عتاب سے بھی سرفراز کیا۔

اس ماہ کا رسالہ ملاحظات کے لئے وقف ہے یعنی ۲۱ء سے لیکر ۳۲ء تک کے ملاحظات کا اقتباس یکجائی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ انتخاب و اقتباس میں دلکشی و افادیت دونوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور اسی لئے سیاسی مسائل یا وقتی نقد و تبصرہ کی حیثیت رکھنے والے مباحث کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ادبی پہلو رکھنے والے ٹکڑے اکثر و بیشتر لے لئے گئے ہیں اور تنقیدات مذہبی کا بھی بڑی حد تک احاطہ کر لیا گیا ہے۔

اس میں دو مصلحتیں پیش نظر تھیں ایک تو یہ کہ وہ ناظرین نگار جو ۲۶ء کے بعد نگار کے خریدار ہوئے ہیں یا جن کے پاس مسلسل فائل موجود نہیں ہیں ملاحظات کو یکجا طور پر دیکھ سکیں اور دوسری یہ کہ مذہب کے متعلق (علاوہ باب الاستفسار اور دیگر مستقل مضامین کے) جو اظہار رائے میں نے ملاحظات کے سلسلہ میں کیا ہے وہ ایک شیرازہ سے وابستہ ہو جائے اور لوگوں کو آسانی کے ساتھ نہ صرف اُن تمام تغیرات کا علم ہو سکے جو تدریجاً میرے مذہبی معتقدات میں پیدا ہوئے ہیں بلکہ ایک صحیح رائے قائم کرنے کا بھی موقع ملے کہ میرا حقیقی مقصود ان سب مباحث سے کیا ہے اور میں اسلام و تعلیمات اسلام کو کس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں۔

شہوانیات یا تاریخ الفحشاء کی کتابت شروع ہو گئی ہے لیکن چونکہ کتاب کافی ضخیم ہے اس لئے اخیر فروری یا شروع مارچ سے قبل اس کی اشاعت دشوار نظر آتی ہے۔ جن حضرات کے خطوط اس کی طلبی میں آگئے ہیں وہ محفوظ ہیں اور بر وقت اشاعت یہ کتاب ان کے پاس روانہ کر دیجائے گی۔

میں ایک بار پھر عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب ان تمام بازاری مطبوعات سے بالکل علحدہ ہے جو زن و مرد کے تعلقات جنسی پر عامیانہ و فاحشانہ طریقہ سے روشنی ڈالتے ہیں بلکہ یہ ایک مبسوط تاریخ ہے انسان کے جذبۂ حیوانی کی جس میں عہد قدیم سے لیکر اسوقت تک کے تمام مدارج جنسیاتی پر مورخانہ و عالمانہ نظر ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس سلسلہ میں نظام تمدن و حکومت نے کیا کیا تدابیر انسداد فحاشی کے لئے اختیار کیں اور ان کا کیا نتیجہ ہوا۔

دسمبر کے نگار میں چند نمونے اس کتاب کے دیدئے گئے ہیں اور ان کے دیکھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب اپنی موضوع کے لحاظ سے کس قدر بسیط و کس درجہ متنوع المباحث اور کتنی دلچسپ ہوگی۔ اردو میں اس موضوع پر یہ بالکل پہلی کتاب ہے اور نوادر تحقیق کا عجیب و غریب مجموعہ ہے۔

۲۹ء کے ملاحظات غلطی سے اپنی اصلی جگہ درج نہیں ہو سکے اس لئے ۳۲ء کے ملاحظات کے بعد درج کئے گئے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

شمارہ ۱	جنوری سنہ ۱۹۳۳ء	جلد ۲۳

جنوری سنہ ۱۹۲۶ء جرائد و رسائل کا دستور ہے کہ آغاز سال میں جب ایک سنہ ختم اور دوسرا شروع ہوتا ہے خیر مقدم و وداع کے مخلوط جذبات کو کسی نہ کسی پیرائے سے ضرور ظاہر کرتے ہیں۔ ایک حد تک یہ رسم بری نہیں ہے اور یوں بھی سالگرہ کی تقریب میں کچھ نہ کچھ چہل پہل کے اسباب پیدا کرنا متمدن دنیا کا دستور ہے، لیکن میں کہ میرے لئے ہر دن قطع منزل ہے اگر کوئی کام کر سکوں اور ہر روز جمعیت قمری اگر بیکار صرف ہو جائے، اس رسم کے ادا کرنے کے لئے طیار نہیں، کیونکہ میرے لئے گزر جانے والے سال کی ناکامی یا آنے والے سال کی کامیابی کا خیال نتیجہ کے لحاظ سے ایک ہی حکم رکھتا ہے، للہ در ما قال:۔

بگذر ز سعادت و نحوست کہ مرا
ناہید بغمزہ کشت و مریخ بقہر

میں دیکھتا ہوں کہ جو دن گزرتا ہے، میرے اندر بجائے تفاؤل کے تشاؤم (Pessimism) کی کیفیت بڑھتی جاتی ہے اور دنیا کی کسی کامیابی کا خیال میرے اندر کوئی ولولۂ مسرت پیدا نہیں کرتا، پھر یہ بات بھی نہیں ہے کہ میں جس کام کو اختیار کرتا ہوں اس میں کامیابی نہ ہوتی ہو، بلکہ خدا کا احسان ہے کہ میں اپنے عزائم کو بہت کم ناکام دیکھتا ہوں، لیکن یہ ضرور ہے کہ کامیابی و ناکامی کے متعلق میرا معیار ضرور بدلتا جاتا ہے، صبح جس نقطہ کو میں منزل سمجھکر آگے بڑھتا ہوں، شام کو وہاں پہونچکر محسوس کرتا ہوں کہ منزل

ابھی کہاں، اور آج جو حد کامیابی کی متعین کر لیتا ہوں کل اُس حد تک پہونچنے کے بعد حقیقت کو اور دور دیکھنے لگتا ہوں۔

نگار کے دور کو اب پانچواں سال شروع ہوتا ہے اور گزشتہ چار سال کے اندر اس نے اس قدر کامیابی حاصل کر لی ہے کہ ہندوستان کا ایک رسالہ اس پر فخر کر سکتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ابھی تک اُس نے حدود حقیقت کی طرف ایک قدم بھی نہیں اٹھایا اور جو معیار میری نگاہوں کے سامنے ہے، وہ ہنوز اس کی دسترس سے بھی بہت دور معلوم ہوتا ہے۔

میں بار بار اسباب کی داستانِ پارینہ کو دہرانا نہیں چاہتا اور بغیر کسی امید و توقع کے بلا کسی خیال کامیابی یا اندیشۂ ناکامی کے ایک راستہ پر چلا جا رہا ہوں اور کوئی چیز سوائے اس خیال کے میری ہمت افزائی کرنے والی نہیں کہ

متاعِ جمع کن شاید کہ غارتگر شود پیدا

مئی ۱۹۲۲ء انسانی زندگی کے سب سے زیادہ تکلیف دہ، لیکن اسی کے ساتھ نہایت دلچسپ لمحات وہ ہوا کرتے ہیں جب حوادثِ روزگار اس کو اپنا نشانہ بنا نا ٹھہرا لیں، یہی وہ چیز ہے جسے مذہب و تصوف کی زبان میں آزمائش و ابتلا کہتے ہیں اور ادبی ذوق رکھنے والے "فطرت کی شوخیوں" سے تعبیر کرتے ہیں لیکن کاروباری دنیا اور مادی عالم میں جہاں خدا "سلسلۂ علت معلول" کے سوا اور کچھ نہیں "طبیعیات" کی یہ ستمرانیاں اس قدر حوصلہ فرسا اور دل شکن ثابت ہوتی ہیں کہ نہ مذہب کی تاویل اس کا مداوا کر سکتی ہے اور نہ شاعرانہ تعبیر اس کے نتائج کی تلخیوں میں کوئی کمی

ہر شخص اپنی اپنی جگہ امن و سکون کی جستجو میں سرگرداں ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ قدرت کا محبوب ترین مشغلہ ہی یہ ہے کہ وہ تدابیر کے اضمحلال کو برابر ہم پر ثابت کرتی رہے، عمارتوں کو ڈھائے اور نقوش کو مٹائے، پھر اکثر و بیشتر اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ انسان اپنی "تعمیری" جد و جہد کو چھوڑ بیٹھتا ہے اور اپنے آپ کو "سیل فنا" کے حوالہ کر دیتا ہے، لیکن کچھ سخت جان ایسے بھی ہوتے ہیں جو آخیر وقت تک ہاتھ پاؤں چلاتے رہتے ہیں! اور یہ میرے نزدیک صرف بر سبیل عادت ہوتا ہے۔ اگر کامیابی ہو گئی تو خیر پند و نصائح کے لئے ایک مثال و نمونہ بن گئے ورنہ شہادت تو قسمت میں لکھی ہی ہے۔

قدرت کی یہ عنایتیں مجھ پر اگست ۱۹۲۳ء سے شروع ہوتی ہیں اور اُسوقت سے لیکر تا ایں دم ایک لمحہ بھی "فارغ از فکر رفتار" بسر نہیں ہوا مسرت و نشاط کا کیا ذکر ہے لیکن میں نے ان تمام روحانی کلفتوں کو کسی پر ظاہر

نہیں ہونے دیا کہ بیکار سی بات ہے اور نہ اس وقت میں ان کی تفصیل آپ کو سنانا چاہتا ہوں کیونکہ اول تو کسی کو میرے ساتھ ہمدردی کیوں ہونے لگی اور اگر ہوئی بھی تو کیا نتیجہ جبکہ غم و الم کی تقسیم ممکن نہیں۔

ماہ اپریل کے رسالہ تجلی میں اس کے فاضل اڈیٹر نے اصغر گونڈوی کے متعلق اظہار رائے کیا ہے کہ:۔

"وہ بہت معمولی علمی لیاقت رکھنے کے باوجود اکثر ایسا اچھا شعر کہتے ہیں کہ روح وجد کرتی ہے لیکن ذہانت سے اچھا شعر کہنا ممکن ہے، بے عیب شعر کہنا ناممکن ہے۔ حال میں اصغر صاحب کی غزل جو علی گڈھ کے مشاعرے میں سب سے بہتر قرار دی گئی اور انھیں ایک طلائی تمغہ پیش کیا گیا اس میں شک نہیں کہ غزل میں چند اشعار قابل داد ہیں لیکن مقطع میں ایک ایسی فاش اور ناقابل تاویل غلطی موجود ہے جس کی بنا پر اہل نظر انھیں تمغہ تو کجا قابل شعرا کی صف میں جگہ دیئے جانے کو بھی پسند نہ کریں گے۔ وہ مقطع یہ ہے ؎

نہیں دیوانہ ہوں اصغرؔ نہ مجھ میں ذوق عریانی کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

اصغر صاحب اور ان کے تمغہ دہندوں کو یہ خبر نہیں کہ جیب و گریباں ایک ہی مسمّی کے دو نام ہیں جیب عربی ہے گریبان فارسی"

معلوم نہیں حضرت وحشی شاہجہاں پوری کا اصل مقصود اس تحریر سے اصغر صاحب کی کم علمی کو ثابت کرنا ہے یا صرف "جیب و گریبان" کی غلطی کو نمایاں کرنا۔ اگر مدعا صرف اس شعر کی اصلاح تھا تو ان کی کم علمی کا ذکر غیر ضروری تھا اور وہ بغیر اس دل آزاری کے بھی پورا ہو سکتا تھا اور اگر مقصود حقیقتاً یہی تھا کہ ان کی کم علمی کو ظاہر کیا جائے تو افسوس ہے کہ اس کے ثبوت میں جس شعر کو پیش کیا گیا ہے وہ کافی دلیل نہیں ہو سکتا۔

یہ درست ہے کہ لفظ "جیب" کا مفہوم عربی میں وہی ہے جو گریبان کا فارسی میں ہے، لیکن فاضل نکتہ چیں کو شاید اس حقیقت سے بھی انکار نہ ہوگا کہ مجازاً لفظ جیب، کیسہ کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور اس کا وہی مفہوم ہوتا ہے جو پاکٹ کا ہے۔ اگر اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ اردو میں کسی لفظ کے غلط مفہوم کا رائج ہو جانا سند پیش نہیں ہو سکتا، تو میں کہونگا کہ لفظ جیب نہ صرف اردو بلکہ خود عربی زبان میں بھی پاکٹ کے معنی میں کثرت سے رائج ہے۔

حال ہی میں مصر کے ایک مشہور فاضل نے عربی زبان کا ایک پاکٹ سائز لغت مرتب کیا ہے اور اس کا نام "قاموس الجیب" رکھا ہے اسی طرح قاموس العصری میں لفظ جیب کے معنی پاکٹ کے بھی لکھے ہیں اور مثالاً "وضع فی الجیب" کا فقرہ درج کیا ہے۔ پھر جب اصل زبان میں اس لفظ کے معنی مجازاً یہ لئے جاتے ہیں تو اردو میں جہاں عموماً لفظ جیب کے معنی صرف کیسہ کے لئے جاتے ہیں۔ کیوں ناجائز و ممنوع قرار دیا جا سکتا ہے اصغر صاحب نے کبھی اپنے علم و فضل کا دعویٰ نہیں کیا کہ مولانا وحشی کو اس کی تردید ضروری ہوتی، وہ

صرف ایک شاعر کی حیثیت سے رونما ہوئے ہیں اور اس لحاظ سے اُن کے کلام پر تنقید کرنی چاہیئے پھر اگر اُن کے اکثر اشعار سے وحشی صاحب کی روح وجد کرنے لگتی ہے تو یہ کافی ثبوت اصغر کے شاعر ہونے کا نہیں ہے۔ رہی قابل و ناقابل شعرا کی تفریق وصف بندی سو یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی کہ کیونکر ایک شاعر کا کلام کلیتہً اغلاط سے پاک ہو سکتا ہے اور محض زبان یا فن کی بعض غلطیوں کی وجہ سے کس طرح ایک حقیقی شاعر کو قابل شعرا کی صف سے نکال کر ناقابل شعرا کی صف میں جگہ ملنی چاہیئے۔ اگر ایک شخص اچھا شاعر پیدا ہوا ہے تو وہ اپنی شعرگوئی کے لحاظ سے قابل ہی شاعر شمار ہوگا خواہ وہ جاہل ہی کیوں نہ ہو اور اگر کوئی شخص فطرتاً شاعر نہیں ہے تو کوشش سے بھی اُس کو قابل شعرا کی صف میں جگہ نہیں مل سکتی خواہ کتنی ہی زبردست سند فضیلت اس کے پاس موجود ہو۔

مجھے افسوس ہوا کہ وحشی صاحب نے اصغر کی کم علمی کا ذکر کرکے ایک ایسے جذبہ کا اظہار کیا جو اُن جیسے سنجیدہ و متین انسان کے لئے کبھی موزوں نہیں ہو سکتا کم از کم وحشی صاحب کے متعلق میں کبھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ انکا شمار بھی ان لوگوں میں ہے جن کے متعلق ایک شاعر لکھ گیا ہے کہ :-

خانۂ شرع خراب است کہ ارباب صلاح

در عمارت گری گنبد دستار خوند

اس دوران میں جو کتابیں ریویو کے لئے موصول ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم "نظریہ اضافیت" ہے، جسے منہاج الدین صاحب ایم، ایس، سی، پروفیسر طبیعیات اسلامیہ کالج پشاور نے مرتب کیا ہے۔

نظریۂ اضافیت (Relativity) زمانہ حال کا جدید ترین نظریہ ہے جسے جرمنی کے ایک ماہر طبیعیات آئن اسٹین نے پیش کیا ہے یہ نظریہ کیا ہے، اس سے طبیعیات کے اصول میں کیا انقلاب پیدا ہوتا ہے اور ہم اس کی مدد سے کائنات کا کس قدر علم حاصل کر سکتے ہیں یہ وہ مسائل ہیں جنھیں فاضل پروفیسر نے نہایت سہل و آسان زبان میں پیش کیا ہے۔ چونکہ نظریۂ اضافیت کے سمجھنے کے لئے طبیعیات کے بعض ابتدائی مسائل علی الخصوص علم الحرکت کا سمجھ لینا ضروری ہے اس لئے اس کتاب میں سب سے پہلے طبیعیات کے بعض ایسے ضروری مسائل کو سمجھا دیا گیا ہے تاکہ اصل مدعا کے ذہن نشین ہونے میں آسانی ہو جائے علاوہ دیباچہ اور مقدمہ کے یہ کتاب چار مقالوں میں تقسیم کی گئی ہے پہلے مقالہ میں مابعد الطبیعیات "ریاضیات" "علم الحرکت" "مادہ" "فضائے معلق" "نظام عالم" "نیوٹن کا کلیۂ تجاذب" "نور دا ثیر" اور نظریہ برقیہ" سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے اور تیسرے مقالہ میں نظریۂ "اضافیت" کی تشریح ہے اور مختلف ابواب

قائم کرکے اس کو سمجھایا گیا ہے چوتھے مقالہ میں ماہیت عالم سے بحث کرکے ایک تتمہ کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں "نظریۂ اضافیت" پر جو اعتراض کئے گئے ہیں اُن کا جواب دیا ہے۔ اس کے بعد اصطلاحات کا ترجمہ ہے اور پھر جدید اصول کے مطابق ایک مفصل انڈکس یا فہرست ہے۔

"نظریۂ اضافیت" چونکہ نیوٹن کے "قانون تجاذب" کو شکست دینا چاہتا ہے اس لئے اب ساری علمی دنیا اس طرف متوجہ ہے اور یورپ میں کثرت سے اس موضوع پر کتابیں لکھی جا چکی ہیں اردو میں اس وقت تک کوئی مفصل مضمون بھی اس مبحث پر شائع نہیں ہوا تھا، چہ جائیکہ کوئی تصنیف، اس لئے ملک کو پروفیسر منہاج الدین صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ انھوں نے اس معرکۃ الآرا نظریہ پر بے مثل تصنیف کرکے اردو داں طبقہ کے لئے اس موضوع کو قابل فہم بنا دیا۔

فاضل مولف کی محنت و کاوش کی داد "حقیقتاً" وہی شخص دے سکتا ہے جس نے کبھی اس نوع کی علمی مضامین کا ترجمہ کیا ہے۔ چونکہ میں نے گزشتہ سال نگار میں ایک مضمون اس موضوع پر لکھا تھا اس لئے میں اس کتاب کی اہمیت اور مولف کی غیر معمولی عرق ریزی و جانفشانی کا اندازہ کر سکتا ہوں۔

اصطلاحات کے ترجمہ میں بیشک مجھے کہیں کہیں اختلاف ہے ذیل میں چند الفاظ کی فہرست، ملاحظہ ہو۔

۱۔	Aberration of light	اس کا ترجمہ شعاع کیا گیا ہے میری رائے میں "انحرافِ نور" زیادہ فصیح ہے
۲۔	Axiom	امر بدیہی سے بہتر میرے نزدیک بدیہیہ ہے مختصر بھی ہے اور اصطلاحی شان بھی رکھتا ہے
۳۔	Convergence	استدقاق بہت ثقیل لفظ ہے اتجاہ یا تقارب زیادہ مناسب ہے
۴۔	Co-ordinates	خطوط مرتبہ صحیح نہیں ہم مراتب ہونا چاہئے۔
۵۔	Common Sense	عقل عام عقل عامہ یا حس مشترک کے بجائے ذوق سلیم یا ذوق فطری بہتر ہے
۶۔	Electron	برقیہ درست ہے لیکن عربی میں اس کے لئے اصطلاحی لفظ کہرمان موجود ہے اس لفظ کے استعمال میں یہ فائدہ ہے کہ نسبت کی صورت میں اس کو کہرمانی کر سکتے ہیں اور برقیہ محدود ہے
۷۔	Ellipse	اہلیجی لکھا ہے غالباً کتابت کی غلطی ہے اس کو اہلیلجی ہونا چاہئے
۸۔	Energy	توانائی بالکل غیر علمی لفظ ہے میری رائے میں قوت بہتر ہے۔
۹۔	Focus	ماسکہ کے بجائے اگر نقطۂ احتراق ہو تو زیادہ مناسب ہے۔
۱۰	Inertia	اس کا ترجمہ جمود میری سمجھ میں نہیں آیا استمرار ہونا چاہئے
۱۱۔	Latent energy	مخفی توانائی۔ اچھا ترجمہ نہیں ہے قوت کامنہ ہونا چاہئے یہی اصطلاحی لفظ ہے
۱۲	Natural	قدرتی سے زیادہ مناسب فطری ہے

۱۳- Nebula — سحابیۂ نیولائے سحابی کی کیا ضرورت ہے جبکہ لفظ سدیم موجود ہے۔

۱۴- Object glass — عدسۂ خارجیہ دہانہ، نہایت الجھا ہوا ترجمہ ہے۔ عدسۂ ایجابیہ کافی ہے۔

۱۵- Photography — عکسی تصویر کشی کے بجائے صرف تصویر شمسی کافی ہے

۱۶- Plate — حساس تختی کی جگہ صرف لوح ہونا چاہئے۔

۱۷- Psyco-Physiology — علم تشریح دماغ اچھا ترجمہ نہیں وظائف نفسی میں کیا حرج ہے

۱۸- Quantum Theory — نظریۂ قدرت سے نظریۂ مقادیر زیادہ فصیح ہے۔

۱۹- Radial motion — منظاری حرکت کی جگہ حرکت شعاعی استعمال کیا جائے تو اچھا ہے

۲۰- Re-action — اس کا ترجمہ جواب عمل کی جگہ ردعمل زیادہ مناسب ہے

۲۱- Refraction — انعطاف شعاع کے بجائے انکشاف نور میرے خیال میں بہتر ہے۔

۲۲- Retardation — ابطار بہت ثقیل ہے ـــــ تعویق یا تاخیر سے بھی یہی مفہوم پیدا ہوتا ہے۔

۲۳- Rotating bodies — اس کا ترجمہ گھومنے والے اجسام کیا گیا ہے چونکہ تمام اصطلاحوں کا ترجمہ عربی انداز میں کیا گیا ہے اس لئے بُرا معلوم ہوتا ہے اجسام دوّارہ ہونا چاہئے۔

۲۴- Spectroscope — طیف نما یا منظار اللون کی کیا ضرورت ہے جبکہ اصطلاحی لفظ مشہور موجود ہے۔

۲۵- Temperation — بجائے طپش کے حرارت کیا جائے تو بہتر ہے

۲۶- Transformation — استحالہ کے بجائے تحویل ہونا چاہئے

۲۷- Ultra Violet — ماورائی البنفشی کے بجائے ماوراء البنفسجی ہونا چاہئے

۲۸- Work — اس کا ترجمہ کام۔ غیر اصطلاحی ہے عمل ہونا چاہئے

۲۹- X-rays — شعاع رانجن کے بجائے شعاع رانجنی ہونا چاہئے۔

جون سنہ ۱۹۲۶ء | اس اشاعت میں جناب حامد اللہ افسر میرٹھی کا ایک مضمون بہ عنوان "ہماری چند انشا پرداز خواتین" درج کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق مجھے نہ کسی نوٹ لکھنے کی ضرورت تھی اور نہ ملاحظات کے سلسلے میں کسی اظہار خیال کی لیکن چونکہ اس کے ساتھ جناب افسر نے مجھے یہ بھی لکھا تھا کہ شاید میں اس کا مخالف ہونگا اس لئے ضرورت ہوئی کہ میں ان کے اس سوءِ ظن کو دور کر دوں۔

معلوم ہوتا ہے کہ جناب افسر نے نگار کی گزشتہ جلدوں کا غور سے مطالعہ نہیں کیا ورنہ ایسا نہ لکھتے سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد جتنے جدید رسائل ہندوستان میں جاری ہوئے ہیں ان میں یہ امتیاز صرف نگار ہی کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے

اسی نے عورتوں کی اس طرز انشا کی مخالفت کی، اور کبھی اپنے صفحات کو اس نوع کے مضامین سے آلودہ نہیں کیا۔
نگار کی مخالفت غالباً اب سے دو سال قبل شروع ہوتی ہے، جب ایک خاتون نے اپنی فارسی غزل اشاعت کے لئے روانہ کی تھی جب اس غزل کا انتخاب شایع ہوا تو شاعرہ نے ایک تحریر روانہ کی جس میں انتخاب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی تھی، میں نے اس کو نگار میں شایع کر دیا اور اسی کے ساتھ اپنے خیالات کا بھی اظہار کر دیا کہ ہمارے ملک کی عورتوں کو صرف معاشری لٹریچر کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے، تغزل اور عشقیہ افسانہ نگاری کے طرف مائل ہو جانا ایک تاریک مستقبل کا پتہ دیتا ہے، میرے اس خیال کی مخالفت متعدد رسائل و جرائد نے کی لیکن میں سختی کے ساتھ اس عقیدہ پر قائم رہا اور اس کے بعد جب ایک خاتون کا فسانہ آیا تو میں نے اُسے اپنے ایک طویل نوٹ کے ساتھ شایع کیا اور نہایت وضاحت کے ساتھ میں نے اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں سے بحث کر کے ملک کے رسائل کو توجہ دلائی اور انہیں وہی مشورہ دیا جو آج افسر صاحب دے رہے ہیں۔ پھر اس کے بعد استفسارات کے سلسلے اور فسانوں کی صورت میں بھی کئی مرتبہ میں نے اس خیال پر زور دیا یہاں تک کہ لوگ مجھے "جنس لطیف" کا دشمن سمجھنے لگے اور اُن کی ترقی کا سخت مخالف، تعجب ہے کہ ان حالات اور واقعات کے ہوتے ہوئے افسر صاحب نے کیسے سمجھ لیا، کہ میں ان کے مشورہ کا مخالف ہوں گا۔
بہرحال فاضل مضمون نگار نے جس مسئلہ کو ملک کے سامنے پیش کیا ہے وہ بہت توجہ کا مستحق ہے اور ضرورت ہے کہ ہر رسالہ کا محرر و مدیر اس پر غور کر کے اک فیصلہ اس امر کا کرلے کہ کسی خاتون کا ایسا مضمون شایع کرنا جو "آدابِ نسائیت" کے منافی ہے مناسب ہو سکتا ہے یا نہیں ہرچند " نزاع " اس بات پر ہو سکتی ہے کہ " آدابِ نسائیت " کا معیار کیا ہے اور کیا ہونا چاہئے۔ نیز یہ کہ ایسا کرنا اُن کی آزادی میں بیجا مداخلت تو نہیں ہے لیکن یہ کوئی ایسی بحث نہ ہوگی جس کا فیصلہ کرنے کے لئے کسی کانفرنس یا انجمن کے طلب کرنے کی ضرورت ہو، ہر شخص اپنی اپنی جگہ اس امر پر غور کر سکتا ہے کہ آیا اس قسم کی انشا جس کا نمونہ افسر صاحب نے اپنے مضمون میں پیش کیا ہے وہ اپنے گھر کی عورتوں اور لڑکیوں کے لئے جائز قرار دے سکتا ہے یا نہیں اگر اس کا ضمیر مخالف ہو تو ملک کے تمام طبقۂ لطیف کو اسپر حاوی ہونا چاہئے۔
میری رائے میں سب سے پہلے اس مسئلہ کو نسوانی رسائل میں زیر بحث لانا چاہئے اور ادارات کی طرف سے اس پر اظہار خیال ہونا چاہئے کہ عورتوں پر عورتوں ہی کے لکھنے کا زیادہ اثر ہو سکتا ہے یا پھر تہذیب نسواں میں اس کے فاضل اڈیٹر شیخ ممتاز علی صاحب کو توجہ کرنی چاہئے کہ انھیں اس طبقہ کے دیرینہ مشیر و مصلح ہونے کی حیثیت سے زیادہ کہنے سننے کا حق حاصل ہے اسی سلسلہ میں مولوی راشد الخیری صاحب کو بھی توجہ دلاؤنگا کہ وہ عصمت کے ذریعہ سے اپنی رائے کا اظہار کریں اور رسالہ نورجہاں کے قابل ایڈیٹوریل اسٹاف کو بھی متوجہ

کروں گا کہ اس باب میں اس کی کوشش قانون ہئیت اجتماعی کے لحاظ سے فرض عین ہے ۔

اس وقت ہندوستان جس دور سے گزر رہا ہے وہ اگر اس موج کا سا خفیف نہیں ہے جو آنے والی بلندی موج کا پتہ دیتی ہے، تو اس میں شک نہیں کہ اس کے بعد جو درجہ آنے والا ہے وہ صرف منزل فنا کا ہے۔ اس وقت سارے کرۂ ارض پر شائد ہی کوئی بدنصیب قطعۂ زمین ایسا ہوگا جو اپنے وقار و خودداری کے لئے اور اپنے وزن کی تعیین کے لئے ہر ممکن ایثار و قربانی سے کام نہ لے رہا ہو، لیکن ہندوستان کی حالت اس قدر شرمناک ہے کہ دنیائے احساس کی کوئی بے غیرتی ایسی نہیں جس کی نمائش اس نے نہ کی ہو اور غفلت و جمود کا کوئی منظر ایسا نہیں جو اس کے اندر بسنے والوں کی طرف سے ظاہر نہ ہو رہا ہو ۔

ہندوستان کی سیاسیات پر دو مختلف نقطۂ نظر سے بحث ہو سکتی ہے ایک متحدہ ہندوستان (United India) جس میں یہاں کی تمام اقوام کو ایک چیز سمجھکر گفتگو کی جائے اور دوسرے "ہندوستانی قومیات" کہ یہ مختلف قوموں کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی مستحق ہے اس وقت ان دونوں میں سے کسی پر کوئی بسیط سیاسی مقالہ پیش نہیں کرنا چاہتا، کیونکہ نہ ملاحظات کے محدود صفحات میں اس کی گنجائش ہے اور نہ اس نوع کی بحث مقاصد نگار میں شامل۔ لیکن اس حیثیت سے کہ اسی سلسلۂ گفتگو میں تعلیمی بحث بھی آجاتی ہے میں مختصراً اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں جس کا تعلق صرف مسلمانوں کی جماعت سے ہے

یہ حقیقت مسلم ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی حالت بہ نسبت ہندوؤں کے بہت زیادہ گری ہوئی ہے اور اس کا بڑا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی مالی حالت کمزور ہے، لیکن میرے نزدیک یہ توجیہ بالکل غلط ہے بلکہ اس کا سبب مسلمانوں کی ذہنی گمراہی ہے ' یا بیجا تفاخر جس کا تعلق ہندوستان کی سرزمین سے نہیں ہے، ہندوؤں کی جماعت ایک ایسی جماعت ہے جس کی تمام تمناؤں کا مرکز صرف سرزمین ہند ہے اور انھیں سیاست خارجیہ سے کوئی تعلق نہیں، اسی لئے ان کی جتنی کوششیں ہوتی ہیں وہ اپنے ہی ملک، اپنے ہی افراد سے وابستہ ہوتی ہیں۔ برخلاف مسلمانوں کے کہ اُن کو سب سے پہلے ترکی افغانستان، ایران، مصر، نجد و حجاز کی طرف توجہ ہوتی ہے اور پھر جو وقت بچتا ہے، اس میں ہندوستان کا بھی خیال آجاتا ہے ۔

جس وقت اس خیال کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سوائے بیجا جذبۂ افتخار کے، اور کوئی چیز شامل نہیں ہے ۔ ممکن ہے کہ بعض افراد کو اخوت اسلامی کا خیال اس پر مجبور کر دیتا ہو لیکن قبل اس کے کہ ہم اس نوع کی برادرانہ ہمدردی پر آمادہ ہوں ہمیں غور کر لینا چاہئے کہ کہیں یہ ہمدردی اس شخص کی سی ہمدردی تو نہیں ہے جو اپنے مطلوب تک تو نہیں پہنچ سکتا، لیکن خودکشی کے لئے تیار ہو جاتا ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ تمام مسلمان خواہ وہ کرۂ ارض کے کسی حصہ میں آباد ہوں ایک ہی جماعت میں داخل ہیں اور مذہب کا اتحاد انہیں ایک ہی رشتہ سے منسلک کئے ہوئے ہے اور یہ بھی فطری مجبوری ہے کہ جب ان میں سے کسی کو کوئی تکلیف ہونچے تو تمام افراد بے چین ہو جائیں اور ہر ممکن امداد کے لئے آمادہ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا ہم فی الحقیقت اس قابل ہیں بھی یا نہیں کہ بیرون ہند کے اسلامی و سیاسی مسائل کو سلجھا سکیں اور کوئی قابل قدر دوسری جگہ کے مسلمانوں کی کر سکیں، ہم نے اس وقت تک جو کچھ کیا وہ صرف یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً کچھ روپیہ بھیجتے رہے، لیکن جو مصیبت ہمارے عام اخلاقی انحطاط سے پیدا ہو چکی ہے وہ روپیہ سے دور نہیں ہو سکتی اور نہ سیاسیات مغرب کی مشرق کش پالیسی کا رخ بدل سکتے ہیں جب تک ہم میں خود کوئی اجتماعی و قومی وزن پیدا نہ ہو جائے۔ پھر ہم اس کے لئے تو بیتاب ہو جاتے ہیں کہ دوڑ کر منزل تک پہنچ جائیں لیکن اس کی پروا نہیں کہ پاؤں میں طاقت رفتار کیونکر پیدا ہو سکتی ہے۔ سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ اندرونی و مقامی اصلاح ہے، اور جب تک اس میں کامیابی نہ ہو جائے ہم دوسروں کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔

اس وقت بظاہر عالم اسلامی افتراق و انتشار کی حالت میں نظر آتا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ انتشار ہی آئندہ اجتماع کا پتہ دیتا ہے، اگر کوئی جماعت اتنی بڑی اور منتشر الدیار ہے کہ من حیث الکل وہ کسی امر پر متفق نہیں ہو سکتی تو پھر بہترین تدبیر یہی ہے کہ اس کو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اپنی اصلاح کرنی چاہئے کیونکہ آسانی اسی میں ہے، اگر ٹرکی خلافت کے بارے آزاد ہو کر ایک ترکی قوم ہونے کی حیثیت سے اپنے آپ کو ابھارنا چاہتا ہے، اگر مصر کے افراد اپنی قومیت علٰحدہ قائم کر کے ترقی کرنا چاہتے ہیں اسی طرح اگر نجد و حجاز، ایران و افغانستان وغیرہ جدا جدا ہو کر اپنی اصلاح کے خواہش مند ہیں تو ہمیں مسرور ہونا چاہئے کہ حقیقتاً یہی صحیح طریق کار ہے اور اسی کی تقلید ہمیں بھی کرنی چاہئے، لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس نکتہ کو نظر انداز کر دیا اور شروع سے اس کلیہ کو فراموش کر دیا کہ "اصلاح ہمیشہ گھر سے شروع ہوتی ہے"۔

مسلمانوں نے "انجمن خدام کعبہ" قائم کی "خلافت کمیٹی" کو برپا کیا لیکن آج تک اُنھوں نے کسی ایسی انجمن قائم کرنے کی کوشش نہیں کی جس کا تعلق خود اُن کی اصلاح سے ہوتا جس میں خود اپنے بچوں کی تعلیمی حالت مد نظر ہوتی، موجودہ سیاسی اضطرابات کے سلسلے میں سب سے بڑا کارنامہ مسلمانوں کا جس کا تعلق اصلاح تعلیمی سے تھا جامعہ ملیہ کا قیام ہے، لیکن جو حالت اُس کی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اگر یہ بدعت کی تھی تو چاہئے تھا کہ اُسے تکمیل تک پہنچاتے اور وسیع کرتے یہاں تک کہ تمام اسلامی بستیوں اور قصبوں میں اس کی شاخیں قائم ہو جاتیں اور اس طرح ایک عام بیداری پیدا ہو جاتی۔

میں نے جامعہ کو دیکھا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ جن اصول کے ماتحت اس کو قائم کیا گیا ہے وہ یقیناً قابل

تھیں ہیں لیکن وہی عیب جو مسلمانوں کے تمام کاموں میں پایا جاتا ہے یعنی "عدم تنظیم" یہاں بھی موجود ہے اور اس لئے اُس نے کوئی ترقی نہیں کی، یہ صحیح ہے کہ گزشتہ چند سال کا زمانہ خاص سیاسی اضطراب کا تھا، اور مسئلہ سوراج عدم تعاون اور کھدر پوشی نے سب کی افکار کو اپنی طرف جذب کر لیا تھا۔ لیکن میں کہوں گا کہ یہ تمام مسائل غور از قبل وقت چھیڑ دئے گئے تھے اور اسی لئے وہ ایک ضعیف و ناقص تخم سے پیدا ہونے والے پودے کی طرح خفیف سی گرمی کی بھی تاب نہ لا سکے۔

یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ اگر ۳۲ کروڑ کی آبادی میں سے صرف چند ہزار انسان تعلیم کی برکات سے اس قدر بہرہ یاب ہو گئے ہیں کہ وہ آزادی کے برکات سے مستفید ہو سکتے ہیں، تو ناممکن ہے کہ وہ ملک کو آزاد کرا سکیں۔ ملک نام ان چند افراد کا نہیں ہے جو کالجوں میں تعلیم پا رہے ہیں، ملک عبارت ان چند نفوس سے نہیں ہے جو لیڈری کر سکتے ہیں اور نہ ملک سے مراد وہ ایک درجن لوگ ہیں جو کسی جلسہ میں اچھی تقریریں کر سکتے ہیں، بلکہ ملک بنتا ہے عوام سے، قصبات و دیہات کی آبادی سے، سو اس کے احساس کا یہ عالم ہے کہ بمشکل حیوانات سے کوئی بلند درجہ اس کے لئے متعین ہو سکتا ہے۔ پھر جب تک آپ اُن کے خیال میں وسعت نہ پیدا کریں تا وقتیکہ عام تعلیم کے ذریعہ سے اُن کے دماغ کو روشن نہ بنائیں آپ کو "آزادی" کے نام لینے کا کیا حق حاصل اور آپ کس اعتماد پر غیروں سے اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ مسلمان کانگرس میں حصہ نہ لیں مسئلہ حجاز سے بے تعلق ہو جائیں، لیکن اس کے کیا معنی کہ آپ اپنے ان فرائض سے غافل ہو جائیں جو یقیناً کانگرس اور حجاز سے زیادہ توجہ کے مستحق ہیں جب ترکوں نے خلافت کا جوا اپنی گردن سے نکال پھینکا تو آپ نے وہ سب کچھ کر لیا جو آپ کے اختیار میں تھا لیکن نتیجہ کوئی نہ نکلا کیونکہ ترک بیوقوف نہ تھے کہ آپ کی غیر دانشمندانہ رائے تسلیم کر کے اپنا نقصان کرتے، اسی طرح اب حجاز کے معاملہ میں آپ کے وفد پر وفد چلے جا رہے ہیں، آپ جہازوں سے اپنے پیغامات لوگوں کو سنا رہے ہیں، گویا اس سے زیادہ سخت مہم آپ کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتی اور شاید آپ ہی کی ذات پر سارے نظم عالم کا انحصار ہے لیکن ہمیں معلوم ہے کہ جو نتیجہ اس کا ہونے والا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب وہاں سے آپ واپس آئیں گے اس حال میں کہ آپ کے مشورے ٹھکرا دئے گئے ہوں گے اور آپ کے پاس خفت مٹانے کے لئے کوئی ذریعہ نہ رہ جائے گا سوائے اس کے کہ ہندوستان کی بیوقوف پبلک کو آپ کسی اور وفد کی روانگی کا منتظر بنا کر چھوڑ دیں۔ اگر حجاز میں ابن سعود ملوکیت قایم کر رہا ہے تو آپ کو کیا اور ترک خلافت کو مٹا رہے ہیں تو آپ کیوں بیتاب ہوئے جاتے ہیں، پہلے اپنے "کارِ زمیں" کی طرف تو توجہ کیجئے اس کے بعد "آسمان پر وازی" کا سودا پکائیے گا، گھر کی حالت تو آپ کی یہ ہے کہ سر چھپانے کا ٹھکانا نہیں، دوسروں کے معاملات میں خواہ مخواہ مشیر و حکم بننے کے لئے

دوڑے جارہے ہیں۔

خلافت کمیٹی کے تازہ ترین اجلاس کی کارروائی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے مقصود سے دور ہونے میں ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے اور "تبلیغ و تنظیم" کی طرف توجہ کرکے اس خلیج کو اور زیادہ وسیع کرنا چاہا، جو اب بھی ہندو مسلمانوں کے مابین کم وسیع نہ تھی۔ یہ صحیح ہے کہ بعض ہندوؤں کا طرز عمل قابل اعتراض ہے اور شدھی و سنگھٹن کی تحریک مسلمانوں کے اندر مذہبی ہیجان پیدا کر رہی ہے لیکن اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ اس کے مقابلہ میں "تبلیغ" "تنظیم" کا علم بلند کیا جائے بلکہ اقتضائے وقت یہ تھا کہ بالکل سکوت اختیار کیا جاتا اور نہایت سکون کے ساتھ اس وقت کا انتظار کیا جاتا، جب شدھی اور سنگھٹن کے محرک ہندو خود اپنی مضرت رساں تحریک سے واقف ہوکر اسے ترک کر دیتے۔ یہ امر روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ مسلمان کسی ایسی تدبیر سے جو ہندوؤں کے سنگھٹنی جذبات میں اور زیادہ ہیجان پیدا کرنے والی ہو، کسی اچھے نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے اور نہ انھیں اس سے باز رکھ سکتے ہیں پھر جبکہ اصل مقصود اس فضا کا پیدا کرنا ہے جسے متحدہ ہندوستان کہتے ہیں اور جب یہ یقینی طور پر معلوم ہو کہ تنہا مسلمان کچھ نہیں کر سکتے تو پھر ہمارا فرض تھا کہ موجودہ کشمکش میں اور اضافہ کرنے کے بجائے معاملہ کو اسی کے حال پر چھوڑ دیتے۔ یہاں تک کہ ہندو اس کو محسوس کرنے لگتے کہ وہ بھی مسلمانوں سے علٰحدہ ہوکر تنہا اپنا مدعا حاصل نہیں کر سکتے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس وقت جو خونریزیاں ہندو مسلمانوں کے درمیان ہو رہی ہیں وہ نتیجہ ہیں صرف بعض فتنہ پرداز ہستیوں کی کوشش کا، اور یقیناً ہندوؤں کی ساری قوم کبھی اس کو پسند نہیں کرتی اور نہ یہ ہمیشہ قائم رہنے والی ہیں، اس لئے اگر اس وقت ملک کی ضروریات شدھی و سنگھٹن سے زیادہ بلند کسی اور چیز کی طالب ہیں تو ہم کو اسی پر نگاہ رکھنی چاہئے اور ان عارضی مناقشوں کو بالکل اس طرح طے کرنا چاہئے گویا کہ وہ بالکل غیر اہم چیزیں ہیں اور ان کی وجہ سے ہم کو وہ شاہراہ نہیں چھوڑنی چاہئے جسے ایک مرتبہ ہندو مسلمان دونوں باہم مل کر قائم کر چکے ہیں۔

بہر حال مسلمانوں کا موجودہ طریق کار یکسر قابل اصلاح ہے اور ضرورت ہے کہ جو حدود انھوں نے اپنی تدابیر کے مقرر کئے ہیں ان کو بالکل بدل دیا جائے چنانچہ سب سے پہلے تو خلافت کمیٹی کو ختم ہو جانا چاہئے کیونکہ جب خلافت کا وجود باقی نہیں رہا تو پھر خلافت کمیٹی کیسی؟

دوسرے یہ کہ "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" پر ملک کو قابض ہونا چاہئے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کوئی اور انجمن قائم کرنا چاہئے جس کا تنہا مقصود مسلمانوں میں عام طور پر تعلیم کی اشاعت کرنا ہو اور اگر ہندو بھی اس مسئلہ میں متفق ہوں تو میرے نزدیک فی الحال کانگرس ہی کا تنہا مقصود یہ قرار دینا چاہئے کہ ہندوستان کے ایک ایک بچہ کو تعلیم سے آشنا کیا جائے اور اس وقت تک کہ اس میں کامیابی نہ ہو اور تمام مسائل کو پس پشت ڈال دیا جائے جتنا روپیہ کانگرس کی تنظیم پر

ہندوستان کا صرف ہو رہا ہے، یا جتنا روپیہ خلافت کمیٹی کے ذریعہ سے مسلمانوں کا تباہ کیا جا رہا ہے یہ سب تعلیم پر صرف کیا جائے تو ایک ربع صدی کے اندر وہ انقلاب پیدا ہو جاتا ہے جو اس طرح بے اصولی کے ساتھ صدیوں میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اگست ۱۹۲۶ء میرا ایک مضمون "نقاب اُٹھ جانے کے بعد" جون کے رسالہ میں شائع ہوا ہے اس کے متعلق بعض تحریریں میرے پاس اس قسم کی آئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جس ہستی کا ذکر میں نے اس میں کیا ہے اس کو واقعی کوئی "موجود فی الخارج" شخصیت سمجھا گیا ہے، حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے، میں نے اس میں صرف ایک خیالی شخص کو پیش کیا ہے اور اس کا نام "وارث علی" بغیر کسی غور و فکر کے میرے قلم سے نکل گیا ہے، لیکن دنیا کا کوئی فرضی نام ایسا نہیں ہے جس کا مسمیٰ موجود نہ ہو اس لئے بعض اصحاب اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔

اس فسانہ سے میرا مقصود صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہمارے یہاں کے طبقۂ متصوفین و علماء میں بعض ایسے "نفوس مقدسہ" بھی پائے جاتے ہیں جن کے ظاہر و باطن میں بالکل سفید و سیاہ کی نسبت ہوتی ہے اور اس لئے صرف ظاہر کو دیکھکر باطن پر حکم لگانا قرین مصلحت نہیں کیونکہ بسا اوقات نتیجہ میں جو منظر ہمارے سامنے پیش ہوتا ہے اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ

چوں بازکنی مادر مادر باشد

عام طور پر صوبۂ یوپی میں اس امر کی شکایت کی جاتی ہے کہ پنجاب اپنی "جریدہ خیز" سرزمین سے اردو میں ناقص لٹریچر کا اضافہ کر رہا ہے اور وہاں کا ممتاز سے ممتاز رسالہ بھی زبان کی فاحش اغلاط سے پاک نہیں ہوتا یہاں تک کہ یوپی کے اہل قلم بھی وہاں پہنچکر "طوطی درپس آئینہ" ہو جاتے ہیں لیکن اس حقیقت کا اعتراف کبھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کس "زندہ دلانہ" طریقہ پر خدمت زبان کے لئے مستعد نظر آتے ہیں اور جس ولولۂ نشاط کے ساتھ وہ کام کر رہے ہیں، اس سے کس درجہ ان کے تقدم ادبی پر روشنی پڑتی ہے۔

اگر وہاں بہت سے ناکارہ رسائل شائع ہوتے رہتے ہیں تو وہ بند بھی ہو جاتے ہیں، لیکن یہ "اجراء و انقطاع" وہاں کی فضا میں کوئی برودت پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ جس طرح ایک شاخ قلم ہونے کے بعد زیادہ قوت کے ساتھ نشو و نما پاتی ہے اسی طرح وہاں بھی اگر ایک رسالہ بند ہوتا ہے تو دس اُسکی جگہ لے لیتے ہیں، جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ تنقید صحیح کے ماتحت ہر جدید رسالہ کا معیار بلند ہوتا جائیگا اور ایک وقت آئیگا جب پنجاب اپنے رسائل کی "کمیت و کیفیت" دونوں حیثیتوں سے ترقی یافتہ نظر آئے گا۔

اس سے قبل جون کے نگار میں بہ سلسلۂ ملاحظات، پنجاب کے ڈرامیٹک کلب کے قیام کا ذکر آچکا ہے جس نے بہترین ڈراما کے لئے ایک ہزار روپیہ انعام کا اعلان کیا ہے اب لاہور کی انجمن ارباب علم نے ادبی مقابلہ کے لئے ۱۲۵۰ روپیہ کا انعام تجویز کیا ہے جس کے شرایط کی تفصیل آپ کو ملک کے مختلف اخباروں سے معلوم ہوگئی ہوگی اور نگار کی آئندہ اشاعت میں ہم بھی اُسے درج کریں گے۔

اب اس کے مقابلہ میں یو۔پی کی گراں خوابی کو ملاحظہ کیجئے کہ اہل علم و قلم کی ترغیب و تشویق کے لئے مادی اعانت تو خیر بڑی چیز ہے، اس گہوارۂ زبان اور مہد ادب میں جو چند رسائل نظر آتے ہیں ان کا بھی یہ حال ہے کہ ہر مہینہ کا رسالہ اس طرح نکلتا ہے جیسے آخری سانس۔ تلخ نوائی معاف، کیا اسی کارگاہ عمل پر یہ "طنطنۂ افتخار" ہے اور اسی حقیقت پر دعوائے "انا ولا غیری" زیب دیتا ہے، اے

طبل بلند بانگ و در باطن ہیچ!

اپریل و مئی کے نگار میں ایک مضمون بہ عنوان "ہندو مسلمانوں کے دورِ حکومت میں" مسلسل شایع ہوا ہے اس پر کسی ہندو فاضل کا ایک ناقدانہ مضمون اخبار شعاع بریلی میں نکل رہا ہے اس میں شک نہیں کہ قابل مضمون نگار نے پوری سعی نامشکور سے معاندانہ انداز تحریر کو چھپاتے ہوئے حق تنقید ادا کیا ہے، لیکن کیا یہ مناسب نہ تھا کہ وہ اس کو نگار ہی میں اشاعت کے لئے بھیجتے، تاکہ ہمیں بھی تحسین کا موقع ملتا جس قوت کے ساتھ وہ مسلمان بادشاہوں کی ستمرانیوں کا ثبوت پیش کر رہے ہیں ہر چند وہ کوئی نئی چیز نہیں، بلکہ

صد بار خواندۂ دگر از سر گرفتہ ایم

کی قبیل سے ہے، لیکن پھر بھی ہم اس "زور بازوئے آزمودہ" کی داد دینے میں اپنے آپ کو کم حوصلہ ثابت کرتے، اگر اُس کا محل نمائش نگار کے صفحات کو قرار دیا جاتا۔

ماہ جون کی ڈاک میں سب سے زیادہ پُر لطف تحریر بمبئی کے کسی اہل کلیسہ، جے مارٹن کی تھی جس میں صاحب موصوف نے مجھے مخاطب کر کے تحریر فرمایا تھا کہ۔

"سنا ہے آپ دین مسیحی کی طرف رجوع ہونا چاہتے ہیں اگر یہ سچ ہے تو میں خوش ہوں کہ آپ نے دین حق کی طرف توجہ کی اور آپ جیسے قابل کی ضرورت بھی تھی سو خدا اور اس کا بیٹا بہت جلد پوری کرے گا"

لیکن اس تحریر میں قیامت کے فقرے تو یہ تھے۔

"دین اسلام ایک تنگ و اوہام پرست مذہب ہے، اس میں رہکر آپ روحانی ترقی نہیں کر سکتے"

مجھے حیرت ہے کہ میرے عزیز دوست کو کیونکر یہ اطلاع بہم پہنچی کہ میں "دین مسیحی کی طرف رجوع" ہونا چاہتا ہوں حالانکہ اس سے قبل کبھی مجھے دین مسیحی قبول کرنے کا شرف حاصل نہیں ہوا کہ مسلمان ہونے کے بعد پھر اس طرف "رجوع" کرتا، لیکن اگر اس رجوع کے فقرے سے اُن کا مقصد مجھے دین مسیحی کی طرف دعوت دینا ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسٹر جے مارٹن جو مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور جو عین شباب کے عالم میں ان کے مصلوب ہونے اور زندہ آسمان پر اُٹھائے جانے کے قائل ہیں وہ ایسے مرتد شخص کو اپنے مسلک میں داخل کر کے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو خود انجیل مقدس کی اسناد سے مسیح کو ایک انسان کا بیٹا سمجھتا ہے، جو اعتقاد رکھتا ہے کہ مسیح عمر طبیعی کو پہنچکر عام انسانوں کی طرح اپنی موت سے مرے اور جو یقین رکھتا ہے کہ

دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

البتہ اگر مسٹر جے مارٹن یا اور کوئی عیسائی فاضل کسی صحیفۂ مقدس سے یہ ثابت کر دے کہ میرا اعتقاد غلط ہے، تو میں مسیحی کیا معنی یہ دعا کرنے کے لئے طیار ہوں کہ -

خدایا جہود م میرانم

رہا ان کا وہ فقرہ جس میں اُنھوں نے اسلام کو تنگ اوہام پرست مذہب بتا کر روحانی ترقی کا دشمن ظاہر کیا ہے، سو اس کے متعلق میں صرف یہ عرض کرونگا کہ ؎

زخار خار محبت دل ترا چہ خبر
کہ گل بہ جیب نہ گنجد قبائے تنگ ترا

آپ اور اسلام پر اوہام پرستی کا الزام ! جے مارٹن صاحب اور دین محمد پر روحانیت کی دشمنی کا بہتان !!

ایں بہ بیداری ست یا رب یا بہ خواب

وہ شخص جس کے مذہب کی روحانیت کو مادہ پرستی ہمیشہ کے لئے محو کر چکی ہو، وہ اسلام کو روحانیت کا منافی خیال کرے وہ اسلام جس کے مقلدین میں بعض مادہ پرست لوگ بھی روحانیت کا واسطہ قائم کئے بغیر کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکتے ہوں، افسوس ہے کہ میرے معزز ناصح نے کافی غور نہیں کیا، ورنہ اس فقرے کو وہ اپنے ہی مسلک کے لئے زیادہ موزوں پاتے -

ہر چند اسلام کے لئے یہ دور سخت انحطاط و زوال کا دور ہے، لیکن بایں ہمہ جو "محرم بادصبا" ہے وہ جانتا ہے کہ اسلام میں اب بھی

باوجود خزاں بوئے یاسمن باقی ست

اس نوع کی دعوت دیکر اس وقت سے ہٹرنے کہ مبادا کوئی "رند ژولیدہ مو" سن لے اور اپنی ادنیٰ توجہ سے

کام لے کر آپ ہی سے کہلوالے کہ

"نکلا اک جام کی قیمت بھی نہ ایماں اپنا"

ستمبر ۱۹۲۶ء | نگار اور ناظرین نگار کے مابین جو ادبی رشتہ قائم ہے، اس کا تقاضہ تو یہی ہے کہ "شکوہ و شکایت" کی راہ و رسم مسدود نہ کی جائے۔ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ اگر اسے جاری رکھا جائے تو بھی کیا فائدہ، جبکہ نتیجہ کے لحاظ سے اپنی ناکامی کی بہتر سے بہتر تاویل اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ:۔

این راہ و رسم تازہ ز حرمان عہد ماست
عنقا بروزگار کسے نامہ بر نبود

پھر نہ میں ایسا شاعر ہوں جو صرف اس خیال سے کسب لذت کرتا ہوں کہ "یاد آں جور و جفائی کنم دمی گریم" اور نہ کوئی صوفی ہوں کہ صبر و شکر کی ویران وادی کو کسی نہ کسی طرح "آبلہ پائی" کی صعوبتیں برداشت کر کے بغیر کسی شکایت کے گزر جاؤں، میں اگر اپنے دل کا خون کرونگا تو آپ سے بھی یہ مطالبہ ضرور ہوگا کہ "از مژہ و آستیں شناس" اور اگر آپ توجہ نہ کرینگے تو یقیناً یہ تلخ شکایت بھی ہوگی کہ

گوش سخن شنو کجا، دیدۂ اعتبار کو؟

پھر اگر فرصت ہو تو کسی وقت اس حقیقت پر بھی غور کیجئے کہ آپ نے اس وقت تک نگار کی کیا خدمت کی ہے، اور اس حال میں کہ آپ اس سے خدا جانے کیا کیا توقع رکھتے ہیں، ان توقعات کی تکمیل کے لئے آپ نے کیا اسباب فراہم کئے ہیں میں اس سے زیادہ واضح الفاظ میں کہنا مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ

اسرار عشق آنچہ تواں گفت گفتہ ایم

اور نہ کوئی سائلانہ لب و لہجہ اختیار کرونگا، کیونکہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ مطالبہ ہے، نہ کہ کوئی گدایانہ التجا، اگر آپ چاہیں تو ادنیٰ توجہ سے توسیع اشاعت کے فرض کو بخوبی ادا کر سکتے ہیں ورنہ یوں تو

تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

جدید رسائل کا اجرا یقیناً قابل مسرت امر ہے، لیکن نہ یوں کہ ان کا وجود صرف کشکول گدائی پر منحصر ہو اگر کوئی صاحب تجارتی نقطۂ نظر سے یہ مشغلہ اختیار کرنا چاہتے ہیں تو میں انھیں مشورہ دونگا کہ

ایں جرعہ راز ساغر دیگر فرو برند

اور اگر مقصود صرف نمود و نمائش ہے تو پہلے اپنی اہلیت کا اندازہ کر لیں کہ وہ بغیر وقار خودداری کو صدمہ پہنچائے،

س میں کامیاب ہو سکتے ہیں یا نہیں، اب رہ گئی تیسری صورت، جس کا نام "خدمت ملک و زبان" رکھا جاتا ہے سو اب
س کا حال یہ ہے کہ

در کشور ریتاں گنہش نام کردہ اند

مجھے روزانہ دو ایک خط ایسے ملتے ہیں جن میں مضامین کا تقاضہ ہوتا ہے، اور کوئی ہفتہ نہیں گزرتا کہ یاد دہانی بھی آجاتی ہے، میں ان احباب کا ممنون ہوں جو مجھے اس قابل سمجھتے ہیں، لیکن شاید انھیں علم نہیں کہ میں کس قدر مصروف و منہمک، اور اسی کے ساتھ کس درجہ حزیں وملول زندگی بسر کر رہا ہوں، نگار کا معاملہ تو ایسا ہے جیسے غالب کے لئے مقطع کی "سخن گسترانہ بات"، "بات کی پچ"، طبیعت کی ضد، کئے کی شرم، جگ ہنسائی کا اندیشہ ان سب نے مجھے پابزنجیر کر دیا ہے، ورنہ حقیقتاً زمانہ نے تو میرے دل و دماغ کو بیکار رہنے اور میری ہمت کو پارہ پارہ کر دینے میں اپنے ترکش کا کوئی تیر ایسا نہیں ہے جو صرف نہ کر دیا ہو۔

پھر جب حالات یہ ہوں تو میں کیا اور کیونکر دیگر رسائل کی قلمی اعانت کر سکتا ہوں۔

وہ حضرات جو جناب خضر کے متعلق میری گفتگو سے برہم ہوئے ہیں وہ اشاعت حاضرہ میں اور زیادہ سامان دلچسپی پائیں گے، حضرت عیسیٰ کی نسبت گزشتہ اشاعت میں، میں نے بہ سلسلۂ ملاحظات ضمناً اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، اس کو ایک کرم فرمانے دیکھا اور سنجیدہ برہمی کے ساتھ مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں ابھی، نا مسلمانی، کو (ظاہر بین و کوتاہ اندیش حضرات کے نقطۂ نظر سے) اُس کے آخری حدود تک پہنچا دوں اگر اب بھی مجھے کوئی کافر نہ سمجھے تو میں اس کے ایمان کا ذمہ دار نہیں ہوں، بہر حال میری طرف سے کوتاہی نہیں ہوئی۔

ہم کعبہ و ہم بتکدہ سنگِ رہِ ما بود
رفتیم و صنم بر سرِ محراب شکستیم

گزشتہ تیرہ سو سال سے مسلمانوں کی ذہنیت میں جو انحطاط رفتہ رفتہ پیدا ہوا ہے اس کی روشن مثال اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ جس مذہب کے متعلق ان کو فطری ہونے کا دعویٰ ہے اسی کے متعلق وہ کوئی بات ایسی نہیں سن سکتے جو واقعی "فطرت آہنگ" اور قانونِ قدرت کے مطابق ہو۔ پھر اگر مذہب نام ہے صرف انجمود پرستی اور دشمنی عقل و ہوش کا، اگر اسلام کوئی ایسی چیز ہے جو صرف متقدمین ہی کے عہد میں پایا جاتا تھا اور اب اس کا وجود بالکل ایک (عنقا ہے) کا سا وجود ہے اور اگر ہمارے مذہبی رہنما و اعظ میں اتنی روشنی بھی پیدا نہیں کر سکتے کہ ہم اسلام کو ہر قوم و زمانہ کا مذہب سمجھنے کی اہلیت رکھیں تو میں کہوں گا کہ

بت خانہ کہ خانقش نام کردہ اند
یارب ز سیل حادثہ طوفاں رسیدہ باد

اکتوبر ۱۹۲۶ء | اپریل و مئی کے نگار میں برسبیل تذکرہ میں نے اپنی بعض ذاتی پریشانیوں کا اظہار کیا تھا جس کو دیکھکر اکثر احباب نے میرے پاس ہمدردی کی تحریریں روانہ کیں، اور بعض نے حد درجہ اصرار کے ساتھ مجھ سے ان پریشانیوں کی تفصیل بھی دریافت کی۔

ہر چند میں نے فرداً فرداً سب کو جواب لکھدیا ہے لیکن اس خیال سے کہ شائد بعض حضرات کی تحریریں نظر انداز ہوگئی ہوں میں نگار کے ذریعہ سے بھی اُن کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں، لیکن اپنے حالات کی تفصیل نہ میں نے خط میں کسی کو لکھی، اور نہ اس جگہ اس کا اظہار کرونگا، کیونکہ درد و غم ناقابل تجزیہ چیزیں ہیں اور اس کو میں کسی طرح تقسیم کرکے اپنے بوجھ کو ہلکا نہیں کر سکتا، اور نہ غیرت اس کی متقاضی ہے۔

میری موجودہ زندگی بدستور "انتشار و فشار" میں گزر رہی ہے، اور شائد قدرت کا فیصلہ یہی ہے کہ میں دمِ واپسیں تک اُس کی اس امانت کا حامل رہوں اس لئے میری حالت دریافت کرنا اور اس کے جواب میں کسی اچھی خبر کی توقع رکھنا غالباً فطرت کے منشار کے خلاف ہے۔

ما خانہ رسیدگانِ ظلیم
پیغام خوش از دیار مانیست

شیخ شوکت علی صاحب بی، اے، ال، ال، بی، ساکن محلہ رکاب گنج لکھنؤ کی طرف سے ایک خط مجھے موصول ہوا ہے، جس میں شائد ایک وکیل کی حیثیت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ میں ان حالات کو ثابت کروں جو شاہ وارث علی کاظمی قادری کے متعلق جون کے نگار میں بعنوان "نقاب اُٹھ جانے کے بعد" میں نے تحریر کئے ہیں۔ اس خط میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو اس کا نتیجہ میرے حق میں "جیل خانہ جانا ہوگا" (یہ انھیں کے الفاظ ہیں) اول تو میں اس تحریر کو شیخ شوکت علی صاحب کی تحریر یقین نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کے الفاظ نہایت ناشائستہ اور طرز عبارت بالکل عامیانہ ہے، لیکن اگر ہو بھی تو قابل اعتنا نہیں سمجھتا، کیونکہ جبتک کوئی شخص "شاہ وارث علی کاظمی قادری" کی حیثیت سے میرے سامنے پیش نہ ہو، میں اپنے افسانہ کے ہیرو کو کبھی اس امر کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ خواہ تخواہ کسی معمولی "شاہ وارث علی" کا سمی بننے کے لئے سامنے آجائے جس طرح وکیل صاحب موصوف اپنے فرضی موکل کی طرف سے یہ نوٹس دینے کے مجاز ہیں میں بھی اپنے اس ہیرو کی پوزیشن محفوظ رکھنے کا ذمہ دار ہوں، جو اس وقت خدا جانے کن کن ناموں سے ہندوستان کے اندر یاد کیا جاتا ہے۔

لیکن اگر اس سے مقصود یہ ہے کہ "خرقہ پوشان سالوس" کے متعلق نگار میں کچھ نہ لکھا جائے تو میں اس تحریر کے

کاتب سے خواہ وہ شیخ شوکت علی صاحب وکیل ہوں، یا کوئی اور بزرگ، ماہ نومبر کا نگار دیکھنے کی درخواست کرونگا جس میں ایک ورایسی ہی ہستی کو "برافگندہ نقاب" پیش کیا گیا ہے۔

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

نومبر ۱۹۲۶ء | شاہ صفی کا شعر ہے اور بہت پرلطف شعر ہے :۔

ہرچہ بادا باد حرفے چند می گویم بدود
کارِ خود در عاشقی ایں بار یکسو می کنم

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی شاعر نے اس پر عمل کیا، کیا حقیقتاً وہ کوئی اخیری فیصلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ؟ مجھے یقین نہیں نہ اس خیال سے کہ شاعر کی بات کا اعتبار کیا، بلکہ محض اس بنا پر کہ کمبخت انسان مایوس ہونے کے بعد بھی امید کا رشتہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا چہ جائیکہ ایک عاشق جس کی زندگی کا ایک اک لمحہ اسی تفاول پر قائم ہے۔ مرزا نوشہ لکھتے ہیں :۔

نازم فریبِ صلح کہ غالب ز کوئے دوست
ناکام رفت و خاطرِ اُمیدوار بود

یعنی "فریبِ صلح " نے دل میں اُمید پیدا کردی، حالانکہ یہ بھی "فریبِ اُمید" ہے۔ پہلے ہی اگر دل اس جذبہ سے خالی ہوتا تو " فریبِ صلح" کی نوبت ہی نہ آتی۔

اس تمہید سے مدعا یہ ہے کہ میں بھی کبھی کبھی شاہ صفی کی طرح "کارِ خود ایں بار یکسو کنم" کے لئے بالکل آمادہ ہو جاتا ہوں اور اپنے حالات میں وہ تغیر پیدا کر لینا چاہتا ہوں جو مجھے موجودہ طلسم "بیم و رجا " سے نکالدے، لیکن بُرا ہو اس خاطرِ "اُمیدوار" کا کہ کبھی اس ارادہ میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اور باوجود اس کے کہ تکمیل عزم کے اکثر اسباب مہیا ہیں، لیکن جب سرے سے عزم ہی کا فقدان ہو تو پھر تکمیل کس کی۔

ہزار رخنہ بدام دمر از سادہ دلی
تمام عمر در اندیشۂ رہائی رفت

خدا کرے نگار کا نیا سال اس حال میں طلوع ہو کہ میں سارے افکار سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو اسی کے لئے وقف کر چکا ہوں۔

نگار میں ایک مضمون "غالب کی ذہنیت" کے عنوان سے شایع ہوا ہے، میرے ایک عزیز دوست کو جنھیں عربی کی پوری استعداد حاصل ہے اور جو ماشاء اللہ ادیب بھی ہیں لفظ "ذہنیت" پر اعتراض ہے اُنھوں نے اپنی ایک تحریر میں مجھ پر طعن کیا ہے کہ "ذہانت یا ذکاوت کے فرق کو اگر محسوس کر لیا جاتا تو ذہنیت کا لفظ استعمال نہ کیا جاتا" ان کا مدعا یہ ہے کہ لفظ ذہانت، ذہنیت کے مفہوم کو ادا کرتا ہے یا یہ کہ اُن کے نزدیک ذہنیت غلط ہے۔

میں نے اس کے جواب میں اُن سے دریافت کیا کہ براہ کرم (Mentality) اور (Intellect) کے فرق سے آگاہ کیجئے اور اسی کے ساتھ ان کا ترجمہ بھی لکھ دیجئے، لیکن اس کا جواب اُنھوں نے نہیں دیا چونکہ میرے دوست غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں، اس لئے میں ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ انگریزی میں قریب قریب اسی مفہوم کے تین لفظ ہیں:- (۱) Mentality (۲) Intelligence (۳) Intellect

اور اُن کا ترجمہ اردو میں بالترتیب ان الفاظ سے کیا جاتا ہے:- "ذہنیت" "ذکاوت" "ذہانت" اگر اُن کے نزدیک لفظ ذہانت، ذہنیت کے مفہوم کو ادا کرتا ہے تو پھر انھیں (Mentality) اور (Intellect) کے ترجمہ میں کوئی تفریق اس کے علاوہ کرنی چاہئے۔

میں اپنے فاضل دوست کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ (Mentality) کا ترجمہ اہل مصر بھی ذہنیت ہی کرتے ہیں اور اب اردو کے تمام اہل قلم اسی ترجمہ پر متفق ہیں اس لئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنی ذہنیت میں تھوڑا سا تغیر پیدا کر کے طوعاً یا کرہاً اس کو تسلیم کر لیں اور زیادہ ذہانت سے کام نہ لیں۔

اپریل ۱۹۲۷ء اکاڈیمی کے شعبۂ اردو کے ممبروں میں سے علاوہ مسٹر رشید احمد صدیقی ایم، اے کے سر عبدالرؤف صاحب الہ آبادی بھی شریک نہ ہو سکے، لیکن ان کی عدم شرکت نہ غیر متوقع تھی نہ باعث افسوس وہ اس لئے کہ کچھ عرصہ سے وہ دائم المرض ہیں، اور یہ اس لئے کہ اُنھوں نے کبھی اردو ادبیات سے دلچسپی لینے کا دعویٰ اس سے قبل کبھی نہ کیا تھا، لیکن اس میں کلام نہیں کہ مولوی عبدالماجد دریا بادی کا اس میں شرکت اختیار کرنا اور نہ صرف یہ بلکہ گورنر کے استقبال کے لئے دوسرے صف بستہ ممبروں کے ساتھ مل کر کھڑا ہونا، کم از کم میرے لئے ضرور حیرتناک تھا، کیونکہ وہ اس جماعت کی ممبری کو (باوجود اس کے کہ خود ہی اُنھوں نے اس کو قبول کیا تھا) اپنی پیشانی کے لئے بدنما داغ سے تعبیر کر چکے تھے۔

جون ۱۹۲۷ء گزشتہ ماہ کے رسالہ میں، جناب آرگس کے مضمون نے، جس میں ابن یمین اور حافظ شیرازی کی

شاعری کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، بعض حلقوں میں برہمی پیدا کر دی ہے، ایسا اختلاف جس کی بنیاد صرف تحقیق حق پر ہو، یقیناً نہایت مفید چیز ہے، لیکن کم ہیں جن کا اختلاف تنقید صحیح ہوتا ہے اور زیادہ ہیں وہ جو صرف اپنے معتقدات کے نقطۂ نظر سے ہر چیز کو دیکھنا پسند کرتے ہیں چنانچہ اس مسئلہ میں بھی اکثر حضرات کی "جبین پیشانی" کا باعث محض وہ جذبۂ صنم پرستی ہے جو حافظ نہیں، بلکہ حافظ کے "بت" "بت قائم ہے" اور "بت" بھی کونسا؟ دنیائے تصوف کا، عالم "ہمہ اوست" کا اور اُس کارگاہ ظن و تاویل کا، جہاں مے و بادہ، کے معنے آب کوثر و سلسبیل، اور "ساقی" کے معنی مرشد کامل کے لئے جاتے ہیں، حالانکہ غریب بے خبر ہیں اس حقیقت سے کہ اگر حافظ کی رندانہ زبان، بادہ پرستارانہ غزل خوانی اس کی رامشگرانہ شاعری اور مذہب سے یکسر بے نیاز ذوق سخن کو اس کے حقیقی اور صحیح رنگ میں دیکھا جائے تو وہ "بت" سے زیادہ ایک غیر فانی "خدا" ہے عالم کیف و سرور اور دنیائے نغمہ و رباب کا — کہ بت کو تو ادنیٰ سی ضرب تیشہ کی توڑ سکتی ہے، لیکن خدا کی خدائی چھیننے کا خیال بھی کسی کے دل میں پیدا نہیں ہو سکتا۔

میں خود آرگس کے دلائل کو ان کے دعوے کے ثبوت کے لئے ناکافی سمجھتا ہوں، جیسا کہ میں نے اس مہینے کے باب الاستفسارات میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ظاہر کیا ہے لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے کہ کوئی صرف فلسفۂ دشنام کو پیش نظر رکھکر جواب دینے کی کوشش کرے درانحالیکہ اس تلخی کے ساتھ "لعل شکر خا" کا ادنیٰ تصور بھی شامل نہ کر سکوں!

جولائی سنہ ۱۹۲۶ء جن لوگوں کو گرمی اور بارش کا زمانہ بھوپال میں بسر کرنے کا موقع ملا ہے وہ واقف ہیں کہ یہ دونوں موسم وہاں کے کس قدر ہلکے اور پر لطف ہوتے ہیں۔ اس لئے اب جو میں بارہ سال تک ان دونوں کا لطف اٹھانے کے بعد یہاں آیا ہوں، تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ گرمی شاید خدا کا کوئی عذاب ہے جو ہر سال بندوں پر نازل ہوتا ہے اور جس سے نجات پانے کی کوئی تدبیر انسان کے پاس نہیں ہے باوجودیکہ تمام وہ ذرائع جو تمدن کی اس عہد ترقی میں تمازت آفتاب اور برہمی موسم سے بچنے کے لئے مہیا ہو سکتے ہیں مجھے حاصل ہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ گرمی خود اپنے اندر سے ابلتی ہوئی نظر آتی ہے اور حد درجہ ناکام دل کی نفس سرد بھی آہِ زباں سوز ہو کر نکلتی ہے۔ پھر جس وقت یہ خیال کرتا ہوں کہ موت و حیات کے درمیان یہ کشمکش یہاں تقریباً اکتوبر تک اسی طرح رہیگی تو دل بیٹھنے لگتا ہے اور بے اختیار دل چاہتا ہے کہ بہار آنے سے پہلے ہی دامن گریباں کے فاصلہ کو کم کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس ملک میں سال کا نصف حصّہ اس طرح بسر ہو جہاں سال میں چار مرتبہ "تداخل فصلین" آدمی کو مہینوں صاحب فراش رکھے، وہ ملک کیا خاک

ترقی کرسکتا ہے اور وہاں کے بدنصیب افراد کیا دماغی و ذہنی امتیاز حاصل کرسکتے ہیں۔ آخری کاپی لکھی جارہی تھی اور میں گرمی کے خلاف ستیاگرہ کئے ہوئے بیکار پڑا ہوا تھا کہ مولوی نور الرحمٰن بی اے (بچھرایونی) کو جو حسن اتفاق سے آج کل میرے مہمان ہیں، مجھ پر رحم آیا اور اُنھوں نے معلومات کا حصّہ مرتب کردیا۔ جب سے نگار جاری ہوا ہے، غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ ماحول سے متاثر ہوکر نگار کی ترتیب کی طرف میں نے اپنے آپ مشوش پایا ہو، یہی سبب ہے کہ میں اس مہینے باب الاستفسار کی طرف بہت کم توجہ کرسکا۔

اکتوبر ۱۹۲۷ء | لکھنؤ کا موسم ابھی تک ناخوشگوار ہے گرمی ہر چند مذبوحی حالت میں ہے لیکن رقص بسمل کی طرح ناپائدار نہیں۔ آفتاب کا طلوع و غروب ابھی تک خط استوا سے ہٹ کر جنوب کی طرف نہیں ڈھلا اس لئے زمانہ بدستور عرقناک ہے سنتے ہیں کہ ۱۵ اکتوبر کے بعد سے یہاں نمایاں تغیر پیدا ہوجائے گا۔ لیکن ایفاء عہد کے خیال کے ساتھ جینے کی تمنا بالکل غیر شاعرانہ بات ہے اس لئے میں کوشش کر رہا ہوں کہ عالم نامرادی ہی میں زندہ رہنا سیکھ جاؤں۔

نومبر ۱۹۲۷ء | معاصر خیابان نے اگسبت (اکتوبر؟) کی اشاعت میں نقطۂ نظر کے استعمال کے متعلق ایک دلچسپ تحقیقی نوٹ لکھا ہے خیابان کے فاضل مدیر کو نقطۂ نظر کی صحت میں شک تھا، اس لئے اُنھوں نے جناب طباطبائی کو حکم بناکر اس کا فیصلہ چاہا اور صاحب موصوف نے پورے یقین کے ساتھ یہ فیصلہ صادر کردیا کہ:-

> "نظر، انگریزی کے محاورہ میں نقطہ ہو تو ہو اردو کے محاورہ میں تار نظر اور مد نظر کی ترکیب اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ہماری زبان میں نظر نقطہ نہیں ہے، خط ہے یہ خیال زبان میں فلاسفہ قدما کے ایک مذہب کی رو سے پیدا ہوا کہ وہ لوگ اس کے قائل تھے کہ رویت کی حقیقت یہ ہے کہ آنکھ سے تار نظر نکل کر مرئیات پر پڑتا ہے، گو بعد میں یہ مذہب غلط ثابت ہوا مگر زبان پر جو اثر پڑ چکا تھا وہ زائل نہیں ہوسکتا.......... غرض نقطۂ نظر کہنے کی کوئی صورت ہمارے محاورہ میں نہیں ہے، ہاں نظر کی صفت نکتہ دان، نکتہ بین، نکتہ سنج آتی ہے اس اعتبار سے نکتۂ نظر کہنا درست ہے"

مجھے اس باب میں جناب طباطبائی سے سخت اختلاف ہے۔ نقطۂ نظر انگریزی کے "پوائنٹ آف ویو" (Point of View) کا ترجمہ ہے اور اس کا مفہوم وہی ہے جو ہدف نظر یا منتہائے نگاہ

کا ہو سکتا ہے۔ اس میں حقیقت رویت سے بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں اور نہ اس کا اثر اُس پر پڑ سکتا ہے۔

جب ہم کسی طرف دیکھتے ہیں تو ہماری نگاہ کسی مخصوص و متعین چیز پر پڑتی ہے۔ اسی طرح جب ہم غور و فکر یا کوئی تمنا کرتے ہیں تو کوئی مخصوص امر سامنے ہوتا ہے جس کے سمجھنے یا حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے اور اسی مخصوص و متعین چیز یا امر کو "نقطۂ نظر و خیال" یا ہدف نظر و خیال کہتے ہیں۔

جناب طبا طبائی نے شاید اس پر غور نہیں کیا کہ "نقطۂ نظر" میں نظر سے مراد نگاہ نہیں بلکہ خیال یا تمنا ہے اور اس صورت میں نظر کے نقطہ یا خط ہونے سے بحث کرنا یا خواہ مخواہ مناظر و مرایا کے ان مسائل کو اس کی تحقیق میں داخل کرنا جن کی حقیقت کی طرف سے شاید جناب طبا طبائی خود بھی مطمئن نہ ہوئے ہوں گے بالکل دور از کار بات ہے۔ اسی کے ساتھ "نکتۂ نظر" کے استعمال کو درست ظاہر کرتے ہوئے جو استدلال پیش کیا گیا ہے وہ بھی محل نظر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ نظر کی صفت چونکہ نکتہ داں یا نکتہ سنج ہوتی ہے اس لئے نکتۂ نظر کہنا چاہیئے۔

نکتہ جس زبان کا لفظ ہے اس میں اس کا مفہوم یہ ہے:-

(۱) النقطۃ السوداء فی الابیض او البیضاء فی الاسود (۲) الاثر الحاصل من نکت الارض (۳) المسٔلۃ الدقیقۃ اخوجت بدقۃ نظر و امعان فکر۔ ظاہر ہے کہ جناب طبا طبائی نے تیسرے مفہوم کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کیا ہے کیونکہ نکتہ سنجی وغیرہ اسی مفہوم سے پیدا ہے۔ لیکن فاضل حکم کی نگاہ اس طرف نہیں گئی کہ لفظ نکتہ اسم ہے اور جب تک کوئی لفظ مصدری معنے کا نظر کے ساتھ مضاف نہ ہو نکتہ سنجی وغیرہ کا مفہوم پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر بجائے نکتۂ نظر کے نکتہ سنجی نظر، دقت نظر کہیں تو بیشک درست ہو سکتا ہے۔

اب لفظ نقطہ کے مختلف محل استعمال پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ عربی میں اس کو انگریزی کے لفظ (point) کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ (Point of difference) کا ترجمہ نقطۂ اختلاف اور (weak point) کا نقطۂ الضعف زبان عربی میں رائج و مستعمل ہے۔ حالانکہ جناب طبا طبائی کی تحقیق کے مطابق اس کو بھی غلط ہونا چاہیئے کیونکہ ضعف یا اختلاف میں حقیقتاً نہ کہیں نقطہ کا وجود پایا جاتا ہے نہ خط کا میں نے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر اس لئے کیا کہ مبادا نگار کے حلقہ میں غلطی یا غلط فہمی سے نکتۂ نظر کا رواج ہو جائے۔

دسمبر ۱۹۲۷ء | اس اشاعت کے ساتھ نگار اپنی عمر کا چھٹا سال ختم کرتا ہے اور جنوری ۱۹۲۸ء کا پرچہ گویا اس کی ساتویں سالگرہ ہے۔

گزشتہ رسالوں کے تقریباً سات ہزار صفحات میں نگار کی طرف سے جو علمی و ادبی تاریخی و تنقیدی لٹریچر

پیش کیا جا چکا ہے اور استفسارات کے سلسلہ میں جس قدر متنوع مباحث آ گئے ہیں وہ اگر ایک رسالہ کے لئے مایۂ ناز نہیں ہو سکتے تو کم از کم اس کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ ایسا نا قابل افتخار سرمایہ بھی بازار کی جنس عام نہ تھا۔

ہندوستان کے رسائل "بیوفائی حیات" اور "زندگی مستعار" کے آئینہ دار ہونے میں بہت مشہور ہیں، اور اگر یہ قصور انھیں کا قرار پائے تو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس سے ابنار جنس کی عام سرد مہری کا جواز کیونکر ثابت ہو سکتا ہے۔ نگار کو ہرچند منظر اول کے مطالعہ کا فخر ابھی تک حاصل نہیں ہوا لیکن دوسرے منظر کے تلخ نقوش سے وہ بھی ناواقف نہیں ہے۔

رسم شکوہ و شکایت اس قدر فرسودہ ہو گئی ہے کہ مجھے شک ہے۔ ان الفاظ کا کوئی مفہوم کبھی تھا بھی یا نہیں اس لئے اس باب میں سکوت ہی زیبا ہے، گزشتہ دس سال کے اندر جو ذہنی انقلاب ملک میں ہوا ہے وہ اس قدر عجیب و غریب اور اسدرجہ امید افزا ہے کہ مشکل سے کوئی توقع اس سے زیادہ قائم کی جا سکتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی کم متحیر کرنے والی نہیں ہے کہ مطالبات دماغ کے ساتھ ساتھ دل میں بہت کم کشائش نظر آتی ہے، اور وہ جو ایک مذموم عادت "گدائی کے ذریعہ سے تکمیل آرزو" کی پڑ چکی ہے، اس میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا۔

میں اس کے مقابلہ میں فریق مقابل کی کامیابیوں کا ذکر نہ کروں گا کہ اس مرثیہ کا یہی بند سب سے زیادہ غیر فصیح ہے، بہرحال گزشتہ سال کے تجربات جو کچھ بھی ہوں، کم از کم یہ ضرور کہوں گا کہ نگار کی قدر دانی نہ صرف اس کو زندہ رہنے کی حد تک کی گئی بلکہ اگر میں چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ یہ زندگی "نامردانہ زیست" نہ تھی اس لئے ہر نئے سال کا طلوع میرے لئے ایک دنیائے امید ساتھ لاتا ہے اور میں ایک ایک جدید کارگاہ قائم کر کے اسیر کار بند ہونا چاہتا ہوں، لیکن افسوس یہ ہے کہ اس باب میں بقدر شوق و ولولہ، کامیابی بہت کم ہوتی ہے، یہاں تک کہ اسی الجھن میں وہ سال گزر جاتا ہے اور میں منزل کے پہلے ہی حصہ میں اپنے آپ کو پاتا ہوں۔

خدا کرے ۱۹۳۰ء زیادہ مبارک ثابت ہو اور میں بھی نگار کو ان تمام آرزوں کی تکمیل کی تصویر بنا کر پیش کر سکوں جو آغاز کار کی ابتدا سے میرے دل و دماغ میں موجزن ہیں۔

وافوض امری الی اللہ

مارچ ۱۹۲۹ء | ایک ترکی شاعر اپنی محبوبہ کے پاس اپنی تصویر بھیجتا ہے اور اس پر ایک شعر لکھتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ تو مجھے دیکھے بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میری چشم حیراں تجھے دیکھا کرے"

غالب کا شعر ہے :-

تا چہا آئینۂ حسرت دیدار تو ام
جلوہ برخود کن و ما را بہ نگاہے دریاب

بہرحال میں اپنی تصویر پیش کرتے وقت نہ یہ دیکھ سکتا ہوں نہ وہ بلکہ دنیائے شاعری سے بالکل علحدہ ہو کر مجھے نہایت سادگی کے ساتھ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس تصویر کی اشاعت سے اگر ایک طرف بعض احباب کے حکم کی تعمیل مقصود ہے تو دوسری طرف یہ خیال بھی ہے کہ آپ جس شخص کی سیرت کا مطالعہ بوساطت اسکے آرا و افکار کے سات سال سے کرتے چلے آرہے ہیں اگر آپ اس کی صورت کو بھی ایک مرتبہ دیکھ لیں تو کیا حرج ہے۔

ممکن ہے بعض حضرات اُس ذہنی تصویر کے لحاظ سے جو انھوں نے قائم کی ہوگی مجھے بہت مختلف پائیں، لیکن اب میں کہ میں خود آپ کے مواجہہ میں حاضر ہوں، سابق تصور و قیاس کے نتائج کو محو کر ڈالئے اور اب پھر غور کرکے فیصلہ کیجئے کہ آپ کسی ایسے شخص سے تو معاملہ نہیں کر رہے ہیں جس کے ظاہر و باطن دونوں بالکل یکساں ہیں ——— آپ اپنی جگہ جو جی چاہئے فیصلہ کریں، لیکن اگر میرے سامنے یہ تصویر پیش کی جاتی تو میں صاحب تصویر کی سیرت کے متعلق اول نگاہ میں فیصلہ کر دیتا کہ

"گو زشت روست اما طبع جمیل دارد"

اس سے قبل متعدد رسائل میں میری تصویریں شائع ہو چکی ہیں، لیکن وہ سب فن کے لحاظ سے اس قدر ناقص ہیں کہ ان کے دیکھنے کے بعد میرے متعلق کوئی صحیح حکم نہیں لگایا جا سکتا، کہیں موقف و محل نے میری صحیح فطرت پر پردہ ڈال دیا ہے اور کسی میں نور و ظل کی عدم مناسبت نے وہ بات پیدا کر دی ہے۔ جو حقیقتاً مجھ میں نہیں ہے۔ بہرحال اس وقت جو تصویر پیش کی جا رہی ہے وہ میری تازہ ترین شبیہ ہے جس میں بطون کے چھپانے کی مطلق کوشش نہیں کی گئی۔ اس لئے میں ذمہ دار نہ ہوں گا۔ اگر آپ میرے متعلق یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئے کہ

"ہے دلی پوشیدہ اور کافر کھلا"

اپریل ۱۹۲۸ء ترقیاں دو قسم کی ہیں، ظاہری و معنوی، جنھیں زیادہ اصطلاحی صورت میں مادی و روحانی کہہ سکتے ہیں۔ ظاہری ترقی کا معیار یہ ہے کہ دولت وافر ہو اسباب راحت فراواں ہوں، اور سامان عیش و تنعم کثیر۔ معنوی ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ قلب پُرسکون ہو دماغ مطمئن ہو اور روح بے نیاز و مستغنی۔ ہر چند دونوں کا اجتماع محال

نہیں، لیکن کمیاب ضرور ہے۔ اس لئے جو لوگ زیادہ سنجیدہ اور متین ہیں، وہ ہمیشہ روح کو جسم پر ترجیح دیتے ہیں اور دیبا و حریر کی نرمی سے زیادہ خشونت گلیم کو پسند کرتے ہیں۔ یہ ہے فلسفہ اخلاقین کا اور غالباً بڑی حد تک درست ہے۔ اڈیسن اور فورڈ کا مسلک اس سے بالکل جدا ہے ان کے ہاں مادی ترقی بھی روحانی ترقی کی طرح لامحدود شے ہے اور ان کا قول ہے کہ دولت کی فراوانی، ہیئت اجتماعی کا استحکام ہے اور یہی وہ مقصد اصلی فطرت کا ہے جسے نہ مسیح کا درس رہبانیت پورا کر سکا، نہ چنگیز و سکندر کی خون آشام تلوار ــــــ یہ نظریہ بھی بہت خوشنما اور قرین عقل معلوم ہوتا ہے مگر دنیا میں ایک جماعت اور بھی ہے جو نہ اس فلسفہ کی لذت آشنا ہے، نہ اس نظریہ کی یعنی نہ اس غریب کے پاس دولت ہے نہ رہبانیت، نہ اسباب راحت روح ہیں نہ سامان عشرت جسم پھر لطف یہ ہے کہ وہ زندہ بھی رہنا چاہتی ہے اور لطف و آسائش کے ساتھ !!

مارا ہنوز عربدہ با خویشتن بست

....

مئی سنہ ۱۹۲۸ء | وقت و موسم کی قوت مسلم ہے اور تمام عالم خلق کا تغیر بڑی حد تک اسی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے، انسان کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح اس کے مضر و مکلف اثرات کا مقابلہ کرے، اور چونکہ فطرت کے ساتھ اس کی یہ جنگ ابتدار کائنات سے چلی آرہی ہے اس لئے اس قدر کہنہ مشقی کا فائدہ صرف یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی وہ بقدر جز حیات کامیاب بھی ہو جاتا ہے، لیکن اکثر نہیں۔ مدعا یہ ہے کہ لکھنؤ کا آتشبار موسم شروع ہو گیا ہے اور اب "دل راحت طلب" کو اکثر استاد وزیر کا یہ مصرع یاد آتا رہتا ہے کہ :-

زمین کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر

جون سنہ ۱۹۲۸ء | گزشتہ ماہ کے رسالہ میں مدیر سچ (جناب عبدالماجد صاحب دریابادی) کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا[۱] اس پر آخر کار اخبار سچ مورخہ ۱۸ رمئی سنہ ۱۹۲۸ء میں ۲½ کالم کا ایک نوٹ شایع ہو ہی گیا۔ ہر چند کہ ادھر جناب

---

[۱] وہ مضمون حسب ذیل ہے:-

نصر اللہ بلڈانوی عبدالماجد دریابادی اور نیاز فتحپوری

جناب نصر اللہ صاحب بی اے، بلڈانہ (صوبہ برار) کے کوئی بزرگ ہیں، جنھوں نے ہمارے محترم و فاضل دوست مولوی عبدالماجد دریابادی مدیر سچ) کے نام ایک تحریر روانہ کی جو ۲۰ راپریل سنہ ۱۹۲۸ء (ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۹ میں)

عبدالماجد صاحب "رسالہ نگار کی زیارت سے علی العموم محروم رہتے ہیں" اور ادھر ہیں "اخبار سچ کی زیارت سے"

(ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۸) کے سچ میں مع جواب کے شایع کی گئی ہے۔ بلڈانوی صاحب کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے :-

"جولائی ۱۹۲۶ء کے نگار میں دریافت کیا گیا تھا کہ خضر واقعی کوئی ہستی ہے یا یونہی کسی فرضی شخصیت کو تصور کر لیا گیا ہے، اس کا جواب نیاز صاحب فتحپوری ایڈیٹر نگار نے یہ دیا کہ خضر نہ کوئی بزرگ ہیں، نہ ہوئے تھے، نہ ہونگے یہ سب یہودیوں کے من گھڑت قصے ہیں جو اسلام میں خدا معلوم کس طرح رہ گئے"۔

اس کے بعد بلڈانوی صاحب حد درجہ بےچینی و اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "میں نے متعدد بار نیاز صاحب سے دریافت کیا مگر انھوں نے کوئی جواب نہ دیا اس لئے میری دلی خواہش ہے کہ آپ (یعنی مولوی عبدالماجد) جیسے حمید عالم کی رائے اس بارے میں معلوم کر دوں تاکہ جن الجھنوں میں مبتلا ہوں، وہ دور ہو جائیں"۔

اس استفسار کا جواب بھی اجمال و تفصیل کے بین بین مولوی عبدالماجد صاحب نے تحریر فرمایا ہے جو سوائے حصۂ تمہید کے جس سے مجھے سخت اختلاف ہے اور جس کی اظہار کے لئے میں نے قلم اُٹھایا ہے نہایت معقول و پسندیدہ ہے قبل اس کے کہ میں اصل مقصود پر آؤں، یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ بلڈانوی صاحب کی اول تو کوئی تحریر میرے پاس نہیں آئی اور اگر آئی بھی ہوتی تو میں اس کا کیا جواب دیتا جبکہ اس سے قبل ہی اپنی رائے وجود خضر کے متعلق بالتفصیل جولائی ۱۹۲۶ء (نہ کہ جولائی ۱۹۲۷ء) کے نگار میں ظاہر کر چکا تھا۔

بلڈانوی صاحب نے ایک اور غلط الزام میرے سر یہ لگایا ہے کہ "نیاز صاحب نے یہ جواب دیا کہ خضر نہ کوئی بزرگ ہیں نہ ہوسکتے، نہ ہوں گے۔ یہ سب یہود کے من گھڑت قصے ہیں جو اسلام میں خدا معلوم کس طرح مشہور ہو گئے"۔

حالانکہ میں نے جو کچھ جولائی ۱۹۲۶ء کے نگار میں اس مسئلہ کے متعلق لکھا تھا وہ صرف ان مطالب پر حاوی تھا کہ :-

"خضر کے متعلق جو روایات عوام میں مشہور ہیں وہ قابل وثوق نہیں ہیں اور جن احادیث سے استدلال کیا جاتا ہے وہ ساقط الاعتبار ہیں، حضرت موسیٰ کی ملاقات اُن کے سفر مدین کے وقت ضرور ایک ایسے انسان سے ہوئی جو اس نوع کا جاننے والا تھا اور جس نے موسیٰ کی رہبری کی، لیکن یہ ایک واقعہ تھا جو اسی وقت ختم ہو گیا اور نہ اب اُس شخص کا وجود باقی ہے اور نہ وہ صحرا نوردوں کی دستگیری پر مامور

(ملاحظہ ہو فٹ نوٹ صفحہ ۳۰)

علی الخصوص محروم رہتا ہوں" لیکن پھر بھی رسالہ نگار کو اُنھوں نے اور سچ کو میں نے دیکھا اور اس طرح

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۹) اگر سبز پوش ہونے یا اسی طرح کسی اور ظاہری سبب کی بنا پر اسکو خضر کہا جاتا ہو تو یہ اس کا اصلی نام نہیں ہوسکتا، لیکن اگر اس نام کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اور تمام خلاف عقل باتوں کا ظہور اس سے منسوب نہ کیا جائے"۔

میں نے نہ صرف اس قدر بلکہ یہ بھی لکھا تھا کہ ہر چند خضر کی نبوت میں اختلاف ہے، لیکن اگر اُن کو نبی مان لیا جائے تو بھی کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔

یقین ہے کہ میرے اس بیان سے یہ امر واضح ہو گیا ہوگا کہ میں نے خضر کے متعلق کیا لکھا تھا اور نصر اللہ صاحب نے کس قدر غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ اب میں اس کے بعد مولوی عبد الماجد صاحب کے جواب کے اُس حصہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں جس سے مجھے اختلاف ہے اور ہر چند اس کا تعلق مسئلہ وجود خضر سے تو نہیں ہے لیکن اس لحاظ سے کہ وہ نہایت ہی مہلک اصول استبداد کی حمایت میں لکھا گیا ہے اس کی مخالفت ضروری خیال کرتا ہوں۔

مدیر سچ نے اپنے جواب کی ابتدا یوں شروع کی ہے:-

"مکتوب بالا میں جس رسالہ نگار کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ میری نظر سے نہیں گزرتا، اسلئے نہیں کہہ سکتا ہوں کہ اس میں کیا لکھا گیا اور کیا دلائل پیش کئے گئے ہیں، لیکن رسالہ مذکور کی "جدت و اجتہاد" کی پہلی مثال میرے علم میں نہیں آئی ہے مسائل دین میں اس کی "تحقیق و اجتہاد" سے متعلق بیشتر بھی بعض مراسلے دفتر سچ میں موصول ہو چکے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر اس باب میں کچھ قصور جواب دینے والے کا ہے تو سوال کرنے والا بھی اس سے کم مجرم نہیں ——— آپ کا کوئی عزیز قریب اگر خدانخواستہ علیل ہے اور آپ .... بجائے کسی طبیب حاذق کے مطب کی جانب رُخ کرنے کے شہر کے ایک کامیاب وکیل کے دفتر میں قدم رکھتے ہیں .... اور وہ بیدرد وکیل صاحب بجائے آپ کو کسی طبیب کے پاس جانے کی ہدایت کرنے کے اگر خود اپنی اٹکل اور ذہانت سے بعض دواؤں کے نام سنا دیں اور وہ نسخہ بے اثر یا مضر ثابت ہو تو اس افسوس ناک نتیجہ میں خطا تنہا ان وکیل صاحب ہی کی ہوگی یا کچھ ذمہ داری آپ پر بھی عائد ہوتی ہے، پھر یہ کیا قیامت ہے کہ جوش و ولولہ تو آپ کو مسائل دین کی تحقیق کا ہوتا ہے اور رجوع (بقیہ نوٹ صفحہ ۳۱)

بحمد اللہ آخر کار "کفر و اسلام" کا تصادم ہو ہی گیا۔
حوریاں رقص کناں ساغرِ شکرانہ زدند

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۰)

آپ "ادب لطیف" اور "افسانہ نگاری" کے "رئیس التحریر" سے کہنے لگتے ہیں ——

اس سے بڑھ کر ستم ظریفی یہ ہے کہ مدیر سچ کو بکمال فیاضی جید عالم کی سند عطا فرما کر اس سے اپنی تشفی چاہی جاتی ہے، اگر میرا نام کسی اعتبار سے اور کسی معنی میں بھی جید عالموں میں ہو سکتا ہے تو عامی اور سائل دینیات جاہل کا اطلاق ہندوستان بھر میں شاید کسی پر بھی نہ ہو سکے، اس قحط الرجال میں بھی خدا کے فضل سے دہلی، یوپی، بہار، حیدرآباد، ہندوستان کا کوئی ٹکڑا مستند و جید علماء سے خالی نہیں ہے، حیرت ہے کہ آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کو چھوڑ کر روشنی کی طلب ریگ کے ذروں سے کی جاتی ہے ....

....

بہرحال اگر تشفی و تحقیق مدنظر ہے تو کسی مستند عالم دین ہی کی جانب رجوع کرنا چاہئے البتہ اگر ایک عامی کی سطحی واقفیت و معلومات ہی کا امتحان لینا مقصود ہو تو عرض ہے کہ :- (اس کے بعد اصل جواب شروع ہو جاتا ہے)

میں اس تمہید کے ان اجزاء سے بحث نہیں کروں گا جن میں مدیر سچ نے اپنے آپ کو از راہ عجز و انکسار یا بر بنائے رسم و رواج ایک ناواقف، عامی شخص ظاہر کرتے ہوئے سائل کو اول اول کسی "مستند عالم دین" کی جانب رجوع کرنے کی ہدایت کی ہے اور پھر اس خیال سے کہ کہیں ان کی معلومات کا امتحان لیا جانا مقصود نہ ہو، ایک عالمانہ جواب دینے کی بھی سعی فرمائی ہے، کیونکہ کبھی کبھی میں نے اس سے زیادہ زور دار الفاظ میں اپنی بے مائیگی و کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے سوالات کا جواب دیا ہے، اور ہر وہ شخص جو نفسیاتی اصول سے واقف ہے، اس نوع کے فقروں کا استعمال کیا کرتا ہے، حالانکہ ان کا مفہوم وہ نہیں ہوتا، جو الفاظ سے متبادر ہوتا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ اگر میں نے وکیل ہو کر طبیب کی خدمت انجام دیں اور ادب لطیف و افسانہ نگاری کا رئیس التحریر ہو کر تحقیق مسائل دین کی ناروا جسارت کی تھی، تو بالکل وہی الزام بلکہ اس سے زیادہ مولوی عبدالماجد صاحب پر عاید ہوتا ہے، کیونکہ انھوں نے عامی و جاہل ہونے کا اعتراف کرنے کے بعد عالمانہ رنگ کا جواب دینے کی سعی فرمائی اور میں نے جواب دینے سے قبل "غرور نما عجز" کی صورت سے بھی اپنے جہل و عدم علم کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اگر مدیر سچ خود بغیر کوئی جواب دئے ہوئے سائل کو ان علماء کی طرف (جن کو وہ جواب دینے کا

فاضل مدیر نے جس لطف کے ساتھ میرے کفر و الحاد، میری ضلالت و گمراہی کا ذکر فرمایا ہے، اس کی داد اس دنیا میں تو انھیں مل نہیں سکتی۔ عاقبت کی خبر خدا جانے صاحب موصوف نے "کنایتہً" اس سے بھی انکار کیا ہے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۱) اہل سمجھتے ہیں) رہنمائی کرکے خاموش ہو جاتے تو بیشک ان کا مجھے ملامت کرنا جائز ہو سکتا تھا، لیکن جب خود انھوں نے وہی طرز عمل اختیار کیا جو میرے حق میں انھیں قابل اعتراض نظر آتا ہے تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ "منکر مے بودن و ہمرنگ مستان زیستن" کیا معنے رکھتا ہے۔ سوائے اس کے کہ مدیر سچ کا مقصود یہ ہو کہ کسی مسئلہ دینی میں رائے دینے کا حق بہ نسبت مدیر نگار کے ان کو زیادہ حاصل ہے۔ کیونکہ ادھر خلافت کمیٹی کا صدر ہونے کی حیثیت سے انھیں قدرت کی طرف سے مسائل دینی کے سمجھنے کی بھی سند مل چکی ہے، اور "ادب لطیف اور فسانہ نگاری" کا ذوق رکھنے والے شخص کے حق میں "صم بکم عمی فہم لایفقہون" کی نص قطعی موجود ہی ہے۔

اگر عالم دین ہونے کے لئے ریش دراز و بروت کوتاہ کی شرط ضروری ہے اگر مسائل مذہب سمجھنے کے لئے طویل جبہ و شملہ ناگزیر ہے، اگر تفقہ فی الدین کا حق اتنا ہی زیادہ ایک شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جتنا زیادہ "عبوسا قمطریرا" ہو، تو مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ان میں سے کسی شرط کا حامل نہیں ہوں اور مجھ سے زیادہ ناواقف دین بلکہ جاہل اور کوئی نہیں ہو سکتا، لیکن اگر قرآن میں "تفکر و تدبر" کا حکم عام ہے جس میں عرب و عجم، شرق و غرب، وضع و صورت کی کوئی تخصیص نہیں ہے، تو پھر مدیر سچ معاف فرمائیں، اگر میں یہ کہوں کہ دن کو دن اور رات کو رات سمجھنے کی اہلیت مجھ میں بھی انھیں کی طرح موجود ہے، البتہ اگر فرق ہے تو صرف یہ کہ میں نے اپنی صورت بگاڑ کر اپنے آپ کو مولانا کہلوانا پسند نہیں کیا، حالانکہ یہ بھی چنداں دشوار نہ تھا جبکہ ہر مسجد کا موذن و امام باوجود انتہائی جہل کے نہایت آسانی سے مولانا بنجاتا ہے۔

اب رہا سوال اس ظاہری و کتابی علم کا جو ممکن ہے کہ مدیر سچ کے نزدیک کوئی بڑی اہمیت رکھتا ہو، سو اس لحاظ سے بھی مدیر نگار ایک سے زائد اسناد اپنے پاس رکھتا ہے، اور جن کتابوں کے سمجھنے کی اہلیت مولانا عبدالماجد دریابادی یا ہند کے اور کسی "علام اللوذعی" میں پائی جا سکتی ہے، اُن کو بحمد اللہ مسٹر نیاز فتحپوری بھی سمجھ سکتے ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ وہ متقدمین کو خدا اور ان کی کتابوں کو صحائف آسمانی سمجھتے ہیں اور یہ اُن کو ایک انسان ------ سمجھکر اُن کی تحقیق کو "آخری لفظ" قرار نہیں دیتا۔ اُن کا اعتقاد ہے کہ انسان کی بہترین صفت تقلید و اتباع ہے اور اسکا مسلک یہ ہے کہ دیگر حیوانات سے انسان کو ممتاز بنانے والی صفت صرف اس کی قوت اجتہاد و ابداع ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نام ہے ابوحنیفہ یا مالک و حنبل کی تحقیقات پر آنکھ بند کرکے عمل کرنے کا اور اس کے نزدیک وہ شخص مسلمان ہی نہیں جس نے خود اپنے اندر کوئی اجتہادی قوت فکر پیدا نہیں کی، ان کا اعتقاد یہ ہے کہ انسان کی پیدا وار صرف رازی و شبلی کے وقت تک ہو کر بند ہوگئی اور اس کا خیال یہ ہے کہ خلیفۃ اللہ فی الارض پیدا

کہ وہ خواجہ حسن نظامی کے مضمون فرام قبلہ ٹو شملہ سے متاثر ہوئے ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو کیونکہ میں نے بھی محض سماعت

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۲) ہونے کی استعداد جس قدر اب پائی جاتی ہے پہلے نہیں تھی' وہ ہیں کہ اسلام کی جستجو صرف بخاری و مسلم میں کرنی چاہتے ہیں کیونکہ انکے نزدیک قرآن کا سمجھنا انھیں کتابوں کے سمجھنے پر منحصر ہے اور یہ معتقد ہے کہ قرآن کا علم صرف قرآن ہی سے حاصل ہوسکتا ہے اور اس کے سمجھنے کا ہر وہ شخص مدعی ہوسکتا ہے جو غور و فکر سے کام لے اگر مذہب کی اہلیت اجتماعی انفرادی یقین سے مرتب ہوتی ہے' یعنی اگر مذہب کی صحیح بنیاد انفرادی اعتقاد پر قائم ہوتی ہے' تو دنیا کا بڑے سے بڑا انسان بھی یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ کسی کو اپنے مزعومات کے تسلیم کرنے پر مجبور کرے - لا اکراہ فی الدین سے مقصود یہی نہیں کہ مذہب کے باب میں تیغ و تفنگ کا استعمال ناجائز قرار دیا جائے بلکہ اس سے مدعا یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے کسی خاص اعتقاد و یقین پر قائم رہنے کے بعد ہی اس منزل تک پہونچ سکتا ہے - جو فطری دین کا مقصود ہے' تو کسی کو تعرض حق حاصل نہیں ہے -

جہاں تک خالص تحقیق و تفتیش کا تعلق ہے' جس حد تک ایمان و اعتقاد کے تحفظ کے لئے جستجوئے انسانی وسیع ہوسکتی ہے اس حد تک نہ بخاری و مسلم کی تحقیق سند ہوسکتی ہے اور نہ بیہقی و رازی کے مسائل سنداً پیش کئے جاسکتے ہیں ہر شخص کا ایمان یعنی اس کے قلب کا سکون بالکل جدا چیز ہے اور وہ اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب خود ہی اس کے قلب کے اندر یہ کیفیت مطمئنہ پیدا ہو جائے - پھر بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ بڑے بڑے حکما و عقلا کے اقوال و نصائح' براہین و دلائل یہ کیفیت پیدا نہ کرسکے اور دفعتہً حالت میں تغیر پیدا ہوگیا - ایک ایسی چیز سے جو حقیقت کے لحاظ سے لاشئ محض تھی - میں نے سنا ہے کہ خود عبدالماجد صاحب دریابادی کو جس چیز نے فلسفہ کی گمراہی سے ہٹایا وہ خواجہ حسن نظامی کا ایک مضمون "فرام قبلہ ٹو شملہ" تھا -

اس لئے آج کل میرے نزدیک کسی شخص کو تلقین ایمان کرنے کے لئے یا اس کے اخلاق درست کرنے کے لئے متقدمین کے دلائل کا دفتر بے پایاں لیکر بیٹھ جانا' یا خلاف عقل باتوں کو صرف اس لئے باور کرنا کہ حدیث میں ایسا آیا ہے یا فلاں بزرگ نے اس طرح لکھا ہے" ایک ایسی بے معنی صورت رشد و ہدایت کی ہے کہ میرے نزدیک اس سے زیادہ تباہ کن چیز اسلام کے لئے کوئی اور نہیں ہوسکتی - اور حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ عقلی بے برگ و باریاں اور ذہنی بے مایگیاں' اسی طریق کار کی غارتگری کا نتیجہ ہیں' اسلام ہو یا کوئی اور خدائی مذہب اس کی صداقت کی بہترین دلیل یہ نہیں ہے کہ اس کے مسائل و تعلیمات کو شجر ممنوع قرار دیدیا جائے اور ایک مفکر و مدبر کو یہ کہکر رد کردیا جائے کہ ہر شخص کی عقل اس کے کنہ تک نہیں پہونچ سکتی' کیونکہ اس صورت میں اس کے معنے یہ ہوں گے کہ مذہب اسلام صرف متقدمین کیلئے تھا اور انھیں کی عقل کو معیار قرار دیکر اس کے

کی بنا پر لکھا تھا، لیکن اگر ایسا ہو بھی تو بظاہر کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ فلسفی شاہ کا لقب بھی بہرحال انکو

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۳) مسائل منضبط کئے گئے ہیں یا پھر یہ مراد ہوگی کہ اب ساری دنیا بیوقوفوں سے بھر گئی ہے اور کسی دماغ میں یہ اہلیت باقی نہیں کہ حق و باطل میں تمیز کر سکے۔

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ مدیر سچ یا اور کوئی مدعی علم و فضل اگر کسی حدیث یا آیت قرانی کو استدلالاً پیش کرکے اس کا مفہوم لوگوں کو بتائے تو اس میں چون و چرا کی گنجائش نہ ہو، لیکن نیاز فتحپوری اگر دعویٰ کرے کہ وہ بھی انھیں کی طرح سمجھنے اور سمجھانے کی قوت رکھتا ہے تو اس پر مضحکہ اڑایا جائے محض اس لئے کہ ایک نے وعظ و تلقین کا پیشہ اختیار کر لیا ہے اور دوسرا اس قسم کی تجارت کو پسند نہیں کرتا۔

مدیر سچ کو معلوم ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کا قرآن ہندوؤں کا وید نہیں ہے جس کا سمجھنا صرف پنڈتوں ہی کے لئے مخصوص ہے اور دوسرے لوگ اسے چھو بھی نہیں سکتے ـــ اس پر غور کرنے کی دعوت ہر کہ ومہ کو دی گئی ہے اور ہر وہ شخص جو زیادہ تفکر و تدبر کر سکتا ہے۔ خواہ وہ کسی زمانہ میں ہو قرآن کے سمجھنے کا اہل ہے پھر اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کر دینا چاہئے کہ عقول انسانی کے لئے یہ زمانہ ایسی زبردست ترقی کا آیا ہے کہ اب منقولات کی سپر اس کے مقابلہ میں کام نہیں دے سکتی۔ اور حفاظت کی صورت اگر کوئی ہے تو صرف معقولات لیکن معقولات بھی صدرہ، شمس بازغہ، شرح چغمنی اور ہدیۂ سعیدیہ کے قسم کے نہیں جن میں سوائے مغالطات کے اور کچھ نہیں ہے بلکہ وہ جو فطرت نے ہر صحیح دماغ انسانی میں ودیعت کئے ہیں اور جن کے استعمال کا ہر شخص کو فطری حق حاصل ہے۔ اسلام کو اگر آپ فطری مذہب سمجھتے ہیں تو اصول فطرت ہی کے مطابق اس کو سمجھنے دیجئے اور غیر متعلق باتوں کو اس میں شامل کرکے مذہب کی سادگی کو تباہ نہ کیجئے۔ اگر ایک شخص کلام مجید کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ حضرت عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا نہیں ہوئے خضر کی زندگی دوام لایعنی سی بات ہے۔ موسیٰ کا ید بیضا صرف ایک تعبیر کامیابی ہے، یونس کا دہان ماہی کے اندر چلا جانا خلاف حقیقت ہے، یوسف کا معجزۂ حسن جمال صرف ایک افسانہ ہے، تو کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ اُسے دائرہ اسلام سے خارج کر دے، کیونکہ وہ قرآن کی صحت کا منکر نہیں ہے، بلکہ قرآن پر غور کرنیکے بعد ان نتائج تک پہونچا ہے اور اسی صورت سے وہ قرآن کو الہامی کتاب مان سکتا ہے ـ اگر آپ نے اس پر یہ الزام لگایا کہ وہ قرآن نہیں سمجھتا تو وہ بھی آپ پر یہی الزام قائم کر سکتا ہے اس کے بعد آپ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ اپنی حمایت میں ایک پشتارہ متقدمین کی کتابوں کا اس کے سر پر دے ماریں لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ان سب کو ناقابل اعتبار کہدے گا یا پھر سرے سے قرآن ہی کی اہمیت و صداقت کا منکر ہو جائے گا۔

اسی دربار سے ملا صاحب سے خاموشی سے قبول کر لیا گیا۔

(ملاحظہ ہو بقیہ نوٹ ۳۴) ہر ترقی کرنے والے مذہب کی جان وسعت نظر و خیال ہے، یعنی جب تک اس کی آغوش وسیع نہ ہوگی ترقی ممکن نہیں۔ اور اس کے آغوش کی وسعت یہی ہے کہ شروط مذہب کو آسان اور پابندیوں کو کم کیا جائے، نام و مقام وضع و لباس، معاشرت و معیشت وغیرہ سب سے بے نیاز ہو کر اسلام کے دائرہ کو وسیع کرنا چاہئے یہاں تک کہ گنگا دہر، جوزف، شاپوجی، اور مزمدار اپنے اصلی ناموں اور اپنے خاندانی وضع لباس، حالت و صورت کے ساتھ بھی مسلمان شمار کئے جائیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا اور آخر کار یہ تنگ نظری ناقوس و اذان کی نزع تک پہونچ جاتی ہے حالانکہ ایک مسلمان کے نزدیک مندر کے ناقوس، کلیسا کے گھنٹے کو بھی ویسا ہی عزیز ہونا چاہئے جیسا وہ اذان کو سمجھتا ہے، بلکہ اگر ضرورت ہو تو خود ناقوس پھونکنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہئے، جب اذان و ناقوس کا مقصود بالکل ایک ہے جب ان دونوں سے مراد نمازیوں، یا پجاریوں کو نماز یا پوجا کے لئے بلانا ہے تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ نزع و مجادلہ کیسا؟ کیا اگر کسی منزل پر پہونچنے کے لئے متعدد راستے گئے ہیں تو ان راستوں کے چلنے والوں کو باہم لڑنا چاہئے، کیا ہر ایک کو اپنی منزل صرف اس جھگڑے میں کھوئی کرنا چاہئے کہ "ہمارا راستہ صحیح ہے اور تمھارا غلط"

مسلمانوں میں اس تنگ نظری پیدا کرنے کی ذمہ داری خواہ وہ ہند میں ہوں یا بیرون ہند، صرف گروہ علماء پر عاید ہوتی ہے اور مذہب و قوم کی جملہ خرابیوں کا سرچشمہ انھیں کے جامد اور خود غرض دماغ سے تعلق رکھتا ہے اس جماعت کے اکثر افراد اپنے علم کے لحاظ سے اس قدر جاہل مذہب کی حیثیت سے اس درجہ نامسلمان اور اخلاق کے لحاظ سے اتنے منافق ہوتے ہیں کہ اگر اسلام کا معیار صرف اُن کی ذات کو قرار دیا جائے تو پھر معیار کفر و نامسلمانی قائم کرنے کیلئے کسی اور کے ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ بہشت و دوزخ کی کنجیاں اُن کے ہاتھ میں ہیں کسی کو مسلمان قائم رکھنا یا کافر بنا دینا ان کے اقتدار میں ہے، مذہب اسلام ایک راز ہے جس کے امین صرف وہی ہیں اور دنیا اسلام کا فرض ہے کہ اُن کے مواعظ کے سامنے خواہ وہ کتنی ہی دور از عقل باتوں سے کیوں نہ لبریز ہوں سربجود ہو جائے کیا اس دور جمہوریت و آزادی میں اس عہد حریت فکر و رائے میں بھی مدیر سچ اس استبداد کے قائم رکھنے میں کامیاب ہو سکیں گے کہ وہ تو ایک امر پر اظہار رائے کریں اور میرا منہ بند کریں شاید یہ اثر ہے اس ہلکی سی مولویت کا جو جمعیۃ العلماء کے ممبر ہونے کی حیثیت سے اُن کو حاصل ہو گئی ہے۔ بہر حال وہ اپنی جگہ اپنے آپ کو کچھ ہی سمجھیں اور مذہب کا مخصوص یونیفارم رکھنے والوں کے متعلق وہ کیسی ہی رائے کیوں نہ رکھتے ہوں، لیکن کم از کم میں ان بتوں کی پرستش کے لئے طیار نہیں۔ اور میرا ایمان و یقین ہے کہ جب تک پوری قوت کے ساتھ ان کو مسمار نہ کیا جائے گا اسوقت تک کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی ۔ افغانستان و ترکی کی ترقی کی تاریخ اسی وقت سے شروع ہوتی ہے جب اس جماعت کے

جولائی ۱۹۲۶ء | اس مہینہ کی اشاعت سے چودھویں جلد کا آغاز ہوتا ہے اور جس وقت اپنی بے سروسامانی کم مائگی اور ناکسی پر نگاہ کرتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیا قوت تھی جس نے باوجود اسباب کی ہر ممکن ناسازگاری کے مجھے اپنے عزم پر ثابت قدم رکھا اور نگار کو اس منزل تک پہونچا دیا کہ اب میں اپنے سے بہتر قائدین کی ضرورت اس کے لئے محسوس کر رہا ہوں، سچ ہے -

ہر رشحہ باندازۂ ہر حوصلہ ریزند
میخانۂ توفیق خم و جام ندارد

میں نگار کو جس سطح تک لانا چاہتا ہوں وہ اس سے بہت بلند ہے جو اس وقت نظر آ رہی ہے اور میں معترف ہوں کہ حوادث و موانع کا مقابلہ کرنے میں اس حد تک کامیاب نہیں ہوا کہ آج عملاً اپنے نصب العین کو آپ کے سامنے پیش کر سکتا، لیکن اس کا ضرور قائل ہوں کہ انسان کی ہر تمنا اگر دل کی خلش ہو کر رہجائے تو اک "مستقل حاصل" ہے اور غالباً مبالغہ نہ ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ

بر ہیں یک آرزو بر بستہ ام تعمیر دل

بہرحال مجھے یقین ہے اور آپ بھی یقین کیجئے کہ ایک دن وہ ساعت آئے گی جب میں حقیقی منزل میں قدم رکھتے ہوئے کہہ سکوں گا کہ

شگفتن گل امید را تماشہ کن

سنگین بت کے سامنے سر عجز خم کر دینا، آفتاب کو دیکھکر اس کے سامنے جھک جانا، آگ کے حضور میں اپنی بیچارگی کا اظہار کرنا، حرم کا طواف، سنگ اسود کا استلام، ان میں سے کوئی بات داخل شرک نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنے والے سمجھتے ہیں کہ خدائی طاقت ان میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے، بلکہ یہ ذرایع ہیں خیال میں مرکزیت اور تصور میں اشتداد پیدا کرنے کے، شرک فی الحقیقت نام ہے انسان کو انسان کے پوجنے کا سر نیاز جھکا دینے کا اس تقدم شخصی کے سامنے جو دوسرے انسان سے اس کی خصوصیات انسانی تو چھین سکتا ہے لیکن عطا کچھ نہیں کرتا، پھر غور کرو کہ آج کتنے ہیں جو اس شرک عظیم میں مبتلا ہیں اور ہر جماعت نے انسانیت کی کتنی عظیم الشان قربانیوں کے بعد اپنے بت علٰحدہ بنا رکھے ہیں، میں عام معتقدات کے خلاف علیسیٰ کی تخلیق دمات کو ایک معمولی انسان کی سی تخلیق دمات کہتا ہوں، لیکن کسی زیدی و حسینی کے جوش ایماں میں حرکت پیدا نہیں ہوتی، میں

(ملاحظہ ہو بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۰) کے افراد کو گردن پکڑ کے باہر نکال دیا گیا اور انکے جھوٹے علم و تقدس کے چہرے سے نقاب نوچ کر دنیا کو بتا دیا گیا کہ ان کا باطن کس قدر سیاہ اور ان کے اخلاق کس درجہ مکروہ ہیں -

یوسعت کے غیر معمولی حسن و جمال سے انکار کرتا ہوں، مگر کوئی میرزا منش کوئی خواجہ زادہ اس کی پروا نہیں کرتا۔ میں بہشت و دوزخ کی مادی حیثیات کو نہیں مانتا، میں حشر اجساد کا قائل نہیں میں تمام مسائل شریعت کو وقت کے لحاظ سے قابل اصلاح و ترمیم کہتا ہوں، لیکن کوئی اسلام پرست اور محب اسلاف مومن ان باتوں کے خلاف احتجاج نہیں کرتا، لیکن محمد حسین آزاد کے خلاف، یعنی ایک ایسے شخص کے خلاف جو کسی طرح اکابر امت میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ مختصر الفاظ میں اظہار رائے کرتا ہوں، تو یہاں سے لیکر وہاں تک آگ لگجاتی ہے، درسگاہوں کے حجروں سے لیکر صحافت گاہوں کے ایوانوں تک ماتم بپا ہو جاتا ہے۔

گویا کہ تازہ خوں زکفن برچکیدن ست

یہ کیا تماشہ ہے!، یہ کیا عجیب وغریب منظر ہے۔!!

کیا بت پرستی کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور ہے، کیا شرک و بدعت کی تعبیر میں اس سے زیادہ کسی اور روشن مظاہرہ کی ضرورت ہے؟

کس قدر حسرتناک ہے اس قوم کی تنگ مایگی جو اپنے کسی فرد کے خلاف کوئی بات نہ سن سکے، صرف اسلئے کہ اس کو ناکارہ مان لینے کے بعد کوئی دوسرا اس جگہ پیش کرنے کے لئے موجود نہیں ہے۔

آزاد کی آبحیات کے متعلق جو مضمون شایع ہوا ہے اس کا جواب دینے میں جس وسعت ظرف و نظر سے کام لیا گیا ہے وہ یقیناً داد سے مستغنی ہے۔ کہنے والا کہتا ہے اور تذکرہ و تاریخ، روایت و درایت سے ثابت کرتا ہے کہ آزاد نے فلاں فلاں جگہ تحریف واقعات کی صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح لکھنے میں اپنے پورے قصد و ارادہ کو صرف کیا، لیکن جواب دینے والا ان باتوں کا ذکر ہی نہیں کرتا کیونکہ دلائل بالکل قطعی و ناقابل تردید ہیں، بلکہ وہ اپنا دل صرف مجھے گالیاں دیکر ٹھنڈا کرنا چاہتا ہے، حالانکہ اگر مجھے جاہل کہنے سے آزاد کے سر سے یہ تمام الزامات اُٹھ جاتے تو اس کی نوبت ہی نہ آتی، جب کہ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو یکسر معائب و نقائص پایا اور ظاہر کیا ہے۔ کیا ایک کو گالیاں دیکر دوسرے کی برتری ثابت کرنا ایسا زبردست کلیہ ہے کہ اس میں کوئی استثنا ہو ہی نہیں سکتا، یعنی میرے اور آزاد کے باب میں بھی نہیں!

برتمناہائے عرفی خندہ می آید مرا

اگست ۱۹۲۸ء آج مسئلہ نسائیات کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ "مدرسہ وخانقاہ" کے گوشوں سے بھی اس پر رائے زنی کی جارہی ہے اور موج کا رُخ یہ ہے کہ وہی کتب مذہبی جن سے پہلے عورتوں کیلئے "زنجیر وسلاسل" قید و بند کے احکام کا استخراج ہوتا تھا، اب انھیں سے یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ موجودہ پردہ کا

شتند اور ایک لعنت ہے اور یکسر تعلیمات اسلام کے منافی۔ اس سے قبل نگار میں بہ سلسلۂ استفسار میں نے عرض کیا تھا کہ کلام مجید سے پردہ کے متعلق جو احکام مستنبط ہو سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ:۔

۱) عورتیں چار دیواری کے اندر بند نہ کی جائیں۔

۲) مناسب و ضروری پردہ کے ساتھ وہ باہر نکل سکتی ہیں۔

۳) پردہ ایسا ہونا چاہئے جس سے آرائش ظاہر نہ ہو۔ اس لئے ہمارے یہاں کا موجودہ برقع عین اسی حکم کے مطابق ہے۔

۴) اگر کوئی ایسا حصۂ جسم کھل جائے جس کا چلنے میں کھل جانا اور اس طرح اس کی زینت کا ظاہر ہو جانا ناگزیر ہے (جیسے ہاتھ پاؤں) تو کوئی حرج نہیں۔

لیکن میری اسی معتدل تحریر پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ آج جناب عبد الماجد صاحب دریابادی پردہ کے متعلق ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ عورت کا چہرہ چھپانے کی چیز نہیں اور اسلام نے اجازت دی ہے کہ وہ برافگندہ نقاب جہاں چاہے پھرے۔ لیجئے "قصہ ہی طے ہوا من و تو کی نزاع کا" اس کے آگے اب مطالبۂ "ہل من مزید" کے لئے صرف ایک ہی چیز رہ جاتی ہے اور کیا عجب ہے کہ اگر کل کو (ملکۂ افغانستان) عریاں لباس رقص میں نمودار ہو جائیں، تو عبد الماجد صاحب یہ فتویٰ بھی صادر کر دیں کہ جب پردہ ہی کھل گیا، جب کوئی بے نقاب، سامنے آ ہی گیا، جب کسی نے ہم کو اور ہم نے کسی کو یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ ہی لیا اور جب جسم انسانی کا وہی حصہ جو "سر فتنۂ عشق" کہلاتا ہے بے حجاب ہو گیا تو پھر کپڑے چڑھائے ہوئے پینچے اٹھائے ہوئے "سیر بازار" آ جانے میں کیا مضائقہ ہے —— وائے گر در پس امروز بود فردائے

اللہ نے تو رسول کو سورۂ احزاب میں یہی ہدایت فرمائی تھی کہ:۔

یا ایہا النبی قل لازواجک وبناتک ونساء المومنین یدنین علیہن من جلابیبہن۔

(اے رسول اپنی بیویوں بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو ہدایت کر دو کہ وہ اپنے اوپر نقاب ڈال لیا کریں) لیکن یہ معمہ آج عبد الماجد صاحب کے قلم حق رقم سے حل ہوتا ہے کہ یدنین علیہن من جلابیبہن کے معنے بے نقاب ہو جانے اور چہرہ کھول کر بازار میں بے نقاب آ جانے کے ہیں۔ فریاد از تطاول مشکیں کمند تو!

مجھ پر وکیل ہو کر پیشۂ طبابت اختیار کرنے کا الزام تھا، آج دنیا اس طبیب حاذق کی حذاقت کا بھی مشاہدہ کرے دنیا کے اس قائد اعظم، کائنات کے اس مصلح کبیر اور عالم اسلامی کے اس ماہر قرآن و حدیث کے فتاوائے دینی بھی دیکھ لے۔ تاکہ آئندہ وکیل و طبیب کے امتیاز میں کسی کو التباس نہ واقع ہو، اور خیر و برکت کا وہ دروازہ جو عورت کے پردہ کو داخل ستر نہ کرنے سے عبد الماجد صاحب نے کھول دیا ہے اس کا طرۂ امتیاز کسی ملحد و دہریہ کو نہ حاصل

ہو جائے۔

حال ہی میں جناب عبدالماجد صاحب کا ایک افتتاحیہ "اخبار ہمدرد" میں شائع ہوا ہے جس میں اُنھوں نے ثابت کیا ہے کہ انگریزی ذہنیت کسی طرح ہندوستانی ذہنیت سے بالا و برتر نہیں ہے اور اس کے ثبوت میں اُنھوں نے استدلال پیش کیا ہے کہ اس وقت تک ایک انگریز بھی ہندوستانی زبان میں وہ مہارت پیدا نہیں کر سکا جو ہندوستانیوں نے انگریزی زبان میں حاصل کی ہے اسی طرح علم و فضل کے سلسلہ میں اُنھوں نے چند نام اہل ہندوستان کے شمار کرائے ہیں، لیکن کیا اچھا ہوتا کہ اگر فاضل افتتاحیہ نگار اسی سلسلہ میں یہ بھی بتا دیتے کہ جب ایک قوم نہ اپنے ذہنی اکتسابات کے لحاظ سے قابلِ لحاظ ہے اور نہ اخلاقی حیثیت سے لائق ذکر تو پھر اس کی ترقی کا راز کیا ہے اور دوسری قوم جو علم و فضل میں بھی تفوق رکھتی ہے اور اخلاق و عادات میں بھی بلند مرتبہ والی ہے اس کے انحطاط و زوال کا کیا سبب ہے۔

کلام مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم

(یعنی جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ وہ اُنھیں دنیا میں قیام عطا فرمائے گا جس طرح اس سے قبل کے لوگوں کو قیام عطا ہوا)

پھر اگر استخلاف فی الارض سے مراد وہی "چہ خورد بامداد فرزندم" والی حالت ہے تو یقیناً ہندوستانیوں سے زیادہ کوئی مستحق اس کا نہیں ہے اور یقیناً تمکن فی الارض اُنھیں کو حاصل ہے لیکن اگر استخلاف سے مراد حکومت و ثروت، جاہ و دولت فراغدستی و خوشحالی اور ہر وہ چیز ہے جس کو "جنت عدن" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے تو پھر یہ سمجھ کیونکر حل ہو سکتا ہے کہ استخلاف اور عمل صالح میں باہم کیا نسبت ہے۔ اگر استخلاف بغیر عمل نیک کے بھی ممکن ہے تو وعدۂ الٰہی بیکار ہو جاتا ہے اور اگر یہ ناممکن ہے تو پھر دو ہی صورتیں ہیں، یا تو استخلاف کا مفہوم دنیاوی نکبت و ذلت قرار دیا جائے یا انگریزی قوم کو تمکن فی الارض کے لئے اصلح تسلیم کیا جائے؟ تاریخ اجرا سے لیکر اس وقت تک سیچ کے جتنے پرچے شائع ہوئے ہیں اگر ان کو دیکھا جائے تو سوائے اس کے کچھ نہ نظر آئے گا کہ یورپ کے فلاں ملک میں اتنے جرائم ہوئے فلاں مقام پر سال میں اتنی طلاقیں ہوئیں، فلاں لارڈ کی لڑکی عریاں رقص کرتی ہوئی پائی گئی وہاں شراب کا اتنا صرف ہے، قمار بازی میں اتنا روپیہ ضائع ہوتا ہے، وہ ہم پر یہ ظلم توڑ رہے ہیں، لیکن اس کی توفیق نہ ہوئی کہ کبھی یہ بات بتاتے کہ فلاں عالم نے یہ ایجاد کی، فلاں ڈاکٹر نے یہ اختراع پیش کی، وہاں علم و فضل کی کیا خدمت ہو رہی ہے، فلاح قومی کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں، ہمارے مظلوم ہونے کے کیا اسباب ہیں ہم میں

کیا نقائص ہیں اور ہم ان کو کس طرح دور کر سکتے ہیں۔

کیا کلام مجید میں "استخلاف فی الارض" کے لئے جس عمل صالح کی شرط قرار دی گئی ہے وہ یہی ہے کہ دوسروں کی عیب چینی کی جائے اور اپنے معائب کو بھی محاسن کی صورت میں پیش کیا جائے کاش کہ عبدالماجد صاحب بجائے اس سطحی مقالہ کے اصل مسئلہ کی طرف توجہ فرماتے اور غور کرتے کہ کیا ہندوستانی دماغ کی برتری ان حالات کے ماتحت سراہے جانے کے قابل ہے اور کیا سورۂ احقاف میں خدا نے یہ کلیہ قائم کر کے کہ:۔

فھل یھلک الا القوم الفاسقون

ہم کو یہ نہیں بتا دیا کہ ایک قوم کی دماغی و ذہنی بلندی کا ثبوت اگر ہو سکتا ہے تو وہ صرف اس کی ترقی ہے اور جو قوم ہلاک ہو رہی ہے وہ یقیناً فاسق ہے، ناقابل ہے اور اس کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے آپ کو بہتر کہہ سکے۔ جناب عبدالماجد کی صحافت اور انشاء کا انحصار صرف اس پر ہے کہ اہل یورپ کے معائب کو نمایاں کیا جائے اور اس غلو کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کا لٹریچر ہی حاسدانہ نکتہ چینی ہو کر رہ گیا حالانکہ یہ حقیقت واضح ہے کہ دنیا عمل میں اس طرز تحریر کو صرف "کوسنا" کہتے ہیں اور اسی لئے اس کو صرف اُس جنس کے لئے مخصوص سمجھ لیا گیا ہے جس کے لبوں کی جنبش اس زہر کو بھی شیریں بنا کے پیش کرتی ہے۔ عبدالماجد صاحب سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ باوجود سعی بسیار کے بھی کبھی اس نوع کی جاذبیت اپنی جنبش لب میں پیدا کر سکیں گے۔

اکتوبر ۱۹۲۸ء | جناب عبدالماجد صاحب دریابادی نے نہرو کمیٹی کی رپورٹ پر رائے زنی فرماتے ہوئے اس قدر عجیب و غریب بات لکھی ہے کہ شاید ہی اس کی نظیر "تاریخ تنقید" میں کہیں مل سکے۔ آپ فرماتے ہیں کہ:۔

> "نہرو کمیٹی رپورٹ میں کیا کچھ نہیں۔ رعایا کے حقوق، حکومت کے اختیارات، برطانیہ سے تعلق، قانون ساز مجلسوں کی ترکیب، ان مجلسوں میں مختلف قوموں کا تناسب، طریق انتخاب .... اور اسی قسم کے دوسرے مسائل پر تفصیلی تبصرہ اور تحقیقی فیصلہ"

یعنی یہاں تک تو وہ تسلیم کرتے ہیں کہ نہرو کمیٹی رپورٹ ایک بہترین سیاسی دستاویز ہے جس پر ہندو مسلمان طمینان سے اپنے اپنے دستخط ثبت کر سکتے ہیں، لیکن اسی کے بعد ہی جس طرح کوئی بھولا ہوا خواب یاد آجائے، چونک کر فرماتے ہیں کہ:۔

> "لیکن اس ۱۵۰ صفحہ کی کتاب میں شروع سے اخیر تک خدا کا نام نہیں آنے پایا ہے، مادیت کی اس نقارخانہ میں قوم کی روحانی و اخلاقی زندگی کی کہیں بھنک تک نہیں پڑنے پائی ہے، حکومت کا اصلی اور اعلیٰ مقصد تمامتر حکومت ہی کو رکھا گیا ہے، نہ کہ زمین پر خلافت الٰہیہ یا خدمت اللہ کو وغیرہ وغیرہ"

اگر عبدالماجد صاحب ایک سیاسی رپورٹ میں ' خدا کا نام ' روحانی و اخلاقی زندگی ' خلافت الٰہیہ وغیرہ کی جستجو کرتے ہیں اور یہ باتیں اس میں نہ پاکر چیں بہ جبیں ہوتے ہیں تو نہرو کمیٹی رپورٹ والوں کو بھی اسی قسم کی تنقید کا حق حاصل ہے اور وہ بھی ہدایہ ' شامی ' جلالین ' بخاری بلکہ خود قرآن میں یہ جستجو کرسکتے ہیں کہ ان میں کہیں ہندوستان کے متعلق سوراج ' کھدر ' چرخا ' کونسل ' اسمبلی ' اور نہرو کمیٹی کا ذکر ہے یا نہیں اور پھر آخیر میں مایوس ہوکر ان کتابوں کے مفید ہونے سے انکار کرسکتے ہیں ۔ کاشکے عبدالماجد صاحب خود ہی کوئی الہامی رپورٹ مرتب کرتے تاکہ دنیا کا ہر شخص اُسے "آیت من آیات اللہ" سمجھ کر تسلیم کرلیتا اور جس کی رو سے سیاسی اور سنیاسی میں کوئی فرق باقی نہ رہتا ۔

اسی کے ساتھ قیصر باغ ' ہٹلر پیلس یعنی ملک کے صاحب ثروت لوگوں کا ذکر اُنھوں نے جس جلن کے ساتھ کیا ہے ' وہ کوئی نئی بات نہیں ہے کیونکہ وہ تو اُن کے نزدیک ہمیشہ سے "طابھا کلاب" میں داخل ہیں ' اور ایک دولت مند کے مقابلہ میں غریب آدمی تسکین رشک وحسد اسی طرح کیا کرتا ہے ' سچ ہے -

ہر ہوسناکے نہ داند جام و سندان باختن

نو ہر شلہ جناب عبدالماجد صاحب دریابادی نے یہ اعتراض کیا ہے کہ نہرو کمیٹی رپورٹ میں مجرموں کو جسمانی سزا دینے سے اختلاف کیا گیا ہے اور اس طرح گویا "مسلمان چوری کرے گا ' لیکن اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا ' مسلمان زنا کریگا اور سنگسار نہ ہوسکے گا ' مسلمان شراب پئے گا ' اور اس کے درّے نہ لگائے جاسکیں گے ' یعنی سات کروڑ مسلمان اپنی شریعت کی بیچارگی پر منٹ محسوس کرکے رہجائیں گے "۔

غالباً یہاں یہ بحث بیکار ہے کہ ہاتھ کا کاٹا جانا ' سنگسار کیا جانا اور درّے لگانا کس حد تک سرقہ ' زنا اور میخواری کا انسداد کرسکتا ہے اور اس وقت تک شدید یا خفیف جسمانی سزاؤں نے دنیا کے جرائم میں کتنی کمی پیدا کی ہے ' لیکن جناب عبدالماجد صاحب سے یہ دریافت کرنے کو ضروری چاہتا ہے کہ اگر مسلمانوں کے لئے قانون میں ان کے تمام مطالب کی رعائت کردی جائے تو پھر وہ اس میں کسی استثنائی دفعہ کا مطالبہ تو نہ کریں گے جس سے علما اور رہبران قوم اس قسم کے تعزیروں سے محفوظ رہیں یا یہ کہ مفتیان اسلام کو تو کسی ایسے حیلۂ شرعی پیدا کرنے کی اجازت نہ ہوگی جو ایک ہی ناجائز بات ان کے لئے قابل معافی اور دوسروں کے لئے لائق تعزیر ہو ؟ کیونکہ خود شریعت کوئی چیز نہیں ہے اگر اس کے نافذ کرنے والے فاروق جیسے انسان نہ ہوں خیر یہ تو سیاسی لطائف ہیں جن پر کوئی شخص توجہ نہیں کرتا لیکن واقعی سنجیدگی کے ساتھ جو اختلاف کیا گیا ہے وہ بھی میرے نزدیک بالکل لایعنی ہے یہاں تک کہ بہت سے اختلاف کرنے والے خود بھی نہیں بتاسکتے کہ وہ کیوں مخالف ہوگئے ہیں ۔

ہم اس سے قبل ظاہر کرچکے ہیں ۔ اور اب پھر اس کا اعادہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ انجمنوں کی کثرت کوئی

محمود طریق کار نہیں ہے اور مسلمانوں کی ان دو جمعیتوں کو جن کا نام تبلیغ و خلافت ہے یقیناً مٹا دینا چاہئے اول الذکر جماعت کا وجود سیاسیات ہند کے لئے بے انتہا مضرت رساں اور خود مسلمانوں کے لئے بھی مذہبی نقطۂ نظر سے غیر مفید ہے۔

اول تو میں اس کے ماننے کے لئے تیار نہیں کہ تبلیغ کانفرنس نے جماعت اسلامی میں کوئی قابل ذکر اضافہ کیا ہے اور اگر اسے تسلیم کر بھی لیں تو اس کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ اس وقت دنیا میں حصول ترقی کا ذریعہ کمیت نہیں بلکہ کیفیت ہے اور اس کا فقدان پہلے ہی سے کم نہیں ہے، رہی خلافت کمیٹی سو بہ حالت موجودہ جبکہ خلافت کا وجود باقی نہیں رہا، اس کی ایک ناکارہ یادگار قائم رکھنا قرین عقل و انصاف نہیں جس طرح دوران قیام خلافت میں اس کمیٹی کا روپیہ نامناسب محل و موقعہ پر استعمال کیا گیا، اسی طرح اب بھی ہو رہا ہے چنانچہ سنا گیا ہے کہ کلکتہ میں نہرو کمیٹی رپورٹ کے خلاف پروپگنڈا کرنے کے لئے خلافت کمیٹی نے کافی مالی امداد دی ہے، جو یقیناً اس کے مقاصد و فرائض سے بالکل علیحدہ چیز ہے۔

مسلمانوں کو اگر اپنی کوئی مخصوص انجمن قائم کرنا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلم لیگ کو از سر نو زندہ نہ کیا جائے اور تمام قوتیں اسی کے اصلاح میں نہ صرف ہوں۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں دیکھتا ہوں کہ مشاعرہ کی بدعت طبقۂ شعراء سے گزر کر اسکولوں، کالجوں، ہوسٹلوں اور یونیورسٹیوں میں بھی پہونچ گئی ہے اور شاید ہی کوئی سالانہ تقریب ایسی ہوتی ہو جس میں بزم مشاعرہ کا انعقاد ضروری نہ خیال کیا جاتا ہو، میں نے جہاں تک غور کیا، یہ نتیجہ ہے اس ادنیٰ قسم کی ذہنیت کا جو موجودہ نصاب تعلیم اور اصول تربیت کے ماتحت اس وقت ہندوستان کی بڑی سی بڑی درسگاہ میں پائی جاتی ہے اگر کسی سالانہ احتفال کے موقعہ پر کسی سنجیدہ و مفید مشغلہ میں مصروف ہونا ممکن نہیں اور صرف سطحی تفریح مقصود ہے تو میرے نزدیک مشاعرہ سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ "رقص و سرود" کا جلسہ منعقد کیا جائے یعنی شعر گوئی شعر فہمی سے پہلے وہ سامان پیدا کیا جائے جو شعر کہنے اور سننے کا اہل بناتا ہے۔

اس مرتبہ جب الٰہ آباد یونیورسٹی کے بعض طلبہ نے اکثر کانووکیشن کے موقعہ پر مشاعرہ میں شرکت کی دعوت مجھے دی تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ وہ کیوں نہیں کوئی اس سے زیادہ مفید صورت سالانہ اجتماع کی قرار دیتے انھوں نے جواب دیا کہ مشاعرہ سے ان کا مقصود اردو زبان کی ترقی اور ہندو طلبہ میں اس کا ذوق پیدا کرنا ہے" مجھے ان کے اس طفلانہ جواب پر بے اختیار ہنسی آگئی اور میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ان کے جواب کے دوسرے فقرہ کی سیاسی اہمیت کو زائل نہ کرنے کے لئے خاموش ہی رہوں تو بہتر ہے۔ لیکن میں یہ کہنے سے بہرحال باز نہ رہ سکا "جب آپ خود ہندی بھاشا کے

سیکھنے کا کوئی اقدام نہیں کرتے تو آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ منہد و طلبہ سے یہ توقع رکھیں کہ وہ آپ کی زبان کی طرف متوجہ ہوں گے۔"

مجھے افسوس معلوم ہوتا ہے کہ غریب طلبہ مختلف مقامات پر خود جا جا کر شعرا کو دعوت دیتے ہیں، ان کے مصارف سفر برداشت کرتے ہیں اور نتیجہ اس کا سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ جب یہ کرائے لیکے جانے والے شعرا، وہاں سے واپس آتے ہیں، تو ان کی برائیاں ہی بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غریب بسم اللہ کے گنبد میں زندگی بسر کرنے والے نوجوان کیا سمجھ سکتے ہیں کہ ہندوستان کا شاعر کس قدر عجیب و غریب چیز ہے اور اس کے اخلاق نفسیات کے کتنے ناحل کردہ مسائل اپنے اندر پنہاں رکھتے ہیں۔

یہاں لکھنؤ کے شیعہ کالج میں بھی ایک مشاعرہ منعقد ہوا، جس کا دعوت نامہ فارسی زبان میں تھا، یہ دیکھکر مجھے مسلم یونیورسٹی کا وہ بے تکا پن یاد آیا جب شاید جوبلی کے موقعہ پر مشاعرہ کا اعلان انگریزی زبان میں کیا گیا تھا، سچ ہے " من چہ فش ام فلاں برادرم بسیار فش ست"

فروری ۱۹۲۹ء اس میں شک نہیں کہ نگار اس وقت یوپی کے تمام اردو رسائل و جرائد سے زیادہ اشاعت رکھنے کا مدعی ہے، لیکن یہ کثرت صرف تقابلی و امتیازی ہے، حقیقی نہیں۔ یعنی یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت اس کی اشاعت مقابلتہً "دوسرے رسائل سے زیادہ ہے، لیکن جس وقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ حقیقتاً اس کی اشاعت کتنی ہونا چاہیے، تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ؎

وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرت تعمیر سو ہے

یہ صحیح ہے کہ رسالہ نگار نہ صرف اپنے مصارف پورے کرتا ہے بلکہ وہ میرے اسباب معیشت و معاشرت کا بھی بڑی حد تک کفیل ہے، اور ایک مشین پریس بھی مع تمام ضروری سامان کے اپنی ملکیت میں رکھتا ہے، لیکن کیا میری سات سال کی کاوش، دماغ کا صرف یہی صلہ ہونا چاہیے ممکن ہے کہ ہندوستان میں، جہاں اب سرمایۂ زر و سیم کے مقابلہ میں سرمایۂ دماغ کی کوئی اہمیت نہیں، اس کو کافی سمجھا جائے، لیکن اسی سرزمین ہند پر ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جب علم و ہنر کی قدردانی کا مفہوم مادی نقطۂ نظر سے استعارۃً نہیں بلکہ حقیقتاً زر و سیم کے برابر تولدیا جانا اور زر و جواہر سے منہ بھر دیا جانا ہوا کرتا تھا، ہر چند میں ان لوگوں میں نہیں کہ کسی وقت اس احترام کا مطالبہ کر سکتا لیکن خدمت کے لحاظ سے اجرت طلب کرنا یقیناً میرا فطری حق ہے اور اگر امین ملک کمی کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ میں اس کا تقاضہ نہ کروں۔

نگار نے گزشتہ سال کے اندر جو خدمت زبان و علم کی انجام دی ہے یا جو ذہنی انقلاب اس نے

پیدا کردیا ہے، وہ صحافت کی دنیا کا ایسا معمولی واقعہ نہیں ہے، جس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ احباب نکتہ سنج نے اپنے اعتراف اور ارباب حسود نے اپنے اضطراب سے بارہا اس کو تسلیم کیا اور کرتے رہیں گے، لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک نگار اپنے پیغام کی نشر و اشاعت ضروری حد تک بھی نہیں کر سکا اور یہ فرض اب تک نا تمام حالت میں پڑا ہوا ہے جسکا بڑا ذمہ دار ملک ہے۔

مارچ سنہ ۱۹۲۹ء

اگر غور کیا جائے تو یہ بات آسانی سے معلوم ہو سکتی ہے کہ حکومت زیادہ سے زیادہ چار قسموں کی ہو سکتی ہے:۔ ایک شخصی و استبدادی ملوکیت جس میں قوم کی رائے اور اس کی آواز کو کوئی دخل نہیں ہے اور شاہ وقت ملک کے سیاہ و سفید کا مختار کل ہوتا ہے اس قسم کی حکومتیں انیسویں صدی سے قبل اکثر جگہ پائی جاتی تھیں اور کچھ زمانہ پیشتر روس ترکی اور ایران میں بھی یہی "سلطنت مطلقہ" پائی جاتی تھی، لیکن اب سوائے سیام اور بعض ہندوستانی ریاستوں کے یہ طریق حکومت تمام دنیا سے معدوم ہو گیا ہے اور اس کے حیات کی اب کوئی امید بھی نہیں۔

دوسری قسم حکومت کی حکومت جمہوری دیمقراطی ہے جو قوم اور نمائندگان قوم کے زیر اثر ہوتی ہے اور کسی ایک شخص کو اختیار کامل نہیں دیا جاتا جس کی ایک مثال فرانس کی حکومت ہے تیسری قسم کی حکومت وہ ہے جسے حکومت اتحادی کہتے ہیں، جمہوری اور اتحادی حکومت میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر میں صرف ایک مخصوص قوم و جماعت تمام اہل ملک کے لئے وضع قانون کا اختیار رکھتی ہے (مثلاً ملک فرانس کہ وہاں کا ہر شخص خواہ وہ کسی جگہ کا رہنے والا ہو پیرس کی پارلیمنٹ کے وضع کردہ قوانین کے آگے سر جھکا دیگا) اور موخر الذکر طریق حکومت میں ایک ملک کے مختلف حصے اپنے مفاد کے لحاظ سے مختلف قوانین وضع کرتے ہیں۔ اور ان کا تعلق ایک مرکزی حصہ سے ہوتا ہے جس کو یہ مختلف حصے کچھ زاید حقوق دیتے ہیں اس کی مثال میں امریکہ اور سوئٹزرلینڈ اور جرمنی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

چوتھی قسم حکومت کی سوویٹ ہے یعنی وہ جو اب روس میں پائی جاتی ہے اور مجالس عمال پر قائم ہے۔ یہ تو صرف وہ تقسیم ہے جسے عقل بھی تسلیم کرتی ہے اور جو عملاً بھی اس وقت دنیا میں پائی جاتی ہے، لیکن ایک پانچویں قسم حکومت کی اور ہے، جو اپنے وجود کی اہمیت اور عمل کی وسعت کے لحاظ سے ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہے، لیکن عقل حیران ہے کہ اس کو کیا سمجھے، آپ نے اگر کبھی غور کیا ہوگا تو آپ بھی شاید حیران ہوئے ہوں گے کہ حکومت برطانیہ کو کس قسم کی حکومت میں شامل کرنا چاہئے اور اس کے متضاد عناصر کو دیکھتے ہوئے اس کا کیا نام رکھنا چاہئے۔ وہاں ملوکیت بھی ہے لیکن ناقص و نا مکمل، وہاں دستوریت بھی ہے لیکن محدود و مقید، وہاں دیمقراطیت (Democracy) بھی ہے مگر لایعنی و بیکار، اور وہاں ارستقراطیت (Aristocracy.) بھی ہے لیکن لغو و بے معنی

پھر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان، جس کی نجات و ہلاکت کا تنہا ذمہ دار اب گاندھی اور نہرو نے بھی حکومت برطانیہ کو تسلیم کرلیا ہے، اس سے کس نوع کی حکومت کا مطالبہ کرسکتا ہے، اور ایسا نظام حکومت جسے کیا عطا کرسکتا ہے۔ مطالبہ کی صورت ہمارے سامنے نہرو رپورٹ کی شکل میں موجود ہے جو عطا ہونے والا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جناب سائمن ہمارے حال کی تفتیش کے لئے مامور ہوئے ہیں جن کو نسل و ملک کے لحاظ سے بعید ترین تعلق بھی ہندوستان سے نہیں ہے۔

ڈومی نین ہوم رول، کوئی الہامی فقرہ نہیں، جس کے دنیا میں صرف ایک ہی معنی لئے جاسکیں، اس لئے یہ ضروری نہیں کہ ہندوستان کے ڈومی نین ہوم رول کے بھی وہی معنے ہوں جو کناڈا یا آئرلینڈ کے ہوم رول کے ہیں اور اگر وہی ہوں تو بھی یہ لازم نہیں کہ برطانیہ اسی اصول پر ہمارا خط سرنوشت تحریر کردے، جبکہ وہ خود نوعیت حکومت کے لحاظ سے ایک نہایت عجیب و غریب مجموعہ اضداد و متناقضات کا ہے۔

نہرو رپورٹ میں جس نوع کی حکومت ہندوستان کے لئے طلب کی گئی ہے وہ یقیناً کسی خوددار قوم کیلئے باعث فخر و ناز نہیں ہوسکتی اور نہ اس سے کسی قوم کی عالی حوصلگی کا پتہ چلتا ہے، لیکن ادھر برطانیہ کی پیچیدہ اور عجیب طرز حکومت کو دیکھتے ہوئے اور ادھر خود سرزمین ہند میں بسنے والی دیوانہ مذہب قوموں کے اختلاف آراء پر نگاہ ڈالتے ہوئے، جو کچھ طلب کیا گیا وہ بڑی حد تک سب کو ایک مرکز پر لانے کا امکان اپنے اندر رکھتا تھا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ برطانیہ کا اقبال یہاں بھی کام کر گیا اور مسلمانوں کی ایک جماعت نے جس کی نیت سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں، نہرو رپورٹ سے اختلاف کرکے ایک ایسا عذر لنگ نہیں بلکہ صحیح آلۂ کار اس کے ہاتھ میں دیدیا کہ اگر دسمبر سنہ ۲۹ء کیا معنے دسمبر سنہ ۳۹ء تک بھی حکومت آرام سے سوتی رہے تو گاندھی کو اپنے الٹی میٹم کے مطابق عمل کرنے کی کوئی عقلی دلیل میسر نہیں آسکتی اس لئے مستقبل میرے سامنے ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ وقت آئے گا جب نہرو رپورٹ اساطیر الاولین میں داخل ہوجائے گی اور کوئی اور خدا کا بندہ دوسری رپورٹ طیار کریگا اور اسوقت بھی یہی سوال پیدا ہوگا کہ ہم برطانیہ سے کیا طلب کریں اور وہ ہمیں کیا دے سکتا ہے۔ جبکہ نہ اس کے پاس کچھ دینے کو ہے اور نہ ہم لینے کے اہل۔

یقیناً ایک قوم کی یہ بڑی بے مائگی ہے کہ اس پر غیروں کی حکومت ہو، لیکن ایک درجہ اس سے بھی فروتر ہے اور وہ یہ کہ وہ غیروں کی حکومت کی محتاج ہو اور اس سے نظم و عدل کی اہلیت سلب کرلی گئی ہو۔ بہر حال وقت تک ہم اس منزل میں ہیں نہ نہرو رپورٹ سے کچھ کام نکل سکتا ہے نہ عدم تعاون کے الٹی میٹم سے اور نہ مسٹر پٹیل کے ہاں اجتماع اور گاندھی سے۔

جس وقت تک مسلمان (نزاع کفر و ایمان کے نقطۂ نظر سے) مسلمان اور ہندو (اپنی گوسالہ پرستی اور چھوت

چھات کے اعتبار سے) ہندو ہے، ہندوستان کبھی غلامی کی لعنت سے نہیں نکل سکتا اور وہ اس کو نکلنا چاہئے اس قعر میں جس طرح مسلمان مبتلا ہیں بالکل اسی طرح ہندو بھی گرفتار ہیں نہ ان کی نگاہ وسیع نہ ان کا سینہ فراخ اور جب تک دونوں میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ صرف اپنے ہی کو نجات آخروی اور مکتی کا اہل سمجھتا ہے اس وقت تک کوئی اُمید فلاح کی نہیں ہے۔

اس لئے جس وقت میں یہ دیکھتا ہوں کہ بعض اکابر قوم بجائے اس کے کہ اُن کے ذہن میں وسعت اور دماغ میں اخوت عامہ قائم کرنے کا خیال پیدا ہو روز بروز تنگ نظر اور رسم و رواج کے پابند ہوتے جاتے ہیں تو میری یاس کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور مجھ کو خود اپنی ذات سے نفرت ہونے لگتی ہے کہ میں کیوں نہ بجائے مسلمان ہونے کے انسان پیدا ہوا۔ پس اگر ہندو مسلمان چاہتے ہیں کہ صحیح معنے میں باہم اتحاد پیدا ہو تو انکا اولین فرض یہ ہے کہ وہ تمام اُن نقوش کو قلب سے محو کردیں جنسے بوئے عصبیت آتی ہے در جبتک ہندو یونیورسٹی کا نام ہندو یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی کا نام مسلم یونیورسٹی ہے جب تک ہندو چوٹی میں گرفتار ہے اور مسلمان اپنی ریش دراز میں، اور جس وقت تک مذہب کا مفہوم اخوت عامہ اور انسانیت پرستی نہیں ہو جاتا، نہ ہندوستان کبھی آزاد ہو سکتا ہے اور نہ حریت کی صحیح روح پیدا ہو سکتی ہے۔

آزادی نام ایک کیفیت کا ہے جو پہلے قلب انسانی میں خود اس کے آزادی ضمیر کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اور وہ بالکل مذہب و ملت سے بہت بلند ہے اگر آج ہندوستان موجودہ ذہنیت کے ساتھ آزاد و خود مختار ہو جائے تو بھی ہمارے لئے باعث مسرت نہیں، کیونکہ وہ امن و سکون جو آزادی کے بعد حاصل ہوتا ہے اس وقت تک میسر نہیں آسکتا جب تک ہماری روحیں آزاد نہوں، ہمارے خیالات وسیع نہ ہوں اور تفریق ملت امتیاز کفر و اسلام کا پردہ درمیاں سے نہ اٹھ جائے اور یہ آسان نہیں جبتک مذہب مفقود نہ ہو جائے یا لوگ مذہب کے صحیح مفہوم سے آشنا نہوں اور اس کو انفرادی عقیدہ کی چیز جانکر اجتماعیات سے علحدہ نہ رکھیں۔

ہندو مسلمانوں کے جتنے اکابر آج آزادی کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں وہ سب بلا استثنا یہ اہلیت اپنے اندر نہیں رکھتے اور جس وقت کورانہ تقلید اور قدامت پرستی کا سوال آتا ہے تو گاندھی ایسا انسان بھی گاؤ پرستی کے احمقانہ جذبہ سے متاثر ہو کر ملک کے تمام مصالح قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے اور بڑے سے بڑے ذی ہوش مسلمان لیڈر کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ سرے سے قربانی کرنا کونسا محمود فعل ہے کہ گائے اور بکری میں انتخاب کا سوال پیدا ہو۔

اپریل ۱۹۲۹ء | سب سے پہلا عملی قدم، جو حکومت برطانیہ و حکومت ہند نے اشتراکیت (Commun-) کے خلاف اٹھایا ہے وہ گذشتہ ماہ کی گرفتاریاں ہیں جو ہندوستان کے ہر صوبہ میں [illegible]

بیک وقت عمل میں آئیں۔

میں اُن گرفتاریوں کے جزئیات سے بحث کرنا نہیں چاہتا کیونکہ ناظرینِ نگار، روزانہ اخبار کی وساطت سے ان کو معلوم کر چکے ہوں گے بلکہ میں مختصراً یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اشتراکیت کیا چیز ہے، اس کی تاریخی قدامت کیا ہے اور یہ کہ ہندوستان یا کسی اور متمدن ملک میں اس کا رواج مناسب ہے یا نہیں، نگار کی اولین اشاعت میں اس موضوع پر بیشتر روشنی ڈالی تھی، اور اس وقت بھی بحالات موجودہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس یاد کو تازہ کیا جائے۔

کمیونزم (Communism.) جسے سوشلزم (Socialism.) بھی کہتے ہیں اور جس کا ترجمہ اشتراکیت کیا جاتا ہے، اپنے لغوی معنے کے لحاظ سے نہایت دلکش چیز معلوم ہوتی ہے کیونکہ تمام افراد انسانی کا ہر چیز میں مشترک رہنا، فطرت کے تمام انعامات سے یکساں طور پر فائدہ اٹھانا، جو مفہوم اشتراکیت کا ہے ایک ایسا دلچسپ مطالبہ ہے کہ کوئی شخص جو انسانیت اخوت عامہ اور امن عام کی حکومت دیکھنا چاہتا ہے وہ بغیر ایک لمحہ تامل کئے ہوئے اس مطالبہ کے استحسان پر فتویٰ دیدیگا۔ لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے یعنی جس حد تک اشتراکیت کے قابلِ عمل و نفاذ پذیر ہونے کا واسطہ ہے۔ یہ مطالبہ اس قدر آسان و خوشنما نہیں اور زمانہ قدیم سے لیکر اسوقت تک جب کبھی اشتراکیت کا جذبہ دنیا میں پیدا ہوا ہمیشہ اس کی مخالفت کی گئی اور کبھی اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔

اشتراکیت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک "اشتراکیت محض" دوسرے "اشتراکیت تعاون" اول الذکر سے مراد یہ ہے کہ تمام افراد انسانی متاع عالم میں برابر کے شریک ہو جائیں اور دوسرے سے مقصود یہ ہے کہ افراد انسانی تقسیم عمل کے ماتحت خدمات انجام دیں اور نفع میں سب کا حصہ برابر ہو۔ الغرض اس کا نصب العین یہ ہے کہ جمہور کی مدد سے افراد انسانی کی عام حالت درست کی جائے۔

اشتراکیت دنیا کا کوئی نیا خیال نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اس کی ابتدا اسوقت سے ہوتی ہے جب سے ملوکیت یا تسلط کی بنیاد پڑی اور ہمیشہ یہی ہوا کہ جب اصحاب دولت یا سرمایہ داروں نے غریبوں پر ظلم شروع کیا، اشتراکی خیالات دنیا میں رونما ہونے لگے۔

یونان قدیم میں فالیاس کا اشتراکیت کو رواج دینا جس کے ذریعہ سے وہ تعلیم و معاشرت میں امیر و غریب دونوں کو دوش بدوش چلانا چاہتا تھا، تاریخ کا کھلا ہوا واقعہ ہے اور افلاطون کا یونانی جمہوریت کو ترتیب دینا جس میں زمین، عورت اور غلام کو مشترک ملکیت قرار دیا گیا تھا، اہل علم پر واضح ہے۔

قبل مسیح دوسری صدی میں اسرائیلیوں کی ایک جماعت جو فرقہ اسینیہ (Essenes.) کے نام سے موسوم تھی بحر مردہ (Dead Sea.) کے ساحل پر آباد تھی، ان کے ہاں بھی سب لوگ مال

میں شریک تھے یہاں تک کہ عورت کو بھی مال ہی سمجھا جاتا تھا اور وہ بھی مشترک چیز سمجھی جاتی تھی۔ یہی حال ایک مسیحی جماعت کرو کراٹیا نا کا تھا جو چھٹی صدی عیسوی میں معدوم ہو گئی ہالینڈ میں بھی متعدد جماعتیں اشتراکی اصول پر قائم ہوئیں جنمیں سے بہت زیادہ شہرت اس جماعت کو حاصل ہوئی جسے جرار گروٹ نے سنہ ۱۳۷۰ء میں قائم کیا تھا، دوسری صدی عیسوی میں ایک گروہ اڈیٹا نمودار ہوا جو راستوں پر برہنہ پھرتا تھا اور عورت پر اس کے مشترکہ حقوق قائم تھے۔

جرمنی کے عہد اصلاح میں کاشتکاروں نے زمینداروں کو مجبور کیا کہ زمین میں انھیں برابر کا حصہ دیں جس پر سخت خونریز لڑائی ہوئی جو "جنگ مزارعین" کے نام سے مشہور ہے۔ ایسے واقعات بھی تاریخ میں ملتے ہیں کہ بھی جماعتوں نے مالداروں پر زور ڈالا کہ وہ اپنی دولت فقراء پر برابر تقسیم کر دیں۔

الغرض ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اشتراکی خیالات پیدا ہوئے، دولت و حکومت نے ان کا مقابلہ کیا اور اس تصادم نے دنیا میں بہت کچھ اضطراب پیدا کیا۔ اشتراکی اصول پر عہد وسطے میں متعدد کتابیں بھی لکھی گئیں جن میں سب سے زیادہ مشہور کتاب سار ٹومس مور کی ہے جو سنہ ۱۵۱۶ء میں طبع ہوئی تھی۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ متمدن دنیا میں اشتراکی جماعت کی تعداد ہمیشہ بڑھتی ہی گئی اور حکومت اس کو فنا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ فرانس میں بھی زمانۂ قدیم میں اصول اشتراکیت قائم ہوئے۔ اور بابوف نے تو نظام حکومت اُلٹ دینے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن اس کے متبعین میں اختلاف پیدا ہو گیا اور یہ تحریک خود فنا ہو گئی۔

اٹھارویں صدی میں سان سیموں فرانسیسی نے ایک نیا مذہب نکالا جسے وہ نصرانیت جدید کہتا تھا اور اپنے اصول مخترعہ کے ذریعہ سے وہ عقائد مذہب و سیادت کی اصلاح کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی عمر نے وفا نہ کی اور اس کے تلامذہ میں باہم اختلافات پیدا ہو جانے کی وجہ سے حکومت نے اس انتشار سے فائدہ اٹھایا اور ان کی قوت کو فنا کر دیا۔ اس کے بعد شارل فوریہ (سنہ ۱۷۷۲ء سنہ ۱۸۸۳) کا ظہور ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ ہیئت اجتماعی کی بنا دائمی ارتقا پر ہے جس زمانہ میں فوریہ اور اس کے مقلدین ہیئت اجتماعی کی اصلاح کرنا چاہتے تھے ایک اور شخص لوئی بلان نے اس امر پر زور دیا کہ حکومت تعین عمل اور تقسیم اجرت کو اپنے ہاتھ میں لے چنانچہ حکومت کی طرف سے کارخانے قائم کئے گئے، حکومت ہی کی طرف سے اجرت پر مزدور رکھے گئے، مگر کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔ اور ملک میں صرف اشتراکی بغاوت پیدا ہو کر رہ گئی۔ برودان (سنہ ۱۸۰۹ سنہ ۱۸۶۵) کا دستور العمل لوئی کے خلاف تھا، وہ کہتا تھا کہ حکومت کو وضع قوانین کا اختیار نہیں ہے۔ انگلستان میں رابرٹ اوین (سنہ ۱۷۷۱ سنہ ۱۸۸۵) نے اشتراکی خیالات کی اشاعت شروع کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ اس کے بعد بہت سی اشتراکی جماعتیں قائم ہوئیں جن کی تعداد ۴۰۰ تک پہونچتی ہے ان میں سب سے زیادہ کامیاب انجمن راشڈیل تھی۔ اس نے

اسباب تجارت کا ایک عام و مشترک ذخیرہ فراہم کیا تھا۔ چند سال کے عرصہ میں اس نے غیر معمولی ترقی کر لی اور ہر قسم کی تجارت اس کے ہاتھ میں آگئی مگر نتیجہ کے لحاظ سے یہ بھی بدقسمت ثابت ہوئی اور حکومت نے اس کو بھی فنا کر کے چھوڑا۔

اس وقت یورپ امریکہ، اور ایشیا میں بہت سی اشتراکی انجمنیں پائی جاتی ہیں اور اکثر "اشتراکیت تعاون" کے اصول پر قائم ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ کامیابی روس میں ہوئی اور اسی کی کامیابی نے روئے زمین میں پھر از سر نو اشتراکیت کے جراثیم پیدا کر دیے ہیں اور روز بروز ان میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ چین کا موجودہ انقلاب اسی کا نتیجہ سمجھا جائیگا اور ہندوستان میں ایسی جماعتوں یا انجمنوں کا قائم ہو جانا بھی اسی کا پرتو ہے۔

مئی سنہ ۱۹۲۹ء | دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں جس نے کسی انقلاب کو بغیر مقابلہ صدمات و خطرات قبول کر لیا ہو۔ انقلاب خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، ذہنی ہو یا جسمانی، مذہبی ہو یا سیاسی نام ہے ان نقوش و آثار ان امیال و عواطف اور ان عوامل و موثرات کے محو کر دینے کا جو زمانہ مدید تک ہمارے حواس و اذہان کو متاثر کر چکے ہیں اور جن کے خلاف جنگ کرنا گویا ایک "بنیان مرصوص" ایک کوہ راسخ "کو ریزہ ریزہ کر دینا ہے پھر یہ تو شدنی ہے کہ اس کوشش میں ہم مجروح بھی ہوں گے اور ہلاک بھی، لیکن اس کو آپ کیا کہیں گے، اگر اسی دوران جنگ و مقابلہ میں افتراق و تشتت پیدا ہو جائے اور قوت مرکزی ضعیف، یقیناً یہ وقت ایک قوم کی تاریخ انقلاب میں نہایت نازک وقت سمجھا جاتا ہے اور بیجا نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ اس وقت ہندوستان اسی "نازک وقت" سے گزر رہا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جس ملک میں ہندو مسلمان ایسے دو متضاد عنصر موجود ہوں گے، وہاں کبھی اتحاد پیدا نہیں ہو سکتا اور نہ وہاں "آزادی" کی امن پسند دیوی کبھی اپنا نشیمن بنا سکتی ہے مجھے اس کے ماننے میں کچھ تامل ہے، کیونکہ بعض ملک (مثلاً سوئٹزرلینڈ) اسوقت یورپ میں ایسے موجود ہیں جہاں ایسے ہی متضاد عناصر پائے جاتے ہیں اور وہاں وہی امن و سکون وہی حریت و آزادی ہے جس کا قیام بغیر اتفاق کامل کے ناممکن ہے۔ اس لئے قبل اس کے کہ ہم مایوس ہو کر بیٹھ جائیں یہ غور کر لینا چاہئے کہ ہمارا باہمی "تضاد" واقعی اس قسم کا ہے کہ کبھی آپس میں ملنے نہیں دے سکتا، یا ہم نے غلطی سے اس کو ایسا سمجھ لیا ہے میری رائے اس باب میں شق ثانی کی طرف ہے اور میرا اعتقاد ہے کہ ہندو مسلم نا اتفاقی نتیجہ ہے صرف غلط فہمی کا اور یہ غلط فہمی وہ ہے جس کے پیدا کرنے کے ذمہ دار صرف مذہبی علماء ہیں خواہ وہ مسلمانوں کے ہوں یا ہندوؤں کے۔

ہندوستانی آبادی میں مذہبی پیشوایان کی جماعت ہر چند کمیت کے لحاظ سے زیادہ نہیں ہے لیکن کیفیت و اثر کے لحاظ سے وہ بہت زیادہ ہے اور جس وقت ہم ان کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ فطرت نے

اس وقت تک کیونکر گوارا کر لیا کہ یہ جماعت "جو جبین انسانیت" کا بدترین داغ ہے، اتنے عرصہ تک قائم رہے۔

مذہب کے صحیح مفہوم کو بگاڑ کر عوام کو گمراہ کرنے والی، اخلاق کی صورت کو مسخ کر کے پبلک کو تنگ نظر بنا دینے والی اوہام اکاذیب کو ذریعۂ نجات قرار دینے والی اور فطرت کی تمام صداقتوں پر پردہ ڈال کر صرف مکروفریب کی پرستش کرانے والی جماعت اگر کوئی ہے تو وہ صرف مذہبی علماء کی ہے اور تاوقتیکہ ان کے بچھائے ہوئے جال سے ہم اپنے آپ کو آزاد نہ کریں گے اس وقت تک کسی فلاح کی امید رکھنا بالکل بے سود ہے۔ اُن کی تعلیمات یکسر کاذب، اُن کی ہدایت سراسر گمراہ کن، ان کا دین، مذہب و اخلاق بالکل خدع و فریب اور ان کا وجود از سرتا پا لعنت ہے، اس جماعت کی داستان مکروزور بہت طویل ہے، اور تاریخ بشریت کی ابتداء سے لیکر تا ایندم اُن کی دراز دستیاں اور فتنہ سامانیاں یکساں طور پر ہادم اخلاق و انسانیت نظر آتی ہیں۔ ترکی کی تباہیاں ایران کی ویرانیاں، افغانستان کی بربادیاں ہندوستان کی غلامیاں، سب انہیں بابرکت ہستیوں کی کارفرمائی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ کب تک دنیا ان کی وجہ سے سوگوار رہیگی۔

میں ہندوؤں سے دریافت کرتا ہوں کہ کیا اُن کی چھوت چھات کیا انکا ایک خاص جذبۂ تفوق کے ماتحت دوسری قوموں کو ذلیل و ناپاک سمجھنا کیا گاے کا یہ لایعنی احترام کہ اس کے لئے انسان کا خون بہانا بھی جائز قرار دیا جائے، کیا دوسرے مذاہب کے اکابر کو بُرا کہنا واقعی ہندو مذہب کی تعلیم ہے اور کیا یہ تمام تنگ نظریاں ان کے یہاں کے مذہبی علماء کی تعلیم کا نتیجہ نہیں ہیں، کیا ہندو مذہب نام صرف چوٹی اور زنار کا ہے، کیا ہندو مذہب عبارت ہے صرف مندر و ناقوس سے، کیا اُن کے ہادی و پیغمبر نے یہ تعلیم نہیں دی کہ تمام بنی نوع انسان ایک حیثیت رکھتے ہیں اور دوسروں کے لئے ایثار و رواداری عین فرض انسانیت ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ دوسرے مذاہب حقہ کی طرح ان کو بھی یہی درس دیا گیا تھا اور ایک زمانہ تک اسپر عامل رہنے کے بعد جب علماء زور کا زمانہ شروع ہوا تو مذہب کے صحیح خط و خال محو ہوگئے اور آج اُن کے مذہب کا مفہوم صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب والوں کو نجس و ناپاک سمجھیں، ان کے اکابر کو گالیاں دیں، اور ایک معمولی جانور کے مقابلہ میں انسان کو ذبح کر دینا روا رکھیں۔ کیا وہ کہہ سکتے ہیں کہ انکا مذہب وہی ہے جسکا اسوہ رام اور کرشن نے پیش کیا تھا اور ان کا مسلک وہی ہے جو اس سے پیشتر آریہ ورت کے سورماؤں کا تھا؟ ہندوؤں کا مذہب جو اپنے فلسفہ پر ہمیشہ فخر و ناز کر سکتا ہے حقیقتاً ایک ایسا وسیع و جامع مذہب تھا جس میں تفریق نوع انسانی ہمیشہ گناہ سمجھی جاتی تھی لیکن آج اس مذہب کا انتہائی ارتقا اپنے فلسفہ کے لحاظ سے صرف پتھروں کو خدا سمجھنا اور عمل کے لحاظ سے صرف لیکھرام اور راجپال پیدا کرنا رہ گیا ہے یہ کیوں؟ اس لئے کہ وہ اپنے مذہب سے بیگانہ ہیں اور جس چیز کو انھوں نے اپنا مذہب بنا لیا ہے، وہ مجموعہ ہے صرف مزخرفات و اوہام کا جنھیں ہوا پرست مذہبی علماء نے اپنا احترام و اقتدار قائم کرنے کے لئے رواج دیا اور جاہل پبلک نے اُسے خدائی تعلیم سمجھ کر قبول کر لیا۔

بالکل یہی حال مسلمانوں کا ہے کہ آج اُن کے تمام عبادات وشعایر بے روح ہیں اور ان کے اعتقادِ مذہبی یکسر مردہ و بے جان نہ اُن کی نماز میں یہ صلاحیت باقی رہتی ہے کہ منکرات ومعاصی سے باز رکھ سکے اور نہ ان کے روزہ میں یہ اہلیت پائی جاتی ہے کہ دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنا سکھائے۔ ان کا مذہب نام ہے صرف متعین حرکات کا، مخصوص وضع ومعاشرت کا، انکا اعتقاد ہے کہ اگر مسلمان گائے کی قربانی چھوڑ دیں تو مسلمان نہیں رہ سکتے، اگر اذان ونماز کے وقت، ناقوس کی آواز سنکر لاحول پڑھتے ہوئے کان نہ بند کرلیں تو کفر کی اعانت کرنے والے کہلائیں الغرض صحت اخلاق، تصفیۂ نفس، تزکیۂ روح اور اخوت عامہ جو اسلام کا صحیح مفہوم تھا وہ رسم ورواج پر قربان ہو چکا ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی اس ایثار ورواداری سے کام لینے کے لئے آمادہ نہیں جو "رحمۃ للعالمین" کے مبعوث ہونیکا مقصود تھا یہاں بھی سبب وہی ہے کہ مذہبی علماء نے اپنی اغراض کے ماتحت عوام کو مذہب کی صحیح تعلیم نہیں دی اور اسلام کو ایسی بدترین شکل میں پیش کیا کہ آج کوئی صحیح الدماغ انسان انکی تعلیمات کو صحیح سمجھ کر اس مذہب کے حق ہونے پر حکم نہیں لگا سکتا۔

الغرض مذہب کی بنا پر جہاں کہیں دنیا میں فساد پیدا ہوا یا ہو رہا ہے وہ نتیجہ ہے انہیں علماء سوء کی گمراہ کن ہدایت کا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ مذہب نام ہے صرف حقیقت وصداقت کا اور دنیا میں کبھی سچائی یا حق پر باہم اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ اسلیئے اگر کوئی صورت ہندو مسلم اتفاق کی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ دونوں اپنی اپنی جماعت سے اس مہلک عنصر کو علیحدہ کریں اور انکے بتوں کو مسمار کر کے صرف

کفر و اسلام در رہش پویان

کو معیارِ مذہب کا قرار دیں

ہندو مسلمانوں کی تفریق کے علاوہ ایک اور زیادہ مہلک افتراق خود اپنے ہی اندر کی جماعتوں کا ہے اور اس اختلاف نے اسقدر شدید منافرت باہم پیدا کر دی ہے کہ آج کفر واسلام سے زیادہ "دست وگریبان" کا جھگڑا تباہ کن ثابت ہو رہا ہے۔ یہ منظر بھی پیدا کیا ہوا انہیں متبرک ہستیوں کی چیرہ دستیوں کا ہے اور اسکے دور کرنیکی بھی وہی تدبیر ہے جو عرض کی گئی

زمانہ اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ ہر شخص نیک و بد میں آسانی سے تمیز کر سکتا ہے اسلیئے دنیا کو اب ان مولویوں پنڈتوں، اور مجتہدوں کی ضرورت نہیں، بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر شخص خود اپنے آپ کو اپنا رہنما قرار دے کہ عقل سلیم سے زیادہ کوئی ہادی ومصلح نہیں

اجری المدامع بالدم المهراق
خطب اقام قیامة الاماق

جون سنہ ۱۹۲۹ء

الغرض وہ خطرہ جس کا اندیشہ تھا آکر رہا اور جس ہولناک نتیجہ سے تمام عالم اسلامی ڈر رہا تھا سامنے آہی گیا دنیا میں اس سے قبل بھی وحشت و بربریت نے جہل و علم کا مقابلہ کیا ہے، مکاید سیاست اور دسائس استعمار نے اس سے پہلے بھی انسانیت و اخلاق کو بارہا مجروح کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ امیر امان اللہ خان کا انتہائی بیکسی کے ساتھ اپنے ملک کو تباہ و خون آلود حالت میں چھوڑ کر چلے جانے پر مجبور ہونا ایسا زبردست خراج ہے جو اس سے قبل شاید ہی کبھی حق و صداقت کی طرف سے کذب و بطلان کے حضور میں پیش کیا گیا ہو

یا راحلاً وجمیل الصبر یتبعه

هل من سبیل الی لقیاك یتفق

(اے صبر و ضبط کی سل سینہ پر رکھ کر جانے والے سچ بتا کیا تجھ سے پھر ملنے کی بھی کوئی سبیل ہو سکتی ہے یا نہیں)

آج ۲۰ مئی کو جبکہ میں ملاحظات لکھنے جا رہا تھا یہ دلدوز خبر آگئی ہے اور میں حیران ہوں کہ اپنے جذبات کا بیان کن الفاظ میں کروں اور اس غم و غصہ کو کیونکر ظاہر کروں جو اس وقت میرے ریشہ ریشہ میں ایک التہاب کی کیفیت پیدا کیے ہوئے ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امیر امان اللہ خان کا اپنے بدنصیب جاہل ملک کی اصلاح سے مایوس ہو کر چلا جانا، کسی ایک ذات کی مایوسی اور کسی ایک اسلامی سلطنت کی تباہی و بربادی کا سوال نہیں ہے، بلکہ سوال ہے اسلام کے مستقبل کا، تمام عالم اسلامی کے انجام کا اور اسکا کہ کیا وہ وقت ابھی نہیں آیا ہے جب ان علمبرداران مذہب کے خلاف جو حقیقتاً انسانی درندے ہیں جہاد عظیم کیا جائے۔

میں قیامت تک یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ انقلاب افغانستان صرف سیاست بیرونی کے مکاید کا نتیجہ ہے، کیونکہ اگر ملک کے مذہبی قائدین جنکے اشارہ پر جاہل پٹھانوں کی حرکت و جنبش موقوف ہے خود ذلیل و دنی الطبع نہ ہوتے تو وہ کیوں کسی خارجی اثر کو قبول کرتے (اگر واقعی کوئی ایسا اثر پیدا کیا گیا) اور یہ وحشیوں کا گروہ کیوں اپنے ہاتھ سے اپنی خودکشی کے اسباب فراہم کرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ بدنصیب ہے وہ قوم جو مذہبی علماء کے اختیار میں ہو۔ اور صد درجہ بدبخت ہے وہ ملک جسکے تدبیر و اصلاح میں ان بندگان طاغوت کو دخل حاصل ہو۔ یہ گروہ خواہ وہ ہندوستان میں ہو یا افغانستان میں ترکی میں ہو یا مصر و ایران میں ہر جگہ ایک مستقل عذاب کی صورت اختیار کیے ہوئے ہے اور یہ بھی قدرت کا عجیب و غریب کھیل ہے کہ جس جماعت کو منصب تعمیر کیلئے متعین کیا تھا اسکے ہاتھوں آج وہ تخریب کا تماشہ دیکھنا چاہتی ہے۔

افغانستان سے ایک شخص اٹھتا ہے اور تمام ان قربانیوں کے بعد جو ایک انسان پیش کر سکتا ہے ملک کو جلد

ہے جلد منازل ترقی طے کرنے پر آمادہ کرتا ہے، اور چند دنوں میں اتنی عظیم سیاسی اہمیت پیدا کرلیتا ہے کہ کرۂ ارض کے معزز ترین حکومتیں بھی اسکی آزادی اور خودمختاری تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ لیکن ٹھیک اسوقت جبکہ آفتاب اقبال نصف النہار پر پہونچنے کے قریب ہوتا ہے، ملک کے بوسیدہ خانقاہوں، مرکز جہل و عصیان عبادتگاہوں سے مخالفت کی آواز بلند ہوتی ہے کہ امان اللہ کافر ہے۔ کیونکہ وہ تعلیم جدید کا حامی ہے، آزادی نسوان کا طرفدار ہے، مغربی ملبوس پسند کرتا ہے اور ان اسباب و دلایل پر اس کو علیحدہ کرکے ملک کے تمام آثار ترقی وحیات کو برباد اور افغانستان کو پھر ایک صدی کیلئے پیچھے ڈھکیل دیا جاتا ہے

وائے گردرپس امروز بود فردائے

اگر یہ حامیان مذہب و مذہبیت واقعی راستی پر ہیں اور امان اللہ خان کی اصلاحات جدیدہ حقیقتاً کافرانہ تھیں اور اسلام نام ہے صرف اس جہل و تاریکی، اس بوسیدگی و کہنگی، اس پستی و ذلت، اور اس نکبت و بد سلیقگی کا جس کا بہترین نظارہ حامیان مذہب کے خلوتکدوں، انکی عبادتگاہوں اور انکی مجالس وعظ و تلقین میں کیا جا سکتا ہے، تو پھر وہ وقت دور نہیں جب ہر شخص کا انسانی و فطری فرض یہ ہوگا کہ وہ اس اسلام ہی کو دنیا سے نیست و نابود کرنیکے لیئے اٹھ کھڑا ہو اور اگر ایسا نہیں ہے، بلکہ اسلام نام ہے ایک پرستش حقیقت کا، اک ارتقائی اقدام کا، مادی و روحانی استعلا و ترقی کا، بلکہ روس بھی زبان سے یہ ثابت کردینے کا کہ دنیا میں جہاں تہذیب و تمدن ہے، جہاں حق و صداقت ہے، جہاں راستی و دیانت ہے، جہاں خیر و برکت ہے جہاں امن و فلاح ہے، وہ صرف اسلام ہی کا کرشمہ ہے اور اسلام نام ہے صرف مکارم اخلاق کا، نہ کہ کسی مخصوص وضع و ملبوس، اور کسی متعین گرایش و نمایش کا، تو پھر لازمی منطقی نتیجہ صرف یہی نکلتا ہے کہ ہر وہ شخص جو دشمن ترقی ہے دشمن اسلام ہے اور مولویوں کو جسقدر عداوت اس چیز سے ہے اس کا حال کسی سے مخفی نہیں ہے۔

قبائل کی جنگ ایام عرب کی مشہور چیز تھی، لیکن اسلام نے ظاہر ہو کر سب سے پہلے اس کو مٹایا، آج غلزیوں اور درانیوں دو قبیلوں کی مخالفت افغانستان کو تباہ کر رہی ہے، لیکن یہ پیروان سنت نبوی اس اختلاف کو کم کرنیکے بجائے اور زیادہ شدید بنا رہے ہیں، اسلام کا درس یہ تھا الحکمۃ ضالۃ المومن (حکمت و دانائی مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے جہاں ملے اسے لیلو) لیکن یہ جانشینان رسول آج یہ سمجھا رہے ہیں کہ اسلام نام ہے صرف قدامت پرستی اور جہل و نسیانی کا، اسلام نے ہدایت کی تھی کہ طلب علم میں پوری جد و جہد کرو، حالات عالم پر غور و فکر کرو، صحت تدبر اور اصابت رائے سے کام لے کر دنیا میں خدا کی خلافت دنیا پر قائم کرو۔ لیکن آج اسلام کی جماعت منادین کہتی ہے کہ نہیں اسلام نام ہے صرف اس دائرہ میں رہنے کا جہاں انسان پیدا ہوا ہے، اسلام نام ہے صرف تجرد ذہنی اور اعوجاج دماغ کا۔ اور جو شخص جتنا زیادہ جاہل، زیادہ احمق اور

زیادہ بندۂ نفس ہے۔ اتنا ہی زیادہ مسلمان ہے، پھر ظاہر ہے کہ جس ملک و ملت کی باگ ایسے متبرک ہاتھون مین ہوگی وہان جو نکبت و ادبار بھی ظاہر ہو کم ہے اور وہ انکی سرزمین جسقدر تباہ و برباد ہو دیا وہ نہین۔

مولویون کی جماعتین خواہ ہندوستان مین ہون یا اس سے باہر حقیقتاً انسانیت کی توہین ہین اور ننگ وجود کائنات ہین اسی لعنت کا مستحق ہے جو کاذبین اور کاذبین کیلئے استعمال کی گئی ہے۔ انھون نے اپنی خاص صورتین بنائی ہین، انھون نے اپنا ایک ملبوس علیحدہ وضع کیا ہے، انھون نے اپنی ایک زبان جداگانہ قائم کی ہے، الغرض انھون نے اپنے آپ کو بتون کیطرح پیش کرکے اسکے سامنے لوگون کو سربسجود ہونیکا حکم دیا ہے اسلیئے ضرورت ہے کہ ان بتونکو توڑ ڈالا جائے، ان کی صورتین بگاڑ دیجائین انکے عبا و قبا مین آگ لگا دیجائے اور ان کے مواعظ و نصائح کو جو یکسر مجموعۂ مزخرفات ہین دریا برد کر دیا جائے۔ انکی لمبی ڈاڑھیان عہد نبوی کی ڈاڑھیان نہین ہین بلکہ قسیسین و رہبانین کی ڈاڑھیان ہین جو صرف شہوت پرستی و ستمرانی کے سایہ مین بڑھتی تھین، ان کے عبا و قبا، انکا عمامہ و جریب، ان کی تسبیح و تہلیل اور ان کے اوراد و وظائف قرون اولیٰ کی نشانیان نہین ہین، بلکہ نصاریٰ و یہود، گبر و ترسا کے مذہبی قائدین کی یادگار ہین جن سے سوائے اشاعت مکر و فریب کے اور کوئی کام نہ لیا جاتا تھا۔ اسلیئے ضرورت ہے کہ دنیا ان بہروپیون کے صحیح خد و خال کا مطالعہ کرے اور ان کو اسیطرح ٹھکرا دے جیسے ایک ذلیل کتے کو ٹھکرایا جاتا ہے۔ آج افغانستان کا یہ نابکار گروہ اپنی کامیابی پر بہت نازان ہوگا لیکن اس کو معلوم ہونا چاہیئے کہ امان اللہ خان کی ناکامی بھی اہل نظر کے نزدیک بڑی فتح ہے اور انکی یہ وقتی و عارضی فتح و کامیابی بدترین شکست کا حکم رکھتی ہے جس وقت تاریخ افغانستان مرتب کیجائیگی تو امان اللہ خان کا نام وہان بھی زرین حروف سے لکھا جائے گا اور ان بندگان حرص و ہوا اور غلامان زر پر وہان بھی لعنت بھیجی جائیگی۔

جولائی سنہ ۱۹۲۹ء نگار کی اس اشاعت سے سولھوین جلد کا آغاز ہوتا ہے اور گزشتہ، سال ۶ ماہ کا زمانہ غالباً "حق صحبت دیرینہ" قائم کرنیکے لیے ناکافی نہ سمجھا جائیگا جسکے مطالبہ مین اگر نگار اور ناظرین نگار دونون اصرار و ابرام سے کام لین تو بیجا نہ ہوگا

سب سے پہلے مجھے اپنے ادائے فرض کے متعلق یہ کہنے مین مطلق پس و پیش نہین ہو سکتا کہ :-

از نفس آنچہ داشتیم صرف ترانہ کردہ ایم

اب یہ اور بات ہے کہ نتیجہ کے لحاظ سے اور اثر و اعتبار کی حیثیت سے مین ایک لفظ "اعتراف" کا بھی مستحق نہ قرار پاؤن۔

شعلہ چکیدہ عشم گرا گل شگفد مزد کو
شمع شبستانیم باد سحرگاہیم

یہ تو صورت ہوگئی اس حق کے فیصلہ کی جو ناظرین نگار کیطرف سے مجھ پر یا نگار پر عاید ہوتا ہے، اب رہا میرا یا نگار کا مطالبہ ملک و اہل ملک سے سو اس کے متعلق کیا عرض کروں حقیقت یہ ہے کہ "نہ میں سمجھا" اور نہ آپ نے بے مہری سے کام لیا، تاہم انور دہلوی کا یہ مصرعہ ضرور زبان پر آجاتا ہے "پسینہ پونچھیے اپنی جبین سے" نگار اس حد سے گذر گیا ہے کہ اس کے مقاصد و اغراض کی تشریح کیجائے اور نہ اس کو اس سطح سے نیچے لے آنیکی کوئی توقع کسیکو پیدا کرنا چاہیئے جو اُسے اپنے لئے بالکل جداگانہ قائم کر لی ہے کیونکہ جو لٹریچر اس کے ذریعہ سے پیش ہو رہا ہے خواہ وہ ادب لطیف سے متعلق ہو یا اصلاح مذہب و معاشرت سے دنیا کی کوئی یسیر الحصول جنس نہیں ہے اور نہ وہ تاجرانہ "لب و لہجہ" سے تعلق رکھنے والی کوئی چیز جسکا بطون اسکے ظاہر سے مختلف ہوا کرتا ہے اور جسکو ہر وقت آسانی سے بدلنا ممکن ہے، میں جو کچھ کہتا ہوں حق سمجھ کر کہتا ہوں اور صداقت کے اعلان میں دنیا کی کسی قوت سے نہ ڈر کر جو مسرت میں محسوس کرتا ہوں اس کو مٹا دینا میرے اختیار کی بات نہیں ،

برلب یا علی سرے بادہ روانہ کردہ ایم مشرب حق گزیدہ ایم عیش مغانہ کردہ ایم

نگار نے جو عظیم الشان انقلاب ہندوستان کے مذہبی عقول انسانی میں پیدا کر دیا ہے وہ اتنا زبردست، معاوضہ، میری حقیر مساعی کا ہے کہ بعض اوقات میں متحیر ہو جاتا ہوں کہ -

تا چہ فراہم شدست اجرت جانکاہ ام

اور اسکے بعد ایک خاص قسم کا استغنا محسوس کرتا ہوں ، لیکن جس وقت میں یہ دیکھتا ہوں کہ

از ہر چہ گفتن داشتم این جملہ حرفے بیش نیست

تو میری جبینیں بڑھ جاتی ہیں اور ذوق وسعت بیان کی تمنا کیساتھ ساتھ یہ بھی دل چاہتا ہے کہ "گوش سخن شنو" اور "دیدہ اعتبار" دونوں میں ایک اضافہ ہو۔ اسلئے قبل اسکے کہ یہ جلد ختم ہو آپ کو ایکبار کبھی تنہائی میں بیٹھ کر غور کر لینا چاہیئے کہ آپنے اس "حق دیرینہ" کا کس حد تک اعتراف کیا ہے چونکہ قرض کے استرار کے ساتھ وقت و زمان کی تعیین اٹھ جاتی ہے اس لئے آپ اب بھی اور ہر وقت اس کی تلافی کر سکتے ہیں

اگست ۱۹۲۹ء اگر خالص لکھنؤی آبادی کا تجزیہ کیا جائے تو غالباً اس کے صرف تین عنصر دریافت ہونگے

شاعر، حکیم، افیمی، اور ان تینوں کو اپنی فطرت، پیشہ، اور مشرب کے لحاظ سے حسب درجہ مرنجان مرنج، صلح کل اور منکسر مزاج ہونا چاہیئے ظاہر ہے۔ یہ میں اسوقت کہتا ہوں، ورنہ اس سے قبل اوائل عمر اور زمانۂ طالب علمی میں جس لکھنؤ کو میں نے دیکھا وہ موجودہ لکھنؤ سے بہت مختلف تھا۔ مولوی صدیق حسن غازیپوری میرے اتالیق ہر وقت میرے ساتھ رہتے تھے، اور ہر چند یہ اپنے حلقۂ احباب میں بہت رنگین مزاج مشہور تھے، مگر میرے لیئے وہ ایک مستقل بے آب و رنگ چیز تھے اور میں نے ہمیشہ انکو نگاہ کراہت سے دیکھا۔ دن کا تمام حصہ اور رات کے کچھ گھنٹے انہیں کی بے مہری اور عبوس فطرت کی معیت میں بسر ہوتے تھے اور میری حالت ایک طائر پربند سے زیادہ نہ تھی۔ اسلیئے اگر کسی دن مجھکو آزادی نصیب ہو جاتی تھی تو میں لکھنؤ کو حد درجہ حریص نگاہوں سے دیکھتا تھا اور اس قلیل فرصت کو تتبع و مطالعہ نہیں بلکہ زیادہ تر صرف قیاس و خیال سے کام لے کر رنگین بنانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اب بھی مجھے وہ نامعلوم سی کشش یاد ہے جو یہاں کے در و دیوار میں محسوس کرتا تھا۔ اور ہنوز اس محبت کی لذت میرے دل سے محو نہیں ہوئی جو یہاں کی فضا سے پیدا ہو گئی تھی اور اس کو میری لکھنوی زندگی کا دورِ اولین سمجھنا چاہیئے

میری عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ تیرہ چودہ سال کی ہوگی لیکن نہ صرف صحت جسمانی و استواری اعضاء کے لحاظ سے بلکہ اس اعتبار سے بھی کہ فارسی ادبیات ختم کر چکا تھا۔ اور عربی کے درس نظامی کی نشاط کش اور ہادم لذات مشغلہ کے باوجود ابھی تک عرفی و نظیری، غالب و بیدل میرے دل و دماغ پر مستولی تھے، صوری و معنوی دونوں طرح دوسرے لوگوں کو بھی نوجوان نظر آتا تھا اور خود بھی عنفوان شباب کی لذت کو ایک نئی کھلنے والی کلی کی خوشبو کیطرح محسوس کر رہا تھا۔ میرے والد اسوقت دولت گنج کے تھانہ میں انچارج تھے اور چونکہ خود فارسی کے اچھے ادیب شاعر تھے اور اپنے اخلاق و خصائص کی وجہ سے نہایت ہی دلچسپ و ہر دلعزیز انسان تھے اسلیئے صبح و شام ایک اچھی خاصی مجلس شعراء، امراء و ظرفاء کی برپا ہو جاتی تھی

شاعروں میں سے صرف ایک صاحب "بنھو میاں شفیق" کا نام مجھے یاد رہ گیا ہے، اور انکی یہ خصوصیت بھی یاد ہے کہ کان پر نیم کا تنکا (غالبًا خلال کرنیکے لیئے) ضرور رکھا رہتا تھا۔ ظرفا میں سے ایک صاحب سید باقر حسین تھے، افیون اور بٹیر انکے نشاط زندگی کا جزو لازم تھیں میں نے اسوقت تک ایسا عجیب و لطیف گفتگو کرنیوالا انسان نہیں دیکھا۔ وہ بات بات پر انکی لطیفہ سنجیاں، شعر خوانیاں، خوش الحانیاں اور لکھنؤ کے صحیح ٹکسالی محاورات کا استعمال مختصرًا یوں سمجھیے کہ :-

"از اثرِ ناطقۂ بندم طراز"

کی صحیح و مکمل تصویر تھے

الغرض وہ ماحول جو اوائل عمر میں یہاں پیدا ہو گیا تھا وہ میرے احساسات کے لحاظ سے ایسا پُر لطف تھا کہ ہر وقت میرے دماغ پر نشہ سا چھایا رہتا تھا اور لکھنؤ کی ساری فضا کو اسی کیفیت میں ڈوبا ہوا پاتا جس نے مجھے سرشار بنا رکھا تھا۔ یہ دوسرا دور تھا جو یہاں آکر ختم ہوتا ہے۔

دن گذرتے گئے اور رفتہ رفتہ میری عمر کے ساتھ پابندیاں بھی کم ہوتی گئیں، یہاں تک کہ وہ زمانہ آیا جب والد نے اپنے خاص اصول تربیت کی بنا پر مجھے بالکل آزاد چھوڑ دیا اور یہی وہ تیسرا دور تھا جس نے مجھے بتایا کہ زندگی کسے کہتے ہیں، شاعری کا خلاق کیا ہے اور بہت سے شاعرانہ الفاظ و تراکیب کا صحیح مفہوم کیا ہو سکتا ہے اس سے قبل فارسی ادبیات اور اردو شاعری کا جو مطالعہ میں نے کیا تھا، وہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کسی مرئی چیز کا درس صرف سامعہ کے ذریعہ سے دیا جائے۔ لیکن اب مجھے اجازت تھی کہ دیکھنے کی چیزوں کو دیکھوں سننے کی باتوں کو سنوں، اور جو اشیاء چھونے کے لئے وضع ہوئی ہیں انھیں اپنے لمس سے محسوس کروں

اس سے قبل میں غالب کی ایک مثنوی کا یہ شعر پڑھ چکا تھا۔

جلوہ گرے آفتِ نظارۂ ۔ برقِ تمثال وے انگارۂ

لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرا استاد باوجود کوشش بلیغ کے مجھے کبھی نہ سمجھا سکا کہ جلوہ گری کا صحیح مفہوم کیا ہے اور "آفت نظارہ" کس نوع کا "آشوبِ چشم" ہے لیکن اب از خود اک الہامی کیفیت کے ساتھ نہ صرف یہی بلکہ

"میانہا نازک و دلہا توانا" کی حقیقت

"قیامت قامتاں مژگاں درازاں" کا مفہوم

"زرنگیں جلوہا غارتگر ہوش" کا علم مجھے حاصل ہو رہا تھا

بلکہ اس سے بھی زیادہ

"زہرہ را اندر ردائے نو عریاں دیدہ ام" اور

"کتاں خویش می شویم بہ مہتاب" کے

مدارج و منازل سے گزر رہا تھا۔

الغرض لکھنؤ کے مطالعۂ آدمیت کا آخری منظر جس طرح ختم ہوا وہ تو ایک ایسی چیز تھا جو بہرحال صورت میں دعوت برگ و نوائے کند

اور اسی لئے جب میں یہاں سے جدا ہوا تو میری حالت ایسی تھی جیسے ساون میں کسی کی بینائی زائل ہو جائے

مین نے لکھنؤ کو اپنی عمر کے جس خوشگوار موسم مین اوّل اوّل دیکھا اُسے -

"زموج گل بہاران بستہ زنار"

کہنا چاہیئے اور اسکا تعلق بالکل خود فراموشانہ اور اسی لیئے غیر ذمہ دارانہ زندگی سے تھا۔ اسکے بعد بھی بارہا لکھنؤ آنیکا اتفاق ہوا لیکن بالکل مسافرانہ یا کبھی کبھی کسی خاص ضرورت سے مجبورانہ جسکو شاعری یا شاعرانہ احساس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اِس مرتبہ جب مین نے مستقلاً یہان قیام کا ارادہ کیا تو بحالات زندگی بالکل بدل چکے تھے، حیات کی مشکلات اور عاملانہ ذمہ داریون نے بقول غالب -

"زدشواری زیستن مردنی"

بنا رکھا تھا اور نہ وہ فراغت خیالی تھی، نہ آسودگی حال، نہ وہ جوش نشاط تھا، نہ وہ سن وسال، "فکر فضول" کی جگہ "غور و تامل" نے "جرأت رندانہ" کی جگہ "احتراز پیرانہ" نے لے لی تھی اور خیالات کے شیرین عالم سے ہٹ کر واقعات کی "تلخ گزار" دنیا مین آگیا تھا۔ بہرحال اس مرتبہ میرا لکھنؤ آنا نہ عہد گذشتہ کی یاد تازہ کرنے کے لیئے تھا اور نہ اس کا ماتم کرنے کے لیے، بلکہ بجائے تماشائی کے، یہاں کی آبادی مین شامل ہو کر خود تماشہ بننے کے لیئے -

اگر گذشتہ تین سال کا مسلسل قیام اور آیندہ کیلیئے تا بقائے حیات یہین رہنے کا عزم راسخ مجھے داخل لکھنؤ تو نہین کرتا، خادمان لکھنؤ مین شامل کر سکتا ہے، تو مجھکو یہ حق غالباً حاصل ہے کہ باشندۂ لکھنؤ ہونیکی حیثیت سے اپنے اُن تجربات کا ذکر کرون جو اس وقت تک دوران قیام مین مجھکو یہان حاصل ہوئے -

اب آپ اس مقالہ کے اولین فقرہ کی طرف پھر توجہ کیجیئے جو خالص لکھنؤ کی آبادی کے "عناصر سہ گانہ" کے متعلق مین نے لکھا تھا ——— ہان، تو اُن تین عنصرون مین سے اس وقت مجھے جس سے بحث کرنا ہے وہ "عنصر شعراء ہے" جسمین اہل صحافت کو بھی شامل کر لینا چاہیئے

لکھنؤ کے شاعرونمین بڑا حصہ تو اُن حضرات کا ہے جو یہین کی خاک سے پیدا ہوئے یا یہین کی سرزمین سے اپنے آپ کو منسوب کر کے لکھنوی ہی لکھتے ہین (اِس جماعت مین بعض وہ حضرات بھی شامل ہین جو ہین تو ضلع لکھنؤ کے کسی قریہ یا دیہہ کے، لیکن اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہین وہ لکھنوی ہی)، دوسرا چھوٹا حصہ اُن بیرونی شاعرون کا ہے جو بسلسلۂ ملازمت، تجارت یا تعلیم و تعلم وغیرہ یہان مستقلاً یا عارضی طور پر مقیم ہین -

گذشتہ تین سال کے اندر مین نے اس کو نہایت تکلیف کے ساتھ محسوس کیا کہ یہ دونون جماعتین

باوجود ہم مشرب و ہم مسلک ہونے کے ایک دوسرے کی حد درجہ مخالف ہیں اور کسی محفل میں ان دونوں کا اجتماع گویا دو متضاد اُم عناصر کا اجتماع ہوا کرتا ہے۔ ایک کہتا ہے کہ وہ دیہقانی ہے، گنوار ہے، لکھنؤ کے محاورات، یہاں کی زبان اور یہاں کے لب لہجہ سے کیا واقف ہو سکتا ہے، دوسرا کہتا ہے کہ،

آنچہ در گفتار فخر تست آن ننگ من ست،

لکھنؤ میں آج تک کوئی شاعر پیدا ہی نہیں ہوا، یہاں کی سرزمین میں اس جنس بے بہا کی پیداوار کی اہلیت ہی نہیں ہے تغزل نام ہے جذبات نگاری کا جس سے یہاں کے شعراء بالکل نا آشنا ہیں اور صرف رعایت لفظی کے جھوٹے طلسم میں اپنے آپ کو پھنسائے ہوئے ہیں۔

ہر چند میں اس وقت لکھنوی و غیر لکھنوی شاعری کے فرق و امتیاز پر بحث کرنیکے لیئے آمادہ نہیں ہوں، مگر جہاں تک تنقید صحیح کا تعلق ہے ضمناً یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ اس مسئلہ میں دونوں زیادتی پہ ہیں۔

اہل لکھنؤ کا ظلم تو یہ ہے کہ وہ یہاں کی فضا میں کسی بیرونی شاعر کا در خور دیکھ ہی نہیں سکتے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی غیر کا انکی محفل یا انکے شہر میں غزل پڑھ دینا گویا "باندازۂ یک غزل" انکی شہرت کو صدمہ پہنچانا ہے، اور اس کا انتقام لینے کے لیئے وہ زبان، محاورہ وغیرہ کے دلائل سامنے لاتے ہیں جو اِس وقت واقعی بالکل بے معنی سی بات ہے۔

غیر لکھنوی شعراء کی یہ زیادتی ہے کہ ان کو لکھنؤ میں کوئی شاعر نظر ہی نہیں آتا اور زبان کی شاعری یا رعایت الفاظ کو وہ ایسی معمولی بات سمجھتے ہیں کہ ہر شخص اس کو حاصل کر سکتا ہے۔ علاوہ اسکے اگر جذبات نگاری ہی کو اصل چیز مان لیا جائے تو بھی اس کے نمونے یہاں کے شعراء اور وہ بھی خصوصیت کیساتھ آج کل کے شعراء کے کلام میں مل سکتے ہیں۔

سنہ ۱۹۲۹ء | آپ کو معلوم ہے کہ نیرہبات عالم میں سب سے زیادہ مہتم بالشان رفیع القدر و جلیل القدر ساعت از ابتدائے ظہور آدم تا این دم کونسی ہے وہ ۲۶ صفر ۱۳۴۸ھ بروز شنبہ مطابق ۲ اگست ۱۹۲۹ء وقت ۲ بجے دن کی ہے جبکہ آفتاب ۱۲ درجہ ۲۰ دقیقہ ۴۰ ثانیہ پر اول بہ مغرب قائم تھا اور تمام نجوم سعد قران عظیم فرنگی محل کی محلسرا پر نور افگن

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ
واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد

حضرت قبلہ مولینا قطب الدین عبدالوالی صاحب ظلہٗ فرنگی محلی سرپرست انجمن مؤیدالاسلام نے دعوت خاص دی اکناف ہند کے تمام ممتاز علماء کرام اور اکابر رہنمایان قوم کا (ایڈیٹر ہمت کی زبان میں) "شاندار اجتماع ہوا" لامذہبی اور دہریت کے انسداد کی تدابیر پر غور و مشورہ کیا گیا اور اس طنطنہ و دبدبہ اور اس شوکت و جبروت کیساتھ کہ۔

تزلزل در ایوانِ کسریٰ فتاد

راویانِ خجستہ اطوار و پیام رسانانِ ذیجاہ و وقار متفقہ طور پر یوں زمزمہ پرداز ہوتے ہیں کہ ٹھیک اسی وقت جب کہ یہ اجتماع فرنگی محل میں برپا ہو رہا تھا، امریکہ میں بمقام واشنگٹن، ایران میں بمقام طہران ترکی میں بمقام انگورا، روس میں بمقام لینن گراڈ، اطالیہ میں بمقام ویٹیکن، اور انگلستان میں بمقام دفتر کارمعت خطرناک زلزلہ کے آثار محسوس ہوئے، روشنی کے منارے بجھ گئے، مشینیں چلتے چلتے رک گئیں کلیساؤں کے گھنٹے زمین پر آرہے، ماہیٔ زمین نے کروٹ لی، قطب اپنی جگہ سے ہٹتے ہٹتے رہ گیا اور کوہِ طور پر بجلی چمک چمک کر

سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّنَا وَرَبُّ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالرُّوْحِ

جناب مولانا قطب الدین عبدالوالی صاحب نے اپنی مؤثر و ایمان آفرین انداز میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ۔

لامذہبیت اور زندقہ کا سیلاب ہندوستان میں بڑھ رہا ہے اور تحریروں اور تقریروں میں جس طرح مذہب کو بازیچہ بنایا جا رہا ہے وہ آپ حضرات سے پوشیدہ نہیں، افغانستان و ایران جس طرح آزاد ہو رہے ہیں۔ وہ ایسی چیز نہیں جس کا اثر ہندوستان پر نہ پڑے اسلئے ضرورت ہے کہ علماء کرام بہت جلد اپنے فرض امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ادا کرنے کے واسطے میدان عمل میں اتر آئیں

اسکے بعد متعدد "مولاناؤں" نے جن میں بہ لحاظ علم مولینا شوکت علی و بہ لحاظ الخنا، مولانا آزاد سبحانی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں اپنی قیمتی تقریروں" میں "فاضل مقرر" کی تائید کرتے ہوئے علماء کرام کی مستعدی و فرض شناسی کی ضرورت کا اعتراف کیا اور اس طرح گویا اصولاً تحریک کی ضرورت پر مہر توثیق ثبت ہو گئی۔

اسکے بعد مولینا شہید انصاری نے بعض "بزرگانِ قوم" کے خطوط کا خلاصہ سنایا، جنہوں نے اس مقصد سے اظہار ہمدردی کیا تھا اور پھر مختلف "علماء کرام" کا ایمان افروز و خلوص پرور بیان پیش ہوا جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ۔

مغربی تعلیم یورپی معاشرت اور فرنگی مادہ پرستی کا ایک خطرناک اثر ہندوستان میں یہ ہوا کہ بہت سے لوگ آزادی مذہب بلکہ لامذہبی کا شکار ہو رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ارکان دین میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ کوئی سمجھتا ہے کہ دین کی معلومات ضروری نہیں کسی کا خیال ہے کہ علماء دین مذہبی آزادی و ترقی کیلئے سنگ راہ ہیں اور جس قدر جلد ممکن ہو انکا خاتمہ کر دیا جائے غرض آزادی مذہبی مختلف صورتوں میں رونما ہو رہی ہے اور روز بروز اسکا اثر جدید نسل کے قلوب میں گھر کر رہی ہے۔ یہانتک کہ بعض نام نہاد حاملان دین بھی اس سیلاب میں بہہ گئے ہیں ہندوستان کے نوجوان

مختلف جماعتون کے نام سے منظم ہو رہے ہین جو علی الاعلان کہتے ہین کہ کسی مذہب کو زندہ نہ رہنے دو ۔ اور قصر مذہب کی اینٹ سے اینٹ بجا دو ان لوگون نے مذہب کے خلاف عام بغاوت کا اعلان کر دیا ہے ۔ اور نئے فتنہ کے احیاء و ابقا مین سرگرمی کا اظہار کر رہے ہین ۔ اس نہلکہ عظیم سے اگرچہ دیگر اقوام کو بھی نقصان پہونچیگا، لیکن وہ قوم (مسلمان) سب سے زیادہ خسارہ مین رہیگی جن کی قومیت سیاست اور وطنیت سب مذہب ہی ہے ۔ اور جسکی اخروی نجات کا انحصار اسلام ہی پر ہے، ان حالات اور انکے خوفناک نتائج کو محسوس فرما کر انجمن مؤید الاسلام فرنگی محل لکھنؤ نے ۲ و ۳ راگست ۱۹۲۹ء کو ہندوستان کے ہر طبقہ کے علماء کو مدعو کیا اور متعدد اعیان ملت سے بھی مشورہ لیا گیا، اس جلسہ مشاورت نے بالاتفاق مقتدر علماء کی ایک کمیٹی بنادی جو اسباب لامذہبی کے انسداد پر غور کریگی، سر دست ہم دستخط کنندگان یہ اعلان کرنا ضروری خیال کرتے ہین کہ قوم مسلمین کی پناہ و حفاظت اور اسکی دینی اور دنیوی نجات اسلام اور صرف اسلام ہی سے وابستگی پر منحصر ہے ۔ آزاد یورپ کی ترقی یافتہ قومین آج تک نام نہاد مسیحیت کی پرستش کرتی ہین ۔ بامئیں کردہ رہنہ و برادران وطن اسکی سرفروشانہ جد و جہد کر رہے ہین کہ وید کے دھرم کی ہر رسم کی حفاظت کیجائے ۔ ہمارا اسلام دین فطرت ہے اور خالق فطرت کی حکیمانہ تشریحات کا مقدس مجموعہ ہے وہ جہان روحانیت و اخلاق کا مجزدخار ہے وہان حب وطنیت اور سچی آزادی کا بھی علم بردار ہے، لہذا ہر کلمہ گو کا فرض ہے کہ وہ پکا اور سچا مسلمان بنے، اسلام ہی اسکی عقائد کی روح ہے اور وہی اسکی زندگی کے ہر لمحہ مین رہبر و رہنما ۔ نیز اوسے چاہیئے کہ اپنے قول و فعل کی تمام طاقتون سے لامذہبی اور الحاد کو پامال کرے اور خدا کے بندون کو خدا کی بغاوت سے روک دے ۔ اس بارہ مین داعی اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اسوۂ حسنہ ہمارے لیئے بہترین ہادی ہے، اور ہمارا فرض ہے کہ دین و دنیا کے اس محسن اعظم کی ہر سنت کو زندہ رکھین اور خود زندہ رہین ۔

اس کے بعد بعض علماء کرام کی ایک کمیٹی بنائی گئی اور یہ ڈراما اسطرح ختم ہوا، کہ دستور العمل بنانے کے لیئے مولانا آزاد سبحانی اور سید جالب کا انتخاب کیا گیا :-

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا مین

یہان تک تو اس اہم جلسہ کی کارروائی کا بیان تھا جو ۲ راگست کو فرنگی محل مین لامذہبیت و دہریت کے انسداد کے لیئے قائم ہوا لیکن آیئے ساتھ ہی ساتھ اس "جلسہ" اور "ارکان جلسہ" کی حقیقت پر بھی اک نظر ڈال لین، کیونکہ ممکن ہے یہ کہانی پھر دوبارہ آپکے سننے مین نہ آئے ۔

سب سے پہلا سوال ان جلسہ کرنیوالون سے یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے آپکو علماء کرام مین کس استحقاق سے شمار کرتے ہین اور ایک عالم کی وہ کیا خصوصیات ہین جن کا حامل وہ اپنے آپ کو سمجھتے ہین ۔

کیا فرنگی محل کی سکونت، کیا دیوبند کا قیام، کیا درس نظامی کی چند کتابون یا اس سے بھی زیادہ "کرم خوردہ کتابون" کا مطالعہ ایک شخص کو علماء کرام مین شامل کر سکتا ہے ؟ کیا عالم نام ہے صرف اس شخص کا جو بالکل مقلدانہ و غیر

رانہ طور پر چند مسائل فقہیہ کا علم رکھتا ہو، کیا ایک عالم کا تشخص منحصر ہے محض اس امر پر کہ اس نے چند کتابیں
بث کی پڑھتی ہوں، کیا عالم کی پہچان یہی ہے کہ وہ عمامہ و عبا سے کبھی منفک نظر نہ آتا ہو، کیا عالم حقیقتاً وہی
ہ صرف خوش بیان واعظ اور خوش الحانی سے مثنوی مولانا روم کے اشعار پڑھ سکتا ہو؟ کیا عالم اس کو
ہیں جو اپنے آپ کو مسجود دنیا سمجھے اور اپنے سوا سارے عالم کو حقیر و ذلیل۔ اگر واقعی ایک شخص انہیں
صیات حاصل ہونیکے بعد عالم کہلائے جانے کا مستحق ہو سکتا ہے تو کس کے منھ میں زبان ہے کہ اس جلسہ کی اہمیت
انکار کر دے۔ لیکن اگر عالم کہتے ہیں نبض شناس فطرت کو، اصلاحِ ملک و قوم کے لیئے تمام دنیاوی اغراض کو
کر کے ایثار و قربانی کا عملی درس دینے والے کو، اس صالحیت و صلاحیت کے حامل کو جسکے لیئے وراثت ارض
خدائے قدوس نے کیا ہے، ان صلحا کو جنہوں نے نفس کو سینیوں کو بغض و حسد سے، دلوں کو نفاق و ریا سے پاک کر کے
خالصتاً للہ ہدایات خداوندی پر عامل ہو کر دوسروں کے لیے دلیل راہ بنتے ہیں اور اگر عالم کی ذات عبارت
ہے استقامت عمل۔ اس استواری عزم اور اس روحانیت اخلاق سے جس کا لازمی نتیجہ دنیا میں ہمیشہ ایک
صرف ایک (انتم الاعلون) ظاہر ہوا ہے، تو میں کہونگا کہ علما، کرام کیلئے یہ زیادہ موزوں ہوتا کہ وہ دوسروں
یمان کا جائزہ لینے کے بجائے پہلے خود اپنے ہی اخلاق و اعمال کا احتساب کرتے اور دوسرونکی اصلاح پر متوجہ ہونگے
سے پہلے وہ اپنی ہی اصلاح سے فارغ ہو جاتے اور بجائے قال کے وہ صرف اپنا حال پیش کرتے کہ دنیا از خود انکی
مجذوب ہو جاتی۔

آج فرنگی محل میں علما، کرام کی ایک جماعت ملک کے اندر دہریت و لامذہبیت کی اشاعت پر ماتم کرنیکے لیئے فراہم
اتی ہے، لیکن، اس سے قبل کبھی اسکی توفیق اس کو نصیب نہیں ہوتی کہ وہ ضلالت و گمراہی کی تقسیم کر کے یہ متعین
کہ اگر دنیا لامذہبیت کی بلا میں گرفتار ہے تو وہ خود صراطِ مستقیم سے منحرف ہو نمیں کس نوع کی گمراہی کا اپنے
کو مجرم قرار دیتی ہے۔

جہاں تک اعلان دنمایش کا تعلق ہے بیشک یہ اپنے آپ کو علما، کرام کہنے والا گروہ بہت نمایاں حیثیت
ہے۔ کیونکہ یقیناً وہ نمازیں زیادہ پڑھتا ہے، پیشانی پر اثر سجود کو بھی نمایاں کر لیتا ہے، صیام کے سلسلہ میں
ہی روزہ بھی ترک نہیں کرتا اور جب حج کو جاتا ہے تو وہاں سے خاک شفا کی تسبیح اور ماء زمزم بھی اپنے احباب
اعزہ کے لیئے لاتا ہے، لیکن اگر ایمان و اسلام کا تعلق بطون سے ہے، اگر عبادات سے مقصود تزکیہ نفس
لاق اور تصفیۂ قلب و روح ہے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ محشر میں اُن علما، کرام کیلئے کوئی علیحدہ صف قایم کیجائیگی
آج یہ "علما، کرام" کا گروہ اس کا تو شاکی نظر آتا ہے کہ "لوگ مذہبی آزادی یا لامذہبی کا شکار ہو رہے ہیں"
خود اپنے گریبان میں منھ ڈالکر یہ غور کرنیکی توفیق کبھی نہیں ہوتی کہ یہ "آورده نست" تو نہیں ہے، وہ زمانہ گیا جب

ایک طرف یہ "حق را بہ حجرے دنی را بہ در وشے" کا افسوں کارگر ہو جاتا تھا اور دوسری طرف دامن امید پُر
اب دنیا ایک خاص اضطراب میں مبتلا ہے۔ علوم و فنون کی ترقی سے عقول انسانی ترقی یافتہ ہو کر مطالبہ کر رہی ہیں۔ کہ سب سے زیادہ مدعی صداقت مذہب، سب سے زیادہ ثبوت اپنے فطری ہونے کا دے اور علماء کی تنگ نظری، بیکسی، و بیچارگی، تہی مایگی و ناداری کا یہ حال ہے کہ اگر ان کے منقولات کے دفتر کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر سوائے کافر کہہ دینے اور گالیاں دینے کے اور کوئی ذریعۂ حرب و دفاع ان کے پاس نہیں رہ جاتا۔ کیونکہ خود اپنے اندر کوئی قوت اخلاق و روح کی ایسی نہیں چھوڑی جو دوسروں پر اثر ڈال سکے۔

جب وقت کسی گوشے سے یہ صدا آجاتی ہے کہ "علماء کا جلد خاتمہ کر دیا جائے کیونکہ وہ آزادی و ترقی کیلئے سنگ راہ ہیں" تو یہ اپنی گردن چھڑانے کیلئے بہت اچھلا کودتا ہے، لیکن یہ نہیں سمجھتا کہ جو چیز عملاً بیکار ہو جاتی ہے وہ اصولاً آپ ہی حذف ہو جایا کرتی ہے، اس کا خاتمہ تو اسی وقت ہو گیا جب اس نے دین کو ذریعۂ رزق قرار دیا۔ خدمت دینی کا منصب خدا نے اسوقت اس سے چھین لیا جب اس نے اپنے آپ کو ایک بت کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

وہ یہ زبان سے تو ضرور کہتا ہے کہ :-

"ہمارا دین اسلام دین فطرت ہے، خالق فطرت کی حکیمانہ تشریح کا مقدس مجموعہ ہے وہ ہی وطنیت اور ہمہ آزادی کا علمبردار ہے"

لیکن عمل کے لحاظ سے اسکی تعلیم یہی ہوتی ہے کہ اسلام نہ وطنیت کا حامی ہے نہ آزادی کا علمبردار، نہ اسمیں کوئی حکیمانہ تعلیم ہے اور نہ مصلحانہ تبلیغ، بلکہ وہ بالکل غیر فطری، غیر الٰہی، اور غیر مذہب تھا جو دنیا میں صرف خود غرضی اور نفس پرستی کی اشاعت کے لیے رونما ہوا

ایک عالم یہ ضرور کہتا ہے کہ :

"داعی اسلام رسول اللہ کا اسوۂ حسنہ ہمارے لیے بہترین ہادی ہے"

لیکن نہ وہ اسوۂ حسنہ کے مفہوم سے واقف ہے اور نہ داعی اسلام کے اخلاق و عادات سے، اس نے اس قسم کے چند الفاظ محض گرمیٔ سخن قائم رکھنے کے لئے یاد کر لیے ہیں، قلب و روح کی حرارت کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے
کیا یہ علماء تاریخ اسلام سے مطلق واقف نہیں اور کیا انھیں نہیں معلوم کہ جب عہد عباسیہ میں اسلام کو ایک خدائی فطری مذہب کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا گیا اور دیگر ملل و مذاہب کے علماء و حکماء کو اسکی حقیقت سمجھانے کی کوشش کی گئی، تو کتنے جدید مسائل بروئے کار آئے اور اس عہد کے علماء متکلمین نے کس وسعت نظر۔ اور مصلحت اندیشی سے کام لیا۔ اور کیونکر انھوں نے منقولات کو علیحدہ رکھ کر صرف معقولات کی مدد سے فریق مخالف کو اسلام کا مداح بنا لیا۔ پھر آج جبکہ عباسیہ کے وقت سے زیادہ علم کی روشنی پھیل چکی ہے

اس وقت سے کہین زیادہ تنقید و تحقیق کے ذرائع لوگون کے ہاتھ آگئے ہین، آپکا اپنے منقولات کا دفتر لیکے بیٹھنا ما کیا فائدہ پہونچا سکتا ہے۔ اور اگر آپ یہ دعوے کرین کہ نہین آپ معقولات مین بھی اپنے خصم کو ساکت کر سکتے ہین، تو معاف فرمائیے۔ مین اس کو سوا لئے "دخل در معقولات" کے اور کسی چیز سے تعبیر نہین کر سکتا۔ کیونکہ آپکے یہان کے معقولات تو اب دفتر پارینہ ہین اور معقولات جدیدہ کی آپ کو ہوا بھی نہین لگی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کی جماعت علماء کرام بالکل ایک (FOSSIL) حجر چیز ہے اور موجودہ کاروبار حیات مین اسکا وجود مایۂ اعتبار و نبش کی حیثیت تو رکھ سکتا ہے، لیکن اوسے سرمایۂ حیات و زندگی نہین کہہ سکتے۔

مین ان تمام "علمار کرام" سے دریافت کرنا چاہتا ہون کہ اس وقت تک انھون نے کونسی دینی خدمت انجام دی ہے۔ کیا حلال و حرام کے معمولی مسائل بتا دینا، کیا مساجد مین امامت کر لینا، کیا مجالس و میلاد مین وعظ کہہ دینا، کیا رنگون و برما جا کر جاہل و احمق مسلمانون سے خلافت و تبلیغ کی بے معنی تحریک کیلئے چندہ وصول کر لانا، کسی آریہ کی کتاب کا جواب لکھ دینا، تقلید و عدم تقلید کے مسئلہ مین مناظرہ کر لینا، ایسی اہم خدمات ہین جو ایک شخص کو علماء مین داخل کر سکتی ہین؟ اگر ایسا نہین ہے تو پھر مین دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہون کہ ان علماء کرام مین سے ایک شخص بھی ایسا نہین جس کو صحیح معنون مین دینی مرشد یا عالم و فاضل کہہ سکین۔

جہان تک علم ظاہر کا تعلق ہے، انکی بے مائگی کا یہ عالم ہے کہ سوائے ان چند دقیانوسی کتابون کے جو انھون نے کسی وقت مدرسہ مین پڑھ لی ہین اور جنکی صحت پر آج بھی انھین ایسا ہی ایمان ہے جیسے اندھے کو اپنے زوال بینائی کا انکو کچھ خبر نہین کہ دنیا مین کتنے اور علوم و فنون رونما ہو گئے ہین اور عقول انسانی نے اس قدر ترقی کر لی ہے۔ نہ انکا مطالعہ وسیع، نہ انکی معلومات عامہ درست، نہ انکا ذہن ترقی یافتہ، نہ انکی عقل صحیح و پختہ، نہ انھین بالغ نظری ہے، نہ نکتہ رسی، نہ مصلحت اندیشی ہے، نہ دیدہ روی، دوسری قومون کے علوم و فنون سے واقف ہونا تو درکنار ان غریبون کو خود اپنے یہان کے علوم کی بھی خبر نہین ہے۔ یہان تک کہ اگر آج ان سے دریافت کیا جائے کہ اس وقت سب سے بہتر کتاب فن تنقید مین کونسی سمجھی جاتی ہے۔ تو وہ اس کا کوئی جواب نہ دے سکین گے۔ وہ اب بھی یہی سمجھ رہے ہین کہ جو ایک درجن کتابین انھون نے پڑھ لی ہین، اس سے زیادہ علوم اسلامی کے حدود وسیع ہو نہین سکتے اور وہ زمانہ کی رفتار سے اس قدر بیگانہ ہین کہ اگر آج مصر کی جدید کتاب انکے سامنے رکھدی جائے تو وہ ایک صفحہ بھی اس کا نہ سمجھ سکین گے اور حیران رہ جائینگے کہ یہ کونسی نئی زبان اس قدر جدید اصطلاحات کے ساتھ پیدا ہو گئی ہے۔ یہ ہے ان کی عربی دانی کا حال۔ فارسی زبان چونکہ آتش پرستون کی ہے اسلئے وہ اسے کیا حاصل کر سکتے ہین،

رنگینی اردو، سو اس کے متعلق شاید وہ فخر کیساتھ کہہ سکیں گے کہ اس میں کمال حاصل کرنا ان کی شان کے منافی ہے مغربی علوم و فنون کا کیا ذکر ان غریبوں کو تو ان کے نام بھی نہیں معلوم۔

علم باطن جسکا تعلق تکمیل اخلاق و روحانیت سے ہے، اس کا ذکر فضول ہے۔ کیونکہ اس کا دعویٰ شاید انہیں بھی نہ ہوگا اور بجز اس کے کہ وہ اپنے نام کیساتھ لفظِ فقیر کا اضافہ کرکے ایک ہلکی سی عبارت اس نمائش کی کریں اور زیادہ ان کے بس کی بات نہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ دنیا انہیں خوب جانتی ہے، رہی اس گروہ کی قوتِ عمل سو اسکی مثالیں بھی کثرت سے موجود ہیں اور آگرہ کا وہ منظر سامنے ہے جب اس سے کہیں زیادہ جوش و قوت کیساتھ مذہبی کانفرنس کی بنیاد ڈالی گئی تھی لیکن اس کا دوسرا جلسہ ہونیکی نوبت اس وقت تک نہیں آئی ——

پھر جب حالت یہ ہے تو میں حیران ہوں کہ یہ لوگ اپنے منھ سے اپنے آپ کو بغیر کسی استحقاق بعید کے بھی "علماء کرام" کہنے والا گروہ (بقول سائب) کن "حفظِ نفس" کے ماتحت اس عبارت پر آمادہ ہوا ہے اور دہریت و لامذہبیت کا کیا مقابلہ کرسکتا ہے، جب کہ وہ ابھی تک یہی نہیں سمجھ سکا کہ جس کو وہ "لامذہبیت" کے نام سے موسوم کرتا ہے حقیقتاً اسلام وہی ہے، اور موجودہ اضطراب حقیقتاً مذہب کے محو کرنیکے لیے نہیں ہے، بلکہ انہیں علماء کرام کے بُت توڑنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔

یہ لوگ بالکل غلط کہتے ہیں کہ اس وقت بد دینی اور لامذہبیت کے خیالات پھیلتے جا رہے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا اب علماء سوء کے عذاب کو اپنے اوپر زیادہ عرصہ تک مسلط نہیں رکھنا چاہتی اور اس کو مٹا دینے کے لئے آمادہ ہوگئی ہے اِس لئے جو کچھ اس جلسہ میں بیان کیا گیا بالکل خلافِ حقیقت ہے اور صداقت سے یکسر دور، جو خوف انہیں اپنی ذات سے متعلق ہے اسے اسلام سے کیوں وابستہ کرتے ہیں۔ اور اگر اسلام عبادت ہے انہیں کی ذات سے تو پھر یقیناً "انہدام اسلام" ہی انسان کا فرض اولین قرار پائے گا۔

اِس جلسہ کی کارروائی میں متعدد جملے ایسے نظر آتے ہیں جن سے انتہائی انہماک و مستعدی کا اظہار ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جو کمر ہمت آج فرنگی محل کی مجلس میں کسی گئی ہے وہ داورِ حشر کے سامنے ہی کھلے تو کھلے لیکن میں اسکے اعتراف میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ ـ

ہے کیا جو کس کے باندھئے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء گذشتہ ماہ کے رسالہ کو کسی نے "سنان دلشکن" سے تعبیر کیا اور کسی نے "تیغ و تفنگ" سے اور جس حد تک "جراحت پذیری" کی اہلیت کا تعلق ہے، اس کے اور نام بھی "مراکب تاثر" کے لحاظ سے رکھے جا سکتے ہیں لیکن مجھے اگر مسرت ہے تو صرف اس خیال سے کہ اگر ایک طرف یہ "تفتیش مذبوحی" جراحت ناکام کا پتہ دے رہی ہے تو دوسری طرف "حمد اللہ" بر بنائے "زخمتگاں آواز" بھی دل بڑھانے کے لئے موجود ہے۔ اور اگر تماشائیوں کے "آفریں و مرحبا" کو بھی اسی میں شامل کر لیا جائے تو پھر "دیت و خونبہا" کا سوال اس "عشوہ و تبسم" سے آگے نہیں بڑھتا جسے ظہوری فخر کے ساتھ سرمایۂ تحمید و تقدیس کی صورت میں پیش کرتا ہے۔

میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی، جب بعض حضرات میری تحریروں سے عصبیت مذہب کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ میری تنقیدیں خواہ وہ مذہب و معاشرت سے متعلق ہوں، یا علم و ادب سے اس خلوص نیت کا نتیجہ ہوتی ہیں جس کی اگر کوئی دنیاوی تعبیر ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ۔

خاکیے ست نہ گنجد بدل ز بیاری

میں اس سے قبل بھی بارہا عرض کر چکا ہوں اور آج پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ تشیع و تسنن تو خیر نہایت ہی معمولی بات ہے میں نے تو اصطلاحی کفر و اسلام کا پردۂ امتیاز بھی نوچ کے پھینک دیا ہے اور میں اس دعویٰ کے ساتھ نہ جس کے لئے تصدیق کی ضرورت ہوتی ہے نہ تردید کا اندیشہ "بصور سرافیل" اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ اگر جنت نام ہے صرف سکون روح و طمانیت قلب کا اور اگر یہ جنت ایک زاہد شب زندہ دار صرف تقشف ہی سے حاصل کر سکتا ہے تو میں وہ ہوں کہ۔

فردوس را بہ دام نگہ می کنم شکار

میں اس چیز سے واقف ہوں جس کی جستجو دیر و حرم میں کی جا رہی ہے، میں اس مقصود کو جانتا ہوں جس کو مساجد و کنائس میں ڈھونڈھا جا رہا ہے۔ اور میں اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں ہوں کہ محراب و منبر پر پیشانیاں رگڑ رگڑ کر نوشتۂ تقدیر کو مٹا دینے کی کوشش کرنے والے آج تک یہی نہیں سمجھ سکے کہ وہ کیا چیز ہے جو سجدہ ہائے نیاز کا مسجود ہو سکتی ہے اور وہ کونسا پردہ ہے جس کے اٹھنے کے بعد یہ تمام اعتبارات سطحی یہ جملہ ممیزات بشری محو ہو کر۔

چشم وا کردن زمیں تا آسماں آغوش دشت

بن جاتے ہیں پھر اس سے قبل خدا معلوم کتنی زریں صبحیں، کتنی رنگین شامیں، کتنی خنک راتیں میں نے صرف اس غور و تامل میں صرف کر دیں کہ کیا منصور کا اناالحق کہکر دار و رسن کی منزل سے گزر جانا واقعی شاہد مقصود کے چہرہ سے حجاب کا اٹھا دینا تھا اور کیا میں بھی اگر ایسا دعویٰ کردوں تو بیجا ہوگا، لیکن میں ہمیشہ اسی نتیجہ پر پہونچا

کہ اول تو وہ منزل بجائے

"مرا کردہ اند آشکارا بمن"

کہتے ہیں جو دکوئی ایسی بلند منزل نہیں جسکو ہر شخص بادنیٰ تامل نہ پاسکتا ہو چہ جائیکہ اسمیں بھی ناصبوری سے کام لیا جائے۔ اس لئے میں بے نیازانہ انداز سے آگے بڑھا اور میں نے اپنی فطری ودیعتوں میں سے ایک نہایت ہی ابتدائی منزل کی ودیعت کو بے نقاب کرنا چاہا لیکن حیرت ہے کہ دنیا اسکے بھی سمجھنے کے لیئے تیار نہیں اور جسوقت میں یہ دعوی کرتا ہوں کہ۔

"تک مے زآبگینہ وساغر برآورم"

تو وہ مجھسے منھ پھیر لیتی ہے، مجھے کافر کہتی ہے۔ دہریہ اور ملحد کے لقب سے یاد کرتی ہے اور اپنے جہل سے میرے علم کو مغلوب کرنا چاہتی ہے حالانکہ یہاں یہ عالم ہے کہ "گرانی محمل" کا احساس جسقدر قوی ہوتا جاتا ہے، اسی اعتبار سے

"ہر پرن را بلولۂ سنجم ہزار بار"

اسلئے میں اپنے تمام احباب سے خواہ کسی مذہب و مسلک کے متبع ہوں بتادینا چاہتا ہوں کہ میرے شاہد مقصود کے سامنے یہ تمام نسبتیں، یہ جملہ اضافات وہی حقیقت رکھتی ہیں جو "پارۂ کتاں" چاند کیسامنے اور بحمد اللہ میں اس سے بہت بلند ہوں کہ اس "نا استواری تسبیح" کا تماشہ دیکھنے کیلئے ایک لمحہ کو بھی اپنی نگاہ تسبیح کیطرف مائل کردوں۔ ——— دنیا اگر اپنی صحرا نوردیوں میں خضر کو راہبر بنانا چاہتی ہے تو بنائے اور جبتک جی چاہے سکندر کی ناکامی کا انتقام اس سے لیتی رہے لیکن مجھے اس جستجو میں دعوت شرکت نہ دے کہ۔

سیلاب را بہ بادیہ رہبر گرفتہ ام

اگر ایکطرف یہ عزم استوار ہے کہ تنقید خواہ وہ معاشرت اخلاق سے متعلق ہو یا مذہب و سیاسیات سے، ہمیشہ بلند نقطۂ نظر سے ہونا چاہیئے، تو دوسری طرف میں اپنی فطرت کی اس کمزوری سے بھی واقف ہوں کہ وہ کسی کا دل دکھانا گوارا نہیں کرتی، اور اسلئے جب مجھے اس کا علم ہو جاتا ہے کہ میری تحریر یا نگار کے کسی مضمون سے کسیکو صدمہ پہونچ گیا ہے، تو میں بہت ملول ہو جاتا ہوں، بنابراں اگر گذشتہ ماہ کے نگار سے کسی خاص شخص یا کسی مخصوص جماعت کو کوئی تکلیف پہونچی ہے تو میں اسکی معذرت میں صرف یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقصود کبھی تنگ نظری کا اظہار نہیں ہوتا اور اگر کوئی صورت ایسی پیدا ہو جاتی ہے تو صرف اسلئے کہ۔

مستم چناں کہ گل نشناسم زنوک خار

اس سلسلہ میں مجھ کو برا کہنے والے دو قسم کے لوگ ہیں، ایک وہ جو انتقام لینے کیلئے صرف اپنے اہرمن سے چارہ سازی چاہتے ہیں، اور گالیوں کی آزار رسانی کے سوا ان کے پاس کوئی آلۂ حرب نہیں ہوتا۔ اور دوسرے وہ جو میری تحریر میں بے حجابی، عریانی، فحاشی وغیرہ کے نقائص نکال کر اپنے پندار میں مجھے ذلیل و خفیف کرنا چاہتے ہیں۔ سو اول الذکر جماعت سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ جس طرح انکا اہرمن ان کے ساتھ ہے اسی طرح میرا یزدان میرے ساتھ ہے، اور اسلئے مجھے ڈرنے کی ضرورت نہیں، اور موخر الذکر جماعت کے حضور میں اپنے ذوق ادب و انشا کی طرف سے سوائے اس کے اور کچھ نہیں عرض کر سکتا کہ۔

نظارۂ خوبان و مے و نغمہ حرام است
دیدیم و شنیدیم و سمعنا و اطعنا

میرے پاس وہ مطبوعہ اعلان آیا ہے جسے کلکتہ میں قائم ہونیوالی "لیگ اگینسٹ ملا ازم" نے اپنے مقصد کی تبلیغ کیلئے شائع کیا ہے، اس لیگ کے روح رواں اور صدر مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی ہیں اور سید محمد عثمان فاضل نائب صدر، اس لیگ کے قیام کا مدعا اس ذہنیت کی مخالفت ہے جو تنگ نظری، تنگ دلی، تقلید و جمود، تعصب و عدم رواداری کو مذہب کے رنگ میں پیش کرتی ہے اس ذہنیت کا اصطلاحی نام، اس انجمن نے ملا ازم اور اس ذہنیت والوں کا "ملا" رکھا ہے۔ اس اعلان کے آخری صفحہ میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ انجمن الحاد و دہریت کی حامی نہیں ہے۔ اور نہ ہر عالم دین کی مخالف ہے بلکہ وہ صرف ان نام نہاد مذہبی پیشواؤں کے خلاف ہے جن میں یہ ذہنیت پائی جاتی ہے۔

جس حد تک الفاظ اعلان کا تعلق ہے، اس انجمن کے مقاصد نہایت ہی پاکیزہ اور قابل قبول معلوم ہوتے ہیں لیکن عملی حیثیت سے مجھے اسکے اندر چند در چند کمزوریاں محسوس ہوتی ہیں جس وقت پبلک کے سامنے یہ دعویٰ پیش کیا جائیگا کہ ملاؤں کی جماعت تنگ نظر ہے متعصب ہے تقلید کی پابند ہے تو لامحالہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ ان کی تنگ نظری، تعصب اور تقلید مذہب کے اندر ہے یا اس سے باہر، ظاہر ہے کہ اس سے باہر نہیں ہو سکتی اور ہو تو بھی کون مانتا ہے۔ اسلئے وہ مذہب ہی سے متعلق ہوگی اور جس وقت آپ مذہبی مناظرہ کرینگے تو اک غیر متناہی سلسلۂ "قال اقول" کا پیدا ہو جائے گا اور آخر کار وہ مقصد حاصل نہ ہو سکے گا جسکے لئے یہ لیگ قائم کی گئی ہے۔

اگر یہ لیگ مذہب کے ساتھ ساتھ ملاؤں کی مخالفت کرنا چاہتی ہے۔ تو کوئی توقع کامیابی کی نہیں ہو سکتی اور نہ مذہب کی موجودہ مراسم کی حمایت کرتے ہوئے ملاؤں کے خلاف کوئی کامیا

پروپگنڈا ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ یہ دعوے کریں کہ جو اسلام اس جماعت نے پیش کیا ہے۔ وہی شروع سے غلط ہے اور ان میں سے ایک بھی بلا استثنا مذہب اسلام کے صحیح مفہوم کو نہیں سمجھا تو بیشک یہ لیگ کچھ اہمیت اختیار کر سکتی ہے اور اصلاح کی بھی اس سے توقع ہو سکتی ہے۔ یہ بالکل خلاف اصول ہے کہ ان عقائد میں سے بعض کو علحدہ کر دیا جائے اور بعض کو لے لیا جائے، بلکہ ایک سرے سے ان سب کو حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہیئے۔ اور لوگوں کو اسلام کی حقیقت ذہن نشین کر کے بتانا چاہیئے کہ اسلام نام ہے صرف ترک مذہب کا، نسخ ادیان کا، تفریق قومی کے مٹجانے کا اور جامعۂ انسانیت کو ایک مرکز پر جمع کرنے کا جسکا نام اخلاق اور صرف اخلاق ہے، اسلام مسجد اور مندر کی تفریق سے بے نیاز ہے، زنار و تسبیح کے امتیاز سے بالاتر ہے، نہ ناقوس و اذان کی تمیز اس کا نصب العین ہے نہ کلیسا اور طواف کا فرق، اس کا مطمح نظر وہ تمام عالم کو، ساری کائنات کو، جملہ نوع بشری کو ایک رشتہ سے وابستہ کرنے صرف ایک نقطہ پر لانا چاہتا ہے، اور وہ اس مساوات کا مبلغ ہے جس سے زیادہ وسیع مساوات دنیا میں کسی ہادی و رہنما، کسی نبی و رسول نے اس سے قبل پیش نہیں کی۔

وہ نہ کسی کے نام کو دیکھتا ہے، نہ وضع و صورت کو، نہ وہ نسب کو وجہ امتیاز قرار دیتا ہے نہ حسب کو، نہ دولت اسکے نزدیک کوئی اہمیت رکھتی ہے نہ جاہ و ثروت۔ وہ دیکھتا ہے صرف رواداری کو۔ جذبہ ایثار و فدویت کو، اور محض اس اضطراب کو، جو بنی نوع انسانی کے ہر فرد میں دوسرے فرد کی اعانت کیلئے پیدا ہونا چاہیئے۔

پھر آج اسلام کا صحیح مفہوم بتانے کے لیئے سب سے پہلے ضرورت ہے اس عنصر کو محو کر دینے کی، جو اسلام کو اصطلاحی لفظ قرار دے کر اس کو اخوت عامہ کے مقصد سے علحدہ کر رہا ہے۔ اور موجودہ ضروریات تمدن و زمانہ کے لحاظ سے تمام ان اصول معاشرت و حیات پر نظر ثانی کرنے کی جو آج اسلام کے چہرہ کو نہایت بدنما صورت میں پیش کر رہے ہیں۔ اگر زمانہ کے ساتھ لوگوں کے امیال و عواطف اور عقول و افکار میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ تو پھر یقیناً وہی مذہب حقیقی معنی میں خدائی مذہب کہلائے گا جو عہد و زمانہ کے لحاظ سے تمام عقول و اذہان کی رہبری کر سکے۔ اور اپنے اندر اس تغیر کو روا رکھے جسکے بغیر "اخوت عامہ" کا مقصد عظیم حاصل نہیں ہو سکتا۔

پھر آج اگر منزل تک پہونچنے کا صحیح راستہ ہو سکتا ہے تو وہ نہ وہ ہے جسے تمام علماء دین زمانہ سے صدیوں پیچھے ہٹ کر متعین کر رہے ہیں اور نہ اس کی وہ تدبیر ہے جو کلکتہ کی اس لیگ نے بتائی ہے۔

اسلیے جس ایثار و قربانی، جس رسوخ و استواری کی ضرورت ہے، وہ ہم میں سے سرمد و منصور کی طلبگار ہے سقراط و مسیح کی متجسس ہے، اور ان مردانِ خدا کی منتظر ہے جو ممبر پر نہیں بلکہ دار پر اس راز کا اعلان کرنیکی جرأت اپنے اندر رکھتے ہوں

پھر اگر آج بعض نفوس مقدسہ اس قربانی کیلئے آمادہ ہوجائیں خدمت اسلام کیلئے اپنے تمام مصالح ذاتی کو پس پشت ڈالنے کیلئے تیار ہوجائیں، تو بغیر کسی لیگ کے قائم کیئے ہوئے حقیقی مقصد حاصل ہوسکتا ہے، اور دنیا از خود ان مولویوں، ان ملاؤں، ان علمائے دین، ان پیران طریقت، ان تصوف پیشگان حرم مرتبت کے بتوں کو ٹھکرا دینے کیلئے آمادہ ہوسکتی ہے۔

میں اس لیگ کے ارباب کار کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں جس منزل میں ہوں وہ انکے لیگ کے مقاصد سے بہت بلند ہے اور میرے نزدیک اس نوع کی جماعتوں یا انجمنوں کا قیام ایک طفلانہ نمائش تو ضرور ہے لیکن سنجیدہ و موثر تدابیر سے اسکو کوئی علاقہ نہیں ہوسکتا۔

اگر اس لیگ کو کچھ کرنا ہے تو میں مشورہ دونگا۔ کہ

"بفشاں دامن و آزادہ برخیز"

ورنہ اسے فنا ہوجانا چاہیئے کیونکہ جو "باب نبرد" نہوا اس کو "عشق نبرد پیشہ" کی دعوت پر لبیک کہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے

داس کا حکومت کے طرز عمل کیخلاف احتجاجاً فاقہ کی تڑپا تڑپا کر ہلاک کرنیوالی صعوبتوں کو برداشت کرکے اس دنیا سے گزر جانا، گو بظاہر نہایت معمولی بات معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھینگے تو معلوم ہوگا کہ زمانہ ایسے "مردان خدا" چند سے زیادہ نہیں پیدا کرسکا۔

اس وقت یقیناً یہ سوال ہے صرف ایک شخص، ایک معمولی انسان کے جان دیدینے کا لیکن عاقبت بین نگاہیں دیکھ سکتی ہیں کہ یہ موت، احیاء ہے ایک قوم کا، نجات ہے ایک ملک کی۔

داس نہیں مرا، بلکہ زندگی کا راز ہمکو بتا گیا، اس کے جنازے پر پھول نہیں برسائے گئے، بلکہ آزادی کی دیوی کے لیے تخت و تاج کو آراستہ کیا گیا اور اگر فطرت نے اپنے اصول نہیں بدلے ہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ داس نے انتظار کی مدت کو بقدر نصف صدی کم کردیا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب ارتھی پر سوگ کے پھول چڑھانیوالے ہاتھ "ملکہ حریت" کے جلوس میں مسرت کی گلباریاں کرتے ہوئے نظر آئیں گے

موت نام ہے دنیا سے محو ہوجانے کا۔ پھر کون ہے، جو داس کو مردہ کہہ سکتا ہے۔ الا ان اولیاء اللہ لا یموتون۔ یقیناً داس اللہ کے اولیا میں سے ایک ولی تھا اور اگر مسلمان مجھے اس اظہار خیال پر اسلام سے خارج کرنا چاہیں تو کردیں، مجھے پرواہ نہیں

"منت کش چشم کہ حقیقت نگر آمد"

اور اگر وہ ولایت خداوندی کو صرف اپنے ہی لئے مخصوص جانتے ہیں تو کم از کم مجھے یقین نہ دلائیں کہ میرے اوپر تو اس کے خیال سے بھی موت کا سا جمود طاری ہونے لگتا ہے اور نہ اپنی قربانیوں کا ذکر کریں کہ

"دارد تفاوت آب شدن تا گریستن"

یہ بڑی حد تک صحیح ہے کہ ہندوستان کا سیاسی تگ و دو میں اس وقت تک کوئی کامیابی حاصل نہ کرسکنا ہندو مسلم تفریق کی وجہ سے ہے۔ اور یہ بھی غلط نہیں کہ اس تفریق کے قیام میں ہندوؤں کی تنگ نظری اور عصبیت بہت معاون ہوئی ہے لیکن کیا مسلمان اس باب میں بالکل معصوم ہیں کیا وہ ہندوستان کی مسئلہ آزادی کو وقعتی بہت اہم سمجھتے ہیں اور کیا وہ اپنی پوری توجہ اس طرف صرف

کرتے ہیں، ممکن ہے بعض نفوس یہ دعویٰ کر سکیں لیکن عام طور پر مسلمانوں کی ذہنیت اس درجہ انتشار و پراگندگی رکھتی ہے کہ اس وقت تک یہی نہیں معلوم ہو سکا کہ ان کا مقصود کیا ہے۔ کبھی وہ مسئلہ تبلیغ کی کامیابی کو اپنے مرض کا علاج سمجھکر اس طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، کبھی "خدمت کعبہ" کو وہ بلا احساس تہذیب و اخلاق، حالانکہ اپنے آپ کو "خدام کعبہ" کہنے اور کہلوانے پر اصرار کرتے ہیں، کبھی "زوال خلافت" پر مجلس عزا مرتب کرکے اس کا نام "خلافت کمیٹی" رکھتے ہیں اور اب خیر سے فلسطین کے معاملہ نے ایک اور نئی چیز "فلسطین کمیٹی" کی بنیاد کا مواد فراہم کر دیا ہے۔ گویا ہندوستان کے مسلمان ساری دنیا کے ذمہ دار ہیں اور جب تک یہ ہندوستان میں بیٹھکر کوئی رزولیوشن پاس نہ کر دینگے اس وقت تک عالم اسلامی کی کوئی مشکل حل ہو ہی نہیں سکتی لیکن اس "خاک بسر" قوم سے کوئی پوچھے کہ اس وقت تک ان تمام مذہبی، سیاسی اور اخلاقی انجمنوں نے کیا کارہائے نمایاں انجام دئے اور ان تحریکات میں حصہ لینے کے بعد دوسروں کو کیا فائدہ پہونچایا اور خود کیا فائدہ حاصل کیا۔ خلافت ختم ہونیکے بعد خلافت کمیٹی قائم ہوئی اور دولت بے اندازہ ہندوستان کے غریب مسلمانوں سے جمع کی گئی لیکن کیا حکومت حجاز نے ارض مقدسہ سے یہود و نصاریٰ کے اثرات محو کرنے میں کوئی مدد ان کی، کیا وہ اس سلسلہ میں اپنی کسی حقیر سے حقیر آرزو کو بھی پورا دیکھنے میں کامیاب ہو سکے۔ اسیطرح خدام کعبہ کی حیثیت سے وہ مشغول ہو سکتے ہیں کہ اس باب میں انکے خدمات کیا ہیں۔ کیا حاجیوں کی جماعت کو بمبئی میں ٹکٹ خرید کرکے لا دینا، مسافر خانوں میں لاکر انکو ٹھہرا دینا اور جہاز پر سوار کرا دینا۔ اتنا بڑا کام ہے۔ کہ اس سے زیادہ کوئی اور ذریعہ نجات ہو ہی نہیں سکتا جمعیۃ العلما اور انکی تبلیغ کا ذکر فضول ہے کیونکہ اب اس جماعت اور اس کے اس مقصد کی لغویت روز روشن کی طرح عیاں ہے،

اب اس ذہنیت کے ماتحت فلسطین کے سلسلہ میں ہنگامہ گدایانہ برپا کیا جا رہا ہے اور کیا عجب ہے کہ اسکے لیے بھی کوئی فہرست فراہمی چندہ کی کھولدیجائے لیکن اسکا نتیجہ بھی جو کچھ ہونیوالا ہے، کسی سے مخفی نہیں۔ یہانکے مسلمان یہ نہیں سمجھتے کہ جبتک وہ خود اپنی ملکی و مقامی حیثیت کو مستحکم و بلند نہ کر لینگے ان کے "وطنین پرشہ" کو کون سنیگا اور انکے شور و شغب سے دنیا کے یہ اصول کیونکر بدل سکتے ہیں کہ پہاڑ سے سر ٹکرانا خود اپنے سر کو مجروح کرنا ہے۔ اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ دنیا انکی آواز کو کوئی اہمیت دیجائے تو انکا فرض یہ ہونا چاہیئے کہ پہلے اندرونی ملکی سیاسیات میں اپنے اندر ایک جماعت صالح کی سی اہمیت پیدا کریں اور جب خود اپنے گھر کو محفوظ کر لیں تو دوسروں کے گھروں کی آگ بجھانیکی کوشش کریں کیا ہندوستان کے مسلمانوں کے باب میں ترکی، ایران، افغانستان، مصر، فلسطین، حجاز کسی جگہ سے کوئی آواز بلند کیجاتی ہے، کیا کبھی سنا گیا ہے کہ وہاں کی کسی انجمن نے کوئی تجویز اپنی حکومت کے ذریعہ سے حکومت برطانیہ کے پاس بھیجی ہو، پھر جب اس وقت حالت یہ ہو کہ ہر قوم و جماعت اپنے ہی تحفظ کی منزل سے نہیں گزری، تو ہندوستان کے مسلمانوں کی یہ "انجمن آرائیاں" اور "رزولیوشن فرمائیاں" کیا اہمیت رکھ سکتی ہیں۔

میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کی ایک جماعت اور غالباً بڑی جماعت ساردا ایکٹ کی منظوری سے چین بجبین نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ اسمبلی کے بعض مسلمان ممبر احتجاجاً ہال سے اٹھکر باہر چلے گئے۔ ہم نے مانا کہ صغرسنی کی شادیاں ہندؤں میں زیادہ ہوتی ہیں اور یہ قانون

انھون نے اپنی ہی معاشرت کی اصلاح کے لیے نافذ کرایا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب اصولاً مسلمان بھی اسکے مفاد کے منکر نہین ہین تو وہ کیون مخالفت کرتے ہین، رہا شریعت اسلامی کا سوال، سو مین پوچھتا ہون کہ کیا ہندوستان مین زنا کے جرم مین کسیکو سنگسار کیا جاتا ہے۔ کیا سرقہ کے ارتکاب پر کسیکے ہاتھ قطع کیے جاتے ہین۔ کیا تہمت پر یہان حد قذف جاری ہوتی ہے، کیا شراب خوارون پر کوڑے لگائے جاتے ہین، پھر جب مسلمان ان تعزیرات کو جو شریعت اسلامی کیخلاف ہین گوارا کیے ہوئے ہین۔ تو کوئی وجہ نہین کہ وہ سارڈا بل پر چراغ پا ہون، علی الخصوص اس وقت جبکہ مسلمانون مین بھی ہندؤن کیساتھ میل جول رکھنے کی وجہ سے صغر سنی کی شادی کا رواج کچھ کم نہین ہے۔

صغر سنی کی شادی کو روکنے والا قانون، باوجود اس کے کہ مسلمانون کی ایک جماعت نے مخالفت کی منظور ہو گیا اور سنہ ۳۰ء سے اس کا نفاذ بھی ہو جائے گا۔ جہانتک عورتون کی صحت کا تعلق ہے یہ قانون بہت مفید ہے اور معاشری حالت کی درستی مین بھی اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ایک قانون اس سے بہت زیادہ اہم تھا جسکی طرف کسی نے توجہ نہین کی اور جس کا نفاذ بقاء عقل و حواس اور تحفظ انسانیت و اخلاق کے لیے ازبس ضروری ہے۔

اس وقت تمام اکناف ہند مین ایک کثیر جماعت ان لوگون کی دیکھی جاتی ہے جو اپنے آپ کو عالم دین کہتے ہین، صوفی و اہل طریقت بتاتے ہین، مجالس وعظ مین سخت تباہ کن اور دشمن عقل و انصاف روایات بیان کرتے ہین صرف اسلیے کہ روپیہ کمائین، جاہلون اور احمقون کو اپنے کاذب کشف و مراقبہ سے دھوکہ دے کر اپنا گرویدہ بناتے ہین تاکہ زندگی کے تمام نعائم و لذائذ اپنے لیے مخصوص کر لین، در انحالیکہ انھون نے کوئی محنت نہین کی، کسی جفاکشی اور عرقریزی سے کام نہین لیا۔

اگر قانون تعزیرات ہند دغا مین ان کو گرفتار نہین کر سکتا، اگر ضابطہ فوجداری آوارہ گردی کے سلسلہ مین ان کو نیک چلنی کا پابند نہین بنا سکتا، اگر امتناع گداگری کا قانون ان پر نافذ نہین ہو سکتا تو کوئی وجہ نہین کہ ان کی تباہ کاریون سے بچانے کے لیے، ایک علیحدہ قانون نہ مرتب کیا جائے، اور ان معزز گداگرون، ان پڑھے لکھے بھکاریون کو جو "یسئلون الناس الحافا" کی ایک مخفی مگر نہایت ہی سخت لعنت مین مبتلا ہین وعظ فروشی، مینگی اور پیری مریدی سے نہ باز رکھا جائے۔ نہ ان کے پاس کوئی جائداد ہے نہ ریاست نہ یہ کہین ملازمت کرتے ہین، نہ تجارت لیکن دولت ہے کہ ان کے قدمون پر نثار کیجا رہی ہے اور عیش و نشاط کی دیوی ہے کہ ہر وقت ان کے پہلو سے وابسطہ نظر آتی ہے۔ مین نہین سمجھ سکتا کہ غریب اہل ہند کی وہ کمائی جو پسینہ مین ڈوب کر حاصل ہوتی ہے۔ کیون بلا کسی محنت و استحقاق مزد کے ان مولویون، پیرون، سیدون، پنڈتون، جوتشیون، اور برہمنون کو دیدیجائے جو ایک متعدی مرض کے جراثیم کی طرح صرف وبا اور ہلاکت پھیلانے کے لیے رونما ہوئے ہین۔

کیا اسمبلی کے کسی ہندو یا مسلمان ممبر مین یہ جرأت ہے کہ وہ اس مسئلہ کو پیش کر کے تکمیل کی حد تک پہونچائے؟

نومبر ۱۹۲۹ء

آہ زعمرے کہ گزشت اینچنیں

چند دن سے میں جس کیفیت میں مبتلا ہوں اس کو اگر کسی ایک فقرہ سے ظاہر کر سکتا ہوں تو عنوان کے مصرعہ کو ملاحظہ فرمائیے۔ آہ زعمرے کہ گزشت اینچنیں!

ماضی کی ہر یاد خواہ وہ کتنی ہی تلخ ہو حال کی شیرینیوں سے زیادہ پُر کیف ہوتی ہے اور مستقبل کی ہر تمنا خواہ کتنی ہی عسیر الحصول کیوں نہ ہو، حاصلات حاضرہ سے زیادہ قیمتی معلوم ہوتی ہے یعنی انسان نام ہے ایک طرف خواہش استرداد کا اس کیلئے جو گزر گیا اور دوسری طرف دست امید بڑھانے کا اس کیلئے جو ہنوز عدم میں ہے۔ پھر چونکہ حیات انسانی کا ہر لمحہ حال ہی ہو کر گزرتا ہے اسلئے اسکا کارآمد ہونا معلوم! لیکن میری حالت اس سے بالکل علیحدہ ہے۔ ماضی کے استرداد کی تمنا نہیں اور حال کی کیفیت یہ ہے کہ

بر من آں می رود امروز کہ گوئی فرداست

کہتے ہیں کہ جہل کا علم، علم کی پہلی منزل ہے، لیکن شاید یقین کی نہیں! معلوم نہیں علم کو جہل سمجھنے والے اس باب میں کیا کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس سوال کا پیدا ہونا ہی دماغ انسانی کی پہلی بدعت ہے جسے فطرت تو برداشت کر لیتی ہے لیکن روح کی نزاکت اس کی متحمل نہیں۔ پھر کتنے ہیں جنکی روحیں اس کشمکش کی سوگوار نہیں اور کہاں ہیں وہ نفوس جو احساس کی اس بے اعتدالی سے واغدار نہیں جہل و علم سے زیادہ اہم و ضروری یہ دیکھنا ہے کہ ہمارا نقص اپنی تکمیل کا طلبگار ہے یا نہیں اور جہاں امکان کے ذرات کس مرکز کی طرف پہونچنے کے لئے بیتاب ہیں

انسان کا وجود اپنی تخلیق کے لحاظ سے سراپا جستجو ہے، روح خواہ وہ مادہ سے مجرد ہو یا وابستہ یکسر اضطراب تمنا ہے۔ صبح کا جلوہ زریں، شام کا نقاب رنگیں، آفتاب کی زرپاشیاں، چاند کی نور بیزیاں، شاہد مقصود کے مختلف مظاہر و آثار Phenomena ہیں جو ہمکو عین ذات (Noumenon) کی طرف بلاتے ہیں، خزاں کی سوگواری، بہار کا نشاط، دریا کی روانی، پہاڑ کی استقامت اور ان کو بھی جانے دیجئے، خود مساعی انسانی کے تمام نتائج جو سر بفلک عمارتوں، محیر العقول ایجادوں، اور زر و سیم کے انبار کی صورت میں ہر جگہ نظر آتے ہیں، یہ سب دعوتیں ہیں اصل منزل تک سعی کرنے کی، اُس آغوش رحمت تک پہونچ جانے کی، جس کا نام مذہبی کاروبار والوں نے فردوس رکھا ہے اور میں اس کو "دار الصحو و المنام" کہتا ہوں۔ جہاں روح اپنی جستجو کو ختم کر کے شیریں خواب میں محو ہو جاتی ہے جہاں تمام تفریقات جسم و رنگ مٹ کر صرف ایک احساس امن و سکون میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

آج علم و حکمت کی ترقیاں اس حد تک پہونچ گئی ہیں کہ زمان و مکان، سمت و جہت کا مفہوم بدل گیا ہے اور تمام محالات ایک ایک کر کے مکان و وقوع کی صورت اختیار کرتے جاتے ہیں، لیکن کیا انسان باایں ہمہ اقتدار و اختیار روح میں کوئی شائبہ سکون محسوس کرتا ہے؟

آج زر و دولت کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ تمام وہ تمنائیں اور خواہشیں جو انسان کے گوشت و خون سے متعلق ہو سکتی ہیں،

«شئے حاصل» کی حیثیت اختیار کرچکی ہیں، لیکن، سوال یہ ہے کہ کیا روح کی گرسنگی میں کسی قسم کی کوئی کمی محسوس کی جاتی ہے؟ انسان آگے بڑھ کررہا ہے۔ انسانیت پیچھے ہٹ رہی ہے — دماغ ترقی کررہا ہے — روح تنزل کررہی ہے اسوقت کا انسان ایک ایسا مستسقی ہے جس کے سامنے دریا جاری ہے اور وہ خود پانی پینے کیلئے آزاد لیکن اس کی روح جس کیلئے بیتاب ہے، اسکا یہ عالم ہے کہ

دہند شوق و دے رخصت نظر نہ دہند

دنیا کے تمام مذاہب اسی "فردوس گم گشتہ" کو ڈھونڈھ نکالنے کیلئے آئے، انبیاء و رسل، اولیاء و اکابر کی ہستیاں روح کی اسی فریاد کی مختلف صورتیں تھیں، جو ابراہیم و اسمٰعیل، سلیمان و داؤد، یوسف و موسیٰ عیسیٰ و محمد زردشت و کرشن، بودھ و کنفوشس کے نام سے ظاہر ہوئیں اور آیندہ مختلف ناموں اور صورتوں سے ظاہر ہوتی رہینگی لیکن ان ہستیوں کے اٹھ جانیکے بعد انسان نے جو کچھ یاد رکھا وہ صرف یہ تھا کہ فلاں آتش پرست ہے اور فلاں گوسالہ پرست، یہ صلیب کا پرستار ہے اور وہ کعبہ کا، یہ ناقوس پھونکتا ہے اور وہ اذان دیتا ہے یہ صورت کفر کی ہے اور وہ اسلام کی حالانکہ یہ تمام تفریقات صوری، یہ جملہ تمیزات ظاہری، نوع انسانی کی اس روح کا تجزیہ نہیں کرسکتے جس کا درد و درماں ایک، جس کی راحت و اذیت ایک، جس کا اوج و حضیض ایک اور جس کی فنا و بقا ایک ہے

خدا ایک ہے اور اس کا پیغام بھی ہمیشہ ایک ہی رہا ہے، وہ پیغام ہمیشہ سے ایک صدق بسیط ایک حقیقت مستدام، ایک صداقت لازوال، ایک قطعیت غیر فانی رہا ہے اور ایسا ہی رہیگا خواہ اسکے پہونچانیوالے کسی ملک و قوم اور کسی رنگ و نسل کے ہوں پھر آج دنیا کی سوگواریوں کا سبب نہ خدا کی دوئی ہے نہ اسکے پیام کا تنوع، بلکہ صرف یہ جستجو کہ پیامبر کا وطن کہاں تھا، اس کا نام کیا تھا اسکی صورت کیسی تھی، اس کا ملبوس کس طرح کا تھا اور وہ کیا کھاتا تھا کیا پیتا تھا۔ خدا کی مرضی تو یہ تھی کہ اپنی روح ہم تک پہونچائے، مگر ہم نے اس کو جسم سمجھ کر اپنے حواس کے تلذذ کو اس کے عرفان کا معیار قرار دیا، وہ چاہتا تھا کہ اپنی نکہت سے صرف ہمارے دماغ کو متاثر کرے لیکن ہم نے پھول کو اصل چیز سمجھکر اس کے رنگ، اس کی صورت سے اپنے ذوق و پسندیدگی کو وابستہ کیا، پھر جب وہ پھول مرجھا کر فنا ہوگیا تو نکہت سے وہ ہلکا سا تعلق بھی جاتا رہا اور ہماری روحیں پھر تڑپنے لگیں

آج دنیا کو امن کی جستجو ہے، سکون کی تلاش ہے، پھول کی چادروں سے چنگاری کی سوزش، زرکار ملبوس سے شعلوں کی تپش اور زر و سیم کے انبار سے آگ کی لپٹ آرہی ہے۔ بنارس کا مرتاض برہمن «قشقہ بر جبیں» ہاتھ میں سمرن لئے ہوئے اٹھتا ہے اور کہتا ہے "میرے مندر میں آؤ، صدائے ناقوس سنو اور مورتی کے سامنے جھک جاؤ تاکہ یہ جلن دور ہو"۔ دیوبند اور فرنگی محل کا عبا پوش مولوی، جریب و تسبیح لئے ہوئے رونما ہوتا ہے اور کہتا ہے، میری مسجد میں آؤ، اذان کی آواز سنو، قبلہ کی طرف منھ کرکے سجدہ میں گر جاؤ تاکہ یہ سوزش دفع ہو" — ایک راہب کہن سال پیدا ہوتا ہے اور تلقین کرتا ہے "میرے عالیشان کلیسا میں آؤ، گھنٹے کی صدا پر متوجہ ہو، پیمبر مصلوب کی شبیہ سے التجا کرو، تاکہ یہ بے چینی دور ہو"— جاتریوں کا گروہ جوق در جوق مندروں سے نکلتا ہوا

نظر آتا ہے، لیکن اُن کے قشقہ کا صندل بھی خشک نہیں ہو چکتا کہ اُن کے سر جنگ و جدل سے رنگین نظر آنے لگتے ہیں۔ جماعت کی جماعت مسجدوں سے باہر نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے مگر ان کی پیشانی سے سجدہ کا نشان خاک بھی محو نہیں ہو چکتا کہ ایک دوسرے پر کثافت اچھالتا ہوا نظر آتا ہے۔ گروہ کا گروہ کلیسہ سے باہر آتا ہے اور ابھی عود و عنبر کے بخور کی خوشبو بھی ان کے لباس سے جدا نہیں ہوتی کہ معصیت کی پُر عفونت آغوش اُن کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ایک رندلاابالی، ایک مردود دیدہ مُو، جو نہ کبھی کسی مندر میں گیا، نہ مسجد میں، نہ جس نے کبھی دیر میں سر جھکایا نہ کلیسہ میں انسانی زندگی کی اس بیچارگی کا مطالعہ کرتا ہے اور اُس قوم کے سامنے جس کو اس نے ہمیشہ تمام علایق مذاہب و مسالک سے بے نیاز ہو کر پہچانا، متحیرانہ و مستفسرانہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ آسمان کا ایک ستارہ ٹوٹ کر روشن لکیر بناتا ہوا غائب ہو جاتا ہے اور یہ بھی اپنی راہ لے لیتا ہے۔ صبح کو قدوسیوں کی جماعت اس کو خاک بسر و گرد آلود حالت میں دیکھ کر منہ پھیر لیتی ہے کہ یہ کوئی شرابی ہے۔ یقیناً وہ شرابی ہے، وہ مست ہے۔ لیکن اس طرح کہ

مستیٔ ما نبود نغمہ و صہبا ساماں

دوسرا گروہ آتا ہے کہتا ہے کہ یہ تو فاسق و فاجر ہے، ملحد و بیدین ہے۔ بیشک وہ سب کچھ ہے مگر اس شان سے کہ

نازد بکفر خود کہ بایماں برابر است

اسکے مجروح جسم اسکے داغدار سر و سینہ کو دیکھ کر لوگ نفرت کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں مگر جس وقت وہ بیتاب ہو کر چیخ اٹھتا ہے کہ

دردیست در دلم کہ بدرماں برابر است

تو اس کا سننے والا کوئی نہیں ہوتا

میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے یہ تاثرات کب سے مجھے بیتاب بنائے ہوئے ہیں اور کتنا اسوقت جبکہ میں چیخ چیخ اُٹھنے کے لئے مجبور تھا کس کس طرح "رتاب گفتگو" مجھ سے چھین لی گئی، لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ اب ان اشارات کا رُخ بدل گیا ہے، ابہام جاتا رہا اور ہے، ظلمت کی شدت اب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اس کے بعد روشنی کا نمودار ہونا لازم ہے۔ اسلئے مجھے بالاعلان [illegible] اس حقیقت کا اظہار کر دینا چاہئے کہ وہ جو اپنے کو راہبر دین کہتے ہیں ان کو گروہ طاغوت سمجھو، وہ جو خانقاہوں میں ہاتھوں کو رسم دست بوسی کے لئے پھیلائے ہوئے پڑے ہیں، ان کو دشمن روحانیت جانو، وہ جو اپنے آگے تمھیں جھکنے پر مجبور کرتے ہیں ان کو غرور تعلی سے زیادہ وقعت نہ دو۔ وہ وقت گزر گیا جب خدا مسجد و مندر میں ملتا تھا کہ اب نہ وہ معبد و معابد رہے، نہ وہ مسجد و مندر تک پہونچانے والے۔ اب خدا ملتا ہے نفس کی آزادی میں، ترک تقلید میں، قلب کے اُس انبساط میں جو صرف اپنے ہی تدبیر و تفکر سے حاصل ہوتا ہے اور روح کی اُس حریت میں جو خلوص اور صرف اخلاق ہی کی پاکیزگی سے میسر آتی ہے۔ مذاہب ترک کر دو کہ اب ان سے صرف فساد و سفک دماء کا کام لیا جاتا ہے، مدعیان مذہب کو ٹھکرا دو کہ نوع انسانی کی تفریق کا ذمہ دار گروہ تنہا یہی ہے۔ تمام انسان ایک ہیں اور صرف انسانیت ہی کے رشتہ کو اپنا مذہب قرار دو، اگر مذہب کا لفظ تمھارے لئے ضروری ہے

ناموں کی تفریق مٹا دو، لباس کی تمیز اُٹھا دو، رنگ و نسل کا امتیاز محو کر دو۔ آسمانی رحمت کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا، مگر اسوقت جب ہماری نگاہوں کے آگے پردے پڑجائیں۔ پھر اگر تم چاہتے ہو کہ دنیا میں حقیقی امن و سکون قائم ہو، تمھاری روح کی بے چینیاں دور ہوں تو اپنی نگاہوں کا مرکز ایک ہی قرار دو اور حسب و نسب کے تفاخر، دولت و جاہ کے تفوق، حسن و جمال کی تعلی، اور علم و فضل کے پندار کو یکسر محو کر دو کہ خدائی بارگاہ میں شریف و رذیل، شاہ و گدا، عالم و جاہل سب ایک ہیں اور وہاں اگر کسی چیز کو امتیاز حاصل ہے تو تمھاری اُس خوے عجز کو جسنے بندگان خدا میں کبھی تفریق نہیں کی اور سب کو اپنی ہستی کا ایک جزو قرار دیا

میں جیساکہ میرے ایک عزیز دوست نے اندیشہ ظاہر کیا ہے، مہدویت کا دعویٰ نہیں کرتا، ورنہ میں کبھی نبوت و رسالت کا مدعی ہو سکتا ہوں، کیونکہ نہ اب کسی مہدی کی ضرورت ہے نہ رسول کی لیکن یہ ضرور عرض کرونگا کہ اگر رات کی تنہائی میں، صبح کی خلوت میں طبیعت سخن کی طرف مایل ہو تو جو کچھ میں کہتا ہوں اس کو سامنے رکھئے اور پھر مجھ سے نہیں بلکہ

زخود بپرسے کہ ما را چہ در دل افتاد است

دسمبر سنہ ۲۶ء کے نگار میں، میں نے اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کو مشورہ دیا تھا کہ سالانہ تقریب میں بجائے مشاعروں کے کوئی اور سنجیدہ و مفید مشغلہ تلاش کرنا چاہئے اور میں نے اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ بزم شعر خوانی کے ساتھ طلبہ کا ازحد شغف نتیجہ ہے اُس ادنیٰ قسم کی ذہنیت کا جو موجودہ نصاب تعلیم اور اصول تربیت کے ماتحت اسوقت ہندوستان کی بڑی سے بڑی درسگاہ میں پائی جاتی ہے۔ میں سمجھتا تھا اور غالبًا اپنے خلوص نیت کی بنا پر صحیح سمجھتا تھا کہ میرا یہ کہنا کسی کو گراں نہ گزرا ہوگا، لیکن اُس وقت یہ امر میرے ذہن میں بھی نہ آیا کہ ہندوستان کا گروہ شعرا ہنوز جناب احسن مارہروی ایسی ذہنیت رکھنے والے شاعروں سے خالی نہیں ہے جو اپنی اہمیت کو صرف اپنی شاعری ہی سے ثابت کرنا چاہتے ہیں درآنحالیکہ سچ پوچھئے تو وہ شاعر بھی نہیں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے اسوقت تک جناب احسن کو ایک لمحہ کے لئے بھی صحیح معنی میں شاعر سمجھنے کی غلطی کا ارتکاب نہیں کیا تھا اور میں ہمیشہ ان کو غیر شاعر ہونے ہی کی حیثیت سے ایک اچھا انسان جانتا تھا، لیکن اب اسٹرکالج میگزین کے جو ابتدائی نمبر کے ملاحظہ سے (جو غزلوں کے ایک گلدستہ کی صورت میں جناب احسن کے مقابلہ افتتاحیہ کے ساتھ شایع ہوا ہے) ثابت ہوتا ہے کہ اگر انھیں اپنے شاعر نہیں تو کم از کم شاعروں کے نقیب ہونے پر ضرور اصرار ہے اور وہ میرے اُس خیال سے اسقدر برہم ہیں کہ مجھ سے اس کا انتقام لینے کیلئے ان کو ایک سے زائد تیر اپنے ترکش طعن و تشنیع سے نکال کر استعمال کرنا پڑے

کس منھ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا

جناب احسن مارہروی نے میرے مصلح اردو ہونے کی حقیقت، میری اصابت رائے کی نازش، میری اعلیٰ ذہنیت کی مفروضیت اور «بادہوائی» خیالی رفعت کو بھی بے نقاب کرنے کی سعی فرمائی ہے، لیکن بالکل حسبۃً للہ کیونکہ مبادا طلبہ کی ناتجربہ کار طبیعتیں اس سے مرعوب ہوجاتیں اور وہ شاعری کا مشغلہ ترک کرنے کے بعد فلاح دارین سے محروم ہوجاتے۔ پھر لے میرے محترم بزرگ اور علیگڈھ کے

فقط نظرت سے، اے آبروئے خلوت و اے فرِ انجمن، میرے پاس تو کافی الفاظ بھی نہیں کہ آپ کے اس خلوص نیت، اس استاذانہ شفقت وکرم، اس مصلحانہ، ندانہ وشمائل اور اس بزرگانہ حزم ونگہداشت کی داد دے سکوں، اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اس کی جزا خیر آپ کو داور حشر کی طرف سے نہ ملی تو سب سے پہلے وہ شخص جو اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا، استغاثہ دربارِ ناآپ کے اس گلدستہ کو پیش کریگا، وہ میں ہونگا، خواہ وہ کانٹے بدکھکر بجائے آپ کے میرے ہی منھ پر کیوں نہ پھینک دیا جائے

سچ ہے اگر کالج کے طلبہ کو شروع ہی سے یہ درس نہ دیا جائے گا کہ محبت کے رموز کیا ہیں، معشوق سے کیونکر باتیں کیجاتی ہیں، ہجر و وصل کے شدائد و لذائذ کیا ہیں، تو پھر قیس و فرہاد کی نسل کیونکر قایم رہیگی اور احسن صاحب اپنے عشق بہارِ نہ سری کے جوش میں کس پر یہ غمزہ محبت صرف کرینگے کہ:۔

قسم اپنی، اتم اپنا، مری خواہش، مرا نام یہی دو چار ہیں باتیں جو انھیں یاد نہیں

مجھے نہیں معلوم کہ وہاں جناب احسن کے سپرد کونسی خدمت ہے، لیکن میں اتنی درخواست کرونگا کہ اگر ہو اس کا موقعہ اتفاقاً آجائے تو اپنے اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے طلبہ کو کم از کم یہ ضرور بتادیں کہ آپ کے محبوب نے کیا قسم کھائی تھی جو یاد نہیں رہی اور آپکی وہ کونسی خواہش تھی جو پوری نہیں کی گئی۔

یہ ہے وہ شاعری جس کو الشعراء تلامیذ الرحمان اور ان من الشعر لحکمۃ وان من البیان لسحرا کی آڑ پکڑ کر جناب احسن کالج میں رواج دینا چاہتے ہیں۔ لاغنیمت کا

بمکتب می رود طفل پریزاد مبارکباد مرگ نو باستاد

کہنا آجتک بدنام ہے لیکن کس کے منھ میں زبان ہے جو جناب احسن مارہروی سے یہ بازپرس کرے کہ کالج کے حدود میں کمسن طلبہ کے سامنے اپنے محبوب کی قسم اور اپنی خواہش کی داستان دُہرانے کا اُن کو کیا حق حاصل ہے۔ کیا لوگ اپنے بچوں کو اسی یقین کیساتھ وہاں بھیجتے ہیں کہ وہاں کا مہتم مشاعرہ سال میں دو چار مرتبہ ایسے پست و دنی مشاغل ایسے ذمیں و ردی جذبات سنرد ان میں رائج کریگا

میں نے اسی دسمبر ۳۵ء کے رسالہ میں یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ "غریب بسم اللہ کے گنبد میں زندگی بسر کرنے والے نوجوان (طلبہ) کیا سمجھ سکتے ہیں کہ ہندوستان کا شاعر کسقدر عجیب و غریب چیز ہے اور اس کا اخلاق، نفسیات کے کتنے ناحل شدہ مسایل اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے"۔ ہمارے احسن صاحب بانی محفل مشاعرۂ علیگڈھ کو یہ فقرہ بھی بہت ناگوار ہوا اور وہ سمجھے کہ شاید میں نے اسی سلسلہ میں ان کے اخلاق پر بھی حملہ کیا ہے۔ حالانکہ جو شخص شوق سندیلوی کی کتاب اصلاح سخن کا مطالعہ کرچکا ہے، وہ جانتا ہے کہ جناب احسن مارہروی کے خطوط (جو اس میں درج ہیں) ایسی معمولی دستاویزی شہادتیں نہیں ہیں، جن کے ہوتے ہوئے مجھے ان کے اخلاق پر روشنی ڈالنے کی یا ان کو اپنے اخلاق سے روشنی ہٹانے کی جرأت ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب احسن مارہروی کی یہ عبارت اس شخص کو بھی تھوڑی دیر کے لئے حیرت میں ڈالدینے والی ہے جو "دزد بکف چراغ دارد" کے نام سے بدنام ہے رہا مجھے آیندہ مشاعرہ کے لئے معۂ ساز و سامان" کے شرکت کی دعوت دینا سو میں ان کے اس نوید کا ہر ممکن احترام ملحوظ رکھتے

ہوئے نہایت افسوس کے ساتھ اس حقیقت کے اظہار پر مجبور ہوں کہ اگر علیگڑھ کا ہجوم شاعرہ، فردوس ہو تو بھی میرا وہاں کیا کام جب آپ ایسے رضوان نے پہلے ہی سے وہاں کی فضا کو داغدار و آلودہ بنا رکھا ہے

معاف فرمائیے میں آپ کی لغزش شاعرانہ سے اپنے ارتعاش لب ناکام کا تبادلہ کرنے کے لئے بھی آمادہ نہیں ہو سکتا

تو و طوبیٰ و ما و قامت دوست   فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

جناب احسن مارہروی نے یہ مشورہ مفادانہ بھی دیا ہے کہ جب کبھی میں علیگڑھ آؤں تو ضرور گے یہ دو شعر ضرور سن لوں کہ

نظم را علیا قدر کن بذات خود تمام   کان نہ محتاج ہوں و صوت علیا گر بود

در کند مطرب نیست ان الحان در آنجا ہم   چوں سخن خود ہمہ پیش دہتر بود

ہر چند میں شاعر نہیں لیکن چونکہ مشورہ صاحب اسپلائی میں نگار کے ذریعہ سے تمام دنیا گر قسم کے شاعروں کو پہونچائے دیتا ہوں لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک مشورہ احسن صاحب کے حضور میں ہے اور اگر پسند فرمائیں تو عرض کروں کہ جب وہ طلبہ کو درس شاعری دینے کے بعد فارغ ہو جایا کریں تو سعدی کے یہ دو شعر وہ خود بھی ضرور پڑھ لیا کریں

کریما بہ بخشائے بر حال ما   کہ ہستم اسیر کمند ہوا

نداریم غیر از تو فریاد رس   توئی شاعران را خطا بخش و بس

افسوس ہے کہ اس مہینہ میں زیادہ تفصیل کا موقعہ نہیں لیکن ماہ آئندہ میں اس گلدستہ کا پورا مطالعہ کرنے کے بعد بتاؤنگا کہ آپ صرود کالج میں تلامیذ الرحمان قسم کے شاعر پیدا کر رہے ہیں یا بتیمم الغافون نوعیت کے اور پھر آپ کے آبگینہ حصار' میں آپکی "ابلہانہ گریز" کا تماشہ دیکھوں گا میں جانتا ہوں کہ یونیورسٹی کے ہر ملازم کو اربابِ یونیورسٹی کی نگاہ میں اپنے تئیں خود مفید ثابت کرنے کے لئے بہت سی تدابیر اختیار کرنا پڑتی ہیں اور جناب احسن حقیقتاً اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے کہ ہر سال مشاعرہ کا ایک انوو بے معنی ہنگامہ پیدا کر کے اپنے خداوندان رزق کے سامنے اپنے وجود کی اہمیت کو ثابت کرتے رہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اُن کی اس "کارگاہ معاش فریب" کو دنیا کیوں برداشت کرے اور ان کے مصالح ذاتی پر فرزندان ملک کے اساتذہ کی قربانی کیوں چڑھائی جائے۔ اگر جناب احسن سوائے مشاعرہ سازی کے کسی اور خدمت کے اہل نہیں ہیں، تو اس کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے کہ نوخیز طلبہ میں احسن صاحب کی اہلیت کے لحاظ سے مخصوص ذہنیت پیدا کیجائے۔ اور اس طرح نسل کی نسل کو تباہ و برباد کیا جائے

مارچ ۱۹۳۰ء خدا ہے یا نہیں ؟ اس کا جواب سورج کے طلوع و غروب سے مانگو، چاند کے ایاب و ذہاب سے پوچھو، آبشاروں کی روانی وشت و صحرا کی ویرانی سے دریافت کرو، پہاڑوں کے سکوت اور دریاؤں کے شور سے طلب کرو۔ موسموں کا باقاعدہ تغیر و تبدل، بہار و خزاں کا ظہور و خفا، نباتات کی بوقلمونی، وحوش و طیور کی طبیعی نیرنگی، نوع انسانی کے قوائے کا منہ، فضائے بسیط کے ستارے، کائنات کی لانہایت وسعت، خورد شبنم، ذرہ و آفتاب اور ان سے بھی فروتر انسانی مساعی کی مختلف صورتیں، (جن کا نام ہم نے علم طبقات الارض، علم الجو، علم الافلاک، علم الکیمیا، علم وظائف الاعضا علم الحیات، نفسیات وغیرہ رکھا ہے) بتائیں گی کہ کوئی ایسی قوت ہے جس کے سمجھنے کے لئے ہم اپنی عقل کو عاجز و بے بس پاتے ہیں اور اسی لئے یہ مسئلہ اس قدر بدیہی اس درجہ روشن و واضح ہے کہ اگر چاہوں تو اُسے مشاہدہ سے تعبیر کرسکتا ہوں۔ جس کے لئے نہ دلیل و بُرہان کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہ کسی حجت و توجیہ کی۔ آفتاب طلوع ہوتا ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس سے آگاہ ہو جاتا ہے، صبح کو پھول کھلتے ہیں۔ اور سارا گنج نکہت سے معمور ہو جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو آپ اپنی برہان ہے، یہ وہ صداقت ہے، جو آپ اپنی مصدق ہے۔ اگر ہم اس سے ناواقف ہیں تو کس کا قصور ؟

حق خامش ست و با تو بصد رنگ گفتگو ست ۔ شوق آرمیدہ است و فلک تاز جستجو ست
موقوف اضطراب زماں نیست عرض راز ۔ گر دارسی اشارۂ تحقیق مو بمو ست
ہر گہ نظر خطاب کند حرف خامشی ست ۔ ہر جا بہار ساز شود نغمہ رنگ و بو ست
کثرت حجاب جلوۂ وحدت نمی شود ۔ مژگاں بہر چہ باز کنی دیدہ محو اوست

پھر اب اور نہ کبھی، یہ سوال تو پیدا ہی نہیں ہوا کہ کوئی قوت ما فوق الادراک ہے یا نہیں البتہ عقول انسانی کا اختلاف اس امر میں ضرور ہوا ہے کہ ہم اس کا تصور کیونکر کریں، اُس نہ دیکھے جا سکنے والے کو کیونکر دیکھیں اور اُس نہ سمجھے جا سکنے والے کو کس طرح سمجھیں۔ فلسفہ آجتک اس گرہ کو نہ کھول سکا اور مذہب کی عقدہ کشائیاں تمام تر اسی ایک معمہ سے وابستہ رہیں اور مختلف زمانوں میں مختلف انبیاء و رسل نے مختلف طریقوں سے اسی مسئلہ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا، لیکن کیا یہ امر حیرتناک نہیں ہے کہ باوجود اسکے کہ حقیقت ایک ہے، مگر تعبیرات بیشمار، راز ایک ہے مگر اسکی داستانیں کثیر، اور

عُسنات واحد و عبارا تنا شتّٰی

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ ۔ چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

مذاہب و مُسنک، اقوام و ملل کی تاریخ کا مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ کفر و اسلام، اذان و ناقوس کی وہ

جنگ جو آج نظر آرہی ہے، کوئی نئی چیز نہیں بلکہ اس کی ابتدا اُسی وقت سے ہوتی ہے جب سے انسان اپنی فطرت کے ساتھ جذبۂ تفوق پرستی لیکر آیا ہے۔ یقیناً یہ جنگ علم و مذہب کی جنگ نہیں، کیونکہ اگر مذہب کا مقصود اعلا صرف خداشناسی ہے تو پھر مجھے کوئی سمجھائے کہ دُنیا کا وہ کونسا علم ہے، جو منشا اس غایت تک نہیں پہونچا، بلکہ یہ جنگ اُن رقیبوں کی تھی جو ایک ہی محبوب کے جلوہ کے لئے بیتاب تھے، اُن جاندادگان خودفراموش کی تھی جو سوائے اپنے کسی اور کو "خلوتیان راز" میں شامل دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ یا زیادہ صحیح الفاظ میں یوں کہئے کہ وہ اپنے ہی "ذوق سجود" کے تفوق کو ثابت کرکے "آستانۂ محبوب" کو اپنے لئے مخصوص کرلینا چاہتے تھے۔ یقیناً یہ کمزوری کم و بیش ہر زمانہ کے انسان میں پائی گئی ہے اور آج بھی تمام افتراق و انشقاق اسی کمزوری کا نتیجہ ہے۔

فلسفہ و استدلال کی دنیا میں آکر جس وقت اس مسئلہ پر غور کیا جائیگا تو معلوم ہوگا کہ اس کا اصل سبب صرف یہ ہے کہ خدا کے جس تصور کو مذاہب عالم نے پیش کیا وہ صحیح نہ تھا ممکن ہے کہ صرف قومی و ملکی نظام تمدن کے لحاظ سے اُسوقت مناسب رہا ہو لیکن اخوت عامہ اور ہمہ گیری کے لحاظ سے وہ نامکمل تھا، دنیا میں صرف ایک ہی مذہب ایسا ہوا ہے جس نے ہزاروں لاکھوں سال کی اس اُلجھی ہوئی گتھی کو سلجھایا اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اب نہ مذہب کے لحاظ سے کسی اور مذہب کی ضرورت دنیا کو باقی ہے نہ مبلغ مذہب کی حیثیت سے کسی اور ہستی کے رونما ہونے کی حاجت۔ اور وہ مذہب اسلام ہے جو نہ کسی ملک کے لئے مخصوص ہے نہ کسی قوم کے لئے مختص، اس کی دعوت گبرو ترسا، یہود و نصاریٰ، عالم و جاہل، امیر و فقیر شاہ و گدا مشرق و مغرب، شمال و جنوب ہر طبقہ و ہر ملک کے لئے یکساں ہے اور اسی لئے اس نے جو مفہوم خدا کی کبریائی کا پیش کیا ہے وہ ایسا جامع، ایسا قرین عقل، ایسا ہمہ گیر اور اس درجہ وسیع ہے کہ جس آسانی سے ایک جاہل اُسے قبول کر سکتا ہے بالکل اسی طرح ایک فلسفی بھی اسکے ماننے پر مجبور ہے

وہ زمانہ جب "آسمانی بادشاہت" کا وعظ دیکر خدا کو ایک دنیاوی صاحب جبروت بادشاہ کی طرح پیش کیا جاتا تھا ختم ہوگیا، وہ عہد جب عقول انسانی صرف مرئی و محسوس اشیا پر ایمان لا سکتے تھے اور جب ضرورتاً و مصلحتاً مسیح کو خدا کی صورت میں پیش کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی تھی، گذر گیا، وہ دور انسانیت جب تمرکز نفس (concentration) کے لئے رمزی و اشاری (symbolic) طریق عبادت کی ضرورت محسوس کرکے خدا کے وجود کو بتوں، ہیکلوں، تمثالوں اور مجسموں میں تبدیل کیا گیا، باقی نہیں ہے۔ یہ تمام زمانے اب سے تقریباً ۱۳۵۰ سال قبل ختم ہوگئے، جب ریگستان عرب سے ایک انسان کامل و اکمل کا ظہور ہوا اور اسنے نہایت ہی مختصر و سادہ الفاظ میں خدا کے وجود کا وہ فلسفہ بیان کیا جو اس سے قبل کسی نے بیان نہ کیا تھا۔ اسنے ثنویت و تثلیث کی تردید کی، اسنے تجسیم و تشکیل کو غلط ٹھیرایا اسنے حلول و تنفیذ کی تغلیط کی، اسنے تشتت و انتشار کی صورتوں کو محو کیا، تفریق و افتراق کی راہوں کو بند کیا اور اسنے بتایا کہ خدا تمام مکانیات و زمانیات کے تعلق سے بے نیاز ہے، مادیات کی دنیا سے علٰحدہ ہے اور تمام ا

نسبتوں و اضافتوں سے منزہ جو عقول انسانی کو کسی وجود کے سمجھانے کے لئے متعین کیجاتی ہیں۔

ایک طرف تو اُسنے بتایا کہ اس کا قیام عرش بریں پر ہے یعنی ذات انسانی سے علیحدہ کائنات ہیں، فضائے وسیع میں، جو لا متناہی ہیں جو کچھ ہے وہ سب اسی کا ہے اور اسی کا پیدا کیا ہوا ہے اور دوسری طرف اُسکو شہ رگ سے زیادہ قریب بتایا یعنی جس حد تک ذات انسانی کا تعلق ہے، اُس کے قرب کی کوئی انتہا نہیں وہ سانس میں جاری ہے خون میں ساری ہے، روح میں دوڑ رہا ہے، قلب میں جاگزیں ہے۔

اس کو رحمان و رحیم بتایا، اور جبار و قہار ظاہر کیا بظاہر یہ تمام ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن یہیں سے یہ نکتہ حل ہوتا ہے کہ جن کو اسمائے حسنیٰ کہا جاتا ہے وہ نہ خدا کے ذاتی نام ہیں نہ صفاتی بلکہ آثاری و مظاہری اسماء ہیں جن کا تعلق کائنات کے ہر تغیر و تبدل، زندگی کے تمام اصول اور ہستی کے جملہ اعتبارات و امتیازات سے ہے یعنی اگر انسان خوشحال و پُرامن زندگی بسر کر رہا ہے تو یہ بھی اُسی کا مظہر ہے اور اگر قہر و جبر کی ساعتیں گزار رہا ہے تو بھی یہ اُسی کی آیات کی وجہ سے ہیں، جس نے اسباب و علل کو پیدا کر کے عالم کی تمام کیفیات مادی و ذہنی کو اپنے سے منسوب کیا ہے اور جس نے اختیار کرنے اور انھیں کے مطابق نتائج حاصل کرنے کے لئے انسان کو عقل کامل عطا فرمائی ہے۔

یہ تھا خدا کا وہ تصور جو بانی اسلام نے بتایا اور دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے زیادہ پاکیزہ و منزہ خیال جو ارفع ترین نگاہ اور رسا ترین فکر انسانی کے لئے بھی قبول ہو، اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہی ہے وہ اصل اصول مذہب جو انسان کو وسیع النظر بناتا ہے جو تمام افراد کو ایک رشتۂ اخوت سے وابستہ کرتا ہے اور وجدانوں کو تعصب و جہل، کینہ و بغض سے پاک کرتا ہے، لیکن کیا کوئی مسلمان آج کہہ سکتا ہے کہ وہ خدا کو ایسا ہی سمجھ رہا ہے جیسا بانی اسلام نے سمجھایا تھا اور اسکی آغوش ہر انسان کے لئے خواہ وہ کسی مذہب و ملت، کسی ملک و قوم کا ہو پوری طرح کھلی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ طبقۂ صوفیہ بھی جن کے مشرب و مسلک کا انحصار ہی عقیدۂ "وحدتِ وجود" پر ہے کوئی کیفیت اپنے ذہن و ضمیر میں اس نوع کی نہیں پاتے جو اس اعتقاد کے بعد پیدا ہونی چاہئے۔

ہمارے یہاں کے علمائے مقدس جو اپنی ساری زندگی صرف روزہ و نماز کی تلقین میں بسر کر دیتے ہیں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی غور نہیں کرتے کہ جس خدا کا پیام وہ دنیا کو پہونچا رہے ہیں وہ پہلے روزہ و نماز کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اس تعلق کی تصدیق چاہتا ہے جو اس کے اور بندوں کے درمیان قائم ہے اور جس کے سمجھنے پر کائنات کی ترقی، روح کا استقلال، اخلاق کی پاکیزگی، مادی ارتقاء اور عالم کا امن و سکون منحصر ہے۔ اگر ایک مسلمان نماز پڑھنے کے بعد مسجد سے یہ خیال لیکر نکلتا ہے کہ مندر و کلیسا خدا کی حکومت سے علیحدہ ہے، اگر وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھکر اپنے سوا تمام عالم کو غیر خدا کی پیدا وار جانتا ہے تو مذہب معلوم و اہل مذہب معلوم!

پھر جب خدا سب کا ہے، تمام مخلوق اسی کی ہے، اس کو نہ مذہب سے فائدہ پہونچتا ہے نہ لامذہبیت سے نقصان

تو پھر یہ عصبیت کیوں، یہ تفوق و برتری کا غلط معیار کیا، طریق عبادت کے اختلاف پر جنگ کیا معنی، وضع و لباس کی تفریق، تمدن و معاشرت کے امتیاز پر آویزش کیسی؟

دل چو آزاد از تعلق شد منور می شود ۔۔۔ قطرہ کز موج دامن چید گوہر می شود
ہیچکس را در محبت شرم چشمی مباد ۔۔۔ در ہوایت ہر کہ گریدو دیدہ ام تر می شود

"انسانیت، اب نہیں بلکہ ایام طفولیت ہی سے حسن و جمال کا خواب دیکھ رہی ہے، اور جس حد تک اس کا علم، اس کے مشاعر بڑھتے جاتے ہیں، اسیقدر زیادہ شدت و تنوع کے ساتھ یہ کیفیت بڑھتی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک صاحب فن اپنے فن میں، ایک شاعر اپنے شعر میں، ایک ادیب اپنی انشا میں، ایک فیلسوف اپنے فلسفہ میں یہانتک کہ ایک مادہ پرست بھی، جو اپنی فطرت کے لحاظ سے معنی جمال سمجھنے کا بہت زیادہ نااہل ہے، حسن ہی کا خواب دیکھتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جمال کسے کہتے ہیں؟

جمال ایک خیال ہے جو مادہ کے ملبوس میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ وہ ایک تبسم ہے جو عالم انسانیت کی پیشانی پر نمودار ہوتا ہے۔ وہ صحرا حیات میں تھک جانے والے تمدن کی جائے پناہ ہے۔ وہ ایک قوت ہے جو مادہ کی قیود سے ہمیں آزاد کرتی ہے۔ وہ حیات سے زیادہ ترقی یافتہ چیز ہے جو حیات کو بھی بھلا دیتی ہے۔

اپنی لڑکی کے سنہرے بالوں کے چھلوں کو دیکھ کر فرط مسرت سے مسکرا پڑتی ہے اور لڑکی بھی ہنس دیتی ہے شاعر دیکھتا ہے اور ان دونوں کی ہنسی میں وہ جمال الٰہی کی چمک محسوس کرتا ہے۔ ایک نوجوان اپنی محبوبہ کے چہرہ پر نگاہ ڈالکر اپنے قالب کو سکون سے بھر لیتا ہے۔ ایک شخص شام کے وقت آسمان کی رنگین فضا کو دیکھکر، آفتاب کو افق لانہایت میں غروب ہوتے ہوئے دیکھکر جمال فطرت سے متاثر ہوتا ہے۔ ایک شاعر، ایک معنی حسن سے متاثر ہوکر، اپنی موسیقی کے بادلوں سے فضا میں اس تاثر کو پھیلا دیتا ہے، پھر اگر اس کا نغمہ عظمت وطن سے متعلق ہے تو وہ اپنے نفس کو وطن کے ہیکل مقدس پر قربان کرتا ہوا محسوس کرتا ہے اور اگر وہ نغمہ محبت ہے تو ہر آواز کے ساتھ وہ اپنی روح کے اجزا کو صرف ہوتے ہوئے دیکھتا ہے

تارڈ (Tarde) اپنی کتاب "المنطق الاجتماعی" (La Logique Sociale) میں کہتا ہے: "ہم وطن کو جمیل کہتے ہیں جب وہ قوی ہوتا ہے، ہم اسے عظیم کہتے ہیں جب اس کے افراد مہذب و شایستہ ہوتے ہیں"۔ یقیناً جمیل ہے وہ وطن جو ظلم کے سامنے نہیں جھکتا اور جو لوائے حضارت بلند کرنا اپنا نصب العین قرار دیتا ہے

اسپارٹا حسین تھا، جب اسپارٹا کا رہنے والا دیکھتا تھا کہ اس کا ملک بلاد یونان پر حکمراں ہے۔ مصر قدیم جمیل تھا جب اہل مصر اپنے ملک کی عظمت کے معتقد تھے اور وہاں کے ہیاکل و آثار میں وہ انوار ربانی کی روشنی کو مرکوز پاتے تھے۔ روم

جمیل تھا جب روما اپنی مملکت کو تمام بلاد عالم کی ملکہ جانتا تھا۔ بلاد عرب جمیل تھے جب اسلام اس کے فرزندوں کو حضارت و مدنیت سے آراستہ کر رہا تھا اور اسکی شوکت و جبروت کی داستانیں دنیا کے ہر گوشہ میں سُنی جاتی تھیں" یہ خیالات تھے ایک مصری ادیب کے جن میں رات میں محو تھا میں نے سوچا کہ سرزمین ہند بھی جمیل تھی جب کرشن کی تعلیم نے صحیح معنی میں حریت آزادی کی روح گوشہ گوشہ میں پھونک رکھی تھی لیکن اب وہی سرزمین مشرق جو ہمیشہ سے طلوع حق و صداقت اور ظہور تہذیب و مدنیت کیلئے مشہور تھی، سوگوار ہے کیونکہ اُس کا جمال محو ہوگیا ہے، اس کی عظمت مٹ چکی ہے۔ اور غالباً اس سے زیادہ دردناک داستان اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ یہ تمام سوگواریاں خود فرزندان ملک کے ہاتھوں اس کو حاصل ہوئی ہیں۔ کیا ہندوستان کی تاریخ غلامی سوائے اس بدبختی کے کسی اور چیز کی تاریخ ہے؟ کیا فرزندان آریہ ورت کہہ سکتے ہیں کہ اُن میں وہی غیرت و حمیت، وہی بلند خیالی و عالی نظری پائی جاتی ہے، جو ان کے اکابر و اعاظم میں پائی جاتی تھی۔ آج ہندوستان کی آبادی کا عنصر غالب غیر کی حکومت سے آزاد ہونے کے لئے بیتاب ہے، لیکن کبھی اس نے اسپر بھی غور کیا ہے کہ وہ خود اپنے برادران وطن کے ساتھ کس سلوک و برداداری کو جائز رکھتا ہے۔ ہندوستان ہے کہ لئے آزادی اور سوراج کے طلبگار حکومت موجودہ سے اپنے فطری و ملکی حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں، لیکن وہ کبھی ایک لمحہ کے لئے ملک کی اُس آبادی کے جذبات کا خیال نہیں کرتے جس کے ضعیف شانوں کی مدد حاصل کئے بغیر یہ بار آسانی سے نہیں اُٹھ سکتا

اپریل سنہ ۱۹۳۰ء

ایک قوم کے انحطاط کا بدترین دور وہ ہوتا ہے جب وہ اس فریب میں مبتلا ہوتی ہے کہ صرف اسی کا مذہب خدا کا پسندیدہ مذہب ہے۔ اور نجات محدود و مخصوص ہے محض اسی کیلئے۔ پھر جب وہ اپنے ادبار و ذلت، اپنے انحطاط و زوال کو دیکھتی ہے تو کوئی تاویل نہیں کرسکتی کیونکہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کیونکر تنہا سچے مذہب والی قوم کو تباہ کرسکتا ہے اور آخرکار وہ "رچناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند" کہکر اپنی تسکین کرلیتی ہے اور پھر اُس سے زیادہ خدید دریب میں اپنے آپ کو مبتلا کرکے غافل ہوجاتی ہے حتی کہ رفتہ رفتہ یہ غلط اعتقاد، یہ خلاف حقیقت عقیدہ اسکے تمام قوائے عمل کو بیکار بنا دیتا ہے اور محض "دسات آسمان کی گردش" پر وہ کچھ نہ کچھ ہو رہنے" کا خیال اُسے آخرکار پامال و معدوم کردیتا ہے۔

ہندوستان کے مسلمان بھی آجکل اسی دور سے گزر رہے ہیں۔ ایک شاعر اُٹھتا ہے اور اسی اعتقاد کی بنا پر اپنے آپکو فخر بھعلاء کے علو کا مستحق جانکر خدا سے شکوہ کرتا ہے کہ "ہم مٹے نیوں تیرے نام کا۔ ملمان تیار ہیں اس طرح دنیا کے ہر گوشہ میں تیری پرستش کرائی اور تو بھی آج ہمیں برباد کر رہا ہے یہ تو سمجھ کر ہم نہ رہیں گے تو پھر کون تیری کبریائی کا علم بلند کریگا"! نظام عالم بدستور اپنے آئین پر جاری رہتا ہے آفتاب و ماہتاب مقررہ اوقات پر طلوع و غروب ہوتے رہتے ہیں اور قدرت کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ کون کیا کہہ رہا ہے کیونکہ وہاں صرف خود اعمال بیش ہوتے ہیں ۔۔۔ ایک ۔۔۔ ہے اور افراد ملت کو سمجھا رہا ہے

کہ عسرت و افلاس سے گھبرانا خلافِ مذہب ہے کیونکہ خدا غریبوں کا ساتھی ہے اور ہر دشواری کے بعد آسانی آنے والی ہے۔ لوگ سنکر اُس قناعت کے ساتھ جو یاس و قنوط کا نتیجہ ہے گردن جھکائے اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں اور وہاں خاموش و بیکار بیٹھکر اُس فوز و فلاح اور اُس نعمت و برکت کا انتظار کرنے لگتے ہیں جس کا وعدہ (بقول واعظ) خدا کر چکا ہے۔ کائنات کا نظم و نسق مقررہ اصول پر قائم رہتا ہے، عناصر کی تحلیل و ترکیب اسی طرح جاری رہتی ہے اسباب و علل کے نتائج بدستور پیدا ہوتے رہتے ہیں اور خدا کو پرواہ بھی نہیں ہوتی" وہ برابر بلند کرتا جاتا ہے ان کو جو بلند ہونے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اور نیچے گراتا جاتا ہے اُن کو جو اپنا بوجھ دوسروں کے سر ڈالنے کے عادی ہیں۔

میں پوچھتا ہوں کہ اگر خدا کو کائنات کا خالق، موجودات کا آفریدگار، مانا جاتا ہے تو مخلوقات کی کسی جماعت کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ اسکے برکات و نعائم کو صرف اپنے لئے مخصوص سمجھے، جبکہ اسکے جملہ مظاہر و آثار تمام عالم کیلئے یکساں طور پر افادہ و استفادہ کیلئے کھلے ہوئے ہیں۔ اگر آفتاب کی حرارت و روشنی، چاند کی برودت و خنکی، موسموں کا تغیر، نباتات کا نمو، جمادات کا تحجر، اور اسی طرح کی ہزاروں کیفیات کسی جماعت کیلئے مخصوص ہو سکتی ہیں تو بیشک وہ سب کچھ درست ہے جو ایک مسلمان کو مولویوں کی طرف سے سمجھایا جاتا ہے ورنہ خدا کے نزدیک، اس خلاق بے ہمتا اور اُس فعال لما یرید کی نگاہ میں جس کی کوئی غرض کسی مخلوق سے وابستہ نہیں ہو سکتی، ایک حقیر چیونٹی سے لیکر کوہ پیکر ہاتھی تک اور ایک وحشی بھیل سے لیکر دنیا کے عظیم ترین پیغمبر تک سب برابر ہیں اور جس طرح ایک انسان کسی کیڑے کو پامال کرتا ہوا گزر جاتا ہے اور پرواہ نہیں ہوتی، اسی طرح خدا بھی نہ صرف کسی ایک جماعت، بلکہ سارے کرۂ ارض، تمام نظامِ شمسی اور جملہ کائنات و موجودات کو معدوم کرنے میں معذور نہیں ہے اور نہ اس سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟

آجکل کا مسلمان جو حقیقتاً اسلام کی صحیح تعلیم سے بالکل بے خبر ہے اور جسکو علماء کے گروہ نے کبھی مذہب کی حقیقی روح سے آگاہ نہیں کیا، محض رسماً و رواجاً اسلام سے منسوب ہونے کو اتنا بڑا اشرف سمجھتا ہے کہ اسکے نزدیک خدا کو بھی اُس سے مرعوب ہو جانا چاہئے اور اسی خیال کے ماتحت وہ دنیا میں سب سے بلند زندگی بسر کرنے کا متمنی ہے درانحالیکہ اُسنے کبھی ایک لمحہ کیلئے اُس تعلق کو نہیں سمجھا جو خالق و مخلوق اور عابد و معبود کے درمیان قایم ہے اور نہ کبھی اس پر غور کرتا ہے کہ خدا کے بنائے ہوئے قانون میں کبھی کوئی استثنیٰ نہیں ہوتا اور اسکا یہ قانون مقرر ہے کہ لا یغیر اللہ ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم۔

پھر جب حالات یہ ہیں تو مسلمانوں کو اپنے فلاح و بہبود کی کوئی توقع صرف "پردہ غیب" کی امداد پر قائم کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے سنسان جنگل میں کسی شخص کا کنوئیں کے اندر گرنا اور پھر یہ امید رکھنا کہ ممکن ہے کوئی شخص اُسے باہر نکال لے۔

اسباب ترقی ہر چہار طرف بکھرے ہوئے ہیں لیکن ہم اُن سے کام لینے کیلئے آمادہ نہیں عروج کی راہیں متعین ہیں، مگر ہمارے پاؤں میں جنبش نہیں۔ قومیں آگے بڑھ رہی ہیں دنیا میں ہیجانِ ترقی برپا ہے، میدان مسابقت میں ملل عالم مضطربانہ و حریصانہ آگے بڑھتی جا رہی ہیں، لیکن ہندوستان کی ایک قوم جو سوائے اپنے کسی کو آشنائے صراطِ مستقیم نہیں سمجھتی، ہنوز منتظر ہے کسی اشارۂ غیبی کی، حالانکہ زمانہ کا ایک ایک لمحہ مستقل دعوتِ اقدام و عمل ہے، اجتک مصروفِ خوابِ گرانخوابی ہے، حالانکہ لوگ کاروان در کاروان منزل کی طرف چل پڑے ہیں۔

آج ہندوستان جس فیصلہ کن ساعت سے گزر رہا ہے، وہ انتظار و آرزو نہیں چاہتی، وہ حزم و احتیاط کی طلبگار نہیں، وہ تامل و تردد کی مقتضی نہیں۔ شاہد مقصود بے حجاب ہے اور ہر بڑھ جانے والے دست طلب کے لئے اسکی دولت جلوہ وقف لیکن یہاں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو ابھی تک صرف "دامانِ خیال یار" کے چھٹ جانے پر مصروف گریہ و ماتم ہے، سیل بڑھتا آرہا ہے اور اعلان کر رہا ہے کہ "مرغابی شو کہ کار بالطوفان ست"، پھر جہاں بہت سے ایسے نظر آرہے ہیں جو "سینۂ سیلاب" کو چیرتے ہوئے گزر رہے ہیں وہیں چند ایسے بھی ہیں جو ساحل کے ساتھ فنا ہو جانے ہی کو پسند کرتے ہیں۔ کیا ہمتیں ہیں اور کیا فکرتیں!!

دعویٰ کیا جاتا ہے کہ آزادی ہر انسان کا فطری حق ہے۔ جسے اول اول اسلام ہی نے بتایا لیکن کیا آج ہندوستان کے فرزندان اسلام کے طرز عمل سے اسکی تصدیق ہوتی ہے؟ پھر غلامی اسکو نہیں کہتے کہ اپنے آپکو دوسرے کا محکوم رکھنے میں اظہار عافیت ہی کیا جائے، بلکہ یہ بھی غلامی ہے اگر حصول آزادی کیلئے اپنے آپکو دوسرے افراد کا ہمنوا نہ بنایا جائے۔ بدترین غلامی ضمیر و احساس کی غلامی ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ طایر جو دوسرے طایروں کے ساتھ قفس کی تیلیوں سے چھوڑ کر نکل جانے کیلئے بیتاب نہیں ہے کبھی کھلی ہوئی فضا کے برکات کا مستحق ہو سکتا ہے۔

لاہور کانگریس کا فیصلہ آزادی، جیسا کہ ہم اس سے پہلے کسی اشاعت میں ظاہر کر چکے ہیں، ممکن ہے مصلحت کے لحاظ سے قبل از وقت قرار دیا جائے، لیکن صداقت و حقیقت کی حیثیت سے وہ ایک ایسی آواز ہے جس پر ہزار مصلحتیں قربان کیجا سکتی ہیں اور جس کے سننے کے بعد ہر انسان کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس پر لبیک کہکر دوڑ پڑے، لیکن کسقدر حیرتناک منظر ہے کہ ہندوستان کی ایک جماعت جو آٹھ کروڑ نفوس پر مشتمل ہے، اور جو مذہبًا و اخلاقًا اپنے آپکو حریت و آزادی کا بڑا علمبردار جانتی ہے اس وقت ساکت و خاموش ہے اور افسردہ کیفیت جمود و تعطل کی طاری ہے جسکو ہم صرف موت کی بے حسی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ پھر علمائے کرام کی وہ جماعت جو اپنے پندار میں اپنے آپکو تنہا رہبر صادق و قاید مخلص سمجھتی ہے، بتا سکتی ہے کہ آج وہ اسکی آتش بیانیاں، وہ جہاد فرمائیاں اور وہ فرط جوش میں سانپ کی پھنکار کی سی زہر افشانیاں کہاں چلی گئیں۔ وہ مقدس و نورانی صورت رکھنے والے واعظ جن کے پاس ہزاروں روایتیں فرشتوں کی امداد کی، دس ہزار کے مقابلہ میں دس افراد کی کامیابی کی، اُس اعانت غیبی کی جو اصحاب فیل کو ابابیل کی مدد سے شکست دے چکی ہے اور اُس مافوق العادت قوت کی جو بیک جنبش دست در خیبر ایسے کوہ گراں کو اُکھاڑ کر پھینک دے سکتی ہے، موجود ہیں آج کیوں مسجد کے حجروں سے اور خانقاہوں کے زاویوں سے باہر نکل کر مسلمان کو درس استقلال نہیں دیتے؟ کیا اب اس سے زیادہ نازک وقت کوئی اور آنیوالا ہے کیا صیحۂ اسرافیل کسی اور چیز کا نام ہے جو ابتک ان کی گراں گوشی کو متاثر نہیں کر سکا، کیا کوئی اور ساعت آئیگی جب مسلمانوں کی زیست و موت کا فیصلہ کرنے کیلئے یہ اپنے آپکو خدا کا بیٹا سمجھنے والے خلوت و اعتکاف کی لعنت سے باہر نکل کر آئیں گے۔ یہ خود غرض و برخود غلط جماعت، یہ اپنے بقدر یک جو نفع کیلئے دوسرے کے خرمن میں آگ لگا دینے سے کبھی نہ چوکنے والی جماعت، یعنی یہ علمائے کرام کی جماعت جسکے عمامہ و قبا، کی ایک ایک شکن میں ہزار اندر ہزار افسانہائے فسق و فجور پوشیدہ ہیں، سارہ دا بل کی مخالفت میں تو چیخ چیخ کر اپنی

گردنکی ہر ہر رگ نچھاور کرنے کیلئے تیار ہے، لیکن جب سوال ملک وقوم کی آزادی کا آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈالدیا گیا ہے اور ہاتھ پاؤں بس سے کھینچکر باہر پھینک دی گئی ہے۔ ممکن ہے اسکا جواب وہ یہ دے کہ سارداایکٹ چونکہ شریعت میں مداخلت ہے اسلئے اسکی مخالفت فریضہ اسلام ہے اور آزادی کا مسئلہ محض ملکی و اجتماعی چیز ہے اسلئے شرعاً اس کی تحریک میں شرکت کرنا علی الخصوص اسوقت جبکہ کافروں و مشرکوں کا ساتھ دینا پڑے، ضروری نہیں۔ لیکن اس تاویل کی تہ میں جو جذبہ "لطیف" کام کررہا ہے وہ واقفان راز سے پوشیدہ نہیں کہ کمسنی کی شادی کے خلاف ستیاگرہ ایک ایسی آرزو کی تکمیل ہے جس کیلئے بسا اوقات جان دیدینے میں بھی دریغ نہیں ہوتا چہ جائیکہ معمولی اذیت قید و بند کہ یہ تو عشاق کے حوصلۂ جانبازی سے کہیں فروتر ہے۔ رہا آزادی ملک کیلئے ستیاگرہ کرکے سینوں کو تیغ و سناں کے لئے کھولدینا، یا زندانی ہوکر مصائب جسمانی برداشت کرنا، سو اس کے لئے ایک مولوی ایک عالم دین کیوں تیار ہو جبکہ حقیقتاً نہ یہاں "لذت کام و دہن" کا سوال ہے نہ "ذوق قلب و نظر" کا۔

آپ کو سنکر حیرت ہوگی کہ جمیعۃ العلماء کا ایک نہایت ہی مقتدر و منتخب فرد جو آپکو اس جماعت کا مرکز ثقل اور اس نظام کا اصلی بنیا نتا ہے، موجودہ حالات سیاسیات پر مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ

"اب مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ کچھ مسلمان تو حکومت سے ملے رہیں اور کچھ ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں سے
دنیا میں سوئیں نے تو لا رڈ اروِن کا آستان ناز ڈھونڈھ لیا ہے جبہہ سائی کرونگا کہ میری نجات اسی میں ہے"

یہ ہے خلاصہ مفہوم جمیعۃ العلماء کی اُس شیرازہ بند ہستی کا، جو آزادی ملک کیلئے ستیاگرہ کرنے میں یہ منافقانہ بزدلانہ اور غیر مسلمانہ مشورہ دیتا ہے، لیکن جب کمسنی کی شادی کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو اسکی موافقت میں وہ ہمہ تن "روحی فداہ" ایسا زبردست جذبۂ نافرمانی حکومت کے خلاف ظاہر کرتا ہے کہ شاید ہی گاندھی کے دل میں کبھی پیدا ہوا ہو۔ نہ اُس وقت لارڈ اروِن لارڈ اروِن رہجاتے ہیں نہ باب حکومت آستان سجود۔ وہ اس وقت ایک انسان سے گزرکر صرف عاشق بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھکر محض "قیس و فرہاد" ہوتا ہے اور اس کے تمام جذبات اسلامی خنجر گذاران نگاہوں میں آجاتے ہیں، جنکی کیفیات کا مطالعہ صرف کمسن معشوق، کے حضور، خلوت ہی میں کیا جاسکتا ہے۔ یہ ہے حقیقت اُن قائدین ملت کی جو بدقسمتی سے ہماری عاقبت و آخرت کی ذمہ داری بھی اپنے سر لیتے ہیں۔ رہ گئے دوسری قسم کے رہبران قوم سو ان کا حال بھی کسی سے مخفی نہیں اور آج وہی لوگ جو اپنے چوڑے چکلے سینے ٹھوک ٹھوک کر منھ میں کف لالاکر ہندوستان کی وادیوں کو اپنے خون سے لبریز کردینے کا دعوی کرتے تھے۔ ایسا زبردست گھونگھٹ کرکے بیٹھے ہیں کہ کسی طرف سے تلوار کیا خلخال کی بھی جھنکار نہیں سنائی پڑتی

جون ۱۹۳۰ء جب کوئی ملک نہضت و ارتقاء کی طرف قدم اُٹھاتا ہے، تو مخالف قوتوں کا متصادم ہونا متضاد عناصر کا باہمدگر متضارب ہوکر بڑھتے ہوئے قدم کو روک دینا.... دنیا کا کوئی نیا تجربہ نہیں۔ زمانہ قدیم کی تاریخ میں بھی اسکی متعدد مثالیں ملتی ہیں اور زمانۂ حال میں تو ہر ملک اسی دور سے گزر رہا ہے یا گزر چکا ہے۔ یورپ میں، روس، جرمنی، ترکی کے انقلابات اور بلاد مشرق میں افغانستان کے کوائف، چین کی بے چینیاں، اور ہندوستان کا اضطراب

ہر شخص کے سامنے ہے۔ جو ہو چکا اس کی داستان سب کو معلوم ہے اور جو ہونے والا ہے وہ دیدۂ بصیرت و اعتبار سے مخفی نہیں اس لئے اگر سرزمین ہند آج اپنی بہت سی امیدوں کے ساتھ کچھ مایوسیاں بھی رکھتی ہے، تو حیرت نہ کرنا چاہئے اور اگر راہ میں خار دار جھاڑیاں دامن کو آسانی کے ساتھ گزرنے نہیں دیتیں، تو اس کو ناقابل اندیشہ نہ جاننا چاہئے

کہا جاتا ہے کہ آزادیٔ ہند کے لئے سب سے بڑا مانع یہاں کی اقوام کا تنوع، یہاں کے مذاہب کی کثرت ہے، اور موجودہ حالات کے لحاظ سے اس کو درست تسلیم کرنا پڑے گا، لیکن حقیقت و اصول کا جہاں تک تعلق ہے میں ماننے کے لئے طیار نہیں کہ ہندوستان میں اقوام کا تنوع پایا جاتا ہے یا یہ کہ مذاہب کی کثرت کا یہ ضروری نتیجہ ہے۔ اس کو میں خلاف حقیقت کہتا ہوں اور اس کو خلاف اصول۔

«قوم» کس کو کہتے ہیں؟ قوم نام ہے ایک جماعت کا جس کے افراد بہ لحاظ تمدن و معاشرت، بہ لحاظ میلان و عواطف، بہ اعتبار ذوق و مزاج ایک طرح کی یکسانیت رکھتے ہیں اور ان کا باہم مل کر زندگی بسر کرنا بغیر جذبات کو صدمہ پہنچائے ممکن ہے پھر چونکہ انسانی طبائع صرف ملک کی آب و ہوا، ملک کی پیداوار اور ملک کی اقتصادی کیفیت کے ماتحت بنتے ہیں، اس لئے ہندوستان کے کسی باشندہ کا یہ کہنا کہ اس کی قومیت دوسرے باشندہ سے علیحدہ ہے، بالکل خلاف حقیقت ہے۔ وہ لوگ جو ہندوستان میں پیدا ہوئے، یہاں کی آب و ہوا میں جنھوں نے پرورش پائی، یہاں کے اقتصادی حالات کے ماتحت جن کی تربیت ہوئی، وہ اپنے آپ کو ایک دوسرے سے کس اصول کی بنا پر جدا کہہ سکتے ہیں اور اگر کہیں تو کون صحیح الدماغ ایسے باور کر سکتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ملک کے مختلف حصوں کے لوگ، ذوق و طبائع میں تھوڑا سا اختلاف رکھیں، لیکن یہ اختلاف اس قدر اہم نہیں ہو سکتا کہ قومیت کو بدل دے۔ یوپی کا باشندہ پنجاب کے رہنے والے سے۔ بنگال کا انسان مدراس کے باشندہ سے یقیناً کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور رکھتا ہے، لیکن میں یہ ماننے کے لئے طیار نہیں کہ ان سب کا اجتماع متضاد عناصر کا اجتماع ہے۔ میرے نزدیک ہر وہ شخص جو ہندوستان کا باشندہ ہے ایک ہی قوم سے وابستہ ہے جس کا نام صرف ہندی یا ہندوستانی ہونا چاہئے، اور مختلف صوبوں کے لوگوں کا اپنے آپ کو مختلف قومیت سے نامزد کرنا، نہ صرف تمدن و اقتصاد، بلکہ خود فطرت کے مقصود کے خلاف ہے، اگر نظر انصاف سے کام لیا جائے

اب سوال یہ ہے کہ اگر حقیقتاً ہندوستان کی آبادی ایک ہی سرزمین پر سانس لینے کی وجہ سے اور ایک ہی ملک کی آب و ہوا میں پیدا ہونے، بڑھنے جینے اور مرنے کے سبب سے، ایک ہی قوم کہلائے جانے کی مستحق ہے، تو پھر لوگوں میں یہ اختلاف کیوں ہے اور وہ کیوں اپنے آپ کو مختلف اقوام سے تعبیر کرتے ہیں، اس کا جواب اتنا ہی آسان ہے جتنا اس پر عمل کرانا دشوار۔ میں نے اس سے قبل عرض کیا تھا کہ ترقیٔ ملک کی مانع دو چیزیں ہیں ایک اقوام کا تنوع جس کی حقیقت بیان ہو چکی اور دوسرے مذاہب کا اختلاف اور حقیقتاً یہی دوسری چیز ہے جس نے ہماری قومیت و وطنیت کو تباہ کیا اور جس نے ہم قوم ہونے کے مفہوم کو بالکل بدل دیا ہے

لوگ ہمیشہ سے اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ نوع انسان کی ترقی کا انحصار مذہب پر ہے اور مذہب ہی اصل چیز ہے جس کے مقابلہ میں ملک و وطن کا رشتہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ حالانکہ انھوں نے کبھی اس امر پر غور نہیں کیا کہ مذہب کا رشتہ تو اسقدر نازک ہے کہ اعتقاد کی ذرا تبدیلی سے وہ ٹوٹ کر پارہ پارہ ہو جاتا ہے، برخلاف رشتۂ وطنیت کے کہ وہ ہر حال میں اور ہر جگہ قایم رہنے والی چیز ہے۔ ایک مسلمان عیسائی ہونے کے بعد جماعت اسلام سے علیحدہ ہو سکتا ہے لیکن اُسکے ہندوستانی ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میرے نزدیک اصل خرابی یہ ہے کہ لوگ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان عیسائی ہوں یا موسائی، ہمدردی و تعاون کی بنیاد مذہب کے رشتہ پر قایم کرتے ہیں، اور ملک و وطن اُن کے سامنے کوئی چیز نہیں ہے۔ ممکن ہے ایک شخص یہ کہے کہ مذہب کا رشتہ وطنیت کے تعلق سے بہت زیادہ وسیع ہے کیونکہ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک بلکہ سارے کرۂ ارض تک وسیع ہو سکتا ہے لیکن اس کا یہ کہنا اول تو محض امکانی صورت رکھتا ہے اور دوسرے یہ کہ نظم سیاسیات کے لحاظ سے ناقابل لحاظ ہے۔ ہیئت اجتماعی کی تشکیل اور کسی غرض مشترک کے ساتھ تمرکز خیال کے لئے ہمیشہ اول کسی حدود و قبۂ زمین کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر بعد کو اس میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہم مذہب کو اس کی بنیاد قرار دینگے تو ایک ملک کے اندر ہم مرکزیت عامہ پیدا نہیں کر سکتے اچہ جائیکہ دوسرے ممالک کو اس میں شریک کیا جائے۔ البتہ اگر قومیت و وطنیت کا جذبہ قوی ہو گیا تو اسکا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم میں ایک اعتبار سے اخوت عامہ قایم کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی جس کو ہم بہت زیادہ وسیع بنا سکتے ہیں حتی کہ اپنا وطن بجائے کسی مخصوص سرزمین کے سارے کرۂ ارض کو قرار دے سکتے ہیں اور ہر ملک و قوم کے انسان کو اس تعلق سے اپنا بھائی سمجھ سکتے ہیں۔

بہرحال میں یہ نہیں کہتا کہ مذہب غیر ضروری چیز ہے یا یہ کہ مذہب کا خیال ہی اصولاً ناواجب ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آج نہ مذہب کے مفہوم سے کوئی واقف ہے اور نہ اس کی صحیح تعلیم دنیا میں باقی ہے۔ اگر کوئی مذہب ایسا ہے جو بنی نوع انسان کے ساتھ محبت و ہمدردی کا درس نہیں دیتا جو ابناء جنس میں باہم خلوص و رافت کا جذبہ پیدا نہیں کرتا، تو میرے نزدیک وہ مذہب بالکل لغو ہے اور اس کی تعلیم دینے والے یکسر گمراہ۔ لیکن جس طرح میں یہ جانتا ہوں کہ مذہب ہونیکی حیثیت سے دنیا کے تمام مذاہب ایک ہیں اور انکا مقصود سوائے اس کے کچھ نہیں کہ نوع انسانی ترقی کرے اور دنیا امن و سکون سے آشنا ہو، اسی طرح میں اس سے بھی واقف ہوں کہ علمبرداران مذہب اور رہنمایان مذہب جنکی گمراہ کن تعلیم کو ہم لوگوں نے صحیح مذہب سمجھ لیا ہے، وہ یہی پسند کرتے ہیں کہ انسان ہمیشہ دورِ جہل و انحطاط میں زندگی بسر کرے اور کرۂ ارض کبھی فتنہ و فساد سے خالی نظر نہ آئے۔

اِس لئے ہماری موجودہ مشکلات کا سبب نہ حقیقتاً یہ ہے کہ ملک مین مختلف اقوام کی کثرت ہے اور نہ یہ کہ متعدد مذاہب یہان پائے جاتے ہین، بلکہ اِس کا سر رشتہ اُن جاہل مولویون، اُن ہٹ دھرم پنڈتون کے ہاتھ مین ہے، جنھون نے اپنی پلید ذہنیت، اپنی تنگ نظری اور ابلیسانہ فطرت سے مجبور ہوکر قومیت و مذہبیت دونون کا مفہوم نفسانیت و عصبیت قرار دیدیا ہے اور جن کے ہان انسان کا اولین و آخرین فرض صرف یہ ہے کہ وہ مخصوص مراسم عبودیت ادا کرلیا کرے، خواہ اخلاق و اطوار کے لحاظ سے وہ کتنا ہی درندہ کیون نہو۔

مجھے ہندوؤن کے علماء مذہب کا حال نہین معلوم کہ انکا کتنا اور کس قسم کا اثر لوگون پر قائم ہے، لیکن مسلمان جماعت کا حال مجھے ضرور معلوم ہے اور مین وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہون کہ ہماری ہان تمام خرابیون کا سبب صرف علماء کی ذات گرامی ہے اور انھون نے ہمارے ذہن و دماغ ہمارے اخلاق و عادات کے بگاڑنے مین کوئی دقیقہ کوشش کا نہین اٹھا رکھا۔ انھون نے بجائے مذہب کے ہم کو صرف رسم و رواج کا پابند بنایا، انھون نے مذہب کی حقیقی روح سے بیگانہ کرکے ہمکو عصبیت و تنگ نظری کی تعلیم دی اور انھون نے ہمیشہ وہی درس ہمکو دیا جو وطنیت کے جذبہ کو خاک مین ملا دینے والا تھا انھون نے ہمکو تمام عمر کفر و اسلام کی نزاع، مسجد و مندر کی تفریق، ریش و بروت کے جھگڑے مین پھنسائے رکھا اور کبھی اسلام کے اُس مفہوم سے آشنا نہین کیا جو ساری دنیا کے افراد کو ایک رشتہ سے وابستہ کردینے والا ہے۔ یہانتک کہ اگر آج کوئی شخص مجھ سے دریافت کرے کہ اصلاح ملک و قوم کی بہترین تدبیر کیا ہے تو مین صرف یہی کہون گا کہ بلا امتیاز و تفریق اس جماعت کے ایک ایک فرد کو منہدم کردینا چاہیئے اور ان کے ہاتھون سے وہ اقتدار چھین لینا چاہیئے جس کے بدولت یہ اپنے آپ کو خدا کا بندہ کہنے والے اس وقت تک "خدائی" کرتے چلے آئے ہین۔ ان مین سے "شر" و "خیر" کا انتخاب، نسیہ و نقد کے امتیاز مین نہ صرف وقت ضائع کرنا ہے بلکہ بڑی خطرناک بھی ہے کیونکہ اگر ہمکو کوئی ایسا ظرف دیدیا جاوے جس مین ۹۹ سانپ ہون اور ایک مچھلی اور اس کے اندر ہاتھ ڈالکر مچھلی نکال لینے کا اختیار دیا جائے تو ہمارے لئے چارہ کار سوائے اس کے کیا ہوسکتا ہے کہ ہم اس ظرف ہی کو زمین مین دفن کردین اور ایک مچھلی کی جستجو مین ۹۹ سانپون سے ڈسے جانے کے خطرہ کو منظور نہ کرین۔

ایک مولوی تبلیغ اسلام کے نام سے جمعیتہ قائم کرکے مسلمانون کی موجودہ بے معنی جماعت مین اُسی بے معنی ذہنیت رکھنے والے افراد کا اضافہ کرسکتا ہے، خلافت کی لغو و بے بنیاد تحریک کو قائم رکھنے مین وہ قرآن و حدیث کے سارے دفتر کو ہر مہمل تاویل کے ساتھ پیش کرسکتا ہے صرف عرب و فلسطین کی سیاسیات مین دلچسپی لینے کی تعلیم مسلمانون کو دے سکتا ہے لیکن اسکو یہ سلیقہ کبھی حاصل نہین ہوسکتا کہ وہ ملک کے فلاح پر غور کرے، وطن کی سیاسی اقتضاء کو سمجھے اور اس ایثار اور قربانی کا درس دے جسکو سب سے زیادہ اسلام ہی نے سمجھا اور سمجھایا۔

لفظ "مسلمان" دنیا مین صرف ایک ہی مفہوم کے ساتھ پیش کیا گیا تھا اور وہ مفہوم "بہترین انسان اور بہترین تمدن" ہونے کا تھا، لیکن آج یہ علمبرداران اسلام، یہ حاملان مذہب اپنے اقوال و افعال سے، اپنی گفتار و کردار سے اس کا

نا رہے ہیں کہ ہمیں "مسلمان" وہ ہے جو انتہا درجہ کا تنگ نظر ہو حد درجہ کا خود غرض ہو اور بے انتہا کمزور و بزدل بھی ہو فی اس کا ذریعۂ فخر بلندی اخلاق و پاکیزگی سیرت نہیں رہا، بلکہ اس کی پہچان اب صرف یہ رہگئی ہے کہ خدا کی عبادت کی لیہ وہ صرف محراب و منبر کی پوجا کرتا ہو، قرآن کے الہامی ہونے کے ثبوت میں وہ اسکی بلندی تعلیم پیش کرنے کے بجائے معجزۂ شق القمر اور فصاحت و بلاغت کا ذکر کرتا ہو اور اپنے سوا سب کو کافر و ملحد مشرک اور زناری بتاتا ہو۔ حالانکہ اس غریب کو یہ خبر نہیں کہ ذہنیت کا یہی وہ درجہ ہے جو "فی الدرک الاسفل من النار" سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہی وہ منزل ہے جہاں پہونچنے کے بعد "علی شفا حفرۃ من النار" کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

اس کے یہاں "دعوۃ الی الخیر" کے معنی صرف یہ ہیں کہ جہانتک ممکن ہو "مولوی" کی دعوت کرد در عہد غلامی سے قربانی کے بکرے کیطرح اسکو موٹا کرو، حالانکہ حقیقی قربانی کے لئے کبھی اسکی گردن جھکنے والی نہیں اسکے وعظ میں "امر بالمعروف" کا مفہوم یہ ہے کہ جو مشہور مولوی کہے بلا سوچے سمجھے، بلا غور و فکر صحیح مان لو اگو وہ تمام عمر تمہیں غلطیوں میں مبتلا رکھے۔ اور اسکے نہی عن المنکر کی تبلیغ اس سے زیادہ نہیں کہ نماز کے وقت ناقوس کی آواز نہ بلند ہونے دو، مسجد کے سامنے سے باجہ نہ گذرنے دو اور اگر وہ بھی ردی قسم کا مولوی ہے تو یہ کہہ گذرتا ہے کہ ڈاڑھی نہ منڈاؤ۔ کوٹ پتلون نہ پہنو۔ الغرض نہ اس کی نہ سیرت ایسی ہے کہ ہم اسکو دیکھ کر اپنی زندگی کی کوئی شاہراہ قائم کرسکیں اور نہ اسکے اقوال میں کوئی ایسی حکمت مضمر ہے جو ہماری تمدنی زندگی اور ہماری انسانی خصوصیات کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہو۔

آج ہندوستان جس دور اضطراب سے گذر رہا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں اور مسلمانوں کی جماعت اپنے قائدین و علماء سے مستفسر ہے کہ وہ کیا کرے، لیکن مولوی کو کہاں فرصت کہ وہ تبلیغ، خلافت اور فلسطین کے لایعنی قصوں کو ترک کرکے اس جانب متوجہ ہو۔

جمعیتہ العلماء کے جس گروہ نے آزادی ملک کے نصب العین کو سامنے رکھکر تحریک کانگرس میں شرکت کا رزولیشن پاس کیا ہے، اس کی حقیقت بھی سبکو معلوم ہے اور جس جماعت نے اس کی مخالفت میں آستانۂ حکومت پر جبہ سائی کو ترجیح دی ہے، اس کا حال بھی کسی سے مخفی نہیں۔ کیونکہ نہ اس جماعت میں یہ ہمت و جرأت ہے کہ وہ عملاً اس تحریک کو بارآور بنائے اور نہ اس میں یہ سلیقہ کہ حکومت ہی سے کوئی جائز یا ناجائز فائدہ اٹھا سکے۔ بہرحال مسلمانوں کو جان لینا چاہئے کہ اس وقت ان کی جماعت میں کوئی قاید و رہنما کوئی مولوی اور مولانا اس قابل نہیں ہے کہ اسکے اقوال و افعال پر اعتماد کیا جائے اور اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر شخص اپنی جگہ خود غور کرے کہ اسے کیا کرنا چاہئے اور یہ کہ ہندوستان کے ساتھ رشتۂ وطنیت قائم رکھنے کے بعد عقل و فراست کا کیا فیصلہ ہوسکتا ہے۔ تاریخ کا فیصلہ اس باب میں ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ ساحل تک پہونچنے والے وہی لوگ ثابت ہوئے ہیں جنھوں نے مضطربانہ ہاتھ پاؤں مارے اور جنھوں نے اپنے آپ کو طوفان کے رحم پر چھوڑ دیا وہ ایسے غرق ہوئے کہ پھر انہیں ابھرنا نہ نصیب ہوا۔

جولانی۔ ہر نشیب کے لئے ایک فراز، ہر ہبوط کے لئے ایک صعود اور ہر انحطاط کے لئے ایک عروج ہے"۔ یہ نظریہ ہرچند اپنی عمومیت کے لحاظ سے اسقدر صحیح و درست نہین، جیسا اسکا عکس "کہ" ہر کمالے را زوالے"۔ ایک حقیقت مسلمہ سمجھی جاتی ہے لیکن بعض اوقات اسکی مثالین بھی اسقدر عجیب و غریب نظر آجاتی ہین کہ چار و ناچار فطرت کی "فیاضیون" اور بیداریون کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔

مثلاً کون کہہ سکتا تھا کہ "اسلام" جو حالی ہی کے وقت تک "غریب الغربا" ہوگیا تھا، سنہ ۱۹۳۲ء مین جبکہ اسکی حالت "فقر الفقرا" سے بھی گر کر "اعلم العلما" تک پہونچ جائیگی، کوئی "مرد غیب" سرزمین "فرنگی محل" سے نمودار ہوگا اور اس کے "عظام رمیم" مین تازہ روح پھونک کر فرنگیون کے خدا "مسیح" کی یاد کو زندہ کردینے والا ثابت ہوگا۔

سچ ہے جب خدا کے لئے یہ محال نہین ہے کہ وہ ایک ہی ذات کے اندر سارے عالم کو جمع کردے" تو وہ یہ بھی کرسکتا ہے کہ سارے عالم مین ایک ہی ذات کو پھیلا کر "کائنات" بنادے اور وہ انسان صرف فرنگی محل کا ہو۔

ہر چہ در جانتوان دید بہر جا بینند!

آپ کو معلوم ہے کہ یہ مقدس ہستی کون ہے اور وہ کس معجزہ کو پیش کرکے "احیاء موتیٰ" کا یقین دلانا چاہتی ہے ——— یہ ممتاز و متبرک وجود افضل الفضلا، اکمل الکملا، خضر راہ طریقت، مشعل جادۂ حقیقت، حجت الاولین، سلالۃ الآخرین، سرخیل اسلام، امام الہمام مولانا و مرشدنا محمد قطب الدین عبدالوالی صاحب قبلہ مدظلہ کا ہے اور وہ معجزۂ محیر و مسکت، ایک ماہوار صحیفہ "قیام الدین" کی صورت مین رونما ہوا ہے، جو آپ ہی کے والد محترم کے نام نامی یا خطاب گرامی پر گذشتہ شوال سے جاری کیا گیا ہے۔

اس سے زیادہ بدقسمتی میری کیا ہوسکتی ہے کہ شوال سے محرم تک جبکہ پورے چار مہینے اس مقدس صحیفہ کی اشاعت پر گذر چکے ہین، مین اس کے ظہور سے بالکل بے خبر رہا اور فرنگی محل کے اس "ید بیضا" کی روشنی سے محروم رکھا گیا۔ مین نہین کہہ سکتا کہ یہ دور محرومی کب تک جاری رہتا، اگر پرسون اتفاق سے مجھ ایک صاحب اس کی اولین اشاعت کی زیارت سے مشرف نہ فرماتے۔

کسی رسالہ کا پہلا نمبر یا تو اصولاً پورے اہتمام سے نکالا جاتا ہے تاکہ لوگ جلد اسکی طرف مائل ہون یا مجبوراً خامیٔ نظم کی وجہ سے پست شائع ہوتا ہے۔ لیکن جب ایسا ہوتا ہے تو ہمیشہ یہ معذرت بھی ساتھ ہی ساتھ پیش کردیجاتی ہے کہ "بوجہ عدم انتظام کی وجہ سے رسالہ حسب خواہش نہین نکل سکا، آیندہ نمبرون مین انشاء اللہ اسکی پوری تلافی کیجائیگی"۔ چنانچہ یہ معذرت اس مین بھی موجود ہے کہ بوجہ رمضان مبارک کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ گویا رمضان ایک ایسا مہینہ ہے جس مین قیام الدین ایسے کام کو بھی کامیابی سے نہین کرسکتے۔ یہی پہلا درس مذہبیت و جوش ایمان اس رسالہ کا جو دعوائے بلند بانگ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے "احباب آگے چلئے اور ہندوستان کے خانوادۂ علم و عمل، مرکز عقل و حکمت اور مدار شریعت و روحانیت (فرنگی محل) کے اس کارنامہ فریدہ اور اس انقلاب انگیز اقدام علم و ادب پر بھی ایک

نگاہ ڈال لیں، قبل اس کے کہ وہ زلزلہ پیدا کرکے زمین و آسمان کی بنیادیں منہدم کردے، اور خدا کو بھلا دینے والی موجودہ مخلوق کو فنا کرکے، اس کی جگہ صرف حق پرستی کرنے والی ہستیاں در و دیوار پر بٹھا دے۔

کسی رسالہ یا کتاب پر ہمیشہ دو مختلف زاویوں سے نگاہ ڈالی جاتی ہے۔ ایک وہ جو صوری محاسن سے متعلق ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو جمال معنوی سے بحث کرتا ہے۔ میں اول الذکر حیثیت سے کوئی گفتگو کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ جو رسالہ معمولی تقطیع کے صرف ۲۰ صفحات پر مشتمل ہو اور جسکی تکمیل میں ارزان ترین اہتمام طباعت و کتابت حاصل کیا گیا ہو، وہ خود بھی حسن ظاہری کا مدعی نہیں ہو سکتا۔ اور پھر یوں بھی ایک اسلامی رسالہ کو حسن و تزئین سے کیا واسطہ جبکہ علماء کرام نے ہمیشہ فنون لطیفہ کی ترقی کو انحطاط ذہن و انسانیت سے تعبیر کیا ہے۔ (گو انکی اندرونی زندگی یکسر "شیفتگان جمال" کی طرح بسر ہوتی ہو) البتہ اسکے معنوی محاسن پر ضرور تبصرہ کرنا چاہتا ہوں میرا معاصرانہ فرض ہے۔

سب سے پہلے جس وقت میں نے فہرست پر نگاہ ڈالی اور بیک وقت سات "مولاناؤں" کے نام نظر آئے، جن میں سے ایک مرحوم اور چھ غیر مرحوم ہیں، تو میں حیران رہگیا کہ دیکھئے آغاز پر ویسا اجتماع کیا انقلاب پیدا کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ نوح کا طوفان اسوقت آیا تھا جب چار سیارے برج آبی میں جمع ہو گئے تھے۔ یہاں "برج فرنگی" میں سات ستاروں کا اجتماع ہوتا ہے، اسلیے آنیوالے وقت کا اندازہ کرنے کے لئے عقل حیران ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس "اقران اعظم" اس "اجتماع فرید" کے عہد میں کتنا پانی سر سے گذر جانیوالا ہے۔

میں نے اولین فرصت میں شروع سے اخیر تک اس رسالہ کا مطالعہ کیا اور کوشش کی کہ سرورق سے لیکر صفحۂ آخرین کی اس سطر تک "جو قیام الدین بک ڈپو فرنگی محل لکھنؤ" کے الفاظ پر ختم ہوتی ہے، کوئی ایک سطر کوئی ایک لفظ، کوئی ایک جملہ ایسا مل سکتا، جسے "فرنگی محل" کی شہرت کے ساتھ (خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز) نسبت دیجا سکتی، لیکن میں اس میں کامیاب نہیں ہوا اور گھنٹوں سوچتا رہا کہ کیا واقعی ہمارے "علماء کرام" کی ذہنیت اسقدر پست ہو گئی ہے۔ کیا ان کے یہاں اظہار علم و فضل کا طریقہ یہی رہ گیا ہے کہ بچوں کی طرح چند نامربوط سطحی مضامین لکھکر اس پر فخر کریں، کیا خدمت علم و دین ایسے ہی حقیر و نحیف رسائل کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے اور کیا اسی کارنامۂ فضل و کمال پر فرنگی محل کے "دارالعلم والعمل" ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے (درآنحالیکہ قیام فرنگی محل سے لیکر اسوقت تک کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر ہم صحیح معنی میں اسے "دارالعلم" کہہ سکیں چہ جائیکہ دارالعمل جس کا خواب بھی ان غریبوں نے کبھی نہیں دیکھا۔)

خویش را صورت پرستان ہرزہ سو گرداند
جلوہ می نامند و در معنی نقابے بیش نیست

اس رسالہ کے اڈیٹر نے عنوان شکریہ کے تحت میں جو تحریر درج کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "

مذہب کی اشاعت علوم کی خدمت، اتحاد و اتفاق کی تعلیم، ادبیات کی چاشنی اور نادر کتب خانون کے قابل قدر اقتباسات کو اہلِ علم کے سامنے پیش کرنا" اِس رسالہ کا مقصد ہے۔ لیکن اِسی رسالہ مین ایک مضمون یادش بخیر ہمارے محترم دوست مولانا عبدالماجد دریابادی کا بھی ہے جنھون نے فرنگی محل کی قدیم علمی روایات کو سراہتے ہوے تحریر فرمایا ہے کہ :-

"آج نوجوان فرنگی محل کو جس اصلی حریف سے صف آرا ہونا ہے خوب جان لینا چاہئے۔ وہ معتزلہ نہین، خوارج نہین روافض کا ذکر نہین کیا گیا کیونکہ لکھنؤ مین رہنے کے بعد اسکی ہمت نہ تھی) علی گڈھ کی نیچری بھی نہین، وہ کوئی اسلامی فرقہ نہین، بلکہ وہ اشد شدید دشمن ہے جو نفس اسلام کا دشمن ہے، محض فرنگی محل، اکابر فرنگی محل، شیوخ فرنگی محل، عقائد فرنگی محل کا دشمن نہین۔ وہ دشمن ہر شریعت اسلام کا وہ دشمن ہر رسول اسلام کا وہ دشمن ہے خدائے اسلام کا، اس سے مصالحت کی کوئی صورت نہین، اُس کے ساتھ راضی نامہ ہو جانے کا کوئی امکان نہین۔ ...... وہ وہ یہ ہذا کی یاجوجی روح ہے جو قیام الدین ہی کی دشمن قاطع ہے۔ اور قیام الدین اسی کو مغلوب کرنے کے لئے نکلا ہے"

"اس جہاد مین فرنگی محل سب کا شریک، اور سب فرنگی محل کے شریک ہین، آج نہ کوئی دیوبندی ہے نہ فرنگی محلی، نہ لکھنوی نہ بریلوی، .... سب کے سب اسلام کے سپاہی، سب کے سب اللہ کے لشکر کے سرفروش پیادے، سب کے سب ناموس رسول کے جانباز فدائی ہین۔

یاجوج، آج اپنے خفیہ اور اعلانیہ تیر چلاتے ہوئے یہ بالکل نہین دیکھ رہا ہے کہ سترا، دو بہتر فرقون مین سے کس کس کے سینے اسکے تیر کے چھید رہے ہین، اُسے تو عداوت یا بغض جو کچھ ہے وہ اللہ کی توحید اور رسول کی رسالت سے ہے وہ (خاکم بدہن) اسی کو دنیا سے نیست و نابود کرنے کے لئے اٹھا ہے آج ہم بھی اس یاجوج کی عداوت و بغض مین سب کی طرف سے اندھے ہو گئے ہین .... اور ہمارے حملون کی زد بھی انشاء اللہ اسی ایک حریف پر رہے گی"

اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِس رسالہ کا مقصد وحید، یاجوجی روح کا مقابلہ کرنا ہے اور اگر ہم غلط نہین سمجھتے تو اِس سے مراد ان کی غالباً وہ عقل پسند (Rationalist) (اور انکے نزدیک وہ احمق) طبقہ ہے جو کسی مذہب کی حقیقت و حقانیت کو بغیر سمجھے ہوے ماننے کے لئے تیار نہین۔ لیکن اگر اس سے مراد انکی کچھ اور ہے تو افسوس ہے کہ مین اسکو سمجھ نہین سکا، کاش وہ اِس استعارہ کی خود ہی صراحت فرماتے تاکہ اِس یاجوجی تاویل کی ضرورت نہ ہوتی۔

ایک اور بزرگ ہین جنکا نام سید محمد اسحاق حسین رضوی ہے۔ اِن کا بھی مبتدیانہ مضمون "قیام الدین اور اتحاد" کے عنوان سے شایع ہوا ہے۔ جس کی ابتدا ہی یون ہوتی ہے کہ "اگر آپ لوگ متفق ہو کر اِس رسالہ کی خریداری

بجان و دل تیار ہو جائیں تو یقیناً لامذہبیت کا خاتمہ ہو جائے"!

اگر اس کو ہم مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریر کا تتمہ خیال کریں تو یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے کہ اس رسالہ کے اجراء کا مقصد یا جو بھی قوت یا لا مذہبیت کا مقابلہ کرنا ہے۔ خیر اس کے متعلق تو میں تفصیل کے ساتھ آیندہ صفحات میں (یا اگر گنجایش نہ ہوئی تو آیندہ ماہ کے ملاحظات میں) عرض کروں گا کہ جس چیز کو وہ لامذہبیت کہتے ہیں، اُس کی حقیقت کیا ہے اور جس کا نام مذہب رکھ لیا گیا ہے وہ فی الاصل کیا چیز ہے۔ پہلے ایک سرسری جایزہ اس دین قائم کرنے والے" رسالہ کے مقالات عالیہ کا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

شکریہ کے بعد سب سے پہلے مضمون مولانا قیام الدین عبدالباری مرحوم کا نظر آتا ہے جن کے نام کے جزو اول یا لقب سے اس رسالہ کا نام استعارہ کیا گیا ہے۔ یہ مضمون مولانا موصوف کی تفسیر الطاف الرحمٰن کا ایک جزو ہے اور تیسرے پارہ کی پہلی آیت سے متعلق ہے جو تلک الرسل سے شروع ہو کر یفعل ما یرید پر ختم ہوئی ہے۔ اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں جو کچھ مولانا نے فرمایا ہے وہ بالکل وہی ہے جسکی فرنگی محل کے کسی عالم سے توقع کیجا سکتی ہے اور اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے جو ملا نظام الدین، عبدالحلیم بحر العلوم اور ابوالحسنات عبدالحی کے وقت سے منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے اور جسکا عنصر واحد کورانہ تقلید، مغالطۂ منطقی اور قدامت پرستی کے سوا کچھ نہیں ہے، مولانا عبدالباری مرحوم اس آیت کی تفسیر میں ایک دوسرے پر فضیلت انبیاء کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھ جاتے ہیں کہ "خدا نے فرمایا تم بھی رسولوں میں سے ہو بلکہ افضل ترین رسل سے ہو" اسی میں لفظ "افضل ترین" کی صحت و عدم صحت سے بحث نہ کرتے ہوئے میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس آیت سے محمد کی افضلیت تمام رسولوں پر کیسے ثابت ہوتی ہے، بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں عیسیٰ کی فضلیت کا بیان ہے جسے "آتینا عیسیٰ ابن مریم البینات وایدناہ بروح القدس" سے ثابت کیا گیا ہے۔ محمدؐ کی افضلیت کا ذکر کسی جگہ نہیں ہے اور نہ سیاق و سباق سے متبادر ہے۔ اسی سلسلہ میں مولانا عبدالباری نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ "رسول وہ نبی ہے جس پر کتاب نازل ہوئی ہو اور اس کی شریعت خاص ہو وہ ۳۶۰ ہیں"۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ مولانا نے ۳۶۰ کی تحدید و تخصیص کس تحقیق کی بنا پر کی ہے اور کیوں نہ میں اس کو ۳۶۵ کہہ دوں تاکہ سال کے پورے دنوں کا حساب ہو جائے۔

اس کے بعد ایک صفحہ فتاوائے قیام الدین کے لئے وقف ہے جس میں چند نہایت ہی معمولی مسائل مسواک اور نماز جمعہ وغیرہ کے ایسے پائے جاتے ہیں۔ جو فقہ کے ابتدائی کتابوں میں بھی ملجاتے ہیں۔

صفحہ ۷ سے ایک مسلسل مضمون مولانا عبدالباری معنی اجمیری کا حیات طیبہ کے عنوان سے شروع ہوتا ہے جس سے مقصود مولانا عبدالباری مرحوم کے حالات سے بحث کرنا ہے۔

ابتدائی دو صفحات میں مولانا عبدالباری کی ولادت کا ذکر بالکل اسی لہجہ و انداز میں کیا گیا ہے جو عام طور سے ذکر میلاد کی کتابوں میں پایا جاتا ہے اور باقی دو صفحات میں فرنگی محل کی تعریف کا راگ گایا ہے۔ جناب معنی

مولانا ہی ہین اور اجمیری بھی اور انکی یہ دونون نسبتین بدرجۂ اتم اس مضمون کے ہر ہر لفظ سے ظاہر ہوتی ہین۔

اِس کے بعد مولانا عبد الماجد بدایونی نے ایک صفحہ مین مرحبا کے عنوان سے قیام الدین کے اجراء پر اظہار مسرت کیا ہے اور دعا فرمائی ہے کہ "یہ رسالہ علمی دنیا کے لئے ایک یادگار چیز ہو" اس دعا کی سادگی اور تمنا کی معصومیت پر عرصہ ہوا غالب اظہار خیال کر گیا ہے کہ "حریف مطلب مشکل نہین فسون نیاز" کاش مولانا کوئی التجا کرتے تو اس قسم کی کہ "دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز" اسکے بعد مولانا عبد الماجد دریابادی کا وہ مضمون ہے جسکا اقتباس ہم پہلے دے چکے ہیں اور پھر مولانا شاہ حسین میان پھلواڑی کا وہ معرکۃ الآرا مضمون ہے جسمین انھون نے مولانا عبد الباری مرحوم کے جوش جہاد و مذہبیت کا ذکر پورے واعظانہ رنگ مین کیا ہے اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

"جناب مولانا ہمیشہ جہاد کے لئے طیار رہتے تھے۔ ایک بار منت مانی کہ جب دانت ٹوٹین گے تو جہاد کرون گا، چنانچہ تحریک خلافت کے زمانہ مین کسی خاص موقع پر جب آپ جہاد کے لئے طیار ہو گئے تھے تو یہ سوچکر کہ منت پوری کرنا ضروری ہے آپ شفاخانہ اسپتال تشریف لیگئے اور سامنے کے چار دانت تڑوا دئیے"

مین نہین سمجھ سکتا کہ فاضل مضمون نگار نے اِس واقعہ کے اظہار سے مولانا مرحوم کی کس خصوصیت کا اظہار کیا ہے اس سے یہ ظاہر نہین ہوتا کہ مولانا مرحوم مین جوش جہاد زیادہ قوی تھا یا منت پوری کرنے کا خیال۔ جہاد تو خیر انھون نے کیا نہین لیکن دانت تڑوا دینا تو سامنے کا واقعہ ہے اس لئے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ منت پوری کرنے کا خیال ان مین بہت زیادہ قوی تھا اور ایسا ہونا بھی چاہئیے کیونکہ لکھنؤ کی فضا مین پرورش پانے کے بعد اِسی قسم کے نسائی اور رسمی زیادہ نشو و نما پا سکتے ہین۔

اِس کے بعد قیام الدین اور اتحاد کے عنوان سے اشتیاق حسین صاحب رضوی کا مضمون ہے اور پھر مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی کا عنایت نامہ جن کا اجمالی ذکر اس سے قبل آچکا ہے۔ صفحہ ۲۰ سے زکوٰۃ پر جناب مولانا محمد قطب الدین عبد الوالی صاحب کی تحقیق فریدہ شروع ہوتی ہے جس مین انھین خیالات کا اظہار کیا گیا ہے جو ایک واعظ کی طرف سے ہر محراب و منبر پر بیان کئے جاتے ہین، مسئلہ زکوٰۃ کے سلسلہ مین سب سے زیادہ ضروری و اہم چیز اُن اقتصادی مسائل و اصول سرمایہ کی بحث ہے، جن پر آجکل تمدن کی ترقی کا انحصار ہے اور جو صحیح معنی مین نوع انسانی کو جمہوریت و آزادی کی طرف لیجاتے ہین۔ اور اسی کے ساتھ مسائل زکوٰۃ مین وقت و زمانہ کے لحاظ سے تغیر و تبدل کی ضرورت پر اظہار خیال ضروری ہے لیکن ہمین معلوم ہے کہ یہ باتین مولانا کے "نظامی" دسترس سے باہر ہین۔ اور وہ سوائے اسی ایک ارغنون کی آواز کے جو فرنگی محل کے معلم اول نے ساز کیا تھا، کوئی اور نغمہ پیدا کر ہی نہین سکتے۔

اس کے بعد ایک مضمون مسلسل تصوف پر بشیر احمد صاحب علوی کا ہے اور دوسرا "ہندوستان قبل اسلام" کے عنوان سے جناب اڈیٹر کا۔ ان دونون کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ آخر الذکر مضمون کے لئے جو چار صفحات ضائع کئے گئے ہین،

دل الذکر مضمون ہی کو ملنا چاہئے تھے۔

اِس رسالہ کے مقاصد میں چونکہ "دنیا کی چاشنی" بھی شامل ہے، اِس لئے اس کا بھی نمونہ ملاحظہ فرما لیجئے اور تھوڑی دیر کے لئے
ن حقیقت کو بھلا دیجئے کہ یہ اشعار اُس رسالہ میں پائے جاتے ہیں جو قیام الدین، مذہبیت، تحسین، اخلاق، نشر علم و حکمت ایسے سنجیدہ اور
مباحث کے لئے اس مقام سے نکلا ہے جسے "دار العلم و العمل" کہنے میں کوئی تامل نہیں کیا جاتا۔

شاہ حسین میاں کے اس مضمون کے بعد ہی جس میں "مولانا عبدالباری مرحوم کے جوشِ جہاد اور دندان شہید" کا ذکر کیا گیا ہے۔ جناب حیدر کی
یک غزل درج ہوئی ہے جس کا مطلع یہ ہے:-

بے مزہ اِس واسطے آواز سننے ہونے لگی، ریش قاضی بینۂ مینائے مے ہونے لگی،

ورنہ مصرع خواہ کتنے ہی بے ربط ہوں اور یہ شعر اپنی جگہ کتنا ہی مہمل کیوں نہ ہو، لیکن اڈیٹر رسالہ کے حسن انتخاب کی داد دینا ضرور ہے کہ
ہ حسین میاں کے اِس مضمون کے بعد اس سے بہتر "تنقید تعریضی" اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ اِس غزل کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔

کیوں نہ وہ طوفان اٹھائے کیوں نہ دے مجھکو فریب تیرے ہی جانب سے دشمن کو شہ ہونے لگی،

"شہ ہونے لگی" کی داد صرف خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت دے سکتے ہیں جو لکھنو کی زبان دانی کے سب سے بڑے علمبردار ہیں
سرا بے پناہ شعر بھی سُن لیجئے:-

ہو گئے بدکیف دشمن تنگ ظرفی کے سبب اِسقدر پی لی کہ آخر سکوتے ہونے لگی

لطف یہ ہے کہ اِس غزل کے بعد ہی "فیض حضرت بانشۂ" کا اشتہار درج کیا گیا ہے۔

صفحہ ۲۷ پہ جناب شیدا لکھنوی کی ایک غزل درج ہے آپ کے الہامات شعری بھی ملاحظہ ہوں:-

تم جو اٹھلا کے چلو حشر ہی برپا ہو جائے انہیں قدموں کی قسم کیا سے ابھی کیا ہو جائے
دست نازک سے بھلا سر کا قلم ہونا کیسا ہاتھ بدلتے ہیں اگر پنجہ سیدھا ہو جائے
تیر دزدیدہ نظر دل کا تجسس نہ کرے سینہ تک آکے ذرا بائیں یہ ترچھا ہو جائے

الغرض یہ ہیں وہ "ادبیات عالیہ" اور یہ ہیں وہ "مذہبیات و حکمیات فائقہ" جن کے ذریعہ سے "قیام الدین" دنیا میں
ہنی و علمی، اخلاقی و مذہبی زندگی پیدا کرنے کے لئے زور لگا رہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ عدیم النظیر تحقیقات حکمیہ اور ادبی
اہکاروں کو دیکھکر کوئی کافر ہی ہوگا جو اِس دعوے کی صحت پر ایمان نہ لے آئے۔

اہ آئندہ کے ملاحظات میں، ہمارا خطاب صرف مولانا عبدالماجد دریابادی سے ہوگا۔ اور ہم بتائیں گے کہ آیا "جوگی قوت کا حقیقی
رچشمہ کہاں ہے اور یہ کہ صحیح معنی میں اِس کے عساکر کا اجتماع کہاں پایا جاتا ہے۔ جہاں "قیام دین" کی ضرورت بتائی جاتی
ہے، وہاں، یا اس جگہ جہاں سے "قیام دین" کی آواز بلند کی جاتی ہے۔

آگاہ نہ تپ درد دل را، نشتر چہ زنی رگِ جنون را

اگست سنہ ۱۹۳۰ء میں نے گذشتہ ماہ کے ملاحظات میں بہ سلسلۂ تنقید رسالہ "قیام الدین" وعدہ کیا تھا کہ اس مہینہ کے رسالہ میں جناب عبدالماجد صاحب دریابادی سے خطاب کرکے بتاؤں گا کہ "یاجوجی قوت" جو آج کل جا بجا انھیں ہر جگہ نظر آ رہی ہے۔ اور جس کا ذکر بار بار انکی زبان پر آجاتا ہے وہ فی الاصل کہاں پائی جاتی ہے اور اسکی حقیقت کیا ہے

حال ہی میں جب الناظر پریس سے ضمانت طلب ہوئی اور اخبار سچ کو بند کرتے ہوئے اس کے فاضل مرتب و محرر نے اس کا اعلان کیا تو اس کے عنوان میں بھی یاجوجی قوت کا ذکر تھا، اس لئے یہ انکشاف میرے لئے بالکل جدید تھا کہ جناب عبدالماجد صاحب دریابادی کی مراد یاجوجی قوت سے صرف وہی قوت نہیں ہے جو انکے مزعومات مذہب و ایمان کے خلاف تنقید کرے بلکہ اس میں حکومت وقت بھی شامل ہے جو آزادی ملک و وطن کے جذبات کو پامال کرنا چاہتی ہے۔ ممکن ہے کہ کل کوئی اور واقعہ جناب دریابادی کے خلاف مزاج ظاہر ہو اور وہ اس کو بھی "ایں ہم بچہ شیر ست" کہکر یاجوجی قوت سے نامزد کریں۔ اس لئے بغیر اس کے کہ میں اس لفظ کی اُس تمام وسعت و عمق سے بحث کروں جو حضرت جناب دریابادی کے ذہن و دماغ میں پائی جاتی ہے، صرف اس پہلو سے بحث کرنا چاہتا ہوں جس کا تعلق ان کے پندار میں دہریت ولا مذہبیت سے ہے

اصولاً سب سے پہلے یہ متعین کرلینا چاہئے کہ "دہریت ولا مذہبیت" کس کیفیت کا نام ہے، ہر چند یہ تعین ہمارا فرض نہیں ہے بلکہ اُن کا فرض ہے جو یہ الزام قائم کررہے ہیں، تاہم بحث کو بغیر کسی استفسار و مزید انتظار کے شروع کردینے کے لئے ضرورت ہے کہ ہمیں اس کا مفہوم بھی متعین کردیں —— اگر جناب عبدالماجد صاحب کی مراد اس سے تمام وہ آبادی دنیا کی ہے جو مسلمان کے لقب سے یاد نہیں کیجاسکتی (کیونکہ وہ ایک مخصوص طریق عبادت کی پابند نہیں ہے۔ شریعت اسلام پر عامل نہیں ہے) یعنی اگر "دہریت ولا مذہبیت" سے اُن کا مقصود صرف "لااسلامیت و غیر مسلمیت" ہے تو مجھے افسوس کے ساتھ ظاہر کرنا پڑتا ہے، کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ بہت پرانی چیز ہے اور نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی کہ وہ "عہد رسالت" میں اب سے کہیں زیادہ پائی جاتی تھی کیونکہ مسلمانوں کی تعداد اُسوقت بہت کم تھی۔ اور اب اس سے بدرجہا زائد ہے۔ لیکن اگر اس سے مراد اُن کی دنیا کا وہ موجودہ میلان ہے جس نے نہ صرف مذہب اسلام بلکہ تمام مذاہب کی طرف سے انسان کو بے پروا و مستغنی بنادیا ہے، یہ تو یہ درد ایسا معمولی نہیں ہے کہ اس کا علاج اس کو صرف "یاجوجی قوت" کہکر پکار دینے، یا ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر کوسنے دینے سے ہوسکے۔ سب سے پہلے یہ غور کرنا چاہئے کہ ارتقاء مذاہب کا فلسفہ کیا ہے۔ ترقی تہذیب و تمدن کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے، عہد حاضر کی ذہنیت کا ساتھ دینے کے لئے مذہب کس حد تک تیار ہوسکتا ہے۔ اور یہ کہ مذہب کی ضرورت اب بھی باقی ہے تو کیوں؟

میں عبدالماجد صاحب دریابادی کو نہایت ہی راسخ العقیدہ مسلمان سمجھتا ہوں، لیکن اسی قدر جہاں تک "اشداء علی الکفار" کا تعلق ہے۔ ممکن ہے "رحماء بینھم" کا بھی کوئی قابل ذکر واقعہ ان کی مذہبی، سیاسی اور انسانی زندگی میں پایا جاتا ہو، لیکن کم از کم مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ اُن کی حیات کا سب سے زیادہ عظیم الشان تبلیغی یا مذہبی کارنامہ اخبار سچ

کا اجرا تھا۔ لیکن اس نے اپنی ساری عمر اسی تنقید و تنقیص میں بسر کر دی کہ مغرب میں اسقدر شراب پی جاتی ہے۔ اس حد تک قمار بازی ہوتی ہے۔ اتنے جرائم ہوتے ہیں، یہ اعداد و شمار مظالم کے ہیں، اور اتنی بے حیائیاں موجودہ تہذیب و تمدن میں پائی جاتی ہیں۔ کبھی اس امر پر غور نہیں کیا گیا کہ دوسروں کے نقائص کے اظہار سے اپنی اصلاح کیونکر ہو سکتی ہے اور اگر اس سے مراد یہ تھی کہ مسلمانوں کو ان ذمیم حرکات کے برے نتائج دکھا کر احتراز کی تعلیم دی جائے۔ تو اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ جس قوم کی برائیاں کیجاتی ہیں، ان کے محاسن بھی پیش کئے جائیں۔ اور ان کے اختیار کرنے کی تعلیم دیجائے۔ بہرحال عبدالماجد صاحب نے اخبار سچ کے ذریعہ سے دوسروں کی بینائی کا نقص تو ضرور ظاہر کیا۔ لیکن اپنی آنکھ کے شہتیر کی طرف کبھی نگاہ نہیں کی۔ اور اسی لئے اس میں بجائے مصلحانہ رنگ ہونے کے ہمیشہ جارحانہ کیفیت پائی گئی۔ اور عام طور پر یہی ہوتا بھی ہے کہ انتہائی مجبوری و بیکسی میں زبان پر گالیاں ہی آتی ہیں، اور انھیں سے کمزور فطرت انسانی اپنی تسکین کر لیا کرتی ہے۔

میں جناب عبدالماجد صاحب کے جوش مذہبی اور خلوص نیت کا معترف ہوں، لیکن یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ جو طریق کار انھوں نے اختیار کیا وہ زمانہ کے حالات کے لحاظ سے نادرست تھا اور جن خیالات کے ماتحت انھوں نے تبلیغ کی وہ بڑی حد تک تنگ و پست تھے۔ ان کو سب سے پہلے غور کرنا چاہئے تھا کہ اسلام کا حقیقی مشن کیا تھا اور عہد حاضر کے مبلغین کس طرح اسے پیش کر رہے ہیں اور اب، جبکہ علوم و فنون کی ترقی نے تمام دنیا کی ذہنیت میں انقلاب پیدا کر کے مذہب کی ضرورت کو بالائے طاق رکھدیا ہے۔ کیونکر انھیں اس طرف مائل کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے یورپ کی بادہ خواریوں کے افسانے تو بیان کئے۔ لیکن یہ نہ بتایا کہ مسلمانوں کے بے پئے ہوئے بہک جانے کا سبب کیا ہے۔ انھوں نے مغرب کی تمام اخلاق شکن روایات کے ظاہر کرنے میں تو سارا زور قلم صرف کر دیا، لیکن خود اپنے اخلاق کے اسباب خرابی متعین کرنے کی جرأت کبھی انھوں نے نہیں کی۔ انھوں نے تمام یورپ کو تو عصبیت میں اندھا سمجھ کر سب و شتم کا بازار گرم کر دیا، لیکن اپنے ہاں کے اہل ملت کے خلوت کدوں کا ذکر کبھی نہیں کیا، جن کی طہارت و عصمت کی داستانیں اور جن کی قدوسیت و للہیت کے افسانے یورپ کے کسی بڑے سے بڑے "عشرت کدہ" کو منفعل کر سکتے ہیں۔ جناب عبدالماجد صاحب کی طرح میں بھی اسی امر کا خواہشمند ہوں کہ یہ قوم ترقی کرے اسکے اخلاق درست ہوں، اور موعودہ خلافت ارض اس کے ہاتھ آئے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ ہمارے مولانا زیادہ تر اپنا وقت اس سعی میں صرف کرتے ہیں کہ دوسروں کے معائب کو ظاہر کر کے اپنے نقائص کو ہلکا ثابت کیا جائے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ تنقید گھر ہی سے شروع ہو اور سب سے پہلے "غریب خانہ" ہی کو دیکھا جائے کہ اس کے "مشرق" میں کتنا "مغرب" چھپا ہوا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ جرأت اخلاق جو غیروں کے اصلاح میں صرف کیجاتی ہے۔ اس سے خود اپنی ہی جماعت کی تہذیب کا کام کیوں نہیں لیا جاتا اور وہ قوت احتساب جو تمام اقطاع مغرب کے حالات کو محیط ہے اس کو خود اپنے اور اپنی جماعت کے اوپر کیوں استعمال نہیں کیا جاتا۔

جو کام میں غیر کے ہوئیں صرف
افسوس وہ دل ربا ادائیں،

جناب دریابادی خلافت کمیٹی میں بھی ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، جمیعۃ العلماء کی مجلس میں بھی ان کو کافی درخور حاصل ہے، کانگریسی خیال کے لوگوں میں بھی وہ نامقبول نہیں ہیں، اس انجمن کے بھی وہ رکن ہیں جس نے لامذہبیت و دہریت کا مقابلہ کرنے کے لئے فرنگی محل کے منبر و محراب پر اسی سال انگڑائی لی ہے، اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو آزاد خیال، آزاد مقال، نقاد مذہب و دین بھی سمجھتے ہیں۔ اس لئے کیا اُن کی ان تمام حیثیات بلند کو سامنے رکھتے ہوئے، ہمیں حیرت نہ کرنا چاہئے۔ کہ کبھی اُنھوں نے اخبار سچ کے ذریعہ سے نہ جمیعۃ العلماء کے ارکان کو اُن کی فرض شناسی کی طرف توجہ دلائی نہ کانگرس کے مطمح نظر کو سامنے رکھکر اُنھوں نے عملی قدم اُٹھایا اور نہ کبھی اس امر کی جستجو کی کہ دنیا میں لامذہبیت کیوں پھیلتی جارہی ہے، اور ان تمام خرابیوں کا علاج کیا سوائے یورپ کو بُرا کہنے کے۔ کوئی اور نہیں ہوسکتا ہے۔

کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کرلو تیر کو

قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ سے وہ نابلد نہ ہوں گے، وہ اچھی طرح واقف ہوں گے کہ ایک مصلح یا پیغمبر کی مسجع و مقفیٰ گفتگو کو کبھی اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ نہیں سمجھا گیا، وہ جانتے ہوں گے کہ سکندر کی فتوحات پاؤں توڑ کر مقدس خیمہ میں بیٹھے رہنے سے حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ اور وہ اس سے بھی بخوبی آگاہ ہوں گے کہ اکاسرۂ عجم کی قوت صرف وعظ و تلقین سے پارہ پارہ نہیں ہوئی۔ اور بہ حیثیت ایک صوفی انسان ہونے کے اُن سے زیادہ کون اس حقیقت کا رمز شناس ہوسکتا ہے کہ

رہرو کہ بہ بشارت ز قبولش ندہند

جز بداں خار کہ از بادیہ در پا ماند

اس لئے وہ کون چیز ہے جو میدان عمل میں قدم اُٹھانے سے اُنھیں باز رکھتی ہے اور اس کانٹے کے چبھنے سے کیوں اُن کے پاؤں میں کپکپی پیدا ہوتی ہے جس کی خلش حاصل کئے بغیر منزل تک پہونچنا محال ہے۔ وہ کیوں اپنی قوت تنقید سے اُس جماعت کو ختم کردینے کا کام نہیں لیتے، جس کے طویل جُبہ و عمامہ میں قوم کی تباہیوں کے جراثیم اور اخلاق کی بربادیوں کے اسباب ہزار اندر ہزار پنہاں ہیں۔ اور وہ سب سے پہلے ان علمائے کرام اور مولویان عظام کو صفحۂ زمین سے محو کردینے کی کوشش کیوں نہیں کرتے جنھوں نے اپنے اعمال ردیہ اور افعال سخیفہ سے عالم اخلاق کو سوگوار اور دنیائے منفعت و عمل کو حزین و غمگین بنا رکھا ہے۔ وہ اب اس حد سے گزر گئے ہیں کہ اُن کی اصلاح ہوسکے، اُن کی ذہنیت کی پستی اب کبھی اُس بلندی کی طرف نہیں آسکتی جو کسی وقت اسلام کی خصوصیت خاصہ سمجھی جاتی تھی۔ وہ ہماری جماعت کا ایک ایسا عضو ماؤف ہیں جس کا قطع کردینا ہی تنہا علاج ہے، اس لئے اب اگر کوئی سعی کامیاب ہوسکتی ہے تو صرف اسی صورت سے کہ پہلے اس جماعت کو منہدم کیا جائے راہ کو اس خارزار سے صاف کیا جائے اور بالکل جدید اُصول سے، از سر نو اس درس کی یاد تازہ کی جائے جو ہر زمانہ، ہر قوم اور ہر ملک کیلئے یکساں مشعل راہ ہوسکتا ہے اور وقت کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے لب و لہجہ اور طریق استدلال میں تبدیلی پیدا کیجائے اور اسطرح اُس لچک کو قائم رکھا جائے جو ایک فطری مذہب میں ہونا چاہئے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ماجد بھی میری ہی طرح

ہرچہ بینند بہ عنوان تماشا بینند

ورنہ اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ میں "بہ من شراب و بہ زہاد فردہ تسنیم" کی مفاہمت پر قانع نظر آتا ہوں اور وہ غریب اس لطف سے بھی محروم ہیں۔

میں نے ابتدائے ملاحظات میں اس یاجوجی قوت سے بحث کرنے کا وعدہ کیا تھا جس کے خلاف فاضل دریابادی اپنی زندگی وقف کرنا چاہتے ہیں، لیکن سلسلۂ کلام میں، بات کہیں سے کہیں پہونچ گئی اور اصل مقصود پر گفتگو نہ ہو سکی، علاوہ اس کے یوں بھی ملاحظات کے معدود صفحات اس کو انجام تک پہونچانے میں کامیاب نہ ہوتے اس لئے میں اس مہینے اس کو ملتوی رکھتے ہوئے آئندہ کے لئے اُن عنوانات کی تعیین کئے دیتا ہوں، جن پر بسلسلۂ ملاحظات یا کسی مستقل عنوان کی صورت میں مجھے بحث کرنا ہے۔ سب سے پہلے میں مذاہب کے فلسفۂ ارتقاء پر گفتگو کروں گا۔ اس کے بعد مذہبیات [illegible] پر غور کروں گا اور پھر یہ کہ مذاہب کا مستقبل کیا ہے یا یہ کہ مستقبل میں مذہب کے بقاء کی کوئی صورت ہے یا نہیں، میں چاہتا ہوں کہ اس طرح ایک بار اور ہمیشہ کے لئے اپنے خیالات ظاہر کر دوں تاکہ ناظرین نگار کو میرے حقیقی مقصود کے سمجھنے میں آسانی ہو اور اُنھیں معلوم ہو سکے کہ یاجوجی قوت کا سرچشمہ حقیقتاً کہاں پایا جاتا ہے۔

ستمبر ۱۹۳۰ء جس طرح جلدی بیماریاں دو قسم کی ہوا کرتی ہیں، لازم و متعدی اسی طرح دماغی بیماریوں کی بھی دو قسمیں ہیں لازم کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو غور و فکر کا اہل نہ سمجھے اور متعدی یہ کہ دوسروں کو بھی نہ سوچنے دے۔

یہ دماغی بیماری مذہب کے غلو اور مذہبی جماعت کی عدم صلاحیت نے پیدا کی اور جس وقت تک ناحق کوش زعمائے مذہب کا وجود باقی ہے، دنیا کبھی امن و سکون سے آشنا نہیں ہو سکتی۔

اسلام نے ایمان و اعتقاد کو دو چیزوں پر منحصر کیا ہے:۔ تصدیق بالجنان و اقرار باللسان یعنی ضمیر کا اطمینان اور اس کا زبان سے اقرار، ظاہر ہے کہ جب تک نفس مطمئن نہ ہوگا، ایمان و اعتقاد میں استحکام و رسوخ پیدا ہونا ممکن نہیں اور جب یقین اچھی طرح دلنشین ہو جائے گا، تو زبان سے اس کا اقرار اور گفتگو کے ذریعہ سے اس کا اظہار بھی ایک اثر پیدا کرے گا۔ اسی اطمینان نفس و ضمیر کا ذکر قرآن میں اکثر جگہ آیا ہے یہاں تک کہ جب ایک پیغمبر نے خدا کے مشاہدۂ عینی کی خواہش کی تو اس کا سبب بھی یہی اطمینان قلب بتایا گیا۔ ہر چند اب دنیا اس منزل میں نہیں ہے، کہ وجود باری پر یقین لانے کے لئے وہ رویت ظاہری کو ضروری قرار دے۔ تاہم ریب و شک، وہم و ظن، اشتباہ و التباس کی کارگاہ ہنوز قائم ہے اور غالباً زیادہ وسعت و فراوانی کے ساتھ، زیادہ الجھن اور پیچیدگی لئے ہوئے۔ پھر یہ کس قدر عجیب و غریب ذہنیت انسانی ہے کہ ایک طرف تو اس روایت کی بھی تصدیق کی جاتی ہے کہ ایک شخص کے اطمینان قلب کے لئے خدا نے اپنے آپ کو بے حجاب و بے نقاب کر دیا، اور دوسری طرف اس کی بھی اجازت نہیں دی جاتی کہ ہم ان جانشینان رسول سے صرف یہ سوال کر سکیں کہ وہ کس استحقاق کی بنا پر اپنے آپ کو حامل دین قرار

سمجھتے ہیں اور وہ دین متین کیا ہے جو فطرتِ انسانی کو مطمئن کر سکتا ہے۔

دنیا کا تنہا فطری مذہب ہم کو ہر ہر موقعہ پر غور و فکر، تامل و تدبر کی تعلیم دیتا ہے، وہ ہم کو بتاتا ہے کہ مذہب کی اصل روح، نظام عالم پر غور کرنا، کائنات اور اس کے مظاہر و آثار کو دیدۂ نقد و اعتبار سے دیکھنا ہے لیکن یہ مذہب کا علمبردار آج دنیا کو یہ درس دے رہا ہے کہ تعلیم کی تکمیل ہو چکی، دین درجۂ کمال کو پہونچ گیا۔ اور وہ تعلیم وہی ہے جو وہ بتاتا ہے وہ دین وہی ہے جسے وہ اپنے اسوۂ حسنہ میں ظاہر کرتا ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ اخلاقیات کا انتہائی درس جو دیا جا سکتا تھا، دیا جا چکا ہے، اور اب دنیا کو کسی مذہب کی ضرورت نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس حقیقت کو اپنے کسی عمل، کسی قول، کسی حجت و دلیل سے ثابت کر سکتا ہے؟ کیا وہ اپنے اس دعوے سے دنیا کو مطمئن کر سکتا ہے؟

دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ عقل انسانی بھی ترقی کر رہی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس ترقی کی حد کیا ہوگی؟ لیکن یہ مذہب کی حمایت کے لئے تڑپنے والا ابتک یہی درس دے رہا ہے کہ مذہب نام ہے بے عقلی و ہرزہ کاری کا، دین نام ہے صرف احمقانہ تقلید و اتباع کا اور زبان سے ہر اس امر کے اقرار کر لینے کا جس پر دل کسی طرح مطمئن نہ ہو اس تبلیغ کا نام اس نے "اعلاءِ کلمۃ الحق" اور "امر بالمعروف" رکھ چھوڑا ہے۔ درآنحالیکہ اس سے زیادہ توہین و تذلیل اسلام اور اس سے زیادہ اشاعت کفر و الحاد کسی اور طرح ممکن ہی نہیں۔

وہ زمانہ گیا جب علیین و سجین، کرہ ہفت طبقات کی تعیین، کوثر و سلسبیل کی روانی اور آتش دوزخ کی شعلہ فشانی کے ذکر سے وہ اپنی ہمہ دانی کی ہیبت جاہلوں پر طاری کر دیا کرتا تھا۔ اب زمانہ ہے علوم و فنون کی ترقی کا، انکشاف حقائق کا، استقرار و مشاہدہ کا، اور اس لئے ٹھیک اسوقت جبکہ وہ منبر پر بیٹھکر معجزہ و کرامات کا ذکر کرتا ہوتا ہے، صاحبان عقل و دانش اس پر ہنستے ہوتے ہیں، اور جس اصول کو پیش کر کے وہ اسلام کی طرف بلاتا ہے اسے دیکھکر لوگ اور اس سے ہٹتے جاتے ہیں۔ حالانکہ موجودہ زمانہ سے بہتر زمانہ تعلیم حق و صداقت کے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتا، اگر واقعی سچ کو سچ کی طرح پیش کیا جائے۔ کیونکہ دنیا سے مذہب اٹھ چکا ہے اور رسم و رواج کی حکومت اب اعتقادات کی دنیا میں قائم نہیں رہی۔ پھر اگر کوئی اس دور دہریت میں واقعی صحیح اصول اخلاق کے پیش کرے جو عین مدعا کسی مذہب کا ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دنیا اسے قبول نہ کرے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ہنگامۂ مادیات میں جبکہ انسان صرف ایک مکانکی چیز ہو کر رہ گیا ہے، روح کا اضطرار سکون کا طلبگار ہے جسے اخلاقی یا تمدنی اصطلاح میں دنیا کا امن کہا جاتا ہے۔ غالباً مبلغین مذہب کو اس کا علم نہ ہوگا کہ وہی چیز جسے دنیا کا امن و سکون کہا جاتا ہے، اسکے لئے مذہب میں ایک نہایت ہی جامع و پُر معنی لفظ "صراطِ مستقیم" کا استعمال کیا گیا ہے، جس کو زبان سے تو ہزار بار ادا کیا جاتا ہے، لیکن اس کے مفہوم پر ایک مرتبہ بھی غور نہیں کیا جاتا۔

جس طرح دو نقطوں کے درمیان خط مستقیم صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، اسی طرح دنیا میں اُس منزل تک

پہونچنے کے لئے بھی جو ارتقاء انسانیت کا نصب العین ہے، ایک ہی راستہ ہو سکتا ہے، اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ راستہ وہی ہے جسے اسلام نے بتایا، اور جو تمام نوع انسانی کو بلا تفریق نسل و قومیت بلا امتیاز ملک و ملت، یکساں طور پر دعوت دیتا ہے۔ لیکن کیا اسلام کی یہ صلح کل تعلیم، یہ ہمہ گیر درس اخلاق و عمل آج بھی باقی ہے؟ اس کا جواب اُن کلید برداران فردوس سے چاہیے، اُن اجارہ داران خلد سے طلب کرو، اور ان تاجرین اسلام و رہنمائے ملت حنیفی سے دریافت کرو، جن کے یہاں اخلاق اسلامی نام ہے صرف ایک خاص وضع قطع ... کا ایک مخصوص رسم و رواج کا، اور جو آفرینش انسان کی حقیقی غایت حور و قصور اور کوثر و سلسبیل کے حصول کے سوا کسی اور چیز کو نہیں سمجھتا، پھر وہ لوگ جو نماز کے وجود کے ساتھ مخصوص انداز کی عبادت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں، کیا اُن سے میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ سب کس مقصد کے حصول کے لئے ہے۔ اگر اس سے مدعا وہی ہے جو ابھی عرض کیا گیا تو خیر، ورنہ ازراہ کرم مجھے بتائیں کہ کلام پاک میں

لکل امۃ جعلنا منسکا ھم ناسکوہ فلا ینازعنک فی الامر" کا کیا مفہوم ہے۔ اور لکل امۃ جعلنا منسکا لیذکروا اسم اللہ" سے کیا مراد ہے۔ کیا عبادت و منسک ایک ہی چیز ہیں، کیا نماز اور منسک ایک ہی مفہوم کے دو لفظ ہیں؟

اکتوبر ۱۹۳۲ء حکومت ترکی کی آزادروی کے متعلق ہندوستان کے مسلم اخباروں میں جس وقت کوئی خبر نظر آتی ہے، تو میں اتنا متعجب نہیں ہوتا جس قدر ان اخباروں کی توجیہہ و تاویل کو دیکھکر ہنسی آتی ہے۔ اگر کبھی وہاں خبر آجاتی ہے کہ حکومت ترکی نے قدیم شکستہ مسجدوں کو مسمار کر کے چمن بنا دیئے ہیں، اذان کا طریقہ اُنھوں نے اللہ اکبر بالصوت کی صورت میں رائج کیا ہے، عورتیں برہنہ نقاب احتفالات رقص میں شریک ہوتی ہیں۔ عربی رسم الخط کو مٹا کر انگریزی حروف کو اختیار کیا جا رہا ہے۔ مغربی ٹوپی لباس کا جزو قرار دیگئی ہے، مذہبی فقہی تعلیم کے ساتھ بے دردی اُٹھتی جا رہی ہے، علماء مذہب کو کوئی مخصوص شرف و امتیاز نہیں دیا جاتا، نماز کا مفہوم وہاں صرف عبادت اور عبادت نہیں بلکہ قومی اجتماع کے اصول پر قرار دے کر اسوقت بینڈ بجانے کا دستور ہوتا جا رہا ہے، الغرض ترکی کے متعلق جب کوئی خبر ایسی آجاتی ہے جو ہندی مسلمانوں کے مذہبی نقطۂ نظر سے قابل نفرت و استکراہ ہے، تو بعض اڈیٹروں کا یہ شیوہ ہوتا ہے کہ وہ ان خبروں کو دشمنوں کا پروپیگنڈا قرار دیکر ان کی صحت سے انکار کر دیتے ہیں، کیونکہ ان کو یہ گوارا نہیں ہوتا کہ ایک قوم جو اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہے اس قدر نامسلمانی کا اظہار کرے اور بعض انکو صحیح جان کر ترکی کی گمراہی اور ضلالت و الحاد پر اظہار افسوس کر کے خاموش ہو جاتے ہیں

پھر سوال یہ نہیں ہے کہ ترکی میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے یا نہیں۔ بلکہ گفتگو اس میں ہونی چاہئے کہ جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے وہ اگر آج غلط ہے تو کل تک صحیح ہونیوالا ہے یا نہیں۔ اگر اندیشہ ہونے کا ہے تو پھر یہ غور کرنا چاہئے کہ اسکے اسباب کیا ہیں؟

ہمارے یہاں کے علماء کرام کی بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ اگر آج ساری دنیا کے مسلمان ان عقائد سے ہٹ جائیں جن پر مذہب اسلام کی بنیاد کا قائم ہونا ظاہر کیا جاتا ہے، تو وہ حد درجہ استغناء کے ساتھ کہدینگے کہ اسلام اور خدائے اسلام کسی کا محتاج نہیں اگر روئے زمین پر کوئی مسلمان (سوائے اُن کے) باقی نہ رہے تو کیا پرواہ ہے حالانکہ ان کو غور کرنا چاہئے کہ

کہ اگر وہ تمام عالم کے مسلمانوں کو جہنم کے سپرد کرکے خود تنہا جنت چلے گئے تو انھیں کیا خاک لطف آئے گا۔ اور حور و قصور، فردوس و سلسبیل کی ضرورت وجود پر کس چیز کو بطور حجت پیش کیا جائیگا۔ برخلاف اس کے اگر وہ اپنی محدود و مختصر جماعت کو علیحدہ کرکے باقی سب کو فردوس کا مستحق قرار دیں تو [illegible] اس میں ایک بات [illegible] کہ خدا کی خدائی بھی ظاہر ہوتی ہے ورنہ یوں تو کائنات کا مفہوم صرف ایک خدا اور چند مولویوں سے زیادہ کچھ نہیں قرار پاتا۔

الغرض یہ لوگ خدا کی بے نیازی ظاہر کرنے میں یہ تو آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ اسلام نہ رہے اور ساری دنیا کافر ہوجائے، لیکن کبھی وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس پر غور نہیں کرتے کہ کیا خدا اسلام کا پابند ہے، اور جس صورت وہ سارے عالم سے بے نیاز ہے۔ کیا اسی طرح وہ اسلام سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ساری دنیا کا مبتلائے کفر ہوجانا اسکو نقصان نہیں پہونچا سکتا، تو سارے عالم کا مسلمان ہوجانا بھی اسکی عظمت و برتری میں کسی اضافہ کا باعث نہیں ہوسکتا۔

پھر جب مذہب و ملت کے مسائل میں، خدا اور اسکی مرضی کا سوال اٹھ گیا، تو کفر و اسلام کا فرق کوئی خدائی امتیاز نہ ٹھہرا، بلکہ صرف عقائد کا اختلاف اور اصول اخلاق کا اختلاف ہوا اور عقائد و اصول بھی وہ جنھیں خود انسان نے بنایا ہے پھر ایک انسان یہ دعویٰ تو کرسکتا ہے کہ اسکے بنائے ہوئے قواعد حیات و معاشرت ایک مخصوص ملک و عہد کیلئے موزوں ہوسکتے ہیں، لیکن وہ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جو اصول زندگی اب سے دو ہزار برس قبل پائے جاتے تھے وہی اب بھی پائے جاتے ہیں یا جو اب موجود ہیں وہ آیندہ دو ہزار سال کے بعد بھی اسی طرح قائم رہیں گے جبکہ اصول اخلاق و معاشرت انسان کی ذہنیت کے تابع ہیں اور انسانی ذہنیت کا وقت اور ماحول کے لحاظ سے تغیر پذیر ہونا ایک پیش پا افتادہ حقیقت ہے۔

بلکہ اگر آج ترکی، مولویوں کے بنائے ہوئے اصول و قواعد پر مصر ہوتا تو دنیا میں وہ کوئی قوت نہ تھی جو اس کی موجودہ ذہنیت کو بدل سکتی ہے، جبکہ اس کا تجربہ و مشاہدہ ہے کہ اس کی ترقی کا راز ہی ان اصولوں سے انحراف میں پوشیدہ ہے۔ ترکی کی ترقی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب اس نے خلافت کی زنجیر سے اپنے آپ کو آزاد کیا اور جو درحقیقت خلافت بھی مولویوں ہی کا مسلط کیا ہوا عذاب تھا۔ اس لئے قدرتاً اس کو اس باعث سے متنفر ہونا چاہئے تھا۔ اور اس تنفر کے بعد قدرتاً ان تمام اصول سے بیزار ہوجانا چاہئے جو انکے وضع کئے ہوئے ہیں۔ اس لئے اگر حالات یہی ہیں تو بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب مذہب کا بعید ترین واسطہ بھی مفقود ہوجائے گا۔ اور اگر انھوں نے زیادہ تنگ نظری سے کام لیا تو ان کے مذہب کا نام ترکیت بلکہ صرف انسانیت قرار پائے گا جو نہ وضع و لباس کو دیکھتی ہے، نہ کسی مخصوص عبادت و نمایش کو بلکہ صرف اخلاق کو، اصول تہذیب و تمدن کو، اور اس جذبہ کو جو تمام انسان کو ایک ہی رشتہ سے منسلک رکھتا ہے۔ پھر اگر یہ اصول حقیقتاً غلط ہیں، اگر یہ ذہنیت گمراہی ہے، تو اس غلطی و ضلالت کے ثبوت کا بار کس پر ہے؟ اُن پر جو اُن کو صحیح سمجھکر اختیار کئے ہوئے ہیں، یا اُن پر جو اُن کی غلطی کے مدعی ہیں۔

ہمارے یہاں کے علمبرداران مذہب اس امر کے لئے تو بیقرار ہیں کہ انکا اقتدار بدستور قائم رہے، منصب ہدایت ان سے نہ چھینا جائے، لیکن وہ اس کی فکر نہیں کرتے کہ لوگوں کے خدشات قلب دور کریں، اپنی تعلیمات میں تمدن حاضرہ کے اقتضاء کے مطابق تغیر و تبدیل کریں، اور خود اپنے اندر وہ ذہنیت پیدا کریں جو اس دور علم و حکمت کی ترقیوں کا ساتھ دے سکے۔
اب زمانہ وہ ہے کہ الہام و وحی کے مفہوم کو صرف تبلیغی کاروفریب سمجھا جاتا ہے، کتب مقدسہ و ملہمہ کے بیانات کو برملاء تحقیقات تاریخی غلط ٹھہرایا جا رہا ہے، تعلیمات مذہبی کو ناقص و ناکمل ثابت کرکے اُسے تقویم پارینہ بتایا جا رہا ہے اسلئے میرے نزدیک اب سوال مقابلہ کا نہیں ہے، بلکہ سپر ڈالدینے کا ہے یا پھر مذہب کو اسقدر بلند لیجانے کا کہ ان تمام اعتراضات کی دسترس سے دور ہو جائے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ ایران کی موجودہ ذہنیت کو پیدا ہوئے چند سال سے زیادہ زمانہ نہیں گذرا لیکن وہاں کا بھی یہ عالم ہے کہ جو خواتین گھروں کے اندر سے باہر دہلیز میں بھی قدم رکھنا پسند نہ کرتی تھیں، آج بے نقاب ہیں، آزاد ہیں، اور نہ صرف یہ بلکہ اپنے بالوں کو بھی مغربی تقلید میں نیر باد کہہ چکی ہیں۔ مصر پر اس سے قبل ہی یہ زمانہ آچکا ہے اور افغانستان بھی خدا جانے کہاں پہونچ گیا ہوتا اگر وہاں کی ترقی کو قصداً قوت و عسکریت سے نہ دبا دیا جاتا۔

موجودہ عہد صرف علم و عمل کا عہد ہے، لیکن وہ علم و عمل نہیں جو صرف خانقاہوں اور معبدوں کو آباد کرنیوالا ہے بلکہ وہ، جو انسان کی خوشحالی، نشاط انگیزی اور آسودگی قلب و دماغ کا ضامن اور وہ جسے ہم جنات عدن بھی کہہ سکتے ہیں اور فردوس بریں بھی۔ پھر دنیا کا کوئی ملک نہیں جو اس کے حصول کے لئے بیتاب نہ ہو، اور مغرب سے بلند ہونے والے اس سیلاب میں کود پڑنے کے لئے مضطرب نہ ہو۔ لیکن فرق یہ ہے کہ جو ملک آزاد ہیں وہ اس طوفان میں اپنے آپ کو ڈال چکے ہیں اور جو آزاد نہیں ہیں وہ اپنی ذہنی غلامی کی بدولت اس کی جسارت نہیں کر سکتے اور حسرت سے جانب نظر دیکھ رہے ہیں۔

اس لئے اگر اسوقت تک ہندوستان کے مولوی میں کچھ جان باقی ہے تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ واقعی وہ رہنے کے قابل ہے، بلکہ محض اس بنا پر کہ اُسکی موت کے اسباب ابھی پیدا نہیں ہوئے اور اگر ٹرکی، مصر اور ایران وغیرہ میں، اس مخلوق کو فنا کر دیا گیا ہے تو صرف اسوجہ سے کہ انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ مولوی کی موت قوم کی حیات ہے۔ اور چونکہ وہ آزاد ہیں، حکومت اُن کی ہے ملک اُن کا ہے اس لئے اُنھیں اختیار حاصل ہے کہ اپنے جس عضو ماؤف و مفلوج کو چاہیں قطع کرکے پھینکدیں۔ یہاں جب ہماری جسمانی صحت کے لئے حکومت آج تک تالاب کے مچھروں اور ملیریا کے جراثیم کو فنا نہیں کر سکی، تو مولویوں کی تباہکاریوں کا اسکو کیا خیال ہو سکتا ہے، جبکہ وہ خود بھی کبھی اخلاق میں عفونت پھیلانے کا کام اُن سے لے لیا کرتی ہے۔

جنوری سنہ ۱۹۳۱ء خیال تھا کوشش تھی یقین تھا کہ نگار کا دسواں سال (جو سنہ ۱۹۳۱ء سے شروع ہوتا ہے) کسی خاص آہنگ کی ابتدا ہوگا، غیر معمولی نشاط کے ساتھ طلوع ہوگا، "گل افشانیاں" اس کے ساتھ ہونگی اور "طرح نو" کے باب دسترس سے قریب۔ لیکن ٹھیک اس وقت جبکہ ۳۱ دسمبر کی نصف شب خط فاصل یا خط تماس بنی ہوئی معلوم نہیں ایک سال کو دوسرے سے جدا کر رہی ہے یا ملا رہی ہے میں شمع کے سامنے تنہا بیٹھا ہوا سوچ رہا ہوں کہ اگر گذشتہ اک سال کی "عمر رائگاں" کا احتساب شغل عبث ہے تو سال حال کی امید دل کو کیوں استوار کروں، سوچنا اور سوچتے رہنا، روز تعمیر تمنا کرنا اور روز اس کو آنکھوں کے سامنے گرتے ہوئے دیکھنا، یہی ہے حاصل زندگی یہی ہے مقصود آفرینش

جب قدرت اپنے اثبات وجود کے لیئے گل و بہار و سبزہ و مرغزار کی پابند نہیں، تو افسردگی خزاں اور بے برگ و ساز ہونے کا گلہ کیوں، جو مظاہر و آثار کے لیئے ہے۔ وہ حسن کفران نعمت ہے جو "چون و چرا" پیدا کرے، تو آئیے جس طرح امید و بیم کی کشمکش میں زندگی کا بڑا حصہ گزار دیا ہے۔ باقی چند سال بھی اسی طرح بسر کر دیئے جائیں، اگر امید کا پیدا ہونا اپنے بس کی بات نہیں تو اس کے فنا ہونے پر کلیجہ سخت کر لینا تو اختیار سے باہر نہ ہونا چاہیئے

سال حال کے لیئے میں نے کوئی لائحہ عمل مرتب نہیں کیا، کیونکہ مجھ میں اس قدر حوصلہ ضبط نہیں کہ سوچوں کچھ اور ہو کچھ۔ جب سیل میں ایک تنکے کی طرح بہنا مقدر ہو چکا ہے تو پھر مقاومت بیکار ہے۔ اسکی مرضی ہے جدھر چاہے بہالے جائے اور جہاں چاہے گم کر دے

گذشتہ سال معاصرین میں سے جن جن ارباب لطف نے مجھکو مورد عتاب بنایا، ان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور جو اس سال جدید طیاریاں کر رہے ہیں ان کا بھی۔ میری طرف سے وہ جواب کی توقع نہ رکھیں کیونکہ حقیقتاً میں ہر الزام و ملامت کا مستحق ہوں اور اگر وہ اس سے زیادہ "تلخ نوائی" سے کام لیں تو بھی وہ میرے استحقاق سے زائد نہ ہوگی۔

میرے کفر و الحاد کے افسانے اب اس حد سے گذر گئے ہیں کہ ان کے متعلق مجھے کوئی عذر پیش کرنیکی ضرورت لاحق ہو۔ لیکن غالباً یہ سن کر "کافر گر" جماعت کو حیرت ہوگی کہ ایک لمحہ کے لیئے بھی کبھی میرے دل میں یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ کیا اسلام کا صحیح مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور ہو سکتا ہے جو میں سمجھ رہا ہوں اور کیا دنیا میں مجھ سے زیادہ کوئی اور سچا مسلمان ہو سکتا ہے۔ اگر میری آنکھوں پر پردہ نہیں پڑ گیا تو کیا یہ منظر کم حیرتناک نہیں کہ ساری دنیا یوں دفعتاً بے بصر ہو گئی ہے۔

مارچ سنہ ۱۹۳۱ء

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست
خود سخن در کفر و ایماں می رود
(غالب)

جو شخص مذاہب کی حقیقت، اختلاف مسلک و کیش کی اصلیت اور امتیاز رسم و راہ کی معنویت سے باخبر ہے اور جو اہل نظر اس رمز سے آگاہ ہیں کہ انسان کا اگر کوئی ہدف پرستش ہوسکتا ہے تو وہ صرف "انسانیت کبریٰ" ہے جسکو قائدین مذاہب نے مختلف ناموں، مختلف صورتوں، اور مختلف لہجوں میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ وہ موجودہ نزاع کفر و ایمان پر اگر کوئی صحیح رائے رکھ سکتے ہیں تو یہ صرف وہی ہوسکتی ہے جسے غالب عرصہ ہوا ظاہر کر چکا ہے کہ۔

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست
خود سخن در کفر و ایماں می رود

اب آیئے واقعات کی دنیا میں، مشاہدات کی فضا میں، اس حقیقت پر غور کیجیے کہ اگر مذہب واقعی کوئی مستبد حکمرانی نہیں ہے۔ کوئی نفسی و ذاتی خود غرضی نہیں ہے اور اگر مذہب کی غایت دنیا مین اصلاح و تہذیب، اشاعت امن و سکون کے علاوہ کچھ نہیں تو پھر تاریخ مذاہب کیوں خون سے رنگین نظر آتی ہے، اور دنیا کے تمام لٹریچر سے زیادہ مذہب کا لٹریچر کیوں ظلم کی داستانوں سے لبریز ہے۔ کیا سبب ہے کہ دنیا مین جسقدر مذہبی تعشف بڑہا، انسانیت گھٹی، جسقدر مذہب کا اقتدار قوی ہوتا گیا انسان مین اسی اعتبار سے درندگی بڑہتی گئی۔ کیا یہ دلیل مذاہب کی لغویت مین پیش کیجا سکتی ہے کیا اس تلخ حقیقت سے یہ نتیجہ نکلسکتا ہے کہ دنیا مین مذاہب کا وجود نقصان رسان ہے، ؟ ممکن ہے ایک سطح بین یہی سمجھے، لیکن زیادہ عمیق نگاہ جان سکتی ہے کہ جب مذہب خود اس دعوے کو ساتھ لے کر آیا ہے کہ وہ دنیا سے ظلم و ستم اور وحشت اور درندگی کو محو کر دینے والا ہے تو پھر کیونکر اس کا وجود ہمارے لیے مضرت رساں ہوسکتا ہے اس لیئے ظاہر ہے کہ ہماری تلخ کامیاں ہماری مصیبتیں اور پریشانیاں حقیقتاً مذہب سے متعلق نہیں ہیں، بلکہ عدم مذہب سے وابستہ ہیں۔ یعنی ان ہستیوں سے جو مذہب کی اوٹ میں، ایمان و اصلاح کے بہانہ سے تبلیغ امن و سکون کے پردہ میں مذہب کے وجود کو محو کر کے لامذہبیت، اصلاح و شائستگی کو تباہ کر کے جہل و تخریب اور امن و سکون کو برباد کر کے قتل و خونریزی کی بنیاد ڈال رہی ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ مذہب کی صحیح تعلیم کو چھپایا انھوں نے مطالعۂ مذہب کی طرف سے لوگوں کو غافل رکھا۔ اور انھوں نے کبھی گوارا نہ کیا کہ لوگ خود اصول مذہب کو سمجھ کر ان پر کاربند ہوں۔ انھوں نے بجائے خدا کے اپنی پرستش کرائی اور عبادت گاہوں میں جہاں صرف خدائے قدوس کا ذکر ہونا چاہیئے تھا۔ انھوں نے اپنے بت قائم کیئے اور لوگوں کے سروں کو اپنے سامنے جھکا کر قدرت اور قانونِ قدرت کی طرف سے دنیا کو غافل بنا دیا۔

انھوں نے یہ تعلیم دی کہ مذہب نام ہے صرف اس چیز کا جسے وہ بتائیں، اور نجات کا راستہ وہ

ہے جو وہ دکھائیں، پھر انھوں نے ہمیشہ مذہب کے نام سے اس چیز کو دکھایا جو یکسر طاغوت و شیطان سے متعلق تھی۔ اور طریق نجات کے بہانے سے ہمیشہ وہ راہ پیش کی جو نکبت و ذلت تباہی و بربادی کے گڑھے میں ڈھکیل دینے والی تھی۔

پھر جس طرح تمام مذاہب کی تاریخ میں ایسے بندگانِ نفس و غرض پائے جاتے ہیں اسی طرح اسلام بھی ان سے خالی نہیں رہا اور اس جنس کی پیداوار آج نہیں بلکہ اسی وقت سے شروع ہو گئی جب رسولؐ کے بعد ہی مذہب و امامت کو دنیاوی ملکیت سمجھ کر ہمارے اکابر باہم دگر دست و گریباں نظر آنے لگے اغراض ذاتی کے لئے احادیث وضع ہونے لگیں۔ اور رفتہ رفتہ حکومت نے ایک جماعت ایسے لوگوں کی پیدا کی جو بیش تو کئے گئے قائدین مذہب کی حیثیت سے لیکن فی الحقیقت وہ پشت پناہ تھے امارت و حکومت کی اس مادی و دنیاوی ترقی کے جس نے بجائے حریت و مساوات کے استبداد و تہرمانیت کی بنیاد دنیا میں ڈالی۔ پھر مذہب سے متعلق کوئی لٹریچر ایسا نہیں تھا جس میں اس جذبہ سے کام نہ لیا گیا ہو اور کوئی حکمراں ستی ایسی نہ تھی جس نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔ فقہ و اصول فقہ میں، حدیث و اصول حدیث میں، تفسیر و اصول تفسیر میں اور یہی تاریخ، ادب، کلام، الغرض تمام لٹریچر میں حق و باطل، صدق و کذب کو اس طرح مخلوط کر دیا گیا کہ لوگوں کو امتیاز نقد و نسیہ دشوار ہو گیا اور حالت بد سے بدتر ہوتی گئی جس کا آخری نمونہ حکومت عثمانی کا وہ دور ظلمت تھا جو "خلافت پناہی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جسکی لعنتوں کی مکمل ترین مثال "سلطان عبدالحمید خاں" کا وہ زمانہ تھا جب اس "سلطان البرین والبحرین اور خلیفۃ اللہ فی الارض" کا ملک سوائے ترکوں کے سارے دنیا کے لئے وقف تھا، ممالک غیر کے سفیر قسطنطنیہ میں خود مختارانہ عدالتیں قائم کئے ہوئے شاہانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور اہل یوروپ پیرا میں اس لطف و مسرت کی داد دے رہے تھے جو ترکوں ہی کے روپیہ سے انھیں نصیب ہوتی تھی، لیکن غریب ترک اس سے بالکل محروم تھے۔ پھر یہ تمام بربادیاں اور غارتگریاں جن سے مسلمانوں کے خاندان کے خاندان تباہ ہو رہے تھے، وہ عسرت و افلاس جس نے اہل ملک سے آزادی کی آخری سانس بھی چھین لی تھی، وہ تمام اخلاقی، اقتصادی و علمی انحطاط جو ایک وبا کی طرح ہر ہر فرد پر مسلط تھا سب ان مذہبی رہنماؤں، عالموں، قاضیوں اور شیخ الاسلاموں کا لایا ہوا تھا جو خلیفۂ وقت کی بداعمالیوں کے جواز کا فتوے دے دیکر ملت کے جذبات کو ابھرنے نہ دیتے تھے اور طمع صرف یہ تھی کہ اس خدمت گرانمایہ کے عوض میں انکو چند "درہم و دینار" اس طرح مل جایا کرتے تھے جس طرح شیر شکار کے بعد چند ہڈیاں گوشت و پوست کے کچھ ٹکڑے مردار خوار جانوروں کے لئے چھوڑ جاتا ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ جب ملک کی حالت اس درجۂ انحطاط پر پہونچ جائیگی تو اس کا "ردّعمل" کیا ہو گا۔

سلطان عبدالحمید خاں کی معزولی اور ترکی کا پہلا انقلاب حقیقتاً اس ردعمل کی صرف ابتدا تھی جس کی انتہا البطل اعظم مصطفےٰ کمال کے ہاتھ پر مقسوم ہو چکی تھی اور جو اچھی طرح جانتا تھا کہ جب تک ان مذہبی رہنماؤں کو محو نہ کیا جائے گا کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا چنانچہ اس نے سب سے پہلے "خلافت" کا خاتمہ کیا جو سرچشمہ تھا تمام مصائب کا اور پھر تمام مولویوں کو جنھیں "ذریات خلافت" کہنا چاہیے ضعیف یا کمزور کر کے اس انقلاب کو رونما کیا جس کی نظیر آج تک تاریخ کے صفحات پیش نہیں کر سکے۔

کہا جاتا ہے کہ ترکی بے دین ہو گیا ہے، ہندوستان کے مولوی چیخ رہے ہیں کہ ترکی کی ترقی لامذہبیت و بیدینی کی ترقی ہے کبھی کبھی خود حدود ترکی کے اندر مولویانہ لبادے میں رونما ہو جاتی ہیں، لیکن کیا کوئی دانشمند کبھی سمجھ سکتا ہے کہ اگر ترقی اسی بیدینی و بے راہ روی سے حاصل ہو سکتی ہے تو پھر دنیا میں کون ہے جو مذہب و مذہبیت اختیار کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ آخر کب تک عالم کو اس فریب میں مبتلا رکھا جائے گا کہ مذہب ناطع ترقی و ادم لذات ہے اور کیونکر اب عقول انسانی کو پیچھے ہٹا کر بجائے "اعتماد نفس" کے "اعتماد مولوی" کا یقین دلایا جائے گا۔

آج ترکی "خلافت اور مولویت" کے جال سے نکل کر تعلیم و اقتصاد، صنعت و حرفت، سیاست و تجارت غرض کہ زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کر رہا ہے، دنیا میں ایک خاص اقتدار حاصل کر کے "مرد بیمار" کی لعنت سے آزاد ہو گیا ہے، اس لیے اب یہ ناممکن ہے کہ وہاں پھر وہ دور قائم ہو جس کی تمنا میں ہمارا "مولوی" آتش زیر پا نظر آ رہا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض مسائل میں ترکی حدود سے متجاوز ہو گیا ہے۔ اور مذہب کی کوئی قیمت ان کے نزدیک باقی نہیں رہی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس انقلاب کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ وہ لوگ جنھوں نے خلافت ترکی کے عہد آخرین کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس الزام کا مستحق کون ہے؟

مس گریس ایلی سن نے زمانہ دراز تک وہاں زندگی بسر کر کے "موجودہ ترکی" پر جو کتاب لکھی ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اب کون سی روح کام کر رہی ہے اور یہ ردعمل کس چیز کا نتیجہ ہے۔؟

اپریل سنہ ۱۹۳۱ء معاصر معارف کے فاضل محرر نے فروری کے شذرات میں جو ابتدائی دو صفحے تحریر فرمائے ہیں خواہ وہ کتنے ہی عام مصلحانہ انداز میں کیوں نہ لکھے گئے ہوں لیکن لکھنے والے کی تفہیم میں ایک ایسی

خصوصاً جب اس کی نگاہ غلط انداز میں ایسی "پرسش پنہاں" موجود ہے کہ اس نے اپنی قدر اندازی سے کام لیا ہو یا نہ لیا ہو لیکن یہ ہمیں ضرور معلوم ہے کہ اگر "تیر" کجا و "نماید کجا می زند" کی صنعت کو پیش نظر رکھ کر یہ تیر کیا جاتا تو ہم کیا دنیا جان لیتی کہ کس کو بسمل کرنے کے لیے مولانا نے اپنے "دست و بازو" کو رنج پہنچانے کی زحمت گوارا کی تھی؟

قربان نگاہِ تو شوم باز نگاہے!

جنوری کے نگار میں اس مضمون کو دیکھ کر جس میں "علمائے کرام" کے فتاوے اور ان کے نظریۂ دینی پر تنقید کی گئی تھی، سب سے زیادہ جس شخص کو متوجہ ہونا چاہیے تھا وہ ہمارے مولانا سید سلیمان ندوی ہی تھے کیونکہ انھیں کا فتوے ایسا تھا جو "صنعت تذبذب" میں لکھا گیا تھا اور اس لیے انھیں پر اس کی ضرب زیادہ شدید تھی، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ انھوں نے شذرات کے دو صفحات پر کفایت فرمائی جو حقیقتاً بانداز "کم نگاہ" کیا بہ قدر "نیم نگاہ" بھی تسکین بخش نہیں۔ پھر اس سے زیادہ ہماری نارسائی بخت اور کیا ہو سکتی ہے، کہ ٹھیک اس وقت جب کہ نگار (جنوری) کی اشاعت کے بعد ہم اپنے آپ کو ساری دنیا کی طرف سے نوید قتل و ذبح پہونچا رہے تھے مذہب کی اس آرمری (ARMOURY) سے جس کو اپنی کسل و آراستگی پر اتنا ہی ناز ہے جتنا غالب کے محبوب کو اپنی "بُرِش تیغ جفا" پر تھا، ایک تیر صرف بھی کیا جاتا ہے تو شکستہ پر و گسستہ سوفار۔ نشانہ سے الگ اور مضمحل رفتار!

کیا ہی ہے جسے ناوک فگنی کہتے ہیں

ہم کو محترم مولانا سے جو دارالمصنفین ایسے خانوادۂ علم و فضل کے چشم و چراغ اور جو شبلی اسکول کی ذہنیت کے سب سے بڑے علمبردار ہیں، یہ توقع تھی کہ وہ نگار کے فتاوی والے مضمون کو دیکھ کر ہماری غلطیوں کی اصلاح فرمائیں گے۔ جو شکوک و اوہام ہم ایسے عامی و جاہل لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ انھیں اپنے فاضلانہ طرز استدلال سے دور کرنے کی سعی کریں گے۔ اور اگر یہ سب نہیں تو کم از کم وہ اس قدر عنایت تو ضرور روا رکھیں گے کہ اپنے "ممکن" والے معمہ کو حل کر کے فتوے کے صحیح مفہوم سے دنیا کو آگاہ کر دیں گے لیکن افسوس ہے کہ نہ انھوں نے اپنے منصب دینی کے لحاظ سے اس مسئلہ پر کوئی توجہ کی، اور نہ دوستانہ حیثیت سے ہم کو لائق اعتنا سمجھا حیف ہے

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں

تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

مولانائے محترم نے اپنے شذرات میں جو کچھ اظہار خیال فرمایا ہے۔ وہ ان کے نزدیک ایسے اصول

راسخ سے متعلق ہے کہ اگر ان کو تسلیم کر لیا جائے اور تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں، تو پھر وہ اصول از خود باطل ہو جاتے ہیں جن پر فتنا لانے والے مضمون کی بنیاد قائم کی گئی تھی۔ اور اس طرح کسی تفصیلی گفتگو کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ اچھا آیئے تو ان اصول پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں جو مولانا نے قائم کیے ہیں۔ اور غور کریں کہ ان میں ہمارے اصولوں کے علاوہ کون سی نئی چیز پائی جاتی ہے

گذشتہ اشاعت میں ابتدائی چار ٹکڑے اس موضوع کے لیے وقف کیے گئے ہیں۔ پہلے ٹکڑے میں ارشاد ہوتا ہے کہ:-

"ہر قسم کی کامیابی صرف دو چیزوں پر موقوف ہے ایک تو چند طے شدہ اصولوں کو دل سے تسلیم کر لینا اور دوسرے ان طے شدہ اصولوں کے مطابق تن من سے عمل کرنا۔ ان کو عام محاوروں میں اصول و عمل کہو یا مذہب کی زبان میں ایمان و اعمال صالحات ایک ہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ پہلے اصول پھر عمل۔ یا پہلے عمل اور پھر اصول۔ ظاہر ہے کہ فلسفہ حقیقت سے کوئی جواب دیگا کہ پہلے اصول پھر عمل —— یہ کہنا کس قدر حماقت ہے کہ .... پہلے پابندی پھر اصول یا پہلے عمل پھر ایمان"

ہم کو بھی اس سے حرف بہ حرف اتفاق ہے۔ اور کون ہے جو اصول کی تعیین سے پہلے پابندی اور ایمان کی تعیین سے قبل عمل کا مطالبہ کرے گا۔ لیکن سوال یہی ہے کہ آج کل مسلمانوں نے جس چیز کو اصول یا ایمان قرار دے رکھا ہے۔ وہ حقیقتاً اصول یا ایمان ہے بھی نہیں۔

مولانا معاف فرمائیں۔ اگر میں یہ عرض کروں کہ وہ ابھی تک یہی نہیں سمجھے کہ میری اصل جنگ تو یہی ہے۔ اصول یا ایمان کی صحیح تعیین ہی باقی نہیں رہی اور پابندی یا اعمال ہی کو اصول یا ایمان قرار دینے کی نمائندہ دنیا مبتلا ہے۔ میں کب کہتا ہوں کہ کسی منزل کی تعیین نہ کیجیے، کوئی مقصود سامنے نہ رکھیے۔ کوئی غرض سے نہ پیدا کیجیے۔ کیونکہ بغیر اس کے جہد و عمل، سعی و اقدام کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ میں خود اس وقت ایک ایک مولوی سے، ہر اس صاحب جبہ و دستار سے جو خود کو تنہا آلۂ رشد و ہدایت سمجھ کر عوام کی دسترس سے دور ... دیوتا کے غضب آلود دیوتا جیو ٹیپر کی طرح کبر و غرور کی شکنیں چہرہ پر ڈالے ہوئے ایک مرتفع مسند اپنے آپ کو اس قدر بلند کھینچے ہوئے ہے، میں یہی دریافت کرتا ہوں کہ خدا کے لیے اور اس رسول کے ... تو ہما نشین بنا ہوا ہے بتا اور صحیح صحیح بتا کہ ایمان کیا ہے، اصول مذہب کیا ہیں؟ وہ کہتا ہے نماز ... توبہ استغفار۔" میں پوچھتا ہوں کہ کیا ایمان نام درستی اخلاق کا نہیں، اصول خیر ... سے متعلق نہیں وہ اس کے جواب میں "ہاں" تو کہہ دیتا ہے، لیکن اس کا وعظ یہی ہوتا ہے ... نماز ہے، ایک مخصوص طریقہ عبادت ہی کا نام ایمان ہے، اور اگر کوئی شخص اس طریق ...

تو وہ گمراہ رہیگا خواہ اس کے اخلاق کتنے ہی پاکیزہ کیوں نہ ہوں؟

پھر میں اب خود مولانا ندوی سے پوچھتا ہوں کہ اصول کی تعیین، ایمان کی تخصیص کو کس نے نظر انداز کیا۔ طریق کار اور راہِ عمل کو کس نے اصل ایمان قرار دیا، میں نے جو صرف نیکو کاری کو حصول ایمان قرار دیا ہے یا اس مولوی نے جو کہتا ہے کہ "اخلاق حسنہ سے نجات ممکن نہیں، جبتک ایک شخص خاص وضع خاص لباس خاص قسم کی ڈاڑھی اور متعین حرکات کے ساتھ نماز پڑھنے والا نہ ہو، خدارا اب آپ ہی فیصلہ کیجئے، اور یہ آپ ہی کے ہاتھ ہے کہ وہ کون ہے جو ذریعہ کو صرف ذریعہ سمجھتا ہے۔ اور وہ کون ہیں جنھوں نے ذریعہ کو اصل مقصود دے لیا ہے۔

شذرات کا دوسرا ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"کسی سمجھدار انسان سے کوئی کام نتیجہ کے سمجھے بوجھے بغیر صادر نہیں ہو سکتا، وہی نتیجہ اس کام کی غرض و غایت ہوتی ہے، اخلاق محض اخلاق کا تصور غرض و غایت اور نتیجہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اخلاق کا کمال اعمال میں نہیں۔ بلکہ ان کی غرض و غایت کی بلندی اور ذاتی خواہشوں اور طلب معاوضہ سے انتہائی پاکی میں ہے، انسان کے اعمال کا پست و ذلیل جذبات، نفسانی ہوا و ہوس سے پاک ہونا اخلاق کی بلندی و طہارت کے لیے ضروری ہے۔ انسان کا کام صرف اس قدر نہیں ہے کہ کسی غریب آدمی کو چند پیسے دے دے۔ بلکہ اس کے بعد یہ بھی ہے کہ یہ کام اس طرح کیا جائے کہ کرنے والے کا مقصود اپنی ناموری، نمائش، معاوضہ، قرب اور اس غریب کو ممنون احسان بنانا نہ ہو بلکہ صرف اخلاص قلب ہو۔ ان قلبی جذبات اور دل کے رجحانات کی اصلاح بجز اس کے ممکن نہیں کہ ایک دانائے رموز و عالم الاسرار ہستی کا یقین کیا جائے جو دلوں کے ایک ایک رگ کی جنبش اور ایک ایک جنبش کی حرکت کو دیکھتا، اور سنتا، اور جانتا ہے، اس لیے خدا پر ایمان لائے بغیر حسن عمل اور حسن خلق کا تصور ممکن نہیں کہ جوارح کے اعمال کی درستی۔ سراسر قلب کے اعمال کی درستی پر موقوف ہے۔"

مولانا کا مقصود اس تحریر سے غالباً یہ ہے کہ اخلاق کی بلندی کا معیار صرف اخلاص قلب ہے اور اخلاص ممکن نہیں جبتک خدا پر ایمان نہ رکھا جائے، یقیناً مجھے بھی لفظاً یہ الفاظ اس سے اتفاق ہے لیکن معنوی اختلاف کے ساتھ اور وہ یہ کہ جس چیز کو وہ اخلاص قلب کہتے ہیں، میں اُسے دو کہتا ہوں اور یہ بھی صرف اس لئے کہ "نفسانی ہوا و ہوس" کا کوئی لگاؤ باقی ہی نہ رہے اگر خدا پر ایمان رکھنے کے بعد اخلاص قلب سے کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اس

کا اجر خدا سے چاہتا ہے۔ اور اس طرح گویا وہ بندے سے نہیں تو اس کے خدا سے ضرور تجارت کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ جذبہ کلیۃً ہوا و ہوس سے خالی نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر تعلیم یہ دی جائے کہ کسی کے ساتھ نیکی کرنا ہر انسان کا فرض ہے جو قدرت یا خدا کی طرف سے اس پر عائد کیا گیا ہے تو پھر کسی قسم کا شائبہ نفسانی خواہش یا غرض ذاتی کا پیدا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کسی پر احسان کرنا گویا خود ممنون ہونا ہوگا کہ اس طرح وہ ایک فرض سے سبکدوش ہو گیا۔

جب تک اعمال کے ساتھ خدا کا ڈر یا اس کی خوشنودی و رضامندی کا خیال شامل رہے گا انسان صحیح معنی میں کبھی کوئی نیکی نہیں کر سکتا، بلکہ اس کے تمام افعال حسنہ یا تو اس طمع کے زیر اثر ظہور پذیر ہوں گے جو حور و غلمان یا کوثر و سلسبیل سے متعلق ہو سکتی ہے۔ یا اس ڈر سے جو فطرتاً آگ، اژدہا، سانپ، بچھو وغیرہ سے انسان کو ہوتا ہے خدا کو ماننا اور اس طرح ماننا کہ گویا وہ ہندوستان کی کسی ریاست کا نواب ہے جس کے جاسوس ہر وقت ہر جگہ لگے ہوئے ہیں۔ اور جو ذرا ذرا سی بات پر دار پر کھچوا سکتا ہے۔ کم از کم میرے خیال میں کسی طرح نہیں آتا۔ میں اس کو بے نیاز مطلق، استغنائے محض جانتا ہوں جس کو ہمارے افعال بد سے واسطہ ہے۔ نہ اعمال حسنہ سے کوئی تعلق، کائنات کے اور تمام نظام کے ساتھ اس نے انسان کی تمدنی زندگی کا بھی ایک قانون بنا دیا جس کو انسان نے اپنے ارتقائی دور کے مختلف منازل میں اچھی طرح سمجھ لیا ہے، پھر اگر وہ اس پر کاربند ہوگا تو خود اسی کی ہئیت اجتماعی کو فائدہ ہوگا ورنہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ خواہ بجائے پانچ کے چالیس وقت کی نماز کیوں نہ پڑھے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ :-

"خدا پر ایمان لائے بغیر حسن عمل کا تصور ہی ممکن نہیں"

میں اس کے ماننے کے لیئے تیار نہیں، کیونکہ دنیا میں بعض افراد ایسے بھی مل سکتے ہیں جو باوجود انکار خدا کے اچھے خصائل رکھتے ہیں۔ اور اپنے ابنائے جنس کو فائدہ پہونچاتے رہتے ہیں، صرف اس خیال کے ماتحت کہ یہ ہر انسان کا فطری فرض ہے۔ میں حیران ہوں کہ مولانا اس سے انکار کیسے کر سکتے ہیں، جب کہ وہ خود بھی اس کے قائل ہوں گے کہ "نیکی خود اپنا بدلہ ہے۔" درآں حالیکہ اس نظریہ کے ماتحت خدا کے ماننے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو اصولی گفتگو ہوئی۔ اب زیادہ مسئلہ جس کے سلسلہ میں مولانا نے اظہار خیال کیا ہے۔ سو میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ جو ایک نیکوکار برہمن کو ناری بتاتے ہیں۔ تو کیا وہ خدا کا قائل نہیں ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایک بت پرست (اصطلاحی معنی میں) حقیقتاً ایک اسی قوت کا قائل نہیں ہوتا جسے سوائے خدا سمجھنے کے کوئی چارہ نہیں۔ اس لیئے میری رائے میں

مولانا کو یہ لکھنا چاہیئے کہ "بغیر مسلمان ہوئے حسن خلق کا تصور ممکن نہیں" اور اس کو ثابت کرنے کے بعد بیشک وہ نکوکار برہمن کو ناری اور بدکار مسلمان کو ناجی کہہ سکتے تھے۔

اس کے بعد مولانا زیادہ کھل کر اصل مدعا کی طرف آتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

"آج جب کہ مسلمانوں کو عملاً کام کرنا ہے، صرف باتیں بنانا نہیں، کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو اس پر بحث نہیں کرتے کہ ایمان ہو یا حسن خلق عملاً حاصل کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس پر بحث کرتے ہیں کہ نجات اخروی کا ذریعہ محض ایمان ہو یا حسن عمل یا صرف حسن عمل ہی سہی، ہمارے داعی اس کا نمونہ بن کر دکھائیں۔ اس اہمیت کو نمایاں کر کے بتائیں وہ کبھی اس کی دعوت نہیں دیتے کہ نماز پڑھنی کسقدر ضروری ہے، لے دے کر دعوت یہ ہے کہ پانچ وقت کی نماز ہے یا تین وقت کی، تین ہی وقت سہی، مگر ان تینوں وقتوں میں پڑھی بھی تو جائے، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی اسلام کے بجائے صرف سلبی اسلام کو مسلمانوں کی ہر ترقی کا ذریعہ جانتے ہیں۔ حالانکہ پانچ وقتوں والا نمازی سلطان صلاح الدین، سلطان محمد فاتح اور سلیمان اعظم پانچ وقتوں کی نماز پڑھنے سے نہ اپنی سلطنت کھو بیٹھے اور نہ اس عہد کے ملاحدہ تارک صلوٰۃ وعدیم ایمان کے باوجود ملک کا چھوٹا سا گوشہ بھی حاصل کر سکے۔ اگر ملک ہی حاصل کرنا ترقی ہے۔"

مولانا نے اس بیان میں چند در چند غلطیاں کی ہیں۔ اول تو "وہ کچھ لوگ جو ایسے پیدا ہو گئے ہیں" خود نجات اخروی سے کوئی بحث نہیں کرتے۔ اس میں سے اگر آپ لفظ اُخروی نکالدیں تو بیشک آپ کا یہ دعوے درست ہو سکتا ہے کیونکہ اُخروی کا جو مفہوم آپ کے یہاں ہے اس سے وہ کوسوں دور ہیں اور اگر بطور معارضہ یا استفادہ وہ اُخروی نجات سے گفتگو کرتے ہیں تو صرف اس لیئے کہ آپ اس کے قائل ہیں اور آپ ہی کے مسلمہ اصول کو سامنے رکھ کر اصولاً بحث کرنا چاہیئے۔

دوسری غلط بیانی یہ ہے کہ ان لوگوں کو صرف باتیں بنانے والا ظاہر کیا گیا اور عملاً حسن خلق سے بالکل بیگانہ۔ اگر اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ دوسرے کی تیز روشنی کو گل کر کے اپنے گھر کی ضعیف روشنی کو نمایاں کیا جائے۔ تو میں حیران ہوں کہ مولانا نے کیسے کہدیا کہ ایسے لوگ حسن اخلاق سے مُعرّا ہوتے ہیں۔ اور عمل کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اس وقت اظہار انکسار کی ضرورت نہیں مجھے صاف صاف دریافت کرنا چاہیئے۔ کہ مولانا مجھے کیوں اخلاق حسنہ سے مُعرّا جانتے ہیں اور کس روایت کی بنا پر وہ مجھے بداخلاق کہہ سکتے ہیں۔ درآنحالیکہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ "مجھ صرف باتیں بنانے والے" کے اخلاق بدرجہا ان بہت سے مولویوں سے اچھے ہیں جو مولانا کے نزدیک عملاً حسن اخلاق کے تعلیم دینے والے ہیں اور باتیں نہیں بناتے۔

اب رہا یہ الزام کہ ایسے لوگ تین ہی وقت نماز پڑھنے کی دعوت لوگوں کو کیوں نہیں دیتے سو اس کا جواب زیادہ دشوار نہیں جب کہ صدیوں سے پانچ وقت کی نماز پڑھنے اور پڑھانے والوں کے اخلاق سامنے موجود ہیں - تو بروں درجہ کردی کہ دُرزن کہتہ آئی - گفتگو تو اسی میں ہے کہ مولویوں نے لوگوں سے اس قدر نمازیں پڑھوائیں، اتنے روزے رکھوائے کہ وہ نماز روزہ ہی کو اصل ایمان سمجھنے لگے - اس لئے اب وقت کا اقتضا، کیا ہے نماز کی اہمیت کا درس دینا یا اس چیز کا جسکے حصول کے مختلف ذرائع میں سے ایک ذریعہ نماز بھی تھی، اور جو اب اپنی اہمیت ذریعہ ہونیکی بھی کھو چکی ہے -

اگر سلطان صلاح الدین وغیرہ پانچ وقت نماز پڑھنے سے اپنی سلطنت نہیں کھو بیٹھے تھے تو اس سے یہ بھی ثابت نہیں ہوسکتا کہ سلطنت ان کو پانچ وقت کی نماز ہی سے حاصل ہوئی تھی اور اگر یہ صحیح ہے تو کیوں نہیں آج تمام مولوی پنج وقتہ نماز پڑھ کر کم از کم دو صوبہ برار ہی انگریزوں سے چھین کر حضور نظام کو نہ دیں نذر ہی لیلیں - اور چیز صوبہ برار یا کوئی حصہ آپ تو خیر بڑی چیز ہے میں کہتا ہوں کہ بجائے پانچ وقت کے وہ چالیس وقت کی نماز کنوؤں میں الٹے لٹک لٹک کر ادا کرتے رہیں - یہ میرا ذمہ ہے اگر وہ وائسریگل لاج کے غسلخانہ ہی پر قابض ہوسکیں -

اب رہا دوسرا الزام کہ ملاحدہ ترک صلوٰۃ و عدم ایمان کے باوجود کیوں نہیں ملک کا کوئی چھوٹا سا گوشہ حاصل کر لیتے، سو یہ بالکل بے محل ہے، کیونکہ انھوں نے تو اس کا کبھی دعوے ہی نہیں کیا - اور نہ وہ اس کے قائل ہیں کہ سلطنت یا ملک گیری نماز سے متعلق ہے - اور اگر الزامی جواب دینا چاہیں تو کہہ بھی سکتے ہیں، کہ آج دنیا میں حکمرانی کس قوم کا حصہ ہے، کیا وہ بڑی خدا ترس ہے، کیا وہ بڑی مسلمان ہے، کیا وہ ملحد و بیدین نہیں - اور دور کیوں جائیے خود ترکی کو دیکھیے کہ اس کے احیاء ثانیہ کا کیا راز ہے - اور کیا ترکوں پر الحاد و بیدینی کا الزام عائد نہیں کیا جاتا - نماز کے متعلق آپ گفتگو کا پہلو ایسا کیوں اختیار کرتے ہیں، جو بالکل بے محل و غیر متعلق ہے - میں نے کب کہا کہ نماز بری چیز ہے - یقیناً وہ ایک بہتر طریقہ اصلاح نفس کا ہے - اور میں پابند صوم و صلوٰۃ لوگوں کو اچھا سمجھتا ہوں بشرط آنکہ وہ آپ ہی کے نظریہ کے مطابق ایمان و عمل میں امتیاز پیدا کر سکیں - نماز اگر نفس ایمان سمجھ کر ادا کی جائیگی تو یقیناً وہ اپنے حدود سے متجاوز ہو کر ناجائز چیز قرار دیجائے گی - لیکن اگر اس کو محض ایک ذریعہ فلاح سمجھ کر اختیار کیا گیا اور جذبہ رانت و لطف اس کی وساطت سے اپنے اوپر طاری کیا گیا تو اس کے بہتر ہونے سے کس کو انکار ہوسکتا ہے -

"آخر میں مولانا فرماتے ہیں کہ :-

"اصل یہ ہے کہ آج کل جہاں یورپ کی نقالی ہر چیز میں ہے، مذہب و اصلاح مذہب میں بھی نقالی ہے۔ یورپ کے رفارمیشن کی تاریخ پڑھ پڑھ کر ہر جدت پسند کو اسلام کا لوتھر بننے کا خیال ہے۔ لیکن یہ خبر نہیں کہ اسلام و مسیحیت میں اشتراک کیا ہے؟ جسکے لیے اسلام کو لوتھر کی ضرورت پیش آئے عیسائیوں نے عیسائیت ملنے کے پندرہ سو برس بعد عیسائیت کو چھوڑ کر سلطنت پائی، لیکن مسلمانوں نے تو اسلام اور سلطنت ایک ساتھ پائی اور جب اسلام چھوڑا سلطنت بھی چھوٹ گئی۔ کیا یہ فرق ہمارے نئے مصلحین کے سامنے ہے۔ غلط رسوم و رواج اور خارجی بدعات کا نام مذہب نہیں۔ محمد (صلعم) کا اسلام وہی ہے۔ جو محمد (صلعم) کے عہد میں مجسم ہو کر نظر آیا اور جس کی تصویر اب بھی اوراق میں محفوظ ہے۔ محمد کا اسلام وہ نہیں ہے جس کی تصویر آپ اپنے واہمہ سے کھینچ کر دکھائیں"

اس کے جواب میں ہم یہی عبارت دوہرا کر خود مولانا سے سوال کرینگے کہ وہ اسلام کہاں گیا جس کے ساتھ ساتھ سلطنت آئی تھی اگر سلطنت کا ساتھ آنا اسلام کا لازمی نتیجہ ہے تو پھر اس سے کیوں انکار کیا جاتا ہے، کہ ترقی ملک گیری کا نام نہیں ہے، اگر آج اسلام کہیں نہیں ہے تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا علماء کا گروہ اس الزام سے بری ہو سکتا ہے۔ یا تو اس کا اعتراف کیجیے کہ اس زمانہ میں کوئی عالم دین، کوئی داعی شریعت، کوئی مصلح مذہب و ملت موجود نہیں ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ان اسباب کو تلاش کیجیے جنھوں نے سلطنت کو اسلام سے جدا کر دیا۔ وہ لوگ جنھیں آپ نئے مصلحین کے لقب سے یاد کرتے ہیں، وہ بھی اسی جستجو میں ہیں، اور آخر کار اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ سارا ادبار انھیں کا لایا ہوا ہے، جو اپنے آپ کو علمائے کرام اور ہادیان مذہب کہتے ہیں۔ اور آپ بھی اسی جستجو میں ہیں، لیکن آپ کی جستجو خود اپنے اندر سے شروع نہیں ہوتی۔ اور اس بیچارے "مذہب" کو اس حد تک لانے والا" کا پتہ نہیں چلتا

یہ آپ صرف زبان سے کہتے ہیں کہ "غلط رسوم اور خارجی بدعات" کا نام اسلام رکھ گیا ہے، لیکن ان رسوم و بدعات کے مٹانے کے لیے آپ کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتے کیونکہ آپ میں ایسا کرنے کی جرأت و جسارت نہیں ہے۔ اور یہ جرأت اور جسارت کیوں نہیں ہے؟ اس لیے کہ جب تک نصیحت دوسروں سے متعلق ہوتی ہے بہت دلچسپ چیز ہے لیکن جہاں اپنی ذات کا سوال آیا، تو پھر وہی "کشف سارق" کا معاملہ پیش آ جاتا ہے جس کا تحمل آسان نہیں۔

بہر حال اگر ہم کچھ نہیں کر سکتے تو ہمارے پاس اس کا ایک معقول جواب بھی ہے کہ ہم اس

سکے اہل نہیں، لیکن آپ تو ایسا نہیں کہہ سکتے، اٹھیئے اور ان رسوم و بدعات کو مٹائیے جن میں اسلام گم ہو گیا ہے، اگر ہم سبھی اسلام والے ہیں تو آپ ایجابی اسلام والے کیوں نہیں سامنے آتے۔ اور ان اوہام و شکوک کو کیوں نہیں رفع کرتے جنھوں نے مسلمانوں کو نصف سے زیادہ تعداد میں، ملحد و بیدین اور کافر بنا رکھا ہے۔

آپ لوگوں کو صرف کافر و ملحد کہہ کر ذہن کی اس رفتار کو نہیں روک سکتے جو زمانہ کے ساتھ ساتھ ایک سیلاب کی طرح بڑھتی آ رہی ہے۔ بلکہ اس کی تدبیر یہ ہے کہ آپ خود اس سیلاب میں پڑ کر بہہ نکلنے والوں کو طوفان سے بچائیں لیکن اگر آپ اس سے معذور ہیں تو پھر یہ وعظ و نصیحت بھی ترک کیجئے کہ اس سے بجائے فائدہ کے اور نقصان ہے، اور کبھی کبھی اپنی جماعت کو بھی غیر معصوم جان کر اس کے اعمال و افعال کا جائزہ لے لیا کیجئے کہ خانقاہوں کے گوشوں اور مسجد کے محراب و منبر سے جو تقدس کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں وہ واقعی صحیح و درست بھی ہیں یا نہیں؟

آتی نہ بڑھا پائی داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بند قبا دیکھ

مئی سنہ ۱۹۳۱ء

مجھ سے بعض حضرات دریافت فرماتے ہیں کہ کیا مسلمانان ہند کے سنبھل جانے کی کوئی امید ہے؟ کیا کوئی صورت ہے کہ وہ وقت حاضر کی نزاکت سے بچ کر جان سلامت لے جائیں یعنی اب سوال یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت و جلال کو کیونکر واپس لا سکیں، بلکہ اسی کو غنیمت جان کر باصد ہزار عجز و تمنا۔ چاہا جاتا ہے کہ وہ کسی طرح دنیا میں زندہ تو رہیں ان سے سانس کی آمد و شد کا استحقاق تو نہ چھینا جائے، وہ اپنی عمر طبعی تک تو پہونچنے کے لیے آزاد چھوڑ دیئے جائیں خواہ وہ آزادی ایک غلام ہی کی سی کیوں نہ ہو۔ اور وہ حیات وہی کیوں نہ ہو جو راہ میں پڑے رہنے والے ایک گدائے معذور کو حاصل ہے۔ اللہ اکبر! یہ سوال اس مذہب کے ماننے والوں کی طرف سے کیا جاتا ہے جس کے پرچم پر سوائے انتم الاعلون کے اور کچھ منقوش نہ تھا۔ جس کا گرم سیر سیر کار راہ میں چبھ جانے والے کانٹوں کے نکالنے کی بھی مہلت نہ دیتا تھا اور جس نے کوئی تعیین کسی منزل کی نہیں کی تھی کیونکہ وہ انسان کو گرم سفر رکھنا چاہتا تھا تا آنکہ وہ خود اس نہار آفرینش کو پالے جو انسان کو خدا بنا دینے والا ہے۔ میں یہ سنتا ہوں اور اعماق قلب سے خون کا فوارہ سبقت کر کے میرے دماغ کی قوت ادراک کو میرے اعصاب بینائی کے انفعال و احساس کو تھوڑی

دیر کے لیے سلب کر لیتا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ سر چکرانے لگتا ہے۔ اور میں ایک بت کی طرح خاموش ہو جاتا ہوں۔

یقیناً سلاطین ہند اس وقت اُسی منزل سے گزر رہے ہیں جب ترقی و انحطاط کا نہیں بلکہ صرف مادی عناصر حیات کے بقا و فنا کا سوال سامنے آتا ہے۔ اس لیے مجھے حیرت نہیں کہ وہ کیوں یہ سوال کرتے ہیں۔ بلکہ عبرت آتی ہے اس منظر پر کہ وہی قوم جس نے دنیا کو جینے کی نہیں بلکہ جلانے کی زندہ رہنے کی نہیں بلکہ زندہ کردینے کی راہیں بتائیں۔ آج اسی کے افراد اس خوف سے کانپ رہے ہیں کہ کوئی انہیں ہلاک کردے اگر کوئی کہے کہ مسیح کا معجزہ جاں بخشی صرف شاعرانہ مبالغہ تھا، تو اسے باور کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی دعوے کرے کہ موسیٰ کے ید بیضا کی روشنی صرف ایک افسانہ تھی، تو اس کا بھی یقین ہو سکتا ہے۔ اور اگر کوئی بتائے کہ سلیمان کی سطوت شاہانہ محض ایک داستان پارینہ ہے، تو اس کے باور کرنے میں بھی تامل نہیں ہو سکتا۔ لیکن خدا را کوئی بتائے کہ اس کا یقین کیونکر آ سکتا ہے۔ کہ وہ قوم جس کا ایک ایک فرد بھی جاں بخشیوں، موسوی نور افروزیوں اور سلیمانی سطوتوں سے بہت بلند دنیا کی حقیقتوں کو بروئے کار لا کر محض انسانی عظمت و جلال پر مہر دوام ثبت کرنے کا دعوے رکھتا تھا، وہ آج انحطاط کی اس منزل پر پہونچ گئی ہے کہ اس دنیا میں غلامانہ سانس لیتے ہوئے بھی اس کا کلیجہ ایک مجرم کی طرح کانپ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ

کم ہوتے ہیں زمانہ میں ایسے بھی انقلاب

آج اگر بودھ اور زردشت کے ماننے والے رام و کرشن کی پوجا کرنے والے موسیٰ و مسیح متبعین صفحۂ عالم سے محو ہو گئے ہوتے تو جائے حیرت نہ تھی کیونکہ وہ تعلیم مذہب و اخلاق جو اب سے کئی ہزار سال قبل دنیا کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ اس درجہ مکمل نہ تھی، کہ وہ زیادہ عرصہ تک ارتقاء انسانی کا ساتھ دے سکتی اور اس لیے اس کو یقیناً بے روح ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن پیروان اسلام کا زوال جسے ابھی صرف ۱۳۵۰ سال کا زمانہ گزرا ہے۔ اور جس کی تعلیم کو تکمیل دین اور اتمام نعمت سے تعبیر کیا جاتا ہے یقیناً سخت حیرتناک واقعہ ہے اور ایک شخص کے لیے یہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے اسباب کا سراغ کہاں اور کیونکر لگائے۔

اسلام کے علاوہ جتنے مذاہب عالم میں گزرے ہیں، ان سب کی تعلیمات۔ دنیا کی طرف سے بالکل خالی الذہن ہو کر پیش کی گئی تھیں، یعنی وہ یہ تو چاہتے تھے کہ انسان حسن اخلاق سے اپنی اہلی و قبائلی زندگی کو خوشگوار بسر کرے، لیکن نہ ان کے سامنے انسان کا وہ مستقبل تھا جسے ریاست و تجارت یا دولت و ثروت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور نہ وہ اس اصول ارتقاء کو جانتے تھے جو موانع انسانی کو ایک جگہ قائم کر رکھنے والی چیز نہیں اس راز کو صرف اسلام نے سمجھا۔ اور دنیا کو سمجھایا کہ انسان نام گوشت و پوست کا نہیں ہے جو فنا ہو جانے

والی چیزیں ہیں۔ بلکہ انسان نام ہے اس کی فراست و بصارت کا، اقدام عمل کا، نہضت و ارتقاء کا، اور تمام کائنات پر فرمانروایانہ انداز سے چھا جانے کا۔ اور یہی وہ حقیقت تھی جسے مذہبی زبان میں تشبیہاً و استعارتاً جنت و فردوس، خلود و مسرت، جنات نعیم، اور کوثر و سلسبیل سے تعبیر کیا گیا۔ آخرت و قیامت سے ہمیشہ ایک قوم کا انجام و نتیجہ مراد لیا گیا۔ اور موت کے بعد بقاء کا مفہوم بھی انھیں روایات عروج کو بتایا گیا جو انسان کی حقیقی داستان حیات ہے۔ لیکن چونکہ ترقی و عروج حکومت و ثروت انسان میں ہمیشہ تمرد و سرکشی اور انحطاط اخلاق کا باعث ہوا کرتی ہے۔ اس لیے اسی کے ساتھ اسلام نے وہ تعلیم بھی پیش کی جو مادی ترقی کے ساتھ اخلاقی صحت کو بھی قائم رکھنے والی تھی۔ اور وہ تعلیم عدل و مساوات تھی۔ عہد رسالت سے قبل اس نوع کی عملی تعلیم کا وجود کسی زمانہ میں نہیں پایا گیا اور عہد حاضر کی تمام ترقیاں اسی اصول پر استوار ہوئی ہیں۔

چونکہ قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دنیا کی تمام ترقیاں اسلام ہی کے وضع کردہ اصول پر مستحکم ہو رہی ہیں تو خود مسلمان کیوں اس سے محروم رہے اور ہیں۔ ممکن ہے کوئی شخص اس کے جواب میں تاریخ ماضی کو پیش کر کے مسلمانوں کی گذشتہ ترقی کو بطور ثبوت سامنے لائے لیکن مجھے اس میں کلام ہے کہ واقعی کبھی مسلمانوں نے کوئی ترقی ایسی کی تھی جو ہم اسلامی اصول کی پابندی کا نتیجہ بتا سکیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کا دور ترقی دو تین سو سال سے زائد قائم نہ رہ سکا حالانکہ اگر اصول ترقی وہی ہوتے جو اسلام نے بتائے تھے تو جو ترقی ہوئی تھی وہ نہ صرف یہ کہ علی حالہا قائم رہتی بلکہ آج ساری دنیا پر چھائی ہوئی نظر آتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی اس بیش بہا تعلیم پر کسی نہ کسی حد تک صرف ۳۰ سال تک عمل رہا اور امیر معاویہ کے تخت نشین ہوتے ہی عدل و مساوات کا قانون بالکل اٹھ گیا اور اس کی جگہ استبداد و قہرمانیت نے لیلی۔ پھر اس کے بعد مسلمانوں نے جو ترقی کی وہ صحیح اسلامی ترقی نہ تھی بلکہ ملوکانہ تسلط تھا۔ جو دنیا کے مختلف حصوں پر قائم ہوا اور چند دن میں اپنی عمر طبیعی کو پہونچ کر فنا ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ جس تعلیم کو پورے تیس سال بھی پختہ ہونے کے لیے نصیب نہ ہوں، وہ کیونکر دنیا میں استوار ہو سکتی تھی۔ اور کس طرح اس کا اثر قوم کے تمام افراد پر پڑ سکتا تھا، علی الخصوص اس وقت جب کہ سلاطین وقت، اور شاہان عصر کی تمام ستم آرائیوں اور بے اعتدالیوں کا ساتھ دینے کے لیے ہمارے علماء کرام کی ایک بڑی جماعت موجود تھی اور جو جھوٹی حدیثیں وضع کر کر کے، لغو و مہمل فقہی مسائل گڑھ گڑھ کر استبداد کو تقویت پہونچا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ جب عہد نبوی سے قریب تر زمانہ میں ہمارے

رہبروں کا یہ حال رہا ہو تو زمانۂ مابعد میں اس کی دنائت کس حد تک نہ پہونچ گئی ہوگی۔ چنانچہ آپ ہندوستان، ایران، مصر، ترکی، اسپین کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا۔ کہ یہاں حکمرانی کا انداز کیا تھا اور کیا حقیقتاً ان میں اصول عدل و مساوات پر قانون جہانبانی کی بنیاد قائم کی گئی تھی جو اسلام نے بتائے تھے؟ نہ انھوں نے اسلام کی صحیح تعلیم کو سمجھا، نہ انھوں نے قانون و شریعت کے اصول پر نگاہ کی نہ ان کو یہ معلوم ہوا کہ فطرت اور تمدن کا باہمی رشتہ کیا ہے اور نہ انھوں نے کبھی اس حقیقت پر غور کیا کہ زمانہ کا ساتھ دینے کیلئے خود اپنے آپ میں کس قدر تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس کا جو قدرتی نتیجہ پیدا ہونا چاہیئے تھا، وہی ظاہر ہوا، یعنی اسلام نام ہوگیا، صرف مخصوص لباس و وضع کا مقررہ رسم و رواج کا اور علمائے کرام نے اس سادہ فطری مذہب کو، اس دور وحشت کا مذہب بنا دیا جب انسان مذہب کے نام سے صرف علم الاصنام پیدا کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ آج اگر کوئی غیر مذہب والا۔ اسلام کی ان کتابوں کو دیکھے جو ہمارے ہاں کے علماء، فقہا، اور محدثین نے تصنیف فرمائی ہیں تو وہ حیران رہ جائے گا کہ کیا انھیں روایات و مسائل کی بناء پر اسلام کو فطری مذہب اور محمد کو خاتم النبیین ثابت کیا جاتا ہے۔ بہر حال اس دور نامرادی میں یہ شکوہ و شکایت بیکار ہے۔ کیونکہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔

اب تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آئندہ کے لئے ہمارا "لائحہ عمل" کیا ہونا چاہیئے۔ سو اس کا جواب تم مولویوں سے نہ چاہو جو تبلیغ کے نام سے نہایت ہی غیر مصلحانہ فضا پیدا کر رہے ہیں۔ نہ ان مدعیانِ ترقی و اصلاح سے جو تنظیم کانفرنس وغیرہ کی مضرت رساں تحریک سے حکومت کی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کو تقویت پہونچا رہے ہیں۔ اس کا جواب خود اپنے آپ سے چاہو اور اس جذبۂ انسانیت سے طلب کرو جو سب سے پہلے انسان کو رشتۂ وطنیت سے وابستہ کرتا ہے۔

مذہب اور مذہبیت کا دور ختم ہوگیا، اب صرف زمانہ وطن پرستی کا ہے۔ اس لئے اگر مسلمان اپنے آپ کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں سب سے پہلے اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھ کر ملک کی دوسری قوموں سے مل جانا چاہیئے اور ہر اس تحریک میں پورے جوش و سرگرمی کے ساتھ حصہ لینا چاہیئے جو ملک کی ترقی و آزادی کی ضامن ہے۔ مذہب بالکل ذاتی و انفرادی اطمینان کا نام ہے، اس لئے اس کو ہیئت اجتماعی کی بنیاد نہ بناؤ اور اس کو استخوانِ جنگ قرار نہ دو کہ مذہب کی گذشتہ تاریخ پہلے ہی بہت کافی خون سے رنگین نظر آتی ہے اور اس میں اب کسی اور خونیں اضافہ کی ضرورت نہیں۔

جون سنہ ۱۹۳۱ء

جس زمانہ میں کانپور کا خونیں ہنگامہ رونما ہوا، میں حیدرآباد میں تھا۔ اور اخباروں

کے بیانات دیکھ کر سخت متردد تھا کہ دیکھئے یہ فرقہ وارانہ آویزش اس وقت جب کہ ہندوستان کو حصول آزادی کے لیے ایک متحد محاذ پیش کرنیکی ضرورت ہے، کیا نتائج پیدا کرتی ہے۔ لیکن جب سب آخر میں ٹائمس آف انڈیا نے ایک انگریز کے چشم دید واقعات شائع کیے اور ہندوؤں کے ہاتھ سے مسلمان بچوں اور عورتوں کے سفاکانہ وبہیمانہ ذبح وقتل کے حالات معلوم ہوئے، تو میں رات بھر بے چین رہا۔ اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے ایک شدید جذبۂ نفرت وانتقام میرے اندر پیدا ہونے لگا۔ اور تھوڑی دیر کے لیے میں اس حقیقی مقصود کو بھی بھول گیا جو یقیناً اس نوع کے جذبات سے زیادہ بلند ہے۔

اس کے چند دن بعد جب میں لکھنؤ واپس آیا تو مختلف ذرائع سے واقعی حالات معلوم کرنے کی سعی کرتا رہا اور آخر کار خود میں نے کانپور پہونچ کر ان مقامات ومکانات کو دیکھا جن کی تباہیاں وبربادیاں ناصیۂ انسانیت کا بدترین داغ کہی جاسکتی ہیں۔ میں وہاں مزدوری پیشہ جماعت سے لے کر حکمراں طبقہ کے افراد تک سب سے ملا۔ اور آخر کار اس نتیجہ پر پہونچا کہ کانپور کی داستان خونیں مشکل ہی سے کبھی پوری بیان کی جاسکتی ہے۔ اور اس واقعہ نے ملک کی فضا کو جس قدر خراب کر دیا ہے اس کا مداوا آسان نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مسلمانوں نے قتل وذبح میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یقیناً انھوں نے بھی کافی وحشت ودرندگی کا ثبوت دیا، مکانوں کو جلایا، مندروں کو توڑا، انسانوں کو ہلاک کیا، لیکن معصوم بچوں اور بے دست وپا عورتوں کو انتہائی بے دردی کے ساتھ پارہ پارہ کرنے کا فخر صرف ہندوؤں ہی نے حاصل کیا۔ اور اگر اس ساری داستان میں کوئی ٹکڑا میرے لیے قابل مسرت ہے تو صرف اتنا ہی کہ مسلمانوں نے باوجود انتہائی غیظ وغضب کے کسی ایسی بہیمیت کا ثبوت پیش نہیں کیا جو ان کی قدیم روایات اخلاق کے خلاف ہو۔ جس طرح بے شمار شہادتیں اس امر کی موجود ہیں کہ اگر کسی ہندو نے الحاح وزاری سے کام لے کر جاں بری چاہی تو مسلمانوں نے اسے چھوڑ دیا یا کچھ روپیے لے کر اس کو جانے دیا، اسی طرح متعدد ثبوت اس تلخ حقیقت کے بھی مل سکتے ہیں کہ ہندوؤں نے عورتوں کو پناہ دینے کے بہانے سے اپنے گھر میں بلا بلا کر، بچوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے ان کے سروں پر دست شفقت پھیر پھیر کر، ایسی بے دردی کے ساتھ انھیں ہلاک کیا کہ سخت سے سخت قلب انسانی بھی اس کو سننے کے بعد کانپ کانپ اٹھنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ پھر یہ درندگی صرف شہر ہی تک محدود نہیں رہی، بلکہ بعض دیہات تک پہونچ گئی۔ جہاں عموماً مسلمانوں کی آبادی چند گھروں سے زیادہ نہیں ہوتی، اور یہاں بھی ہندوؤں نے اسی بیرحمی کے ساتھ اپنی جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے بعض مسلمان خاندانوں کو بچوں سے لے کر بوڑھوں تک کو ذبح کرکے ہمیشہ کے لیے محو کر دیا۔ یقیناً یہ جنگ تعلیم یافتہ افراد کی نہ تھی، یہ بھی سچ ہے کہ دونوں جماعتوں کے

مہذب و شائستہ لوگ اس میں شریک نہیں ہوئے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے بہت سے برہمنوں اور پجاریوں نے بھی اس میں پورے جوش کے ساتھ حصہ لیا۔ اور مسلمانوں میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو کسی طرح کی شرافت حسب و نسب کا مدعی ہو۔ پھر کیا یہ امر قابل غور نہیں کہ ایک طرف کے شریف ترین افراد بھی ضعیفوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے میں دریغ نہیں کرتے اور دوسری طرف غیر شریف افراد بھی ایک پناہ چاہنے والے دشمن پر ہاتھ نہیں اٹھاتے، خواہ وہ ان کے کسی عزیز ہی کا خون بہا کر کیوں نہ آیا ہو۔ دنیا اس کو جس نگاہ سے چاہے دیکھے، لیکن میں اس میں مسلمانوں کے مستقبل کے لئے ایک عجیب و غریب جھلک امید کی پاتا ہوں اور مسرور ہوں کہ ہنوز ان کی وہ خصوصیت لطف و رافت جو ایک شجاع قوم میں پائی جانا چاہیئے بدستور باقی ہے۔ پھر اگر آئندہ واقعی ہندوستان میں خانہ جنگی کی نوبت آئی (جس کا مجھے قوی اندیشہ ہے) اور اگر واقعی کسی جنگ میں حقیقی کامیابی اسی فریق کو حاصل ہو سکتی ہے جو اپنی اخلاقی فتحمندی کو دنیا سے تسلیم کرا سکے، تو میں مسلمانوں کی قسمت کی طرف سے بالکل مطمئن ہوں اور یقین کامل رکھتا ہوں کہ ان کے مقابلہ میں کبھی وہ قوم کامیاب نہیں ہو سکتی، جس کی بہادری کا انتہائی کارنامہ عورتوں، بچوں، اور ضعیفوں کو ذبح کر دینا ہو۔

کانپور کے اس دردناک ہنگامہ کی تفصیل فراموش کی جا سکتی ہے۔ مندروں، اور مسجدوں کے واقعات انہدام بھلائے جا سکتے ہیں، آتش زنی اور غارتگری کے واقعات بھی دلوں سے محو ہو سکتے ہیں، لیکن ہندو قوم کی اس داستان شجاعت کو کبھی صفحۂ تاریخ سے نہیں مٹایا جاسکے گا کہ اس نے مسلمان عورتوں کو پناہ دینے کے بہانہ سے اپنے گھروں میں بلایا، اور پھر مکان کے اندر بند کر کے ان کے بچوں کو انھیں کے سامنے ذبح کر کے انکو بھی انتہائی بیدردی و شقاوت کے ساتھ تڑپا تڑپا کر ہلاک کر ڈالا، حیران ہوں کہ اگر ایک انسان ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والی جماعت اس نوع کی دنائت و رذالت، اس قسم کا ذلیل کمینہ پن اور اسی طرح کی وحشت و درندگی کا اظہار کر سکتی ہے تو ایک بھیڑیے کی نسل سے پیدا ہونیوالے بچے اور کن خصوصیات کو لے کر پیدا ہوں گے اور دنیا ان دونوں کے درمیان کیونکر خط امتیاز کھینچ سکے گی۔

کانپور میں اس خونریزی کو حکومت نے کیوں جاری رہنے دیا۔ اس پر بحث کرنا بیکار ہے کیونکہ دنیا اس کی حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ ہو چکی ہے۔ اسی طرح یہ جستجو کہ ہندو مسلمانوں میں زیادہ اتلاف جان کس فریق کا ہوا، اب کوئی معنی نہیں رکھتی، لیکن اس سلسلہ میں دو باتیں ضرور توجہ کی مستحق ہیں ایک یہ کہ

ہندوستان کی تمام ہندو جماعت نے اس واقعہ کو کس نگاہ سے دیکھا اور دوسرے یہ کہ اس ہنگامہ کے صحیح اسباب کیا تھے امر اول کے متعلق مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوؤں نے تو ذبح و قتل میں بیدردی سے کام لیا ہی تھا۔ لیکن ہندوستان کے اور ہندوؤں نے بھی اپنی خاموشی اور سکوت سے کام لے کر کچھ کم شقاوت کا ثبوت نہیں دیا۔ میں نے کسی ہندو اخبار یا قائد رہنما کو اس درندگی پر اظہار ملامت کرتے نہیں دیکھا بلکہ برخلاف اس کے جو بیانات ادھر سے دیئے گئے ہیں اور جو رائیں ظاہر کی گئی ہیں، ان میں حقیقت کو چھپانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ ٹھیک جس وقت کانپور میں یہ ہنگامہ برپا ہو رہا تھا، کانگریس میں تمام قائدین کا اجتماع ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں مصروف تھا، لیکن ان میں سے کسی نے اس واقعہ کی اہمیت پر اظہار خیال نہیں کیا۔ اور ان ہندو افراد کو کوئی سرزنش نہیں کی گئی جنھوں نے اس کمینہ فطرت کا ثبوت دیا۔

اب رہا دوسرا امر جو اس فساد کے اسباب سے متعلق ہے، وہ کسی قدر تفصیل کا محتاج ہے اور اس کا اصل سراغ معلوم کرنے کے لیئے ہم کو اب سے ۲۲ سال قبل پہونچنا پڑے گا جب ۱۹۰۹ء میں مسلمانوں کے وفد کو جداگانہ انتخاب کی لعنت کا طوق مرحمت ہوا تھا۔ یہ حکومت کی اتنی زبردست چال تھی کہ نہ اس وقت تک مسلمانوں نے اس کو سمجھا اور نہ اب سمجھنے کے لیئے طیار ہیں۔ یوں تو بظاہر مسلمانوں کے لیئے نہایت امید افزا بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ کونسلوں کی نیابت میں ان کا انتخاب بالکل جداگانہ کر دیا گیا اور ان کی آبادی کو اس طرح گویا مخصوص اہمیت دی گئی، لیکن یہ نہ دیکھا گیا کہ یہ رعایت حقیقتاً اسی قسم کی رعایت تھی جو ایک مریض کے لیئے اس کو ایک مضر غذا کھانے کی اجازت دے کر روا رکھی جائے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو و مسلم جماعتوں میں آہستہ آہستہ باہم اختلاف پیدا ہونے لگا اور عصبیت و فرقہ داری مستحکم ہونے لگی۔ پھر چونکہ ہندوؤں کی جماعت یہاں زیادہ ہے اس لیئے انکو زیادہ موقع ستانے کا ملا اور چند دنوں میں عام طور پر مسلمانوں کو ہندوؤں کی طرف سے عدم رواداری اور عصبیت و تشدد کی شکایت پیدا ہونے لگی۔ ۱۹۰۹ء سے قبل جب جداگانہ انتخاب کا وجود نہ تھا، نہ کبھی ناقوس و اذان پر جھگڑا ہوتا تھا۔ نہ باجہ اور قربانی پر کہیں نزاع ہوتی تھی۔ کیونکہ ایک کے مفاد دوسرے سے متعلق تھے اور ہر فریق مجبور تھا کہ دوسرے فریق کے ساتھ صلح و آشتی سے کام لے۔

پھر چونکہ کانپور میں ہندوؤں کی جماعت تعداد و اقتصاد ہر لحاظ سے زیادہ قوی ہے

اس لئے یہاں کے مسلمانوں کو زیادہ تکلیفیں پہونچیں اور برابر ۱۳ سال تک وہ ان کو برداشت کرتے رہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ ابھی اور کتنے عرصہ تک ضبط سے کام لیتے رہتے، اور اگر اسی دوران میں تنظیم کانفرنس کی ملعون تحریک نے ان کے جذبات کو مشتعل نہ کر دیا ہوتا۔ فساد سے چند دن قبل کانپور کے گلی کوچوں میں اس کانفرنس کے جلوس مسلمانوں کی طرف سے نکالے جاتے تھے اور علانیہ "ہم کفر کی ہستی کو دنیا سے مٹا دینگے" کے نعرے بلند کیے جاتے تھے۔ بعد اس لفظ کفر کی تاویل خواہ کوئی کچھ ہی کیوں نہ کرے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں لفظ کفر کے اصطلاحی معنے صرف "ہندویت" کے ہیں اور وہ جماعت جو اس نعرہ کو بلند کرتی تھی وہ یقیناً اس سے ہندوؤں کی جماعت کو مراد لیتی تھی۔ پھر چونکہ کلکتہ، بمبئی کے بعد کانپور ہی ایک ایسا مقام ہے جہاں کارخانوں کے مزدور کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ہندو مسلمانوں کے درمیان یہاں زبردست ناگوار صورت اختلاف کی پیدا ہو گئی تھی اور وہی غیر ذمہ دارانہ جوش جو مزدوروں کی جماعت میں پیدا ہو سکتا ہے، یہاں دونوں جماعتوں میں کافی خطرناک حد تک پہونچ گیا تھا۔ ایک طرف یہ تمام آتش گیر مادہ جمع ہو چکا تھا کہ سوء اتفاق سے بھگت سنگھ کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا اور ہندوؤں میں ایک غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ جس وقت ہندوؤں نے بھگت سنگھ کی پھانسی کے خلاف مظاہرہ اور ہڑتال کرنے کا ارادہ کیا، اُن کا ارادہ براہ راست مسلمانوں پر حملہ کرنے کا نہیں تھا۔ وہ صرف اس حد تک تشدد برتنا چاہتے تھے کہ ہڑتال ہر نہج سے کامیاب ثابت ہو۔ چنانچہ وہ لوگوں کو سائکل سے اتارتے تھے، موٹروں کو روک دیتے تھے۔ ٹراموے کو چلنے سے باز رکھتے تھے، لیکن بعد کو جب یہ خیال عوام میں زیادہ وسعت کے ساتھ پھیلا تو فرط جوش میں مال روڈ پر انگریزی مال فروخت کرنے والوں کی دوکانوں پر پتھر پھینکے گئے۔ اور بعض فرنگیوں پر حملے بھی کیے گئے۔ شام یہ وقت تھا کہ اگر مقامی حکومت عسکری حکومت سے کام لے کر اس گروہ کو منتشر کر دیتی یا گرفتار کر لیتی تو فساد وہیں کا وہیں ختم ہو جاتا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا ایسا نہ کرنا محض اضطراب و بزدلی کا نتیجہ تھا یا کسی اور مصلحت کا، بہر حال سبب جو بھی ہو، عوام کے اس جوش کو بڑھنے دیا گیا، اور جب عین اسی عالم غیظ و غضب میں کسی طرف سے یہ آواز بلند ہوئی کہ مسلمانوں نے ہندوؤں پر حملہ کر دیا ہے تو ہندوؤں کا رخ مال روڈ اور فرنگی آبادی کی طرف سے مسلمانوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ اور آخر کار وہ آگ جو مسلسل ۲۲ سال سے دبی ہوئی چلی آرہی تھی دفعتاً بھڑک اٹھی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ جداگانہ انتخاب

ہندوستان کے لیے کیا برکتیں اپنے ساتھ لایا ہے اور وہ ایک انسان کو درندگی کی کسی حد تک پہونچا سکتا ہے۔ اس کے بعد کانپور میں کیا ہوا اس کی تفصیل نہایت دردناک ہے مختصراً یوں سمجھ لینا چاہیے کہ تین دن تک مسلسل وہاں سوائے وحشت و بربریت کے کسی کی حکومت نہ تھی اور ایک انسان دوسرے انسان کو اس طرح پھاڑ کر کھاتا رہا گویا جنگل سے بھیڑیوں کی جماعت شہر میں گھس آئی ہے اور سوائے خون پینے کے انھیں اور کوئی شغل ہی نہیں ہے۔

پھر کسقدر حیرتناک امر ہے کہ بنارس میں ہندو مسلم فساد رونما ہوتا ہے، مرزاپور میں بھی یہی آویزش نظر آتی ہے، اور پھر کانپور میں یہ محشر قائم ہوتا ہے، لیکن اب بھی ملک میں بعض ایسے صاحب فہم و تدبیر انسان موجود ہیں جو جداگانہ انتخاب کی حمایت میں آواز بلند کر رہے ہیں۔ اگر یہ لوگ ہمارے دوست ہیں تو خدا ایسے دوستوں سے بچائے اور اگر دشمن ہیں تو خدا ہم پر رحم کرے کہ ہم یہ سب کچھ جان بوجھ کر اپنی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاتھ میں دے رہے ہیں۔

جولائی ۱۹۳۱ء اگر آپ نے کبھی سمندر کے ساحل پر کھڑے ہو کر طوفانی حالت میں پانی کے تموج کو دیکھا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تلاطم نام ہے سطح آب کے اس ارتفاع کا جو انتہائی حضیض کے بعد دفعتاً رونما ہوتا ہے اور لہروں کا سلسلہ عبارت ہے اسی نشیب و فراز سے، اسی صعود و ہبوط سے اور اسی ابھر کر گرنے اور گر کر ابھرنے سے ——— بالکل یہی حالت ملکوں اور قوموں کے عروج و زوال کی ہے۔ اگر آج کوئی قوم انتہائی زوال کی حالت میں ہے تو سمجھ لو کہ اس کے مستقبل میں بلندی پنہاں ہے، اور اگر کسی کو بلندترین نقطۂ عروج پر دیکھو تو جان لو کہ اس کا زوال دور نہیں ——— فرق اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ موجوں کا نشیب و فراز ہم کو جلد جلد نظر آجاتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کے لیے قرنوں اور صدیوں کا انتظار کرنا پڑتا ہے ——— ملکوں کے جغرافیے اسی طرح بنے ہیں اور بدلتے رہینگے۔ قوموں کی تاریخیں اسی طرح بنی ہیں اور بنتی رہیں گی اور آج دنیا کے تمام آثار حقیقۃً زندہ شہادتیں ہیں فطرت کے اسی انقلاب پسند ذوق کی جو ذرے سے لے کر آفتاب تک ہر جگہ ہر چیز میں اور ہر وقت یکساں طور پر موثر نظر آتا ہے ——— البتہ غائر نگاہیں آنے والے انقلاب کو بہت پہلے سے دیکھ لیتی ہیں اور جن کی نظر بالغ و دوررس نہیں ہے وہ سب سے آخری پردے کے اٹھنے کی منتظر رہتی ہیں ——— روس کی اشتراکیت، جرمنی کی رجعت، اطالیہ کا انقلاب اور بالکل تازہ چیز ہسپانیہ کے دور ملوکیت کا خاتمہ یہ سب وہ

آثار و مناظر ہیں جن کا علم ہمیں اس وقت ہوا جب یہ رونما ہو کر واقعہ و حقیقت میں تبدیل ہو گئے لیکن جاننے والے پہلے ہی سے جان چکے تھے کہ زار روس کے دور قہرمانیت کو فطرت اس سے زیادہ برداشت نہ کر سکتی تھی قیصر جرمنی کے پیمانۂ کبر و غرور کا چھلک پڑنا ناگزیر تھا، اٹلی کی دشمنِ انسانیت سیادت مذہبی کا ختم ہو جانا ضروری اور اسپین کے دور امارت کا مٹ جانا بالکل اٹل اور یقینی تھا۔

پھر جو کچھ گزر چکا اس کو گزر جانے دو۔ آؤ دیکھو کہ موجودہ فضا میں بھی تمہیں کوئی آثار اضطراب نظر آتے ہیں۔ کیا آج کی ساعتوں میں آنے والے کل کے نشانات کا کچھ پتہ چلتا ہے

مغرب کی علمی و اقتصادی، سیاسی و تجارتی تفوق کی داستانوں میں مشرق نے اپنی اہلیت اپنی استعداد ترقی اور اپنی اخلاقی برتری کی خصوصیات کو ہمیشہ نظر انداز کیا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا نگاہوں کی خیرگی کے اسباب اب بھی اسی طرح قائم ہیں، کیا ظاہری نقش و نگار کی خوبیوں سے گزر کر بطون کی حقیقت کو ہماری نظروں نے اب بھی نہیں پہچانا؟ —— وہ چیز جو ہمیں مغرب میں جاہ و ثروت نظر آتی تھی آج اس کے استعماری خط و خال بے نقاب ہیں دول یورپ کے اقبال دولت کے ترانے جن سازوں کے ذریعے ہم تک پہونچائے جاتے تھے ان کی بے آہنگی آج کسی سے مخفی نہیں اور اس سرزمین ایجاد و اختراع کے مصانع و معامل جن کا نصب العین صرف رہزنی و قزاقی تھا، آج ویران و برباد نظر آتے ہیں —— وہ ایوانہائے تجارت جن کا گوشہ گوشہ ہر وقت روپے کی جھنکار سے گونجتا رہتا تھا اب سنسان ہیں —— وہ کارخانے جہاں عفریت پیکر مشینیں ہر وقت رعد آسا آوازیں بلند کرتی رہتی تھیں ویران و برباد ہیں —— اور وہ ٹکسالیں وہ بینک جہاں دولت ہر وقت پانی کی طرح بہتی نظر آتی تھی خاموش و غیر آباد ہیں —— وہی یورپ جس کے تمول کے افسانوں نے ہم کو مرعوب بنا رکھا تھا آج اسی کے دولت مند فرزندوں کا یہ حال ہے کہ افلاس سے پریشان ہیں، خودکشی کے لیے آمادہ ہیں۔ بے روزگاری نے انہیں دیوانہ بنا رکھا ہے اور اس وقت وہاں کا بڑے سے بڑا حکیم و فیلسوف چارہ کار کی تجویز میں ناکام نظر آتا ہے۔

اگر ایشیا تباہ و ویران ہے تو جائے شکایت نہیں کیونکہ وہ جاہل ہے ناتراشیدہ ہے اگر مشرق ادبار و تنزل میں مبتلا ہے تو کس کو مجال گفتگو ہو سکتی ہے، کیونکہ وہ سیاہ فام ہے غیر مہذب ہے، دیوانہ مذہب ہے۔

لیکن خدا را کوئی بتائے کہ آج یورپ جو اپنے آپ کو مخزن علم جانتا ہے جو تہذیب و شائستگی

کا موجد و مخترع ہے جو مذہبیات کی لعنت سے آزاد ہو چکا ہے، جو سفید رنگ رکھتا ہے، جو حسین ہے، قوی ہے، محنتی ہے، اور وہ سب کچھ رکھتا ہے جو ایک خدا کے بیٹے کی نسل سے چلنے والی مخلوق میں پایا جانا چاہئے ——— ہاں کوئی بتائے کہ آج وہ کیوں سوگوار ہے۔ اس کا آرام کس نے کھویا، اس کی نیند کس نے اچاٹ کی اور اس کے بنائے ہوئے "بروج مشیدہ" کہاں گئے؟ ——— واقعہ یہ ہے کہ انسان صرف اعتبارات و مفروضات پر زندہ رہنا جانتا ہے اور جب حقیقتوں سے پردہ اٹھتا ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے کہ کتنے زمانہ تک اس نے اپنے آپ کو مکر و فریب میں مبتلا رکھا ——— قدرت مسکرا کر پھر دوسرا پردہ ڈالتی ہے اور پھر وہ اسی تار و پود میں الجھ جاتا ہے جو اس سے قبل اس نے قائم کیا تھا ——— پھر اگر غور کیجئے تو یہ زمانہ وہی ہے جب حقیقتیں یکے بعد دیگرے بے نقاب ہوتی جا رہی ہیں اور نہایت واضح طور پر سرکش انسان کو بتایا جا رہا ہے کہ اگر وہ حقیقی امن و سکون کا خواہاں ہے تو اس کو استعمار میں نہ ڈھونڈھنا چاہیئے بلکہ استہلاک میں تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ تجارت و دولت کی ترقی اس حصول کی ضامن نہیں بلکہ یہ جنس نایاب صرف اخوت انسانی اور ایثار و رواداری سے مل سکتی ہے جو نہ کروپ کے کارخانہ کی چیز ہے نہ مانچسٹر اور لنکاشائر کے صنعت گاہوں کی۔

آج ایشیا اگر بیدار ہو رہا ہے تو اس کو پہلے ہی سے یہ فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ کیا وہ مغرب کے انھیں نقوش قدم پر چلے گا جو انسان کو دولت مند تو بنا سکتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ انسانیت بھی چھین لیتے ہیں یا وہ اپنی انھیں دیرینہ خصوصیات کو قائم رکھے گا جو زمانۂ نامعلوم سے لے کر اس وقت تک برابر انبیاء و رسل اولیاء و اکابر کے ذریعہ سے ان کے دردمند دلوں میں ودیعت کی گئی ہیں ———

اگست ۱۹۳۱ء اصحاب علم و فضل ہمیشہ دو قسموں میں منقسم رہے ہیں اور رہیں گے ایک وہ جو کسی علم کی بنیاد ڈالتے ہیں جدید اصول بناتے ہیں اور اپنے اختراعات سے تربیت ذہن و دماغ کے لئے نئی راہیں نکالتے ہیں دوسری جماعت وہ ہے جو صرف اسلاف کے چراغ سے اپنا چراغ روشن کرتی ہے مقررہ تصانیف معینہ اصول کے مطالعہ ہی کو انتہائی کارنامہ اکتساب علم کا جانتی ہے۔ اور جو سمجھتی ہے کہ تحقیق و تنقید اجتہاد و ابداع کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا ہے اور علم کی تکمیل جو ہونا تھی ہو چکی ——— اول الذکر جماعت کی حالت یہ ہے کہ اگر اس

کے نتائج تحقیق پر تنقید کی جاتی ہے تو وہ سکونِ دل کے ساتھ اسے سنتی ہے، غور کرتی ہے اور پھر از سرِ نو سعی و عمل، جد و جہد میں مصروف ہو جاتی ہے یہاں تک کہ دنیا کو اس کی صحت و تکمیل پر ایمان لے آنا پڑتا ہے لیکن برخلاف اس کے دوسری جماعت کی حالت یہ ہے کہ جب اس کے مفروضات پر گفتگو کی جاتی ہے تو وہ برہم ہو جاتی ہے اور اساطیر الاولین کی تمام حکایتیں، منطق و فلسفہ کے تمام مغالطے، خرافیاتِ تاریخی کے جملہ واقعات سامنے رکھ کر جواب دیتی ہے کہ کیا ان کے مقابلہ میں کسی کو دم مارنے کی مجال ہو سکتی ہے کیا کوئی انسان اس ذہن و دماغ کا پیدا ہو سکتا ہے جو تحقیقاتِ ماضیہ کے سامنے سابقون الاولون کے علی الرغم لب کھول سکے؟ کیونکہ نہ اب روح القدس باقی ہے نہ اس کا فیض، اور اس لیے کس کو یہ کہنے کی جرأت ہو سکتی ہے کہ

دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

اس وقت اگر ان دونوں جماعتوں کا صریح و واضح مطالعہ کرنا ہے تو مغرب و مشرق کے علماء کا مطالعہ کیجیے اور اپنی بے بصری و بیچارگی پر جتنا ماتم بھی ہو سکتا ہو کر لیجیے کیونکہ اب اس کے بعد کوئی درجہ منزلِ فنا تک پہونچنے کے لیے ہم کو طے کرنا نہیں ہے۔

اب سے چند سال قبل تک اہلِ مغرب کا ایمان تھا کہ ایتھر تمام فضا میں پایا جاتا ہے اور زمین کی کشش ہر وقت کارفرما ہے۔ لیکن ایک شخص اینسٹین نامی اٹھتا ہے اور تمام گذشتہ تحقیقات کو باطل کرکے ایتھر کے وجود کو مہمل اور زمین کی کشش کو لغو قرار دیتا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ اعوجاجِ زماں (Curvature of Space) کا عجیب و غریب نظریہ پیش کرتا ہے لیکن نہ کوئی شخص اسے مردود و ملعون قرار دیتا ہے نہ اس پر مضحکہ اڑاتا ہے بلکہ ہر شخص غور کرتا ہے، سمجھتا ہے حتیٰ کہ اس کا جدید نظریۂ اضافیت (Relativity) مسلمات میں داخل ہو جاتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں ہمارے یہاں کے علماء کو دیکھیے کہ اگر ان سے کہا جائے کہ "ھدیۂ سعیدیہ" میں جو دلائل گردشِ زمین کے ابطال میں پیش کیے جاتے ہیں وہ لغو ہیں" "شرح چغمینی" میں جو مسائل ہیئت کے بتائے جاتے ہیں وہ تقویم پارینہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تو وہ آستین چڑھا لیتے ہیں اور اس کو کفر و الحاد قرار دے کر مذہب و سوسائٹی سے علیحدہ کر دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک اب انسان سے غور و فکر، اختراع و ابداع، تحقیق و اجتہاد کی قوت چھین لی گئی ہے اور وہ مجبور ہے کہ اس سے قبل جو کچھ قدما لکھ گئے ہیں ان پر بے چوں و چرا ایمان لے آئے۔

حال ہی میں اس ذہنیت کا نہایت پر لطف منظر دیکھنا ہو تو اس بحث کو دیکھیے جو جناب ابوہریرہؓ کی موافقت قتل مرتد کی حمایت (در نگار کے سلسل مضمون "مطالعۂ حدیث" کی مخالفت میں معارف اور سچ کے صفحات میں نظر آ رہی ہے۔

صفحے کے صفحے اس تحقیق میں صرف کر دیئے گئے ہیں کہ جناب ابوہریرہؓ نہایت ذی فہم و ذی ہوش تھے، عہد نبوی میں وہ عاقل و بالغ کی حیثیت رکھتے تھے، رجال میں بڑے پایہ کے ثقہ راوی مانے جاتے تھے، قدما نے ان کے اقوال کو ہمیشہ صحیح باور کیا وغیرہ وغیرہ، لیکن کسی ایک جگہ بھی مضمون کی اصل روح سے بحث نہیں کی گئی جو ابوہریرہ پر جرح کی باعث ہے اور کوئی ضعیف سی کوشش بھی ان الزامات کے دور کرنے کی نہیں کی گئی جو ابوہریرہ پر اصولاً و درایۃً روایات واحادیث کی نوعیت کو دیکھ کر وارد ہوتے ہیں گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ وہ رسول اللہ کو صرف ابوہریرہ کے ذریعے سے سمجھنا چاہتے ہیں اور اس سلسلہ میں اگر رسول اللہ کے اخلاق پر کوئی حرف آئے یا ان کی تعلیمات پر اعتراض وارد ہو تو اس کے تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ انتہائی حد ہے اس کورانہ تقلید و اسلاف پرستی کی جس میں آج کل خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کا مولوی مبتلا نظر آتا ہے وہ یہ گوارا کر سکتا ہے کہ رسولؐ کی تنقیص ہو جائے، اسے یہ تسلیم ہے کہ تعلیمات اسلامی مسخ نظر آئیں، وہ یہ منظور کر سکتا ہے، کہ مذہب کا تعلق عقل و فہم سے بالکل نہ رہے، لیکن ابوہریرہ کو کوئی ٹوکے تو یہ اس کی برداشت سے باہر ہے، کیونکہ اس کے نزدیک

یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

مولویوں کی وہ جماعت جو تصنیف و تالیف سے کوئی تعلق نہیں رکھتی اور صرف تقریر و مواعظ سے جاہل مسلمانوں کو تباہ و برباد کر رہی ہے، یقیناً بڑی خطرناک چیز ہے لیکن میرے نزدیک اس سے زیادہ مہلک وہ جماعت ہے جو بدقسمتی سے تصنیف و تالیف کا بھی کچھ ذوق رکھتی ہے اور جو خدا معلوم کب سے غیر صالح ذخیرہ اپنی تحقیقات باطلہ کا فراہم کرتی چلی آ رہی ہے۔ ہر چند اس کے اثرات عوام پر تو زیادہ نہیں ہیں لیکن متوسط طبقہ جو کچھ لکھنا پڑھنا سا جانتا ہے ان کے تصانیف سے بری طرح اثر پذیر ہوتا ہے اور چونکہ اس طبقے میں کوئی اہلیت تنقید و تفتیش کی نہیں ہوتی اس لیے وہ ان موٹی موٹی کتابوں سے جس میں ہر چار سطر کے بعد ایک سطر عربی کی ضرور نظر آتی ہے اور جس کے نوٹ نوٹ میں بیسیوں حوالے خدا معلوم کن کن قدیم و عجیب و غریب کتابوں کے درج ہوتے ہیں مرعوب ہو جاتا ہے، حالانکہ مذہب کو کتابوں سے کیا واسطہ، اطمینان نفس کے لیے اس دفتر بے معنی کی کیا حاجت؟ مولوی

نیت سے نہیں، بلکہ ہمیشہ سے نام ہے اس مخلوق کا جس نے صرف پرانی لکیر کو پیٹا اور خود سمجھ کر کبھی مذہب کو اختیار نہیں کیا۔ وہ اگر مسلمان ہے تو صرف اس لیئے کہ اس کا باپ مسلمان تھا اور اگر اسلام کو وہ صحیح مذہب جانتا ہے تو محض اس بنا پر کہ اس کے اسلاف ایسا کہہ گئے ہیں اسی لیے جب کوئی دوسرا اس سے کچھ دریافت کرتا ہے تو وہ تاریخ کی ورق گردانیاں شروع کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھو فلاں فلاں اکابر و اعاظم یہی کہتے چلے آئے ہیں اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس صورت میں ہم اپنی عقل سے کام لیں۔

بالکل یہی صورت ابوہریرہ کے مسئلہ میں پیش آرہی ہے کہ وہ نہ تو اس حقیقت پر غور کریں گے کہ ابوہریرہ سے جو احادیث مروی ہیں وہ واقعی رسول اللہ سے منسوب کی جاسکتی ہیں یا نہیں، اگر منسوب نہیں کی جاسکتیں تو پھر دو ہی صورتیں ہیں یا تو اس سے انکار کیا جائے کہ ابوہریرہ ان کے راوی ہیں یا خود ابوہریرہ کو غیر ثقہ راوی قرار دے کر ان احادیث کی صحت سے انکار کیا جائے مگر مولوی اس اصل چیز کو ہاتھ نہیں لگاتا اور جواب میں وہ جو کچھ کہتا ہے اس کی نوعیت اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ ابوہریرہ کی دیانت پر شک کرنا جائز نہیں کیونکہ وہ تو ابوہریرہ ہیں گویا ان کا صرف ابوہریرہ ہونا کافی دلیل اس امر کی ہے کہ جو کچھ وہ کہیں گے بالکل صحیح و درست ہوگا، خواہ اس دلیل کی بنا پر رسول کی رسالت ہی کو کیوں نہ مجروح کرنا پڑے۔

انسان جب بہت زیادہ جاہل تھا تو اس نے دوسرے انسان کو خدا کہنے میں بھی تامل نہ کیا۔ اس کے بعد جب اس جہل میں کمی ہوئی تو نبی و رسول کہہ کر اس کی پرستش کی لیکن غیر معمولی معجزات منسوب کر کے نبی آخر الزماںؐ نے یہ کہہ کر کہ "میں تمہاری ہی طرح ایک انسان ہوں اور کوئی معجزہ اپنے ساتھ نہیں لایا" حقیقت کو ہمیشہ کیلئے بے نقاب کر دیا، لیکن انسان جو غلامانہ انقیاد و اطاعت اور مقلد ذہنیت کا عادی چلا آرہا تھا اس نے پھر بھی اپنی اس مکروہ عادت کو نہیں چھوڑا اور اسلام کی اس غیر معمولی تعلیم کو جو انسان کو حریت فکر آزادی ضمیر کا درس دینے والی تھی نظر انداز کر کے سینکڑوں خدا و رسول ایسے بنائے کہ ان کے مقابلہ میں وہ سچے خدا اور رسول کو بھی چھوڑنے کے لیئے آمادہ ہے۔

ایک شخص کہتا ہے کہ ابوہریرہ سے جو احادیث روایت کیجاتی ہیں وہ یکسر رسول کی شان کے منافی ہیں۔ اس لیئے ابوہریرہ کو ساقط الاعتبار سمجھو یا رسول کو غیر صادق مدعی رسالت، اس کا جواب مولوی جماعت کی طرف سے صرف یہ دیا جاتا ہے کہ ابوہریرہ کی ذات طعن و جرح سے

بہت بلند ہے مدعا یہ کہ رسول کو خواہ کوئی رسول مانے یا نہ مانے لیکن ابوہریرہ کے ثقہ ہونے میں کسی کو مجال گفتگو نہیں ہو سکتی۔

کیا اس سے زیادہ مکروہ مثال شخص پرستی کی کوئی اور ہو سکتی ہے، کیا اس سے زیادہ سخت لعنت تقلید کی کوئی اور پیش کی جا سکتی ہے۔

چشم اگر این است و ابرو این و ناز و عشوہ این
الفراق اے ہوش و تقوی الوداع اے عقل و دین

ستمبر ۱۹۳۱ء آیئے آج کی صحبت میں، اپنے ملک کے شاعروں سے کچھ باتیں کریں۔

مکّہ کی ایک نوجوان لڑکی مدینہ آتی ہے اور سنتی ہے کہ "عمر بن ابی ربیعہ" کا انتقال ہو گیا۔ واضح رہے کہ جرمنی کے شاعر "شیلر" کی طرح "عمر ابن ابی ربیعہ" بھی صرف "عورتوں کا شاعر" کہلاتا تھا، اس نے اپنی ساری عمر اسی جمیل و نازک جنس کی مدح و توصیف میں بسر کر دی تھی اور عرب کی کوئی عورت ایسی نہ تھی جو اس کے شعر کی دیوانہ نہ ہو ——— ہاں، تو جب اس لڑکی کو ابن ابی ربیعہ کی موت کا حال معلوم ہوا تو بری طرح رونے پیٹنے لگی اور عربوں کی رسم کے مطابق اپنے نالہ و شیون سے اس نے گویا صف ماتم بچھا دی وہ روتی تھی، اور کہتی جاتی تھی۔ کہ اب کون ہے جو ہماری جنس کے حسن و جمال کا راگ گائے گا۔ وہ سینہ کوبی کرتی تھی اور چیخ چیخ کر کہتی جاتی تھی کہ اب کون ہے جو ہمارے صنف کی رعنائیوں اور دلربائیوں کی توصیف کرے گا۔

لوگ جمع ہو گئے اور اس سے کہا کہ "اس قدر غم نہ کر عثمان ابن عفان کا ایک پوتا موجود ہے، جو ابن ابی ربیعہ کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ وہ اس کمی کو پورا کرے گا" اس لڑکی نے یہ سن کر لوگوں سے کہا کہ "اس کا کوئی شعر تو مجھے سناؤ" جب لوگوں نے اس کے اشعار سنائے تو اس نے آنکھیں پونچھیں اور مسکرا کر بولی، خدا کا شکر ہے کہ وہ اپنی یادگار قائم کیے بغیر اس دنیا سے نہیں گیا۔"

کیا ہزاروں میل کا طول و عرض رکھنے والے ہندوستان میں، سیکڑوں سال کی تاریخ شاعری میں سے کوئی ایک ایسا شاعر مجھے بتایا جا سکتا ہے جس کے مزار پر محض اس کی شاعری کی وجہ سے کسی عورت نے دو پھول چڑھانے کی بھی زحمت گوارا کی ہو ——— یہ امر یہاں خارج

از بحث ہے کہ اس سرزمین کی عورت ہی ان جذبات کی پرورش کرنے کی اہل نہیں ہے یا یہ کہ فی الحقیقت یہاں کوئی شاعر ایسا پیدا ہی نہیں ہو سکا -

جاہلیۃ اور اوائل اسلام میں عورت و مرد دونوں آزادی سے باہم ملتے جلتے تھے، محافل و مجالس میں دونوں شرکت کرتے تھے، تبادلۂ نظر کے ساتھ تبادلۂ جذبات و خیالات میں بھی آزاد تھے - اور ان کی قومی فطرت، ملکی اخلاق اور معاشری خصوصیت کے لحاظ سے یہ میل جول خطرہ سے خالی ہوا کرتا تھا - یہاں تک کہ حطیم کعبہ میں بھی دونوں دوش بدوش نظر آتے تھے - اور طواف میں بھی ایک کا شانہ دوسرے کے شانہ سے رگڑ کھاتا تھا - جب ان میں تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ امارت و غرور وادی و عیرت اخلاق و تفریق مراتب کا جذبہ پیدا ہوا تو خلفاء و امراء نے ایک کو دوسرے سے جدا کر دیا - لیکن اس کی ابتدا کیونکر ہوئی یہ واقعہ بھی سننے کے قابل ہے ——— سلیمان ابن عبد الملک اموی کے خلافت کا زمانہ ہے، خالد بن عبد اللہ القسری مکہ کا سردار ہے - کہ اس کے کانوں تک کسی شاعر کے یہ اشعار پہونچتے ہیں -

یا حبذا الموسم من موقف . وحبذا الكعبة من مسجد

وحبذا اللاتی یزاحمننا . عند استلام الحجر الاسود

(کیسا پیارا ہے یہ موسم، کیسی پیاری ہے مسجد کعبہ اور کیسی پیاری ہیں وہ عورتیں جو حجر اسود کو بوسہ دینے کے وقت ہم کو گھیر لیتی ہیں)

خالد نے یہ اشعار سن کر کہا کہ خیر، اب آیندہ سے وہ تمکو نہیں گھیریں گی - اور حکم دیا کہ مرد و عورت میں تفریق کر دی جائے اور سپاہی متعین کر دیئے کہ کوڑے مار مار کر دونوں کو علیحدہ کیا جائے - چنانچہ یہ جدائی جو اس وقت قائم ہوئی تھی اب تک باقی ہے اور مرد و عورت دونوں ساتھ ملکر یہ فریضۂ حج ادا نہیں کر سکتے - کیا ہندوستان کے ہزاروں شعلہ بیان شاعروں میں سے کسی ایک شاعر کا نام لیا جا سکتا ہے جسکے کلام سے متاثر ہو کر کسی بادشاہ یا امیر نے شعائر دینی تو خیر بڑی چیز ہے کسی معمولی رسم و رواج کو بھی بند کر دیا ہو ——— یہ سوال یہاں پیدا نہیں ہوتا کہ اس ملک کے امراء و سلاطین ہی ایسے کب تھے یا یہ کہ کسی شاعر کی زبان میں خدا نے یہ اثر پیدا ہی نہیں کیا

ایک غریب عرب کی تین لڑکیاں ہیں جو شکل و صورت کے لحاظ سے بھی قابل لحاظ نہیں اور ذہن و دماغ کے اعتبار سے بھی لایق اعتنا نہیں - گھر میں اتنا سرمایہ نہیں کہ سب کو بیٹھ کر کے کھلائے، شوہر ملتے نہیں کہ ان کے سپرد کر کے اس مصیبت سے نجات پائے، مجبوراً وہ ایک شاعر

(اعشیٰ) کے پاس جاتا ہے اور اپنی داستانِ غم سناتا ہے۔ یہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور سوق عکاظ میں جا کر ایک قصیدہ ان لڑکیوں کی تعریف میں سناتا ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے

لعمری لقد لاحت عیون کثیرۃ
الی ضوء نار بالبقاع تحرّق

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاعر قصیدہ ختم بھی نہیں کر چکتا کہ تینوں لڑکیاں شوہر حاصل کر لیتی ہیں۔

ایک طرف ان کی مدح و توصیف کا یہ اثر ہے اور دوسری طرف ان کی ہجو و مذمت کا وہ رعب کہ خلیفۂ وقت بھی ہزار درہم دے کر ایک شاعر سے اسکی ہجو خریدنے پر مجبور ہو جاتا ہے کیا ہمارے یہاں کے شعراء میں سے کسی ایک قصیدہ گو کا نام ایسا بتایا جا سکتا ہے جس نے کسی اور کا تو خیر کیا ذکر ہے، خود اپنے ہی لیئے کوئی بہتر رشتۂ ازدواج اپنی شاعری سے پیدا کیا ہو ــــــ یہ بحث بیکار ہے۔ کہ یہاں کی آبادی ہی اغراقِ مدح و ذم کے قبول کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی یا یہ کہ خود ہمیں دوسروں کو متاثر کرنے کا سلیقہ حاصل نہیں

عراق کا ایک تاجر مدینہ آتا ہے اور جتنے نقاب اس کے پاس ہیں، سب فروخت کر دیتا ہے صرف سیاہ نقاب باقی رہ جاتے ہیں۔ جن کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہ مسکین الدارمی شاعر کے پاس گیا جو کسی وقت اپنی عیش پرستیوں اور رنگ رلیوں کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ لیکن اب تائب ہو کر مسجد میں زاویہ نشین ہو گیا تھا۔ مسکین الدارمی نے کہا کہ میں کیا تیری مدد کر سکتا ہوں۔ تاجر نے کہا کہ "جس طرح ممکن ہو کوئی نہ کوئی تدبیر نکالیئے ورنہ میرا تمام مال پڑا رہیگا۔ اور مجھے سخت نقصان ہوگا" مسکین الدارمی نے تھوڑی دیر تامل کیا۔ اور پھر اپنا لباس زہد و تقویٰ اُتار کر وہی رندانہ وضع اختیار کی۔ اس حال میں وہ مسجد سے باہر آ گیا۔ اور اپنے ایک دوست کو یہ تین شعر یاد کرا کے کہا کہ شہر کے مغنیوں کو جا کر سنا دو

قل للملیحۃ فی الخمار الاسود　　ماذا فعلت براھب متعبد
قد کان شمّر للصلاۃ ثیابہ　　حتیٰ خطرت لہ بباب المسجد
ردّی علیہ صلاتہ وصیامہ　　لا تقتلیہ بحق دینِ محمّدٍ

(اس معشوقۂ ملیح رنگ سے جو سیاہ نقاب ڈالے ہوئے ہے کہدو کہ یہ تو نے ایک فقیر گوشہ نشین کا کیا حال کر دیا۔ وہ تو اپنا دامن سمیٹ کر عبادت کے لیئے ایک گوشۂ مسجد میں بیٹھ رہا تھا کہ تو دفعتہً سامنے آ گئی اور نماز و روزہ سب غارت کر کے رکھدیا۔ پھر اے حسینہ تجھے واسطہ ہے دینِ محمدؐ کا، کہیں ایسا نہ کرنا کہ تو اس کو قتل کر دے)

جس وقت یہ اشعار مدینہ کے گلی کوچوں میں پہونچے تو سب کو یقین ہو گیا کہ دارمی واقعی کسی سیاہ نقاب والی پر عاشق ہو کر مسجد سے باہر آ گیا ہے، اور تمام مدینہ میں کوئی ملیح رنگ لڑکی ایسی نہ رہ گئی جس نے اس تاجر سے سیاہ نقاب خرید کر اپنے چہرہ پر نہ ڈالا ہو۔ اس کے بعد سے سیاہ نقاب اس وقت کے فیشن میں داخل ہو گیا۔

کیا ہندوستان کے بیشمار شاعروں میں کوئی ایک ایسا پیش کیا جا سکتا ہے جس کے کلام سے متاثر ہو کر کسی ایک ہی شخص نے کوئی جدید وضع اختیار کر لی ہو ——— یہاں بھی اس گفتگو کا موقعہ نہیں کہ اس ملک کی آب و ہوا خود اس جوش کی پیداوار کی منافی ہے۔ یا یہ کہ یہاں کا شاعر خود اس کیفیت سے معرا ہوتا ہے۔

ہشام ابن عبدالملک کی خلافت کا زمانہ ہے۔ اور خالد القسری عراق و خراسان کا حاکم ہے اس وقت تک عام دستور تھا۔ کہ مسجدوں میں بلند مینار ہوتے تھے اور ان پر کھڑے ہو کر موذن اذان دیا کرتے تھے۔ اتفاق سے خالد کے کانوں تک کسی شاعر کے یہ اشعار پہونچ گئے

لیتنی فی المؤذنین حیاتی　　انہم یبصرون من فی السطوح

فیشیرون او تشیر الیہم　　بالہوی کل ذات دل ملیح

(کاش میں بھی ان موذنوں میں سے ہوتا جو اونچے میناروں پر کھڑے ہو کر آس پاس کے چھتوں پر نگاہ ڈالتے ہیں اور وہیں سے عشوہ طراز ملیح لڑکیوں سے اشارہ بازی کرتے ہیں۔)

ان اشعار کے سننے کے بعد ہی خالد نے حکم دیا کہ تمام مساجد کے مینار منہدم کر دیئے جائیں کیا ہندوستان کی تاریخ میں بھی کوئی واقعہ ایسا ملتا ہے کہ کسی شاعر کے کلام نے انہدام مسجد و مینار تو خیر بڑی بات ہے کسی محراب میں ایک پردہ ہی کا اضافہ کر دیا ہو ——— یہ عذر اس جگہ قابل سماعت نہیں کہ اس کا سبب ملک کی غیرت دینی کا فقدان ہے یا خود شاعر کی بے اثر زبان۔

امیر معاویہ مصروف جنگ ہیں اور دشمن کے ہجوم نے اس قدر تنگ کر دیا ہے کہ سوائے فرار کے کوئی صورت نظر نہیں آتی، لیکن ٹھیک اس وقت ابن الاطنابہ الانصاری کا یہ شعر ان کے کانوں تک پہونچتا ہے۔

ابت لی عفتی و ابی بلائی
واخذی الحمد بالثمن الربیح

اور وہ نئے جوش و خروش کے ساتھ حملہ کر کے دشمن کو شکست دیتے ہیں۔

رشید کو جس چیز نے نقفور ملک روم کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔ وہ صرف ایک یہ شعر تھا۔

عذر الذی اعطاک نقفور   فعلیہ دائرۃ البوار تدور

خلیفۂ سفاح ستر امرائے بنی امیہ کیساتھ بیٹھا ہوا، کھانے کا انتظار کر رہا ہے، کہ دفعتہً ایک شاعر اندر آتا ہے اور مظالم بنی امیہ کا ذکر کرکے یہ شعر پڑھتا ہے ۔ اذکروا مصرع الحسین و زیداً و قتیلاً بجانب المہراس سفاح یہ سنتے ہی برہم ہو جاتا ہے۔ اور تمام امرائے بنی امیہ کو قتل کرا دیتا ہے ۔

ایک بار اسی خلیفۂ سفاح کے پاس سلیمان ابن ہشام اموی بیٹھا ہوتا ہے۔ کہ سدیف شاعر آتا ہے اور کہتا ہے

لا یغرنک ما تری من رجال   ان تحت الضلوع داءً دویا

فضع السیف و ارفع السوط حتیٰ   لا تری فوق ظہرہا امویا

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سفاح فوراً سلیمان کو قتل کرا دیتا ہے ۔

رشید ملک بن طوق کے قتل کا حکم دیتا ہے جس وقت جلاد اس کو قتل کے لیے سامنے لاتا ہے اور گردن جھکا دیتا ہے تو اس کی زبان سے یہ اشعار نکلتے ہیں ۔

اری الموت بین النطع والسیف کامنا   یلاحظنی من حیثما اتلفت

وما لی من خوف الموت و انّنی   لاعلم ان الموت شیٔ موقت

ولکن خوفی صبیۃ قد ترکتہم   واکبادہم من حسرۃ تتفتت

رشید رونے لگتا ہے اور کہتا ہے کہ، "میں نے تیری لڑکی کا صدقہ تجھے معاف کر دیا، جا۔ اور اب پھر لوٹ کر یہاں نہ آنا۔"

عرب میں قبیلہ نمیر نہایت ہی معزز قبیلہ سمجھا جاتا تھا۔ اور اس قبیلہ کے افراد نہایت فخر و غرور سے اپنی نسبت اس قبیلہ سے ظاہر کرتے تھے، لیکن جب شاعر جریر نے اس قبیلہ کی ہجو میں یہ شعر کہا کہ۔

فغض الطرف انک من نمیر   فلا کعباً بلغت ولا کلابا

تو تمام ملک میں رسوائی کا یہ عالم ہو گیا۔ کہ اگر لوگ اس قبیلہ کے کسی آدمی سے اس کا نام پوچھتے تو وہ نمیر کا نام چھوڑ کر کسی اوپر کی پشتوں کے نام بتاتا یہاں تک کہ آخرکار اس قبیلہ کا نام ہی دنیا سے محو ہو گیا

تاریخ شعر عرب اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے لیکن میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا ہندوستان میں بھی کوئی شاعر ایسا ہوا ہے جس نے ہمارے مصالح دینی، ہمارے روایات اخلاقی اور ہمارے شعائر قومی و ملی پر کوئی ہلکے سے ہلکا اثر چھوڑا ہو ——— پھر جب میرے ان تمام سوالوں کا جواب نفی میں دیا جاتا ہے تو خدا کیلئے مجھے بتایا جائے کہ اس یاوہ گوئی، اس ژاژ خائی، میں وقت ضائع کرنا کیا معنی رکھتا ہے غالب کا ایک

شعر ہے ؎ حیف کہ من بخوں تپم وز تو سخن رود کہ تو — اشک بدیدہ بشکری نالہ بہ سینہ بشکری

شاعر نے تو اسے اپنے مخصوص حالات محبت کے لحاظ سے کہا ہوگا لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اثر و تعبیر کے لحاظ سے ہندوستان کے ہر شاعر پر فرداً فرداً شاید ہی کوئی شعر اس سے بہتر طور پر منطبق ہو سکے

ہر ملک کی آب و ہوا کا خاص اثر ہوتا ہے، ہر قوم کی سیاسیات کا مخصوص اقتضا ہوتا ہے اور ہر زمین اپنی معیشت و معاشرت کے ماحول کے لحاظ سے ذہن انسانی کی تربیت کرتی ہے۔ ہندوستان جو ہمیشہ سے غیر ملکی تاخت کا مرکز بنا رہا یقیناً یہاں کے لوگوں میں کوئی جذبۂ حماست پیدا نہیں کر سکتا، اس لئے شاعری کا یہ قہرمانی عنصر جو دنیا میں انسان کو سکندر و رستم بنانے میں مدد دیتا ہے یوں ختم ہو گیا، لیکن مغلوبیت و مظلومیت سے جو کیفیت پیدا ہو سکتی تھی وہ ضرور انتہا کو پہنچ گئی اور نکبت و ذلت، انحطاط و ادبار قومی زندگی کا ایک ضروری جز و ہو کر رہ گیا حتیٰ کہ یہاں کا بہترین تغزل وہی مانا گیا جس میں سب سے زیادہ یاس و حرماں کا اظہار تھا۔ چنانچہ میرؔ کو خدائے متغزلین کہنے کی علت یہی ہے کہ ان سے زیادہ کسی نے اپنی بیکسی و بیچارگی، محرومی و مایوسی کا اظہار نہیں کیا۔ یہاں کی حماسی شاعری کا بڑا سرمایہ مراثی کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے لیکن آپ کسی بہترین مرثیہ گو کا کلام اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس کا قابل ذکر حصہ وہی ہے جہاں اس نے فریاد و شیون سے کام لیا ہے، ورنہ جہاں اس نے جوش مردانہ سے کام لینے کی کوشش کی وہیں وہ منہ کے بل آ رہا۔ یہاں تک کہ اگر وہ تلوار و اسپ کی تعریف کرتا ہے تو اس طرح گویا عروس کا حال بیان ہو رہا ہے۔ اور جب وہ حرب و دفاع کا حال بیان کرتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے بٹیروں کی پالی کا ذکر ہو رہا ہے۔

آپ مراثی کا تمام ذخیرہ ڈھونڈھ ڈالئے لیکن آپ کو عربی کے اس ایک شعر کا بھی جواب کہیں نہ ملے گا۔

کان مثار النقع فوق رؤسنا — واسیافنا لیل تہاوی کواکبہ

(یعنی میدان جنگ میں جو گرد و غبار سروں پر اٹ کر رہ گیا تھا تو اس میں تلوار کی چمک ایسی نظر آتی تھی جیسے رات کو ستارے ٹوٹ رہے ہیں)

اس کا سبب یہ ہے کہ وہاں کے لوگ جنگ کی حقیقت سے واقف تھے، قبائلی غیرت و خود داری ان کو ہمیشہ حرب و دفاع کے لئے آمادہ رکھتی تھی۔ اور یہ وہاں روز کا منظر تھا کہ اگر کوئی عورت وا تغلباہ کہہ کر ایک بار چیخ پڑی، تو سارا قبیلہ تلواریں سونت سونت کر باہر آ گیا۔ اور جب تک انتقام نہیں لے لیا واپس نہیں گئے۔ یہی وہ حقیقت تھی جو ان سے یہ شعر کہلوا دیتی تھی کہ۔

فآبوا بالرماح مکسرات — وابنا بالسیوف قد انحنینا

(وہ لوگ واپس گئے اس طرح کہ ان کے نیزے ٹوٹے ہوئے تھے اور ہم واپس پھرے اس حال میں کہ ہماری تلواریں خم ہو گئی تھیں۔)

اور اسی حقیقت کا فقدان تھا جو ہندوستان میں حماسی شاعری کو پیدا نہیں کر سکا حالانکہ اصل چیز یہی ہے

یہاں غزل گوئی کی کثرت و رواج کا سبب یہی ہوا کہ اس صنف سخن میں پوری طرح جی کھول کر درد و کرب کا بیان ہو سکتا ہے اور اس میں کلام نہیں کہ اس لحاظ سے یہاں کی قنوطی شاعری کا مقابلہ کوئی دوسری زبان مشکل سے کر سکتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ

اس سے ایک ملک یا قوم کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہے کہ ایک شخص اپنے مصائب جھیلنے کیلئے زیادہ صبر سے کام لینا سیکھ جاتا ہے اور اگر بستر مرگ پر ہے تو جان ذرا اچھی طرح سے نکلتا ہے لیکن کیا شاعری کا انتہائی مقصود یہی ہونا چاہیئے۔ اور صرف اسی لیے اس کو اختیار کرنا چاہیئے کہ ملک میں ایک جماعت "احدیوں" اور "مُردہ دِلوں" کی پیدا ہو جائے۔

اس وقت ملک جس دور سے گزر رہا ہے وہ یقیناً نہضت و ارتقاء کا آغاز ہے جسکی بنیاد سیاسی انقلاب پر قائم ہو رہی ہے، اس لیئے ہمارے شعراء کا ایسے زمانہ میں صرف "ہائے، وائے" کی آواز بلند کرنا، ملک کے مقاصد کو نقصان پہونچانا ہے۔ ضرورت ہے کہ لوگوں میں انکی پستی و نکبت کا احساس پیدا کرکے، انسانی غیرت و خود داری کو ابھارا جائے، اور چند دنوں کیلئے اس شغلِ بازی کو ترک کر دیا جائے، جس کا مدعی تو یہاں کا ہر شاعر ہے۔ لیکن حامل کوئی نہیں۔

میں غزل گو حضرات کی توہین نہیں کرتا۔ اور نہ انکی اہمیت کو کسیطرح کم کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ مدعا صرف یہ کہنا ہے کہ غزلگوئی کا صحیح زمانہ ایک قوم پر سو وقت آتا ہے۔ جب وہ انتہائی نکبت و ذلت تک پہونچ جائے، یا انتہائی عروج و ارتقاء کی حالت میں ہو۔ لیکن ہاں دونوں زمانوں میں بھی اسکی افادیت مشتبہ ہے۔ کیونکہ زوال کے دور میں وہ فنا کے حدود سے قریب تر کرنے والی ہوتی ہے۔ اور عروج کے زمانہ میں زوال کی خبر دینیوالی۔ اس لیئے کوئی وجہ نہیں کہ اس فطری استعداد و قوت سے کوئی بہتر کام نہ لیا جائے۔ اور وہ ملکۂ شعر جو صرف غزلگوئی میں صرف کیا جاتا ہے۔ ملک و قوم کی فلاح و صلاح کیلئے استعمال نہ کیا جائے

کیا وہ ہاتھ جو ماتم کیلئے اٹھتے ہیں، ان ہاتھوں سے جدا ہوتے ہیں، جو تیغ و تبر کا وزن اٹھاتے ہیں جب گھر میں آگ لگتی ہے تو اہلِ تدبیر گریہ و زاری میں وقت صرف نہیں کرتے۔ بلکہ پانی فراہم کرنے کیلئے دوڑ پڑتے ہیں پھر کیا ہندوستان کیلئے اس سے زیادہ نازک وقت کوئی اور آنیوالا ہے جب ہم اسکی خدمت کیلئے آمادہ ہونگے۔ اور کیا ہمارے شعراء پر مادرِ وطن کا کوئی حق نہیں ہے۔ جو ایسے نازک وقت میں ان سے طلب کیا جائے۔

اس وقت سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے اور جو مسلمانوں میں تقریباً مفقود ہے۔ وہ جذبۂ وطنیت ہے اسلیئے یہ ساعت زلف و عارض کے ذکر کی نہیں ہے۔ بلکہ اس غیرت و خود داری کو بیدار کرنیکی ہے جسکے فقدان نے ہمکو دنیا میں ذلیل و رسوا کر رکھا ہے۔

اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء　غالب، مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"سنو صاحب، شعراء میں فردوسی، فقراء میں حسن بصری، اور عشاق میں مجنون، یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر و پیشوا ہیں شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے، فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے، اور عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہمطرحی نصیب ہو.........."

اسی میں اگر اسکا بھی اضافہ کر دیا جائے کہ ایک صداقت پرست، ایک حق شناس اور ایک بے لاگ تنقید کرنیوالے کی انتہا یہ ہے کہ وہ کافر و مرتد بنا لیا جائے، ملحد و بیدین کے نام سے پکارا جائے، تو میرے لیئے اس سے زیادہ فخر کا موقع اور کیا ہو سکتا ہے کہ آج میں بھی اسی منزل میں ہوں جو کسی وقت فردوسی، حسن بصری، اور مجنوں کو اپنے اپنے فن میں نصیب ہوئی تھی، اور ناشکری ہوگی اگر اس سے زیادہ کوئی اور سعادت طلب کروں،

ما بہ جامے کہ زجم ماند قناعت کردیم　　بہ سکندر بدہید آنچہ ز دارا ماند،

آج سے کئی صدی قبل جب مذہب نام نفس و ضمیر کے سکون کا تھا جب قرآن کا مفہوم ایک مولوی کے مواعظ و ارشاد سے بلند تھا جب دین حنیف میں جبر و اکراہ کا ذرا سا بھی شائبہ گوارا نہ کیا جاتا تھا، اور جب عہد بنی عباس میں آزادی کے ساتھ ہر شخص کو اسلام کا صحیح مفہوم جاننے کیلئے جرح و تنقید کی اجازت تھی۔ اسوقت کفر و ارتداد کا مفہوم صرف یہ تھا کہ اصول اخلاق کو پس پشت ڈال کر انسانیت کی ترقی کو روک دیا جائے لیکن اب یہ معیار بہت بلند ہو گیا ہے اس قدر بلند کہ میں تو خیر کیا چیز ہوں اگر آج غزالی اور رازی زندہ ہوتے تو ان کا دامن بھی مولوی کے ہاتھ میں ہوتا اگر مولوی کی عبا اُن کے ہاتھ..... نہ آسکتی! غضب خدا کا! میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ خدا کی عظمت و جبروت، اور اس کی قوت و قدرت کا اس طرح قائل ہوں کہ شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ ہزار بار کہہ چکا کہ رسول کی صداقت و بلندی فطرت پر جسطرح میں ایمان لایا ہوں شاید ہی کوئی اور ایمان لایا ہو لیکن باوجود اس اقرار کے بھی میں کافر ہوں، ملحد ہوں، مرتد ہوں! پھر اگر اسی اقرار و عقیدہ کا نام کفر و الحاد ہے تو

نازم بہ کافری کہ بہ ایماں برابر است

لاؤ ساری دنیا کی بیدینی مجھے دیدو، تمام عالم کا ارتداد میرے حوالہ کر دو۔ اور کائنات کے ہر ہر گوشہ کا الحاد میرے قلب میں بھر دو کہ اس دولت کے ساتھ تو مجھے جہنم بھی اس فردوس سے زیادہ عزیز ہے جہاں ایک مولوی مسلمان کو کافر بنائے بغیر نہیں جا سکتا —— آہ

ایں چہ شور یست کہ در دور قمر می بینم!!

اس دوران میں ہندوستان کے مختلف مقامات سے زیادہ منظم طور پر میری بیدینی کے خلاف تبلیغ و اشاعت کی گئی، یہاں تک کہ بعض انجمنوں نے جو مقامی "مولوی جماعت" کے زیر اثر تھیں میرے اور نگار کے الحاد کو ناقابل برداشت قرار دے کر نگار کی خریداری سے لوگوں کو باز رکھنے کی کوشش کی، صوبہ بہار کے کوئی بزرگ مولوی عبد الحکیم یا حکیم الدین صاحب ہیں انھوں نے اپنے صوبہ کے اخبار اتحاد میں ایک خطیبانہ مقالہ کے ذریعہ سے ابناء وطن کو نگار کے فتنہ سے آگاہ کر کے اسکے مطالعہ کو حرام و ناجائز قرار دیا۔ یہانتک کہ ہمیں لکھنؤ میں بعض اکابر قوم و مذہب نے جلسہ کر کے یہ بھی ارادہ کیا کہ میری اس عارضی زندگی ہی کو ختم کر دیا جائے۔ بعض حضرات نے متعدد خطوط اس نوع کی تخویف و ترہیب کے بھی میرے پاس روانہ کئے۔ مقامی اخباروں میں روزنامہ ہمت اور ہفتہ وار سچ نے اس کار ثواب میں زیادہ اہتمام و توجہ سے حصہ لیا، الغرض اس دوران میں وہ سب کچھ ہوا جو صحافت و پروپیگنڈہ کی مدد سے ہو سکتا تھا لیکن میں نے ان تمام حملوں کے جواب میں صرف سکوت سے کام لیا کیونکہ ان تمام حضرات میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جسنے نگار کا بالاستیعاب مطالعہ کرنیکے بعد کوئی رائے قائم کی ہو۔ اور مجھے معلوم ہے کہ جو کچھ کہا جاتا ہے۔ یہ سب ظن و قیاس اور عوام کی افواہ کا نتیجہ ہے جو ہمیشہ بے معنی ہوا کرتی ہے یا پھر دیدہ و دانستہ کتمان حقیقت ہے اور..... میرے خلاف نا میری ہی تحریر کی غلط تعبیر جو ممکن ہے اصول جنگ کے لحاظ سے ان کی شرع متین میں جائز قرار دیدی گئی ہو جنھوں نے بمصداق "اس کا ثواب نذر کروں گا حضور کی" شاید میرے خلاف تبلیغ و اشاعت ہی کے ذریعہ سے ایصال فردوس میں ایک قصر تازہ کی تعمیر کا عزم راسخ کر لیا ہے

ہمارے مسٹر عبد الماجد صاحب دریابادی (زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا!) نگار کی الحاد پروری کا ذکر تو اکثر کرتے رہتے ہیں لیکن کیا کبھی کوئی ضعیف سی کوشش انھوں نے اس امر کی بھی کی ہے کہ وہ عصبیت سے علحدہ ہو کر میرے خیالات پر غور فرمائے اور پھر فیصلہ

کرے کہ میرا حقیقی مقصود، اسلام کی خدمت ہے یا اس کی تخریب و توہین۔ مجھے حیرت ہے کہ باوجود اینہمہ دعوائے ادبیت و تفلسف، تعصب و برہمی کے زیر اثر یہ بھی نہ غور کر سکے کہ جن مضامین کے اقتباسات وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر رہے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ انہیں سے انکی تردید ہوتی ہو۔ میر نگائی کے ذکا ہی مضمون میں خدا کے متعلق جو خیالات پریشان ظاہر کئے گئے ہیں وہ ایک دیوانہ یا مخبوط الحواس کی طرف سے ہیں جیسا کہ مضمون کی ابتدا میں ظاہر کر دیا گیا ہے اور مضمون سے جو نتیجہ پیدا کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ انسان خدا کو جو چاہے کہے جس اصول کے ماتحت چاہے مطالعہ کرے لیکن آخر کار وہ خدا ہے اور وہی کرتا ہے جو اسے منظور ہوتا ہے —— میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس "وانتم سکاریٰ" کو علیحدہ کر کے صرف "ولا تقربوا الصلوٰۃ" پیش کرنیوالی ذہنیت جناب عبدالماجد صاحب دریابادی کو کس مدرسہ میں زانوئے ادب تہ کرنے سے حاصل ہوئی ہے۔ اسی طرح انھوں نے دوزخ و جنت کے متعلق میرے خیالات کے سمجھنے میں غلطی سے کام لیا ہے اگو میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ غلطی قصد و ارادہ کے ماتحت تھی یا تعصب و نا انصافی کی بنا پر۔ میرا مقصود ان مضامین سے یہ تھا کہ جن غلط روایات کی بنا پر دوزخ و جنت کا مفہوم عام طور پر پیش کیا جاتا ہے وہ کس قدر مضحک اور اسلام کی شان کے منافی ہے۔ پھر جب تک کہ جناب دریابادی یا انھیں کی طرح کوئی اور حامی دین یہ نہ ثابت کر دے کہ واقعی دوزخ و جنت کا تعلق مادی لذات سے ہے، اسوقت تک میرے اُن مضامین کو توہین مذہب یا مخالفت اسلام کی صورت میں کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

یہ کہنا بھی سخت غلط بیانی ہے کہ میں امام بخاری کا مخالف ہوں۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ نہ صرف بخاری بلکہ تمام کتب احادیث بحالت موجودہ ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر کلیتہً اعتماد کر کے کسی مذہب کے اصول کو پیش کیا جا سکے علی الخصوص مذہب اسلام جو دنیا کا تنہا فطری مذہب ظاہر کیا جاتا ہے۔ کیا جناب دریابادی کے پاس اس امر کا کوئی ثبوت ہے کہ صحاح ستہ میں جتنی احادیث درج ہیں وہ واقعی وہی ہیں جو انکے جامعین نے فراہم کی تھیں اور ان میں بعد کو تدلیس و تحریف، حذف و اضافہ کچھ نہیں ہوا۔ یقیناً اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا ہے اس لئے میری مخالفت نہ امام بخاری سے ہے نہ انکے مجموعۂ احادیث سے بلکہ صرف اس خیال سے کہ کیوں بغیر تنقید کے ہر قول کو رسول اللہ سے منسوب کر کے مذہب اور رسول کی توہین کیجائے اور کیوں ایک ایسے شخص کو جو بغیر سمجھے ہوئے احادیث کو احادیث ماننے کیلئے تیار نہیں مذہب کا مخالف قرار دیا جائے۔ بخاری کے درس سے ترک مذہب کا درس اسی لحاظ سے کہا گیا کہ بہ حالت موجودہ اگر شروع سے لیکر آخیر تک تمام احادیث کو صحیح تسلیم کرنے پر انسان کو مجبور کیا جائے تو اس کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ یا تو وہ مذہب کا خیال ترک کر دے گا۔ اور اگر ایسا نہ کرے گا تو پھر وہ جس مذہب کا پیرو ہوگا اُسے اسلام تو کسی طرح نہیں کہہ سکتے اور جو نام چاہے اس کا قرار دے لیجئے

اسی طرح جناب عبدالماجد صاحب نے ۲۵ ستمبر کے سچ میں میرے خلاف اور جو الزامات قائم کئے ہیں وہ سب تحریف مفہوم کا نتیجہ ہیں۔ اور میرے مقصود سے بالکل علیحدہ۔ میں نے جن اکابر ملت کی طہارت و عصمت کی داستانوں کا ذکر کیا ہے۔ اُن سے مراد صرف آجکل کے بعض ایسے نام نہاد علمائے کرام ہیں جو صداقت کو محو کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اور جن کا باطن انکے ظاہر سے بالکل مختلف ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سلسلہ میں انھوں نے ابوحنیفہ وغیرہ کو کیوں شامل کر لیا، کیا عبارت کے سیاق و سباق سے وہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ میری مراد اکابر ملت سے کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اگست ۳۶ء کے ملاحظات میں اپنا ذکر دیکھ کر وہ بیتاب ہو گئے۔ اور فرط غضب میں

محض انتقام لینے کے لئے اُنھوں نے میرے فقرہ کا محل بدل کر خواہ مخواہ ایسے معنی پیدا کئے جو لوگوں کو مشتعل کر دینے والے ہوں۔

. . . .

. . . .

. . . .

پھر یہ سب کچھ جانے دیجئے میں مانتا ہوں کہ جو کچھ میں لکھتا ہوں یا جو مضامین «نگار» میں شایع ہوتے ہیں وہ یکسر الحاد و شرک ہیں۔ لیکن خدارا کبھی ان کا جواب دینے کی بھی تو سعی فرمائیے۔ میرے اضطراب کو تو دور کیجئے۔ بفرضِ محال یہ بھی مان لیجئے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ غیر مسلم ہونے کی حیثیت سے کہتا ہوں، تو کیا آپ کا فرض بہ حیثیت ایک مسلم ہونے کے یہ نہیں ہے کہ میرے شبہات کو دور کریں مجھے راہ راست پر لائیں۔ یا یہ فرض صرف اس طرح پورا ہو جاتا ہے کہ مجھے ملحد و مرتد بنا کر خدا کے حوالہ کر دیا جائے۔ اور نگار کے مطالعہ کو حرام قرار دیکر میری تاریک ذہنیت میں اور اضافہ کیا جائے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ یہ کس نوع کی خدمت اسلام ہے، یہ کس انداز کی تبلیغ ہے

تمام رسائل میں صرف معارف ہی ایک رسالہ ایسا ہے جو کبھی کبھی جواب دینے کی زحمت گوارا کرتا ہے۔ اور محض «کفر گری» کو ذریعۂ حرب و دفاع قرار نہیں دیتا، لیکن افسوس ہے کہ نگار میں جس نقطۂ نظر سے گفتگو ہوتی ہے۔ اس سے وہاں بھی اعتنا نہیں کیا جاتا اور اس لئے میری تشنہ کامیاں بدستور باقی رہتی ہیں

میرا دعوٰے یہ ہے کہ تمام مذاہب عالم میں، اسلام ہی صرف ایک مذہب ایسا ہے جو وقت و زمانہ کا ساتھ دینے والا ہے۔ اور یہی ایک تنہا مسلک ہے جس نے اخوت عامہ اور انسانیت کبریٰ کو منزلِ حقیقی قرار دے کر ساری دنیا کو اشتراکِ عمل کی دعوت دی، اور اسی اعتقاد و یقین کے ساتھ میں تمام اصول و شعائر پر نگاہ ڈالتا ہوں ——— یوں تو ایک مولوی بھی بظاہر یہی کہتا ہے کیونکہ جب تک وہ یہ دعوٰے نہ کرے مذہب اسلام کا امتیاز، اس کی تہہ گیری کیونکر ثابت ہو سکتی ہے، لیکن جس وقت اصول و عقائد، شعائر و عمل کا سوال آتا ہے تو پھر اس کا چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے۔ جو یقیناً کسی یزداں اسلام کا نہیں ہو سکتا

اسلئے اسوقت جو برہمی علمار کرام کی میرے خلاف ہے، اس کا سبب حقیقتاً یہ نہیں ہے کہ میں اسلام کا مخالف ہوں۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں کیوں انکے سامنے سر بسجود نہیں ہوتا، اور میں کیوں اسلام کو ان کے عقول کا پابند نہیں سمجھتا۔ جن حضرات نے نگار کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں اگر اسلام نام صرف یزداں پرستی کا ہے تو اس کے متعدد شواہد اس میں نظر آسکتے ہیں، لیکن اگر اسلام کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور ہے تو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ اب پھر کہتا ہوں اور فاش و برملا کہتا ہوں کہ میں ہرگز مسلمان نہیں ہوں اور نہ دنیا میں کوئی انسان مسلمان ہو سکتا ہے

آج زمانہ جس دور اضطراب سے گزر رہا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ پھر کوئی بت شکن نبی پیدا ہو۔ بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ کوئی مذہب شکن رسول آئے اور اس دنیا سے اس مذہبیت کی گرانباری کو دور کر دے جس نے دنیا کا امن و سکون غارت کر رکھا ہے۔ پھر اگر آپ

ایسے نازک وقت میں اسلام کی کوئی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں، اور اپنے اس دعوے کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کا نصب العین دنیا میں امن و سکون قائم کرنا ہے تو اس کی صورت وہ نہیں ہے جو آپ لوگ اختیار کرتے ہیں، بلکہ اس کی تدبیر یہی ہے کہ

یک دو نفس تالہ شو اندر دل دیوانہ برآ

اسلام کے چہرہ کو اُن تمام داغوں سے پاک کیجئے جنھوں نے اس کے اصلی خط و خال کو پوشیدہ کر رکھا ہے اور وہ حقیقی روحِ وہ بلند نظری، وہ فراخ دلی اور علوئے نگاہ پھر پیدا کیجئے جو اسلام کے عناصر ترکیبی تھے۔

اس وقت تک کہ آپ ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے مثلث، مثلاً صرف " بہ آواز دولاب مستی کنندہ " کو اپنا ایمان قرار دیے ہوئے ہیں، اور کسی کو اجازت نہیں دیتے کہ آپ کے ان حرکات مذبوحی پر جرح و تنقید کرے، اور آپ میں آکر شامل ہو، یقیناً آپ بالکل محفوظ ہیں اور کسی کو چون و چرا کی گنجائش نہیں۔ لیکن اگر آپ نے کبھی یہ دعوے کیا کہ آپ اپنے اصول کی تبلیغ بھی چاہتے ہیں تو پھر معاف کیجئے اس وقت آپ کا مجھے کافر و ملحد کہہ دینا، نگار کے خلاف لغو و غلط پروپاگنڈا قائم کرکے عوام میں ہیجان پیدا کر دینا، مفید مطلب نہیں ہو سکتا کیونکہ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اس وقت دماغ انسانی جس اضطراب میں مبتلا ہے، اُس کی تشفی آپ کے پروپاگنڈا سے نہیں بلکہ نگار ہی کے مطالعہ سے ہو سکتی ہے ——— پھر ممکن ہے کہ آج کا .... ماحول اس کی قدر نہ کرے لیکن ایک وقت آئے گا۔ جب نگار کے صفحات ہی میں آپ کو پناہ لینا پڑے گی۔ اور آپ کے پاس کوئی ذریعہ دفاع نہ ہوگا، مگر وہ جسے نگار اور صاحب نگار قائم کر چکا ہے۔ وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ کلام اللہ کے بعد جس مذہبی لٹریچر (یعنی مجموعۂ احادیث) کو اپنا مقصود بحث بنائے ہوئے ہیں اس نے اسلام کی جڑوں کو کس قدر متزلزل کر دیا ہے۔ عیسائیوں کے اعتراضات، آریوں کے حملے، اور تمام غیر مسلم اقوام کی نکتہ چینیاں کلام مجید پر اتنی منحصر نہیں ہیں جتنی احادیث پر اور حقیقت یہ ہے کہ آج تک ڈاکٹر تسڈل کی مشہور کتاب ینابیع الاسلام کا جواب ہمارے ہاں کسی بڑے سے بڑے عالم سے بن نہیں پڑا کیونکہ اس کے تمام اعتراضات کا بڑا ماخذ مجموعہ احادیث ہے اور آپ اس پر مجبور ہیں کہ جو واقعہ یا لفظ رسول اللہ سے منسوب کر دیا گیا ہے اُسے غلط نہ قرار دیں خواہ وہ کتنا ہی لغو و مہمل کیوں نہ ہو ——— یعنی یہ تو آپ گوارہ کر سکتے ہیں کہ مذہب کی بنیاد کھوکھلی ہو جائے، رسول اللہ کی توہین ہو جائے لیکن مجموعۂ احادیث پر آپ کبھی تنقید نہ ہوگی۔ اور اگر کوئی دوسرا اس کی جرأت کریگا تو اسے ملحد، بیدین، فتنہ نگار، اور خدا جانے کیا کیا کہیں گے۔ درانحالیکہ ان تمام الفاظ کا بہترین مصرف تو واضعین احادیث ہی کی ذات بابرکات ہو سکتی ہے۔

بہرحال میں ان تمام معذرت نگاریوں کے بعد بھی ہر وقت اپنے آپ کو ایک مبتدی طالب علم سے زیادہ نہیں جانتا۔ اور اس کے لئے تیار ہوں کہ ہندوستان کا کوئی ایک مولوی یا مولویوں کی کوئی بڑی سے بڑی جماعت مجھے سمجھا دے اگر میں غلطی پر ہوں، لیکن اس کا طریقہ شاید یہ نہیں ہے جو آپ لوگ اختیار کر رہے ہیں۔

میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ مذہبیات کے سلسلہ میں اس مقصود سے ہٹ جاؤں جس کا نام میں نے صرف معرفت انسانی رکھا ہے، اور خواہ مخواہ وہ الجھنیں عوام کے سامنے لے آؤں جو مجموعہ احادیث اور ہمارے علماء کرام کی تنگ نظری سے پیدا ہو گئی ہیں لیکن چونکہ اہل مذہب نے اب میرے خلاف کھلی ہوئی جنگ قائم کر دی ہے۔ اور مصلحت نہیں کہ خاموش رہوں —— اس لئے میں تمام علماء کرام کو چیلنج دیتا ہوں کہ اشاعت آیندہ سے جو سلسلۂ جدید بہ عنوان "اسلام دوسروں کی نگاہ سے" شروع ہوگا اس کا جواب دیں اگر ان کے امکان میں ہے اگر وہ اس میں کامیاب ہو گئے تو میں سمجھوں گا کہ ایک بڑی دینی خدمت اس طرح انجام ہو گئی اور ناکام رہے تو پھر دنیا خود جان لیگی کہ اسلام کا دشمن حقیقتاً کون ہے۔ وہ جو صاحب نگار کو کافر کہتا ہے۔ یا وہ جو کافر بن کر بھی خدمت دین سے باز نہیں آتا۔

نومبر ۱۹۳۱ء

منم کہ بر دل و دین خود اعتمادم ہست
بہ نیم غمزہ ہم ایں ہر دو رہائے دہم آں را
(غالب)

انسان کی زندگی میں بعض ساعتیں ایسی بھی آتی ہیں جب وہ محو خواب ہوتا ہے۔ لیکن انسانیت آپ ہی آپ بیدار ہوتی رہتی ہے، اس کے قوا بظاہر بیکار نظر آتے ہیں لیکن روح اپنا کام کرتی رہتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس کے جوارح ظاہری درد تکلیف میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن قلب و دماغ آہستہ آہستہ "سکون جاں" کی منزل سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسانیت پوری طرح آنکھ کھول کر مسکرانے لگتی ہے، روح ایک فاتحانہ مسرت کے ساتھ اچھل پڑتی ہے، قلب و دماغ نشۂ کامیابی و فتح سے سرشار ہو جاتے ہیں اور　　　　اور، پھر آخر کار خود انسان بھی چونک پڑتا ہے، اس کے اعضا بھی بیدار ہو جاتے ہیں اور وہ منزل سامنے آجاتی ہے جسے "آشتی جسم و روح" سے تعبیر کرنا چاہئے۔ اسی کا دوسرا نام دنیائے عمل ہے، اسی کو عالم تگ و دو کہتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جسے شاعرانہ زبان میں "شک زمیاں رفت و یقیں جلوہ کرد" سے تعبیر کرنا چاہئے۔

ابتدائے آفرینش سے لیکر تا ایندم، کرۂ ارض کی زندگی پر کوئی صدی، کوئی قرن، کوئی دن، کوئی ساعت، بلکہ میں تو کہوں گا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا ہے، جس میں قدرت کے اس نظام، فطرت کے اس اصول اور خدا کی اس نہ تبدیل ہونے والی سنت پر کشود کار کا انحصار نہ رہا ہو جواہر فرد اور قوت کا باہمی تعاون، مادہ کی مختلف صورتیں، ایتھر بلکہ ما ورا ایتھر میں عناصر آفرینش کا رنواۃ اور برقپاروں کی صورت اختیار کرنا، طبقات سحابیہ کا رفتہ رفتہ منجمد ہو کر مختلف کرون، سیاروں، چھوٹے چھوٹے ستاروں، چاندوں، اور شہاب ثاقب میں تبدیل ہو جانا۔ یہ کیا ہے۔ کیا یہ سب اسی بیداری کا نتیجہ نہیں، کیا مادہ کا تفاعل اسکی بیداری نہیں کیا برقپاروں کی گردش ان کا نشاط عمل نہیں، کیا آفتاب کے طلوع و غروب، چاند کے ایاب و ذہاب میں اس تبسم خداوندی کی جھلک موجود نہیں جس کے پرتو سے تمام ملکوتی قوتیں دفعتہً جگمگا اٹھتی ہیں

ابراہیم کی بت شکنی کیا اسی بیداری کا نتیجہ نہ تھی۔ موسیٰ کا فرعون کی قوت قہرمانی کے مقابل میں آجانا کیا روح و جسم کے

اتحاد کا نتیجہ نہ تھا، عیسیٰ کا صلیب پر چڑھ جانا کیا اس احساس کے علاوہ کچھ اور تھا، مہاتما بودھ کا شاہانہ جاہ و جلال کی زنجیروں کو توڑ کر پھینک دینا کیا کسی اور قوت کا کرشمہ تھا، رام چندر جی کی صحرا نوردیاں کیا کسی جذبۂ غیر روحانی سے متعلق تھیں۔ کرشن جی کی معرکہ آرائیاں کیا کوئی اور منظر پیش کرنے والی تھیں، کنفوشیوس کی ذات کیا کسی غیر صادق کیفیت کا مظہر تھی، زردشت کی زندگی میں کیا کسی اور شعلہ کی جھلک پائی جاتی تھی، سرزمین عرب سے پیدا ہونے والے سب سے بڑے انسان کا کوہ فاران پر چڑھ کر کفار عرب کو پیام خداوندی پہونچانا کیا کسی اور احساس کا نتیجہ تھا حسینؑ کی عظیم الشان قربانی کیا کوئی اور رسعداد عمل تھی۔ منصور کے ساتھ دار و رسن کا معاملہ بھی اسی عقدہ کی گرہ کشائی تھی، اور منصور کے حلقوم پر تیغ کی روانی بھی اسی حقیقت کا اعادہ تھا

لیکن جس طرح قدرت صدیوں تک محو خواب رکھنے کے بعد نوع انسانی کو بیدار کرنے کے لئے اسکے کسی ایک فرد کا انتخاب کر لیتی ہے، اسی طرح وہ یہ بھی کرتی ہے کہ وہ قرنوں تک بیدار رکھنے کے بعد دوبارہ آہستہ آہستہ نیند طاری کر دیتی ہے۔ پھر تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی قوم کے لئے یہ نیند موت کی نیند میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے فنا اور کبھی یہ نیند پھر ایسی بیداری اختیار کر لیتی ہے جیسے مردہ میں از سر نو جان پڑ جائے

کہا جاتا ہے کہ اصلاح کی بنیاد انسان کے جہل سے شروع ہوتی ہے اور علم کی روشنی میں اس کا اختتام ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ جو چیز جہل کے دور کرنے کے لئے آئے گی اس کی ابتدا عہد تاریک ہی سے ہوگی اور یقیناً جب علم کی ترقیاں انسانی دماغ کو منور کر چکیں گی تو دور اصلاح ختم ہو جائے گا اگر اس کا مقصود انسان کو کسی محدود منزل تک پہونچا کر ٹھہر جانا ہے لیکن اگر کوئی خیال دنیا میں ایسا ہے یا ہو سکتا ہے جس کے دائرۂ عمل سے تعین منزل کا سوال خارج ہے یا جس نے لانہایت کو اپنی تگ و دو کا جولانگاہ مقرر کیا ہے یا جس کا مدعا عقول انسانی کو ہر وقت اور ہمیشہ منور کرتے رہنا ہے یعنی اگر کوئی تعلیم ایسی ہے جو اخلاق ہی کی ترقی کو منتہائے نظر قرار دیتی ہے، جس کی دعوت عالم انسانی کے ہر ہر فرد کو ایک شیرازہ سے وابستہ کر سکتی ہے اور جو تمام ظاہر پرستیوں سے بلند ہو کر انقیاد فطرت کا مفہوم صرف روح کے جھک جانے کو.... قرار دیتی ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ علم و حکمت کی ترقی کے ساتھ ایسی تعلیم کو ختم ہو جاتا ہے

میں سمجھتا ہوں کہ جہانتک تعلیم اخلاق کا سوال ہے اسوقت تک جتنی اصلاحیں دنیا میں بروے کار آئیں ان سب کا مقصود ایک ہی تھا سب نے یہی تعلیم دی کہ اچھے کام اچھے اور برے کام برے ہیں، لیکن اس تعلیم کے عملی پہلو کے لحاظ سے جو اصول و قواعد انھوں نے مقرر کئے وہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے ضرور مختلف تھے اور انھیں مختلف ہونا چاہئے تھا، کیونکہ ان کا عقول انسانی کے مطابق ہونا ضروری تھا، اور عقول انسانی کی ترقی ہمیشہ سے جاری ہے اور رہے گی۔ لیکن جس وقت ہم تقابلاً ان کا مطالعہ کریں گے ان کے مقاصد تعلیم اور ان کے اصول اصلاح اور ان کے اس پیغام پر غور کریں گے جو انھوں نے نوع انسانی تک پہونچایا

تو ہم کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ان تمام تعلیمات میں صرف ایک ہی تعلیم ایسی ہے جس کے نصب العین کی بلندی ازل سے لیکر ابد تک تمام کائنات کا احاطہ کر لینے والی ہے اور جس نے اگر ایک طرف اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ تعلیم دی کہ نوعِ انسانی کے تمام افراد کو ایک ہی مرکز پر جمع ہو کر ابنائے جنس کی خدمت کرنا چاہئے تو دوسری طرف علوم کی ترقی کے لحاظ سے اس نے تمام مظاہر فطرت کو انسان کے تصرف میں دے کر گویا یہ بتا دیا .... کہ انسان حقیقتاً نام ہے اسی قوتِ عمل کا جو لانہایت تک برابر اسباب ترقی کا ساتھ دیتی چلی جائے۔ یقیناً اصلاحی تحریکوں کی تاریخ ارتقاء میں یہ تبلیغ ایک آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے اور زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے اس کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتا

اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی ، حقیقی پیام یہی ہے جو بیان کیا گیا تو دنیا کے افراد اس کے ماننے سے کیوں احتراز کرتے ہیں اور اس کے متبعین کے زوال و انحطاط کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔ غیر جماعتیں اس سبب کو اس کی تعلیمات میں ڈھونڈھتی ہیں اور میں اس کی تاریخ میں پاتا ہوں یعنی وہ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ شاید اس کے اصول تعلیم ہی ایسے ناقص و نامکمل ہیں کہ اس کے متبعین زمانہ کا ساتھ نہ دے سکنے کی وجہ سے پستی کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں اور میرا دعوےٰ یہ ہے کہ اس انحطاط کا سبب ہی یہ ہے کہ انھوں نے تعلیم کی اصل روح کو نظر انداز کر دیا جس کے بہت سے اسباب تاریخ میں مل سکتے ہیں۔

جس وقت آپ نوعِ انسان کی ذہنی یا اخلاقی ترقی کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ جب تک کسی قوم یا جماعت کا کوئی مصلح ان کے اندر موجود رہتا ہے ایک عام انقیاد و اطاعت اور اقدامِ عمل کے سوا کوئی صورت اختلاف کی پیدا نہیں ہوتی، لیکن جس وقت وہ اُٹھ جاتا ہے تو رفتہ رفتہ قوائے عمل کی حرکت مضمحل ہونے لگتی ہے اور اسی کے ساتھ اختلاف آرا پیدا ہونے لگتا ہے جو اجتماعی روح کے لئے سم قاتل سے کم نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اخوت و ہمدردی، عدل و مساوات کا جذبہ ضعیف ہو کر ملوکیت و استبداد کی بنیاد پڑنے لگتی ہے اور انسانی برتری کا معیار اخلاق نہیں بلکہ جاہ و ثروت، دنیاوی نمود و نمایش قرار پا جاتا ہے اور آخر کار ہر ہر فرد خود غرضی، نفسانیت اور ذاتی آسایش جسم و جاں کو زندگی کا حقیقی مقصود سمجھنے لگتا ہے۔ یعنی ایک وقت تو وہ ہوتا ہے جب روئے زمین پر ہر سانس لینے والے انسان کے سامنے تعلیم اخلاق و اصلاح پیش کی جاتی ہے اور ہر شخص آزادی کے ساتھ سوچنے سمجھنے کے بعد شمع یقین اپنے دل میں روشن کرنے کے لئے آزاد ہوتا ہے اور پھر دوسرا وقت وہ آتا ہے جب خود اپنے افراد کو بھی اس کے اندر پناہ لینے کی جگہ نہیں ملتی۔ اور اپنی کمزوریوں، اپنی نا اہلیوں کا اندیشہ اس قدر غالب آ جاتا ہے کہ ان کا ذکر سننا بھی گوارا نہیں ہوتا، یہی وہ منزل ہے جس کی طرف غالب نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ

ناروا بود بہ بازارِ جہاں جنسِ وفا
رونقے گشتم و از طالعِ دکاں رفتم

یہی سبب ہے کہ آج ہماری قومی و اجتماعی حیات، ہماری مذہبی و اخلاقی زندگی، ہمارا اقتصادی و معاشرتی نظام، الغرض ہماری ہر ہر چیز خواہ وہ کسی شعبۂ حیات سے متعلق ہو اور کسی نظام زندگی سے وابستہ بالکل ویسی ہی ہے جیسے اندھوں کی وہ نزاع تنقیدی جب ان میں سے ہر ایک نے ہاتھی کے مختلف اعضاء کو ٹٹولنے کے بعد اس کی ماہیت کا اندازہ لگایا، اور ہر ایک نے اپنی جگہ اپنے آپ کو سچا باور کرکے دوسرے کو برا بھلا کہنا شروع کیا، درانحالیکہ ہاتھی کی حقیقت کو ان کے اعتقاد و یقین سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔

آج جس چیز کو ہم یقین کی صورت سے پیش کر رہے ہیں وہ محض وہم و گمان ہے، آج جن باتوں کو ہم حقایق و مسلمات کہکر بیان کر رہے ہیں وہ صرف مزخرفات و ترہات ہیں۔ دنیا نئی ہے اور اس کے اصول نئے، زندگی نئی ہے اور اس کے ایمان و عواطف نئے، پہلے سانس لینے کا طور اور تھا، اب جینے کی راہیں اور ہیں، اب سے ایک صدی قبل جو انسان پیدا ہوتا تھا اب نہیں پیدا ہوتا اور پہلے عقل انسانی کے جو جو خانے مقفل نظر آتے تھے، اب بالکل کھلے ہوئے ہیں، ذہن و دماغ جن زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے وہ اب ٹوٹ رہی ہیں، فراست انسانی آزاد ہے، اور اب اسی شخص کو یہاں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے، جو آزادی کے ساتھ سوچ سکتا ہے، جو آزادی سے بول سکتا ہے، جس نے آزادی ہی کے لئے مرنا اور جینا اپنا شعار قائم کر لیا ہے، اور جو دنیا کی آزاد فضا میں آزادانہ مسرور سانس لے رہا ہے۔

پھر کیا انسان کی یہ مسرت اس لئے ہے کہ وہ مذہب و اخلاق کی بندشوں سے چھوٹ کر بہیمانہ اخلاق اختیار کرنے کے لئے آزاد ہو گیا ہے۔ کیا یہ جذبۂ سرور اس بناء پر ہے کہ خونخواری و درندگی سے باز رکھنے کیلئے اس کے ناخن و چنگال کو قطع کرنے والی قوت کوئی باقی نہیں رہی — نہیں یہ مسرت صرف اس لئے ہے کہ آج بالکل پہلی مرتبہ وہ خدا کو بے نقاب دیکھ رہا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جس نے آزادی کی پوجا کی اس نے خدا کی پرستش کی کیونکہ قدرت کا یہی وہ مظہر ہے جو انسان کو انسان اعلیٰ (Superman) یا خدا کا نائب و خلیفہ بنا دینے والا ہے۔

اے بہ خلاد ملا خوئے تو ہنگامہ ترا
با ہمہ در گفتگو، بے ہمہ در ماجرا

دسمبر ۱۹۳۱ء

اے خدا، اُس وقت بھی کہ قرون مظلمہ کی دنیا تجھے صرف غصہ کی آگ برسانے والا دیوتا سمجھ رہی تھی، مجھے تیرے دونوں ہاتھ لطف و رافت کے پھولوں اور عطوفت کے ہاروں سے لدے ہوئے نظر آتے تھے

اول دن سے میں ڈرایا جا رہا تھا کہ میں نے ایسا کیا تو، تو خفا ہو جائے گا، ایسا نہ کیا تو، تو برہم ہو کر مجھے آگ میں ڈال دے گا، لیکن میں نے تجھے قلب کی گہرائیوں، اپنی روح کے اعماق میں ہمیشہ مسکراتے ہی دیکھا

——— ٹھیک اس وقت کہ لوگ تیرے غصہ کے اندیشہ سے کانپتے ہوتے تھے، میں تیری محبت تیری شفقت کے حضور میں سکون کے ساتھ تیری تعریف کے گیت گایا کرتا تھا۔ وہ روتے تھے میں ہنستا تھا، وہ تیرے سامنے جھکتے تھے تجھ سے ڈر کر، اور میں تیرے حضور میں سر بہ سجود ہوتا تھا تیری محبت سے بیتاب ہو کر۔

دلے دارم خراب از التفات چشم بیمارت
ہمہ از جور می ترسند من از لطف بسیارت

ایک زمانہ گزر گیا کہ اس کارگاہ عالم میں، اُن کا خوف اور میری محبت دونوں اسی طرح متوازی چلتے رہے۔ نہ ان میں یہ جرأت کہ میری محبت کی آنکھوں سے تیرے تبسم درخشاں چہرے کا نظارہ کرتے، نہ مجھ میں اس کا ہوش کہ ان کے آئینہ خوف میں تیری پیشانی کی شکنوں کو دیکھتا ——— دن گزرتے گئے، آفتاب کے طلوع و غروب کے نہ جانے کتنے مناظر میرے دل میں، تیرے حسن مجرد کے نقوش قائم کرتے رہے، چاند کے عروج و زوال کی مختلف منزلوں میں تو ہی ہر جا نظر آتا ہے کہ میں نے تجھے کس کس آن میں دیکھا، بہار و خزاں کی متضاد کیفیات میں، کسے خبر ہے کہ میں نے تیری شیریں نکہت کو کس کس طرح سونگھا، دریاؤں کی روانی میں، پہاڑوں کے سکوت میں، آبشاروں کے شور میں جنگل کے سناٹے میں، قصر دولت کے مخملیں فرش پر، غربت زدہ جھونپڑوں کی بوسیدہ چٹائیوں پر، خواجگان کبار کی جبین ابرو میں، کاسبان ضعیف کی عرق آلود پیشانی میں، امیروں کے زرکار لبادوں میں، کسانوں کے تار تار کرتوں میں، الغرض بے اعداد و شمار سے باہر، بے زمان و مکان کی قید سے آزاد میں نے ہر جگہ تجھی کو کارفرما دیکھا اور جہاں دیکھا

شفقت و رافت کے لاکھوں پھول برساتا ہوا

میں حیران تھا کہ دنیا والے تجھ سے ڈرتے کیوں ہیں، محبت کیوں نہیں کرتے، تیری ہیبت کیوں اُن کے دلوں پر طاری ہے، تیری رحمت سے الفت کرنے پر کیوں مجبور نہیں ——— اس حال پر بھی ایک زمانہ گزر گیا اور میں خاموش پروانہ وار تیری شمع حسن کا طواف کرتا رہا ——— ایک دن ناگہاں تجھ سے ڈرنے والوں میں سے ایک ڈرنے والا میرے پاس آیا اور بولا کہ "چل ہمارے معبد میں ہمارے خدا کی جستجو کر" میں بولا "تمہارا معبد تمہارا خدا! کیا وہی معبد جسے آسمان کا صاعقہ، زمین کا زلزلہ مسمار کر دیتا ہے کیا وہی خدا جس کے تصور کی ابتدا خوف و ہراس سے ہوتی ہے مجھے نہ یہ چاہیئے نہ وہ ——— میرا معبد میرے دل کے اندر ہے جسے کوئی چیز تباہ نہیں کر سکتی میرا خدا میری روح کے اندر محبت کا زریں نقاب ڈالے ہوئے جگمگا رہا ہے ———

پھر ایک طویل زمانہ گزر گیا اور ایک بے آب و گیاہ قطعۂ زمین سے رونما ہونے والی ہستی نے مجھ سے کہا کہ چل ہماری پرستش گاہ میں" خدا کی پرستش کر ——— میں نے پوچھا وہ پرستش گاہ کیسی ہے اور وہ خدا کیسا

ہے "جواب لا" وہ معبد کسی مکان میں مقید نہیں بلکہ انسان کے ہر سجدہ کے ساتھ از خود پیدا ہوتا ہے — اور وہ خدا ایک سر محبت و شفقت ہے جو میرے ذریعہ سے تمام دنیا کے بسنے والوں کو اپنی رحمت کا پیام دینا چاہتا ہے ——

میں فرطِ مسرت سے اچھل پڑا۔ لاکھوں برس کے انتظار کے بعد وہ آواز کان میں آئی جسکے لئے روح بیتاب اور دل دیوانہ تھا —— میں نے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدیا اس کے سامنے اپنا دل ڈال دیا۔ اس کے دامن سے اپنا دامن باندھ دیا —— اس نے مسکرا کر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور میری ہستی اس کی ہستی کا ایک جزو ہو کر سکون کے شیریں خواب میں محو ہو گئی۔

ہر بات کے کہنے کا ایک محل ہوتا ہے، ایک مخصوص ہستی ہی اس کو کہہ سکتی ہے اور مخصوص زبان میں دنیائے اثر و تاثر میں، کامیابی کا انحصار انھیں تین چیزوں پر ہے اور اگر ان میں سے کسی ایک چیز کی بھی کمی ہوئی تو سمجھ لو کہ ناکامی یقینی ہے ——— میخانہ میں ایک رند کی طرف سے صلاح و تقویٰ کی گفتگو ویسی ہی بے معنی ہے، جیسے مسجد میں ایک زاہد مرتاض کی جانب سے دعوت جام و سبو۔ نہ اس طرح وہاں حلقۂ تسبیح و تہلیل قائم ہو سکتا ہے اور نہ یہاں بزم نشاط برپا۔ بالکل یہی حال روح انسانی کے ان رازوں کا ہے جو وقتاً فوقتاً زبان پر بے اختیارانہ آجاتے ہیں لیکن ان میں بعض ایسے ہوتے ہیں جو صرف محراب و منبر ہی میں کہے جا سکتے ہیں اور بعض وہ جو —

بر دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

اس لئے اگر کوئی شخص محراب و منبر سے جدا رہنا چاہتا ہے تو وہاں کی بات باہر کیوں کہے اور جو دار پر چڑھا دئیے جانے سے ڈرتا ہے وہ اس کے راز کو کیوں منہ سے نکالے۔

دنیا اس دور آزادی میں مذہبی پابندیوں، اخلاقی بندشوں سے علیٰحدہ ہو کر محض اپنے ذہن و دماغ کی پرستش کرنا چاہتی ہے، صرف اپنے سمجھے ہوئے اصول اخلاق کی پابندی پسند کرتی ہے، لیکن جس طرح عالم کا نظامِ اجتماعی اس انفرادی سرکشی کو برداشت نہیں کر سکتا، اسی طرح یہ "ذہنی انفرادیت" بھی اب آسانی سے انقیاد و اطاعت قبول نہیں کر سکتی ——— یہ ہے وہ عظیم الشان جنگ، جو اس وقت انسانوں کے قلوب کو غیر مطمئن بنائے ہوئے ہے، جس نے ذہنی توازن کے سکون کو تباہ و برباد کر رکھا ہے اور کون کہہ سکتا ہے اس کا نتیجہ استردادِ "حیوانیت" کی صورت میں ظاہر ہو گا یا قیامِ "انسانیت کبریٰ" کی شکل میں —

قانون انسانی کا اقتدار و اثر انسان کے صرف ظاہری اعضاء تک محدود ہوتا ہے لیکن خدائی قانون دلوں پر حکومت کرتا ہے۔ اس لئے یہ اضطراب کسی ملکی آئین سے دور ہو نہیں سکتا اس کا علاج اگر کوئی ہے تو وہی ضابطۂ خداوندی جو خوف و جبر سے نہیں بلکہ محبت و رافت کے ساتھ سب کو ایک مرکز پر

جمع کرنا چاہتا ہے اور انفرادی اغراض کو دل سے نکال کر، اجتماعی فلاح کی بنیاد پر، روح انسانی کو رواداری کے درد اور ایثار کے جذبہ سے معمور کر دیتا ہے ——— پھر آج ہے کوئی مذہب ایسا جو دنیا کے اس دماغی، روحانی، اور اخلاقی ہیجان پر قابو حاصل کرسکے —— کوئی نہیں —— آپ کو معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوگا —— اخلاقی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی، مذہبی بندشیں یکسر فنا ہو جائیں گی، درندگی و خونخواری کا نام تہذیب انسانی قرار پائے گا۔ ہر فرد کا ہاتھ دوسرے فرد کے خون سے رنگین نظر آئے گا، اور آخر کار جب انسان تھک کر خستہ و درماندہ ہو کر ہانپنے لگے گا، ایک جگہ گر پڑے گا، تو افق سے ایک روشن ستارہ طلوع کرتا ہوا اسے نظر آئے گا جس کی روشنی اسے راحت و سکون معلوم ہوگی جس کی تیز کرنیں اس کے بکھرے ہوئے اعضاء اور زخمی ہاتھ پاؤں پر مومیائی کا سا کام کریں گی اور افراد نوع انسانی پھر ایک بار اسی کے درخشاں فضا میں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوں گے —— اور یہی ہے وہ حقیقت جس کو غالب نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ —— ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں —— پھر یہ بات نہ خرابہ و منبر کی ہے کہ مجھ سا رند معصیت کوش اسے نہ کہہ سکے، نہ حدیث دار و رسن ہے کہ میرا ضعیف قلب اس کے اظہار سے خائف ہو۔ یہ ایک ایسے واقعہ کی پیشین گوئی ہے جس کو میری نگاہیں ابھی سے دیکھ رہی ہیں۔ اور ہر چند اس وقت میں نہ ہوں گا، لیکن جو ہوگا وہ دیکھ لیگا کہ آخر کار نوع انسانی اس ایک مرکز پر جمع ہو کر رہی جسے آج کل کی اصطلاح میں نہیں بلکہ مستقبل کی اصطلاح میں سچے مذہب کے نام سے پکاریں گے کیونکہ وہ عبارت ہوگا محض انسانیت سے جس کی سب سے پہلے اسلام نے دعوت دی اور آخر میں بھی وہی اس کو انجام تک پہونچانے والا ثابت ہوگا۔

دنیا میں کوئی چیز بذات خود نہ بری ہے نہ اچھی۔ اس کے اچھائی یا برائی کا تعلق اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس کا استعمال کیا جائے۔ پھر اگر اس سے خیر و فلاح کا کام لیا جاتا ہے تو اس کی تعریف کی جاتی ہے، ورنہ برائی۔ ایک زنگ خوردہ لوہے کا ٹکڑا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، لیکن اگر اسی سے زخم پہونچایا جانے لگے تو لوگ اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں گے۔ تیغ و تفنگ اپنی جگہ بے حقیقت چیزیں ہیں۔ لیکن ان کے استعمال کی تاریخ اس قدر خونین ہے کہ لوگ اس کو دیکھتے ہی خائف ہو جاتے ہیں۔ درانحالیکہ اگر ان سے انسان کا خون نہ بہایا جاتا۔ تو آج لوگوں کو یہ یقین کرنے میں بھی تامل ہوتا کہ بندوق کی گولی انسانی سینہ کے اندر داخل ہوسکتی ہے۔ اور تلوار کی دھار انسان کے اعضاء کو قطع کرسکتی ہے۔ بالکل یہی حالت دنیا کی ان تمام تحریکوں کی ہے جن کو اصلاح نوع انسانی اور قیام امن و سکون کے لیے بروئے کار لایا گیا۔ جب تک ان سے مقصد اصلاح پورا ہوتا رہا لوگ متوجہ رہے اور جب ان کی حقیقی روح مفقود ہوگئی تو لوگوں نے

ان سے روگردانی اختیار کر لی اور وہ مردہ ہو کر رہ گئیں ——— دنیائے اصلاح اخلاق میں سب سے بڑا مرتبہ مذہب کا سمجھا جاتا ہے۔ یعنی کوئی تحریک دنیا میں قیام امن و سکون کے نام سے ایسی پیش نہیں کی گئی جس کا نام مذہب نہ رکھا گیا ہو۔ لیکن جب آپ اس کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ مذاہب عالم خواہ اپنی تعلیم کے لحاظ سے کتنی ہی امن پسند کیوں نہ ہوں، لیکن تاریخی حیثیت سے، ان کی خونریزیاں، خون آشامیاں، نوع انسانی کے مصائب کی نہایت دردناک داستانیں ہیں۔ یقیناً اس سے زیادہ حیرتناک امر اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو مذاہب یہ دعوےٰ کرتے ہیں کہ وہ دنیا سے قتل و غارت گری وحشت و درندگی مٹانے آئے ہیں اور دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انھیں کے متبعین نے دنیا میں خونریزیاں کیں اور مذاہب ہی کا نام لے لے کر قتال و جدال کا بازار گرم کیا گیا ——— یقیناً ایک سوچنے والے دماغ کے لیے یہ مسئلہ بڑی الجھن پیدا کر دینے والا ہے اور وہ حیران رہجاتا ہے کہ اس سے وہ کس نتیجہ پر پہونچے آیا یہ کہ مذہب کا خیال ہی دنیا میں ایک لغو خیال ہے یا یہ کہ واقعی دنیا نے مذہب کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ——— اس حقیقت پر نگار کے صفحات میں بار بار روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ مذہب کا خیال بالکل فطری چیز ہے۔ اور نوع انسانی کی ترقی کے لیے کسی ایسے نظام کا قائم ہونا جو امن و سکون کی بقا اور اخلاق کے قیام کا ضامن ہو، خود انسان کی فطرت کا اقتضا تھا خواہ اس کا نام مذہب رکھا جاتا یا کوئی اور ——— اس لیے اس پر بحث کرنا صرف لفظی نزاع ہوگی کہ اس کا نام مذہب کیوں رکھا گیا کسی اور نام سے کیوں نہ موسوم کیا گیا۔ بہر حال فی نفسہٖ مذہب کی ضرورت یا اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لیے لامحالہ ہم کو دوسری صورت پر غور کرنا پڑے گا کہ کیا واقعی دنیا نے مذہب کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ——— لفظ مذہب کا مفہوم طریق حیات یا طریق عمل ہے جو اپنی جگہ کس قدر معصوم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب ہم اس کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ یہی معصوم لفظ دنیا میں کتنی خونریزیوں اور معصیت کوشیوں کا سبب بنا اور وہی چیز جس کو پیام امن و نجات کی صورت سے ہمیشہ پیش کیا گیا۔ اس نے کتنا ہنگامہ فتنہ و فساد عالم میں برپا کیا۔ لیکن آپ جس وقت جنگوں کی حقیقت پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت تک حقیقتاً دنیا میں کوئی ایک جنگ بھی ایسی نہیں ہوئی جسے مذہب کے نفس العین سے منسوب کیا جا سکے یا کسی مذہب نے اسے روا رکھا ہو۔ بلکہ تمام لڑائیاں صرف ہوس ملک گیری کی بنا پر قائم ہوئیں۔ یا خود غرضی یا نفسانی خواہشات پر۔ پھر یہ تو ہوا کہ بعض اہل مذہب نے محض مدافعت و حفاظت کے لیے واقعی خلوص و صداقت کے ساتھ اسلحہ اٹھائے، لیکن جارحانہ جنگ کوئی ایسی نہیں ہوئی جسے مذہبی ضرورت کی صورت میں پیش کیا جا سکے۔ تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں کہ اس نے اپنی عسکریت کی نمائش اسی وقت کی جب مدافعت و حفظ نفس کے خیال نے ان کو اس کے لیے مجبور کر دیا، یا طاغوتی قوتوں نے دنیا کے امن و سکون کو خراب کرنا چاہا، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ دنیاوی اغراض کے لیے اسلام نے

کسی کا خون بہایا ہو، پھر جب حقیقت یہ ہے تو کیا انسانی خود غرضی اور نفس پرستی کی اس سے زیادہ کوئی مکروہ مثال مل سکتی ہے کہ اس نے جنگ تو کی ہمیشہ اسباب عیش و تنعم فراہم کرنے کے لئے، جاہ و ثروت، دولت و حکومت کی خواہش پورا کرنے کی غرض سے، دشمنوں سے قبائلی و ذاتی عناد کا انتقام لینے کے لئے، لیکن منسوب کیا اسے مذہب سے اور مذہب ہی کا نام لے لے کر اس نے ہمیشہ لوگوں کی جانیں لیں ——— تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مذہب کا ابتدائی دور ہمیشہ اس نوع کے جذبات سے صاف و پاک رہا ہے۔ لیکن جب بعد کو اسمیں ایک جماعت دنیا پرست لوگوں کی پیدا ہوئی تو جنگ و جدال کشت و خون سبھی کچھ ہوا، اور لوگوں نے غلطی سے اسکو مذہب کی تعلیم سے منسوب کیا۔ پھر جب حقیقت یہ ہے تو خدا کیلئے آج باہم نوع انسانی کے افراد میں مذہبی تفریق کو عنوانِ جنگ نہ بناؤ اور مذہب کو بدنام نہ کرو۔ کیونکہ مذہب پیام امن و سکون ہے اور وہ فساد کو کبھی پسند نہیں کرتا۔ اسلئے میرے نزدیک سب سے زیادہ مضرت رساں تحریک دنیا میں وہ ہے جو قومیت اور وطنیت کے رشتہ کو مذہب کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اور بڑا ظالم تھا وہ جسنے اول اول اس بدعت کو رواج دیا۔ آج ہندوستان اسی لعنت میں گرفتار ہونے کی وجہ سے ہنوز غلام نظر آرہا ہے۔ درآنحالیکہ اس سے بہت چھوٹے چھوٹے ملک کبھی کے آزاد ہو کر ترقی کی راہ پر لگ گئے ہیں۔ غضب خدا کا کسی ایک ملک میں رہتے ہوئے صدیاں گزر جائیں، وہاں کی آب و ہوا کا اثر یکساں طور پر سب کے مذاق و مزاج پر ہوتا چلا آرہا ہو۔ ایک ہی قسم کی بہار و خزاں میں ایک زمانۂ نامعلوم سے یکساں طور پر زندگی بسر ہو رہی ہو، لیکن پھر بھی بیگانگی کا یہ عالم کہ باہم مل کر کھانا بھی نہ کھا سکتے ہوں محبت و رافت کے ساتھ ایک رات بھی کسی جگہ نہ بسر کر سکیں۔

مذاہب کا شعائر و مراسم کے لحاظ سے مختلف ہونا عیب نہیں لیکن انکی وجہ سے باہم دگر نفرت و احتراز، بغض و عناد، پیدا ہونا یقیناً مذاہب کی توہین ہے۔ کیونکہ یہ کھلی ہوئی ہلاکت نوع انسانی کی ہے۔ اور دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جسکا مقصد انسان یا انسانیت کو ہلاک کرنا ہو اسلئے ہمکو شرم کرنا چاہیئے کہ ہم مذہب کا کتنا غلط استعمال کر رہے ہیں اور انسانیت کی قربانی اپنے اغراض نفسانی کے دیوتا پر چڑھا کر اسے مذہب کا خراج سمجھتے ہیں۔

دسمبر ۱۹۲۹ء کون کہتا ہے انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے کیا اسلئے کہ وہ اپنی مقابل جنس سے محبت کرتا ہے۔ مگر یہ فطرت کی مجبوری ہے یا اپنی خواہش کی تکمیل کا اقتضا ——— کیا اسلئے کہ وہ اپنی اولاد پر شفقت و رافت صرف کرتا ہے۔ لیکن وحشی سے وحشی درندہ بھی اس جذبہ سے خالی نہیں کیا اسلئے کہ وہ اپنے ابنائے جنس کے ساتھ نرمی و لطف سے کام لیتا ہے۔ مگر شاید صرف اس لئے کہ وہ اپنے ساتھ بھی کسی سلوک کی توقع رکھتا ہے۔ تم فطرت انسانی کا مطالعہ خواہ کسی پہلو سے کرو، اسکی خود غرضی، اسکی ناحق کوشی، اور اسکی حرص و ہوا پرستی اسکی زندگی کے ہر ہر لمحہ اور اسکے اعضاء کی ہر ہر جنبش سے وابستہ پاؤگے۔ یہاں تک کہ وہ خدا کی عبادت بھی کرتا ہے تو صرف اس طمع سے کہ وہاں اسکو حوریں ملینگی، کوثر و تسنیم ملینگے۔ اور ہر وہ چیز ملیگی جو اس دنیا میں اسکو میسر نہیں آسکتی۔

عالم طفلی سے لیکر عہد انحطاط تک کوئی دور زندگی کا ایسا نہیں ہے جسمیں انسان کی اس فطری خصوصیت کی جھلک نمایاں طور پر پائی

جائے اور اس قدیم حیوانیت کے علامات ہمیں نظر نہ آئیں جن کا ثبوت ماہرین علم تشریح بعض انکے اعضا سے دیتے ہیں اور ڈارون کا قانون ارتقاء یقیناً انسان نام نہ اسکے اعضاء کا ہے۔ اور نہ ان خصوصیات کا جو اسکے محض ایک جاندار چیز ہونے کے ثبوت میں پیش کیجا سکتی ہیں بلکہ انسان کا بہترین تشخص اساسی وہی ہے جو کائنات کی سب سے زیادہ روشن دکمل الہامی کتاب نے بتایا ہے۔

"انی جاعل فی الارض خلیفہ" ۔ وعلم آدم الاسماء کلھا۔ اسلئے آیئے آجکی صحبت میں اجمالاً استخلاف فی الارض اور حقیقت علم پر ایک نگاہ ڈال لیں کیونکہ میرے نزدیک تمام اخلاق کی اساس اور فلسفۂ مذہب کی بنیاد اسی پر قائم ہے۔

خلافت سے مقصود ربانی کیا ہے اور اس خلافت کی غایت کیا ہے؟ بظاہر یہ بحث بہت طویل الذیل گفتگو کا مقتضی معلوم ہوتا ہے لیکن خدا نے جسطرح تمام فلسفۂ حیات کو نہایت آسان و مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے اسیطرح خلافت انسانی کے مسئلہ کو بھی بہت واضح و صاف طور پر ظاہر کر دیا ہے ارشاد ہوتا ہے:۔ وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصلحٰت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم۔

(یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے کام کئے انکو زمین میں اپنا قائم مقام بنائیگا جیسا کہ اس سے قبل کے لوگوں کو عطا فرمایا گیا) نہ صرف اس آیت میں بلکہ اکثر مقام پر جہاں استخلاف کا ذکر کلام مجید میں آیا ہے اسی کے ساتھ ارض کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) قال عسیٰ ربکم ان یھلک عدوکم ویستخلفکم فی الارض فینظر کیف تعملون۔

(۲) ولو نشاء لجعلنا منکم ملٰئکۃ فی الارض یخلفون۔

(۳) ثم جعلناکم خلٰئف فی الارض من بعدھم لننظر کیف تعملون

اس سے ظاہر ہے کہ یہ استخلاف یہ خلافت اسی زمین سے متعلق ہے، اسی دنیاوی حیات سے تعلق رکھتی ہے اور یہی عالم کے کاروبار سے متعلق ہے جکو دوسرے مقامات پر وراثت ارضی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۱) ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون

(۲) ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین

(۳) وقالوا الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ واورثنا الارض نتبوأ من الجنۃ حیث نشاء فنعم اجر العاملین۔

پھر کسی جگہ وراثت ارض کیساتھ عبادی الصالحون کا ذکر ہے کسی جگہ متقین کا بیان ہے اور کہیں عاملین کیطرف اشارہ ہے یعنی خلافت خداوندی نیابت الٰہی یا وراثت ارضی کے حصول کا ذریعہ صرف یہی ہے، کہ انسان اچھے کام کرے، ترقی کے لئے جد وجہد کرے، دنیا میں امن وسکون کو رواج دے اور اپنے استقلال واستقامت سے شیطانی قوتوں، طاغوتی لشکروں اور اخلاقی بغاوتوں کا مقابلہ کرے۔

پھر اسی کے ساتھ سورۂ احقاف کی اس آیت کو ملاحظہ فرمائیے۔

فھل یھلک الا القوم الفاسقون (کیا سوائے فاسق قوم کے کوئی اور قوم ہلاک ہو سکتی ہے۔) اور غور کیجئے کہ ان تمام آیات کے مفہوم کو مربوط کرنے سے کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔

پہلے ارشاد ہوا کہ "میں زمین میں اپنا قائم مقام، اپنا نائب پیدا کرنا چاہتا ہوں جس کا نام انسان ہے"

پھر بتایا گیا کہ خلافت سے مراد یہ ہے کہ "وہ زمین کا وارث ہو، وہاں حکومت کرے، امن وسکون پھیلائے،

ترقی کی راہیں نکال کے خدا کی پیدا کی ہوئی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھائے۔ رات دن محنت و عمل میں لگا رہے اور حیات دوام حاصل کرے اس کے بعد فیصلہ کن الفاظ میں بتا دیا گیا کہ جب تک انسان ان باتوں پر کاربند رہے گا وہ برابر ترقی کرتا رہیگا، کیونکہ خدا کا دستور یہی ہے کہ وہ صرف ان قوموں کو ہلاک کرتا ہے جو فاسق ہیں، باغی ہیں، اور خدا کی ودیعت کی ہوئی قوتوں سے کام نہ لے کر کفرانِ نعمت کا ارتکاب کرتی ہیں۔

یقیناً ترقی سے مراد مادی ترقی نہیں ہے محض صنعت و حرفت، دولت و تجارت، جاہ و ثروت، کی ترقی مقصود نہیں ہے، لیکن اسی کیساتھ کلام مجید سے یہ بھی ثابت نہیں کہ وراثت ارضی سے مراد نکبت و ذلت اور عسرت و افلاس ہے۔ اس لیے وہ قومیں جو اس وقت دنیاوی حیثیت سے ترقی یافتہ نظر آتی ہیں باوجود انتہائی انحطاط اخلاق کے بھی، ایک لحاظ سے اپنے آپ کو یرثہا عبادی الصالحون کے ماتحت میں لاسکتی ہیں۔ لیکن وہ جن کے پاس نہ دولت ظاہری ہے۔ نہ دولت اخلاق اور ہلاک ہو رہی ہیں اپنے آپ کو فہل یہلک الا القوم الفاسقون سے کیونکر علٰحدہ کرسکتے ہیں۔

کیا کوئی بڑے سے بڑا مولوی یعنی خدا کا کوئی بڑے سے بڑا خلیفہ اس کا جواب دے سکتا ہے۔

علم کی تعریف خدا نے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔ ولا تقف ما لیس لک بہ علم۔ ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسئولا۔

یعنی ہر اس چیز کو نہ مان لیا کرو جس کا تمہیں علم نہ ہو اور علم کی حقیقت اس طرح سمجھ لو کہ تمہارے کان، تمہاری آنکھ اور تمہارا قلب ان میں سے ہر ایک جواب دہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ تم کرتے ہو وہ پوری طرح سوچ سمجھ کر اطمینان قلب و نفس کے ساتھ کرتے ہو یا محض دوسروں کے کہنے سننے سے۔

یہ ہے تفسیر و تشریح علم آدم الاسماء کلہا کی۔ علم اسماء سے مراد حقائق اشیاء کا علم ہے اور علم بھی وہ جس کا ذکر اوپر کیا گیا، پھر اب انسان کے مسئلہ خلافت فی الارض اور حقیقت علم دونوں کو سامنے رکھ کر غور کرو کہ اسلام کی صحیح تعلیم کیا ہے۔ اور اسی کو معیار قرار دے کر فیصلہ کرو کہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے ہم کو کیا کرنا چاہیے کہ کھوئی ہوئی وراثت ارض حاصل ہو سکے۔

میں نے ہمیشہ اس امر کی تبلیغ کی ہے کہ اسلام سے زیادہ وسیع النظر، قریب الفہم، آزاد خیال اور وسیع آغوش رکھنے والا مذہب کوئی نہیں ہو سکتا، اس نے کوئی چیز ایسی پیش نہیں کی جو مذہب کے دائرہ کو تنگ اور محدود کر دینے والی ہے، بلکہ اس نے دوسرے مسلک والوں کے ساتھ بھی رواداری کا اظہار کیا ہے جس کی نظیر دنیا کا کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ اس نے دوسرے مذہب کے انبیاء و اکابر کی عزت کرنے کا درس دیا ہے، اس نے دیگر اقوام کی کتب مقدسہ کا احترام کیا ہے

اس نے لکل اجل کتاب کا سبق دیا ہے، اس نے لکل قوم ہاد کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے، وہ علی الاعلان معترف ہے اس امر کا کہ "ان من امۃ الا خلا فیہا نذیر" اور نہایت صاف صاف یہ بھی بتا دیا ہے کہ لکل امتہ رسول اللہ پھر جب حقیقت یہ ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام جو اس اصول کے ساتھ تمام دنیا کو دعوت دے رہا ہے اور جو اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتا کہ تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا۔ کیوں نہیں سارے عالم پر چھا جاتا اور کیوں نہیں دنیا اس مرکز پر آجاتی جسے اسلام نے صرف انسانیت اور اخوت عامہ سے تعبیر کیا ہے۔ اگر اس راز کی حقیقت معلوم کرنا ہے تو اسلام کی تعلیمات کو نہ دیکھو کہ وہ تو ہمیشہ سے بے لاگ ہیں، کلام مجید پر غور نہ کرو کہ اس میں بھی کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، بلکہ صرف اس جماعت کی تاریخ کا مطالعہ کرو جو اپنے آپکو عالم دین ہادی طریقت، اور مرشد و رہبر کہتی ہے کہ اس نے ہمیشہ اپنے اغراض نفسانی کیلئے تعلیمات مذہب کو مسخ کر کے پیش کیا اور آج بھی عالم انسانی اس طاغوتی قوت کا مجروح نظر آتا ہے۔ وہ تم کو اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ کلام مجید پر غور کرو، حالانکہ خدا نے علم و یقین کے باب میں تعقل قلب کو بھی ذمہ دار بنا دیا ہے۔ اس کا دعوی ہے کہ منشاء ایزدی کو صرف اسی نے سمجھا ہے حالانکہ علم آدم اسماء کلہا میں تمام افراد نوع انسانی شامل ہیں۔ وہ تعلیم دیتا ہے کہ مسلمان بننے کیلئے صورت بدلو، لباس بدلو، خاص وضع اختیار کرو، مخصوص طریق حیات کے پابند ہو، درانحالیکہ خدا نے یہ شرط نہیں رکھی، وہ مومنین کی صفا مسلمانوں کو انتم الاعلون کے لقب سے یاد کرتا ہے، لیکن ان کا تقاضا یہ ہے کہ محکوم رہو، غلام بنو، دوسروں کے دستگیر بنے رہو۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مذہب کا تعلق صرف درستی اخلاق سے ہے، لیکن یہ گروہ کہتا ہے کہ مذہب نام ہے قومیت کا، سیاست کا، اور ہر اس چیز کا جس سے حقیقتاً مذہب کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر آج جبکہ اس جماعت نے ہمارے تمام نظام مذہبی کو درہم برہم کر رکھا ہے، سب سے پہلے سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان کب تک آنکھ بند کر کے انکے مواعظ و ہدایات کو وحی آسمانی سمجھتے رہیں گے اور کس حد تک وہ بانی اسلام اور اسکی توہین کو گوارا کریں گے۔ وقت آگیا ہے کہ لوگ ہشیار ہو جائیں اور انکے اقتدار کے بار گراں سے اپنی گردنوں کو آزاد کر لیں کیونکہ جب تک "یہ حجاب کثیف" درمیان ہے باقی ہے امت مسلمہ کبھی منزل مقصود تک نہیں پہونچ سکتی۔

شہوانیات

یا

تاریخ اقتشاء

زیر طباعت ہے اور مارچ ۱۹۳۳ء کے اوّل ہفتہ میں شائع ہو سکے گی۔ قیمت کا اندازہ معہ محصول عا کیا جاتا ہے

خریداران نگار کو معہ محصول صرف عا میں ملیگی۔

"منیجر نگار"

باب الاستفسار

(بہ سلسلۂ ماسبق)

جوشؔ ملیح آبادی اور ان کی بعض حرکات مذبوحی

گزشتہ ماہ کے باب الاستفسار میں علی اختر اور جوشؔ کی شاعری پر جو اظہار خیال کیا گیا تھا وہ حقیقتاً صرف تمہیدی ذکر تھا اس تفصیل و تشریح کا جس کے بیان کو میں فی الحال ملتوی رکھتا اگر تنقید مذکور کی اشاعت پر جناب جوشؔ کی بعض حرکات مذبوحی مجھے اس سلسلہ کو برابر جاری رکھنے پر مجبور نہ کر دیتیں۔

قبل اس کے کہ میں اصل مدعا کی طرف آؤں بطور مقدمہ چند ایسے واقعات کا اظہار ضروری ہے جن سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ میری تنقید جناب جوشؔ کے لئے کیوں اس درجہ تلخ و ناگوار ثابت ہوئی۔

یہ حقیقت شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ جوشؔ اس بلند سطح کے شاعر نہیں ہیں جو "ستائش و صلہ" یا "داد تحسین" کی منزل سے گزر کر صرف اپنے "احساس شاعرانہ" پر مست و بیخود رہا کرتے ہیں۔ بلکہ ان کا شمار اُن ادنیٰ سطح کے شاعروں میں ہے، جو اپنی شاعری کو ذریعہ "عزت و شہرت" سمجھ کر ہمیشہ ایک خاص پروپاگنڈا میں مصروف رہتے ہیں اور اگر کوئی چیز ان کی ان تبلیغات لاتحصیٰ کے عمل میں کبھی حائل ہو جاتی ہے تو ان کے کرب و تکلیف کا وہی عالم ہوتا ہے جو ایک سود خوار مہاجن کا جب وہ اپنی رقم کو ڈوبتا ہوا محسوس کرے۔ — حیدرآباد پہونچنے سے قبل جن جن ذرائع سے انھوں نے اپنی شاعری کی نمائش کی ان کا اظہار اس وقت ضروری نہیں لیکن حیدرآباد جا کر انھوں نے جو طریق کار اپنی نمود و شہرت کے قائم رکھنے کیلئے اختیار کیا اس کا مختصر بیان یقیناً ضروری ہے کیونکہ وہ اس داستان کی ایک ضروری کڑی ہے۔

اب سے تقریباً ۹،۱۰،۱۱ سال قبل جب جوشؔ صاحب عماد الملک مرحوم کے نام ڈاکٹر اقبال کی تحریر سفارش لیکر حیدرآباد پہونچے تو ایک شاعر ہی کی حیثیت سے وہ روشناس ہوئے اور چونکہ شاعر ہونا ان کی جملہ ادبی حیثیت کو مستلزم ہے اس لئے ان کے لئے کسی ایسی ہی خدمت کی جستجو ہوئی جو "ادب و انشا" سے تعلق رکھتی ہو اور اس طرح آخر کار وہ دار الترجمہ میں ادبیات انگریزی کی مترجم کی حیثیت سے نوکر ہو گئے۔ جوشؔ لاکھ بر خود غلط انسان ہوں لیکن یہ ممکن نہیں کہ خدمت مفوضہ کی اہمیت و دشواری کے مقابلہ میں اپنی نااہلیت کا علم نہ رہا ہو، کیونکہ وہ شخص جس نے انگریزی زبان کا مطالعہ اسکول کی چند ابتدائی کتابوں سے زیادہ نہ کیا ہو، جو عربی فارسی کا کوئی علم نہ رکھتا ہو اور جو اردو میں ایک فقرہ بھی سنجیدہ و شایستہ نثر کا نہ لکھ سکتا ہو، ظاہر ہے کہ وہ انگریزی ادبیات کو اُردو میں کیونکر منتقل کر سکتا ہے۔ اس لئے انھوں نے اس کمی کو صرف اپنی شاعری کے پروپاگنڈا سے پورا کرنا چاہا اور کوشش کی کہ ان کی شاعری کا اثر وہاں کے

لوگوں پر اس درجہ قائم ہو جائے کہ ان کی اہلیت ملازمت کا سوال اگر کبھی اُٹھے بھی تو بے نتیجہ رہے، چنانچہ انھوں نے وہاں کی ہر ادنیٰ و اعلیٰ صحبت و مشاعرہ میں جا جا کر، لوگوں کے گھروں پر پہونچ پہونچ کر راستہ چلتے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اور تہذیب کی مسند نشین سے لیکر مہتری کے آستانہ تہذیب تک ہر جگہ اپنی شاعری کی نمایش شروع کر دی۔ ظاہر ہے کہ پانی مسلسل میں رہنے سے بھی پتھر پر اپنا نشان چھوڑ جاتی ہے چہ جائیکہ انسانی کوشش، کوئی وجہ نہ تھی کہ اس تبلیغ و اہتمام کا کوئی اثر نہ ہوتا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتے۔ پھر چونکہ تحفظ شہرت میں ہمیشہ مسابقت کا کھٹکا انسان کو لگا رہتا ہے اسی لئے جوش صاحب نے اپنی کارگاہ عمل کو صرف بیجا نمود و نمایش ہی کی حد تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اسی کے ساتھ انھوں نے وہ بھی کیا جو ہر ناقص و نااہل کا شعار رہا ہے یعنی انھوں نے دوسروں کی برائیاں بھی شروع کر دیں اور اپنے تفاخر کو وہ اس حد تک کھینچ لے گئے کہ ایک طرف خود اپنے استاد جناب عزیز لکھنوی پر نکتہ چینیاں شروع کر دیں تو دوسری طرف اپنے محسن ڈاکٹر اقبال کو ایک جھک مارنے والے "شاعر" سے زیادہ حیثیت دینا انھوں نے گوارا نہ کیا حالانکہ فن شعر میں جو علم و مرتبہ عزیز و اقبال کو حاصل ہے وہ جوش کو سو بار مر مر کر جینے کے بعد بھی میسر نہیں آسکتا۔

اتفاق سے ان کے حیدرآبادی حلقۂ احباب میں جس سے وہ اپنی شاعری کی داد حاصل کیا کرتے تھے ایک شاعر علی اختر بھی تھے، جو باعتبار زمانہ ہر چند جوش سے متقدم تھے، لیکن دنیا ان سے واقف نہ تھی کیونکہ وہ نہ پروپگنڈا کے فن سے آگاہ تھے، اور نہ وہ اپنی شاعری کو ذریعۂ شہرت قرار دینا پسند کرتے تھے۔ مخصوص صحبتوں میں یہ بھی جوش صاحب کو اپنی نظمیں سنایا کرتے تھے اور جوش صاحب کی ظاہری "واہ واہ" کو انتہائی خلوص پر محمول کر کے خوش ہو لیا کرتے۔ اسی حال میں ایک زمانہ گذر گیا اور جوش صاحب سرزمین دکن میں "انا ولا غیری" کا دم بھرتے رہے۔ لیکن چونکہ قدرت دنیا میں کسی استبداد کو زیادہ عرصہ تک گوارا نہیں کر سکتی اس لئے وہ وقت آیا کہ فطرت نے کبر و غرور کا سر نیچا کرنے کے لئے اسباب فراہم کرنا شروع کر دیے اور غالباً ۱۹۲۸ء میں مولانا ہوش بلگرامی نے اول بار مجھے ذریعۂ تحریر جناب علی اختر کی شاعری کی طرف متوجہ کیا اور ان کی ایک نظم بھی روانہ کی۔ یہ واقعہ ہے کہ مشکل ہی سے کوئی نظم میری توجہ اپنی طرف مائل کر سکتی ہے لیکن علی اختر صاحب کی اس نظم میں، میں نے ایک خاص سنجیدگی و متانت پائی، اور میں نے مختصر الفاظ میں اس کی داد دیتے ہوئے نگار میں شایع کر دیا اور علی اختر صاحب کو متوجہ کیا کہ قدرت کی اس ودیعت کو وہ رایگان نہ جانے دیں اور ملک میں اپنے خیالات کی اشاعت کریں کہ اس وقت ضرورت اسی نوع کی شاعری کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے نگار میں مسلسل نظمیں لکھنا شروع کر دیں اور پھر گذشتہ چار پانچ سال کے اندر ملک کے اکثر جراید و رسایل میں ان کے افکار شعری شایع ہونے لگے۔

اول اول تو جوش صاحب نے علی اختر کے ظہور کو معمولی بات سمجھا، لیکن جب رفتہ رفتہ لوگوں کے دل و دماغ اس طرف زیادہ متوجہ ہوتے نظر آئے تو ان کا نشہ اُترا، اور انھیں اندیشہ پیدا ہوا کہ یہ زبردست ٹکر کہیں

اپنی جگہ سے انھیں متزلزل نہ کردے۔ درانحالیکہ علی اختر کی شاعری کوئی کاسۂ گدائی نہ تھی کہ بھیک کی تقسیم کا اندیشہ جوش صاحب کو اس کے توڑ دینے پر مجبور کر دیتا لیکن وہ آتش رشک و حسد جو ہمیشہ ایک غیر کامل الفن شخص میں بہت جلد بھڑک اٹھتی ہے، جوش صاحب میں مشتعل ہو کر رہی اور تمام تعلقات مودت و خلوص کو بالائے طاق رکھکر انھوں نے علی اختر کے خلاف لوگوں سے یہ کہنا شروع کیا کہ "ان کی شاعری کی بنیاد تو صرف میری نظموں کا سرقہ و اخذ ہے" اسی کے ساتھ انھوں نے یہ کوشش بھی کی کہ ایک پمفلٹ کے ذریعہ سے یہ پروپاگنڈا کیا جائے، چنانچہ جوش صاحب خود ایک جگہ سے نگار کی گزشتہ جلدیں اسی غرض سے لیگئے لیکن بعض احباب کے مشورہ سے یہ خیال ترک کر دیا گیا۔ علی اختر صاحب کو مختلف ذرائع سے یہ خبریں پہونچتی رہتی تھیں، لیکن وہ کبھی اس کا یقین نہ کرتے تھے کہ جوش سے ایسی منافقانہ حرکت سرزد ہو سکتی ہے۔ الغرض جوش صاحب کے اس پروپاگنڈا کو بھی کافی زمانہ گذر گیا اور اس کا اثر یہ ہوا کہ جب میں گذشتہ اکتوبر میں حیدرآباد پہونچا تو متعدد حضرات نے مجھ سے زبانی و تحریری استفسارات اس باب میں کئے اور میں نے نومبر ۱۹۳۱ء کے نگار میں مختصراً ان استفسارات کا ذکر کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ دسمبر میں اپنے خیالات علی اختر اور جوش کی شاعری کے متعلق ظاہر کروں گا۔ اس خبر کا شائع ہونا تھا کہ جوش صاحب کے ایوان شاعری میں ایک زلزلہ سا محسوس ہوا اور منجملہ اور بہت سے وسائل دفاع کے ایک ذریعہ انھوں نے یہ بھی اختیار کیا کہ میری تنقید شائع ہونے سے قبل ہی وہاں کے ایک مقامی اخبار (صبح دکن) میں جس کے اڈیٹر کو جناب جوش کے "ہم پیالہ" ہونے کا فخر حاصل ہے، قیل و قال کے عنوان سے ایک غیر متین نوٹ شائع کرا دیا جس میں مجھ پر بہت سے حملے کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا تھا کہ

(۱) اس وقت تک حیدرآباد میں کوئی سوال علی اختر و جوش کی شاعری کے تقابل کا پیدا نہیں ہوا اس لئے اڈیٹر نگار کا اس مسئلہ کو چھیڑنا صرف اس لئے ہے کہ دو دوستوں کے درمیان منافرت پیدا کی جائے۔

(۲) اگر کوئی شخص اس تقابل کا خیال بھی کرے تو نادانی ہے کیونکہ علی اختر کا جوش کے مقابلہ میں نام لینا ہی درست نہیں میں نے اس نوٹ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، کیونکہ مجھے تو اعتماد تھا اپنی تنقید پر جو دسمبر کے نگار میں آنے والی تھی اور سمجھتا تھا کہ اس نوع کے "قیل و قال" سے کیا وہ پتھر ہٹایا جا سکتا ہے جس کے اندیشہ نے جوش صاحب کو اس قدر سراسیمہ کر رکھا ہے۔

آخر کار دسمبر کا نگار شائع ہوا اور اس کے دیکھنے کے بعد جو جو مذبوحی حرکات جوش صاحب سے سرزد ہوئیں وہ ایک مستقل بیان کی محتاج ہیں۔ سب سے پہلے تو انھوں نے میری ہجو میں ایک نظم لکھی جس میں مجھے "بدشعار" "بدخصال" اور "پولیس کا مُشتَبِل" وغیرہ کے مہذب الفاظ سے یاد کیا گیا تھا لیکن افسوس ہے کہ اس نظم کی اشاعت کی جرات اُن کو نہیں ہوئی، اور پھر اس خیال سے کہ کہیں یہ سلسلۂ تنقید ان کی شاعری کو اور زیادہ بے نقاب نہ کر دے، انھوں نے علی اختر صاحب کو ایک تحریر بھیجی جس میں اپنے انتہائی خلوص کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے احتراز کرنے کی ہدایت کی تھی۔ مدعا یہ تھا کہ

علی اختر صاحب خود مجھے اس سلسلے کو ختم کر دینے پر مجبور کریں لیکن چونکہ جوش صاحب کے صحیح خط و خال علی اختر صاحب پر بالکل ظاہر ہو چکے تھے اس لئے یہ آخری حربہ ان پر کارگر نہ ہوا اور علی اختر صاحب نے وہ تحریر میرے پاس بھیج دی جو بجنسہٖ ذیل میں درج کی جاتی ہے :-

میاں لڑکے تم کن ہاتھوں میں کھیل رہے ہو، ان ہاتھوں کو تمھیں مس کرنے کا کوئی حق نہیں، یہ ہاتھ ناپاک ہیں۔ اچھے بچے، تم اس گود سے اتر آؤ، یہ کھلائی بڑی علامہ ہے، تمھیں بڑی بڑی باتیں سکھاوے گی، ——— سنتا ہوں تم اس مضمون سے بہت خوش ہو، پھولے نہیں سماتے، اس مضمون کے کھلونے کو تم لئے لئے پھرتے ہو، "دیکھو ہمارا اچھا اچھا کھلونا، اتا نے دیا ہے" اور کھیلتے کھیلتے اکثر منہ میں بھی رکھ لیتے ہو۔ استغفر اللہ، تم جانتے ہو یہ ساری اچھل کود کس بات کی ہے؟ میاں آنکھیں کھولو، یہ تمھاری محبت نہیں، میری عداوت ہے، جسے حُبِّ علی سمجھے ہوئے ہو، وہ بغضِ معاویہ ہے، سمجھے؟ میری ننھی سی جان! سمجھے؟

ارے یہ مضمون۔ یہ مضمون، توبہ توبہ، لکھنے والے نے اتنا بھی انتظار نہیں کیا کہ جوش پر آیا ہوا غصہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے تو لکھوں، ورنہ مضمون کی غایت ہی مفقود و معدوم ہو جائیگی، کیا اہلِ دنیا اتنے اندھے ہیں کہ اس مضمون کی روح تک آن کی آن میں نہ پہنچ جائیں گے۔ اور کان کھڑے کرکے یہ سوال نہ کریں گے کہ یہ دیوانے کو کس نے چھیڑ دیا ہے کہ غصے میں چیخیں مار رہا ہے،

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اس مضمون میں عناد کی آگ بھڑکی ہوئی ہے، سطریں غصے سے اکڑی اکڑی ہیں، الفاظ کا منہ تمتمایا ہوا ہے، دائرے کف در دہاں ہیں، اور کششیں، بارِ غیظ سے دُہری ہوئی جاتی ہیں۔

اس مضمون کی علت یہ ہے کہ (۱) اس خطا پر کہ میں صاحبِ مضمون کو حقیر و فرومایہ سمجھتا ہوں، مجھے نظروں سے گرا دیا جائے (۲) میری اور تمھاری جدائی ہو جائے، یہ دوسری مدعا شاید تمھاری سمجھ میں نہ آئے اسلئے کہ تم اس بے پایاں خباثت کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ بعض لوگوں کو دو دوستوں میں نفاق ڈال دینے سے مزا آتا ہے،

میاں اختر، تم جانتے ہو میں تمھارا ہمیشہ سے مداح رہا ہوں، میں تمھارے شاعرانہ جوہروں کا دل سے قدرداں ہوں، اور ہمیشہ ہونگا میں تمھارا ہوں، تم میرے ہو، ——— اچھے بچے! یہ تحریر جا کر صاحبِ مضمون کے منہ پر مارنا، جوش کی یہ تحریر ہے، وہ مجھ سے جدا نہیں ہو سکتا ہم اتنے لونڈے نہیں کہ ایک کو ایک پر ترجیح دینے سے ہم قلانچیں مارنے لگیں، ہپ ہپ ہرا کرنے لگیں۔ شاعری ان مہمل مضمون بازیوں سے بہت بلند ہے، اگر شاعری کسی کی ابھر رہی ہے تو کوئی قوت اسے گرا نہیں سکتی، چاند چمکتا رہتا ہے، کتے بھونکتے رہتے ہیں، البتہ اگر کسی کی شاعری ہی کمزور ہے تو تمام دنیا کی تعریفیں اسکے لئے بیکار ہیں، اسے گرنے سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ صاحبزادے تمھیں مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا، میں کبھی تمھارا مقابلہ نہیں کرونگا، خاک کھاؤں، دھول کھاؤں، کیا بھانجے کو کھا جاؤں، کیا میں اُس پیٹ سے ہی گیا گذرا ہوں،

نیاز مند جوش "نابغۂ دوم"

ارے ہنسی کے مارے دم نکلا جاتا ہے "نا بغہ" نابغۂ اُف کوئی گدگدائے ڈالتا ہے، ارے مرا مرا مرا، یہ غیبی آواز کہاں سے آرہی ہے، دیکھو کوئی افیونی تو جاں بحق تسلیم نہیں ہو رہا ہے،

آپ نے دیکھا یہ ہے تحریر اُس شاعر اعظم کی جو اپنی ادبیت و انشاء کا اتنا زبردست پروپاگنڈا دنیا میں کر رہا ہے۔ یہ ہے عبارت اس شخص کی جو حیدرآباد ایسی عظیم المرتبت و مردم شناس ریاست کی ایک علمی اکاڈیمی میں تصحیح عبارت و درستی انشاء کے لئے "ناظر ادب" کی حیثیت سے مامور ہے، یہ ہے انداز بیان اس فاضل بے بدل کا جو دقیق ترین علوم و فنون کی کتابوں کا ترجمہ درست کرنے کے لئے متعین ہے، اور یہ ہے شاہکار اُس ادیب جلیل کا جس کی فصاحت و بلاغت سے متمتع ہونا جامعۂ عثمانیہ ایسی عظیم الشان درسگاہ کے "شعبۂ تصنیف و تالیف" کے لئے ازل سے مقسوم ہو چکا تھا

اس تحریر کی سنجیدگی و متانت کا مرتبہ اس سے بہت بلند ہے کہ اس پر اظہار رائے کیا جائے اور نہ جوش صاحب کی طرح بغیر صدورجہ مجبوری کے ذاتیات میں پڑنا میرا شعار ہے۔ البتہ اگر انھوں نے اسی قسم کے خیالات ظاہر کرنیکی جرأت پھر کبھی کی تو پھر بیشک میں آزاد ہوں گا اور جوش صاحب کو اس وقت سے ڈرنا چاہئے جب میں اپنی تمام معلومات ان کی حیدرآبادی زندگی کے متعلق ظاہر کرنے پر مجبور ہو جاؤں کیونکہ مجھے ان کے اخلاق بلند کے وہ تمام حالات بھی معلوم ہیں جنھوں نے ان کے احباب کے دلوں میں ناسور ڈالدیئے ہیں، اور اُنکے وہ خیالات بھی میرے علم سے باہر نہیں جن کا اظہار وہ حیدرآباد کے بعض نہایت ہی اونچے گھرانوں اور عظیم ترین شخصیتوں کے متعلق "مسافر خانوں" اور عام جلسوں میں بیٹھ کر کیا کرتے ہیں۔ یقیناً میں اُن کی نگاہ میں حقیر و فرومایہ ہوں لیکن اس کے اظہار سے ان کو ڈرنا چاہئے تھا کیونکہ اگر ان کے اخلاقی کارنامے کسی وقت دنیا کے سامنے آگئے تو پھر خود جناب جوش کے لئے "حقیر و فرومایہ" کے علاوہ وہ کون سے مناسب الفاظ ہوں گے جن سے دنیا اُن کو یاد کرے گی

اس قدر لکھنے کے بعد اب میں ان کی شاعری کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور بتانا چاہتا ہوں کہ کس کس قسم کی غلطیاں ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

دسمبر کے نگار میں ایک عمومی تبصرہ جوش کی شاعری پر کرتے ہوئے ظاہر کر چکا ہوں کہ ان کے کلام میں عمق کم ہے اور سطح زیادہ، یعنی وہ الفاظ تو یقیناً نہایت پاکیزہ جمع کر دیتے ہیں لیکن ان سے کوئی مفہوم ایسا پیدا نہیں ہوتا جو دماغ انسانی کو جاکر مس کرے۔ رندانہ جوش و سرمستی کی ان کے یہاں کمی نہیں، خیال کی دلکشی و دلآویزی بھی کافی پائی جاتی ہے، لیکن سنجیدگی و متانت، تصوری عمق اور معنوی وزن کی بہت کمی ہے۔ اس لئے ان کے اشعار میں اکثر و بیشتر وہی غلطیاں نظر آتی ہیں جو اچھے الفاظ یکجا جمع کر دینے والے شاعروں کے کلام میں عموماً پائی جاتی ہیں۔ وہ تو ایک خاص جوش کے عالم میں اپنی جگہ یہی سمجھتے ہیں کہ مفہوم ادا ہو گیا لیکن چونکہ سننے والا صرف الفاظ کی مدد سے مفہوم تک پہونچنا چاہتا ہے اور الفاظ اس مقصد میں اس کے مساعد نہیں ہوتے۔ جوش صاحب کے یہاں اس قسم کی مثالیں بکثرت سے پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ان کا ایک شعر:-

مے ناز کی نزدیک سے چھلکا کے دم رقص   پھر دور سے مہکی ہوئی زلفوں کی سنگھادی

پہلا مصرعہ بالکل لکھنوی وضع کا ہے کہ پہلے تو ناز و ادا کو مے قرار دیا اور پھر اس کو چھلکتا ہوا دکھایا[1]۔ اس لئے اگر اس مصرعہ کا تصنع و تکلف علیحدہ کر کے پورے شعر صاف صاف الفاظ میں سمجھایا جائے تو یوں کہیں گے کہ۔

"نزدیک سے اس نے رقص کر کے بو دور سے مہکی ہوئی زلفوں کی سنگھا دی"

اور اس طرح اس شعر کا اہمال ظاہر ہے۔ علاوہ اس کے بو قریب سے سنگھائی جاتی ہے نہ کہ دور سے اور ناز رقص دور سے زیادہ لطف دیتا ہے نہ کہ قریب سے۔ اگر یوں کہا جاتا کہ "دور سے عشوۂ رقاصانہ دکھایا اور قریب آ کر زلفوں کی بو سنگھا دی" تو بیشک درست ہو سکتا تھا۔ چھلکا گئے کے بجائے اگر چھلکا دی کہا ہوتا تو اتنا نقص نہ پیدا ہوتا۔

اسی نظم کا دوسرا شعر یہ ہے:۔

سر نشہ میں تھوڑا سا جھکا اور اُٹھی آنکھ
گویا در میخانہ کی زنجیر ہلا دی

شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ "نشہ کی حالت میں سر جھکا کر کسی کا نگاہ اُٹھا دینا گویا در میخانہ وا کر دینا ہے" لیکن دوسرے مصرعہ سے یہ مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔ در میخانہ کی زنجیر ہلانے اور در میخانہ وا کرنے میں جو فرق ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔

اس نظم کا آخری شعر ملاحظہ ہو۔ پیمانہ ترا گرم رہے جوش کہ تو نے
رندوں کو شب قدر کی تصویر دکھا دی

"پیمانہ کا گرم رہنا" بالکل خلاف محاورہ ہے۔ محفل و بزم کے لئے لفظ گرم استعمال ہوتا ہے نہ کہ پیمانہ کے لئے۔ پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہئے تھا

ساغر ترا گردش میں رہے جوش کہ تو نے

ایک نظم انھوں نے صلح کی رات پر لکھی ہے۔ اس کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو:۔

حریم صلح میں قایم ہوا ایک مرکز یہ
مزاج عشق و تقاضائے حسن عربدہ جو

اس شعر میں بھی الفاظ تو نہایت پاکیزہ جمع کر دیے گئے ہیں لیکن مفہوم کا کہیں پتہ نہیں۔ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ حسن و عشق دونوں آشتی پسند حالت میں تھے، لیکن شعر سے اگر کوئی مفہوم بڑی کوشش و کاوش کے بعد پیدا ہوتا ہے تو اس کے بالکل مخالف۔ ایک طرف تو حسن عربدہ جو (یعنی جنگجو) ہے جس کا تقاضا سوائے جنگ کے اور کچھ نہیں ہو سکتا،

[1] ایک معیاری شعر اسی خصوصیت لکھنوی کا ملاحظہ ہو:۔

انگور میں یہ مے تھی پانی کی چار بوندیں پر جب سے کھینچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے (امیر مینائی)

دوسری طرف مزاج عشق ہے جس کی صفت قوت تسلیم و وفا کے اور کچھ نہ ہونا چاہئے۔ پھر جب یہ دونوں ایک مرکز پر جمع ہو جائیں گے تو ظاہر ہے کہ دونوں سے اپنی اپنی صفت کا اظہار پوری قوت سے ہوگا اور اس عالم میں سطحیت آشتی کا کیا ذکر۔ اسی طرح کا مہمل ایک شعر اور اسی نظم کا یہ ہے

دفا کی انجمن ناز میں تھی شیر و شکر
جراحت دل صد چاک و تیغ صاعقہ خو

اول تو انجمن ناز کے ساتھ وفا کی نسبت بالکل لغو و مہمل ہے۔ علاوہ اس کے جراحت دل اور تلوار کا شیر و شکر ہو جانا مفہوم صلح کا حامل کبھی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے خلاف یہ مفہوم پیدا کرتا ہے کہ تلوار پوری طرح کاٹ کر رہی تھی اور جراحت دل انتہائی تحمل سے اسے برداشت کر رہی تھی۔ دوسرے مصرعہ میں ایک اور معنوی نقص یہ بھی ہے کہ پہلے ٹکڑے میں "جراحت دل صد چاک" کہکر صرف ایک کیفیت کا اظہار کیا گیا ہے اور دوسرے ٹکڑے میں تیغ کا لفظ ہے جو ایک مادی و مرئی چیز ہے۔ بالکل اسی طرح کی غلطی غالب نے بھی ایک شعر میں کی ہے۔ کہتا ہے

کہیں نظر نہ لگے ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

دوسرے مصرعہ میں۔ زخم جگر سے واقعی وہ زخم مراد نہیں ہیں جو کھال کو کاٹ کر خون جاری کر دیتا ہے بلکہ ایک کیفیت مراد ہے لیکن پہلے مصرعہ میں دست و بازو کا ذکر کر دیا گیا جن کا اس کیفیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسی نظم کا ایک اور شعر جناب جوش کا ملاحظہ ہو

ہوا کی جیب میں تھا تیر از کماں رفتہ
کشش کے دام میں تھی کاوش رم آہو

کماں سے چھوٹے ہوئے تیر کا ہوا کی جیب میں ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا اور نہ کاوش رم آہو کا کشش کے دام میں آجانا کوئی مفہوم پیدا کرتا ہے۔ اگر مدعا یہ ظاہر کرتا ہے کہ کماں سے جدا ہو کر تیر ہوا میں ایک جگہ تھم کر رہ گیا تھا اور آہو نے وحشت و رمیدگی کی کیفیت چھوڑ دی تھی تو اول لذکر ٹکڑے کا اہمال ظاہر ہے اور موخر الذکر مفہوم شعر سے متبادر نہیں۔

ایک اور شعر اسی نظم کا:-

بساط عیش پہ خوابیدہ تھا غم دوراں
شراب ناب کی موجوں میں غرق تھے آنسو

دوسرے مصرعہ سے شاعر یہ مفہوم ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ آنسوؤں کا کہیں پتہ نہ تھا یعنی اُس وقت رونا دھونا موقوف تھا حالانکہ مصرعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر رو تو رہا تھا لیکن اس کے آنسو شراب ناب میں ڈوبتے جاتے تھے۔

مقطع سے پہلے ایک شعر اسی نظم کا اور قابل ملاحظہ ہے:-

اُدھر اُڑا ہوا طول شب فراق کا رنگ
ادھر شباب پر آرائش خم گیسو

اول تو پہلے مصرعہ میں لفظ طول بالکل زاید و بیکار ہے۔ شب فراق کا رنگ اُڑنا تو خیر ایک بات ہے لیکن طول شب کا رنگ اُڑنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ علاوہ اس کے جب ذکر صبح کی رات کا ہو رہا ہے اور دوسرے مصرعہ میں یہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ آرائش خم گیسو کے ساتھ محبوب شاعر کے پاس موجود تھا تو شب فراق کا وجود ہی کہاں باقی رہا یہ اجتماع اضداد کیسا؟

ایک نظم کا عنوان ہے راز و نیاز کی رات۔ اس کا تیسرا شعر یہ ہے:-

ترانہ ریز تھی نبض حیات کی جنبش ضمیر شب میں وہ پنہاں خروش و ولولہ تھا

دیکھئے الفاظ کتنے خوبصورت و دلکش ہیں لیکن مفہوم کا کہیں پتہ نہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ضمیر شب کس چیز کا نام ہے اور ضمیر شب سے اُس نبض حیات کی جنبش کو کیا لگاؤ جس کا تعلق شاعر کی ذات سے ہے۔ مقصود صرف یہ کہنا ہے کہ "رات کا سماں ایسا ولولہ خیز تھا کہ نبض حیات میں جنبش سی محسوس ہو رہی تھی" لیکن خواہ مخواہ غیر ضروری الفاظ استعمال کرکے شعر کو اصل مفہوم سے بیگانہ کر دیا

اس کے بعد کے دو شعر تو اس سے بھی زیادہ مہمل ہیں۔ ملاحظہ ہوں:-

تپاں تھا دائرۂ چرخ و عالم ارواح نیاز و ناز میں کیا جانے کیا معاملہ تھا
کبھی ہلال چمکتا تھا اور کبھی خنجر میان حسن و محبت عجیب مرحلہ تھا

اول تو علمی نقطۂ نظر سے دائرہ چرخ بالکل مہمل سی بات ہے اور اگر یہ مان لیا جائے کہ جوش صاحب کی شاعری کو علم و عقل سے کوئی لگاؤ نہیں تو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ نیاز و ناز کے درمیان کیوں ایسا معلوم ہو سکتا ہے جس سے دائرۂ چرخ اور عالم ارواح تڑپنے لگیں۔ اسی طرح دوسرے شعر میں "ہلال و خنجر کا چمکنا" بالکل لا یعنی سی بات ہے دوسرے مصرعہ میں مرحلہ "معاملہ" کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے جو صحیح نہیں۔ علاوہ اس کے یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ معاملۂ حسن و محبت میں ہلال و خنجر کا چمکنا کیا معنی رکھتا ہے اور اس سے شاعر کا کیا مقصود ہے۔ اگر یہ کوئی اشارہ ہے تو کس چیز سے اور اگر حقیقت کا اظہار ہے تو کیونکر؟

(باقی)

(نوٹ۔ یہ سلسلہ برابر ایک سال تک جاری رہے گا اور اس ضمن میں اکابر ہند کے وہ تمام خطوط بھی شایع کئے جائیں گے جو جوش کی شاعری کے متعلق میری ہم آہنگی میں وصول ہو رہے ہیں)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائے گا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ - ششماہی تین روپیہ

بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

شمارہ ۲	فہرست مضامین فروری ۱۹۳۳ء	جلد ۲۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد ۲۳	فروری سنہ ۱۹۳۳ء	شمارہ ۲

ملاحظات

آپ ایک سو دس سال قبل کے انسان کو زندہ کرکے دریافت کیجئے کہ کبھی تم نے اپنی جوانی میں

۱ـــ بحری تار کا نام سنا تھا؟
۲ـــ ہوائی جہاز کو آسمان میں اُڑتے دیکھا تھا؟
۳ـــ ٹیلی فون کے ذریعہ سے گفتگو کی تھی؟
۴ـــ پٹرول گیس کا حال معلوم تھا؟
۵ـــ جراثیم کا کچھ علم حاصل تھا؟
۶ـــ نظریۂ نشو و ارتقاء کا چرچا ہوتے کہیں دیکھا تھا؟
۷ـــ کبھی یہ بات ذہن میں بھی آئی تھی کہ کسی جنگ میں ۶ کروڑ مسلح آدمی شریک ہو سکتے ہیں؟

۸ — کیا تصور میں بھی یہ بات کبھی آسکتی تھی کہ سیاسیات کی اہمیت اقتصادیات کی اہمیت پر منحصر ہوگی؟

تو وہ یہ سوالات سنکر یا تو تمھیں احمق سمجھ کر ہنسنے لگے گا یا فرطِ حیرت سے پھر فوراً اسی کا دم نکل جائے گا — لیکن آپ گزشتہ ۸۰ سال (سنہ ۱۸۵۱ء سے لے کر سنہ ۱۹۳۱ء تک) علمی، سیاسی، اقتصادی و صنعتی انقلابات پر نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب کچھ اسی مختصر زمانہ میں ہوا اور شاید ہی تاریخ عالم پر کوئی ایسا دور آیا ہو جس نے عقول انسانی میں بالکل کایا پلٹ دی ہو۔

اب آئیے ساتھ ہی ساتھ اس عہد کے سیاسیات، اقتصادیات و اجتماعیات پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں۔ تاکہ اس اجمال کی ضروری تفصیل ہاتھ سے نہ جائے۔

(۱) کامل ۸۰ سال سے وطنیت یا قومیت یورپ کے اندر ایک دبی ہوئی چنگاری کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہی تھی مگر اس کو مشتعل ہونے کا موقع نہ ملتا تھا۔

اطالیہ عبارت تھا ان ممالک و ولایات کے مجموعہ سے جہاں آسٹریا کی فوجیں حکومت کر رہی تھیں۔ اور آسٹریا ہی کی سیاست برسرِ اقتدار تھی — جرمنی کا مفہوم اس سے زائد نہ تھا کہ مستقل صوبوں میں مستقل فرمانروا دادِ حکمرانی دے رہے تھے — ترکی دولِ بلقان کے بڑے حصہ پر قابض چلا آرہا تھا۔ اور پولینڈ کی سلطنت کا تو جغرافیہ میں کہیں وجود ہی نہ تھا — لیکن گزشتہ ۸۰ سال کے اندر یورپ کی سرزمین نے استقلال قومی کے کیا کیا مناظر دیکھے؟ — تاریخ عالم ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

سنہ ۱۸۵۱ء اور سنہ ۱۸۷۱ء کے درمیان جو سلسلہ جنگوں کا شروع ہوا تو اس وقت تک ختم نہ ہوا۔ جب تک جرمنی اور اطالیہ کے تمام متفرق صوبے ایک دوسرے سے متحد ہو کر مستقل سلطنتوں میں تبدیل نہ ہوگئے، اسی طرح دولِ بلقان نے اس وقت تک ہتھیار نہ رکھے جب تک ان کی مستقل قومی حیثیت علیحدہ تسلیم نہ کر لی گئی، پھر جنگِ عظیم میں جو کچھ ہوا وہ بھی کسی سے مخفی نہیں کہ پولینڈ ایسے مختصر حصۂ زمین نے بھی ایک مستقل حکومت کی حیثیت اختیار کر لی۔ اور آسٹریا ہنگری کی ملوکیت مختلف اجزاء قومی میں منتشر ہوگئی جن سے اس کی تشکیل ہوئی تھی — اسی طرح جاپان نے کمانڈر پری کے متعینہ اصول پر عمل کر کے مغرب کی قومی تحریک کو اپنا دلیل راہ بنایا۔ چین نے سن یت سن کی زعامت میں، ہندوستان نے گاندھی کی قیادت میں، ترکی نے مصطفیٰ کمال کی سیادت میں، ایران نے رضا شاہ کی حکومت میں اور مصر و سوریا وغیرہ تمام ممالک شرق ادنےٰ نے مختلف مصلحین کے زیر اثر اسی استقلال قومی کی بنیاد مستحکم کی جس کی روح وسط مغرب سے پھیل کر آہستہ آہستہ روئے زمین کے ہر ہر قطعۂ آبادی کو بیدار کرتی چلی آرہی تھی، یہاں تک کہ اس وقت آئرلینڈ سے لے کر ایران تک اور ایران سے لے کر انام تک کوئی ایک حصۂ زمین بھی ایسا نہیں جہاں گزشتہ ۸۰ سال کے اندر قومیت کی روح بیدار نہ ہوگئی ہو — لیکن اسی کے ساتھ یہ امر بھی کم حیرت ناک نہیں کہ اس روح قومیت کے ساتھ ساتھ ملوکیت کی

جذبہ بھی قوی ہوتا گیا اور ایک قوم نے دوسری قوم کو مغلوب و محکوم بنانے میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اٹھا رکھا۔

انیسویں صدی کے اوّل نصف حصہ میں استعماری توسیع کی رُوح بالکل ابتدائی حالت میں تھی، اور بہت کم قومیں مغرب کی ایسی تھیں جنھوں نے ایشیا کی طرف قدم بڑھایا ہو۔ افریقہ کا اکثر حصہ سوائے مصر اور بعض مغربی و مشرقی مستعمرات ساحل کے مجہول و غیر معلوم حالت میں تھا۔ برطانیہ نے تو بیشک ہندوستان، زیلینڈ، سنگاپور اور ہانگ کانگ کو بھی اپنی مستعمراتِ ایشیا میں شامل کر لیا۔ لیکن دوسری مغربی حکومتیں البتہ برطانیہ کی طرح خوش قسمت نہ ثابت ہوئیں کیونکہ فرانس، اسپین، اور پورتگال کے قدیم مستعمرات بھی جو شمالی و جنوبی امریکہ میں تھے ہاتھ سے نکل گئے۔ لیکن سنہ ۱۸۷۰ء کے بعد سے ایک جدید استعماری دَور کی ابتدا ہوئی۔ اور دنیا کا جغرافیہ بدلنا شروع ہوا یعنے روس نے ایشیا میں شرقاً و جنوباً منچوریا، منگولیا اور ایران تک اپنا تصرف وسیع کیا۔ جرمنی نے افریقہ اور مشرقی جزائر ہند میں ایک لاکھ مربع میل زمین اپنے لئے مخصوص کر لی۔ فرانس سنہ ۱۸۸۱ء میں تیونس سے برسرپیکار ہوا اور سنہ ۱۸۸۳ء میں تونکین سے لڑا، پھر ۹۰ ہزار مربع میل زمین ایشیا میں اور ۲۶ لاکھ مربع میل افریقہ میں حاصل کر لی ——— اسی دَوران میں برطانیہ نے ۴۰ لاکھ مربع میل زمین کا اپنی سلطنت میں اضافہ کر لیا ——— جاپان نے بھی اقوام یوروپ کی تقلید میں جزیرۂ فارموسا اور منچوریا و کوریا کا ایک حصہ اپنے قبضہ میں کر لیا ———

اس استعماری توسیع کے سلسلہ میں اگر ایک طرف تھوڑا سا فائدہ یہ ہوا کہ بعض نامعلوم و مجہول حصے زمین کے علم انسانی میں آگئے تو دوسری طرف نقصانِ عظیم یہ بھی ہوا کہ باہم سلطنتوں میں جنگ و نفاق کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور اسی طرح سنہ ۱۸۵۱ و سنہ ۱۹۰۰ء کے درمیان ایک سلسلہ بین الاقوامی جنگوں کا شروع ہو گیا۔ چنانچہ فرانس و آسٹریا کی جنگ سنہ ۱۸۵۱ء میں۔ امریکہ کی خانہ جنگیاں سنہ ۱۸۶۱ سے سنہ ۱۸۶۵ء تک ——— فرانس اور پروشیا کی جنگ سنہ ۱۸۷۰ سے سنہ ۱۸۷۱ء تک ——— پھر اس کے بعد چین و جاپان کی لڑائی سنہ ۱۸۹۴ء سے سنہ ۹۵ء تک ——— اسپین و امریکہ کی جنگ سنہ ۹۸ء میں، جنگ بوئر سنہ ۹۹ء میں، روس و جاپان کی لڑائی سنہ ۱۹۰۴ء میں اور پھر گذشتہ جنگ عظیم یہ سب اسی استعماری حرص و طمع کا نتیجہ تھیں۔

پھر جب استعماری حرص و آز نے یہ صورت اختیار کر لی اور ہر ملک و قوم امن و سکون کی اس خرابی سے اپنی تجارتی و اقتصادی حالت کو خطرہ میں دیکھنے لگی۔ تو سنہ ۱۸۵۶ء میں تمام دولِ کبریٰ (سوائے امریکہ اور اسپین کے) نے آپس میں ایک ایسا معاہدہ کیا جس کی رُو سے دَورانِ جنگ میں تجارت کو محفوظ کر دیا گیا ——— اس کے بعد سنہ ۱۸۶۴ء میں جب امریکہ خانہ جنگیوں میں مبتلا تھا دولِ یوروپ نے معاہدۂ جنیوا کی رُو سے جمعیۃ صلیب احمر کی بنیاد ڈالی اور سنہ ۱۸۶۸ء میں موتمر برلن کا اجتماع ہوا تاکہ روس، برطانیہ، اور آسٹریا ہنگری کے درمیان عہدنامۂ مصالحت ہو جائے۔ پھر سنہ ۱۸۸۲ء میں امریکہ بھی عہدنامۂ جنیوا میں شریک ہو گیا اس کے بعد سنہ ۹۹ء میں زار روس نقولا ثانی نے ایک موتمر لاہائی میں طلب کی، سنہ ۱۹۰۷ء میں رئیس روزولٹ نے پھر اجتماع کیا جس میں ۴۴ حکومتوں کے نمایندے شریک ہوئے اور ہر چند اسلحہ کے مسئلہ میں کسی متفقہ نتیجہ پر نہ پہونچ سکے تاہم بین الاقوام

قانون میں کچھ ضروری ترمیمیں کر دی گئیں۔

اسی اثنا میں دول کبریٰ نے دیکھا کہ مصلحت عامہ کا اقتضا یہ ہے کہ تجارت و مواصلات کے باہمی طریقوں کو منظم کیا جائے اس لئے سنہ ۱۸۶۵ء اور سنہ ۱۸۷۴ء کے درمیان ڈاک رسانی کے متعلق اتحادی صورت پیدا کی گئی جس میں ۶۰ قوموں نے حصہ لیا اور بارہ حکومتوں نے معاہدۂ برن کے ذریعہ سے حقوق طبع کی حفاظت کو تسلیم کیا۔ اسی کے ساتھ مخترعین کے حقوق اور اتحاد تلغرافی کے متعلق معاہدے مرتب کئے گئے۔

جنگ عظیم کے بعد جمعیت الاقوام قائم کی گئی اور اس میں ۴۵ حکومتوں نے شرکت کر کے پوری کوشش کی کہ جو مسئلہ موتمر بن لاہای سے طے نہ ہو سکا تھا اسے طے کیا جائے اور ملکوں کے مسلح ہونے کی ایک خاص حد مقرر کی جائے ——— الغرض حکومتیں ہر ممکن خطروں کو مٹا کر اپنی اپنی جگہ ملوکیت و استبداد کے لئے راہیں صاف کر رہی تھیں، مگر اسی کے ساتھ ذہنوں کا انقلاب آہستہ آہستہ دیمقراطی طرز حکومت کے طرف بھی مائل ہو رہا تھا اور یہی وہ میلان تھا جس نے سنہ ۱۸۵۰ء سے اپنی قوت کا مظاہرہ شروع کیا اور بعض حکومتیں قطعی جمہوری ہو گئیں ——— خود انگلستان میں بھی پارلیمنٹ کو یہ قانون نافذ کرنا پڑا کہ مجلس نواب میں داخل ہونے کے لئے امارت کی شرط غیر ضروری ہے، اور سنہ ۱۸۶۷ء میں انتخابات عامہ میں رائے دہندگان کی تعداد میں اضافہ کیا گیا اور رفتہ رفتہ اس میں اسقدر اضافہ ہوتا گیا کہ آخر کار ہر مرد و عورت کو جس کی عمر ۲۱ سال سے زاید ہو رائے دینے کا حق حاصل ہو گیا ——— جاپان جہاں قرون وسطیٰ کی سی اقطاعی حکومت پائی جاتی تھی وہ بھی سنہ ۱۸۸۹ء میں دستوری حکومت میں آگیا۔ اسی طرح فرانس، جرمنی، روس، چین، برازیل، آسٹریا ہنگری، ترکی اور اسپین بھی دستوری حکومتوں میں تبدیل ہو گئی۔

(۲) اب اقتصادیات کی تاریخ پر بھی نظر ڈال کر دیکھئے کہ گزشتہ ۸۰ سال میں کیا کیا انقلابات رونما ہوئے ——— اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مہتم بالشان انقلاب ترقی علوم کے وجہ سے ہوا۔ اور گزشتہ نصف صدی کے اندر حیرت انگیز تغیرات رونما ہوئے ——— اسٹیم انجن سنہ ۱۷۶۹ء میں ایجاد ہوا تھا لیکن اس پر ایک صدی کا زمانہ بھی نہ گزرا تھا کہ سنہ ۱۸۵۰ء تک اکثر و بیشتر کارخانے اسٹیم انجن ہی سے چلنے لگے۔ اسی دوران میں تار کی ایجاد ہوئی، سینے کی مشین بنائی گئی۔ دخانی جہاز اور ریلوے انجن وغیرہ کثرت سے چل پڑے۔

سنہ ۱۸۵۵ء کے قریب بسمر نے ایک خاص طریقہ فولاد بنانے کا ایجاد کیا جس سے فولادی صنعتوں میں بڑا انقلاب پیدا ہوا۔ سنہ ۱۸۶۰ء کے قریب قوسی نور کہربائی ایجاد ہوا اور کھیت کاٹنے کی ایسی مشین بن گئی جو خود ہی گٹھے بھی باندھتی تھی، چھینٹ چھاپنے کا طریقہ معلوم کیا گیا اور یوروپ و امریکہ کے درمیان تار برقی کا سلسلہ قائم ہو گیا۔

سنہ ۱۸۷۰ء کے قریب آلات گیس، ٹیلی فون، کہربائی لمپ وغیرہ ایجاد ہوئے، سنہ ۱۸۸۰ء کے قریب بجلی کا موٹر استعمال ہونے لگا، چھاپنے کی لینوٹائپ مشین بنائی گئی۔ الومینیم کہربائی طریقہ پر اپنی معدن کے اندر سے نکالا گیا، موٹر کار طیار

ہوئی اور پھر اس کے بعد جو سلسلہ اختراع و ایجاد کا شروع ہوا تو لاسلکی ٹیلی فون، مکبر الصوت، ٹیلی ویژن وغیرہ سیکڑوں جدید چیزیں وجود میں آگئیں جنھوں نے صنعت و تجارت دونوں کے اصول بدل کر ان کو ایک نئے رنگ میں رنگ دیا ——— لیکن اسی کے ساتھ جو سب سے زیادہ اہم انقلاب ہوا وہ یہ تھا کہ تجارت و صنعت افراد سے متعلق ہونے کے بجائے جماعتوں سے وابستہ ہوگئی اور مشترکہ سرمایہ سے کمپنیاں قائم ہونے لگیں۔ اس کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ عوام میں بھی اس کا شوق پیدا ہوا، دوسرے بنکوں کا اثر وسیع و قوی ہو چلا اور تیسرے یہ کہ دنیا کا ہر ملک دوسرے ملک سے وابستہ ہوگیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج جب تاوان جنگ کی ادائی کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو ٹوکیو، نیویارک، لندن اور پیرس کے سرمایہ دار اس کے حل کرنے کے لئے طلب کئے جاتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں جو بہت اہم انقلاب ہوا وہ تنظیم عمال تھا یعنی مزدوروں اور کام کرنے والوں میں بیداری پیدا ہوئی ——— اس تنظیم کی ابتدا ابھی ۱۸۵۱ء میں ہوئی اور رفتہ رفتہ ایک لاکھ مزدور برطانیہ کی اس تحریک میں شریک ہوئے اس کے بعد ۱۸۶۶ء میں امریکہ کے مزدوروں نے بھی اپنے آپ کو منظم کیا اور رفتہ رفتہ یہ تحریک اسقدر وسیع ہوئی کہ اسوقت ایک کروڑ ۴۰ لاکھ مزدور اس تنظیم سے وابستہ ہیں۔ اس تعداد میں امریکہ شامل نہیں جہاں ۳۰ لاکھ کی تعداد اس کے علاوہ ہے اور نہ روس و جنوبی امریکہ شامل ہیں۔

(۳) اب اجتماعات کی طرف توجہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ نمایاں ترقی تعلیم نے کی۔ ۱۸۵۱ء میں برطانیہ ۱۰ لاکھ گنی سے بھی کم ملک کی تمام پبلک مدارس پر صرف کرتا تھا، لیکن اب صرف لندن کے مدارس پر جو کچھ صرف ہوتا ہے وہ بھی اس سے بدرجہا زاید ہے۔ یہی حال امریکہ کا تھا کہ ۳۰ ملین آبادی کے لئے صرف ۱۰۰ مدرسے قائم تھے، لیکن اب ان کی تعداد ہزاروں تک پہونچ گئی ہے ——— پھر یہی نہیں ہوا کہ ثانوی تعلیم کا مفت رواج ہوا بلکہ کالج قائم کئے گئے، یونیورسٹیوں کی بنیاد پڑی، کتب خانے بڑھائے گئے، تالیفات و تصنیفات کی کثرت ہوئی، اخبارات و رسایل میں اضافہ ہوا اور یوروپ و ایشیا ہر جگہ اس کو محسوس کیا جانے لگا کہ عام تعلیم ہی بنیاد ہے ایک قوم کے استقلال و ترقی کی۔

اسی سلسلہ میں عورت کی ترقی پر بھی نگاہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ گزشتہ ۸۰ سال میں وہ بھی خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچ گئی ہے ——— امریکہ میں اوّل اوّل عورتیں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل نہ ہو سکتی تھیں لیکن ۱۸۷۵ء میں ان کی ایک بڑی جماعت مردوں کے دوش بدوش علمی تجربات میں حصہ لینے لگی اور ۲۰ فی صدی وظائف ان کو دیئے جانے لگے ——— پھر رفتہ رفتہ انھوں نے جتنی ترقی کی وہ کسی سے مخفی نہیں اور وہ کونسا علم و فن، کون سی صنعت و حرفت ایسی ہے جس میں وہ پیش پیش نہیں ہیں۔ یوروپ کی عورت نے بھی امریکہ ہی کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا اور اب وہاں بھی وہی عالم ہے جو امریکہ میں نظر آتا ہے ——— خیر مغرب میں اگر یہ انقلاب رونما ہوا تھا تو جائے حیرت نہ تھی، لیکن تعجب

تو یہ ہے کہ مشرق کی عورت بھی نچلی نہ بیٹھ سکی اور چین و جاپان، ترکی، مصر، اور بلادِ عرب میں بھی وہ سیاسی و اجتماعی، علمی و صناعی، اقتصادی و تجارتی تحریکوں میں برابر کا حصہ لینے لگیں۔

اسی کے ساتھ علم طب کی ترقی کو دیکھئے کہ مختلف امراض کے جراثیم کی تحقیق شروع ہوئی، بہت سے لاعلاج امراض قابل علاج قرار پا گئے اور تعداد اموات ۱۹ فی ہزار کی نسبت سے کم ہو گئی۔ دیگر علوم عقلیہ کو دیکھئے کہ علم الکیمیا، طبقات الارض، فلکیات وغیرہ میں کیسے کیسے اضافے ہوئے، ڈارون کی کتاب " اصل الانواع " اسی زمانہ میں شایع ہوئی، اسپنسر کا فلسفۂ ترکیبیہ " اسی عہد کی چیز ہے، " رانتجن شعاع " اسی دَور میں دریافت ہوئی، ریڈیم انھیں ۸۰ سال کے اندر دریافت ہوا اور انیشٹین کا نظریۂ نسبیت بھی اسی زمانہ کی چیز ہے۔

الغرض گزشتہ ۸۰ سال کا زمانہ اپنی علمی، سیاسی، اجتماعی و اقتصادی ترقیوں کے لحاظ سے ایک ایسا عجیب و غریب زمانہ تھا کہ اس کی نظیر تاریخ گزشتہ میں نہیں ملتی اور اگر کوئی قوم دنیا میں ایسی ہے جو ہنوز محو خواب ہے تو ہم کو نہایت آسانی سے اس کے فنا ہو جانے کا حکم لگا دینا چاہئے کیونکہ علم کی اس تیز روشنی میں یہ گرانخوابی، نیند کی گراں خوابی نہیں ہے بلکہ موت کا جمود ہے، موت کی غفلت ہے، جو نہ کبھی دور ہوئی نہ ہو سکتی ہے۔

حال ہی میں کسی اخبار (غالباً انصاف امرتسر) نے مولویوں کی ایک جماعت کی طرف سے یہ صدائے احتجاج ہمارے کانوں تک پہونچائی تھی کہ ترکی کے متعلق جو خبریں شایع کی جاتی ہیں وہ اکثر و بیشتر غلط ہوتی ہیں یعنی نہ وہاں اذان ترکی زبان میں ہوتی ہے نہ خطبہ وغیرہ غیر عربی زبان میں سُنایا جاتا ہے —— ہر چند یہ طفلانہ باتیں اس قابل نہیں ہیں کہ کوئی سنجیدہ شخص ان کی طرف توجہ کرے (اور اس جماعت کی جتنی باتیں ہوتی ہیں وہ سب ایسی ہی لغو و مہمل ہوتی ہیں۔) لیکن اس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ اس جماعت کی ذہنیت کیا ہے۔ چونکہ یہ لوگ فروع مذہب میں بھی کسی قسم کی تبدیلی کو خواہ وہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے کتنی ہی ضروری کیوں نہ ہو کفر کا مترادف سمجھتے ہیں اور اسی کے ساتھ اگر ان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی ایسی مسلم جماعت جس پر ان کی " کفر گری " کا حربہ اثر نہیں کر سکتا، اُن کے مزعومات کے خلاف اصلاح مذہب کی حامی ہے، تو انتہائی بیکسی و بیچارگی کے ساتھ صرف یہی مدافعت کیا کرتے ہیں۔ کہ " اس طرح کی خبریں غلط ہیں، دشمنوں کا پروپگنڈا ہیں اور ان کی کوئی اصلیت نہیں ہے "

اگر یہ " برخود غلط " جماعت مصر و عرب اور خود ترکی کے اخبارات کا مطالعہ کرتی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ وہاں نہ صرف اذان و خطبہ ہی ترکی زبان میں ہوتا ہے بلکہ نماز میں قرأت قرآن بھی عربی میں نہیں ہوتی، چنانچہ حال ہی میں استنبول کا ہنگامہ صرف اسی وجہ سے ہوا تھا اور اسی ہنگامہ کی وجہ سے بہت سے علما، و مشائخ کو پکڑ کر مصطفٰے کمال نے قید و بند میں ڈال دیا —— میرے پاس جو عربی اخبارات آتے ہیں اُن میں اس وقت کی تصاویر موجود ہیں جب

اوّل اوّل ترکی زبان میں نماز ادا کی گئی تھی، پھر اس کو غیروں کا پروپاگنڈا کیونکر کہہ سکتے ہیں ——— غالباً ہندوستان کے علمائے کرام یہ سن کر اور زیادہ مایوس ہوں گے کہ حکومت ترکی نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ سلطنت کے تمام عرض و طول میں سخت احکامات نافذ کر دئے گئے ہیں کہ عربی زبان کا ایک لفظ بھی استعمال نہ کیا جائے۔ اور اس کے لئے انجمنیں قائم ہوئی ہیں۔ تاکہ وہ موجودہ ترکی لٹریچر کو عربی سے پاک کر کے خالص ترکی الفاظ اس کی جگہ تلاش کر کے لغات کی کتابیں مرتب کریں۔

پھر اگر مصطفےٰ کمال اور ترک قوم اپنی ان تمام آزادیوں کی وجہ سے واقعی دائرہ اسلام سے خارج ہو چکی ہے تو ہمارے علماء کو نہایت صفائی سے اس کا اظہار کر دینا چاہئے۔ اس دنائت و کم ہمتی کی کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ حقیقتوں کو الزامات بیجا قرار دے کر ان کی صفائی کی جائے ——— اگر اسلام کی قوت و عزت کا انحصار کسی مخصوص قوم یا ملک کے مسلمان رہنے ہی پر ہے تو اسلام کی حقیقت معلوم اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کیوں ہندوستان کے مسلمان علماء ترکوں کو کافر و مشرک قرار دے کر ان سے تبرّا و بیزاری کا اعلان نہیں کر دیتے۔ مگر چونکہ وہ اس حقیقت سے واقف ہیں۔ کہ ان کی اس مزخرفات کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے نہ اب ان کا جذبۂ ایمانی جوش میں آتا ہے اور نہ خدا کی راہ میں وہ اپنی "ٹٹین" لے کر نکلنے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں ——— اِن کی کارگاہِ عمل تو ہندوستان ہی کی جہل پرور و واہمہ پرست سرزمین میں قائم ہو سکتی ہے۔ جہاں اب بھی "فرمودۂ مولوی" "فرمودۂ خدا" کی حیثیت رکھتا ہے

جنوری کا نگار نہ صرف یہ کہ غیر معمولی تعویق سے شائع ہوا بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ حد سے زیادہ غلطیاں اس میں پائی جاتی ہیں ——— اُس کا سبب تو یہ ہوا کہ کاتب دھوکا دے کر دفعتۃً غائب ہو گئے اور عرصہ تک مسودات وغیرہ بھی ان سے نہ مل سکے، اِس کا سبب مینیجر کی عدیم الفرصتی ——— کہ کاپیوں کی صحت کا انتظام نہ کر سکے۔ میں حیدرآباد میں تھا۔ اس لئے خود کوئی انتظام نہ کر سکتا تھا ——— فروری کا پرچہ بھی ۸ - ۱۰ .... دن کی تعویق سے شائع ہو رہا ہے۔ اور اس کا سلسلہ غالباً دو چار ماہ اور رہیگا کیونکہ ہر مہینے اسی طرح دو دو چار دن کی تاخیر کو دور کیا جائیگا۔

تاریخ الفحشاء کی طباعت شروع ہو گئی ہے، لیکن چونکہ کتاب کا حجم زیادہ ہے اس لئے مارچ کے اخیر ہفتہ تک اس کی اشاعت کا انتظار کیجئے

جن حضرات نے اس کتاب کے سلسلہ میں کچھ رقم پیشگی بھیجدی ہے وہ وی پی کی روانگی کے وقت وضع کر دیجائیگی۔ ابھی تک قیمت کا تعین نہیں ہو سکا غالباً ماہ آیندہ میں اس کا اعلان ہو سکے گا

واقعۂ معراج کے متعلق اسلامی عقاید کی تحلیل

اور

ایک انگریز مستشرق ڈاکٹر ٹسڈل کی ہرزہ سرائیاں

اسلامی ادبیات کے ہر شعبہ میں اسریٰ و معراج کا کچھ نہ کچھ واقعہ ضرور ملتا ہے، قرآن وحدیث تفسیر و تصوف، تاریخ و شاعری یہاں تک کہ آرٹ اور فنون لطیفہ میں بھی اس کے بعض نقوش نظر آتے ہیں اس موضوع پر دوستوں نے بھی نیاز کیشیوں کا ہدیہ پیش کیا اور مخالفوں نے بھی معاندانہ تنقیدیں کیں عقول انسانی کے مختلف مراتب اور فکر و نظر کے مختلف زاویوں کے اعتبار سے اس پر بہت سی حاشیہ آرائیاں کی گئیں اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ مصوروں نے اس کو نقوش میں ظاہر کیا، عہد صفویہ کی مصوری کا یہ ایک دلچسپ موضوع تھا چنانچہ اس کا ثبوت آج خمسہ نظامی کے ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۵۳۹-۴۳ء سے ملتا ہے، جو برٹش میوزیم میں ہے، اس میں عہد صفوی کے بہت سے نامی گرامی مصوروں کے شاہکار ہیں اس نایاب نسخہ کی تمام تصویروں میں سب سے بہتر وہ مرقع ہے جس میں آں حضرتؐ کا واقعہ معراج پیش کیا گیا ہے، آں حضرت براق پر سوار ہو کر نیلگوں آسمان پر تشریف لیجا رہے ہیں آپ کے چاروں طرف ایک شہابی رنگ کے نور کا ہالہ ہے آپ جس وقت زمین سے عالم بالا کا رُخ کرتے ہیں تو ملائکہ کی جماعت سطح سحاب کے نیچے آپکو گھیرے ہوئے ہے، لورنس بنیین لکھتا ہے، کہ واقعہ معراج تو اس عہد کی مصوری کا عام موضوع ہے لیکن اس نقش میں جو اثیری شکوہ نمایاں ہے، کسی دوسری جگہ نہیں پایا جاتا[1]

قرآن وحدیث کے سیدھے سادے واقعہ پر اسی طرح مورخوں اور مفسروں نے خیال آرائیاں کیں صوفیہ نے کچھ اضافہ کیا، اور تفسیر و تاریخ کی شکل سے کوئی ایسی کتاب ملیگی جس میں اس پر بحث و تمحیص نہ کی گئی ہو یہاں تک کہ خاص اس موضوع پر علامہ نجم الدین غیطی نے "حاشیۃ الدردیر علی قصۃ المعراج" لکھی اسی طرح الکردی نے "ضوء السراج فی فضل رجب و قصۃ معراج" لکھی یہ کتابیں مصر میں چھپ گئی ہیں اور عام طور پر ملتی ہیں،

محدثین کے جزدی مباحث، مورخین کے اضافی حاشیوں، اجنبی اقوام سے ربط و اختلاط اور مذاہب فلسفہ کی سینہ زوریوں کی بدولت خود مسلمانوں میں اس کے متعلق اختلاف عقاید شروع ہوا اور آج مختلف افکار کی تحلیل کرنے کے بعد اسکے متعلق تین عقاید پائے جاتے ہیں۔

---

[1] Persian Art (مرتبہ ای ڈینین راس (رایل اکاڈمی لندن)

پہلی جماعت تو اُن حضرات کی ہے جن کا عقیدہ ہے کہ آں حضرت آسمان پر جسم اطہر کے ساتھ تشریف لے گئے چنانچہ جمہور محدثین و فقہا کا یہی مذہب ہے، حضرت ابن عباس اس کے سرگروہ ہیں،

دوسری جماعت ان لوگوں کی ہے، جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف روحانی اعتبار سے معراج ہوا، آپ جسم کے ساتھ آسمان پر تشریف نہیں لے گئے چنانچہ بی بی عائشہؓ اور امیر معاویہؓ کا یہی عقیدہ تھا حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی ہے، ابن اسحٰق کہتے ہیں

عن عائشۃ زوجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم	آں حضرتؐ کی بی بی حضرت عائشہؓ کہتی تھیں کہ آپ کا
کانت تقول ما فقد جسد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	جسم غایب نہیں ہوا لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو معراج
ولکن اللہ اسریٰ بروحہ	عطا فرمایا

امیر معاویہؓ سے معراج کے متعلق سوال ہوا آپ نے فرمایا کانت رؤیا من اللہ تعالیٰ صادقۃ (اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو رویائے صادقہ ہوا)

تیسری جماعت صوفیہ کی ہے، حضرت محی الدین ابن عربیؒ کا خیال تھا کہ قرآن میں جس اسریٰ یا معراج کا تذکرہ ہے وہ روحانی تزکیہ کے متعلق مجازی اور استعاری طرز بیان ہے،

پہلے عقیدہ کے متعلق سوائے ابن عباسؓ کے قیاس (یعنی رؤیا عین) کے علاوہ کوئی ایسی مستند حدیث نہیں پائی جاتی جس سے معراج کو جسمانی مانا جائے، قرآن مجید میں محض اس قدر ہے،

سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلا من المسجد الحرام	پاک ہے وہ ذات جو رات کے وقت اپنے بندہ کو مسجد
الی المسجد الاقصی الذی بارکنا حولہ لنریہ من	حرام سے مسجد اقصیٰ میں لے گئی جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں
آیاتنا	رکھی ہیں تاکہ ہم اسکو اپنے عجائبات قدرت دکھائیں،

اس میں کہیں نہ تو اس معراج جسمانی کا تذکرہ ہے جس کے متعلق بخاری اور دوسری حدیثوں میں روایتیں ملتی ہیں اور نہ یہ تذکرہ ہے کہ آپ جسم کے ساتھ آسمان پر تشریف لے گئے، قرآن مجید سے صرف "اسریٰ" ثابت ہے، احادیث سے معراج کا حال معلوم ہوتا ہے، معراج اور اسریٰ کی حدیث کے راویوں میں عبد اللہ ابن مسعودؓ ابو سعید خدریؓ، عائشہ صدیقہؓ، امیر معاویہؓ، ام ہانی بنت ابی طالبؓ، حسن بن ابی الحسن، ابن شہاب زہری اور قتادہ وغیرہم کے اسمائے گرامی پائے جاتے ہیں

معراج جسمانی ماننے والی جماعت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ "عبد" مجموعہ ہوتا ہے، جسم و روح کا اس لئے قرآن مجید میں "اسریٰ بعبدہ" سے جسمانی سیر مراد ہے، نہ کہ محض رویائے صادقہ، اگر آپ کو معراج محض خواب میں ہوئی تو پھر معجزہ کیا ہوا خواب میں تو عام لوگ بھی مناظر و مرایا کے عجائبات کا مشاہدہ کرتے ہیں پھر آں حضرتؐ کی خصوصیت کیا ہوئی،

دوسری جماعت کہتی ہے کہ معراج جسمانی کا عقیدہ تجارب و مشاہدات کے خلاف ہے، اور وہ بی بی عائشہؓ کی پرزور حدیث

اور بی بی ام ہانی کی اہم روایت سے استدلال کرتے ہیں ابن اسحق کہتے ہیں

عن ام هانی بنت ابی طالب رضی الله عنها واسمها هند فی مسری رسول الله صلی الله علیه وسلم کانت تقول ما اسری برسول الله صلی الله علیه وسلم الا هو فی بیتی نایم تلك اللیلة فصلی العشاء الاخرة ثم نام ونمنا فلما کان قبیل الفجر اهبنا رسول الله صلی الله علیه وسلم فلما صلی الصبح وصلینا معه قال یا ام هانی لقد صلیت معکم العشاء الاخرة کما رایت بهذا الوادی ثم جئت بیت المقدس فصلیت فیه ثم قد صلیت صلاة الغداة معکم الآن کما ترین[51]

اور ام ہانی بنت ابی طالب سے جن کا نام ہند تھا معراج نبوی کے متعلق روایت ہے کہ جس رات کو معراج ہوا آپ میرے گھر پر میرے نزدیک سوئے تھے: آپنے آخری عشا کی نماز پڑھی اور سو گئے اور ہم لوگ بھی سو رہے صبح کے قبل آپ نے ہم لوگوں کو اٹھایا جب آپ صبح کی نماز پڑھ چکے اور ہم لوگوں نے آپکے ساتھ نماز پڑھ لی، تو آپ نے فرمایا کہ اے ام ہانی! مینے عشا کی نماز تمھارے ساتھ اس میدان میں پڑھی جیسا کہ تم نے دیکھا پھر بیت المقدس میں آیا اور اس میں نماز پڑھی اور اب تمھارے ساتھ صبح کی نماز ادا کی جیسا کہ تم دیکھتی ہو،

آپ گھر سے روانہ ہوئے تاکہ لوگوں سے اس کا تذکرہ کریں حضرت بی بی ام ہانی نے برنبائے محبت آپ کی چادر پکڑ لی اور عرض کیا، اس کا تذکرہ نہ فرمائے لوگ آپ کی تکذیب کریں گے، آپ نے نہیں مانا بی بی ام ہانی نے ایک حبشیہ لونڈی کو آپکے پیچھے روانہ کیا اور کہدیا کہ دیکھ آپ لوگوں کے سامنے یہ واقعہ بیان کرتے ہیں تو وہ کیا کہتے ہیں آپ نے یہ واقعہ بیان کیا لوگوں کو تعجب ہوا اور انھوں نے کہا،

ما آیة ذلك یا محمد فانا لم نسمع بمثل هذا قط[52]

محمدؐ یہ کونسی نشانی ہے، ہمنے تو کبھی اس قسم کا واقعہ سنا نہیں

آپ نے بیت المقدس کے ماحول، مختلف مناظر، وہاں کے قبایل کے حالات اور ان کے اعمال شبانہ کے واقعات بیان کرنا شروع کئے،

عن جابر بن عبد الله قال سمعت النبی صلی الله علیه وسلم یقول لما کذبنی قریش قمت فی الحجر فجلی الله لی بیت المقدس فطفقت اخبرهم عن آیاته وانا انظر الیه[53]

جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے، اُنھوں نے کہا میں نے رسول سے سنا آپ فرماتے تھے جب قریش نے میری تکذیب کی تو میں حجر کے نزدیک کھڑا ہوا، اللہ نے بیت المقدس کو میرے پیش نظر کر دیا، میں نے اس کی نشانیاں بیان کرنا شروع کیں گویا کہ میں اس کو دیکھ رہا ہوں،

---

[51] سیرت ابن ہشام

[52] سیرت ابن ہشام [53] بخاری

بی بی عائشہؓ اور ام ہانیؓ کی احادیث سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ آپ پر خواب کی سی کیفیت طاری ہوئی، اسی عالم میں آپ بیت المقدس تشریف لے گئے اسی کو قرآن مجید نے "اسریٰ" بیان کیا ہے، ابن اسحٰق کی روایت کے مطابق ابو سعید خدریؓ اسی "اسریٰ" کے ساتھ معراج کا واقع ہونا بتاتے ہیں

انہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	آپ نے کہا میں نے رسول اللہ سے سنا آپ فرماتے تھے کہ
یقول لما فرغت مما کان فی البیت المقدس	جب میں بیت المقدس کی چیزوں کو دیکھکر فارغ ہوا تو
اتی بالمعراج	معراج میں گیا،

اسی طرح مالک ابن صعصعہ کی روایت سے معراج کی جو طویل حدیث مذکور ہے، اس میں ہے آنحضرت نے فرمایا

انا عند البیت بین النائم والیقظان[1]	میں گھر میں بیداری اور خواب کے درمیانی حالت میں تھا

روایات بالا کے مقابلہ میں صرف حضرت ابن عباس کا قیاس ہے، قرآن مجید نے اس کو "رویا" سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے، وما جعلنا الرؤیا التی اریناك الا فتنة للناس بخاری کی منقولہ بالا حدیث کے مطابق حضرت ابن عباسؓ تو رؤیا سے "اسریٰ ومعراج" مراد لیتے ہیں لیکن ھی رؤیا عین (یہ مشاہدہ بیداری کا تھا) کا اضافہ کرتے ہیں، جو بی بی ام ہانی اور حضرت عائشہ کی روایات کے مقابلہ میں زیادہ زور دار نہیں قرآن مجید میں "رویا" کا استعمال دوسرے مقام میں "خواب" ہی کے معنی میں ہوا ہے، لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا بالحق (فتح) خیر یہانتک تو تنقید روایات کی بحث تھی، آئیے اب ذرا معراج جسمانی اور روحانی پر عقلی حیثیت سے غور کریں آج علوم جدیدہ سے روشناس ہو جانیکے بعد ایک شخص کہہ سکتا ہے، کہ معراج جسمانی کا عقیدہ محض اساطیری در خرافی پہلو رکھتا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ خدا کی قدرت سے بعید نہیں کہ اس نے آں حضرت کو آسمان پر جسم اقدس کے ساتھ بلایا ہو، تو پھر قوموں کی خرافیات اور ملتوں کے افسانوں کو ماننے میں کیا مضائقہ رہجاتا ہے، مصر کے گلگمیش اور خرافیات ہند کے ہنومان کے عجیب کارناموں پر ایمان لانے میں کیا عذر ہے؟ لیکن سوال یہ ہے کہ سائنس اور فلسفہ کے اکتشافات جدیدہ آج سے کئی صدیاں قبل "خوارق عادات" نہیں سمجھے جاتے تھے، لاسلکی خبریں، اور لاسلکی نغمے آج ہماری روزانہ زندگی کے مشاہدات ہوگئے ہیں، ہم ان پر تعجب نہیں کرتے، آج طیاروں کی سرعت روانگی کا معائنہ کرتے ہیں تو ہم انکار نہیں کرتے، سائنس کا ایک عالم سیاروں کی بے انتہا تیز حرکتیں اور ایک قطرۂ خون میں ہزاروں جراثیم کے وجود کو ہم سے تسلیم کرا لیتا ہے، لیکن ایک صادق و امین کی زبانی جسمانی سیر کا غیر معمولی واقعہ ہم سنتے ہیں تو نہیں مانتے، سائنس اور اکتشافات جدیدہ نے آج دنیا والوں سے بہت سی ایسی باتیں منوالی ہیں جن کا قدیم انسانوں کو مطلق علم نہ تھا یہی باتیں جو آج روزانہ زندگی کا مشاہدہ سمجھی جاتی ہیں قدما کے لئے "خوارق عادات" نہیں تھیں؟ آج ہم اپنے مکان میں بیٹھکر ممالک یورپ و امریکہ کے

---

[1] مسلم کتاب الایمان

محافل رقص و سرود اور مجامع علمی و سیاسی کی آوازیں سنا کرتے ہیں اور قدرت کی اس چھپی ہوئی طاقت کے یکایک دریافت کر لینے کے بعد ایک معمولی درجہ کا آدمی بھی آن واحد میں دور دراز آبادی کے رہنے والے انسانوں کی آوازیں سن لیتا ہے، زمانہ آئے گا جب سائنس کی اختراع فایقہ یہ پردہ بھی ہٹا دیگی، اور مشرق و مغرب کے درمیان آواز کی طرح جسم کا بھی اتصال ہوا کرے گا، سائنس ہم سے ایسی عجیب عجیب باتیں منوا رہا ہے، جن کو ہم پہلے خرافیات سمجھتے تھے، پھر کیا وجہ ہے کہ نوامیس فطرت کا مکمل علم حاصل کئے بغیر ہم کسی ایسی روایت کی تکذیب کر دیں جو ایک صادق انسان کی طرف منسوب ہو، حالانکہ نوامیس فطرت کے مقابلہ میں نہ تو ہمارا دیدۂ بینا ہی مکمل ہے، نہ ہمارا گوش شنوا ہی[1]

اسی کے ساتھ اگر معراج کو روحانی مانا جائے تو بھی آپ کا معجزہ برقرار رہتا ہے: انبیا پر خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں وحی نازل ہوئی ہے، خود قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ اور آں حضرتؐ کے ان خوابوں کا تذکرہ ہے جن کو وحی بتایا جاتا ہے، (انبیا، معجزات) روحانیات اور نفسیات کے ماہرین آج "غیب بینی" (Clairvoyancy) اور "رویاے الہامی" (Prophetic dream) پر زور دے رہے ہیں آں حضرتؐ کو خواب میں اگر یہ معراج ہوئی تو بھی آپ کا یہ معجزہ تھا کیونکہ آپ کی ذکاوت و بصیرت سے آپ کے اس ارتقائے روحانی کا ثبوت ملتا ہے، جس کی نظیر انبیا و رسل کے علاوہ عوام کی زندگی میں میسر ہونے والی چیز نہیں،

قرآن مجید نے جس سادہ پیرایہ میں واقعہ معراج پر روشنی ڈالی ہے، اس پر تو کسی کو اعتراض کا موقعہ نہ تھا لیکن احادیث و تاریخ کی روایات کو پیش نظر رکھکر ایک بہت بڑے معاند اسلام ڈاکٹر ٹسڈل نے جو ہرزہ سرائیاں کی ہیں وہ قابل غور ہیں، وہ لکھتا ہے،

> "ابن اسحٰق سند حدیث کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ محمدؐ کی پیاری بیوی حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ پیغمبر کا جسم (اطہر) غایب نہیں ہوا بلکہ خدا نے آپ کی روح کو معراج عطا فرمایا، دوسری حدیث میں ہے کہ محمدؐ خود فرماتے تھے "میری آنکھیں سو رہی تھیں اور میری روح بیدار تھی" مشہور صوفی مفسر حضرت محی الدین ابن عربی نے پورے واقعہ کو مجازی حیثیت سے تسلیم کیا ہے، یہ یقین ہے کہ جمہور مفسرین و محدثین کا عقیدہ ہے، کہ محمدؐ حقیقۃً مکہ سے بیت المقدس تشریف لے گئے، اور آسمانوں کی سیر بھی کی اور جو کچھ آپ نے کیا اور دیکھا اس کے متعلق وہ طویل واقعات پیش کرتے ہیں جو مسلمانوں کے لئے صد درجہ دلچسپ ہے، یہی حدیث ہے جس کے متعلق ہم بحث کرنا چاہتے ہیں اور ہم بتائیں گے کہ اس کی مخصوص باتیں قدیم روایات خرافی بالخصوص مذہب زردشت سے لی گئی ہیں، ہم پہلے ابن اسحٰق کی روایت نقل کرتے ہیں کیونکہ یہ تمام روایتوں سے جو ہم تک پہونچی ہیں قدیم ہے، اس کا مرتب ابن ہشام لکھتا ہے "محمدؐ کا دعوی

[1] نوٹ از اڈیٹر:- اگر آپ اس کے قایل ہیں کہ معراج جسمانی بھی انہیں اسباب و ذرایع کے ماتحت عمل میں آئی جو آج کل لاسلکی وغیرہ کے اعمال کا باعث ہوتے ہیں تو پھر کوئی جھگڑا باقی نہیں رہتا۔

تھا کہ معراج کے لئے دو مرتبہ جبرئیل میرے پاس تشریف لائے اور دونوں مرتبہ مجھے نیند آگئی، اسی طرح تیسری بار وہ میرے پاس آئے تب انھوں نے مجھکو اپنے پیرسے مس کیا اور میں اوٹھ بیٹھا، تب وہ مسجد کے دروازہ تک لے گئے اور وہاں ایک سفید جانور تھا جو صورت میں خچر اور گدھے کے درمیان تھا اس کے بازوں میں دو پر تھے جس سے وہ اپنے اگلے پیروں پر قبضہ رکھتا ہے اپنا اگلا پیر وہ منتہائے نظر تک قایم رکھتا ہے، انھوں نے مجھکو اس پر سوار کیا تب وہ میرے ساتھ چلے اس طور سے کہ نہ تو وہ مجھ سے آگے نکلے اور نہ میں ان سے آگے نکلا جب میں اس کے پاس پہونچا تو وہ چیخا جبرئیلؑ نے اپنا ہاتھ اس کے ایال پر رکھا تب انھوں نے کہا اے براق! کیا تو جو کر رہا ہے، اس سے شرمندہ نہیں ہے؟ اے براق خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں محمدؐ کے قبل کوئی ایسا بندہ تجھ پر سوار نہیں ہوا جو خدا کے نزدیک زیادہ معزز ہو اس پر براق ایسا شرمندہ ہوا کہ اس کو پسینہ آگیا تب وہ چپ چاپ کھڑا ہو گیا اور میں اس پر سوار ہوا، حسن نے حدیث روایت کی ہے، کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور آپ کے ساتھ جبرئیلؑ بھی گئے یہاں تک کہ آپ ان کے ساتھ بیت المقدس میں پہونچے یہاں آپ نے انبیا کی ایک جماعت کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ حضرت عیسیٰؑ کو بھی دیکھا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے امامت کی اور ان کے ساتھ نماز ادا کی، اس کے بعد جبرئیلؑ دو برتن لائے، ایک میں شراب تھی اور دوسرے میں دودھ تھا آپ نے دودھ کا ظرف اُٹھا لیا اور پی گئے، اور شراب کا برتن چھوڑ دیا اس پر جبرئیل نے کہا اے محمدؐ! آپ فطرت پر ہیں اور لوگ فطرت ہی پر واقع ہوتے ہیں شراب آپ پر حرام کی گئی ہے، تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم جدا ہو گئے، اور صبح کے وقت آپ قریش کے پاس گئے اور ان کو اس کی اطلاع کی، بہت لوگوں نے کہا کہ واللہ یہ معاملہ تو صاف ہے، بخدا ایک قافلہ ایک ماہ میں مکہ سے شام میں پہونچتا ہے، اور ایک ماہ میں مراجعت کرتا ہے، اور یہ صاحب (محمدؐ) مکہ سے ایک رات میں جاتے ہیں، اور واپس آجاتے ہیں"

"اس روایت کے مطابق ایک رات میں محمدؐ مکہ سے صرف بیت المقدس گئے اور واپس ہوئے اس کے بعد کی حدیثیں اس سفر کو زیادہ بتاتی ہیں، یہ تمام حدیثیں خود محمدؐ نے بیان کیں "مشکوٰۃ المصابیح" میں مفصلہ ذیل روایت پائی جاتی ہے[1]

"پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب میں سو رہا تھا ایک آنے والا آیا تب اس نے اس کے اور اس کے درمیان کھولا اور میرا دل نکالا، اس نے میرا دل دھو کر پھر جگہ پر رکھدیا میں اپنے میں آگیا تب میرے لئے ایک سفید جانور آیا جو خچر سے چھوٹا اور گدھے سے لانبا تھا اس کا نام براق ہے، اور وہ اپنا اگلا پیر اپنی حد نظر کے آخر تک

[1] مشکوٰۃ المصابیح کی پوری حدیث جس کا مستدل نے حوالہ دیا ہے، بخاری (کتاب الصلوٰہ) اور مسلم (کتاب الایمان) میں مذکور ہے، دودھ اور شراب کے برتنوں کے متعلق کتاب التفسیر بخاری (سورۂ بنی اسرائیل) میں بھی حدیث پائی جاتی ہے،

رکھتا ہے، میں اس پر سوار ہوا، اور جبرئیل مجھکو لے چلے، یہاں تک کہ میں آسمان کے سب سے نیچے طبقہ تک پہونچا جبرئیلؑ نے داخل ہونا چاہا سوال ہوا کون ہے؟ انھوں نے کہا "جبرئیل" سوال ہوا تمھارے ساتھ کون ہے، انھوں نے کہا "محمدؐ" پوچھا گیا کیا آپ کو بلایا گیا ہے، کہا "ہاں" کہا گیا ان کو مرحبا ہو، آپ کی تشریف آوری بہت خوب ہے "ایکسنے دروازہ کھولدیا جب میں داخل ہوا تو حضرت آدم وہاں تشریف رکھتے تھے، میں نے آپ کو سلام کیا آپ نے جواب سلام دیا، "مرحبا اچھے بیٹے اور اچھے نبی" اس کے بعد اسی قسم کے واقعہ کا اعادہ ہے، ہر طبقہ آسمان پر اسی قسم کا سوال وجواب ہوا اور آپ داخل ہوے دوسرے طبقہ پر آپ نے یوحنا اور عیسیٰؑ کو دیکھا، تیسرے پر یوسفؑ کو چوتھے پر ادریس کو پانچویں پر ہارون کو اور چھٹے پر حضرت موسیٰؑ کو دیکھا، موسیٰؑ رونے آپ سے سبب دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ محمدؐ کی اُمت میری اُمت کی بہ نسبت زیادہ تعداد میں جنت میں داخل ہوگی، ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیمؑ سے ملاقات ہوئی، اور انھوں نے وہی مبارکباد دی، اس کے بعد میں "سدرۃ المنتہیٰ" تک گیا اس کے پھل کمہار کے برتن کی طرح تھے، اور اس کی پتیاں ہاتھی کے کان کی طرح تھیں جبرئیل نے کہا یہ "سدرۃ المنتہیٰ" ہے اس کے بعد چار دریا تھے، دو داخلی اور دو خارجی میں نے کہا اے جبرئیل یہ کیا ہیں، انھوں نے کہا یہ دونو داخلی جنت کے دریا ہیں، اور دونوں خارجی دریاؤں میں نیل و فرات ہیں"

اب ہم کو پتہ لگانا ہے، کہ وہ کون سے ماخذ ہیں جن سے محمدؐ کے اس معراج کا خیال لیا گیا ہے یہ بہت ممکن ہے، کہ یہ قصہ جس کو پہلے پہل خود محمدؐ نے روایت کیا ایک خواب پر مبنی ہو، اور جس میں معراج کا کوئی ذکر نہ ہو اگر سورۃ بنی اسرائیل کو آخری زمانہ سے متعلق سمجھیں، لیکن ہم لوگ اس روایت سے بحث کرنا چاہتے ہیں جو احادیث میں مذکور ہے، اور ان حدیثوں میں واقعہ معراج کی جزئیات پائی جاتی ہیں یہ یقین کرنے کے لئے جیسا کہ آیندہ پتہ چلے گا کافی سبب موجود ہے کہ یہ قصہ اسلئے گڑھا گیا، کہ محمدؐ کو تمام انبیا سے زیادہ سرفراز ثابت کیا جائے، ممکن ہے اس کے اجزا مختلف اطراف سے لئے گئے ہوں لیکن معراج کا خاص خاص واقعہ "ارتا دراف" کے واقعہ معراج پر مبنی ہے، یہ کتاب پہلوی زبان میں ہے، اور اس کا نام "ارتاد راف نامک" ہے آردشیر بابکان[۵] (　　) شاہ فارس کے دور میں یہ کتاب لکھی گئی، اگر مذہب زردشت کے پیروؤں کی روایت یقین کر لی جائے تو اسکی تصنیف کا زمانہ محمدؐ کی ہجرت سے چار سو برس قبل گذرا ہے،

اس کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ جب گبروں کے پیشواؤں نے دیکھا کہ حکومت ایران میں لوگوں کے دماغ سے زردشت کے مذہب کا اثر زائل ہو رہا ہے، تو انھوں نے تازہ شہادتوں سے اپنے دین کے فروغ کے لئے کوشش کی جسے آردشیر کے جوش نے اور تقویت پہونچائی، اس لئے انھوں نے ایک نوجوان عالم کا انتخاب کیا جو ایک بزرگ کی طرح زندگی گزارتا تھا،

[۵] آردشیر خاندان ساسانیہ کا بانی گذرا ہے، اس خاندان نے ایران پر چار سو پندرہ برس تک حکومت کی، آخری فرمانروا یزدجرد کے زمانہ میں سعد بن وقاصؓ نے فتح کیا (ہسٹری آف پرشیا سرجے میلکم)

اور اس کو بہترین تقریبات پاکیزگی سے معراج آسمان کے لئے تیار کیا تاکہ وہ دیکھے کہ وہاں کیا ہے اور وہاں سے پتہ لگائے کہ آیا یہ واقعات ان کی مذہبی کتابوں سے ملتے ہیں یا نہیں روایت کی جاتی ہے، کہ جب اس ارتادراف پر بیخودی کی کیفیت طاری ہوئی، اس کی روح نے قدیم فرشتہ "سروش" کی رہنمائی میں آسمان کی طرف صعود کی، اور ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ تک گزری تو اسکا عروج بلند بتدریج ہوتے ہوتے "ارمزد" کے حضور میں پہونچی، جب ارتاوراف نے اس طرح سے آسمان پر ہر چیز دیکھ لی، اور وہاں کے باشندوں کی خوش باشانہ زندگی کا معائنہ کیا تو ارمزد نے اس کو اپنا پیغمبر بنا کر زمین پر واپس جانے کا حکم دیا، تاکہ جو کچھ اس نے دیکھا تھا، پیروان زردشت سے بیان کرے، اس کے تمام مشاہدات پوری طرح اس کتاب میں مذکور ہیں جو اسی کے نام پر ہے، تمام و کمال اسکو نقل کرنا غیر ضروری ہے لیکن چند اقتباسات سے پتہ چلے گا، کہ کس طرح صاف طریقہ سے یہ مسلمانوں کے یہاں محمدؐ کے قصہ معراج کے لئے نمونہ قرار دیا گیا،

"ارتاوراف نامک" میں لکھا ہے[1]

اور میں پہلا قدم طبقۂ انجم یا "ہومت" پر بڑھاتا ہوں، اور ان مقدس حضرات کی روحوں کو دیکھتا ہوں جن سے روشن ستارہ کے مثل روشنی پھیلتی ہے، اور وہاں بہت روشن، بلند اور پرشکوہ تخت اور نشستگاہ ہے، میں نے مقدس "سروش" اور فرشتہ "آذر" سے دریافت کیا "یہ کون سا مقام ہے اور یہ کون لوگ ہیں؟"

عبارت بالا کی تشریح میں یہ بات قابل ذکر ہے، کہ طبقۂ انجم مذہب زردشت کے عقیدہ کے مطابق جنت کا اولین اور بہترین دربار ہے، آذر اس فرشتہ کا نام ہے جو آگ پر متصرف ہے "سروش" فرشتۂ اطاعت ہے، اور مقدس ارباب ابدی یا دین زردشت کے قدیم ملایکہ میں سے ہے اور وہ مختلف آسمانوں پر ارتاوراف کا بدرقہ رہتا ہے، جیسا کہ جبرئیلؑ محمدؐ کے بدرقہ ہوتے ہیں

اس روایت سے پتہ چلتا ہے، کہ کیونکر ارتاوراف طبقۂ قمر یا دوسرے طبقہ، اور طبقۂ شمس یا محلات آسمانی کے تیسرے طبقہ میں پہونچتا ہے، اسی طرح وہ طبقاً عن طبق گزرتے ہوئے ارمزد کے حضور میں پہونچتا ہے، اس ملاقات کا حال بمفصلہ ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:-

"آخر کار قدیم فرشتہ بہمن اپنے جڑاؤ تخت سے اٹھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے "ہومت" اور "ہوخت" اور "ہورست" میں لایا، اسی طرح ارمزد، ملائکہ قدیم، دوسرے مقدس لوگوں، اور پاک خیال زردشت کی روح اور اسی طرح کے دوسرے دیندار آدمیوں، اور خاصان دین سے ملاقات ہوئی ان لوگوں سے زیادہ منور اور بہتر ہستیاں میں نے نہیں دیکھیں، بہمن نے کہا کہ "یہ ارمزد ہے" اور میں نے اس کو سلام کرنا چاہا، اور اس نے

[1] پوری بحث ڈاکٹر ٹسڈل کی کتاب "ماخذ قرآن" سے لی گئی ہے،

کہا اے ارتاویراف تم پر سلام، مرحبا، تم عالم فانی سے اس مطہر اور منور مقام پر آئے ہو، اور اس نے مقدس "سروش" اور فرشتہ آذر کو حکم دیا کہ ارتاویراف کو لیجاؤ، اور نکوکاروں کا تخت اور انعام اور بدکرداروں کی عقوبت کھاؤ آخر کار مقدس سروش اور آذر فرشتہ نے میرا ہات پکڑا اور وہ لوگ مجھے ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے گئے اور میں نے ان قدیم ملائکہ اور دوسرے فرشتوں کو دیکھا"

اس کے بعد مفصلاً ارتاویراف کی زیارت بہشت اور معائنہ دوزخ کا حال، اور جو کچھ اس نے ان کے اندر دیکھا ان کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس کی سیر دوزخ کے بعد قصہ کی ابتدا یوں ہوتی ہے،

"آخر کار مقدس سروش اور آذر فرشتہ میرا ہات پکڑ کر اس تاریک، خطرناک اور مہیب مقام سے باہر لائے اور ارمزد اور ملائکہ قدیم کے زمرہ میں پہونچایا، اس جگہ نور برس رہا تھا، میں نے ارمزد کو سلام کرنا چاہا، اور وہ مہربان تھا، اس نے کہا اے وفادار بندہ! ارتاویراف! ارمزد کے پرستاروں کے پیغمبر! مادی دنیا میں جا، مخلوقات سے حق و صداقت کے ساتھ بیان کر، جیسا کہ تو نے دیکھا اور جانتا ہے، کیونکہ میں ارمزد یہاں ہوں، جو کوئی صداقت کے ساتھ بولتا ہے، میں سنتا ہوں، تو عقلمندوں سے جا کر گفتگو کر" اور جب ارمزد اس طرح سے بول رہا تھا، میں متعجب کھڑا رہا، چونکہ میں نے ایک روشنی دیکھی، اور جسم نہیں دیکھا بس نے ایک آواز سنی اور جانا کہ یہی ارمزد ہے"

محمدؐ کے قصہ معراج سے ان واقعات کو کیسی مماثلت ہے، اس کے بتانے کی ضرورت نہیں

"زردشت نامہ" میں جس کی تصنیف کا زمانہ غالباً تیرھویں صدی عیسوی ہے، ایک قصہ مذکور ہے، کہ خود زردشت ارتاویراف سے صدیوں قبل آسمان پر گیا اور اس کے بعد اس کو دوزخ کا معائنہ کرنے کی اجازت بھی ملی وہاں اس نے اہرمن کو دیکھا جو قرآن کے ابلیس کے ساتھ بہت قریب ہے،

یہ قصص آریہ دنیا کے صرف ایرانی حصہ تک محدود نہ تھے، سنسکرت میں بھی اسی قسم کے قصے پائے جاتے ہیں جن میں ایک کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو "اندرالوکاگیمنم" یا "اندر کی دنیا کا سفر" کے نام سے مشہور ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ بطل (ہیرو) ارجن نے آسمانوں کا سفر کیا جہاں اس نے اندر کی آسمانی مقام "دیوتی" کا معائنہ کیا جو "نندانم" نامی گلستان میں واقع ہے، ہندؤں کی کتاب سے پتہ چلتا ہے، کہ یہاں ہمیشہ جاری رہنے والے چشمے ان تازہ اور سرسبز نباتات کی آبیاری کرتے رہتے ہیں جو اس خطۂ جمیل میں اگتے ہیں انہیں نباتات کے درمیان ایک درخت ہے، جس کا نام "کپشا جاتی" ہے اور جس کے پھل کو "امرت" (بقا) کہتے ہیں اس کو جو شخص کھا لیتا ہے، مرتا نہیں ہے، اور جو کوئی اس کے نیچے آرام کرتا ہے، اس کے دل کی جو آرزو ہوتی ہے، پوری ہو جاتی ہے،

پیروان زردشت بھی ایک عجیب درخت کے وجود کا تذکرہ کرتے ہیں جس کو "اوستا" میں "ہواپا" اور

پہلوی میں "ہاپا" کہا جاتا ہے، وہ تو حیثیت سے اس کے معنی "اچھے پانی پر قبضہ رکھنے والے" یا "اچھی طرح سے سیراب ہونے کے ہیں" "وندیداد" میں اس کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے:

پاک شفاف پانی "پوتیسکا" سمندر سے "واؤ ر وکاشا" سمندر میں بہتا ہے، اور یہیں سے یہ پانی "ہواپا" میں پہونچتا ہے
یہاں ہر قسم کے نباتات اُگتے ہیں "ہواپا" اور "ہکشا جاتی" مسلمانوں کی بہشت کے "طوبیٰ" یا "شجر نخلی" سے مشابہ ہیں۔

یہ امر قابل لحاظ ہے، کہ اسی قسم کے قصص بعض مسیحی کتابوں بالخصوص "ویسیو پالی" اور "عہد نامہ ابراہیم" میں بھی پائے جاتے ہیں "ویسیو پالی" میں بتایا گیا ہے، کہ کس طرح پولوس آسمان پر گئے، اور بہشت کی چار دریاؤں کو دیکھا اسی طرح "عہد نامہ ابراہیم" میں بھی ابراہیم کی سیر سماوی کا حال بتایا گیا ہے، دونوں کے بارہ میں مذکور ہے کہ انھوں نے جو کچھ وہاں دیکھا ارتاویرات اور محمدؐ کی طرح واپس آکر اہل زبان سے بیان کر دیا حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کہا گیا ہے کہ "اور قدیم فرشتہ میکائیل آپ کو ایک گاڑی پر سوار کرکے اوپر لے گئے اور ان کو آسمان کی فضا میں بلند کیا اور ابر میں انکو اور فرشتوں کے ساتھ لاے ابراہیمؑ نے سواری پر ساری سرزمین آبادی میں سیر کی"

مسلمانوں کے قصہ میں یہ سواری دوسری صورت اختیار کرتی ہے، چونکہ محمدؐ "براق" نامی ایک جانور پر سوار ہوتے ہیں کیونکہ عربوں میں سوار ہونا گاڑی چلانے سے زیادہ متداول ہے، لفظ "براق" غالباً عبرانی لفظ "بارق" (بجلی) سے مشتق ہے جو عربی زبان میں برق ہو گیا گو یہ بھی ممکن ہے، کہ یہ پہلوی زبان سے مشتق ہو،

اب دوسرے امور پر بحث کرنے سے پہلے یہ بات قابل غور ہے، کہ "کتاب یوحنا" میں زمین، جہنم، اور آسمان کے عجائبات کی ایک مبسوط فہرست ہے، جنھیں یوحنا نے اپنے خواب میں دیکھا، اس غیر مستند کتاب نے بلاشبہ "ویسیو پالی" اور "عہد نامہ ابراہیم" پر اثر ڈالا ہے، اور اس طور سے مسلمانوں کی کہانی پر بھی، لیکن یہ قیاس نہیں کر سکتے کہ "ارتاویرات نامک" کو بھی ان کتابوں نے اثر پذیر کیا،

باغ عدن کے "شجر حیات" کے متعلق یہود عجیب و غریب افسانے رکھتے ہیں یہ افسانے الکادین قصوں سے لئے گئے ہیں جن سے "مقدس شجر اریتو" کی روایت کا پتہ چلتا ہے، ڈاکٹر ہلپر کٹ نے "نیپور" کے نزدیک بعض قدیم ترین کتبے پائے ہیں جن میں اس درخت کا تذکرہ پایا جاتا ہے، تفصیل کے ساتھ میں ان واقعات پر بحث کرنا نہیں چاہتا یہودی قصص نے مسلمانوں کی جنت سماوی کی روایت کو اثر پذیر کیا مسلمانوں کا عقیدہ ہے، کہ جنت عدن آسمان پر ہے، اس لئے وہ جنت سماوی کو اسی صورت میں منتقل کرتے ہیں جس صورت میں یہود نے جنت ارضی کو پیش کیا ہے، اس طور سے ان کو مسیحی مذہب کی غیر مستند کتابوں سے بھی غلط فہمی ہو گئی ہو گی، کیونکہ چار دریاؤں کا بیان جو "ویسیو پالی" میں ہے، بظاہر اسی عجیب و غریب وہم کی پیداوار ہے، یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ ان غیر مستند کتابوں کو مسیحی مذہب کے کسی فرقہ نے مستند اور د قیع تسلیم نہیں کیا گو ان میں بعض نے کسی زمانہ میں جہلا کی جماعت میں

بہت زیادہ مقبولیت حاصل کرلی تھی، بعض عرصہ سے مشہور ہیں بعض صدیوں گم ہو کر حال میں دستیاب ہوئی ہیں اس کی تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں کہ مسلمانوں کے درخت طوبیٰ کا واقعہ مذہب زردشت سے ماخوذ ہے، یا یہودیوں سے لیا گیا ہے، یا دونوں سے، کیونکہ مذہب زردشت اور یہود دونوں کے قصص شجر ایک ہی ماخذ کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں لیکن یہودی افسانہ کا اثر اس قصہ پر نہیں پڑا ہے، چار دریا جو محمدؐ نے دیکھے "ولسیو پالی" سے لئے گئے ہیں ولسیو پالی کے چار دریاؤں کا تخیل عدن کے چار دریاؤں کے مشابہ ہے، اور یہ اس غلط فہمی کی بنا پر جس کا سطور بالا میں تبصرہ ہو چکا،

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ بائبل میں یوحنا، ایلیا اور ہمارے آقا (مسیح) کے معراج کا جو واقعہ مذکور ہے وہ تمام ان قصوں کا جن کا تذکرہ ہوا ہے، ماخذ تو نہیں؟ جن ایرانی اور ہندوستانی قصص کا بیان ہو چکا ہے، ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسیحی عقیدۂ معراج کے متعلق یہ قیاس کرنا مشکل اور غیر ضروری ہے، گو یہ ممکن ہے، کہ بعض ایسے دوسرے افکار و عقاید مسیحیت سے ماخوذ ہیں لیکن اگر یہ ہو بھی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ محمد کے معراج کا قصہ ان کے متعلق بعض دوسرے قصص کی طرح دوسرے واقعات کے نمونہ پر جیسا کہ "ارتا دراف نامک" میں مذکور ہے گڑھ لیا گیا ہے، تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے، کہ وہ بعض حیثیت سے حضرت مسیح اور دوسرے انبیا سے جو ان سے قبل گزرے ہیں ملتے ہوئے ہیں۔ گو بہ ہیئت مجموعی مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق آپ تمام انبیا سے افضل ہیں"

ڈاکٹر تسڈل کے ان سارے ہفوات کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) حضرت عیسیٰؑ اور انبیائے سلف کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے کے لئے معراج کا واقعہ مسلمانوں نے محمدؐ کی وفات کے بعد گھڑ لیا ہے،

(۲) معراج کا واقعہ زردشت مذہب کی ایک کتاب ارتا دراف نامک سے ماخوذ ہے، اور اس کے بعض عناصر یہودی اور مسیحی مذہب کی نامعتبر کتابوں "ولسیو پالی" اور "عہد نامہ ابراہیم" سے لئے گئے ہیں

(۳) حضرت عیسیٰؑ، ایلیا وغیرہ کے واقعہ معراج کو جن کا انجیل مقدس میں تذکرہ ہے، محمدؐ کے معراج سے نسبت نہیں،

انسان مجموعہ ہے، متضاد عناصر کا وہ اپنے سارے پندار فضل اپنے تمام دعاوی علم و نظر کے باوجود ایک گہری تاریکی میں ہے، اور اس وقت جبکہ تقلید اور عصبیت کے مرض میں وہ مبتلا ہوتا ہے، تو اس کی بصیرت اور بھی ناکارہ ہو جاتی ہے، ہمارے ڈاکٹر صاحب مسیحیت کی کورانہ تقلید، اور اسلام کے ساتھ جبلی تعصب میں یہ بھی خیال نہیں فرماتے کہ آیا جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں ان کی عالمانہ خودداری اور فاضلانہ دعویٰ تحقیق کے منافی تو نہیں؟ یہ کیا ظلم ہے کہ کسی بات کا مضحکہ اُڑانے کے لئے تو ایک راوی سے استناد کیا جائے، اور پھر اسی کو موقعہ پر نامعتبر اور غیر ثقہ کہہ دیا جائے، وہ معراج کا واقعہ قرآن کے علاوہ حدیث اور تاریخ سے نقل کر دیتے ہیں اور اس پر اچھی طرح زہر فشانیاں کر جاتے ہیں لیکن پھر بھی

یہ کہتے ہیں کہ واقعہ معراج متاخرین نے گھڑ لیا ہے، حالانکہ جس سیرت ابن ہشام اور مشکوۃ المصابیح سے وہ واقعۂ معراج کی جزئیات پیش کرتے ہیں انہیں کتابوں میں یہ روایت آں حضرتؐ سے مرسلاً بیان کی گئی ہے، معراج کی حدیثیں ان بزرگان دین اور صالحات عابدات سے مروی ہے جنھوں نے خود آں حضرت کو دیکھا تھا معلوم ہوتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے تمام زبانیں تو سیکھیں لیکن حدیث کے اقسام انہیں معلوم نہوئے، معراج کا واقعہ خود آں حضرتؐ نے بیان فرمایا اور اصول حدیث کے مطابق اس کے ماننے میں کوئی عذر کی وجہ نہیں اگر آپ محض خیال کی بناپر حضرت ابو سعید حذریؓ حضرت عائشہؓ ابن عباسؓ، بی بی ام ہانیؓ کی شہادتوں کو نہیں مانتے تو پھر میں آپ کی اس تمام کادکاوش خامہ فرسائی کو کیوں تسلیم کرنے لگا، حدیث اور تاریخ کی روایات کو چھوڑئے صرف قرآن کے بیان کردہ واقعہ پر تبصرہ کیجئے، لیکن ایک ہی راوی سے بیک وقت آپ کا اعتماد کرنا اور دوسرے وقت اس کو نامعتبر بتانا علم وادب سے کس قدر کھلا ہوا تمسخر ہے، اگر ڈاکٹر صاحب قرآن کے علاوہ معراج کی جزئیات واحادیث وتاریخ سے پیش کرتے ہیں تو ان کو ماننا پڑے گا کہ معراج کا واقعہ خود آن حضرت نے بیان فرمایا تھا اور متاخرین نے اس کو گھڑا نہیں ہے،

۳۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال بھی عصبیت کا نتیجہ ہے، اور وہ جوش عناد میں روایات کی تطبیق سے کسی صحیح نتیجہ نہیں پہونچے، آپ نے بلند بانگ دعوی کے ساتھ یہ تو سپرد قلم فرمادیا کہ واقعہ معراج "ارتا درافت نامک" سے ماخوذ ہے، اور اس کے بعض عناصر وسیبو پالی اور عہد نامہ ابراہیمؑ سے لئے گئے ہیں لیکن یہاں غور طلب بات یہ ہے، کہ اسلامی معراج کا واقعہ زردشت مذہب کی اس کتاب سے کیونکر لیا گیا اس کی دو ہی صورتیں ہوسکتی تھیں، یا تو "ارتا درافت نامک" (جس کی تصنیف کا زمانہ ڈاکٹر صاحب آں حضرت کی ولادت سے چارسو برس قبل بتاتے ہیں) کی روایت عربوں میں قدیم زمانہ سے مشہور ہو، یا پھر آں حضرت پہلوی زبان کے ماہر ہوں، اور آپ نے بطور خود اس کا مطالعہ کیا ہو، چونکہ اگلے سطور میں یہ ثابت کردیا گیا ہے، کہ واقعہ معراج خود آں حضرت نے بیان فرمایا تھا، یہ متاخرین کی افسانہ تراشی نہیں ہے تاریخ ودرایت کے لحاظ سے دونوں صورتیں مستبعد ہیں اگر ارتا درافت نامک کے واقعہ سے عرب واقف ہوتے تو آں حضرت کے بیان کی تکذیب اور اس سے استہزا کیوں کرتے، حضرت بی بی ام ہانی کی حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے عربوں کے سامنے معراج کا واقعہ پیش کیا تو ان کو تعجب آیا وہ کہنے لگے میں نے ایسا قصہ تو کبھی سنا ہی نہیں پھر آپ حضرت صدیق کے پاس گئے اور ان کو اپنا دمساز بنانے کے لئے تعجب کے ساتھ سارا قصہ بیان کیا جناب صدیق اکبر نے آں حضرت کی تصدیق کی اور اسی دن سے آپ کا لقب "صدیق" ہوگیا، قریش اور کفار کے بڑے بڑے لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کیا چنانچہ ان میں بعض لوگوں کے نام ابن ہشام نے درج کئے ہیں،

اسود بن مطلب بن اسد ابو زمعہ (۲) اسود بن عبد یغوث بن وہب بن عبد مناف بن زہرہ (۳) ولید بن مغیرہ بن عبد اللہ بن عمر بن مخزوم (۴) عاص بن وایل بن ہاشم بن سعید بن سہم، (۵) حرث بن طلاطلہ بن عمرو بن الحرث

بن عبد عمرو بن ملکان ؎ .

ان لوگوں کی استہزا اور شر انگیزیوں پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی

فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین انا کفیناک المستہزئین الذین یجعلون مع اللہ الٰہا آخر فسوف یعلمون

آپ کو جو کچھ حکم ہوا ہے، کر گذریے، اور مشرکوں سے پہلو تہی کیجئے ہم آپ کے لئے کافی ہیں ہنسی اڑانے والے جو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں، پس قریب ہے کہ جان لیں

اگر "ارتا دراف نامک" کی روایت عربوں میں مشہور ہوتی تو کفار تعجب کا اظہار کیوں کرتے، ایسے موقعہ پر تو صرف "اساطیر الاولین" کہکر ٹالدیتے، کفار کے تعجب اور استہزاء سے صاف معلوم ہو رہا ہے، کہ وہ زردشت مذہب کی اس روایت سے بالکل نابلد تھے،

دوسری صورت یہ رہجاتی ہے، کہ آں حضرتؐ پہلوی زبان کے ماہر ہوں گے اس پر بجز ہنسنے کے ڈاکٹر صاحب سے کیا کہا جائے، آپ نے کبھی فارس کا سفر بھی نہیں کیا جہاں زردشت مذہب کی یہ مشہور روایت سنتے، الغرض ڈاکٹر صاحب کا یہ لکھنا کہ واقعہ معراج "ارتادراف نامک" سے ماخوذ ہے، روایت و درایت دونوں لحاظ سے مستبعد ہے، رہگیا دسیو یا لی اور عہدنامۂ ابراہیم سے استفادہ، تو ڈاکٹر صاحب نے محض چار دریاؤں اور درخت طوبی کی حدیث کو ان کتب سے ماخوذ بتایا ہے معراج کے پورے واقعہ کو وہ "ارتا دراف نامک" ہی سے مستفاد بتاتے ہیں

(۳) مسیحیت کے اس پرستار نے اپنے اس دعوی میں کچھ ایسی ہٹ دھرمی اور مغالطہ سے کام لیا ہے کہ ایک غیر جانبدار قاری حیران رہجاتا ہے، کہ اتنا بڑا نکتہ چین اور نقاد مذاہب اپنے پرستارانہ شغف میں اس قدر گم کردہ راہ کیونکر ہو گیا ڈاکٹر صاحب نے بہت بڑا ظلم تو یہ کیا کہ یہ بحث انہوں نے اس مضمون کے فٹ نوٹ میں درج کی ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے، وہ انجیل مقدس کے بیان کردہ واقعات معراج (عیسی، ایلیا وغیرہ) کو منصۂ شہود پر لانا نہیں چاہتے تھے، شاید بعض عاقبت اندیش پادریوں کے مشورہ اور اعتراض سے انھوں نے ضمناً یہ قصہ بھی چھیڑ دیا حالانکہ ضرورت اس کی تھی کہ انجیل مقدس سے پورے واقعہ معراج کو پیش کیا جاتا اور اس کے بعد آں حضرت کے واقعہ معراج سے اس کا فرق وامتیاز دکھایا جاتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور نہ ایسا کیا جا سکتا تھا کیونکہ اس صورت میں ڈاکٹر صاحب کی تمام خردہ بینوں کی داستان صرف قرآن کے ایک جملہ "ان ھذا لفی الصحف الاولی" سے بالکل بے معنی بن کر رہجاتی

عبد المالک آروی

(نگار) ڈاکٹر ٹسڈل نے واقعہ اسریٰ یا معراج پر جو اعتراضات کئے ہیں ان کا جواب دینا اس قدر آسان نہ تھا جتنا ہمارے دوست مولوی عبد المالک نے سمجھا۔ سب سے پہلی اصولی غلطی جو جواب دینے میں کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ .

جواب کی شان وہی مذہبی و روایتی ہے جسے ایک مسلمان تو مان لیگا لیکن دوسرا ماننے پر طیار نہیں ہوسکتا۔

اصل اعتراض یہ ہے کہ معراج نبوی کے جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں بالکل اسی طرح کے واقعات قبل اسلام کے دیگر مذاہب میں بھی نظر آتے ہیں اور اس لئے قوی گمان یہی ہے کہ پیروان رسول نے بعد رحلت نبوی اپنے پیغمبر کی اہمیت قائم کرنے کے لئے ویسی ہی روایات گھڑلی ہوں۔ اس لئے جواب کی دو ہی صورتیں ہوسکتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ سرے سے اس بات کا انکار ہی کردیا جائے کہ دیگر مذاہب میں اس قسم کی روایات پائی جاتی ہیں لیکن چونکہ یہ ممکن نہیں اس لئے اب دوسری صورت صرف یہی رہجاتی ہے کہ دیگر مذاہب کی روایات کو بھی صحیح مان کر یہ جواب دیا جائے کہ جس طرح دیگر انبیا کو معراج ہوئی رسول اللہ کو بھی ہوئی۔ مولوی عبدالمالک صاحب نے جو صورت جواب کی اختیار کی ہے وہ نہایت کمزور و غیر تشفی بخش ہے کیونکہ ان کے جواب کی اصل روح صرف یہ ہے کہ واقعۂ معراج کو رسول اللہ کے بعد لوگوں نے نہیں گھڑا بلکہ خود رسول اللہ نے بیان کیا اور میرے نزدیک جواب کی یہ صورت بہت زیادہ خطرناک ہے کیونکہ اس سے تو خود رسول اللہ پر الزام قائم ہوتا ہے اور کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اگر تم یہ کہتے ہو تو پھر اس کے معنے یہ ہوئے کہ (معاذ اللہ) خود تمہارے رسول نے غلط بیانی سے کام لیا۔

رہا یہ جواب کہ رسول اللہ کو دیگر مذاہب کی یہ روایتیں کیونکر معلوم ہوسکتی تھیں جب کہ اُمی تھے اور جبکہ اُسوقت عرب میں بھی ان روایتوں کا کہیں چرچا موجود نہ تھا، الزام کو دفع نہیں کرسکتا۔ کیونکہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں یہ صرف آپ ہی کا بیان ہے اور دوسرا اس کا ماننے کے لئے طیار نہیں، علاوہ اس کے معترض کو اس بحث میں پڑنے کی ضرورت بھی کیا ہے جبکہ اسنے واقعۂ معراج کے اصل ماخذ کو سامنے لاکر رکھدیا ہے جس سے انکار کرنے کی آپ کو بھی جرأت نہیں ہوسکتی۔

اس قسم کے اعتراضات کا جواب اگر روایات سے بالکل ہٹ کر محض اصول درایت سے نہیں دیا جاسکتا اور ایک غیر مسلم کو اس سے تشفی نہیں ہوسکتی تو ان میں الجھنا ہی بیکار ہے۔

نیاز

سیزر و کلیوپیٹرا

(ڈرامہ برنارڈ شا)

تیسرا ایکٹ

(مسلسل)

شاہی محل کے سامنے، گھاٹ کا ایک کنارہ جہاں سے مغربی سمت میں، اسکندریہ کی مشرقی بندرگاہ کے آگے، جزیرہ فاردس نظر آتا ہے۔ اس جزیرہ کے اختتام پر وہ مشہور منارۂ روشنی ہے۔ جسے ایک تنگ فصیل جزیرہ سے ملاتی ہے۔ یہ سفید سنگ مرمر کا ایک عظیم الشان مستطیل منارہ ہے۔ جو اوپر کی طرف منزل بہ منزل چھوٹا ہوتا جاتا ہے۔ اس کی آخری منزل پر ایک دھات کا بنا ہوا چراغ ہے۔

گھاٹ کے وسط میں، ایک رومن سنتری، پہرا دے رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں بَلَم ہے۔ وہ منارہ کی جانب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے اور اپنے بائیں ہاتھ سے آنکھوں پر چھجا کئے ہوئے ہے۔ بلم ساڑھے چار فٹ کی ایک مضبوط لکڑی ہے جس پر تین فٹ لانبی لوہے کی ایک نوکدار سلاخ لگی ہوئی ہے۔ سنتری اسقدر منہمک ہے کہ وہ اُن بار بردار مصری حمالوں کی آمد کو بھی محسوس نہیں کرتا جو گھاٹ کے شمالی حصے سے نزدیک آتے جا رہے ہیں۔ وہ لپٹے ہوئے قالین لا رہے ہیں۔ اور اُن کے آگے آگے فتاتا اپالوڈورس چلے آ رہے ہیں۔ اپالوڈورس، جو بیس سال کا ایک خوشرو نوجوان ہے؛ حمال، فتاتا کے جلو میں، سنتری کے پیچھے ہو کر گھاٹ پر سے گذر جاتے ہیں اور محل تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں پہنچکر وہ اپنی گٹھریوں کو نیچے رکھ دیتے ہیں۔ اور پالتھی مار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اپالوڈورس ان کے ہمراہ زینہ تک نہیں جاتا بلکہ ٹھیر جاتا ہے اور سنتری کے انہماک سے تفریح حاصل کرتا ہے۔

اپالوڈورس:۔ (سنتری کو مخاطب کر کے) کون جاتا ہے؟"

سنتری:۔ (بینائی سے چونک کر، حملہ کرنے کے لئے اپنا بلم اٹھاتا ہے وہ ایک پستہ قد، منحنی نوجوان ہے۔ اسکے بال مٹیالے رنگ کے ہیں۔ اور چہرے سے عمر رسیدگی اور احساس فرض نمایاں ہے) "یہ کیا حرکت ہے۔ کھڑے رہو۔ تم کون ہو؟"

اپالوڈورس:۔ "میں سسلی کا اپالوڈورس ہوں۔ اے میاں! تم لوگ کیا خواب دیکھا کرتے ہو۔ جب سے میں تمھاری بارک میں، اس گول کمرے کے پاس سے داخل ہوا ہوں، اسوقت سے، میں اور میرے ہمراہی، تین سنتریوں کے پاس سے گذر چکے ہیں۔ لیکن سب کے سب، مثل ہ۔

کی روشنی کے دیکھنے میں اسقدر منہمک ہیں کہ ان میں سے کسی نے بھی مجھے نہ روکا۔ کیا رومیوں کا انتظام ایسا ہی ہے"۔

سنتری:۔ "ہم یہاں سمندر کے دیکھنے پر متعین ہیں، خشکی کے دیکھنے پر نہیں۔ سیزر ابھی فاروس میں اترا ہے (فتاتیا کی طرف دیکھ کر) ارے یہ کون ہے۔ اس چینی کی گڑیا کا کیا نام ہے"۔

فتاتیا:۔ "اپالوڈورس، اس رومی کتے کو دھمکاؤ۔ اور اُسے حکم دو کہ اپنی زبان کو، ملکہ کے محل کی مالکہ، فتاتیا کے سامنے لگام دے کر رکھے"۔

اپالوڈورس:۔ میرے دوست۔ یہ ایک جلیل القدر خاتون ہے جسکی سیزر بھی عزت کرتا ہے۔

سنتری:۔ (غیر متاثر انداز سے قالین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اور یہ کیا چیز ہے۔؟

اپالوڈورس:۔ ملکہ کا محل آراستہ کرنے کے لئے قالین ہیں۔ میں نے ان کو دنیا کے بہترین قالینوں میں سے انتخاب کیا ہے۔ اور ملکہ ان قالینوں میں سے اپنی پسند کے مطابق خود منتخب کریگی۔

سنتری:۔ تو تم قالین کے سوداگر ہو۔؟

اپالوڈورس:۔ میرے دوست میں ایک شریف آدمی ہوں۔

سنتری:۔ ایک شریف۔ ایک شریف جو قالین کی دوکان رکھتا ہے۔

اپالوڈورس:۔ میں دوکاندار نہیں ہوں۔ میں پرستار حسن ہوں اور میرا یہ فرض ہے کہ خوبصورت اشیاء کا خوبصورت شہزادیوں کے لئے انتخاب کیا کروں۔ میرا مطمح نظر یہ ہے کہ فن کو فن کے لئے اختیار کرنا چاہیے

سنتری:۔ تمہارا یہ بیان تو کلمۂ اجازت نہیں ہے۔

اپالوڈورس:۔ یہ ایک عام اجازت نامہ ہے۔

سنتری:۔ مجھے عام اجازت کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ یا تو مجھے آج کا کلمۂ اجازت بتاؤ۔ یا پھر اپنی دوکان پر واپس جاؤ۔ (فتاتیا اس کے کرخت لہجے سے غضبناک ہو کر چیتے کی سی تیز رفتاری سے دوڑ کر گھاٹ کے سرے پر سے گذر کر اس کے پیچھے پہونچ جاتی ہے)

اپالوڈورس:۔ اگر میں دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہ کروں تو کیا ہو؟

سنتری:۔ تو میں یہ نیزہ تمہارے بدن میں بھونک دونگا۔

اپالوڈورس:۔ تمہاری مرضی۔ (وہ اپنی تلوار سونت لیتا ہے۔ اور اپنی حفاظت پر تیار ہو جاتا ہے)

فتاتا:۔ (اچانک پیچھے سے سنتری کے ہاتھ پکڑ کر) اپالوڈورس اپنا چاقو اس کتے کے حلق میں اُتار دو (بہادر اپالوڈورس ہنستے ہوئے اپنے سر کو جنبش دیتا ہے۔ اور سنتری کے پاس سے اچک کر محل کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اور اس کے نیزہ کی نوک جھکا دیتا ہے)

سنتری:۔ (بے سود کشمکش کرتے ہوئے) تم پر خدا کی مار۔ مجھے جانے دو۔ اوہ۔ مدد۔ مدد۔

فتاتا:۔ (اسے زمین سے اٹھا کر) اس رومی سانپ کو مار ڈالو، اس کو اپنی تلوار کی نوک پر اٹھا لو۔ (دو رومی سپاہی ایک صوبیدار کے ساتھ شمالی گھاٹ کے کنارے سے دوڑتے ہوئے آتے ہیں وہ اپنے ساتھی کو چھڑاتے ہیں۔ اور فتاتا کو دھکیل دیتے ہیں۔ جو چکراتی ہوئی سنتری کی بائیں جانب گر پڑتی ہے۔)

صوبیدار:۔ (ایک پنجاہ سالہ سخت زبان اور بد تہذیب آدمی ہے۔ جو ہاتھ میں ایک انگور کی لکڑی کا ڈنڈا لئے ہوئے ہو) کیا ہوا؟ یہ کیا گڑ بڑ ہے؟

فتاتا:۔ (اپالوڈورس سے) تم نے اس پر کیوں حملہ نہیں کیا۔ اور وقت ہاتھ سے جانے دیا۔

اپالوڈورس:۔ صوبیدار۔ میں ملکہ کے حکم سے یہاں ....

صوبیدار:۔ (بات کاٹ کر) ملکہ۔ ہاں۔ ہاں۔ (سنتری سے) اس کو اندر جانے دو۔ بازاری آدمیوں کو ان کے تمام سامان کے ساتھ ملکہ کے پاس اندر جانے دو۔ لیکن یہ خیال رہے۔ کہ کوئی ایسا شخص باہر نہ جانے پائے جسے تم نے اندر نہیں جانے دیا۔ حتیٰ کہ ملکہ بھی۔ نہ نکلنے پائے۔

سنتری:۔ یہ بوڑھی عورت بہت خطرناک ہے۔ اور تین آدمیوں کے برابر طاقتور ہے۔ وہ سوداگر سے کہہ رہی تھی کہ مجھ پر چاقو سے حملہ کرے۔

اپالوڈورس:۔ صوبیدار۔ میں سوداگر نہیں ہوں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں اور مختلف آرٹ کا ماہر

صوبیدار:۔ کیا یہ عورت تمھاری بیوی ہے؟

اپالوڈورس:۔ (خوفزدہ ہو کر) نہیں۔ نہیں۔ (اپنے لہجہ کو نرم کرتے ہوئے) وہ میری بیوی نہیں ہے۔ ایک عالی وقار خاتون ہے۔

فتاتا:۔ (صوبیدار سے) رومی۔ میں ملکہ کے گھر کی مہتمم ہوں

صوبیدار:۔ محترمہ ہمارے سپاہیوں سے ذرا علیحدہ رہو ورنہ مجبوراً مجھے تم کو یہیں ساحل پر دفن کر دینا پڑے گا۔ خواہ تم دس آدمیوں کے برابر طاقتور کیوں نہ ہو۔ (اپنے آدمیوں سے) اپنی اپنی جگہ پر جاؤ (وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ جدھر سے آیا تھا اسی طرف چلا جاتا ہے)

فتاتا:۔ (نفرت آلود نگاہوں سے دیکھ کر) مجھے دیکھنا ہے۔ کہ آئی سس دیوتا سب سے زیادہ کس سے محبت کرتا ہے اپنی خادمہ فتاتا سے یا روم کے ایک کتے سے۔

سنتری:۔ (اپالوڈورس سے، اپنے ڈنڈے کا سرا محل کی طرف اٹھا کر) ادھر جاؤ۔ (فتاتا سے مخاطب ہو کر) میرے پاس آ۔ او گھڑیال کی خالہ، میں یہ ڈنڈا تیرے حلق میں ڈالوں گا۔

کلیوپیٹرا:۔ (محل سے پکار کر) فتاتا۔ فتاتا۔

فتاتا:۔ (گھبرائے ہوئے لہجے میں) کھڑکی سے ہٹو۔ کھڑکی سے ہٹ جاؤ۔ یہاں آدمی ہیں۔

کلیوپیٹرا:۔ میں نیچے آرہی ہوں۔

فتاتا:۔ (مضطرب ہو کر) نہیں، یہ تم کیا خواب دیکھ رہی ہو۔ اپالوڈورس اپنے آدمیوں سے کہو کہ سامان اٹھا کر جلدی جلدی میرے ساتھ چلیں۔

اپالوڈورس:۔ ملکہ کے منتظمہ حکم کی تعمیل کرو۔

فتاتا:۔ (مزدوروں سے) جلدی کرو۔ جلدی (کلیوپیٹرا محل سے باہر نکل کر گھاٹ پر آجاتی ہے) اوہ۔ کاش میں پیدا نہ ہوتی۔

کلیوپیٹرا:۔ (آرزومند نگاہوں سے) فتاتا میں نے کچھ سوچا ہے مجھے فوراً ایک کشتی کی ضرورت ہے۔

فتاتا:۔ ایک کشتی۔ نہیں نہیں۔ تمھیں نہیں مل سکتی۔ اپالوڈورس، ملکہ سے ملو۔

اپالوڈورس:۔ (خاص انداز سے) حسین ملکہ۔ میں سسلی کا باشندہ ہوں۔ اور آپ کے لئے دنیا کے بہترین قالین لایا ہوں۔ آپ اس میں سے خود انتخاب

فرمالیں۔

کلیوپیٹرا:۔ آج قالین کے انتخاب کی مجھے فرصت نہیں، مجھے ایک کشتی کی ضرورت ہے۔

فتاتا:۔ یہ کیا جنون ہے تم شاہی جہاز کے سوا اور کسی چیز پر سمندر میں نہیں جاسکتیں۔

اپالوڈورس:۔ بادشاہت جہاز میں نہیں رہتی۔ بلکہ خود ملکہ میں موجود ہے (کلیوپیٹرا سے) آپ کے قدموں کے چھو جانے سے بدترین کشتی بھی شاہانہ جہاز بن سکتی ہے۔ (وہ ساحل کی طرف پلٹ کر پکارتا ہے) او ملاحو! ادھر آؤ۔

کلیوپیٹرا:۔ اپالوڈورس آج سے تم میرے سردار ہو۔ اور میں اپنے قالین ہمیشہ تمہارے ہی ذریعہ سے خریدا کروں گی (اپالوڈورس سر تسلیم خم کرتا ہے۔ گھاٹ کے پاس ایک پتوار اور ایک ملاح نظر آتا ہے۔ جس کا چہرہ دھوپ کی تپش سے سیاہ پڑگیا ہے، وہ پانی سے نکل کر پتوار ہاتھ میں لئے ہوئے سنتری کی داہنی جانب پہنچ جاتا ہے اور حکم کا انتظار کرتا ہے) اپالوڈورس کیا تم کشتی چلا سکتے ہو!

اپالوڈورس:۔ میرے بازو ہر ضرورت کے لئے حاضر ہیں۔ کس طرف چلنے کا قصد ہے؟

کلیوپیٹرا:۔ روشنی کے مینار کی طرف (وہ اترتی ہے)

سنتری:۔ (اپنے بھالے سے روک کر) کھڑی رہو۔ تم نہیں جاسکتیں۔

کلیوپیٹرا:۔ (برہم ہوکر) تجھے یہ جرأت کیونکر ہوئی۔ کیا تو نہیں جانتا کہ میں ملکہ ہوں؟

سنتری:۔ مجھے یہی حکم ملا ہے کہ تم نہیں جاسکتیں۔

کلیوپیٹرا:۔ اگر تم نے نہ جانے دیا تو میں سیزر سے کہہ کر تم کو قتل کرادوں گی۔

سنتری:۔ اگر میں اپنے حاکم کا حکم ٹال دوں تو وہ میرے ساتھ اس سے بھی برا سلوک کرے گا۔

کلیوپیٹرا:۔ فتاتا! اس کو پکڑلو۔

سنتری:۔ (مبہوت ہوجاتا ہے۔ اور نہایت غصے سے فتاتا کو گھورتے ہوئے اپنا نیزہ اٹھاکر) بس وہیں کھڑی رہ!

کلیوپیٹرا:۔ (اپالوڈورس کے پاس پہونچ کر) اپالوڈورس، اپنے غلاموں سے کہو کہ میری مدد کریں۔

اپالوڈورس:۔ ملکہ مجھے ان کی امداد کی ضرورت نہیں۔ (تلوار میان سے کھینچ لیتا ہے) اے سپاہی بتا کہ تلوار کا مقابلہ تلوار سے کرے گا یا بھالے سے؟

سنتری:۔ رومی، ایک سسلی کے مقابلے میں! تجھ پر قہر نازل ہو۔ سنبھل جا۔ (وہ اپنے بھالے سے اپالوڈورس پر وار کرتا ہے۔ جو تیزی سے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہے۔ بھالا اس کے سر پر سے سنسناتا ہوا زمین پر گر پڑتا ہے۔ اپالوڈورس فتحمندی کا ایک نعرہ لگاکر کھڑا ہوجاتا ہے۔ اور سنتری پر حملہ کرتا ہے۔ سنتری بھی تلوار کھینچ کر مقابلہ کرتا ہے۔ اور چلاتا ہے) او محافظ۔ مدد۔ مدد۔

کلیوپیٹرا:۔ بھاگ کر محل میں اس مقام پر پناہ لیتی ہے جہاں مزدور سامان کے پاس کھڑے ہوئے ہیں۔ اور ملاح خوفزدہ سیڑھیوں کی طرف دوڑتا ہے۔ لیکن لڑائی دیکھنے کی غرض سے آخری سیڑھی پر کھڑا ہوجاتا ہے۔ اور سنتری فتاتا کے حملہ کے خوف سے گھبرایا ہوا۔ اور وہ اپنی تلوار سے اچھی طرح کام نہیں لیسکتا

کیونکہ اُسے بار بار پیچھے بھی مڑنا پڑتا ہے۔ تاکہ فتاتا کو اپنے پاس نہ آنے دے۔ صوبیدار کئی سپاہیوں کے ساتھ واپس آتا ہے۔ اپالوڈورس کلیوپیٹرا کی طرف ہٹ جاتا ہے۔ کیونکہ نئے سپاہیوں کی آمد سے وہ خوفزدہ ہے۔

صوبیدار:۔ (سنتری کے داہنے جانب آکر) یہ کیا ہے؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟

سنتری:۔ (ہانپتے ہوئے) اگر یہ عورت نہ ہوتی تو میں تنہا اس کا جواب دیتا۔ اس کو مجھ سے دُور رکھو۔ بس مجھے اتنی ہی مدد کی ضرورت ہے۔

صوبیدار:۔ سپاہی تم بیان کرو کہ کیا ہوا؟

فتاتا:۔ صوبیدار اس نے ملکہ کو قتل کر ڈالا ہوتا۔

سنتری:۔ غلط ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ ملکہ یہاں سے نکل نہ پائے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ کشتی لے کر مینار جانا چاہتی ہے۔ چونکہ مجھے حکم دیا گیا تھا۔ اس لئے میں نے اسکو روک لیا۔ اس پر اُس نے اس آدمی کو میرے پیچھے لگا دیا۔

رسالدار:۔ (کلیوپیٹرا سے) کلیوپیٹرا میں تم کو بچانے کا ذمہ دار ہوں۔ لیکن سیزر کی اجازت کے بغیر تم باہر نہیں جا سکتیں۔

اپالوڈورس:۔ یہ بتاؤ کہ جہاں سیزر مقیم ہے وہ رومی حدود میں ہے یا نہیں۔

کلیوپیٹرا:۔ ہاں، ہاں، اب بن پڑے تو اس کا جواب دو۔

رسالدار:۔ (اپالوڈورس سے) جہاں تک تمہارا تعلق ہے اپالوڈورس، تم کو دیوتاؤں کا شکرگزار ہونا چاہیئے۔ کہ تم اس ڈنڈے کی مار سے محل کے دروازے میں کیل کی طرح جڑ نہیں دیئے گئے۔

اپالوڈورس:۔ (متانت سے) میرے فوجی دوست میں ایک ایسے بھدے ہتھیار سے قتل کئے جانے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہوں۔ اگر میں شکست بھی کھاؤں گا تو اس (تلوار میان سے کھینچ کر) سفید ہتھیاروں کی ملکہ سے۔ اور یہی ایک ہتھیار ایک آرٹسٹ کے لئے موزوں بھی ہے مگر اس وقت جبکہ تم کو یقین ہو گیا ہے۔ کہ ہم رومی حدود سے باہر نہیں جانا چاہتے۔ تو مجھے اجازت دو۔ کہ میں تمہارے سنتری کا خاتمہ کر دوں۔ اور ملکہ کو لے کر چلا جاؤں۔

رسالدار:۔ (سنتری غصہ سے منہ بنانے لگتا ہے) خاموش رہو کلیوپیٹرا مجھے شاہی احکام کی تکمیل کرنا ہے۔ اس لئے اب تم محل میں جاؤ۔ اور قالینوں کا انتخاب کرو۔

کلیوپیٹرا:۔ (سر ہلا کر) میں نہ جاؤں گی۔ میں ملکہ ہوں۔ سیزر مجھ سے اس طرح گفتگو نہیں کرتا۔ جیسے تم کرتے ہو۔ کیا سیزر کے رسالدار نے اپنی تہذیب کھو دی ہے؟"

رسالدار:۔ (نرمی سے) ملکہ میں اپنا فرض ادا کرتا ہوں۔ اور یہی میرے لئے اطمینان کا باعث ہے۔

اپالوڈورس:۔ ملکہ جب کوئی بزدل انسان ایسا کام کرتا ہے جس پر اسے منفعل ہونا چاہیئے۔ تو ہمیشہ یہی کہہ دیتا ہے کہ یہ میرا فرض ہے۔

رسالدار:۔ (غصہ سے) اپالوڈورس ———

اپالوڈورس:۔ (بات کاٹ کر نہایت خوبی سے) میں اس توہین کا انتقام کسی وقت ضرور اپنی تلوار سے لوں گا۔ (کلیوپیٹرا سے) سنئے۔ جب تک سیزر کا فرمان ان لوگوں کے پاس

نہ آجائے آپ ان کی قیدی ہیں۔

اپالوڈورس:۔ آپ مجھے اپنے پیغام اور تحفے کے ساتھ سیزر کے پاس جانے کی اجازت دیجئے۔ اور قبل اس کے کہ آفتاب سطح بحر کے نصف حصے تک پہونچے گا۔ میں آپ کی رہائی کا فرمان سیزر کے پاس سے لیکر آجاؤنگا

رسالدار:۔ (اس کو نفرت سے دیکھ کر) اور اس میں شک نہیں کہ وہ تحفہ تم خود ملکہ کے ہاتھ فروخت کروگے۔

اپالوڈورس:۔ رسالدار، وہ تحفہ میں بلا معاوضہ ملکہ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ جو مصری حُسن کی بارگاہ میں ایک پُرخلوص دل کا نذرانہ ہوگا۔ اور وہ تحفہ قالین کا ہوگا۔ جو ان تمام قالینوں میں سب سے عمدہ قالین ہے۔

کلیوپیٹرا:۔ (تعریف کرتے ہوئے رسالدار سے) اب تم کو معلوم ہوا کہ تم کیسے جاہل آدمی ہو؟

رسالدار:۔ (برہم ہوکر) ہاں ایک بیوقوف اور اس کا سامان دونوں ایک دوسرے سے بہت جلد جدا ہوجاتے ہیں (اپنے سپاہیوں کی طرف پھر کر) دیکھو دو آدمی یہاں مقرر کئے جاتے ہیں۔ تاکہ اس آدمی اور اس کے سامان کے سوا یہاں سے اور کوئی نہ جانے پائے۔ اگر وہ پھر یہاں آکر اپنی تلوار سے دھمکائے تو اس کو قتل کرڈالنا۔ جاؤ، اپنی اپنی جگہ جاکر پہرہ دو۔

(وہ دو اور مددگاروں کو مقرر کرکے چلا جاتا ہے)

اپالوڈورس:۔ (دوستانہ لہجے میں) میرے دوستو کیا تم محل میں آکر ان جھگڑوں کو شراب کے پیالوں میں دفن نہ کردوگے؟ (وہ اپنی تھیلی نکالتا ہے جس میں روپیوں کی جھنکار آتی ہے) یہ دیکھو ملکہ نے تم سب کے لئے انعامات بھیجے ہیں۔

سنتری:۔ (بہت رکھائی سے) تم نے رسالدار کے احکام سُن لئے۔ بس جاؤ۔ اپنا کام کرو۔

پہلا مددگار:۔ ہاں تم کو جلد چلا جانا چاہیے۔ جاؤ چلے جاؤ

دوسرا مددگار:۔ (تھیلی کو للچائی نظروں سے دیکھ کر) ایک غریب آدمی کو لالچ نہ دلاؤ۔

اپالوڈورس:۔ (کلیوپیٹرا سے) شہزادیوں کی سرتاج۔ رسالدار قریب ہے۔ اور جب رومی سپاہی کا افسر قریب ہو تو وہ بے ایمانی نہیں کرسکتا۔ مجھے تمہارا پیغام سیزر کے پاس لے جانا چاہیئے۔

کلیوپیٹرا:۔ (جو قالینوں کے درمیان بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی) کیا یہ قالین بہت بھاری ہیں؟

اپالوڈورس:۔ بھاری ہونے سے کیا حرج ہے۔ یہاں بہت سے مزدور ہیں۔

کلیوپیٹرا:۔ قالین کشتیوں میں کس طرح رکھتے ہیں؟ کیا ان کو کشتی کے نیچے ڈال دیتے ہیں؟

اپالوڈورس:۔ نہیں ملکہ چھوٹی کشتی میں نیچے رکھنے سے کشتی ڈوب جائے گی۔

کلیوپیٹرا:۔ تاہم اگر میں سیزر کو صرف ایک قالین بھیجوں تو تم اس میں لیجا سکتے ہو؟

اپالوڈورس:۔ یقیناً۔

کلیوپیٹرا:۔ تم اس کو آہستہ آہستہ لے جانا اور راستے میں اس کی پوری حفاظت کرنا۔

اپالوڈورس:۔ آپ مجھ پر اعتماد رکھئے۔

کلیوپیٹرا:۔ بہت حفاظت سے!

اپالوڈورس:۔ اپنی جان سے زیادہ، ملکہ،

کلیوپیٹرا:۔ بہت خوب۔ فتاتا، ادھر آؤ۔ (فتاتا اس کے پاس آتی ہے اپالوڈورس اُسے قالین محل میں لے جانے کو کہتا ہے) نہیں اپالوڈورس تم کو نہ آنا چاہئے۔ میں خود ہی قالین کا انتخاب کرلوں گی۔ تم کو یہیں ٹھہرنا چاہئے۔ (وہ محل میں چلی جاتی ہے)

اپالوڈورس:۔ (مزدوروں سے) اس خاتون کے حکم کی تعمیل کرو۔ (مزدور اٹھ کر کام میں لگ جاتے ہیں)

فتاتا:۔ (مزدوروں کو مخاطب کرکے) اس طرف مگر سیڑھی پر پاؤں رکھنے سے پہلے جوتے اُتار ڈالو۔ (وہ قالین لئے ہوئے مزدوروں کے ساتھ اندر جاتی ہے۔ اس اثناء میں اپالوڈورس پل کے کنارے جاتا ہے اور ساحل کی طرف دیکھتا ہے۔ سنتری اس کو نفرت سے دیکھتے ہیں)

اپالوڈورس:۔ (سنتری کو مخاطب کرکے) میرے دوست۔

سنتری:۔ خاموش رہو۔

پہلا مددگار:۔ اپنی زبان بند کرو۔

دوسرا مددگار:۔ (پل کے شمالی کنارے کی طرف دیکھ کر) کیا تم ایک لمحہ کے لئے ٹھیر سکتے ہو۔؟

اپالوڈورس:۔ صبر سے کام لے تین سر والے گدھے (وہ آپس میں چہ می گوئیاں کرنے لگتے ہیں لیکن اپالوڈورس اس سے خوفزدہ نہیں ہوتا) سنو۔ یہ بتاؤ کہ تم یہاں میری نگرانی کے لئے مقرر کئے گئے ہو یا مصریوں کی؟

سنتری:۔ ہم اپنے فرائض بخوبی جانتے ہیں۔

اپالوڈورس:۔ تو پھر ان کو انجام کیوں نہیں دیتے؟ دو دیکھو وہاں کیا ہو رہا ہے (جنوب کی طرف اشارہ کرتا ہے)

سنتری:۔ مجھے تم ایسوں کی ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔

اپالوڈورس:۔ (شور کرتا ہے) رسالدار، دوڑو۔ دوڑو

سنتری:۔ اپنی مجذوبانہ بڑ کو ختم کر (شور مچا کر، ہو ہو۔ خطرہ۔ خطرہ۔

پہلا اور دوسرا مددگار:۔ خطرہ خطرہ۔ دوڑو۔ دوڑو۔ (رسالدار اپنے محافظوں کو لے کر آتا ہے)

رسالدار:۔ کیا گڑبڑ ہے۔؟ کیا بوڑھی عورت نے پھر تم پر حملہ کیا۔ (اپالوڈورس سے) کیا تم ابھی یہیں ہو؟

اپالوڈورس:۔ (اشارہ کرکے) ادھر دیکھو مصری حرکت کر رہے ہیں۔ اور خشکی اور تری دونوں طرف سے حملے کریں گے۔ خشکی پر تو بڑے پل کی طرف سے۔ اور تری میں مغربی ساحل کی طرف سے۔ میرے دوست تو جاؤ شکار نکل گیا۔ (متعدد بگلوں کی آوازیں مختلف سمتوں سے آتی ہیں)

رسالدار:۔ (تیزی سے) دونوں زائد آدمی جنوبی مقام پر جاکر اس خطرہ کی اطلاع دیں، ایک آدمی یہاں پہرہ دے۔ اور باقی سب میرے ساتھ جلد چلو۔ (دونوں مددگار سنتری جنوب کی طرف دوڑتے ہیں۔ رسالدار اور اس کے ہمراہی شمالی جانب جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہی بگل کی آواز آتی ہے۔ چاروں مزدور قالین لئے ہوئے۔ فتاتا کے ہمراہ محل سے برآمد ہوتے ہیں)

سنتری:۔ (اپنا ڈنڈا سنبھال کر) تم پھر نکلے (مزدور ٹھیر جاتے ہیں)

فتاتا:- رومی جوان صبر کر۔ اب تو تنہا ہی اپالوڈورس!
یہ قالین کلیوپیٹرا نے سیزر کو بطور تحفہ بھیجا ہے اس
کے اندر دس بہت نفیس بلوریں جام ہیں۔ اور
مقدس نیلے کبوتر کے ایک ہزار انڈے ہیں۔ میں انھیں
تمہارے حوالے کرتی ہوں۔ اس میں سے ایک بھی
ٹوٹنے نہ پائے۔

اپالوڈورس:- میں ذمہ دار ہوں۔ (مزدوروں سے)
چلو اس کو حفاظت سے لے کر کشتی میں رکھو۔
(مزدور سیڑھی پر سے قالین لے کر اترتے ہیں)

پہلا مزدور:- (کشتی کو دیکھ کر) ان انڈوں میں سے تقریباً
ہر ایک، ایک پونڈ سے زیادہ وزنی ہے۔ یہ کشتی
اتنے بھاری بوجھ کو نہیں اُٹھا سکتی۔

ملاح:- (تعجب سے سیڑھیوں پر دوڑ کر) او احمق مزدور۔
او اونٹنی کے بچے (اپالوڈورس سے) جناب میری
کشتی ایک دفعہ میں پانچ آدمیوں سے زیادہ لے
جاتی ہے۔ کیا یہ آپ کو اور کبوتر کے انڈوں کو
نہیں لے جا سکتی۔ (مزدور سے) او شریر اونٹنی کی
بچے۔ دیوتا تجھے اس حاسدانہ شرارت کی سزا
دیں گے۔

پہلا مزدور:- اس وقت میں تجھے ٹھیک کرنے کے لئے
اپنا کام نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن ٹھیر جا۔ کل تجھے
اس کا مزہ چکھاؤں گا۔

اپالوڈورس:- (بیچ بچاؤ کر کے) ٹھیر جاؤ۔ گڑبڑ نہ کرو۔
اگر کشتی ایک ہی تختے کی ہوتی تو بھی میں اس پر سیزر
کے پاس پہونچتا!!

فتاتا:- (بےچینی سے) خدا کے لئے اپالوڈورس اس گٹھری
کی خاطر، خطرہ میں نہ پڑو۔

اپالوڈورس:- محترم خاتون، ڈرو نہیں۔ (مزدوروں سے)
چلو اس کو اٹھا کر نیچے لے چلو۔ آہستہ آہستہ ورنہ
دس دن تک خاک پھانکنا پڑے گی۔ (ملاح گٹھری
لئے ہوئے مزدوروں کے ساتھ سیڑھیوں سے نیچے اترتا ہے
فتاتا اور اپالوڈورس اوپر سے دیکھتے رہتے ہیں)

اپالوڈورس:- آہستہ آہستہ میرے لڑکو۔ میرے بچو۔
(یکایک خوفزدہ ہو کر) آہستہ اٹھاؤ۔ اس کو نیچے رکھ دو۔
اس طرح۔ ہاں اب ٹھیک ہے۔

فتاتا:- (ایک مزدور پر غصہ ہو کر) اس پر پاؤں مت رکھ۔
اس پر پاؤں مت رکھ۔ او جانور۔

پہلا مزدور:- (گٹھری پر چڑھتے ہوئے) بی صاحبہ غصہ
نہ ہو سب ٹھیک ہے۔

فتاتا:- (ہانپ کر) سب ٹھیک ہے، تو نے تو میرا
کلیجہ ہلا ڈالا۔ (وہ قریب کی دیوار پکڑ لیتی ہے۔ چاروں
مزدور اب ادھر آجاتے ہیں۔ اور اجرت دیے جانے کا
انتظار کرتے ہیں)

اپالوڈورس:- ادھر آؤ۔ بھوکو۔ (وہ پہلے مزدور کو کچھ دیتا
ہے۔ جو ہاتھ میں لے کر دوسرے مزدوروں کو دکھاتا ہے۔ سب
حریصانہ دوڑ کر اسے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس کی
دریادلی سے مسرور ہو جاتے ہیں۔)

پہلا مزدور:- او سخی شہزادے۔

دوسرا مزدور:- او بازار کے مالک۔

تیسرا مزدور:- او دیوتاؤں کے منظور نظر۔

چوتھا مزدور:- اور مزدوروں کے مربی۔

سنتری:- (حاسدانہ اپنے گرز سے ان کو دھمکا کر) بھاگ جاؤ کتو۔ یہاں سے منہ کالا کرو۔ (وہ شمال کی جانب پُل کی طرف بھاگنے لگتے ہیں۔)

اپالوڈورس:- خدا حافظ فتاتا۔ میں مینار پر مصریوں سے قبل ہی پہنچ جاؤں گا۔ (سیڑھیوں سے اترتا ہے۔)

فتاتا:- جا، دیوتا تجھے جلد پہونچائیں۔ اور میری بچی کو محفوظ رکھیں۔ (سنتری جو مزدوروں کا تعاقب کر رہا تھا واپس آتا ہے اور کشتی کی طرف نظر دوڑاتا ہے جو سیڑھی سے ملی ہوئی کھڑی ہے۔ تاکہ فتاتا بھاگ نہ جائے)

اپالوڈورس:- (کشتی چلتے وقت نیچے سے) خدا حافظ۔ ای گرز مار بہادر،

سنتری:- خدا حافظ سوداگر، ای دوکاندار۔

اپالوڈورس:- ہاں، ہاں، جلدی کر، اے دلیر ملاح جلدی کر۔ (وہ پتوار کی آواز کے ساتھ ساتھ گانے لگتا ہے)

سنتری:- (فتاتا کو دھمکا کر) اب بی صاحبہ اپنے مرغی خانے کو تشریف لے جائیے۔

فتاتا:- (گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلاتے ہوئے) اے سمندر کے دیوتاؤ۔ اس کو حفاظت سے ساحل تک پہونچا دو۔

سنتری:- (تعجب سے) کسے حفاظت سے پہنچا دو۔ تم کس کی بابت کہہ رہی ہو۔

فتاتا:- (نفرت سے دیکھ کر) جاؤ اب تم اس رومی احمق کو ایک کتے کی طرح نگل لو۔ کیونکہ اس نے میری بچی کو سمندر میں جانے سے نہیں روکا۔

سنتری:- کمبخت۔ کیا وہ کشتی میں ہے؟ (وہ سمندر کی طرف منہ کر کے شور کرتا ہے) او ملاح - او ملاح -

(اس اثناء میں روفیو۔ صبح کی جنگ کے اختتام کے بعد، مینار کے دروازے کے باہر ایک بڑے لٹھے پر بیٹھا ہوا کھجور کھا رہا ہے۔ اس کا کھجور سے بھرا ہوا خود اس کے دونوں گھٹنوں کے بیچ میں دبا ہوا ہے۔ اور ایک چمڑے کی شراب کی صراحی قریب رکھی ہوئی ہے۔ اس کے پیچھے مینار کا چبوترہ چاروں طرف پانی سے بھرا ہوا ہے۔ جس کے اطراف میں ایک فصیل ہے۔ اور بیچ میں دو سیڑھیاں ہیں۔ ایک بوجھل زنجیر روشن مینار سے اس کے سر پر لٹکی ہوئی ہے۔ سیزر باہر کی طرف مضطربانہ انداز سے دیکھتا ہوا چبوترے کی سیڑھی پر کھڑا ہوا ہے۔ اور بظاہر بہت بے چین معلوم ہوتا ہے۔ برٹینس مینار کے دروازے سے برآمد ہوتا ہے)

روفیو:- میرے برطانوی دوست، کیا تم مینار کی چوٹی تک گئے تھے؟

برٹینس:- ہاں میرا خیال ہے کہ دو سو فیٹ بلندی۔

روفیو:- وہاں اور کوئی بھی ہے؟

برٹینس:- صرف ایک جر ثقیل کو چلانے والا بڈھا اور اس کا بیٹا۔ جس کی عمر تقریباً ۱۴ سال کی ہے۔

روفیو:- کیا کہا۔ ایک بڈھا۔ اور اس کا بیٹا یہ کام کرتا ہے۔ کیا تمہارا مطلب بیس آدمیوں سے ہے۔

برٹینس:- صرف دو۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ ان کے پاس ایک مشین ہے۔ جس میں اُبلتا ہوا پانی

بھرا رہتا ہے - یہ مشین میری سمجھ میں نہیں آتی - کہ کیسے کام کرتی ہے - یہ برطانوی طرز کی نہیں ہے - وہ اس مشین سے تیل کے پیپے اور لکڑی کے لٹھے ادھر اٹھاتے ہیں ———

روفیو :- لیکن ———

بری ٹینس :- مجھے معاف کیجئے - جزیرے سے بعض پیغامبر ہمارے پاس آرہے ہیں - مجھے دیکھنا ہے کہ وہ کیا پیغام لاتے ہیں (وہ تیزی سے مینار کے باہر جاتا ہے -)

سیزر :- (تھرتھراتے ہوئے چبوترے سے اتر کر آتے ہوئے) روفیو، یہ ایک دیوانوں کا سا سفر رہا - ہم کو شکست اٹھانی پڑے گی - کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ میرے آدمی جو ٹیلے کے اس پار ہیں، کس طرح کام انجام دے رہے ہیں -

روفیو :- (غصے سے) کیا میں کھانا چھوڑ دوں - اور بھوک کا شکار بنکر تمہارے لئے اطلاع بہم پہونچانے جاؤں -

سیزر :- (تسکین دیتے ہوئے) نہیں روفیو نہیں - کھاؤ - میرے بچے کھاؤ - (وہ دوسری طرف پلٹتا ہے - روفیو بدستور کھجور کھانے لگتا ہے) مصری اتنے بیوقوف نہیں ہو سکتے کہ ہماری جائے پناہ کو تہ و بالا کر کے ہم کو نہ آدبوچیں - یہ سب سے پہلا موقع ہے کہ میں ایک خطرہ میں گھر گیا ہوں - مجھے مصر نہ آنا چاہیے تھا -

روفیو :- ایک گھنٹہ قبل آپ صرف فتحمندی کا اظہار کر رہے تھے -

سیزر :- (معذرت خواہی کے انداز سے) ہاں - میں ایک بیوقوف تھا - یہ حماقت تھی روفیو - لڑکپن تھا -

روفیو :- لڑکپن ! ذرا نہیں - یہ لو - (وہ مٹھی بھر کر کھجور سیزر کو دیتا ہے)

سیزر :- یہ کس لئے ہیں ؟

روفیو :- کھانے کے لئے - تم کو اس کی ضرورت ہے جب ایک رومی تمہاری عمر کو پہونچتا ہے تو وہ اپنے دوپہر کے کھانے کو بھول جاتا ہے - کھاؤ پیو اور پھر دوسرے موقع کی تلاش کرو -

سیزر :- (کھجور لیکر) میری عشرت (وہ سر ہلاتا ہے اور ایک کھجور کو دانت سے کاٹتا ہے -) ہاں روفیو - میں ایک بڈھا آدمی ہوں - اور بالکل شکستہ حال - (اس کے دماغ پر مغموم خیالات کے بادل چھا جاتے ہیں - (وہ کھجور کھانے لگتا ہے) اچیلتس ابھی جوان ہے - ٹالمی ایک بچہ ہے (وہ دوسری کھجور کھاتا ہے) ہاں ہر شخص کا ایک وقت ہوا کرتا ہے - اور مجھے بھی اپنا وقت نصیب ہو چکا ہے - میں اس کے لیے شکوہ نہیں کر سکتا - (بری ٹینس بے حد خوف زدہ ایک صندوق لے کر آتا ہے - سیزر اپنے ہوش و حواس پر قابو پا لیتا ہے -) کیا خبر لائے ؟

بری ٹینس :- ہمارے دلیر رہوڈیائی ملاح نے ایک خزانے پر قبضہ کر لیا ہے یہ دیکھو - (وہ چمڑے کا صندوق سیزر کے پیر کے قریب ڈال دیتا ہے) ہمارے دشمن ہمارے قبضہ میں آگئے ہیں

سیزر :- اس تھیلے میں ؟

بری ٹینس :- جبتک آپ پوری بات نہ سن لیں صبر سے کام لیں اس تھیلے میں وہ تمام مراسلت بند ہے جو پمپئی کے فریق اور یہاں کی مقامی فوج کے مابین ہوئی تھی -"

سیزر :- اچھا ؟

بری ٹینس :- (سیزر کی اس سستی سے بے چین ہو کر اس نے اصل واقعہ کو نہیں تاڑا) ہاں تو ہمکو اب یہ معلوم ہو جائیگا کہ ہمارے دشمن کون ہیں

ہر اس شخص کا نام جسنے آپکے خلاف سازش کی ممکن ہو ان کاغذات میں ہے۔

سیزر :- ان کو آگ میں جھونک دو۔

بری ٹینس :- ان کو آگ میں ... ؟ (وہ ہانپنے لگتا ہے)

سیزر :- ہاں آگ میں! کیا تم چاہتے ہو کہ میں اپنی زندگی کے تین سال اُن آدمیوں کی تحقیق اور چھان بین میں صرف کر دوں، جو اس وقت میرے دوست بنجائیں گے جب میں یہ ثابت کر دوں گا۔ کہ یہ دوستی پمپئی کی دوستی سے زیادہ قیمتی ہے یا کیٹو کی دوستی سے زیادہ اہم ہے۔ او جاہل برطانوی کیا میں بُل ڈاگ کتا ہوں۔ کہ محض اس غرض سے جنگ کی تلاش کروں۔ کہ میرے جبڑے بہت سخت ہیں؟

بری ٹینس :- لیکن سرکار آپ کی عزت میں روم کی عزت ہے۔

سیزر :- میں اپنی عزت پر انسانی قربانیاں نہیں کرتا۔ اگر تم ان کو نہیں جلاتے تو میں پانی میں غرق کر سکتا ہوں۔ (وہ کاغذات کا تھیلا اٹھا لیتا ہے۔ اور چبوترے پر سے نیچے سمندر میں پھینک دیتا ہے)

بری ٹینس :- سیزر۔ آپ بہت ضبط سے کام لیتے ہیں کیا باغیوں کو بالکل آزادی اس لئے دے دی جائے۔ کہ ان کا ظاہر اور باطن مختلف ہے۔

روفیو :- (کھڑے ہوتے ہوئے) جب جزیرہ کا باشندہ اپنا وعظ ختم کر دے تو مجھے بلانا۔ میں اس وقت ابلتے پانی کی مشین دیکھنے جا رہا ہوں۔ (وہ مینار پر چلا جاتا ہے)

بری ٹینس :- او سیزر، میرے بڑے آقا۔ کاش میں آپ کو صرف اس امر پر راغب کر سکتا کہ آپ زندگی پر سنجیدگی سے غور کریں۔ اسی طرح جس طرح میرے ملک میں لوگ کرتے ہیں۔

سیزر :- بری ٹینس، کیا وہ حقیقت میں ایسا ہی کرتے ہیں۔

بری ٹینس :- کیا آپ وہاں نہیں رہے؟ کیا آپ نے ان کو نہیں دیکھا؟ ایک برطانوی کیسی گفتگو کرتا ہے۔ جیسی آپ اپنے لمحات فرصت میں کرتے ہیں۔ کون برطانوی مقدس عبادتوں میں شریک ہونے سے بے اعتنائی کرتا ہے، کون برطانوی بجائے نیلے رنگ کے آپ کی طرح مختلف رنگ کے کپڑے پہنتا ہے۔ یہ ہمارے لئے اخلاقی سوالات ہیں۔

سیزر :- اچھا اچھا۔ میرے دوست، جب میں کبھی چین سے بیٹھوں گا۔ تو شاید ایک چغہ بنواؤں گا۔ اس وقت تک مجھے اپنی رومی ہی وضع قطع میں رہنے دو۔

(اپالوڈورس مینار کے پاس آتا ہے) کہو کیسے آئے؟

بری ٹینس :- (تیزی سے پلٹ کر افسرانہ تمکنت سے اجنبی سے استفسار کرتے ہوئے) یہ کیا ہے، تم کون ہو؟

اپالوڈورس :- گھبراؤ نہیں میرے دوست۔ میں تم کو کھا نہ جاؤں گا۔ میں اسکندریہ سے سیزر کے لئے بیش قیمت قالین کا تحفہ لایا ہوں۔

سیزر :- اسکندریہ سے!

بری ٹینس :- یہ سیزر ہیں۔

روفیو :- (مینار کے دروازے پر آتے ہوئے) کیا قصہ ہے۔؟

اپالوڈورس :- مبارک۔ سیزر اعظم۔ میں سسلی کا ماہر

فنونِ لطیفہ، اپالوڈورس ہوں۔

بری ٹینس:- ماہر فنون۔! انھوں نے اس مکار کو آنے کیوں دیا۔؟

سیزر:- ٹھیرو۔ بھلے آدمی آپالوڈورس مشہور ماہر فنون لطیفہ ہے۔

بری ٹینس:- (اکھائی سے) میں جناب سے معافی مانگتا ہوں (سیزر سے) میں نے سمجھا کہ وہ خود کو ایک پیشہ ور بتا رہا ہے۔ (کسی قدر منہ بگاڑ کر وہ اپالوڈورس کو سیزر کے پاس آنے کی اجازت دیتا ہے۔ اور خود ہٹ جاتا ہے۔ روفیو، اپالوڈورس کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر دوسری طرف جاکر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

سیزر:- اپالوڈورس! میں تم کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ تم کس لئے یہاں آئے ہو؟

اپالوڈورس:- آپ کی خدمت میں ملکہ کی طرف سے تحفے پیش کرنے کے لئے!

سیزر:- وہ کون ملکہ ہے؟

اپالوڈورس:- ملکۂ مصر، کلیوپیٹرا۔

سیزر:- (انتہائی معتمدانہ انداز سے) اپالوڈورس یہ تحفہ تحائف پیش کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ ملکہ کے پاس جاؤ۔ اور اس سے کہو کہ یہاں کے حالات اطمینان بخش رہے تو شام تک محل واپس آؤں گا۔

اپالوڈورس:- سیزر۔ میں واپس نہیں جا سکتا۔ جونہی کہ میں اس روشن مینار کے پاس پہونچا۔ کسی بیوقوف نے ایک چمڑے کا تھیلا سمندر میں پھینک دیا۔ جس سے میری کشتی کا ایک سرا ٹوٹ گیا۔ اور مجھے ذرا بھی موقع نہ ملا کہ میں کنارے پہونچ کر اس کو ڈوبنے سے بچاؤں۔

سیزر:- اپالوڈورس۔ مجھے افسوس ہے۔ اس نالائق کو سزا دی جائے گی۔ خیر۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ تم میرے لئے کیا تحفے لائے ہو؟ اگر میں ان کو نہ دیکھوں گا تو ملکہ کو صدمہ ہوگا۔

روفیو:- کیا ہمارے پاس اتنا فضول وقت ہے۔ کہ اس کھیل میں ضائع کریں۔ ملکہ تو بالکل بچہ ہے۔

سیزر:- ہاں ایسا ہی ہے۔ اسی لئے تو ہم کو اس کی دل شکنی نہ کرنی چاہئے۔ اپالوڈورس۔ کیا تحفہ ہے؟

اپالوڈورس:- سیزر! یہ ایک ایرانی قالین ہے۔ اور اس کے اندر، جیسا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے۔ کبوتر کے انڈے، شراب کے بلوری جام اور بہت سی قیمتی چیزیں ہیں۔ مجھے اس کو اس سیڑھی پر سے لیجانے کی ہمت نہیں پڑتی۔

روفیو:- تو اسے جرثقیل کے ذریعہ اٹھاؤ۔ انڈے ہم باورچی کے پاس بھیجدیں گے۔ شراب ان پیالوں میں نوش کریں گے۔ اور قالین پر سیزر لیٹا کرے گا۔

اپالوڈورس:- کیا کہا۔؟ جرثقیل۔ سیزر۔ مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ میں اس قالین کو اپنی جان کے برابر سمجھ کر آپ کے حوالے کروں۔

سیزر:- (مسرت سے) تو بہتر ہے تم بھی اس کے ساتھ لٹک جاؤ۔ تاکہ اگر زنجیر ٹوٹ جائے تو کبوتر کے انڈوں کے ساتھ تم بھی فنا ہو جاؤ۔ (وہ زنجیر کے پاس جاتا ہے اور اسکو غور سے دیکھنے لگتا ہے۔)

اپالوڈورس :- (بری ٹینس سے) کیا سیزر سنجیدگی سے کہہ رہا ہے ؟

بری ٹینس :- اس کا کچھ اعتبار نہیں۔ کیونکہ وہ اطالوی ہے۔ لیکن جو کچھ وہ کہتا ہے بے معنی نہیں ہوتا۔

اپالوڈورس :- سنجیدہ ہو یا نہیں۔ اس نے ٹھیک کہا ہے اب مجھے ایک فوجی دستہ دو۔ تاکہ جر ثقیل سے کام لیا جائے۔

بری ٹینس :- جر ثقیل کو مجھ پر چھوڑ دو۔ جاؤ۔ اور زنجیر کو نیچے آتا ہوا دیکھو۔

اپالوڈورس :- بہت خوب۔ تم مجھے وہاں لمحہ بھر میں ایک سورج کی طرح اپنا خزانہ لئے ہوئے طلوع ہوتا ہوا پاؤ گے (وہ جس طرف سے آیا تھا اسی طرف واپس جاتا ہے۔ اور بری ٹینس مینار میں داخل ہوتا ہے)

روفیو :- (بے پروائی سے) سیزر، کیا تم ان احمقانہ باتوں کے لئے یہاں ٹھیرے رہو گے ؟

سیزر :- (جر ثقیل کے متحرک ہوتے وقت پیچھے ہٹ کر) کیوں نہیں ؟

روفیو :- یہ مصری آپ کو "کیوں نہیں" کا مزہ چکھائیں گے، اگر ان کی سمجھ میں آ گیا کہ قبل اس کے کہ ہم اپنی مورچہ بندی ختم کر چکیں۔ وہ ہم پر حملہ کر دیں تو پھر کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑے گا۔ ہم کس قدر بے وقوف ہیں کہ یہاں ایک کبوتر کے انڈوں سے بھرے ہوئے قالین کو دیکھنے کے لئے بچوں کی طرح ٹھیرے ہوئے ہیں۔ (زنجیر بہت بلند ہو جاتی ہے۔ تاکہ فصیل ہیں نہ رک سکے۔ پھر وہ مینار کے پیچھے چھپ جاتی ہے۔)

سیزر :- میرے بچے۔ روفیو ڈرو نہیں۔ جب پہلا مصری اپنا پہلا قدم پل پر رکھے گا تو طبل آگاہی بجے گا۔ اور ہم دونوں اپنے اپنے کونے سے نکل کر۔ قبل اس کے کہ مصری اپنے گھروں سے نکل کر وہاں پہونچیں مورچے کے پاس پہنچ جائینگے، ہم دونوں، میں جو کہ ایک بڈھا آدمی ہوں اور تم جو اس کے سب سے بڑے بیٹے ہو۔ اس لئے چپ رہو۔ اور لاؤ مجھے چند کھجوریں اور دو۔

اپالوڈورس :- (نیچے سے) ہاں۔ اوپر کھینچو۔ ہو۔ ہو۔ ہو۔ (زنجیر ادھر کھینچتی ہے۔ اور پھر مینار کے پیچھے سے سامنے آجاتی ہے۔ اپالوڈورس قالین کے ایک کنارے سے چمٹا ہوا۔ ہوا میں لٹکتا رہتا ہے۔ اور جیسے جیسے وہ فصیل سے ادہر جاتا ہے گانا شروع کرتا ہے۔) ہاں اب ٹھیک ہے۔ ٹھیر جاؤ ایک چکر اور۔ (چلا کر) اب نیچے جھکاؤ۔ (زنجیر نیچے اترنے لگتی ہے۔)

اپالوڈورس :- (زور سے) آہستہ آہستہ، انڈوں کا خیال رہے۔

روفیو :- (زور سے) بس ٹھیک ہے۔ آہستہ آہستہ۔ (اپالوڈورس مع قالین کے پلیٹ فارم پر آہستہ سے اتار دیا جاتا ہے۔ روفیو اور سیزر اپالوڈورس کو زنجیر سے علیحدہ ہونے میں مدد دیتے ہیں۔)

روفیو :- ادھر کھینچ لو۔ (زنجیر ایک کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ ان کے سر پر اٹھتی ہے بری ٹینس مینار سے باہر آکر قالین کی رسیاں کھولنے میں مدد دیتا ہے۔

اپالوڈورس :- (رسیاں کھلنے کے بعد) اب ذرا دور کھڑے

ہو جاؤ۔ میرے دوستو۔ اور سیزر کو دیکھنے دو۔

(وہ قالین کھول دیتا ہے)

روفیو:۔ بس صرف شال کا ایک گٹھر اور انڈے ؟

اپالوڈورس:۔ سیزر قریب آؤ۔ اور ان دوشالوں میں ان کو تلاش کرو۔

روفیو:۔ (تلوار کھینچ کر) ہوں۔ دغابازی۔ سیزر پیچھے کھڑے رہو۔ میں نے ان دوشالوں میں ایک حرکت سی محسوس کی ہے۔ اس کے اندر ضرور کوئی زندہ چیز ہے۔

بری ٹینس:۔ (تلوار کھینچ کر) اس کے اندر سانپ ہے۔

اپالوڈورس:۔ کیا سیزر میں اتنی جرأت ہے کہ جہاں سانپ حرکت کرتا ہو۔ وہاں اپنا ہاتھ ڈال دے؟

روفیو:۔ (اس سے مخاطب ہو کر) دغاباز کتے۔

سیزر:۔ خاموش رہو۔ اپنی اپنی تلواریں میان میں رکھ لو۔ تمہارے سانپ کا تنفس باقاعدہ معلوم ہوتا ہے (وہ اپنا ہاتھ دوشالوں میں ڈال دیتا ہے۔ اور ایک عریاں ہاتھ باہر نکالتا ہے۔) یہ ایک چھوٹا حسین سانپ ہے۔

روفیو:۔ (دوسرا ہاتھ نکال کر) ہم کو دوسرا ہاتھ بھی نکالنے دو۔

(دونوں کلیوپیٹرا کی دونوں کلائیاں پکڑ کر کھینچتے ہیں۔ اور اسے بیٹھا ہوا پاتے ہیں۔ بری ٹینس خوفزدہ ہو کر اپنی تلوار میان میں رکھ لیتا ہے۔)

کلیوپیٹرا:۔ (ہانپتے ہوئے) اوہ۔ میں بالکل گرد میں دفن ہو گئی۔ اوہ سیزر۔ ایک آدمی کشتی میں مجھ پر کھڑا ہوا۔ اور ایک بڑا بھاری تھیلا آسمان سے میرے اوپر گرا اور کشتی ڈوب گئی۔ اور پھر میں ادھر لڑھکائی گئی اور نیچے اتاری گئی۔

سیزر:۔ (پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر جب وہ اٹھ کر سیزر کے گلے سے لگ جاتی ہے۔) خیر اس کا خیال نہ کرو۔ تم اب یہاں بالکل محفوظ ہو۔ تم بالکل مطمئن رہو۔

روفیو:۔ اچھا اب یہ یہاں پہنچ گئی تو ہم اس کے ساتھ کیا سلوک کریں؟

بری ٹینس:۔ سیزر وہ بغیر کسی خادمہ کے یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔

کلیوپیٹرا:۔ (سیزر سے جو بے حد متحیر ہو جاتا ہے) کیا تم مجھے دیکھ کر خوش نہیں ہوئے۔؟

سیزر:۔ نہیں۔ نہیں۔ میں بہت خوش ہوا ہوں۔ مگر روفیو بہت غصہ ہو رہا ہے اور بری ٹینس متحیر ہے۔

کلیوپیٹرا:۔ (نفرت سے) تم ان کے سر قلم کر سکتے ہو۔ کیا نہیں۔؟

سیزر:۔ میری سمندری چڑیا۔ یہ سر کٹنے کے بعد اتنے مفید نہ ثابت ہوں گے، جتنے اب ہیں۔

روفیو:۔ (کلیوپیٹرا سے) اب ہم کو فوراً جا کر تمہارے بعض مصریوں کے سر قلم کرنا پڑیں گے۔ اگر ہم شکست کھا کر تم کو تنہا چھوڑ دیں اور تمہارے چھوٹے بھائی کو یہ موقع دیں کہ وہ تم کو گرفتار کر لے تو تم اس امر کو کن نظروں سے دیکھوں گی۔؟

کلیوپیٹرا:۔ لیکن تمہیں مجکو اکیلا نہ چھوڑنا چاہئے۔ سیزر تم مجھے اکیلا نہ چھوڑ دو گے۔ کیا چھوڑ دو گے؟

روفیو:۔ کیوں نہیں! جب بگل بجے گا۔ اور ہماری جانیں سیزر پر منحصر ہوں گی کہ وہ مورچہ پر مصریوں کے پہنچنے سے قبل پہونچ جائے۔ اونھ؟

کلیوپیٹرا:۔ انھیں مرجانے دو۔ وہ صرف سپاہی ہیں

سیزر:۔ (سنجیدگی سے) کلیوپیٹرا۔ جب بگل بجتا ہے تو ہم میں سے ہر ایک کو اپنا سر ہتھیلی پر رکھنا پڑتا ہے۔ اور اسے موت کے منہ میں ڈال دینا پڑتا ہے اور اپنے سپاہیوں میں سے جنھوں نے مجھ پر کامل اعتماد کیا۔ ایک بھی ایسا نہیں ہے۔ جس کا ہاتھ میں تمہارے سر سے زیادہ مقدس سمجھ کر نہ پکڑ دوں۔

(کلیوپیٹرا گھبرا جاتی ہے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں)

اپالوڈورس تم کو چاہئے۔ کہ ان کو واپس محل لے جاؤ۔

اپالوڈورس:۔ کیا میں کوئی مچھلی ہوں کہ اپنی پیٹھ پر ان عورتوں کو بٹھا کر لے جاؤں؟ میری کشتی تو ڈوب گئی۔ اور آپ کی کشتیاں یا تو مورچہ پر ہیں یا شہر واپس جا چکی ہیں۔

کلیوپیٹرا:۔ (آنسو بہاتے ہوئے) میں واپس نہ جاؤں گی۔ کسی کو میری پروا نہیں ہے۔

سیزر:۔ کلیوپیٹرا۔

کلیوپیٹرا:۔ تم چاہتے ہو کہ میں ارڈالی جاؤں؟

سیزر:۔ میری بھولی لڑکی۔ (زیادہ سنجیدگی سے) اس وقت یہاں تمہاری جان کی وقعت تمہارے سوا۔ اور کسی کو نہیں ہے (اس امر سے شکستہ دل ہوکر وہ نیچے گر پڑتی ہے۔ اور رونے لگتی ہے۔ یکایک بہت دور بگل کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اور ایک شور بلند ہوتا ہے۔) روفیو ادھر آؤ۔

کلیوپیٹرا:۔ (گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس سے چمٹتے ہوئے) سیزر مجھے تنہا نہ چھوڑو (وہ اس کا دامن مضبوط پکڑ لیتی ہے۔)

برٹینس:۔ (فصیل کے اوپر سے) سیزر! ہم بری طرح پھنس گئے۔ مصری مغربی ساحل کی طرف سے ہمارے اور مورچے کے درمیان اتر آئے ہیں۔

روفیو:۔ (دیکھنے کو دوڑتا ہے) سچ ہے ہم ایک چوہے کی طرح پھنس گئے ہیں۔

سیزر:۔ (نرمی سے) روفیو۔ روفیو۔ افسوس ہے۔ کہ میں نے اپنے مورچہ کے آدمیوں کو مار ڈالا۔

روفیو:۔ (فصیل سے اتر کر سیزر کی دائیں جانب آکر) ہاں اور یہ نتیجہ ہے اس لڑکی کے ساتھ کھیلنے کا۔

اپالوڈورس:۔ فصیل کی طرف دیکھو سیزر۔

سیزر:۔ ہم نے دیکھ لیا۔ میرے دوست اب ہم کو یہاں حفاظت کرنی چاہئے۔

اپالوڈورس:۔ میں نے سیڑھیوں کو سمندر میں پھینک دیا ہے۔ وہ بغیر اس کے یہاں نہیں آسکتے۔

روفیو:۔ ہاں اور ہم باہر نہیں جاسکتے۔ کیا تم نے یہ بھی سوچا تھا۔؟

اپالوڈورس:۔ کیوں نہیں جاسکتے؟ مشرقی بندر پر جہاز موجود ہیں۔

برٹینس:۔ (امید افزا انداز سے) رہوڈیا کے جہاز ہمارے لئے تیار کھڑے ہیں (سیزر فوراً برٹینس کے پاس جا پہنچتا ہے)

روفیو:۔ (اپالوڈورس سے) اور یہ تو بتا کہ ہم ان جہازوں تک کس راستے سے جائیں؟

اپالوڈورس:۔ اس سڑک سے جو ہر طرف جاتی ہے (وہ اپنا کوٹ اور ٹوپی پھینک دیتا ہے اور تلوار کمر سے باندھ لیتا ہے)

روفیو:۔ تم کس کا ذکر کر رہے ہو؟

اپالوڈورس:۔ میں تم کو دکھاتا ہوں (بری ٹینس کو بچا کر) سب سے قریب جہاز یہاں سے کتنی دور ہے؟

بری ٹینس:۔ پچاس گز۔

سیزر:۔ نہیں۔ نہیں وہ بہت دور ہیں۔ کم سے کم ربع میل اپالوڈورس۔

اپالوڈورس:۔ خوب۔ تو جب تک میں تم کو اس جہاز سے ایک کشتی روانہ کروں تم یہیں اپنی حفاظت کرتے ہو۔

روفیو:۔ تمہارے پردار بازو ہیں شاید؟

اپالوڈورس:۔ ہاں، ہیں دیکھو، (سیزر اور بری ٹینس کے درمیان کی سیڑھیوں پر چڑھ کر فصیل کے کنارے پہنچ جاتا ہے۔ اور سر نیچا کرکے سمندر میں کود پڑتا ہے)

سیزر:۔ (ایک مدرسہ کے طالب علم کی طرح متعجب ہوکر) اوہو اوہو۔ (کوٹ اتار کر) زہرہ کی قسم میں بھی ایسا ہی کروں گا۔

روفیو:۔ (اسے پکڑ کر) تم دیوانے ہو۔ تم نہیں کر سکتے۔

سیزر:۔ کیوں نہیں کر سکتا۔ کیا میں اس کی طرح نہیں تیر سکتا؟

روفیو:۔ کیا ایک بڈھا ایک جوان کی طرح ہاتھ پاؤں مار کر تیر سکتا ہے؟ اس کی عمر صرف پچیس سال کی ہے۔ اور تمہاری پچاس برس کی۔

سیزر:۔ (چڑاتے ہوئے) بڈھا۔!

بری ٹینس:۔ (حیرت زدہ ہوکر) روفیو۔ تم اپنے آپ کو بھول گئے ہو۔

سیزر:۔ روفیو۔ آؤ میں ایک ہفتہ کی تنخواہ کی شرط بدکر تمہارے ساتھ جہاز تک دوڑوں گا۔

کلیوپیٹرا:۔ لیکن میں۔ میرا کیا انجام ہوگا؟

سیزر:۔ میں تم کو ڈالفن مچھلی کی طرح اپنی پیٹھ پر لیجاؤں گا

روفیو:۔ جب تم مجھے سطح پر ابھرتے دیکھو تو اسے اندر ڈالدو پھر میں بتاؤں گا۔ تم دونوں۔

کلیوپیٹرا:۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں میں ڈوب جاؤں گی۔

بری ٹینس:۔ سیزر میں ایک آدمی ہوں، ایک برطانوی ہوں، مچھلی نہیں۔ مجھے کشتی کی ضرورت ہے۔ میں اس کے بغیر نہیں تیر سکتا۔

کلیوپیٹرا:۔ اور نہ مجھے تیرنا آتا ہے۔

سیزر:۔ (بری ٹینس سے) تو پھر یہاں اکیلے ٹھیرو۔ جب تک کہ میں مینار پر دوبارہ قبضہ نہ کرلوں۔ تمکو فراموش نہ کروں گا۔ اچھا روفیو۔

روفیو:۔ کیا تم نے اس حماقت کی تکمیل کا ارادہ کر لیا ہے؟

سیزر:۔ ہاں اس کے سوا یہاں اور کیا کرنا ہے۔

(وہ سیڑھیوں پر سے چڑھ کر کنارے پہونچ جاتا ہے)

بری ٹینس:۔ (بے صبری سے) سیزر صرف ایک آخری لفظ۔ جب تک تم اپنے کپڑے نہ تبدیل کرلو۔ اسکندریہ کے کسی حصہ میں سے نہ گذرنا۔

سیزر:۔ (سمندر کی طرف زور سے) اپالوڈورس (وہ آسمان پر سفیدی کی طرف اشارہ کرتا ہے)

اپالوڈورس:۔ کیا نیچے سبزہ برار غوانی رنگ ہے۔؟

سیزر:۔ (تعریف کرتے ہوئے) آہا۔ (وہ کود پڑتا ہے)

کلیوپیٹرا:۔ (سیڑھیوں پر خوفزدہ ہوکر دوڑتے ہوئے) اوہ۔

مجھے دیکھنے دو۔ وہ ڈوب جائے گا۔ (روفیو اس کو پکڑ لیتا ہے) آہ۔ آہ۔ آہ (وہ اس کو اٹھا کر سمندر میں ڈال دیتا ہے۔ روفیو اور بری ٹینس قہقہہ لگاتے ہیں۔)

روفیو :- (نظر دوڑا کر) وہ اس کے پاس پہونچ گئی (بری ٹینس سے) قلعے پر قابض رہو۔ سیزر تم کو نہ بھولے گا۔ (وہ بھی کود پڑتا ہے) (بری ٹینس سیڑھی پر دوڑتا ہے تاکہ دونوں کی تیراکی دیکھ سکے)

سیزر :- سب بالکل محفوظ ہیں؟

روفیو :- (تیرتے ہوئے) سب محفوظ!

سیزر :- (آگے ہوتے ہوئے) مینار پر چل کر دم لو۔ اور چور دروازے پر جلانے کی لکڑیاں جمع کر دو بری ٹینس

بری ٹینس :- (جواب میں پکار کر) ہاں پہلے میں یہی کرونگا اسکے بعد دیوتاؤں کی عبادت کرونگا۔ (ایک مسرت کی آواز سمندر سے آتی ہے۔ بری ٹینس بیحد متعجب ہو جاتا ہے) کشتی اسکے پاس پہنچ گئی۔

ایکٹ چہارم

کلیوپیٹرا، اسکندریہ کے مشرقی بندر میں اکتوبر ۴۸ ق - م میں قیام پذیر ہوئی تھی۔ مارچ ۴۷ ق م) میں وہ اپنے محل کی آرائشگاہ میں شام کے اوقات گذار رہی ہے۔

وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ایک کنیز کی طرف متوجہ ہے۔ جو کمرہ کے بیچ میں بیٹھی ہوئی بربط بجا رہی ہے۔ اس کا استاد قریب بیٹھا ہوا ہے۔ جس کے چہرہ پر جھریاں پڑی ہوئی ہیں، بھویں لمبی ہیں، سفید مونچھیں اور پلکیں الجھی ہوئی ہیں۔ اس کی نظر بہت تیز ہے۔ فتاتا کنیزوں کے ایک مجمع کے سامنے دروازے پر کھڑی ہوئی ہے۔ بربط نواز کے سوا اور سب بیٹھے ہیں۔ کلیوپیٹرا دروازے کے سامنے ایک کرسی پر متمکن ہے۔ اور سب زمین پر بیٹھی ہیں۔ کلیوپیٹرا کی تمام سہیلیاں جوان ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ ممتاز حیثیت چارمیان اور ایراس کی ہے۔ چارمیان کی شکل بھونڈی، چہرہ کتابی ہے۔ اور بہت چست و چالاک ہے۔ ایراس ایک فربہ جسم کی نیک خصلت عورت ہے جس کے بال کسی قدر سرخی مائل ہیں۔ یہ ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتی ہے۔

فتاتا :- (بربط نواز سے غصہ کے ساتھ) چپ رہ ملکہ کچھ ارشاد فرمارہی ہیں (وہ چپ ہو جاتی ہے)

کلیوپیٹرا :- (بڈھے موسیقار سے) میں خود بربط بجانا سیکھنا چاہتی ہوں۔ سیزر موسیقی کا پرستار ہے۔ کیا تم مجھے سکھا سکتے ہو؟

موسیقار :- یقیناً صرف میں ہی ملکہ کو سکھا سکتا ہوں اور کوئی نہیں۔ کیا میں نے ان قدیم مصریوں کے فراموش شدہ نغمے دریافت نہیں کئے جو اپنی انگلی کی خفیف سی حرکت سے اہرام کو لرزہ براندام کر دیتے تھے۔

کلیوپیٹرا :- بہت خوب تم مجھکو سکھاؤ، کتنا زمانہ چاہئے؟

موسیقار :- زیادہ وقت نہ لگے گا۔ صرف چار سال۔ پہلے ملکہ کو فیثاغورس کا فلسفہ سمجھنا پڑے گا۔

کلیوپیٹرا :- (کنیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کیا اس کو فیثاغورس کے فلسفہ کا اچھا علم ہے؟ (باقی آیندہ)

جوش ملیح آبادی کی اہمال سرائیاں

یعنی

طلسم الفاظ میں کھوئے ہوئے شاعر کی گمراہیاں

بسلسلۂ سابق

جناب جوش کی ایک نظم ہے جس کا عنوان انھوں نے " انتظار کی رات " رکھا ہے۔ اس کا پہلا شعر ملاحظہ ہو:-

کس نے وعدہ کیا ہے آنے کا
حسن دیکھو غریب خانے کا

اس شعر میں انداز بیان درست نہیں۔ اگر دوسرا مصرعہ اپنے حال پر رکھا جائے تو پہلے مصرعہ میں بجائے کس نے (استفہامیہ) کے " اُس نے " ہونا چاہیئے۔ اور اگر کس نے کو برقرار رکھا جائے تو دوسرے مصرعہ کی ترکیب کچھ اس طرح کی ہونی چاہیئے تھی۔

" کہ غریب خانے کے حسن کا یہ عالم ہے۔ "

دوسرا شعر:-

دل میں ہے خوش سلیقگی بیدار
آج گھر، گھر بنا ہے پہلی بار

پہلا مصرعہ تصنع وآورد کی نہایت ہی مذموم مثال ہے۔ اوّل تو خوش سلیقگی کی بیداری خود ہی کوئی اچھی تعبیر نہیں چہ جائیکہ اسے دل سے مخصوص کیا جائے۔ بغیر اس نسبت وتخصیص کے بھی یہ مفہوم پورا ہو جاتا ہے۔

تیسرا شعر:-

غرق ہے روح خوش جمالی میں
نظم ہے طبع لااُبالی میں

پہلے مصرعہ میں چند در چند غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ اوّل تو خوش جمالی خود محل نظر ہے، پھر روح کا اس میں غرق ہونا دوسری

بدعنوانی ہے۔ جوش صاحب کو عرق اور محو کا فرق شاید معلوم نہیں۔ عرق کا تعلق خود اپنی کیفیات و جذبات سے ہوتا ہے۔ نہ کہ کسی دوسری چیز سے۔ لیکن لفظ محو دونوں صورتوں میں مستعمل ہے۔ اس لئے یہاں بجائے عرق کے محو ہونا چاہئے۔ علاوہ اس کے شعر سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ خوشجمالی سے کیا مراد ہے۔ اگر محبوب کی خوش جمالی مقصود ہے تو درست نہیں کیونکہ اس کا تو ابھی صرف انتظار ہی انتظار ہے اور اگر اس سے مقصود صرف کسی خاص کیفیت کا اظہار ہے۔ تو اس کے لئے اس لفظ کا استعمال بالکل غلط ہے۔ دوسرے مصرعہ میں لفظ نظم جس محل پر استعمال ہوا ہے۔ وہ بھی شاعر کی قدرت شاعری پر پشمک زن ہے۔

چوتھا شعر:۔

روح کو آئینہ دکھاتے ہیں
درودیوار مسکراتے ہیں

پہلے مصرعہ میں جو فعل واقع ہے اس کا فاعل غالباً درودیوار ہیں۔ لیکن ان کے مسکرانے اور روح کو آئینہ دکھانے سے کیا واسطہ ہے۔

ساتواں شعر:۔

چشم برراہ شوق کے مارے
چاند کے انتظار میں تارے

چشم برراہ کون؟ خود شاعر۔ پھر دوسرے مصرعہ سے اس کا کیا تعلق۔ غالباً استعارہ ہے جس میں شاعر نے اپنے کو تارے (تارہ کی جمع) کہا ہے۔ علاوہ اس کے ان صورتوں میں استعارہ کبھی استعمال نہیں ہوتا، بلکہ تشبیہی صورت پیدا کی جاتی ہے۔ اس شعر کا پورا مفہوم اس طرح ادا ہونا چاہئے تھا کہ

"میں شوق کے مارے اس طرح چشم براہ ہوں جیسے تارے چاند کا انتظار کر رہے ہوں۔"

اسی نظم کا ایک اور منظر ملاحظہ ہو:۔

شب کی زلف سیاہ پیک اجل
بھیگ کر اور ہو گئی بوجھل

رات کا بوجھل ہو جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اور پیک اجل بالکل حشو ہے جس کا شعر کے مفہوم سے کوئی تعلق نہیں صرف بوجھل کا قافیہ لانے کے لئے اس کو استعمال کیا گیا ہے۔

پھر مایوسی کے بعد جب "امید کی بجلی چمکی" تو شاعر پر جو کیفیت طاری ہوئی اس کا بیان ملاحظہ ہو:۔

اپنی حد وفا ہوئی محسوس ان کی آواز پا ہوئی محسوس
جل اٹھی شمع دل کی مجلس میں صبح گویا ہوئی بنارس میں

حدِ وفا کا محسوس ہونا بالکل مہمل بات ہے اور اس کا کوئی تعلق نظم کے مفہوم سے نہیں۔ اسی طرح دل کے مجلس میں شمع کا جل اٹھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر شمع امید یا شمع حسن کہا جاتا تو خیر اک بات بھی تھی۔ علاوہ اس کے سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ دوسرے مصرعہ میں گویا کلکر تشبیہی صورت پیدا کر دی ہے۔ اور اس طرح مجلس دل کو بنارس سے تشبیہ دی ہے جس کی لغویت محتاج بیان نہیں۔

آخری شعر اس نظم کا :-

آئے وہ اشک تھم گئے بارے

چاند نکلا، سبک ہوئے تارے

تاروں کا سبک ہونا، اس معنی میں کہ وہ غائب ہو گئے، بالکل غلط ہے۔

اس نظم کے بعد ایک اور نظم ہے جس کا عنوان " اشکوں کی رات " رکھا ہے۔ یہ ساری نظم جوش صاحب نے بصنعت اہمال میں لکھی ہے۔ اور تاویل بعید کے بھی کوئی مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔

آخری شعر اس نظم کا ملاحظہ ہو:-

رات جس وقت بھیگ جاتی ہے

میرے اشکوں میں مسکراتی ہے

" رات کا بھیگ کر کسی کے اشکوں میں مسکرانا " خدا جانے کیا مفہوم رکھتا ہے اور معلوم نہیں شاعر نے کس جذبہ یا کیفیت کا اظہار کرنا چاہا ہے۔

برسات کی رات کا ایک مصرعہ

مکان کے بام و در بجلی کی رَو میں جب جھلکتے ہیں

شاعر کو رَو اور چمک کا فرق نہیں معلوم۔ رَو کہتے ہیں " CURRENT " کو جس میں خود کوئی چمک یا روشنی بالکل نہیں پائی جاتی۔ اور نہ اس کے انعکاس سے بام و در جھلک سکتے ہیں۔ بجائے رَو کے چمک یا تابش استعمال کرنا چاہئے تھا۔

ایک اور مصرعہ ہے :-

ستارے دفن ہو جاتے ہیں جب آغوشِ ظلمت میں

آغوش میں کوئی چیز دفن نہیں ہوتی بلکہ چھپتی ہے۔

بدست رات کی نظم کا ایک شعر ہے :-

گل پیرہن و گلبدن و گلرخ و گلرنگ

ایمان شکن، آئینہ جبیں، انجمن آرا

پہلے مصرع میں بالکل مادی قسم کی تشبیہیں استعمال کی گئی ہیں - لیکن دوسرے مصرعہ میں ایماں شکن اور انجمن آرا، کو ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں - جنکا تعلق تشبیہوں سے نہیں بلکہ صفات سے ہے اور یہ معانی و بیان کا نقص ہے - کہ ایک ہی سلسلہ میں الفاظ صفات و تشبیہ دونوں کو ملا دیا جائے -

اسی نظم کا ایک اور مصرعہ ہے :-

گل بیز و گہر ریز و گہر بار و گہر تاب

گہر ریز اور گہر بار میں کوئی فرق نہیں سوائے اس کے کہ دوسرے میں مفہوم کثرت و افراط کا ضرور پایا جاتا ہے - اگر شاعر نے محبوب کا گہر ریز ہونا بہ لحاظ حسن گفتگو کے لکھا ہے تو گویا گہر باری اس کے رونے سے متعلق کی جائے گی -

اسی نظم میں ایک جگہ معشوق کو " صبح گل نوخاستہ و شام شگوفہ " لکھا ہے - اگر گلِ صبح اور شگوفۂ شام کہا ہوتا تو بھی ایک بات تھی، کسی انسان کو صبح و شام کہنا عجیب بات ہے -

اسی نظم کا ایک شعر اور یہ ہے :-

آنکھوں کے جھکنے میں تقاضائے تلطف
پلکوں کے جھپکنے میں تمنائے مدارا

پہلے مصرعہ میں لفظ تقاضا اور دوسرے میں تمنا بالکل بے محل استعمال کیا گیا ہے - تقاضا اور تمنا دونوں سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ محبوب خود دوسرے سے تلطف و مدارا کی توقع کرتا ہے - درانحالیکہ شاعر کا مدعا یہ ظاہر کرنا ہے - کہ وہ خود لطف و کرم پر آمادہ تھا -

ایک اور شعر :-

نغموں کے تلاطم سے تھا جنبش میں لب لعل
موجوں کے تھپیڑوں میں تھا دریا کا کنارا

نغموں کے تلاطم کو موجوں کا تھپیڑا اور لب معشوق کو دریا کا کنارا کہنا تشبیہ نہیں بلکہ پھبتی ہے -

صندل کی دمک تھی عرق آلود جبیں پر
یا شام کو پانی میں تڑپتا ہوا تارا

اول تو مجھے اس میں بھی کلام ہے کہ صندل میں دمک پیدا ہوتی ہے لیکن اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو دوسرے مصرعہ میں لفظ شام کا استعمال بالکل سمجھ میں نہیں آتا - کیا معشوق کی پیشانی کو شام کے وقت تاریک نظر آنے والے پانی سے تشبیہ دینا کسی طرح جائز قرار دیا جا سکتا ہے -

ہر سانس میں اپنے ہی یہ پیچیدہ جوانی ہر گام پہ لیتا ہوا زلفوں کا سہارا

دونوں مصرعوں میں تضاد مفہوم ہے۔ جو شخص اپنی قوت کے زعم میں ہر وقت اینٹھتا رہتا ہے اس کو فارسی محاورہ میں برخود بیچیدن کہتے ہیں۔ چنانچہ فردوسی، سہراب کی قوت کا حال بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتا ہے:۔

تو گوئی کہ برخود بہ پیچد ہمی

اس لئے جیسا کہ شاعر نے پہلے مصرعہ میں ظاہر کیا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کا محبوب اپنے جوش جوانی میں "پیچ و تاب" کھا رہا ہو، لیکن اسی کے ساتھ فوراً دوسرے مصرعہ میں یہ کہنا کہ "ہر گام پہ لیتا ہوا زلفوں کا سہارا" اس کے انتہائی ضعف و نقاہت کو ظاہر کرتا ہے۔ علاوہ اس کے زلفوں کا سہارا لینا بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیا معشوق کی زلف کوئی عصائے پیری تھا۔ یا برگد کی مضبوط جٹا تھی۔ جس کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔

زلفیں تھیں کہ ساون کی مچلتی ہوئی راتیں

رات کو مچلتا ہوا کہنا اس حال میں کہ کوئی اس کا ثبوت نہ پیش کیا جائے بالکل لغو و بے معنی سی بات ہے۔

نظم۔ "جوانی کی رات" :۔

شب کے حریم ناز میں شور صد اضطراب تھا

شب کا حریم ناز کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کے غلط ہے۔ اس کی جگہ کاف بیانیہ ہونا چاہئے۔ اس نظم کا بہت مشہور شعر ہے:۔

آنکھوں میں روئے یار تھا آنکھیں تھیں روئے یار پر
ذرہ تھا آفتاب میں، ذرہ میں آفتاب تھا

اس شعر میں چند در چند نقائص ہیں۔ آنکھوں میں روئے یار کا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ محاورہ یوں ہے کہ فلاں چیز ہماری نگاہوں میں ہے۔ اس طرح کوئی نہیں بولتا کہ "فلاں چیز ہماری آنکھوں میں ہے"

دوسرے مصرعہ میں اسی کیفیت کو استعارتاً یوں بیان کیا ہے کہ "ذرہ میں آفتاب تھا"۔ اس میں ایک نقص تو یہ ہے کہ اُدھر آنکھوں (بہ حالت جمع) کہا گیا ہے اور اِدھر ذرّہ (واحد) لایا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ آنکھوں کو ذرہ کہنا بھی کوئی معقول تشبیہ نہیں اور اگر آنکھ لے کر آنکھ کا تل مراد لیا گیا ہے تو شعر سے قبا در نہیں۔

پہلے مصرعہ کا دوسرا ٹکڑا ہے:۔ آنکھیں تھیں روئے یار پر۔ اسکو استعارتاً دوسرے مصرعہ میں یوں ظاہر کیا ہے کہ "ذرہ تھا آفتاب میں" حالانکہ پر اور میں کا فرق ظاہر ہے۔ اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہی ایک چیز جو ایک جگہ کسی چیز کے اوپر دکھائی جا رہی ہے۔ دوسری جگہ اس چیز میں (یعنی اس کے اندر) دکھائی جائے۔

موج ہوا میں عطر تھا، چھنکی ہوئی تھی چاندنی
پھول تھے صحن باغ میں، چرخ پہ ماہتاب تھا

اس شعر میں کوئی ایک مصرعہ بالکل زاید ہے - کیونکہ دونوں کا مفہوم بالکل ایک ہے - موج ہوا میں عطریت ہونے کے معنے ہی یہ ہیں کہ پھول کھلے ہوئے تھے - اور چاندنی بغیر ماہتاب کے ضودار ہوئے چھٹک ہی نہیں سکتی۔

اس نظم کے آخری منظر کا ایک شعر ہے :-

اور سحر کو ہمنشیں آنکھ کھُلی تو کیا کہوں :
پھول پڑے تھے خاک پر، چرخ پر آفتاب تھا

اس جگہ چرخ کی تخصیص کسقدر ذوق پر بار ہے - مفہوم صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ "آفتاب بلند ہوگیا تھا" لیکن عدم قدرت شعر اس کو یوں ظاہر کرتی ہے کہ "چرخ پر آفتاب تھا" گویا آفتاب کی جگہ چرخ کے علاوہ کوئی اور بھی ہے۔

اندھیری رات کے عنوان سے ایک نظم کے دوران میں وہ مہیب مناظر کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :-

جھینگروں کی تان، بادل کی گرج، پانی کا شور
مینڈکوں کے راگ، بجلی کی کڑک ، پانی کا شور

درانحالیکہ اس سلسلہ میں تان اور راگ دونوں بے محل ہیں - اس قسم کے معنوی عدم توازن کی مثالیں جوش کے کلام میں بہت کثرت سے نظر آتی ہیں۔

چاندنی رات کے ذکر میں ایک جگہ فرماتے ہیں :-

موج رنگیں کے یہ ہلکورے یہ دریا کا نکھار

رنگت کا یہاں کیا کام جو موج رنگیں لکھا گیا - بجائے رنگیں کے سیمیں کہنا چاہئے تھا۔

اسی نظم کا ایک شعر یہ ہے :-

تیرتا پھرتا ہے یہ بادل کے ٹکڑوں میں ہلال
یا زمرد کا سفینہ درمیانِ جوئبار

ہلال کو زمرد کے سفینہ سے تشبیہ دی درانحالیکہ زمرد گہرا سبز ہوتا ہے اور چاند کا رنگ سفید زردی مائل ہے - علاوہ اس کے دوسرے مصرعہ میں جب تک کوئی فعل نہ لایا جائے مفہوم پورا نہیں ہوتا۔

بھیگی ہوئی رات کا ایک شعر ہے :-

ہنوز نغموں کی خوابگاہوں کے گرد ہوتے ہیں سرخ پردے
رباب دل کا میں چھیڑتا ہوں حریم دوشیزۂ سخن میں

یہ شعر نہایت مکمل مثال ہے نہایت خوبصورت مگر نہایت مہمل الفاظ کے اجتماع کی - معنی کے لحاظ سے اس شعر کا کوئی ایک لفظ دوسرے سے مرتبط نہیں اور مطلق سمجھ میں نہیں آتا کہ نغمہ کی خوابگاہ سے کیا مراد ہے اس کے گرد سرخ پردے ہونا

کیا معنی رکھتا ہے۔ اور دوشیزۂ سخن کے حریم سے ان نغموں کی نیم بنگاہوں کا کیا واسطہ ہے۔ اور اگر اس سے مراد صرف نغموں کی عدم بیداری ہے اور اس کے ظاہر کرنے کے لئے ایسا لغو و مہمل اندازِ بیان اختیار کیا جاتا ہے تو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں۔ (۱) ہنوز نغموں کا مطبخ گرم نہیں ہو چکتا۔ یا (۲) نغموں کا حمام ہنوز سرد ہوتا ہے۔ یا (۳) نغموں کا گھوڑا ابھی تک اصطبل سے نہیں نکلتا۔ مہمل گوئی کا میدان تو بہت وسیع ہے۔

"شعر گوئی کی رات" میں جوش پر کیا گزرتی ہے، ملاحظہ ہو:۔

کھولتی ہے اپنے شہپر جب سہیلی موت کی
دوڑ جاتا ہے مری نبضوں میں خونِ زندگی

"موت کی سہیلی" سے مراد رات ہے۔ لیکن شہپر کہاں سے پیدا کر لئے اور اس کے اظہار کی کیا ضرورت تھی، یہ شاید شاعر کو خود بھی معلوم نہیں جن کی شاعری یکسر مجموعہ ہی ایسی ہی لا یعنی دعاوی کا جن کے ثبوت کا بار وہ اپنے سر لینے کے عادی نہیں ترک فعل کی وجہ سے اہمالِ مفہوم کی ایک اور مذموم مثال ملاحظہ ہو:۔

یوں فضا میں نقش ابھر آتے ہیں تھراتے ہوئے
جس طرح ساحر کے لب افسوں کو دہراتے ہوئے

دوسرا مصرعہ تشبیہاً استعمال کیا گیا ہے۔ اس لئے اگر اس کے محذوفات کو ظاہر کیا جائے گا تو شعر کی عبارت نثر میں یوں ہو گی:۔ "فضا میں تھراتے ہوئے یوں نقش اُبھر آتے ہیں، جس طرح ساحر کے لب افسوں کو دُہراتے ہوئے اُبھر آتے ہیں" حالانکہ ساحر کے لبوں کا ابھرنا جیسی لغو بے معنی بات ہے کسی سے مخفی نہیں۔

"عبرت کی رات" کا دوسرا شعر ہے:۔

توڑ ڈالی تھی سواری ہمرہانِ خام نے
اور تیرہ میل کا پیدل سفر تھا سامنے

چونکہ جوش فارسی سے بالکل نابلد ہیں اور الفاظ کے صحیح مفہوم اور ان کے درست استعمال سے واقف نہیں اس لئے وہ فارسی الفاظ اکثر بے محل لکھ جاتے ہیں۔ ہمرہانِ خام بالکل غلط ترکیب ہے۔ انسان کے لئے کبھی لفظ خام بغیر کسی ترکیب کے استعمال نہیں ہوتا۔ ہمرہانِ خامکار تو کہہ سکتے ہیں لیکن ہمرہانِ خام بالکل غلط ہے۔ اسی طرح کی ایک غلطی انھوں نے اپنی ایک رباعی میں بھی کی ہے۔ جو انھوں نے ایک دن میرے گذشتہ قیام حیدر آباد میں ہز اکسلنسی سر مہاراجہ بہادر یمین السلطنت کو سنائی تھی۔

اس رباعی میں چوتھا مصرعہ "پیرانِ کہن" پر ختم ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ پیرانِ کہن سال کہنا چاہئے۔

اس نظم (عبرت کی رات) کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:۔

دو رنگ تابندہ میداں تھا کہ بحر ضوفشاں
حاشیہ پر تھیں پہاڑوں کی روپہلی چوٹیاں

دوسرا مصرعہ پہلے سے بالکل علیحدہ ہے۔ پہلے مصرعہ میں بحر ضوفشاں کو تابندہ میدان کہہ کر مفہوم کو پورا کر دیا گیا۔ اس لئے دوسرے مصرعہ میں جب تک کوئی حرف ربط نہ رکھا جائے، دونوں مصرعے مربوط نہیں ہو سکتے۔

ایک اور مصرعہ :۔

دیکھتا کیا ہوں کہ ہلکی چاندنی ہے پاش پاش

چاندنی کو پاش پاش کہنا انتہا درجہ کی غلط تعبیر ہے جبکہ اس قسم کی کوئی کیفیت کبھی چاندنی میں پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ سرشار رات کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو :۔

ناز تھا طغرا کش دیوان آداب نیاز
تیغ تھی پیغمبر امن و اماں کل رات کو

میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سے زیادہ خوبصورت الفاظ اس سے زیادہ مہمل طور پر کوئی اور یکجا کر سکتا ہے۔ مقصود صرف اسقدر ظاہر کرنا ہے کہ ناز و نیاز باہم آشتی پسند حالت میں تھے۔ اب اس مفہوم کو اس شعر میں ڈھونڈئے اور شاعر کی اہمال پسند طبیعت کی داد دیجئے۔

ایک اور شعر اسی نظم کا :۔

الاماں ٹھنڈی ہوا کے گدگدانے کی ادا
ہر کلی کو آرہی تھیں ہچکیاں کل رات کو

گدگدانے کا نتیجہ ہچکیاں کبھی نہیں ہوا کرتا۔ علاوہ اس کے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کلی کو ہچکیاں آنا اس کی کس حالت کو ظاہر کرتا ہے۔

آرہی تھی جنبش مژگان عالم کی صدا
یوں لب گلرنگ تھا افسانہ خواں کل رات کو

پہلا مصرعہ بالکل مہمل ہے۔ مژگان عالم یوں ہی کیا کم مہمل بات تھی کہ اس میں اور کسی اضافہ کی ضرورت ہوتی۔ لیکن جوش صاحب چونکہ پیٹ بھر کے مہمل گو واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے مژگان عالم کے لئے جنبش بھی پیدا کی اور جنبش کے لئے صدا بھی۔ اگر عالم سے مراد ان کی کرہ ارض ہے تو غالباً مژگان عالم سے مقصود جنگل کے درخت ہوں گے۔ جن میں واقعی جنبش بھی ہوتی ہے اور صدا بھی، لیکن اگر عالم سے مراد کائنات یا فضائے بسیط ہے تو شاید مژگان بول کر انھوں نے "شہب ثاقب" مراد لئے ہوں گے

نرگس مخمور و جام آتشین و موج گل :
ہر طرف تھیں سرخیاں ہی سرخیاں کل رات کو

نرگس میں سرخی نہیں ہوتی۔ اس کا پھول زرد ہوتا ہے چنانچہ ایک فارسی شاعر کہتا ہے :۔

عصائے سبز بکف زرد روی و موئے سفید
بدر چشم تو شد زار و ناتواں نرگس

اس نظم میں اکثر قوافی غلط ہیں۔ لیکن جوش صاحب چونکہ فن شعر سے نابلد ہیں۔ اس لئے ان کو نہیں معلوم کہ داماں و مہرباں وغیرہ کے ہم قافیہ رنگینیاں اور سرخیاں وغیرہ لانا کس قسم کی غلطی ہے۔

ایک نظم " شادی و غم کی رات " پر لکھی گئی ہے۔ جس میں بہ تتبع غالب جوش صاحب نے اپنی حسرت و ناکامی اور محبوب کی عشرت و کامرانی کا ذکر کیا ہے۔ زمین بھی وہی ہے اور انداز بیان بھی وہی اختیار کیا گیا ہے، لیکن جو فرق غالب و جوش میں ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔

غالب کا پہلا شعر ہے :۔

شب کہ برق سوز دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

جوش صاحب کا پہلا شعر ہے :۔

شب کہ واں بزم طرب میں حلقۂ احباب تھا
میری تنہائی کا ہر لمحہ دل بیتاب تھا

لمحۂ تنہائی کا دل بیتاب ہو جانا نہایت مہمل ادعا ہے نہ جس کا کوئی ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ کوئی مفہوم دوسرے شعر میں جوش صاحب اپنے محبوب کے بزم کا منظر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ

مسند شادی پہ واں انبوہ شیخ و شاب تھا

لیکن اسی کے بعد یہ بھی کہتے ہیں کہ

واں حریم ناز میں دور شراب ناب تھا

ظاہر ہے کہ ایسے انبوہ میں شیخ کی شرکت کیونکر مناسب ہو سکتی ہے ۔۔۔

اسی نظم کا ایک شعر ہے :۔

حسن کے رخ پر تھا واں ننگ تنک نقابی کا ناز
عشق کے حق میں ادھر فرمان ترک خواب تھا

مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ محبوب محوِ خواب تھا۔ اور میں بیدار۔ لیکن اس کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی اہمال کیساتھ جو جوش صاحب کے نزدیک معنی آفرینی کی انتہا ہے۔ رنگ شکر خوابی کے بعد لفظ ناز بالکل بہمل بات ہے۔ اگر محبوب سو رہا ہے تو بظاہر ناز کا کوئی موقع نہیں۔ اور اگر بیدار ہے تو رنگ شکر خوابی بالکل بیکار ہوا جاتا ہے۔

لکھتے لکھتے دفعتہً جوش صاحب اس شعر پر آجاتے ہیں کہ

ناگہاں آلام کی شدت سے چکرانے لگا
سر کہ خلد زانوئے جاناں سے لذت یاب تھا

زانوئے جاناں کو خلد کہنے میں جو لغویت پائی جاتی ہے اس سے قطع نظر کر کے ایک معنوی نقص نہایت رکیک قسم کا یہ پایا جاتا ہے کہ ابھی تو شاعر اپنی مجبوری و ناکامی کا ذکر کر رہا تھا۔ اور اس کے بعد ہی فوراً " زانوئے جاناں کی خلد میں بھی پہونچ گیا"۔ شاعر کا ذہنی مفہوم اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ دوسرے مصرعہ میں لفظ کبھی یا اسی کے مترادف الفاظ کا اضافہ نہ کیا جائے۔ اس صورت میں شعر کی نثر اس طرح ہوگی :-

" ناگہاں آلام کی شدت سے چکرانے لگا۔ وہ سر جو کسی وقت یا کبھی یا اس سے قبل خلد زانوئے جاناں سے لذت یاب تھا"

ایک نظم ہے جس کا عنوان " ربودگی کی رات " ہے۔ اس میں ایک جگہ شاعر کو صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ "سڑکوں کا شور بند ہو گیا ہے " لیکن اس معمولی خیال کے ظاہر کرنے کے لئے جس لغو و مہمل تکلف و تصنع سے کام لیا گیا ہے اور جس بیدردی کے ساتھ الفاظ کا صرف فرمایا گیا ہے۔ اس کی مثال ملاحظہ ہو :-

جھک چکا ہے پائے خاموشی پہ کھو کر جی کا زور
گرسنہ شیروں کی صورت ہونکتی سڑکوں کا شور

اوّل تو سڑکوں کا شیر کی طرح ہونکنا بجائے خود حد درجہ بے معنی تخئیل ہے۔ علاوہ اس کے یہ امر خلاف واقعہ بھی ہے کیونکہ کبھی سڑکوں کا شور، شیر کے ہونکنے کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ اس پر طرہ یہ انداز بیان کہ " سڑکوں کا شور پائے خاموشی پر جی کا زور کھو کر جھک چکا ہے " اور اس سے مراد صرف یہ لینا کہ سڑکوں پر خاموشی طاری ہو گئی اسقدر طفلانہ اپج ہے کہ شاید ہی اس سے زیادہ مکمل مثال لغو نگاری کی کوئی مل سکے !

اسی نظم کا دوسرا شعر ہے :-

ہو چکا ہے خامشی کی بزم میں خواب خیال
گرم کل پرزوں کی پیہم گھڑگھڑاہٹ کا جلال

اول تو خامشی کو بزم سے تعبیر کرنا ہی اپنی جگہ ایک لغو جسارت ہے چہ جائیکہ خامشی کی بزم میں کسی چیز کا خواب و

خیال ہوجاتا ——— اسی قسم کی بے معنی لفاظی، جوش کے کلام میں کثرت سے پائی جاتی ہے۔ اور وہ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اس پر غور نہیں کرتے کہ نظم کے اصل مفہوم و مقصود پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ اسی نظم میں وہ پہلے تو یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ سڑکوں پر کامل خاموشی طاری ہے، لیکن آگے چل کر یہ بھی فرماتے ہیں کہ

لے رہی ہے سسکیاں روندی ہوئی سڑکوں کی گرد

اور الفاظ

کہ رہے ہیں کتنی الجھی حسرتوں کی داستاں
راستوں پر گاڑیوں کے پیچ و خم کھاتے نشاں

ہر چند یہ سب استعارتاً بیان ہوا ہے، لیکن جوش صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ ایسے استعاروں کا استعمال جو کسی نہج سے جمع اضداد کی صورت پیدا کرسکیں، شاعری کا نقص ہے۔

ایک جگہ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ دنیا محو خواب ہے لیکن اسے ظاہر کرتے ہیں اس طرح :-

زیست کے ماتھے پہ ہو لیلائے شب کا سرد ہاتھ

بجائے زیست کے بیداری ہونا چاہئے تھا۔

"تعبیراتِ حکائی"، یا "استعاراتِ محاکاتی" میں جوش بہت زیادہ تتبع انگریزی طرز ادا کا کرتے ہیں، لیکن چونکہ وہ انگریزی زبان سے واقف نہیں ہیں۔ اور نہ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ انگریزی ادب و انشار کی کن خصوصیات کی بنا پر کون سے استعارے کس محل پر استعمال کئے جاتے ہیں اس لئے وہ اردو میں ان کی تقلید کر کے حد درجہ بدنمائی و لغویت پیدا کر دیتے ہیں۔ اسی لئے فضا کو بوجھل، راہوں کو خستہ جان اور بے مزہ لمحوں میں دھار پیدا کرتے ہوئے انھیں مطلق باک نہیں ہوتا۔ اور نہ اس جوش اختراع میں انھیں اس کا احساس ہوتا ہے کہ کس بیدردی سے مفہوم کا خون کر جاتے ہیں۔ مثلاً ذیل کا شعر ملاحظہ ہو۔

ضو فگن ہے چاند عالم پر بصد لطف و نیاز
جسطرح بیمار کی بالینِ غم پر چارہ ساز

پہلے مصرعہ میں وہ ضوفگن لکھنے کو تو لکھ گئے۔ لیکن ذہن اس طرف منتقل نہ ہوا کہ دوسرے مصرعہ میں جو تشبیہ دی ہے۔ وہ محض اسی لفظ کے وجہ سے مہمل ہو کر رہ گئی، کیونکہ "بالین غم" پر "چارہ ساز" کے آنے کو کوئی یوں نہیں کہتا۔ کہ "چارہ ساز صاحب ضوفگن ہوئے ہیں"۔ البتہ اگر "چارہ ساز" سے "محبوب" مراد ہو تو بیشک کہہ سکتے ہیں، لیکن یہ مراد شعر سے متبادر نہیں ——— اسی طرح وہ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ

سو رہے ہیں برق پا جھونکے ہوائے سرد کے

معلوم ہوتا ہے کہ لفظ برق پا انھوں نے کسی جگہ دیکھ لیا ہے اور اس کے اصل مفہوم سے واقف نہیں۔ برق پا صفت اس چیز کی آتی ہے جو بہت جلد آن کی آن میں فنا ہو جائے، لیکن سرد ہوا کے جھونکوں کا تو دن بھر چلنا شاعر نے ظاہر کیا ہے۔ انھیں برق پا کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ دوسری لغویت یہ ہے کہ رات کو سرد ہوا کے جھونکوں کا بند ہونا اور دن بھر چلتا رہنا ظاہر کیا گیا ہے، درانحالیکہ سرد جھونکے ہوا کے بالعموم رات ہی کو چلتے ہیں۔

اسی نظم کا ایک شعر ہے:۔

سر کے فاقے سو چکے ہیں بندگانِ سوگوار
رزق کے وعدہ کو ایفا کر چکا ہے کردگار

یہاں بھی وہی جمع اضداد کی صورت پائی جاتی ہے۔ جب کردگار رزق کا وعدہ ایفا کر چکا تو پھر فاقہ کہاں سے آگیا جسکو برداشت کر کرکے بندگان سوگوار سو چکے تھے۔

"شاہد و شراب کی رات" کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں:۔

دمک اس رُخ پہ ایسی ہے کہ گویا
زمانہ کی صباحِ اوّلیں ہے

اس شعر میں "صباحِ اوّلیں" کہنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ جس طرح کسی وقت صباحِ اوّلیں کا طلوع ہوا تھا، بالکل اسی طرح اب بھی ہو رہا ہے۔

ایک اور شعر:۔

گھٹا زلفیں، دھواں پلکیں، چمن لب
جوانی ہوش میں گویا نہیں ہے

اس میں معشوق کی "الھڑ بادہ نوشی" کی تصویر کھینچی ہے۔ اور ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں۔ کہ اس پر عالم مدہوشی طاری ہے، جیسے لفظ گویا سے ظاہر کیا ہے۔ اب مصرعۂ اوّل کے ان مناظر کو دیکھئے، جو جوانی کی مدہوشی کو ثابت کر رہے ہیں زلفوں کو گھٹا کر ان کی پریشانی و آشفتگی کو ثابت کیا جا سکتا ہے، لیکن پلکوں کو دھواں اور لب کو چمن کہکر مدہوشی کیونکر ثابت ہو سکتی ہے، ان دونوں سے ربودگی کو کیا تعلق ہے۔

آفرینش کی اعجوبہ نمائیاں
اور
خلق و فنا کے حیرت انگیز مناظر

قدرت کے اسراف کا تماشہ دیکھنا ہو تو عالم خلق و فنا کو دیکھئے کہ ایک چیز کے باقی رکھنے کے لئے وہ کتنی چیزیں پیدا کر کے فنا کر دیتی ہے۔ کیا دنیا میں کوئی شخص صحیح اندازہ کر سکتا ہے۔ کہ نباتات و حیوانات کی پیدائش کتنی ہے۔ اور ان میں کتنے فنا ہو کر کتنے باقی رہتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کروروں پیدا کر کے سیکڑوں باقی رکھنا قدرت کا عجیب و غریب کھیل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر نباتات و حیوانات کو اس بیدردی سے فنا نہ کیا جائے تو کرۂ زمین پر سوائے گھاس پھوس اور جانوروں کے کچھ اور نظر ہی نہ آئے، لیکن سوال یہ ہے کہ اتنا پیدا کرنے ہی کی کیا ضرورت ہے جو کارگاہ ہلاکت کو اسقدر وسیع کرنا پڑے۔

کہا جاتا ہے کہ چوہے کی ایک قسم ایسی ہے کہ ایک جوڑے سے سال بھر میں سیکڑوں نسلیں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن ان میں سے اکثر فنا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح عالم نباتات کو دیکھئے کہ ان سے ارب در ارب تخم پیدا ہوتے ہیں لیکن زمین پر گر کر ان کا پھر نشو و نما صرف چند کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔ تاہم یہی چند تخم جب بڑے بڑے وسیع جنگل بن جاتے ہیں تو برق و سموم کے چند لمحے ان کو آن کی آن میں خاکستر کر کے رکھ دیتے ہیں۔ یہی حال جانوروں کی پیدائش و فنا کا ہے۔ چنانچہ کاڈ مچھلی (جسکا تیل کمزور سینہ والوں کو پلایا جاتا ہے) ایک موسم میں ۸۰ لاکھ انڈے دیتی ہے اور بام مچھلی ایک کرور۔ اسی طرح چیونٹیوں کی ایک قسم ہے جس کی ملکہ اپنی تین سال کی زندگی میں ۵۰ لاکھ انڈے دیتی ہے۔ اور سفید چیونٹی تو ایک دن میں ۸۰ ہزار انڈے پیدا کرتی ہے۔ یہی حال جھینگا مچھلی کا ہے کہ ایک دفعہ میں دس ہزار انڈے دیتی ہے۔ گھونگھا، جو حشرات بحری میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ چیز مانا جاتا ہے۔ ایک موسم میں ۵ لاکھ انڈے دیتا ہے۔ پھر خیال کیجئے کہ اگر قدرت نباتات و حیوانات کی اس پیداوار کو فنا نہ کرتی تو آج روئے زمین پر سوائے درختوں، مچھلیوں، چوہوں، چیونٹیوں اور حشرات الارض کے اور کیا ہوتا۔

جراثیم کی دنیا کا مطالعہ کیجئے تو عقل انسانی اور زیادہ حیرت زدہ رہ جاتی ہے کیونکہ بعض جراثیم ایسے ہیں جنکی عمر صرف بیس منٹ کی ہوتی ہے، لیکن اس کے بعد وہ پھر زیادہ تعداد میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور پھر فنا ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک برابر جاری رہتا ہے۔ جب تک ایک معتدل درجہ حرارت کا ان کی پیدایش کے لئے باقی رہتا ہے۔ پھر کیا آپ انداز کرسکتے ہیں۔ کہ اگر ایک پیالی خراب دودھ کی پانچ دن تک رہنے دی جائے تو اس میں کتنے جراثیم پیدا ہوجاتے ہیں کہ اگر اُن سے ایک غلاف طیار کیا جائے تو کرۂ زمین سے زیادہ بڑے کُرے کو ڈھکنے کے بعد بھی بچ رہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب آپ اس خراب دودھ کو زمین پر پھینک دیتے ہیں تو جراثیم فنا ہوجاتے ہیں اور دس ارب جراثیم میں سے کوئی ایک جرثومہ باقی رہ جاتا ہے جو پھر رفتہ رفتہ اپنی نسل کو اسی طرح بڑھا لیتا ہے اور پھر قدرت اسے فنا کردیتی ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ منظر بھی نظرانداز کرنے کے قابل نہیں کہ جوں جوں، نباتات وحیوانات میں ترقی ہوتی جاتی ہے ان کی پیداوار بھی گھٹتی جاتی ہے۔ تاریخ انسانی کے مطالعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب تک وہ وحشی وغیر متمدن رہا۔ اولاد کثرت سے ہوتی اور مرتی رہی، لیکن رفتہ رفتہ تہذیب وتمدن کے ساتھ ولادت ووفات دونوں میں کمی پیدا ہونے لگی۔

ترقی یافتہ حیوانات میں آپ ہاتھی کو دیکھئے کہ عمر بھر میں اس کے چند ہی بچے ہوتے ہیں۔ لیکن ماں باپ دونوں ان کی اتنی حفاظت کرتے ہیں کہ مرنے نہیں دیتے۔ بعض نیچے درجہ کے حیوانات میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ پانی کا ایک کیڑا ہے جسے نیرتیس کہتے ہیں۔ یہ سال میں صرف چند انڈے دیتا ہے لیکن اپنی اور انڈوں کی حفاظت کے لئے ایک نلکی سی طیار کرلیتا ہے۔ اور ہر وقت اپنی دُم کو حرکت دیتا رہتا ہے تاکہ پانی کی کافی مقدار اندر آتی رہے۔ اور انڈے خراب نہ ہونے پائیں۔ مچھلی کو دیکھئے کہ کیسے محفوظ مقامات میں انڈے دیتا ہے اور چھپنے میں کیسی مہارت رکھتا ہے۔

اسی طرح بعض نباتات کی حفاظت کا بھی انتظام قدرت نے کیا ہے۔ چنانچہ کوکوا درخت کے بیج کو دیکھئے کہ اس کے اوپری خول کے نیچے ہوا بھری ہوتی ہے اور وہ اس کو عرصہ تک خراب نہیں ہونے دیتی۔ یہ درخت اکثر ساحلوں پر ہوتا ہے اس لئے جب اس کے تخم گر گر کر سمندر یا دریا میں پہونچ جاتے ہیں تو یہی خول حفاظت کرتا ہے۔ اور تخم کو سڑنے نہیں دیتا۔ پھر جب پانی کی موجیں اسے کسی اور ساحل پر پہونچا دیتی ہیں تو یہ ہفتوں بلکہ مہینوں تک اسی طرح پڑا رہتا ہے۔ اور خول کی سختی کی وجہ سے اسے کوئی جانور کھاتا نہیں، پھر رفتہ رفتہ زمین کے اندر پہونچ کر اس کا خول پھٹتا ہے اور درخت نمودار ہوتا ہے۔

ایک اور درخت وربا سکم ہے جو سال میں سات لاکھ بیج پیدا کرتا ہے اور جن میں سے ۶ لاکھ بیج نشو ونما کی صلاحیت رکھتے ہیں جنھیں ہوا اطراف عالم میں اُڑا کرلے جاتی ہے، لیکن ان میں سے صرف سو تو اگتے ہیں باقی فنا ہوجاتے ہیں۔ پھر جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے یہ نسبت اور کم ہوتی جاتی ہے حتے کہ چند سال کے بعد صرف ایک یا دو تخم ایسے

پائے جاتے ہیں جو بار آور ہوتے ہیں ورنہ سب فنا ہو جاتے ہیں۔

تاریخ حیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بہت سے درخت یوں ہی رفتہ رفتہ فنا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے جانور بھی صفحۂ ہستی سے مٹ چکے ہیں۔ چنانچہ دنیاسور جانور جو کسی وقت لاکھوں کی تعداد میں پایا جاتا تھا۔ اب اس کا کہیں وجود نہیں ہے۔ اور کسی کسی مقام پر اس کے صرف ڈھانچے یا برف کے نیچے دبے ہوئے انڈے نظر آجاتے ہیں۔ اس وقت کے جانوروں میں چیتا کی نسل بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ اور بہت جلد یہ بھی صفحۂ ہستی سے محو ہو جائے گا۔

قدرت کے اسی اصول پر نگاہ کرکے بعض علماء نے یہ نظریہ بھی قائم کیا ہے کہ جس طرح نباتات و حیوانات کی بہت سی نسلیں فنا ہو گئیں اور ہوتی جا رہی ہیں۔ اسی طرح موجودہ انسان کی نسل بھی محو ہو جائے گی۔ اور ایک وقت آئیگا۔ جب مستقبل کی فضائی مخلوق انسان کے ڈھانچوں کو بھی زیر زمیں دیکھ کر کہا کرے گی کہ یہ بھی کیسا بھیانک جانور تھا۔ اور غالب کے اس مصرعہ کا دُھرانے والا کوئی نہ ہوگا کہ

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یورپ کا فطری انسان

اور

حوا کی بیٹیوں کی خلد فروش عریانیاں

"نوجوان لڑکیوں کے گورے گورے سڈول بدن کو بالکل عریاں دیکھنا،

ایک ایسی لذت ہے، جس میں دماغ و نگاہ دونوں برابر کے شریک ہیں۔"

اقتصادی دشواریاں کتنی ہی بڑھ جائیں، جنسی آزادیاں خواہ کسی حد تک وسیع ہو جائیں، لیکن یہ بات ذہن انسانی میں کبھی نہیں آسکتی تھی کہ یورپ کا انسان جو تصنعات کا پتلا اور یورپ کی عورت جو اسباب آرایش و زیبایش کی پرستار ہے، کسی وقت تکلفات زندگی سے اس درجہ بیزار ہو جائے گی۔ کہ جسم پر کپڑے کا ایک تار بھی اسے گوارہ نہ ہوگا۔ یقیناً یہ نتیجہ فرط نزاکت کا نہیں ہے بلکہ کرشمہ ہے اس نظام قدرت کا جو ایک بار ماضی کو بھی گردش میں لاکر حال بنائے بغیر نہیں چھوڑتا۔

انسان کے عریاں پھرنے کا زمانہ وہ ہے جسے ہم "عہد قبل تاریخ" سے تعبیر کرتے ہیں، جب وہ کچا گوشت کھاتا تھا، جنگلوں میں آزاد پھرتا تھا، چوپایوں کی طرح دوڑتا پھرتا تھا ——— لیکن آج دنیا کے روشن ترین عہد کو بھی آخر کار پھر اسی عہد تاریک کا سہارا لینا پڑا۔ اور انسان کی فطری خواہشوں نے اُسے نہ صرف ملبوس سے بے نیاز کردیا بلکہ مختلف اداروں سے یہ آوازیں بھی آنے لگیں کہ انسان کو غلہ و گوشت خام حالت ہی میں کھانا چاہئے۔ اور قیام صحت کے لئے جانوروں کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں ٹیک کر روزانہ کچھ دیر چلنا از بس ضروری ہے۔

اس سے قبل نگار میں بعض مقالات مغرب فلسفۂ "عریانیات" پر شایع ہو چکے ہیں۔ اس لئے آج کی صحبت میں یہ بتانا غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ یورپ میں یہ ذوق اس درجہ عام ہوتا جارہا ہے کہ گزشتہ دو سال کے اندر لاکھوں آدمیوں نے اپنے کپڑے اتار پھینکے اور اسی حمام میں داخل ہو گئے جہاں سے "آدم و حوا" ابتداء آفرینش کے زمانہ میں جدا ہوئے تھے۔

خیال کیجئے کہ اگر کسی جگہ لاکھوں سیمیں تن، نازک کمر۔ اور بقول غالب "قیامت قامتاں، مژگاں درازاں" کا

ہجوم ہو، اس حال میں کہ نہ ان کا چہرہ رہین غازہ ہے، نہ گیسو منت کش شانہ، نہ کوئی ہیکل زیب گلو ہے نہ کوئی چوڑی رنجۂ ساعد ہیں۔ جسم پر کپڑے کا ایک تار نہیں، سرکش شباب کے سامنے کوئی حجاب نہیں ——— واقعی خیال کیجئے کہ اگر ایسا ہو تو کوئی کیا کرے، دل و دماغ کی کیا کیفیت ہو، نگاہ کی گستاخیوں کا کیا عالم ہو ——— یہ ہم اس وقت یہاں سرزمین مشرق پر سوچ رہے ہیں۔ جہاں عورتوں کو عام طور سے "مستورات" ہی کہتے ہیں اور حجاب و نقاب نے عورت کو "جلوۂ کوہ طور" بنا رکھا ہے، لیکن مغرب کی دنیا میں جہاں کی ہر خلوت نازایک "انجمن بر ملا" کا حکم رکھتی ہے، یہ خیال کوئی معنی رکھتا ہی نہیں اور یہی سبب ہے کہ وہاں مرد و عورت کا لباس اتار کر پھینک دینا گویا ایک لحاظ سے صرف پردۂ مجاز کو ہٹا دینا ہے۔

غالباً آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جرمنی میں اس وقت ۳ لاکھ مہذب و شائستہ پڑھے لکھے انسان بالکل ننگے رہتے ہیں اور اگر ان کے تمام اعوان و انصار کو جو تمام قرب و جوار کے ممالک یورپ میں پائے جاتے ہیں ان میں شامل کر لیا جائے تو یہ تعداد ایک کروڑ سے کم نہیں ہوتی۔ الغرض یہ تحریک یورپ میں رفتہ رفتہ نہایت قوی ہوتی جا رہی ہے۔ اور اگر کہیں ایک جنگ اور ہو جائے تو پھر دفعۃً تمام یورپ کا ننگا ہو جانا بالکل یقینی ہے۔ جرمنی میں سب سے پہلے اس تحریک کا سبب یہی ہوا کہ گزشتہ جنگ میں سب سے زیادہ وہی متاثر ہوا تھا اور اقتصادی دشواریوں نے منجملہ دیگر تغیرات معیشت و معاشرت کے اس تغیر کو بھی پیش نظر کر دیا۔ پھر چونکہ اس میں خیال حفظان صحت کا بھی شامل تھا۔ اور مختلف ماہرین فن نے کھلی ہوئی فضا کی کھلی ہوئی شعاعوں سے مختلف امراض کا علاج بھی شروع کر دیا تھا۔ اس لئے ایک اور قوی محرک شامل ہو گیا، یہاں تک کہ جرمنی میں اب ایک مستقل کالونی انھیں ننگوں کی قائم ہو گئی اور زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو عہد وحشت کی یاد نہ دلاتا ہو۔

لہ میں یہی گفتگو کر رہا تھا کہ میرے ایک دوست نے جو بے موقعہ اشعار پڑھ دینے میں ید طولٰے رکھتے ہیں، یہ سنکر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور فرمایا کہ "یہ نہ پوچھو کر کیا ہو۔ آہ

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے۔

بار بے محل اشعار پڑھنے میں نواب محمد اسحاق خاں مرحوم بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے ایک واقعہ سنئے:۔ علیگڈھ میں آپ سکرٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے اور ہر شعبہ پر آپ کی نگاہ تھی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں مطبخ کا انتظام غیر معمولی طور پر خراب ہو گیا اور لڑکوں نے جاکر شکایت کی کہ کسی دن ڈائننگ ہال میں تو آکر ملاحظہ فرمائیے کہ چپاتیاں کسقدر حسین پک کر آتی ہیں۔ نواب صاحب یہ سن کر دوسرے دن عین کھانے کے وقت پہونچ گئے۔ دیکھا تو واقعی چپاتیاں نہایت خراب تھیں۔ آپنے فوراً داروغۂ مطبخ کو طلب کیا اور پوچھا کہ اسکا کیا سبب ہے۔ اسنے مختلف عذرات پیش کرنے شروع کئے۔ نواب صاحب نے روک کر کہا کہ "داروغہ صاحب، فضول باتیں نہ بنائیے، مجھے سارا حال معلوم ہے۔ رات کا خواب الٰہی توبہ آپ سنیئگا تو شرمائیے گا" (دنیاز)

ہمبرگ میں ایک باغ انھیں کے لئے مخصوص ہے جہاں مدارس کے طلبہ بالکل ننگے کھیل کود میں معروف نظر آتے ہیں برلن میں ایک ورزش گاہ ایسی ہے جہاں لوگوں کو ریاضت جسمانی کے تماشے مفت دکھائے جاتے ہیں۔ یہیں دو حوض ایسے ہیں جو انھیں ننگوں کے لئے مخصوص ہیں۔ اسی طرح بحر شمالی جزیرہ سلیٹ میں عام اجازت ہے کہ جس کا جی چاہے ننگا پھرے۔

حال ہی میں امریکہ کے دو سیاحوں نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے "ننگوں کے درمیان" اس کتاب میں انھوں نے جرمنی کے تمام شمالی حصہ کا دورہ کرکے بعض بہت دلچسپ حالات قلمبند کئے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"جس وقت ہم لوگ پہلی بار اپنے کپڑے اتار کر آگے بڑھے تو ہمیں شرم سی تو ضرور معلوم ہوتی تھی لیکن دھوپ میں ننگے بدن پر جو ہوا لگتی تھی وہ نہایت خوشگوار تھی۔ ان لوگوں نے ہماری حد درجہ محبت کے ساتھ پذیرائی کی اور یہ دیکھ کر کہ ان میں سے کسی کی نگاہ ہمارے عریاں جسم پر تجسس سے نہ پڑتی تھی، ایک گونہ سکون سا ہم کو حاصل ہوا، لیکن ہم مشکل سے اپنی نگاہوں کی جستجو کو چھپا سکے جو سیکڑوں نوجوان لڑکیوں کی عریانی کو اپنا ہدف بنائے ہوئے تھی۔"

ان سیاحوں نے بیان کیا ہے کہ "اس عریاں کالونی کے رہنے والے نہایت صحیح و توانا اور اچھے دل و دماغ کے ہیں۔ انکی بیویاں، لڑکیاں، بچے اور بوڑھے سب نہایت ہی مسرور زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور آپس میں شادی بیاہ بھی اسی عریاں سادگی کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہمارے دوران قیام میں ایک دن ہمبرگ کا ایک دولتمند شخص معہ اپنی بیوی کے یہاں آیا جو نہایت قیمتی لباس اور زیور سے آراستہ تھی، وہ یہاں آکر ایک ہوٹل میں ٹھیرے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہاں سے نکلے تو پہچاننا دشوار ہو گیا کیونکہ دونوں ننگے تھے۔ اور حد درجہ مسرور نظر آتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ سوائے جرمنی کے یوروپ کے دیگر ممالک میں ابھی تک عملاً اس آزادی کا رواج نہیں ہوا۔ لیکن فکر و احساس کے لحاظ سے یہ لہر ہر جگہ دوڑ گئی ہے۔ اور وہ وقت یقیناً آنے والا ہے۔ جب سرزمین مغرب میں ہر عورت کا جسم عریاں طلوع آفتاب کا منظر ہو کر رہ جائے گا۔ خود جرمنی میں بھی اوّل اوّل جب ایک عریاں عورت ہوٹل میں داخل ہوئی تو پولیس نے اس کی مزاحمت کی تھی، لیکن آج خود حکومت کی طرف سے اُسی حوا کی بیٹی کے لئے وہ تمام انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ جو اس کے ذوق عریانی کو تسکین پہونچانے والے ہوں۔

مشرقی ممالک میں بھی مغربی تہذیب بڑی وسعت و قوت کے ساتھ پھیل رہی ہے، یہاں تک کہ سرزمین عرب میں بھی جو انبیاء ورسل کا مہبط رہا ہے بہت سی لڑکیوں کے گیسو "تا بنا گوش" سے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔

ہندوستان کی عورت میں جو ذہنی انقلاب پیدا ہو رہا ہے وہ بھی اپنے اندر سخت اضطراب انگیز مستقبل چھپائے ہوئے ہے۔ اور کسے خبر ہے کہ حکومت مغرب کے برکات دو تین نسلوں کے بعد یہاں کی عورت کو کیا سے کیا بنا دینے والے ہیں اس لئے اس وقت ہندوستان میں کسی کا یہ سوال کرنا کہ پردہ و تعلیم عورت کے لئے ضروری ہے یا نہیں بالکل ایسا ہی سوال ہے۔ جیسے کمان سے تیر جدا ہونے کے بعد یہ پوچھا جائے کہ تیر چلایا جائے یا نہیں۔ بلکہ اب تو اس سوال کا وقت ہے کہ مرد کو

اپنی وفاداری کا امتحان دینے کے لئے بچوں کو دودھ پلانے اور چولھے پر جاکر روٹیاں پکانے کی خدمت کس طرح انجام دینا پڑے گی۔

تاریخ سلطنت انسانی کے لحاظ سے دنیا پر مختلف دَور گزر چکے ہیں، سب سے پہلا دَور نظام امتالی کا تھا۔ جب عورت مرد پر حکومت کرتی تھی، اس کے بعد نظام بطریق پھیلا۔ جب مرد برسر اقتدار ہوا، اور دنیا کا کوئی ظلم ایسا نہ تھا۔ جو اس نے عورت پر نہ توڑا ہو۔ اب خدا جانے کتنی صدیوں کے بعد پھر وہی اوّلین دور آرہا ہے۔ اور عورت کا اقتدار بڑھتا جارہا ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ایک طرف علمی دور کے لحاظ سے تو یہ زمانہ " برق و نور " کا سمجھا جائے۔ اور جنسی حیثیت سے عورت کی حکومت کو قبول نہ کیا جائے۔ جو اگر برق و نور نہیں تو " زائیدۂ برق و نور " ضرور ہے۔

ایک نہلسٹ کی زندگی کے کچھ واقعات

شہاب نے اُسترا میز پر رکھ کر اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا " واقعہ یہ ہے کہ داڑھی مونڈنا بھی عجیب لذت ہے " اس کی آنکھوں سے اطمینان برس رہا تھا، چہرہ پر عجیب قسم کی شگفتگی تھی اور آنکھوں میں ہلکا سا تبسم ـــــ اس نے یہ کہہ کر ایک وقفہ کی خاموشی کے بعد میز سے اُسترا وغیرہ بکس میں رکھا۔ اور سامنے کی کرسی پر نسیم کی طرف مستفسرانہ انداز سے دیکھ کر غالب کا یہ شعر گنگناتے ہوئے۔

برلب یا علی سرائے بادہ روانہ کردہ ایم
مشرب حق گزیدہ ایم عیش مغانہ کردہ ایم

کہا۔ " فرمائیے نسیم صاحب کیسا مزاج ہے " ـــــــــ

شہاب کی عمر ۴۰ سے متجاوز ہو چکی تھی اور ہر چند زمانہ نے اُسے کبھی " لطف فراغ " سے آشنا نہ کیا تھا، لیکن اس کے چہرہ کے اعصاب سے کسی کو یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ " تنازع للبقا " میں اس کو کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ابھی تک اس کے خدوخال میں کافی نرمی پائی جاتی تھی۔ اور یبوست، جو ایک زمانہ کی شکایت کرنے والے کے چہرہ پر بالعموم پیدا ہو جاتی ہے، اس میں بہت کم پیدا ہوئی تھی۔ دنیا اس کی صحت پر تعجب کرتی تھی۔ اور سمجھتی تھی کہ وہ یقیناً کافی مالدار ہے۔ لیکن اس کا اصل راز تھا جسے وہ بارہا ان الفاظ میں ظاہر کر چکا تھا۔ کہ " افلاس نام مادی مجبوری کا نہیں بلکہ قلب و ضمیر کی مجبوری کا ہے۔ وہ بے انتہا آزاد خیال، حد درجہ آزاد مشرب تھا اور ایک چیز کا مطالعہ، فطرت کے اس نقطۂ نظر سے کیا کرتا تھا۔ جب وہ طلوع آفتاب میں محو ہو " غروب " کے باب میں وہ اس کا ہم آہنگ کبھی نہ ہوتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ فطرت سے زیادہ بے حس اور سنگدل کوئی چیز نہیں، اس لئے اس کا مقابلہ بھی اسی بے حسی سے کرنا چاہئے۔ قدرت کا بڑا حربہ افلاس میں مبتلا کرنا ہے یا پھر بیماریوں میں مبتلا کر کے مار ڈالنا، پھر اگر یہ اس کا انتقام ہے تو برارت کرنا ناگزیر۔ اور اگر کوئی درس ہے تو اس استبداد کے خلاف احتجاج کی صورت یہی ہے کہ اس درس کو رد کر دیا جائے اور گدایانہ گریہ و زاری سے انسانی خودداری کو صدمہ نہ پہونچایا جائے۔ ایک امیر کے سامنے کمر بستہ جھکنے والے وہی ہیں جن کے پیٹ نہیں بلکہ دل بھوکے ہیں جس کو " آن " کی فکر نہیں وہ " آندا تا " کا محتاج کیوں ہو ـــــــ الغرض شہاب عجیب و غریب اصول کا انسان تھا۔ اور اپنے اعتقادات کے لحاظ سے وہ عرف عام میں ایسے سخت " کفر و الحاد " کا مبلغ تھا کہ مشکل ہی سے دنیا میں ایسی مثالیں ملتی ہیں۔

نسیم نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "مزاج کا حال نہ پوچھئے، کاروبار کی خرابی سے اب تو آبرو سنبھالنا بھی مشکل ہے۔"

نسیم، شہاب کے دوستوں میں سب سے زیادہ نوجوان دوست تھا۔ اور شہاب کے اصول وعقاید سے ہرچند اس کو بالکل اتفاق تو نہ تھا۔ لیکن ایک حد تک اس سے مرعوب ضرور تھا۔ وہ کبھی کبھی اس کے پاس ضرور آتا۔ کیونکہ اوّل تو اس کے بعض مشورے بہت صائب ہوا کرتے تھے۔ اور جو امداد اس کے امکان میں ہوتی اس سے کبھی دریغ نہ کرتا۔ دوسرے یہ کہ نسیم ایک حد تک "نہلسٹ" خیال کا انسان تھا۔ اور شہاب کی گفتگو سے اسے بہت کچھ مواد اپنے اس عقیدہ کی پختگی کے لئے مل جایا کرتا تھا۔

شہاب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ آبرو؟ یعنی زندگی ومعاشرت کے ایک خاص معیار کو قائم رکھنا۔"

نسیم۔ "ہاں، اور کیا؟"

شہاب۔ "لیکن یہ معیار تو آپ نے خود ہی قائم کیا ہے، اس لئے آپ اسے بدل بھی سکتے ہیں"

نسیم۔ "یہ صحیح ہے، مگر جس چیز کا انسان عادی ہو جائے اس کا ترک کسقدر دشوار ہوتا ہے، پھر شماتت ہمسایہ الگ!"

شہاب۔ "ہاں، یہی حال مذہب والوں کا بھی ہے کہ "شماتت ہمسایہ" کا حال بہت سی نہ سمجھ میں آنے والی باتوں پر ان کو قایم کئے ہوئے۔ مگر تم تو شاید نہلسٹ اعتقاد کے انسان ہو؟

نسیم۔ "ہاں، ہوں تو، مگر اس سے اس کو کیا تعلق؟

شہاب۔ "خوب، سچا نہلسٹ تو وہی ہے جو سب سے پہلے اپنے خیال واعتقاد کے خلاف بغاوت کرے۔ نہلسٹ ہونا بُت شکن ہونا ہے، پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ اپنے دل ودماغ میں بسنے والے بتوں کو تو برقرار رکھیں اور دوسروں کے بتوں کے سامنے "تیشۂ ابراہیمی" لے کر کھڑے ہو جائیں۔"

نسیم۔ "اچھا تو بتائیے اِس سوسائٹی کے بُت کو کیسے توڑا جائے، جس کے اصول کی پابندی نے اس قدر پریشان کر رکھا ہے۔"

شہاب۔ "معاف کیجئے ابھی ہندوستان نے اتنی ترقی نہیں کی کہ سوسائٹی کا کوئی بت قائم ہو گیا ہو۔ یہاں جس چیز کا نام سوسائٹی رکھا گیا ہے، میں اسے حماقت و بزدلی کہتا ہوں۔"

نسیم۔ "یعنی؟"

شہاب۔ "میں یعنی وعنی کچھ نہیں جانتا۔ مجھے تو صرف اس قدر معلوم ہے کہ جب تک جسم میں ایک لنگوٹی باندھئے۔ اور دو دو دن کا فاقہ کرنے کے بعد بھی زندہ رہنے کا مقدور باقی ہے، ہنسئے جائیے اور چلتے پھرتے رہیئے۔"

نسیم۔ "مگر دنیا ہنسے گی نہیں"

شہاب۔ "آپ اس سے زیادہ ہنسئے۔ آپ کو کس نے باز رکھا ہے۔"

نسیم۔ "اور اگر اس طرح زندہ رہنے کا بھی مقدور نہ ہو تو؟"

شہاب۔ "یہ کون سی بڑی بات ہے مرجائیے۔ آپ کے مرنے سے دنیا کو کونسا ایسا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ کہ وہ آپ کے لئے ہائے وائے کرتی پھرے گی۔"

نسیم۔ "شہاب صاحب، انسان تنہا ہو تو سب کچھ کر سکتا ہے، علائق سے کس طرح جُدا ہو، بیوی بچوں کو کیا کرے"

شہاب۔ "اچھا کوئی اور ذکر کیجئے۔ اب آپ وہی تیسرے درجہ کے آدمیوں کی باتیں کرنے لگے۔"

نسیم۔ "میں ہوں ہی تیسرے درجہ کا آدمی، پھر باتیں کیوں نہ ویسی کروں۔"

شہاب۔ "ہوش میں آؤ، جب تم مرگئے تو پھر تمھیں کیا فکر کہ تمھارے پسماندگاں کس طرح زندگی بسر کریں گے، زندگی نام ہے اس فصل کا جو ایک عدم کے کنارے سے لے کر دوسرے عدم کے کنارے تک پایا جاتا ہے۔ قطرہ اسی وقت تک قطرہ ہے جب تک دریا سے نہیں ملا۔ علائق کے خیال سے مرنے میں ضرور تھوڑی سی تکلیف ہو سکتی ہے، سو یہ چند لمحوں کی بات ہے، اس کے لئے ساری زندگی خراب کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ تم تو ایک حد تک مذہبی انسان بھی ہو اس لئے تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ

"روئے کشادہ باید و پیشانی فراخ ؎ آنجا کہ لطمۂ زید اللہ می زنند

یہ کہہ کر اس نے سامنے کی الماری سے ایک شیشہ نکالا اور ایک گلاس میں تھوڑی سی شراب ڈال کر سوڈے کی بوتل کھولی اور گلاس لبریز کر کے اسے غور سے دیکھنے لگا ——— "نسیم، دیکھتے ہو ان چھوٹے چھوٹے بلبلوں کو جو شہاب ثاقب کی طرح نیچے سے اوپر کی طرف بیتابانہ دوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک معمولی انسانی زندگی کا بھی بالکل یہی فلسفہ ہے۔ ایک بے اختیارانہ صعود، ایک مضطربانہ اقدام، ایک والہانہ استعلا اور ایک مجنونانہ تگ و دو ——— یہ ایک لمحہ کا بقا بلبلوں کی ساری عمر پر حاوی ہے۔ درانحالیکہ ہماری ایک نگاہ بھی پوری طرح اس سے آسودہ نہیں ہوتی۔ اگر خدا اتنا ہی اہم ہے، اتنا ہی ذوالجلال ہے جتنا تم کہتے ہو، تو اس کے نزدیک نہ صرف انسان کی عارضی زندگی، بلکہ ساری کائنات کی ابدیت (اگر واقعی اس لفظ کا کوئی مفہوم ہے) کو ان بلبلوں سے بھی زیادہ غیر اہم و ناقابل لحاظ ہونا چاہئے۔ غالب کا یہ شعر تم نے سنا ہے:۔

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

حیرت ہے کہ شاعر ہو کر تم غالب کے اس طعن سے بے خبر ہو۔ درانحالیکہ مذہب و شعر دونوں کی جان یہی اعتقاد و اعتراف ہے، اور یہی وہ کشش ہے جو مایوسی سے ڈرنے والوں کو معاد و آخرت کے یقین کی طرف متوجہ کر دیتی ہے ——— ہر سچ ہے ملحد و بے دین ہونا بھی بڑے کلیجہ والوں کا کام ہے۔ (اب اس کی کیفیت

بڑھتی جاتی تھی) ـــــ حور و قصور کی طمع میں ہلاک ہو جانا اور بغیر کسی خیال مزد و اجرت کے جان سے گزر جانا کیا ان دونوں کے فرق کو تم محسوس نہیں کر سکتے ہو'

نسیم۔ "میں کر سکتا ہوں اگر کسی حد تک انسانیت سے گزر جاؤں"

شہاب۔ " (دوسرا جرعہ لیتے ہوئے) کیا انسانیت سے گزر جانا انسانی زندگی کی کوئی ٹریجڈی ہے جس سے خوف معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ انسان جب تک انسان ہے یعنی جب تک سوسائٹی میں وہ صرف انسان رہ کر زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ ہنوز گہوارہ میں ہے۔ اس کا عنفوان شباب اس وقت شروع ہوتا ہے جب اس قید و بند سے آزاد ہونے کی خواہش اس میں پیدا ہوتی ہے۔ اور سن و قوت تک پہونچتے پہونچتے تو وہ اس جگہ ہوتا ہے جسے شاعرانہ زبان میں "ماورا رسرحد ادراک" کہتے ہیں۔ انسان، انسان ہی اس وقت ہوتا ہے۔ جب وہ انسانیت سے گزر جائے، مذہبیت و اخلاق سے گزر جائے۔ تمدن و تہذیب سے گزر جائے بلکہ حدود الوہیت سے بھی گزر کر وہاں پہونچ جائے۔ جہاں ازل و ابد نام ہے صرف ایک "نگاہ غلط انداز" کا

(باقی)

باب الاستفسار

مزامیر کی حقیقت۔ سماع بالمزامیر

(جناب علی گوہر صاحب۔ پشاور)

"کہا جاتا ہے کہ مذہب اسلام میں مزآمیر کے ساتھ گانا سُننا حرام ہے۔
میں نے بعض حضرات سے دریافت کیا کہ مزآمیر سے کیا مراد ہے تو انھوں نے بتایا
کہ "مزامیر" سے مقصود وہ ساز ہیں جن میں ستار وغیرہ کی طرح تار استعمال
کئے جاتے ہیں۔ براہِ کرم مطلع فرمائیے کہ کیا واقعی مزامیر سے مراد تار والے ساز
ہیں اور نیز یہ کہ مزامیر کے ساتھ گانا سننا کیوں حرام ہے؟

(نگار) آپ کا استفسار دو اجزاء پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ مزآمیر کے ساتھ گانا سُننا کیوں حرام ہے۔ اور دوسرے یہ کہ مزآمیر سے کیا مراد ہے۔

امرِ اوّل کے متعلق میں زیادہ تفصیل سے گفتگو کرنا غیر ضروری خیال کرتا ہوں، کیونکہ سماع کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ اور اس کے دونوں پہلوؤں پر کافی بحث ہو چکی ہے، وہ لوگ جو اس کو جائز قرار دیتے ہیں وہ بھی کثیر دلائل پیش کرتے ہیں۔ اور جو ناجائز کہتے ہیں وہ بھی کافی ثبوت عدمِ جواز کا اپنے پاس رکھتے ہیں —— میرا فتویٰ اس مسئلہ میں دونوں فریق سے بالکل علیحدہ ہے اور میں دونوں کے دلائل کو بالکل دور از کار سمجھتا ہوں، کیونکہ یہ لوگ جب کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں تو آنکھ بند کر کے صرف منقولات و روایات کو دلیل راہ بناتے ہیں اور انھیں اس سے مطلق بحث نہیں ہوتی کہ یہ روایات کس حد تک قابلِ اعتبار ہیں، زمانہ کے احول اور تاریخ کے لحاظ سے ان روایات کا کیا مفہوم قرار دینا چاہیئے۔ اور ان سے کس اصول کے ماتحت استخراجِ نتائج کرنا چاہیئے، الغرض یہ حضرات نہ خود اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ اور نہ دوسر

کو اس کی اجازت دیتے ہیں۔

اس مسئلہ میں بھی دونوں فریق نے اسی قسم کی غلطی کا ارتکاب کیا ہے، اور خواہ مخواہ ایک معمولی سی بات کو اس درجہ اہمیت دے دی ہے کہ سماع کا مسئلہ بھی گویا مہمات مسائل اسلام میں داخل ہو گیا ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ جس زمانہ میں ظہور اسلام ہوا ہے۔ اس وقت حالت کیا تھی۔ اور ماحول کا تقاضہ اس مسئلہ میں کیا تھا ——— اس سے غالباً کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ابتدا ارتقاء میں ہمیشہ ایک قوم کو انھیں مسایل کی طرف توجہ ہوتی ہے جن کا تعلق صرف تعمیر قوم سے ہوتا ہے نہ کہ تعمیر تمدن سے یعنی سب سے پہلے اس کو اپنی بنیاد استوار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ مسئلہ مطلقاً سامنے نہیں ہوتا کہ اس بنیاد پر آگے چل کر جو عمارت تعمیر کی جائے گی۔ اس کی آرایش و زیبایش کس طرح کی جائے گی۔ اس لئے کھلی ہوئی بات ہے۔ کہ اوائل عہد اسلام میں فنون لطیفہ کی طرف توجہ کرنے کا کوئی موقعہ ہی نہ تھا۔ بلکہ برخلاف اس کے ضرورت اس امر کی تھی کہ اس ذوق کو بھی لوگوں میں نہ پیدا ہونے دیا جائے، کیونکہ فنون لطیفہ کا تعلق ترقی تمدّن سے ہے۔ نہ کہ تعمیر قوم سے اور تعمیر قومی کے زمانہ میں ایسے فنون کی طرف مایل ہو جانا جو تعیشات تمدّن کے لوازم میں داخل ہیں۔ کسی طرح مناسب نہیں۔

اس کے بعد جب حکومت اسلام پر ابتدائی دور گزر کر دوسرا دَور آیا یعنی جب سلطنت وسیع و مضبوط ہو گئی تو دیگر علوم و فنون کے ساتھ موسیقی کی طرف بھی توجہ ہوئی۔ اور اتنی توجہ ہوئی کہ دَورِ عباسیہ اسی فن کی بدولت عہد اسلام کے دَور زرّیں کہلایا جانے لگا۔ اور علمی و عملی دونوں صورتوں سے اس کو انتہائی تکمیل کی حد تک پہونچا دیا، چنانچہ کتاب الاغانی کی بیس جلدیں اس دعوے کے کافی ثبوت ہیں۔

بہرحال موسیقی یا سماع کا مسئلہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کا تعلق مذہب یا معتقدات مذہب سے ہو۔ بلکہ اسکا واسطہ صرف قومی حالات سے ہے۔ اگر کسی قوم کی سیاسی، اقتصادی، و اجتماعی حالت واقعی قابل اطمینان ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ فنون لطیفہ کی طرف مائل نہ ہو۔ اور اگر صورت اس کے برعکس ہے تو اسے کوئی حق حاصل نہیں۔ کہ وہ اس طرف توجہ کرے ——— اس لئے اگر ابتداء عہد اسلام میں سماع حرام تھا تو بالکل درست تھا۔ کیونکہ حالات کا اقتضاء یہی تھا، اس کے بعد جب دَور ترقی میں موسیقی کا رواج ہوا۔ تو بالکل صحیح و برمحل ہوا۔ کیونکہ ترقی تمدن کے ساتھ ساتھ اس کو بھی معاشرت و معیشت کے لوازم میں شامل ہونا چاہئے تھا۔ رہ گیا عہد حاضر سو مسلمانوں کی حالت دیکھ کر ہر شخص اپنی جگہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ فنون لطیفہ میں ان کا حصّہ لینا کس حد تک درست ہے۔ وہ قوم جسے پیٹ بھر کھانا نہ ملے، ستر پوشی کے لئے کپڑا نہ نصیب ہو وہ کس منہ سے نغمۂ و صہبا کا نام لے سکتی ہے اور اسے کیا حق حاصل ہے۔ کہ وہ اس طرف توجہ کرے۔ مشایخ و صوفیہ کا ذکر نہ کیجئے کہ وہ تو اس فکر سے فارغ و بے نیاز ہے۔ اور ایسے قوم کی اس دردناک حالت کا احساس ہی نہیں، وہ جو چاہے کرے اور جتنا جی میں آئے "آواز دولاب" پر اظہار مستی کیا کرے۔

آپ کے اس استفسار پر کہ سماع بالمزامیر حرام ہے، بڑا لطف آیا۔ کیونکہ اس سے قدرتاً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر سماع مزامیر کے ساتھ نہ ہو تو جائز ہے،

مزامیر، جمع ہے مزمار کی جس کے لغوی معنی اس آلہ کے ہیں جس کو پھونکا جائے۔ لیکن چونکہ منہ سے بجانے والے نَے کی قسم کے دو ساز ہیں۔ ایک وہ جن میں پتّی (قصبہ) رکھی ہوتی ہے اور جن کا ایک حصہ منہ میں داخل کرکے بجایا جاتا ہے جیسے الغوزہ اور دوسرے وہ جن میں پتی نہیں ہوتی بلکہ صرف پھونک کر آواز نکالی جاتی ہے۔ جیسے بانسری اس لئے عرب کے ماہرین موسیقی نے اوّل الذکر کا نام مزامیر رکھ دیا اور دوسرے کو یراع کہنے لگے۔

قدیم سامی لٹریچر سے معلوم ہوتا ہے کہ مزامیر ان کے یہاں بھی پائے جاتے تھے۔ لیکن اہل ایران کا بیان ہے کہ نَے یا مزمار کی ایجاد ایران کی ہے اور جمشید اس کا موجد تھا۔ عرب قبل اسلام میں مزمار محافل نشاط میں بھی بجائی جاتی تھی اور حجاز کے یہودی جنگ کے وقت بھی اس سے کام لیتے تھے۔ جس وقت ظہور اسلام ہوا تو حالت یہ تھی کہ عرب میں کثرت سے پیشہ ور عورتیں مزمار بجایا کرتی تھیں جنھیں زمّارہ کہتے تھے اور ان کا چال چلن اس قدر خراب تھا کہ زمّارہ اور زانیہ کے مفہوم میں کوئی فرق باقی نہ رہ گیا تھا، اسی لئے رسول اللہ نے مزامیر کے ساتھ گانا سننے کو حرام کر دیا کیونکہ اس وقت مزامیر کے ساتھ گانا سننے کا مفہوم ہی یہ تھا کہ زمّارہ کے عشوہ و ناز پر اپنے آپ کو قربان کر دیا جائے۔

اوّل اوّل اہل عرب جس ساز کو مزمار کہتے تھے، اہل ایران نے اس کا نام نَے رکھا تھا۔ بعد کو جس کے اندر قصبہ یا پتی ہوتی تھی۔ اسے نَے زم اور نَے سیاہ کہتے تھے اور دوسری قسم کو نَے سفید۔

عہد عباسیہ کے ایک ماہر موسیقی نے جس کا نام زنام تھا ایک قسم کی مزمار بنائی جو نَے زنامی کے نام سے مشہور ہوئی۔ چنانچہ اسپین میں جس ساز کا نام (Helami) ہے وہ یہی زنامی ہے۔

فارابی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مزمار میں آٹھ سوراخ ہوا کرتے تھے جن پر انگلیاں رکھی جاتی تھیں، ایک چھوٹی قسم کی مزمار کا نام اس نے سُریانے بتایا ہے جو بعد کو سُرنے اور سُرنا ہو گیا۔

ترکوں میں یہی لفظ زُرنا ہو گیا اور ایک دوسرا ساز جسے بوق کہتے ہیں وہ بھی اسی سے بنایا گیا، جیسا کہ ابن خلدون نے لکھا ہے۔ مسلمانوں میں مزامیر کا استعمال زیادہ تر جشن کے جلوس کے موقعہ پر ہوا کرتا تھا اور فوج میں بھی اس کا رواج تھا۔

ابن خورداد بہ نے لکھا ہے کہ ایرانیوں نے دوہری پتی کی بھی نَے ایجاد کی تھی جسے وہ دونائے کہتے تھے اور اہل عرب اس کو زمر المثنیٰ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اسی قسم کے مزماری ساز میں مشک کی بین (Bag-pipe.) بھی شامل ہے۔ جس کا عہد اسلام سے بہت پہلے ساسانی آثار میں پتہ چلتا ہے۔ ابن سینا اور ابن زیلا اس کو مزمار الجراب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

چنگ بھی مزمار میں شامل ہے جو فی الاصل چین کی ایجاد ہے لیکن اہل عرب میں اس کا رواج نہیں ہوا۔

ابن غیبی نے اس کا نام مستق رکھا ہے۔ اور اہل ایران بیشامشت کہتے تھے۔

چلپی نے ایک اور ساز قوال کا بھی ذکر کیا ہے جو مزمار میں شامل ہے۔ یہ ایک قسم کی بانسری تھی جسے گلہ بان استعمال کیا کرتے تھے۔

اہل عرب کی مزمار خصوصیت کے ساتھ بہت لمبی ہوتی تھی، چنانچہ اہل یونان بہت باتونی شخص کو عربی مزمار سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔

ابتدا، عہد اسلام میں اہل عرب اس کو قصابہ کے نام سے پکارتے تھے اور شعرا بھی اسی لفظ کا استعمال کرتے تھے۔ الغرض عرب میں جن سازوں کو مزامیر کے نام سے موسوم کرتے تھے ان کا کوئی تعلق تار سے نہ تھا بلکہ منہ سے پھونک کر بجائے جاتے تھے۔ اس لئے آپ کو اگر یہ بتایا گیا ہے کہ مزامیر تار کے باجوں کا نام ہے تو غلط بتایا گیا ہے۔ اور اگر گانا واقعی صرف مزامیر کے ساتھ حرام ہے۔ تو کوئی حرج نہیں۔ آپ ستار، سارنگی، بین، قانون وغیرہ کے ساتھ سنئے اور اگر کوئی اعتراض کرے تو کہہ دیجئے کہ یہ ساز تو مزامیر میں شامل نہیں ہیں ——— آیندہ ماہ کی اشاعت میں عہد اسلام کی موسیقی پر ایک مستقل مضمون کا انتظار کیجئے۔

---

(۲)

مزدک و مزدکیت

(جناب محمد حسین صاحب۔ راولپنڈی)

مزدک کون تھا۔ زردشت سے اس کو کیا واسطہ تھا۔ اور مزدکیت کے اصول کیا ہیں۔ زحمت نہ ہو تو تحقیق فرما کر مطلع کیجئے۔

(نگار) مزدک کا زمانہ زردشت کے تقریباً دو صدی بعد کا ہے اور اس نے خود کسی جدید مذہب کی بنیاد نہیں ڈالی بلکہ بہ ادنیٰ تغیر تعلیم زردشت ہی کی تبلیغ کی۔ اس کی تعلیمات کی تفصیل معلوم ہونا دشوار ہے کیونکہ تاریخ کی کتابیں اس باب میں بہت تشنہ ہیں لیکن عمومی حیثیت سے یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس نے امن عام پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور خودغرضی وطمع کو بہت برا سمجھا۔ اسی کے ساتھ اشتراکیت یا موجودہ بالشویت کے اصول کے مطابق اس نے عورت اور جائداد دونوں کو ملکیت عام قرار دیا۔

یہ واقعہ ہے کہ زردشتی مذہب، مزدک ہی کی وجہ سے ایران میں پھیلا اور پانچویں صدی کے اخیر اور چھٹی صدی

کی ابتدا میں تو اس کو بڑی سیاسی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔
پہلوی لٹریچر میں تو مزدک کا حال بہت کم ملتا ہے، لیکن اس عہد کے شامی اور بازنطینی لٹریچر سے اس کے تعلیمات پر کچھ روشنی ضرور پڑتی ہے۔ بعد کی عربی اور فارسی کتابوں میں جو حالات ملتے ہیں وہ سب خودائے نامگ سے لئے گئے ہیں جس میں ساسانی بادشاہوں کے حالات .... درج ہیں۔ البتہ سیاست نامۂ نظام الملک میں جو کچھ درج ہے اسے علیحدہ مستقل تحقیق کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ بہرحال اس جگہ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مزدکیت کے حالات کہاں کہاں کس ذرائع سے حاصل کئے گئے اور نہ اس میں آپ کو دلچسپی ہوگی، مختصراً میں ان حالات کو یہاں درج کئے دیتا ہوں۔
مزدک کے باپ کا نام مورخین نے بامداد لکھا ہے۔ اور مدریہ اس کی سکونت ظاہر کی ہے، بعض اصطخر اور تبریز اس کی جائے ولادت بیان کرتے ہیں —— البیرونی و دیگر مورخین کا بیان ہے کہ وہ مذہب زردشت کا مُغ تھا جسے موید کہتے ہیں۔ یہ بالکل درست ہے کہ اس وقت کی حالت ایران کی ایسی ہی تھی کہ ہر انقلابی تحریک کامیاب ہوجاتی۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کواد (قباد ؟) نے جو اس وقت حکمراں تھا کیوں مزدکی یا زردشتی مذہب اختیار کرلیا۔ بعض کا خیال ہے کہ واقعی وہ اس مذہب کی صداقت کا قایل ہوگیا تھا۔ اور بعض نے یہ توجیہ کی ہے کہ اس وقت کے امراء اور علماء مذہب کا اقتدار مٹانے کے لئے اس نے یہ ترکیب اختیار کی تھی تاکہ مزدک کے متبعین کو اپنا طرفدار بناکر اپنی قوت کو مستحکم کرے، بہرحال سبب جو بھی ہو، یہ امر مسلم ہے کہ کواد نے مزدکیت اختیار کرلی تھی اور چند دن میں اس مذہب کو بڑا سیاسی اقتدار حاصل ہوگیا۔ اوّل اوّل تو ملک کی مخالف قوتیں اس انقلاب کو برداشت کرتی رہیں، لیکن بعد کو ایک عام برہمی پیدا ہوئی۔ اور کواد کو قید کرکے اس کے بھائی جاماسپ کو تخت نشین کردیا۔ کواد کسی نہ کسی طرح قید سے نکل کر بھاگا۔ اور پھر ۴۹۹ء میں اپنا تخت واپس لیا۔ اس دوران میں مزدکیت اور وسیع ہوگئی تھی۔ اور سخت بد امنی ملک میں پھیل چکی تھی۔ امراء دن دہاڑے لوٹے جاتے تھے۔ اور عورتیں زبردستی بھگالی جاتی تھیں۔ کواد نے یہ رنگ دیکھ کر پہلے تو اپنے مخالفین سے انتقام لیا اور بھرام اور اکابر مذہب کو ملایا کیونکہ بازنطینی حکومت کا اسے مقابلہ کرنا تھا —— کواد کے دو لڑکے تھے، بڑا بادشخوارشاہ، چھوٹا خسرو۔ چونکہ مزدکی جماعت بجائے خسرو کے اس کے بڑے بھائی کی طرفدار تھی۔ اور اسی کو باپ کا جانشین کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے خسرو اس جماعت سے بہت متنفر تھا۔ پھر چونکہ کواد پر خسرو کا بڑا اثر تھا۔ اس لئے اس نے اپنے باپ کو آمادہ کیا کہ اس جماعت کا قلع قمع کردینا چاہئے۔ چنانچہ مزدک کو مع اس کے بڑے بڑے معاونین کے دربار میں اس بہانہ سے بلایا کہ کسی مذہبی مسئلہ پر گفتگو کرنا ہے۔ لیکن جب وہ جمع ہوگئے تو قتل عام شروع کردیا گیا۔ اس کے بعد جب ۵۳۱ء میں خسرو تخت نشین ہوا تو پھر اسے جو جو مزدکی ملا اسے تہ تیغ کرڈالا۔ لیکن اس واقعہ سے مزدکیت کا خاتمہ نہیں ہوا، کیونکہ جو افراد بچ کر ادھر ادھر بھاگ گئے تھے۔ انھوں نے خرمیہ مسلک کی بنیاد ڈالی جو حقیقتاً مزدکیت ہی کی ایک شاخ تھی۔ اور باطنی و اسمٰعیلی

مذاہب میں بھی مزدکیت کے عناصر شامل ہو گئے۔
بہرحال مزدکیت کافی عرصہ تک وسط ایشیا میں برسرعروج رہی اور اس کے تعلیم کی وہ عملی خصوصیت جو کسی اور متمدن مذہب میں (سوائے موجودہ بالشویت کے) اس وقت تک نہیں پائی گئی اس کی اشتراکیت تھی۔ جس نے جائداد اور عورت دونوں کو ملک عام بنا دیا تھا۔

آثارِ انقلاب

نصفِ شب ہے، شورشِ بزمِ جہاں خاموش ہے
قہقہے ساکت ہیں، آوازِ فغاں خاموش ہے
زندگی، ناکامیوں کا اضطرابِ جانگداز!
ہلکی ہلکی سرد آہوں کا عذابِ جانگداز!!!
نیند کے گہرے نشے میں غرق ہے، مدہوش ہے
بے نیازِ کلفتِ فردا اور رنجِ دوش ہے
سو گیا ہے غم کا ظالم ناگ شب بھر کے لئے!!
بجھ گئی ہے تلخیوں کی آگ شب بھر کے لئے
مضمحل، بیکس، غریب انساں، تھکے ہارے ہوئے
سو رہے ہیں چادرِ غفلت سے منہ ڈھانپے ہوئے
حیرتِ ناگاہ بام و در سے ہے لپٹی ہوئی!!
دم بخود ہو کر ہے موجِ زندگی سمٹی ہوئی

گو فضائے دہر کیف آلود ہے، سرشار ہے
ہلکی ہلکی آنچ میری روح میں بیدار ہے
روح اِس تاریک غمخانہ سے اب بیزار ہے
مقتلِ انسانیت میں زندگی دشوار ہے
کوئی دلچسپی نہیں رفتارِ صبح و شام میں
کچھ نہیں غیر از مصائب امن ایام میں
وحشت آلودہ ہیں سنگیں آسماں کی وسعتیں
نیلگوں، بے حس، مکدر سائباں کی وسعتیں
مضمحل تاروں کی زرد آنکھیں ہیں پتھرائی ہوئی
کہکشاں کے آئینہ میں گرد ہی چھائی ہوئی

چل سکے گا ہمنشیں کب تک فریبِ مستقل پرورش کرتا ہی شعلوں کی شکیبِ مستقل
منقلب ہونے کو ہی دُنیا کا فرسودہ نظام خواب سے بیدار ہوتا ہے خدائے انتقام
اِنتہا تک جب پہنچ جاتی ہے تحریکِ فریب ٹوٹ پڑتا ہے قیامت بنکے فطرت کا شکیب
بجلیاں گرنے کو ہیں اب اس بھیانک چرخ سے قہر نازل ہو گا دنیا پر اچانک چرخ سے

مجھ سے آنکھیں مانگ کر دیکھ اے بصارت ناشناس کس طرح طاری ہے دُنیا پر تباہی کا ہراس
کیا سناؤں تجھ کو میں خاموش راتوں کا پیام کیا دکھاؤں وہ مناظر جن سے جینا ہے حرام
کوندتی رہتی ہیں شب بھر آسماں پر بجلیاں ناچتا رہتا ہے آنکھوں میں قیامت کا سماں
پھیلتا ہے موت کی چنگاریوں کا ایک جال مُرتعش ہوتا ہے برقی تازیانوں کا جلال
قہر کے شعلے برستے ہیں غضب ڈھاتے ہوئے معصیت کے قصر گر جاتے ہیں تھرّاتے ہوئے

خون کا دریا اُبل پڑتا ہے تا حدِ نظر
اور لہو میں غسل کرتا ہے زمانہ رات بھر

عدم

درسِ حقایق

دونوں جہاں کی خلق پر اس لیے مجکو فوق ہے
تیرے گلے میں بندگی کا بھی ازل سے طوق ہے
اُنس ہی کائنات ہے، عقل ہے اور ذوق ہے
قفلِ رموز کی کلید تارِ نگاہِ شوق ہے

دیکھ فضا میں آفتاب آئینۂ حیات ہے
گردش مستقل ہی یاں اک سببِ ثبات ہے
ایک جہاں جدوجہد ذرّہ کائنات ہے
——— قفلِ رموز کی کلید تارِ نگاہِ شوق ہے

موجِ رواں میں ہیں شرر برقِ تپاں کے عکس ریز
قطرۂ آب میں نہاں ہے اک صدائے حشر خیز
نکہتِ گل سے تخم کا سینۂ تنگ مشک بیز
——— قفلِ رموز کی کلید تارِ نگاہِ شوق ہے

مشتِ غبارِ دشت میں بند شعاعِ آفتاب
دُرجِ صدا میں قید ہے نغمۂ دلکشِ رباب
نخلِ چمن کے برگ کا ہر ورق اک نئی کتاب
——— قفلِ رموز کی کلید تارِ نگاہِ شوق ہے

(محمود - اسرائیلی)

قطعات

گریۂ سحری

ہمیشہ وقتِ سحر جب قریب ہوتا ہے　　ہوائیں چلتی ہیں، سارا جہان سوتا ہے
تجھے خبر نہیں او غم سے بے خبر! اُس وقت　　ترے پڑوس میں اک غم نصیب روتا ہے

حسین رات

نسیم، پھولوں کی رونق، کھِلے ہوئے تارے　　فضا میں چھوٹ رہے ہیں ضیا کے فوارے
رُخِ حسینۂ فطرت سے اُٹھ گئی ہے نقاب　　نظر کو ڈھونڈ رہے ہیں حسین نظارے

گمشدہ زندگی

اَلم نے چھین لئے ہائے وہ خوشی کے دِن　　وہ انبساط کی راتیں، وہ دل لگی کے دن
ہزاروں غم ہیں مجھے اب اُداس رہتا ہوں　　کہاں گئے مرے اللہ! وہ ہنسی کے دن

لمحاتِ کیف

سہانی رات، ہوائیں، بیاس کا ساحل　　ضیا فگن ہے قمر، موجِ آب نغمہ بیز
جو کیفیت ہے مری ہائے کیا بیان کروں　　دل و جگر مترنم ہیں، روح سجدہ ریز

بہار

یہ بوندیاں، یہ ہوائیں، یہ کیف بار سماں　　مرے حواس پہ اک بیخودی سی چھائی ہے
تجلیاتِ مسرت سے قلب ہے معمور　　مگر بہار کسی کا سلام لائی ہے

اختر انصاری

دوشیزگانِ دہقاں

جھونکے ہوا کے دل کو سرشار کر رہے ہیں　　خوابیدہ زندگی کو بیدار کر رہے ہیں
عالم ہے عطریت کا موجِ صبا رواں ہے　　یہ رازدانِ فطرت صحرا کی پاسباں ہے
اِک روح پھونک دی ہے آکر کلی کلی میں　　دنیائے دلکشی ہے جلوؤں کی سادگی میں
اشجار جھومتے ہیں غنچوں میں ہے تبسّم　　جنبش سے ٹہنیوں کی پیدا ہے اک ترنم
یہ قطعۂ زراعت کیا حاصلِ جہاں ہے　　اس کا ہر ایک ذرّہ دلکش ہی دلستاں ہے
گہوارۂ مناظر یہ فخرِ بوستاں ہے　　پستی میں یہ زمیں ہے رفعت میں آسماں ہے
دیہات میں عیاں ہیں انوار زندگی کے　　ہر شے سے ہیں نمایاں آثار زندگی کے
دوشیزگانِ دہقاں گلگشت کر رہی ہیں　　یا دامنِ نظر کو پھولوں سے بھر رہی ہیں
نازاں ہے خود جوانی اٹھکھیلیوں کے سن ہیں　　آزاد زندگی ہے۔ بیباکیوں کے دن ہیں
آغوشِ دیہ میں یہ اتنی بڑی ہوئی ہیں　　پروردۂ فضا ہیں دنیائے دلکشی ہیں
کچھ نازنینِ کمسن ہنس ہنس کے گا رہی ہیں　　کچھ اپنی شوخیوں کے جلوے دکھا رہی ہیں

دیکھے جوان کی شوخی وہ بار بار دیکھے
مجبور و مضطرب ہو بے اختیار دیکھے

کندھوں پہ ہل لئے ہیں دہقان کیا مگن ہیں　　اور دخترانِ خوشرو ساتھ ان کے گامزن ہیں
شام و سحر میسّر ہے سیرِ بوستانی　　شاداب ان کی روحیں، پُر کیف زندگانی

مسرور ہو رہی ہیں، محنت سے باخبر ہیں — مستی سے بے خبر ہیں۔ ہمّت سے باخبر ہیں
کرتی ہوئی کلیلیں سرمست ہو رہی ہیں — کچھ پھول چُن رہی ہیں، کچھ بیج بو رہی ہیں
کھیتوں کو سینچتی ہیں سرگرم کار حوریں — جنت بنا رہی ہیں رشکِ بہار حوریں
بیدار کر رہی ہیں ذرّاتِ مضمحل کو — آباد کر رہی ہیں دنیائے آب و گِل کو
روزانہ سخت محنت عادت میں ان کی داخل — جوشِ عمل سے پیہم کرتی ہیں طے مراحل
کرتی ہیں جب یہ اپنا روزانہ خون پانی — آتی ہے کھیتیوں پر کس شان سے جوانی
مل مل کے خاک میں یہ خود کو مٹا رہی ہیں — اور دانے دانے کی یہ قسمت جگا رہی ہیں
دنیا کے واسطے یہ ایثار ان کا دیکھو! — خوش حال کر دیا ہے ہر ذرۂ جہاں کو

یہ رزق فی السما کی تفسیر بن گئی ہیں
تقدیر کی یہ گویا تدبیر بن گئی ہیں

دہقانیوں کا طبقہ کس درجہ نیک خو ہے — اِک بار ورچمن ہے، عالم کی آرزو ہے
آرائشِ جہاں کا، دنیا کی لذتوں کا — دار و مدار ان پر ہر اک کی راحتوں کا
کوشش ہیں یہ سراپا، اُمید ہیں سراسر — شاہ و گدا پہ ان کا احسان ہے برابر
عشرت کدے جہاں کے قائم ہیں انکے دم سے — دولت کدے جہاں کے قائم ہیں ان کے دم سے

ساری ترقیوں کا یورپ کی راز ہیں یہ
مشرق کی دیویاں ہیں مغرب نواز ہیں یہ

فطرت واسطی

میری طرح

کس کی تخلیق میں ہے رنگِ فنا میری طرح   کون ہے بسملِ پیکانِ قضا میری طرح
کون ہے میری طرح پیکرِ اندوہِ طلب   کس کی تصویر میں ہے رنگِ دعا میری طرح
کون اتنا ہے ترے حسنِ کرم پر نازاں   کون ہے سرخوشِ صہبائے غنا میری طرح
کون ہے میری طرح خستۂ اندوہِ وفا   جرمِ الفت کی ملی کس کو سزا میری طرح
خاک، ناکامیٔ پیہم نے بنایا کس کو   کون بربادِ رہِ عشق ہوا میری طرح
عرصۂ دہر میں ہے کون اسیرِ ہستی   خستۂ کشمکشِ بیم و رجا میری طرح
موت کس کو نظر آتی ہے حیاتِ جاوید   کون بیمار ہے بیزارِ شفا میری طرح
کیوں زمانہ مری حیرت پہ ہے انگشت نما   کوئی دیکھے تو سہی اس کو ذرا میری طرح

کم نہیں حسنِ ستم لطف کرم سے کوکب
کوئی پیدا تو کرے ذوقِ وفا میری طرح

کوکب شاہجہانپوری

اُمید کی کشتی

ناامیدی کے تند دھارے پر — اپنی تقدیر کے سہارے پر
تیز موجوں میں ڈگمگاتی ہوئی — خوفِ طوفاں سے تھرتھراتی ہوئی
بہہ رہی ہے امید کی کشتی
یاس و حرماں کے چھائے ہیں بادل — غرق کرنے کو آئے ہیں بادل
کوئی تدبیر چل نہیں سکتی — یعنی تقدیر ٹل نہیں سکتی
ڈوب مرنے کا کچھ ملال نہیں — پار اترنے کا بھی خیال نہیں
کاش! ساحل تو دیکھ لیتا مَیں — اپنی منزل تو دیکھ لیتا مَیں

تند موجوں نے گھیر کر آخر — سارے دریا میں پھیر کر آخر
دامِ گرداب میں پھنسا ہی دیا — موت کا راستہ دکھا ہی دیا
آہ! دریا میں غرق ہوتی ہو — یاس اُمید کو ڈبوتی ہے
میرے اللہ مجھے بچا لینا
پنجۂ موت سے چھڑا لینا

باقی صدیقی (سہام)
راولپنڈی

مَعلُومات

تاریخ عالم میں سب سے بڑا جھوٹا انسان یوں تو جھوٹے ہر زمانہ اور ہر ملک میں پائے گئے ہیں اور دنیا کے بہت سے مشہور لوگوں نے جھوٹ ہی کی بدولت شہرت و عظمت حاصل کی ہے، لیکن ان لوگوں کے جھوٹ محدود تھے اور آخر کار کھل کر رہے لیکن تاریخ کے صفحات میں ایک ایسا کذابِ اعظم بھی نظر آتا ہے جس کا مثل نہ اس سے قبل کبھی پیدا ہوا۔ اور نہ آیندہ توقع ہے۔ اسکا جھوٹ ایک ایسا جھوٹ تھا جو اپنے بعد نہ مٹنے والے نقوش و آثار چھوڑ گیا ہے۔ اور اسی کے بدولت وہ زبردست مشہور مورخین میں شمار ہونے لگا۔

اس کا اصل نام تو کسی کو معلوم نہیں لیکن وہ نام جس سے وہ مشہور ہوا۔ جارج بسالماناززار تھا۔ یہ نام جو آشوریہ کے بادشاہوں کی وضع کا ہے خود اسنے اپنے لئے گھڑا تھا۔ اور اسی نام سے وہ ہمیشہ پہچانا گیا ——— ۱۶۷۹ء میں فرانس کے ایک قصبہ میں یہ شخص پیدا ہوا۔ اس قصبہ کا نام لانجدوک ہے جو یوروپ بھر میں کذب کے وجہ سے مشہور ہے اور یہاں کے لوگ اسپر فخر کرتے ہیں کہ دنیا میں انسے بہتر جھوٹ کوئی نہیں بول سکتا۔

ہمارے ہیرو کی عمر ۶ سال کی تھی جب وہ مدرسہ میں داخل ہوا۔ اس کا باپ بیوی بچوں کو چھوڑ کر جرمنی چلا گیا تھا اور اسکی ماں صد درجہ عسرت میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ چند سال کے بعد ماں نے اس کو مرسیلیا بھیجدیا تاکہ وہاں مذہبی تعلیم حاصل کرکے راہبانہ زندگی اختیار کرے۔ مگر چونکہ یہ شہرت کا طالب تھا اسلئے وہ یہاں سے چلا گیا اور شہر افنیون کے ایک امیر گھرانے میں پڑھانے پر ملازم ہو گیا۔ اسوقت اسکی عمر سولہ سال کی تھی۔ گھر کی مالکہ اس سے محبت کرنے لگی لیکن جب اسکی طرف سے خاطر خواہ پزیرائی محبت کی نہ دیکھی تو اسکو علیحدہ کردیا۔ یہ زمانہ اس کیلئے نہایت افلاس و تنگدستی کا تھا۔ یہ فرانس کے مختلف مقامات میں چکر لگا رہا تھا۔ اور کہتا پھرتا تھا کہ میں آرلینڈ کا رہنے والا ہوں اور حکومت انگلستان نے مجھے میرے مذہبی معتقدات کیوجہ سے نکال دیا ہے۔ اس بنا پر یہ "شہید آئرلینڈ" کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔ پھر یہ اپنے باپ کی جستجو میں جرمنی گیا۔ اور اسکو ڈھونڈھ نکالا لیکن اسکی حالت اس سے بھی زیادہ ابتر و سقیم تھی۔ اسلئے اسنے فیصلہ کیا کہ کذب نفاق کے علاوہ اب کوئی اور صورت حصول شہرت و زر کی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اسنے مشہور کیا کہ میں جاپانی ہوں لیکن دین مسیحی اختیار کرنے کیوجہ سے بھاگ آیا ہوں کیونکہ اہل جاپان مسیحیوں کو ذبح کر ڈالتے ہیں۔ اسیوقت اسنے اپنا نام بسالماناززار رکھا۔ اور مشہور کیا کہ میں جاپانی زبان کا ماہر ہوں، درانحالیکہ وہ کبھی جاپان نہیں گیا تھا۔ اور اس زبان کا حرف شناس بھی نہ تھا ——— بعض انگریزی و ہالینڈی افسران فوج نے یہ حالات معلوم کرکے اس سے خواہش ظاہر کی کہ جاپانی زبان کی ایک کتاب تحریر کرے۔ چنانچہ یہ فوراً آمادہ ہو گیا۔ اور اسی تاریخ سے اسکا وہ کذب شروع ہوتا ہے جسکی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ یعنی اسنے جزیرۂ فارموسا کی تاریخ لکھی اور وہاں کے لوگوں کے حالات و مراسم درج کئے۔ اسنے محض اس کتاب کے لکھنے کیلئے ایک زبان گھڑی، ایک خاص خط ایجاد کیا اور خدا معلوم کس کس قسم کے جھوٹ وضع کرکے جزیرۂ فارموسا کے حالات لکھے اور نقشے و تصاویر بھی بنائے یہ کتاب ۶ بار طبع ہوئی۔ اور کثرت سے فروخت ہوئی درانحالیکہ اس زبان کا جاننے والا دنیا میں کوئی نہ تھا بعد کو لندن کی ایک علمی انجمن نے اسکو دعوت دی کہ وہ جزیرۂ فارموسا کے حالات بیان کرے چنانچہ اسنے بسیط لکچر دئے جو یکسر کذب و دروغ کا مجموعہ تھے اور اسطرح وہ تمام یوروپ میں مشہور ہو گیا۔ اسنے انجمن علمی کی خواہش پر فارموسا کی زبان پر ایک کتاب گرامر و دیباچہ کی بھی لکھی اور کسی پر یہ راز نہ کھلا کہ جس زبان کی اسنے ایجاد کی ہے اسکا وجود کہیں پایا ہی نہیں جاتا۔

زمین کا وزن | ڈاکٹر بول ہیل ایک زمانہ سے اس فکر میں لگے ہوئے تھے کہ زمین کا وزن معلوم کیا جائے۔ چنانچہ اب انھوں نے اعلان کیا ہے کہ زمین کا وزن ان کے نزدیک ۶۵۹۲۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ ٹن ہے اور اگر تمام انسان وحیوان جو اس پر چل پھر رہے ہیں فنا ہو جائیں تو لاکھواں حصہ بھی اس کے وزن کا کم نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر موصوف نے اس وزن کی تحقیق میں کن آلات ریاضی سے کام لیا ہے اس کا علم ہمیں نہیں، لیکن ایک بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی اور وہ یہ کہ وزن جس چیز کا نام ہے وہ صرف قوت کشش ہے یعنی مرکز زمین سے جو چیز جسقدر زیادہ قریب ہوگی اتنی ہی وزنی محسوس ہوگی۔ چنانچہ اس کا تجربہ یوں ہو سکتا ہے کہ آپ کسی چیز کو سطح زمین پر وزن کیجئے۔ اور پھر کسی نہایت بلند پہاڑ کی چوٹی پر لیجا کر تولیے تو وزن میں ضرور فرق ہو جائیگا پھر غور طلب امر یہ ہے کہ اس اصول کے ماتحت زمین کے وزن کے کیا معنے ہوں گے۔ غالباً اس سے مراد آفتاب کی وہ قوت کشش ہوگی۔ جو زمین کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے، لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ زمین و آفتاب کا فاصلہ روزانہ کم ہوتا جاتا ہے۔ تو پھر زمین کا کوئی وزن معین کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

آفتاب کے ساتھ گھومنے والا شفاخانہ | آجکل مغرب میں آفتاب کی شعاعوں سے علاج کرنے کا دستور اسقدر عام ہوگیا ہے کہ ہر جگہ اس کے شفاخانے قائم ہو رہے ہیں اور مدارس وغیرہ میں بھی نہ صرف ریاضت جسمانی بلکہ تعلیم ذہنی بھی کھلی ہوئی ہوا اور دھوپ میں ہوتی ہے۔

اسپتالوں میں بعض مریض ایسے ہوتے ہیں جو نقل وحرکت نہیں کر سکتے، ان کے لئے ایسے پلنگوں کا انتظام ہے۔ جو حسب ضرورت سایہ سے دھوپ میں منتقل کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن فرانس میں ایک اسپتال ابھی ایسا طیار ہوا ہے۔ جس میں مریضوں کے منتقل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ ایک بہت بلند پہاڑ کی چوٹی پر بنایا گیا ہے۔ اور ہوا اور دھوپ کے لئے کثرت سے اس میں دروازے اور کھڑکیاں بنائی گئی ہیں۔ یہ اسپتال آفتاب کے ساتھ ساتھ گردش کرتا رہتا ہے تاکہ ہر وقت کھڑکیوں سے دھوپ اندر آتی رہے۔ یہ ایک بڑے پہیے پر بنایا گیا ہے جسے ایک مشین آہستہ آہستہ گھماتی رہتی ہے

کچھوؤں کی دوڑ | گھوڑوں کی دوڑ، کتوں اور کبوتروں کی دوڑ تو آپ نے سنی ہوگی، لیکن اب امریکہ نے ایسے جانوروں کی دوڑ بھی شروع کی ہے جو اپنی سست رفتاری کے لئے مشہور ہیں۔

پھر چونکہ سست رفتار جانوروں میں کچھوا خاص شہرت رکھتا ہے اس لئے سب سے پہلے بمقام بونکا سیتی (امریکہ) اس کی دوڑ کا انتظام کیا گیا۔ جس میں تقریباً دس ہزار تماشائی جمع ہوئے تھے۔ اور جیتنے والے کچھوے کے مالک نے علاوہ بازی کی جیت کے چار ہزار ڈالر بطور انعام حاصل کیا۔ اس کے بعد سے امریکہ میں کچھوے کی دوڑ کی تقریباً وہی کثرت ہوگئی ہے جو انگلستان میں گھوڑ دوڑ کی ہے۔

گلیم عمر وعیار | فری یزن کے قصہ میں درج ہے کہ کسی حکیم نے اس کے لئے ایک معدنی گھوڑا ایسا طیار کیا تھا۔ جو اس کو لے کر اڑ جاتا تھا۔ سلیمانؑ کے متعلق بھی یہی مشہور ہے کہ آپ کے پاس ایک قالین ایسا تھا جو فضا میں بلند ہو کر اڑتا تھا۔ اور

عمرو عیار کی گلیم کا حال تو معلوم ہی ہے کہ جس وقت وہ سر پر ڈال لی جاتی تھی تو آدمی لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو جاتا تھا۔ بہرحال یہ تمام باتیں سنتے تھے مگر اعتبار نہ آتا تھا کہ ایسا ہو تا کیوں کر ممکن ہے۔ لیکن غباروں اور ہوائی جہازوں نے اوّل الذکر دو چیزوں کا یقین دلایا تھا، گلیم عمرو عیار البتہ ابھی تک طیار نہ ہوئی تھی۔ مگر اسپین کے ایک مہندس نے آخرکار اسے بھی پیش کر ہی دیا، یعنی اس نے ایک خاص قسم کا کپڑا ایسا طیار کیا ہے کہ اس کے پہننے کے بعد انسان نگاہوں سے پوشیدہ ہو جاتا ہے۔

طاؤسوں کی حکومت | کالیفورنیا کے جنوب میں ایک شہر ہے جس کا نام ارکاڈیا ہے، یہاں طاؤسوں کی اسقدر رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ شکار کرنا تو کجا، ان کو کوئی چھو بھی نہیں سکتا، لوگ بھی نہیں سکتا۔ وہ ہر جگہ باغوں میں، جنگلوں میں، سڑکوں پر آزادی سے رقص کرتے پھرتے ہیں۔ اور مطمئن ہیں کہ ان کے حسن و جمال کی ہیبت کسی کو آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔

حکومت بلدیہ نے ان کے فراغ و اطمینان کا اس حد تک انتظام کر دیا ہے کہ جس طرح سڑکوں پر راہگیروں اور موٹر چلانے والوں کے لئے جابجا تختیاں تنبیہ وخطرہ کی نصب کر دی جاتی ہیں، اسی طرح ان مقامات اور راہوں پر جہاں طاؤسوں کی کثرت ہے۔ جابجا یہ تختیاں نصب کر دی گئی ہیں کہ۔ "خبردار، طاؤس اس راہ سے گزرتے ہیں"

آدمِ ثانی | کمبرلینڈ (امریکہ) میں ایک خاندان ہے جس کا نام وِب ہے۔ اس کی کثرت اولاد کا یہ عالم ہے کہ اگر اس کے مورث اعلےٰ کو آدم ثانی کہا جائے تو ناموزوں نہ ہوگا۔ اس خاندان کا سردار اس وقت جوسولم وب ہے۔ جس کی عمر ۸۴ سال کی ہے۔ اس کے ۱۹ لڑکے پیدا ہوئے۔ اور ۱۷۵ پوتے، ان پوتوں کی اولاد ۱۵۰ ہوئی۔ اور ان کی ۱۰۰۔ گویا ایک آدمی کی نسل سے ۴۴۴ آدمی وجود میں آئے،

اس کا ایک بھائی ہے جس کا نام ملزوب ہے جس کی عمر ۸۰ سال کی ہے اور اس کے ذریات کی تعداد ۴۰۰ نفوس تک پہونچتی ہے، ان کی ایک بہن (بولی وب) کا خاندان ۲۳۰ نفوس پر مشتمل ہے۔ اور دوسری بہن (سالی وب) سے جس کی عمر ۹۰ سال کی ہے ۱۳ بیٹے، ۸۰ پوتے، ۶۵ پڑپوتے۔ اور ۵۰ سگڑ پوتے پیدا ہوئے۔ تیسری بہن (لیسی وب) کے ذریات ۲۱۱ ہیں۔ اس طرح گویا صرف دو بھائی اور تین بہنوں سے ایک ہزار چار سو ترانوے (۱۴۹۳) بیٹے پوتے وغیرہ اس وقت تک پیدا ہو چکے ہیں، اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان بچہ پیدا کرنے والی مشینوں سے آیندہ مردم شماری تک ایک پورا نیویارک نہ طیار ہو جائے گا۔

کتے کی روح | مغرب میں عموماً اور امریکہ میں خصوصاً روحوں کے بلانے کے لئے حاضرات کا عمل کرنا بہت کثرت سے رائج ہے۔ یہاں تک کہ کینن ڈائل اور آلیور لاج ایسے انسان بھی اس عمل کی صحت کے قائل تھے اور ان کو یقین تھا

کہ جو روحیں معمول یا وسیط کے ذریعہ سے آتی ہیں۔ وہ واقعی متوفی کی ارواح ہوتی ہیں۔ اور اپنے پیغامات اہل دنیا تک پہونچاتی ہیں ـــــ لیکن ناظرین نگار غالباً یہ سن کر متحیر ہوں گے کہ حاضرات کا عمل صرف انسانوں ہی کی ارواح تک محدود نہیں رہا بلکہ اب جانوروں کی روحوں کو بھی طلب کرکے ان سے شرف کلام حاصل کیا جاتا ہے۔

انگلستان میں ایک صاحب پروفیسر لٹل جون ہیں جو عمل حاضرات کے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے حال ہی میں رن ٹن ٹن کتے کی روح کو بلانا چاہا۔ واضح ہو کہ رن ٹن ٹن کتا دنیائے سینما کا نہایت مشہور کتا تھا جو حال ہی میں مرا ہے ـــــ اس خبر کے سنتے ہی اخباروں کے نمایندے پہونچ گئے۔ تاکہ کتے کے پیغامات جو عالم ارواح سے بھیجنے والا ہے معلوم کریں۔

پروفیسر موصوف نے سب سے پہلے یہ سوال کیا کہ ـــ "کیا مرنے کے بعد کتوں کو کافی ہڈیاں ملتی ہیں"

جواب ملا کہ ـ "میں اب ایک اور کتے کی صورت میں آگیا ہوں۔ اور غذا بہت کافی ملتی ہے۔"

پھر سوال کیا گیا کہ ـ "کیا اس نئی دنیا میں تم خوش ہو"

جواب ملا ـــ "کہ ان تمام لوگوں سے جو مجھ سے محبت کرتے ہوں کہدو کہ میری جگہ اب دوسرا کتا پیدا ہو گیا ہے اور میں اب ایسی جگہ رہتا ہوں جہاں سایہ دار درخت ہیں۔ اور غذا بہت وافر ہے"

اس کے بعد سوال کیا گیا کہ "تمھاری جگہ کس کتے نے لی ہے" جواب ملا کہ "جہاں میں مرا تھا وہیں قریب ہی وہ کتا رہتا ہے"

اس خبر کے سننے کے بعد کون ہے جو عالم ارواح و یوم آخرت پر ایمان نہ لائے گا۔ اور وہ خدا جو ایک کتے کی روح کو بھی فنا نہیں ہونے دیتا۔ وہ انسان ایسے مہتم بالشان حیوان کی روح کو کیوں فنا کرنے لگا۔

؎ اے رگِ جاں بہار ایں ہمہ بیرحمی چیست　　خاک از مقدم تو خوں خوردن عادت دارد

عاقل نے ایک جگہ اور عین کو گرا کر چشمۂ مذاق کو مکدر کیا ہے ؎

ای بہ نقاب عارضت شعلۂ بال نگاہ　　عکس تو در آئینہ یوسف مصری بہ چاہ

اہل ایران میں بھی بعض ہستیاں ایسی ہیں جنھوں نے عین کو گرا دیا ہے۔ خواجہ باقر عشرت[1] شیرازی کا شعر ہے۔ ؎

مرا پند خرد مندان بحال خود نمی آرد　　بایں افسانہا مجنون عشق عاقل نمی گردد

(مولف) مولانا آزاد بلگرامی نے عین کے گر جانے کی یہ وجہ بتائی ہے کہ ہندوستانیوں کے لہجہ میں عین داخل نہیں ہے۔ مگر مولانا کے اس قول کو فارسی والوں پر کیونکر صادق کیا جائے۔ اور اگر یہ بھی مان لیا جائے تو اُن حضرات کو کیا کہا جائے۔ جو بے تکلف عین ہی کی طرح دوسرے حروف کو بھی گراتے چلے جاتے ہیں جیسا کہ ذیل میں مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

سقوط عین قاآنی ؎

شہزادۂ اعظم حسین آں اصفہاں را نورِ عین
اعدا از و در شور و شین احباب از و با قدر و شاں

ظہوری ؎ بدہ ساقی آں رشک یاقوت را　　کہ سازم علاج عقل فرتوت را

نعیم ؎ مجنوں کی کیا سند ہے عشق عاشقوں کے آگے　　دیوانے کو ہم ایسے مجذوب جانتے ہیں

ظفر ؎ ظفر خار کیوں گل کے پہلو میں ہوتے　　جو اچھے نصیب عندلیبوں کے ہوتے

سقوط ہائے ہوز ظفر ؎

کہا غیر کو نہ بلائیو کہا شوق سے میں بلاؤنگا　　تمھیں رشک ہو تو نہ آئیو یہ کہا اور ہمکو اٹھا دیا

سقوط حائے حطی فصیح ؎

ای فصیح یہ گھر بغیر از یار کے زندان ہے　　ہر در و دیوار پر لکھ دیجئے اس بات کو

ایضاً قلندر ؎ گدا ہوں اس کے کوچے کا قلندر　　صحیح ہے گر کہوں میں بادشاہ ہوں

پہلے اس طرح حروف کے گرانے کو عیب نہ سمجھتے تھے۔ مگر اب لوگ اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اور ہونا بھی چاہیے

عشرت شیرازی و مرزا فاخر مکین

عشرت ؎ بر سبکروحی اکس نتواند در بست　　چوں ہوا در ہمہ آفاق بود خانۂ ما

---

[1] عشرت کا نام خواجہ باقر تھا۔ شیراز کے رہنے والے تھے۔ تجارت کرتے تھے اور اسی تجارت کے ذریعہ سے ایران سے ہندوستان آئے نہایت عمدہ

اصلاح فاخر مکین ؎ بسبکروحی ما کس نتواند در بست ہمچو بو در ہمہ آفاق بود خانۂ ما

جواب سودا۔ اگرچہ بو بھی سبکروح ہے۔ مگر بُو کا تمام عالم میں ہونا ضروری نہیں کیونکہ حکمار نے خلار کو بوجہ امتلائے ہوا کے محال قرار دیا ہے نہ کہ بسبب بو کے۔ اسی وجہ سے عزت کا شعر درست ہو اور مرزا فاخر مکین کی اصلاح درست نہیں ہے اگر اصلاح دینا منظور تھی تو اس مصرع کو یوں بنانا چاہیئے تھا۔ ع

ہمچو بُو در ہمہ گلزار بود خانۂ ما

(مؤلف) سودا نے جواب میں جو استدلال کیا ہے کہ خلاء عالم بوجہ ہوا کے ممنوع اور ناجائز ہے یہ ایک حد تک درست ہے۔ مگر بُو کیا چیز ہے وہی ہوا ہے۔ بعض حکمار کا یہ بھی مقولہ ہے کہ ہر ہوا میں کوئی نہ کوئی بو شامل ہے اور بغیر بو کے دنیا میں کسی شے کا وجود نہیں ہے اس لحاظ سے مرزا فاخر مکین کی اصلاح بیجا نہیں ہے۔ اب رہی سودا کی اصلاح اوس میں قباحت یہ ہے کہ وہ سبکروحی کے اختیار اور اقتدار کو صرف گلزار تک محدود رکھتے ہیں۔ حالانکہ شاعر نے پہلے مصرع میں یہ کہا ہے کہ۔ (کس نتواند در بست) اور یہ عمومیت گلزار کی قید کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی۔

عرفی[1] و مولانا آزاد بلگرامی

عرفی ؎ پیش عرفی مرہ از دست عناں کیں اُستاد خویش را ابلہ نمود است پئے ابلہ نیست

آزاد۔ قاعدہ یہ ہے کہ کلمات فارسی میں اکثر ہائے مختفی فتح ماقبل کے اشعار کے واسطے زیادہ کی جاتی ہے۔ اور وہ خود تلفظ میں نہیں آتی۔ مگر کہیں کہیں ضرورت شعر سے مجبور ہو کر اوس کو ظاہر کرنا پڑتا ہے۔ جیسے کہ خامہ نامہ وغیرہ میں۔ اور تائے تانیث جو

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۴۷) شعر کہتے تھے۔ ایک دیوان ان سے یادگار ہے جس میں قریب پانچہزار اشعار کے موجود ہیں۔ رباعی قصیدہ مثنوی وغیرہ سب اصناف سخن اس میں موجود ہیں۔

[1] عرفی عہد اکبری کا مشہور و معروف شاعر تھا۔ سید محمد نام جمال الدین خطاب عرفی تخلص تھا۔ ملا عبد القادر بدایونی کا بیان ہے کہ ولایت سے فتحپور پہنچا۔ اور سب سے پہلے شیخ فیضی سے ملاقات ہوئی۔ شیخ نے نہایت تواضع و تکریم سے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مدتوں شیخ کے ساتھ رہا۔ مگر بعد کو کچھ رنجشیں پیدا ہو گئیں۔ آخر عرفی حکیم ابو الفتح سے ملا۔ اور انھیں کے توسل سے اس زمانہ کے مشہور سخی اور قدردان عبد الرحیم خانخاناں سے ملا۔ خانخاناں نے سوز برودرتبت افزائی بھی کی۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں۔ کہ اخلاص شاہجہاں آبادی نے لکھا ہے کہ خانخاناں نے ایکمرتبہ ستر ہزار روپیہ ایک قصیدہ کا صلہ عرفی کو دیا تھا۔ عرفی کی شعر و شاعری کے متعلق متاخرین اور متقدمین سب کی رائے اچھی ہے مگر قصیدہ گوئی میں اس کو یدطولیٰ حاصل تھا۔ مگر سچ یہ ہے کہ قصیدہ کی برابر غزل نہیں ہے۔ اور غزل کے برابر مثنوی نہیں بعض ایسے خوش عقیدہ ہیں جنکا یہ خیال ہے کہ عرفی کے یہاں جو کچھ ہے خوب ہے اور ہر صنف کلام ایک ہی درجہ پر ہے۔ بہرصورت عرفی اپنے دور کا مسلم الثبوت استاد تھا۔ اسنے چھتیس برس کی عمر پاکر ۹۹۹ھ میں لاہور میں انتقال کیا۔ یوں تو عرفی کے کلام میں ایرانیوں کے خیال کے موافق بہت سے اغلاط ہیں۔ مگر ہندیوں نے بھی اس پر اکثر اعتراضات کئے ہیں۔ چنانچہ ملا منیر لاہوری نے بھی بہت سے اعتراضات کئے اور مولانا آزاد بلگرامی نے بھی۔

عربی کلمات کے آخر میں آتی ہے۔ وہ حالت وقف میں (ہ) ہو جاتی ہے۔ اہل فارس کبھی اس کو (ت) پڑھتے۔ جیساکہ ظہوری ترشیزی اس شعر میں عاریت کی (ت) کو (ت) کہتا ہے ؎

چراغ عاریتی تیرگی زیادہ کند　　　بروشنائی شبہائے تار سوگند است

اور کبھی اوس کو (ہ) کہتے ہیں جیساکہ صائب کے اس شعر میں ؎

از رنگ و بوئے عاریہ دامن کشیدہ ایم　　　چوں عنبر است از نفس ما بہار ما

مگر۔ ہائے اصلی خواہ فارسی لفظ میں آئے۔ جیسے سہ۔ نگہ۔ وغیرہ میں خواہ عربی میں جیسے موجبہ اور مرفہ وغیرہ۔ اس کو کسی صورت میں ہائے مختفی کے ساتھ نہیں پڑھ سکتے۔ عرفی نے اپنے اس شعر میں ابلہ کی ہ (ہ) کو مختفی بنا دیا ہے یہ جائز نہیں
مگر بعض اساتذہ نے ہائے اصلی کو اعداد میں مختفی کر دیا ہے۔ جیساکہ ان اشعار میں

خاقانی ؎　　　چو ماہ سی شبہ ناچیز شد خیال غرور　　　چو روز پانزدہ ساعت کمال یافت ضیا

خواجو کرمانی ؎　　　آں ترک پریچہرہ گر لعبت چین است　　　یا ماہ شب چاردہ بر روئے زمین است

کاتبی نیشاپوری ؎　　　ہم طالع خوش داری و ہم طلعت روشن　　　چوں ماہ شب چاردہ ہیچت کمی نیست

حسن بیگ رفیع ؎　　　عکس رخسار تو چوں در مئے گلفام افتاد　　　شد گمانم کہ مہ چاردہ در جام افتاد

(مؤلف) آزاد مرحوم نے جو قاعدہ لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ جو مثالیں مستثنیات کی دی ہیں۔ وہ اعداد میں بطریق جواز سمجھنا چاہئیں ورنہ یہ ضروری نہیں ہے کہ اعداد میں (ہ) کو ہر جگہ گرا دیا جائے میں یہاں (ہ) کے متعلق بطریق فوائد چند قواعد لکھے دیتا ہوں۔ (ہ) کی دو قسمیں ہیں ایک ہائے ملفوظ۔ وہ وہ ہے جو تلفظ میں آتی ہے۔ یہ اول، درمیان، اور آخر کلمات میں آتی ہے۔ جیسے ہر چند ہمہ۔ مہر۔ چہر۔ گواہ وغیرہ میں۔ دوسری قسم، ہائے مختفی ہے۔ وہ آخر کلمات میں واقع ہوتی ہے۔ اور کبھی تلفظ میں نہیں آتی۔ اور صرف حرکت ماقبل اوس کے اظہار کے لئے کافی ہے۔ فارسی میں اس کی چند قسمیں ہیں۔ کبھی یہ فعل ماضی میں ملحق ہوتی ہے۔ انتہا اور اتمام حرکت کے لئے۔ اور اس قسم کی (ہ) ہمیشہ زاید مانی جاتی ہے۔ جیسے نشستہ۔ گفتہ۔ کردہ۔ اور اس قسم کی (ہ) کا تلفظ، مخل فصاحت ہوتا ہے، چنانچہ آشکارہ، خارہ وغیرہ کی (ہ)، جو الف سے مبدل ہو گئی ہے ایسی ہی ہے۔ دوسرے ہائے نسبت جیسے زمانہ یا درینہ، پشمینہ وغیرہ میں کہ یہ اگرچہ زاید ہے مگر پھر بھی نسبتی گنی جاتی ہے۔ اس کا اظہار بھی فصاحت کے منافی ہے دستہ وغیرہ میں ہائے نسبت ہو اس کا اظہار بھی فصحا کے نزدیک بہتر نہیں ہے۔ ہائے فاعلی جیسے ہرکارہ۔ ناکارہ۔ یا ہائے مفعول جیسے گذشتہ، شدہ وغیرہ میں۔ یا ہائے تسمیہ جیسے لالہ۔ سبزہ۔ زردہ۔ نیلہ۔ نشانہ۔ ریزہ۔ یا تعین مقدار کے لئے آتی ہے جیسے یکشنبہ۔ امروزہ۔ ہفتہ وغیرہ۔ یا ہائے وقف جو کلمات عربی کے آخر میں تائے قرشت کی جگہ آتی ہے یا تائے مصدری اور تائے تانیث کے بدل میں۔ جیسے رحمت سے رحمہ۔ دولت سے دولہ۔ حکمت سے حکمہ۔ یا عاقلہ۔ کاملہ۔ بالغہ۔ زاہدہ۔ جمیلہ یا ہائے تشبیہ جو آخر کلمات میں الف اور نون جمع کے بعد آتی ہے۔ جیسے حکیمانہ۔ دوستانہ۔ عاشقانہ۔

وغیرہ میں۔ یاحاے حالیہ۔ جیسے خفتہ۔ مردہ۔ رفتہ وغیرہ میں یا ہائے عاطفہ جیسے خوردہ رفت کشیدہ رفت وغیرہ میں۔ یاجو وسط کلمات میں زاید آتی ہے جیسے رستہم گستہم۔ زردہشت وغیرہ میں یا ہائے اسمیہ جو آخر اسمار میں آتی ہے جیسے جامہ۔ خامہ۔ غلہ۔ گلہ۔ یا ہائے مصدری جیسے زآنہ بمعنی نزآری وغیرہ ان جگہوں میں ہائے مختفی کو ظاہر کرنا فصحا کے نزدیک خلاف فصاحت ہے۔

عزیزؔ[۱] و مرزا یاسؔ

عزیزؔ بادصرصر ہے نہ اس اقلیم میں بادنسیم ہاں مگر جھونکے فنا کے آرہے ہیں بےحساب

اعتراض – اقلیم عدم میں فنا کے جھونکے آرہے ہیں۔ تو کہاں سے آرہے ہیں۔ اور اقلیم عدم پر فنا کے جھونکے کیا اثر ڈال سکتے ہیں۔ الخ

جواب جناب اشہر جناب یاس اس شعر کے معنی الٹے سمجھے غور کیجئے کیسا لطیف مطلب ہے شاعر کہتا ہے کہ میں نسیم و صرصر صبا کا وجود نہیں۔ مگر فنا کے جھونکے آئے جاتے ہیں جو عالم وجود سے ہستیوں کو عالم عدم میں پہونچاتے ہیں۔ شعر ہرگز یہ معنی نہیں دیتا کہ بادصبا کے جھونکے ملک عدم پر کوئی اثر ڈالتے ہیں۔ نے وقوف سے نے وقوف

---

[۱] جناب عزیزؔ کا نام نامی مرزا محمد ہادی ہے آپ کے والد بزرگوار مرزا محمد علی نجوم السمار نہایت زبردست فاضل تھے۔ آپ کے بھائی حکیم مولوی مرزا محمد مہدی صاحب مرحوم نہایت زبردست طبیب تھے۔ جناب عزیزؔ کی ولادت ۵ ربیع الآخر ۱۳۰۱ھ میں ہوئی۔ اگرچہ بچپن ہی میں آپ کو داغ یتیمی برداشت کرنا پڑا۔ مگر اس حالت میں بھی آپ نے لکھنؤ کے مختلف اساتذۂ فن سے علم عربی و فارسی کی تکمیل کی فن شاعری سے آپ کو خلقتاً لگاؤ تھا۔ اس میں بھی آپ نے مختلف اساتذہ سے اصلاح لے کر وہ درجہ حاصل کیا کہ آج لکھنؤ میں خصوصاً اور ہندوستان میں عموماً لوگ آپ کو استاد جانتے ہیں۔ قصیدہ گوئی میں آپ کو ید طولےٰ حاصل ہے۔ غزلیات میں میر و غالب کے رنگ کو بہت زیادہ پسند فرماتے ہیں۔ نظمیں اور رباعیات بھی آپ کی تصانیف سے بہت کافی ہیں۔ محلہ اشرف آباد لکھنؤ میں تشریف فرما ہیں۔ پہلے گورنمنٹ ہائی اسکول امین آباد لکھنؤ میں اُردو کی تعلیم دیتے تھے۔ اب ڈیڑھ دو برس سے ریاست محمود آباد میں ملازم ہیں۔

جناب مرزا واجد حسین صاحب یاس کا مولد و منشا عظیم آباد ہے۔ جہاں آپ کے اسلاف ایران سے آکر آباد ہوئے تھے۔ آپ کے والد کا نام پیارے مرزا تھا جنکے اکلوتے فرزند دلبند اور تنہا یادگار آپ ہیں۔ آپ کا تاریخی نام مرزا افضل علی بیگ اور یاس کا نام مرزا واجد حسین ہے۔ ۱۹۰۵ء میں مرزا صاحب اپنا وطن چھوڑکر لکھنؤ تشریف لائے۔ اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اور یہیں شادی کی۔

آپ کی تعلیم و تربیت عظیم آباد میں ہوئی پہلے کچھ فارسی پڑھی اوس کے بعد زمانے کے رسم و رواج اور ضرورت کے لحاظ سے انگریزی شروع کی۔ اور ضرورت کے موافق شاید انٹرینس تک انگریزی بھی پڑہی۔ شاعری کا شوق بھی یہیں پیدا ہوا۔ اوّل اوّل جناب بیتاب عظیم آبادی سے اصلاح لی اور پھر خان بہادر شادؔ عظیم آبادی کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ لکھنؤ میں تشریف لائے۔ تو کچھ کلام پیارے صاحب رشید مرحوم کو بھی دکھایا۔ اور چند ہی روز میں اس سے بھی بے نیاز ہوگئے۔

یاس صاحب جس زمانے میں لکھنؤ میں آئے اس وقت لکھنؤ میں گھر گھر آئے دن مشاعرہ ہوا کرتے تھے۔ اور غالباً اوسی زمانہ میں

کہدے گا کہ وہ عالم تو خود غرق فنا ہے۔ وہاں بادِ فنا کا کیا اثر۔ جیسا کہ جناب یاس نے فرمایا۔ مگر وہ مطلب غلط سمجھے۔

(مولف) جناب اشہر نے جو معنی بیان کئے ہیں غالباً یہی مفہوم شاعر کا ہے۔ اور یہ خیال بھی صحیح ہے کہ مرزا یاس غلط سمجھے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو کچھ مرزا یاس نے معنی سمجھے ہیں وہ معنی بھی جناب عزیز کے شعر سے پیدا ہوتے ہیں یا مرزا یاس کی زبردستی ہے۔ میرے خیال میں جو معنے مرزا یاس نے بیان کئے ہیں شعر سے وہی پیدا ہوتے ہیں۔ مولانا اشہر نے آرہے ہیں کے معنی میں جو تاویل فرمائی ہے کہ " وہ جھونکے آئے جاتے ہیں جو عالم وجود سے ہستیوں کو عالم عدم میں پہونچاتے ہیں۔ نہایت بارد ہے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جناب یاس نے جو معنی بیان کئے ہیں اوس صورت میں بھی اُس شعر پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے۔ میرے نزدیک کوئی اعتراض نہیں پیدا ہوتا۔ شاعر کہتا ہے کہ اقلیم عدم میں نہ بادِ صرصر کا وجود ہے نہ بادِ نسیم کا۔ بلکہ صرف فنا کے جھونکے آتے رہتے ہیں مطلب یہ کہ یہاں سراسر طاری فنا ہے۔ یہ کہنا کہ فنا کے جھونکوں کا اہل فنا پر کیا اثر پڑتا ہے بالکل عبث ہے کیونکہ شاعر کا مقصد ہی یہ نہیں ہے کہ وہ اُن جھونکوں کا کوئی اثر بیان کرے۔ بلکہ اوس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ یہاں جو چیز ہے وہ فنا ہی کے اثر سے لبریز ہے۔ اگر مرزا یاس شعر میں یہ بات پاتے کہ فنا کے جھونکے اہل فنا کی طرف فنا کرنے کی غرض سے آرہے ہیں تو بیشک اعتراض درست تھا اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ سرد ملکوں کے رہنے والوں کی طرف ہمیشہ سرد ہوا کے جھونکے آتے رہتے ہیں تو کیا اس کے معنی یہ ہوں گے یا اس پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب وہ سرد ملک کے رہنے والے ہیں تو پھر ان پر سردی کا کیا اثر نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہاں صرف سردی ہی کا دور دورہ ہے۔

عزیز ؎ لو توڑ کے کعبہ کی دیوار بہ آسانی ‏ ‏ نکلے ہے بہار اب کے سرگرم رجز خوانی

اعتراض ۔ " لو توڑ کے کعبہ کی " مفعول مفاعیلن۔ کعبہ کی توڑ کے !

جواب اشہر ۔ کور را ہمہ عالم کور ست نماید۔ اس قسم کے پہلوئے ذم سے میر مومن بلکہ خود فاضل نقاد یاس بھی نہ بچے۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۸۰) لکھنؤ کی مشہور انجمن معیار کا انعقاد ہوا تھا۔ جس کے سرگرم رکن جناب صفی۔ ثاقب۔ عزیز۔ محشر۔ بہار۔ ابر وغیرہ حضرات تھے۔ چونکہ لکھنؤ کی زمین قدرتاً ولولہ انگیز اور جذبات خیز ہے۔ اس لئے یہاں رہ کر مرزا صاحب کے ذوق سخن میں بھی تحریک پیدا ہوئی۔ مگر لوگ ان کے شعر سنتے تھے اور کافی داد نہ دیتے تھے۔ اسی وجہ سے مرزا صاحب کو ان لوگوں سے ایک قسم کی کد ہوگئی۔ اور مخالفت کے مضامین لکھنے شروع کئے۔

مرزا صاحب کے اعتراضات کا نشانہ جناب عزیز لکھنوی زیادہ رہے ہیں۔ مرزا صاحب اب بجائے یاس کے یگانہ تخلص فرماتے ہیں۔ اور اب ریاست حیدر آباد میں ملازم ہیں۔

میر ؎ سینہ کو کیا فضلِ الٰہی سے سبھی چاک — ہے وقت دعا میر کہ اب دلکو لگا ہوں
مومن ؎ ہاں جوشِ تپش چھیڑ چلی جائے کہ پر تو — جھڑ جائیں گے فرسودہ اگر دام نہ ہوگا
جناب یاس ؎ حیا کی باعث ہوا ابتک قفس میں زندہ ہوں — چمن میں جاؤں تو نرگس سے آنکھ چار نہ ہو
؎ مرنیکے بعد بھی مری پیٹھ لگی نہ قبر سے — کھائے ہو کیوں پچھاڑیں اب سجدے مزار دیکھکر

مرنے کے بعد بھی مری۔ مفتعلن مفاعلن۔

(مؤلف) افسوس ہے کہ جس طرح مرزا یاس نے آنکھیں بند کر کے اعتراض کیا اسی طرح مولانا اشہر نے بھی جواب دیا۔ مرزا یاس کا منشاء اعتراض وہ شعر ہے جو کسی شاعر نے کسی امیر کے دربار میں پڑھا تھا ؎ اے تاج دولت بر سرت - اور کسی حاسد نے یا خود بادشاہ نے کہا تھا کہ تقطیع کن۔ تقطیع۔ تقطیع کرنے میں لت بر سرت - بروزن مستفعلن آتا ہے - اور یہ خلاف تہذیب ہے۔ لہذا شاعر کو دربار سے بھاگ جانا پڑا۔ اعتراض یہ ہے کہ لو توڑ کے کعبہ کی - بروزن مفعول مفاعیلن آیا ہے۔ اور اس سے ذم پیدا ہوتا ہے۔ مولانا اشہر کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کے پہلوئے ذم سے میر و مومن اور یاس خود نہیں بچے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر اس ذم کا ایک ٹکڑا مان بھی لیا جائے۔ تب بھی یہاں کوئی اعتراض نہیں پڑتا۔ کیوں کہ اس قسم کا ذم عائد ہو سکتا ہے کسی انسان کی طرف - یا زیادہ سے زیادہ کسی ذی روح کی طرف۔ کعبہ کوئی ذی روح نہیں (کہ لو توڑ کے کعبہ کی) سنکر ذرا خیال ادس طرف منتقل ہو۔ جدھر معترض و مجیب کا خیال منتقل ہوا ہے۔ تعجب ہے کہ اشہر صاحب نے بھی اسے ذم تسلیم کر لیا اور پھر نظیر میں میر صاحب کا جو شعر پیش کیا ہے وہ قطعاً خلاف محل ؎

سینہ کو کیا فضل الٰہی سے سبھی چاک — ہے وقت دعا میر کہ اب دلکو لگا ہوں

سینہ کو کیا۔ اور دل کو لگا ہوں۔ یہ دو ٹکڑے ہیں۔ ان میں کونسی ذم کی صورت ہے۔ اگر محض لگنا اور کرنا دوسرے الفاظ کے ساتھ ذم مانے جائیں تو پھر اردو میں شعر کہنے والوں کا کہیں ٹھکانا نہیں عیاذاً باللہ۔ ہاں مومن کے یہاں - جھڑ جائیں گے فرسودہ اگر دام نہ ہوگا - میں ایک ذم کی صورت اس وجہ سے پیدا ہو گئی ہے۔ کہ وہ (لفظ ماقبل) سے علیحدہ آپڑا ہے۔ مرزا یاس کے شعر میں کوئی ذم نہیں۔ مولانا اشہر نے جواب کے جوش میں اس میں ذم قرار دے لیا ہے۔ مرنے کے بعد بھی مری - اس میں ذم کیا ہے پیٹھ نہ قبر سے لگی میں کیا ذم ہے۔ اور اگر ذم اسی کا نام ہے تو مرزا غالب کے اس شعر کو کوئی کیا کہے گا۔

قید میں یعقوب نے گو لی نہ یوسف کی خبر — لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

عزیز ؎ اے میکدۂ عشرت منہ تجھ سے نہ موڑوں گا — ہے یہ مئے عرفانی قطرہ بھی نہ چھوڑوں گا
مینائے فلک تیری اس مہر کو توڑوں گا — اس قرصِ طلائی کو ساغر میں نچوڑوں گا
اور چھلک کے پیوں گا یہ افشردۂ نورانی

اعتراض ؎ کسی اُستاد کا مصرع ہے ع گوئی کہ آفتاب بجام فشردہ اند۔ عزیز نے اس پر تصرّف کیا۔ آفتاب کو قرص طلائی بنالیا۔ قرص طلائی کو اگر پگھلا کر نچوڑیئے تو نچڑ سکتی ہے اور افشردہ بن سکتا ہے۔ ورنہ قرص طلائی نچڑ نہیں سکتی۔
اشہر۔ پگھلانے کی بھی ایک کہی۔ کیوں صاحب آفتاب فشردن کیونکر ٹھیک ہوگیا۔ پہلے آفتاب کو کسی طرح پگھلایا جاتا۔ یا نرم کیا جاتا۔ تب بجام فشردن صحیح ہوسکتا تھا۔ آفتاب فشردن اور قرص آفتاب افشردن ایک ہی چیز ہے۔ قرص آفتاب بوجہ ترکیب اضافی آفتاب ہونے کی حد سے جدا نہیں ہے۔ خاقانی ؎

رستی خورم بخوانچۂ زرین آسماں آوازۂ صلا بہ مسیحا برآورم

دیکھئے آفتاب کو یہاں گردۂ نان کہا ہے۔ بغیر پہلے سے اُسے پکائے ہوئے آخر پھکنی چولھا۔ دست پناہ کیا کام آئیں گے۔ مزہ یہ ہے کہ شاعر خود بھی کھا رہا ہے۔ اور دوسروں کو بھی بغیر وجہ کھانے کے صلا دے رہا ہے۔ اس شعر کا مطلب لکھنے میں بہت طوالت ہوگی اس لئے چھوڑ دیا گیا۔ اصل مطلب کی توضیح کردی گئی۔

خاقانی ؎ قرصۂ شمس بود قرصۂ ریوند ز لطف بہر تفتہ جگراں کافت گرما بینند

یہاں پر بھی خاقانی نے آفتاب کو قرصۂ ریوند کہا ہے۔ اور تفتہ جگراں کہہ کے خوردن کے مضمون کو درست کیا ہے۔ مگر شعر اوّل میں کوئی وجہ نہیں بیان کی۔ عاشق تفسیدہ جگر ہوتے ہی ہیں۔ پھر ان کے لئے قرص آفتاب کا ساغر میں نچوڑ لینا کیوں جائز نہیں۔ سبب موجود ہے۔ نقاد کے لئے علم و بیان پر حاوی ہونا پہلا فرض ہے۔

(مؤلف) نہ معلوم مولانا اشہر نے اصل اعتراضات سے دانستہ چشم پوشی کی ہے۔ یا کیا۔ یاس صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ عزیز صاحب نے اس مصرع پر تصرف کیا ہے ؎ گوئی کہ آفتاب بجام فشردہ اند۔ اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ حالانکہ مرزا یاس کا یہ اعتراض نہیں ہے۔ اس قسم کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں یہ سرقہ کے ذیل میں نہیں آتی۔ اشہر صاحب مرزا صاحب کے اس اعتراض کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قرص طلائی نچڑ سکتا ہے یا نہیں۔ پگھلا کر یا بغیر پگھلائے میرے خیال میں معترض اور مجیب دونوں نے قرص طلائی کے معنے یہ سمجھے ہیں کہ وہ قرص جو طلا سے بنایا گیا ہو۔ کیا طلائی سے یہ معنی نہیں پیدا ہوسکتے کہ وہ قرص جو شکل طلا کے معلوم ہوتا ہو۔ پھر جب یہ طے ہوگیا تو اعتراض اٹھ گیا۔ ہر قرص طلائی اگر قابل نچوڑنے کے ہے تو نچوڑا جاسکتا ہے۔ البتہ قرص کے معنی میں اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ آیا قرص کا نچوڑنا معمول ہے یا نہیں۔ یہ میرے نزدیک صحیح نہیں ہے قرص بغرض نچوڑنے کے کبھی نہیں بنایا جاتا۔

مرزا یاس نے یہ بھی ایک عجیب و غریب منطق پیش کی ہے کہ طلا کو اگر پگھلا کر نچوڑیں تو نچڑ سکتا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ نچوڑنے کے معنے یہ ہیں کہ کسی شے سے اوس کی مائیت علیحدہ کرلیں سونے کو اگر پگھلا لیا جائے تب بھی نچوڑنے کی صورت ممکن نہیں ہے۔ اوس کو زیادہ سے زیادہ صاف کرنا کہہ سکتے ہیں نچوڑنا نہیں کہہ سکتے۔ آفتاب کا فشردہ نور ہوگا۔ جیسا کہ عزیز نے کہا ہے (افشردۂ نورانی) اسی طرح مصرع "گوئی کہ آفتاب بجام فشردہ اند" کو لیجئے تو اسمیں

۶

بھی سیّال شے اور مائیت ہی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

اگرچہ یہاں یہ کہنا بے ضرورت ہے کہ طلائے دشت افشار بھی ایک قسم کا سونا ہوتا ہے۔ جو بے انتہا نرم ہوتا ہے۔ خسرو پرویز نے اسی سونے کا ایک ترنج بنایا تھا۔ جس کو وہ بیشتر ہاتھ میں رکھتا تھا۔

فاضل مجیب نے بڑی دور دور سے قرص آفتاب کے ثبوت پیش کئے ہیں مگر افسوس کہ انہوں نے سعدی کے اس مشہور مصرع کو نظر انداز کر دیا۔ ع "قرص خورشید در سیاہی شد۔" اس کے علاوہ لغات میں دیکھئے تو قرص زر مغربی قرص زر۔ قرص سیمیں۔ قرص گرم و سرد۔ قرص ماہ و قرص خورشید۔ قرص روئیں۔ قرصۂ زر۔ قرص ہفت درہ۔ سب کی سب کنایۃً آفتاب و ماہتاب کے معنے میں مل جاتے۔ بہر حال یہ ایک شاعرانہ تخیل ہے اور یاسؔ صاحب کو اس اعتراض سے بچنا چاہئے تھا۔

عزیز ؎

خم خانۂ کعبہ میں ہو محفل نورانی اُترا ہے محمدؐ پر اک مصحف ربّانی
نکلا ہو کوئی لے کر اک تحفۂ یزدانی اب چلّے کو کھولیں گے مستِ عرفانی
آئی ہے مراد انکی کعبے میں جو من مانی

اعتراض۔ لفظ تو حشو محض ہے۔ مُنہ مانگی مراد کی جگہ من مانی مراد جناب عزیز کا تصرف ہے۔

جواب الشہر۔ جناب یاس قائل ہیں کہ اساتذہ کے یہاں اس قسم کے حشو پائے جاتے ہیں تو اعتراض بیکار تھا۔ خود یاسؔ کا ایک مصرعہ ہے ؎ "کیئے کعبے کو سدھارے کہ صنم خانے کو" اگر جناب عزیز (منہ مانگی) مراد نظم کرتے تو محاورہ تھا۔ من مانی مُراد محاورہ نہ ہونے کی حیثیت سے نظم نہیں کیا۔ بلکہ ان دو لفظوں سے مطلب ادا کیا ہے۔ مَن اپنی جگہ معنی دے رہا ہے۔ اور مانی اپنی جگہ۔ یہ کون کہتا ہے کہ اسے محاورہ کہئے۔ ہاں یاسؔ صاحب کو تو ضرور ماننا پڑے گا۔ کیونکہ وہ تو عظیم آبادی ہیں۔ اور لکھنؤ کی زبان کی تقلید کرتے ہیں۔ ایک مشہور دعا کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎

ہے جو بانی عزا کی محفل کا اوس کا بر آئے مدّعا دل کا

کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ منہ مانگی مُراد کی جگہ مدعائے دل کیوں نظم کیا۔ منہ مانگی مراد اور چیز ہے۔ اور من مانی مراد اور شئے۔ کیا تک ملایا ہے۔ سبحان اللہ۔

(مؤلف) اب چلّے کو کھولیں گے۔ میں مرزا یاس نے جو اعتراض کیا ہے۔ وہ اس لئے قابل وقعت نہیں ہے کہ روزمرہ پہلے بھی دونوں طرح تھا۔ اور اب بھی دونوں طرح ہے۔ خواہ یہ کہا جائے کہ اب چلّے کھولیں گے۔ اور خواہ یہ کہا جائے۔ کہ اب چلّے کو کھولیں گے۔ ذیل میں دو ایک مثالیں درج کی جاتی ہیں۔ مرزا غالبؔ کہتے ہیں ؎

غالبؔ کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

مطلب صرف اتنا ہے۔ اور کہنا یوں چاہیئے تھا۔ کہ اگر بخ کشت نہ کھائے تو خرمن جلے۔

غالب ؎ شہادت تھی مری قسمت میں تو دی تھی یہ خو مجھکو جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

اس میں دو دو جگہ کو زاید یا حشو موجود ہے۔ کہنا یہ چاہیئے تھا کہ جہاں تلوار دیکھی۔ گردن جھکا دیتا تھا مگر دونوں جگہ کو لایا گیا ہے اور لیجئے۔

غالب ؎ سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے جگر کیا ہم نہیں رکھتے جو کھودیں جا کے معدن کو

اس میں بھی کو زاید ہے۔

عزیز ؎
دیوار نے کعبہ کی اسوقت دہن پایا اور ابن لسان اللہ اک لمعۂ نور آیا
قدرت نے تجلی کی جب دور کیا سایا آپ اپنے کو پوشیدہ اس پردے میں کہلایا
بے پردہ نکلنے میں اک راز تھا پنہانی

اعتراض ۔ شاعر نے الٹی بات کہی۔ یعنی در پردہ کی جگہ بے پردہ کردیا۔ وہ بے پردہ نکل آیا تو پھر راز کہاں۔

جواب اشمر۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ ذات علی بمنزلہ حجاب حقیقت ہے۔ اگر اس حجاب حقیقت کو اٹھا دیا جائے تو ذات علی اور ذات باری میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ذات علی عین ذات الٰہی ہو جاتی ہے۔ بے پردہ کے لفظ سے شاعر نے کسقدر نازک مسئلہ حل کیا ہے۔ مگر یاس صاحب اس کی فہم سے عاجز ہیں۔

بے پردہ کے معنی یاس صاحب نے ظاہر ہونے کے لئے۔ حالانکہ اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ بغیر ذات کو پردہ کئے نکلنے میں ایک راز تھا۔ اور وہ یہ راز تھا کہ علی عین خدا ہوئے جاتے تھے۔ علی کو مظہر نور احدیت کہا جاتا ہے نہ کہ عین ذات۔ اور یہی عقیدۂ اثنا عشری ہے۔

(مؤلف) میرے نزدیک معترض کا اعتراض صحیح ہے۔ بے پردہ ہرگز در پردہ کے معنی نہیں دے سکتا۔ اور یہاں مصنف کی غرض یہی ہے کہ در پردہ کا مفہوم ادا کیا جائے۔ مگر در پردہ کہنے میں ایک خامی رہتی ہے۔ اسی لئے بے پردہ کہا گیا ہے۔

عزیز ؎
غنچے کی طرح جسکی دیوار حرم دیکھو اک نو گل وحدت کے آئے ہیں قدم دیکھو
ہیں سجدۂ طاعت میں کعبہ کے صنم دیکھو محراب کو کیوں دیکھو ابرو ہی کا خم دیکھو
کرتی ہے جدہر سجدہ خود قدرت ربانی

اعتراض۔ بتوں کا سجدہ میں گرنا مسلّم۔ مگر ایسے سجدہ کو سجدۂ طاعت کہنا غلط ہے۔ سجدۂ طاعت وہ ہے جو اپنی خوشی سے ہو۔ بتوں کا سجدہ کرنا نہ اپنی خوشی سے ممکن ہے نہ ارادے سے۔

جواب اشہر۔ سجدہ کرنا یعنی فروتنی یا عجز کرنا۔ یاس صاحب وہی سجدہ سمجھے جس میں سبحان ربی اعلیٰ وبحمدہ کہا جاتا ہے۔ علاوہ سجدۂ خالق کے اگر کوئی بندہ دوسرے بندے سے فروتنی کرے تو سجدہ کرنا کہہ سکتے ہیں۔ دیکھو انوری اپنے ممدوح کی سخاوت کی تعریف میں کہتا ہے۔

انوری ؎ بزرگوار خدایے کہ دست طبعش را ہمی نماز برو سجدہ آرد کان

یہاں یاس صاحب نماز کردن سے بھی وہی قیام و قعود سمجھ کر اعتراض کر دیں گے کہ دریا کے لئے نماز کردن اور کان کے لئے سجود کردن کوئی آدمی ہے جو سجدہ کرے۔ جناب عزیز نے اگر خدا کے گھر میں بتوں کے سجدے کو سجدۂ طاعت کہا تو کیا گناہ کیا۔

(مؤلف) مرزا یاس کا یہ اعتراض صحیح ہے کہ اس سجدہ کو سجدۂ طاعت نہیں کہتے بلکہ ایسے سجدے کو سجدۂ تحیت کہا جا سکتا ہے۔ مگر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ بت کسی طرح سجدہ نہیں کر سکتے۔ لامحالہ ان سے سجدہ کرانے والا کوئی اور ہوگا۔ پھر جب وہ حکماً سجدہ کر رہے ہیں تو وہی سجدۂ طاعت ہے۔ سجدۂ طاعت کے لئے یہ قید ضروری نہیں کہ اپنی خوشی سے کیا جائے بلکہ انقیاداً جو سجدہ کیا جائے وہ بھی سجدۂ طاعت ہے۔

عزیز ؎
پُرجوش شجاعت کا خون نس سے جھلکتا ہے اصنام کو تکتا ہو رہ رہ کے لپکتا ہے
انگڑائیاں لیتا ہے جب کوئی تھپکتا ہے خیبر کی صدا سنکر ہاتھوں کو جھٹکتا ہے
بے طرح ہمکتا ہے یہ ضیغم یزدانی

اعتراض۔ پُرجوش شجاعت کی ترکیب بھی انوکھی ہے۔ شجاعت میں جوش کا مفہوم داخل ہی ہے اس تخصیص کی کیا ضرورت ہے۔ لہٰذا لفظ جوش اس مقام پر حشو قبیح ہے۔ خیبر کی صدا سنکر۔ نہ معلوم خیبر کی صدا کیا چیز ہے۔ شاعر نے نام یا ذکر کی جگہ صدا کہہ دیا۔ ضیغم کے لئے ہمکنا بالکل غلط ہے۔ ہمکنا بچوں ہی کے لئے ہے۔ مگر جب بچہ کو ضیغم کہدیا تو پھر اس کے لئے مناسب لفظ لانا چاہئے تھا۔ اور اگر ہمکنا ہی لانا ضرور تھا تو ضیغم نہ کہتے۔

جواب اشہر۔ روز روشن۔ شب تاریک خورشید درخشاں کو پڑھ کر یاس صاحب کہیں گے کہ دن تو روشن ہوتا ہی ہے رات تو تاریک ہوتی ہے۔ خورشید درخشاں تو ہوتا ہی ہے۔ لہٰذا روشن۔ تاریک درخشاں حشو قبیح۔ پُرجوش شجاعت میں مضاف الیہ مقدم ہے۔ اور اس میں اضافت توضیحی ہے جیسے مذکورۂ بالا امثلہ میں۔ حشو قبیح جناب یاس نے آج تک دیکھا ہی نہیں ہے۔ دیکھئے حشو قبیح اس کو کہتے ہیں۔ انیس در ولادت علیؑ

؎ آخر ہوئی جب حمل کی مدت تہ افلاک فرمانے لگے بنت اسد سے شہ لولاک

تہ افلاک حشو قبیح بلکہ اقبح القبایح ہے (جواب ۲) جناب یاس خیبر کی صدا کو بھی نہ سمجھے۔ یعنی اگر کسی طرف سے لفظ خیبر

کی صدا کان میں آئی تو ہاتھ جھٹکنے لگا۔ کیسا نام اور کیسا ذکر جوشش (جواب ۳) اس سے زیادہ ہم اور کیا سمجھا سکتے ہیں کہ یہ بچہ بچۂ انسان اور بچۂ شیر نہیں بلکہ خود اسد اﷲ اسادتھا۔ یہ کیا مہملات ہے۔

(مؤلف) میرے نزدیک مرزا یاس کے تینوں اعتراض بالکل صحیح ہیں۔ یہ جوش شجاعت کو گو قاعدے سے صحیح بھی ٹھہرا دیا جائے۔ پھر بھی اس حشو کی قباحت طبع سلیم کو بے انتہا گراں معلوم ہوتی ہے۔ اگر جوش اور شجاعت کے فلسفہ پر غائر نگاہ ڈالی جائے تو شاید مفہوم ایک ہی نکلے گا۔ شب تاریک۔ اور روز روشن۔ خورشید درخشاں کی سند لانا بالکل بیکار ہے۔ وہ صفات مشہورہ ہیں اور شجاعت کی صفت جوش بالکل اجنبی اور غیر مانوس۔ دوسرا جواب یعنی خیبر کی صدا کی تاویل نام یا ذکر خیبر کرنا بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے فلاں کی صدا سنی۔ یعنی اُس کا ذکر سنا۔ صحیح ہے۔ اسی طرح تیسری تاویل بھی صحیح نہیں۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو ضیغم یزدانی بھی غلط ہے۔ اسد اللہ کو ضیغم یزدانی کہنا اگر محاورہ میں تصرف نہیں تو اور کیا ہے۔ اسی طرح بعض نے ید اللہ کو دست خدا کہا ہے وہ بھی غلط ہے۔ فصاحت و بلاغت اور زبان کے قواعد کو اگر ملحوظ نہ بھی رکھا جائے تب بھی یہ وہ الفاظ ہیں جو حدیث و قرآن میں آئے ہیں۔ اور الفاظ احادیث و قرآن کو بدل کر کہنا شرعاً اور عرفاً دونوں طرح سے ممنوع ہے

عزیز ؎

اسلام کے کاجل کو کعبے میں یہ پارے گا ان چھوٹے سے ہاتھوں سے زلف اسکی سنوارے گا

رگہائے شجاعت کو دم بھر میں ابھارے گا لو نام تو مرحب کا قلقاریاں مارے گا

اور ہوگی ابھی طاری کیفیت وجدانی

اعتراض۔ چھوٹے سے ہاتھوں سے کس کی زلف سنوارے گا۔

جواب اشہر۔ دوسرے مصرع میں ضمیر اس کی موجود ہے۔ اس کا مرجع اسلام ہے۔ این و آں فارسی میں بھی قریب و بعید کے لئے آتے ہیں۔ اسلام کے کاجل کی نسبت یہ کافی ہے کہ یہ مولود زینت اسلام کرے گا۔ یاس صاحب یہ نہیں جانتے کہ افعال معصومین فوق العادت تھے۔ ناظرین اس شعر میں پورے اعتراض کا جواب موجود ہے غور فرمائیے ؎

چوں دم مار سیہ میکندش گوشۂ چشم سرمہ چشم کہ در ہاں دہن میساید

(مؤلف) پہلے شعر کے پہلے مصرع میں دو مرجع موجود ہیں۔ اسلام اور کعبہ۔ پھر نہ معلوم کس وجہ سے اشہر صاحب نے صرف اسلام کو مرجع قرار دیا۔ یاس صاحب کا اعتراض اگر صحیح نہ ہو تو بھی شعر میں یہ سقم ضرور ہے۔

عزیز ؎

دروازۂ کعبہ پر جا کے صدا دوں گا تکبیر کے نعروں سے مردوں کو جلا دوں گا

دیکھو تو نقاب اس کے چہرے سے اٹھا دوں گا   کونین کو مٹھی میں اس کی میں جگا دوں گا
باندھیگا مُرنڈے جب یہ بچۂ عمرانی

اعتراض۔ نقاب اٹھانے والے آپ کون۔

جواب اشہر۔ ہر صاحب ایمان کو مشتاق زیارت و شیدائے امیرالمومنین ہونا چاہیئے۔ عاشق جوش میں اگر نقاب روئے محبوب اٹھادے تو کوئی قباحت نہیں۔

(مؤلف) اعتراض غالباً اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ یہ ولادت کا ذکر کرتے کرتے مولانا عزیز کہاں آن پہونچے۔

عزیز ؎   ضد کرتا ہی کرنے دو مچلا ہی مچلنے دو   اے فاطمہ ہاتھوں سے ہرگز نہ نکلنے دو
ایماں کی قلمرو میں سکہ ابھی چلنے دو   سانچے میں نبوت کے اس نور کو ڈھلنے دو
ہو جائے گا کچھ دن میں یہ احمد لاثانی

اعتراض۔ الفاظ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ فرمائشیں کون کر رہا ہے۔ رسول اللہ۔ یا چودھویں صدی کا شاعر۔

جواب اشہر۔ ائمہ معصومین ہیں ان کا کوئی فعل عبث نہ تھا۔ ضد سے مراد معمولی ضد نہیں۔ علی نے کعبہ میں جو ضدیں کیں وہ بت شکنی کے لئے۔ مادر محترمہ کی گود میں اس لئے مچلے کہ کسی طرح اصنام کعبہ تک ہاتھ پہونچ جائے۔ مگر فاطمہ بنت اسد کی طرف شاعر مخاطب ہو کے کہتا ہے کہ ابھی ہاتھوں سے نکلنے نہ دینا۔ ابھی علی کی بت شکنی کا وقت نہیں آیا ہے۔ ابھی اسے پروان چڑھنے دو۔ حامی اسلام مشہور ہونے دو۔ دیکھو تو پھر یہی بچہ وہ کام کرے گا جو رسول کریں گے۔ اس بند کے پیشتر شاعر نے ایک بند کہا ہے اور اس سے پانچوں مصرعہ کے ہر مصرع کو ربط دیا ہے۔

نام اسکا ابھی کچھ دن اصنام کو جپنے دو   خیبر کو ابھی رنگی گرمی ہی سے تپنے دو
پیمائش قدرت میں اس نور کو نپنے دو   کعبہ کی ہوا کھا کر کچھ اور پنپنے دو
مانیں گے خدا اس کو دلدادۂ حیرانی

عزیز ؎   سمجھو نہ زنَد اس کو یہ غیظ ٹپکتا ہے   یا ہی شفق قدرت یا پھول مہکتا ہے
پیمانے میں شوخی کا اک رنگ جھلکتا ہے   اب خون سے مرحب کے دم بھر میں چھلکتا ہے
نمناک ترا ساغر اے نرگس فتانی

اعتراض۔ "سمجھو" سے تو شاعر نے دیکھنے والوں کو مخاطب کیا ہے اور چاروں مصرعوں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ شاعر نے دیکھنے والوں سے خطاب کیا ہے۔ مگر پانچویں مصرع میں "نمناک ترا ساغر اے نرگس فتانی" کو مخاطب بنایا۔ لفظ ترا۔ اور لفظ اے نرگس فتانی۔ یعنی جناب امیر کی آنکھوں سے خطاب کیا ہے کہاں تو دیکھنے والوں سے خطاب

تھا۔ کہاں خود نرگس فتانی کو مخاطب بنالیا۔

جواب اشہر۔ جناب یاس کی طرح اہل فہم کج فہم نہیں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ادائے مطلب میں مختلف ضمیریں لانا مخل انداز نہیں۔ مرثیۂ حال علی اکبر میں جناب انیس جناب زینب کی زبان سے کہلواتے ہیں۔

میری طرف سے کوئی بلائیں تو لینے جائے　　عین الکمال سے تجھے بچے خدا بچائے

وہ لوذعی کہ جس کی طلاقت لوں کو بھائے　　دو دو دن ایک بوند بھی پانی کی وہ نہ پائے

غربت میں پڑ گئی ہے مصیبت حسین پر

فاقہ یہ تیسرا ہے مرے نورِ عین پر

ملاحظہ فرمائیے پہلے مصرع میں کوئی برائے غایت ہے اور دوسرے مصرع میں تجھے بچے خدا بچائے کہہ کے حضرت علی اکبر کو مخاطب کیا ہے۔ اور پھر چھٹے مصرع میں مرے نورِ عین کہہ کر ضمیر اضافی استعمال کی۔ مگر مطلب میں کیا قباحت آئی۔

اعتراض نمبر ۲۔ شفق قدرت میں لفظ قدرت قبیح بلکہ اقبح ہے۔

جواب۔ رمد چشم (عیب چشم ہے) بلحاظ بیماری مگر شاعر نے آداب مدح امام مدنظر رکھ کر اس سرخی چشم کو جو بوجہ بیماری ہے؛ ایک حسن قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ سرخی باعث زینت قدرت ہے۔ یعنی رمد چشم میں بھی باعتبار حسن قدرت خدا نظر آتی ہے۔

اعتراض نمبر ۳۔ چشم آشوب زدہ کا استعارہ پھول سے نہیں ہو سکتا۔ وجہ شبہ تو فقط رنگ ہے۔ بو تو آنکھ میں ہوتی نہیں۔ لہٰذا یہ استعارہ غلط ہے۔ کیونکہ وجہ شبہ ایک طرف نہیں پائی جاتی۔

جواب۔ یہ تو تشبیہ ہے اور کامل تشبیہ۔ استعارے سے یہاں کیا غرض استعارے میں وجہ شبہ کہاں۔ اور تشبیہ تشبیہ میں بھی ایک طرف وجہ شبہ کا پایا جانا کیا معنی ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا مہملات ہے۔ کیا اب دنیا میں علم معانی و بیان کے جاننے والے نہیں رہے۔

ذرا ناظرین اس اعتراض کو پھر غور سے ملاحظہ فرمائیں چشم سرخ کو پھول سے تشبیہ دی ہے اور بس۔ وجہ شبہ سرخی اور اتحاد صورت بگل۔ "پھول مہکتا ہے" میں دونوں خوبیاں موجود ہیں۔ اول تو سرخ آنکھ کا کھلا ہونا دوسرے جب پھول کھلتا ہے تو مہک نکلتی ہے۔ دیکھو صائب کہتا ہے ؎

تماشائے گل شبنم گوارا باد بلبل را　　کہ بوئے گل نمی ارد روئے گریہ آلودش

یہاں صرف گل و شبنم کو رخسار معشوق اور اشک سے تشبیہ دینا مقصود تھا۔ مگر بوئے کی لفظ سے ضمناً ایک نازک تشبیہ اور پیدا ہو گئی۔ آپ اپنے قیاس مع الفارق کو اپنی جیب میں رکھئے۔ ہم جسم ائمہ کو بہمہ صورت عین خوشبو مانتے ہیں

(مؤلف) پہلا جواب صرف جواد کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں ہو کہ کسی غلط سند کو دیکھ کر غلط کو صحیح مان لیا

جائے - دوسرا اعتراض شفق قدرت پر ہے - یہ بھی صحیح ہے - میرے نزدیک قدرت یہاں بالکل بے ضرورت ہے - آخر شفق قدرت کے سوا شفق بے قدرت کون سی ہے - تیسرا اعتراض غلط ہے - اس لئے کہ تشبیہ ادنیٰ ملابست کے ساتھ بھی جائز ہے۔

نعمت خان عالی[1] و مولانا آزاد بلگرامی

جب کامگار خاں پسر ثانی عمدۃ الملک جعفر خاں وزیر اعظم عالمگیر بادشاہ کی سید مظفر وزیر سلطان ابوالحسن کی لڑکی کے ساتھ دوسری شادی ہوئی تو عالی نے ایک زبردست قطعہ لکھا جس کو ان کی خوش طبعی اور بیباکی کا اعلیٰ نمونہ کہہ سکتے ہیں - بدقسمتی سے اسی قطعے میں ایک زبردست ٹھوکر کھائی ہے - جس کی مولانا آزاد بلگرامی نے تصریح و تشریح کی ہے - قطعہ کا پہلا شعر یہ ہے سے

کہ خدا شد بار دیگر خان عالی منزلت　　باکمال عز و تمکین و وقار و زیب و زین

خان عالی منزلت سے مراد کامگار خاں ہیں۔

اعتراض آزاد - نعمت خاں کا پہلے حکیم تخلص تھا - دوبارہ عالی تخلص اختیار کیا - اور خان عالی مشہور ہوئے - اس لحاظ سے یہ پورا قطعہ خود انھیں کے اوپر منطبق ہوتا ہے جیسا کہ بار دیگر کہ خدا شد خان عالی منزلت سے ظاہر ہے - دوسرا اعتراض یہ ہے کہ خان عالی منزلت یعنی کامگار خاں جو عالی کی صفات سے متصف ہے - اوس کے یہ یہ واقعات ہیں جو قطعہ میں مذکور ہیں - نعمت خاں نے بالکل یہ خیال نہیں رکھا - کہ عالی خود میرا تخلص ہے اور یہ سب صفات میرے اوپر منطبق ہوئے جاتے ہیں - کاش بجائے عالی منزلت کے والا منزلت لکھتے تو یہ خرابی پیدا نہ ہوتی - حقیقت یہ ہے کہ یہ سزا ہے جو قدرت کی طرف سے ہجو گوئی پر دی گئی ہے۔

---

[1] نعمت خان عالی کا اصل نام میرزا محمد تھا - شیراز کے رہنے والے تھے - اور ایک قدیم موقر خاندان سے تعلق رکھتے تھے - ان کے باپ فتح الدین بہت معروف و مشہور اطبا میں سے تھے - اکبر نہ ہندوستان بھی آئے - عالی ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو و نما پائی - مگر کمسنی ہی میں اپنے والد کے ساتھ شیراز چلے گئے - علوم ضروری کی وہیں تعلیم و تکمیل ہوئی - ملا شیفعائی یزدی ملقب بہ دانشمند خاں کے شاگرد ہوئے - چند روز وہاں رہ کر پھر ہندوستان آئے - اور عالمگیر بادشاہ کے زمرۂ مصاحبین میں داخل ہوئے - پھر چند روز میں منصب بکاؤلی پر سرفراز ہوئے - اور اس خدمت کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دینے کی وجہ سے نعمت خاں خطاب پایا - اول شاعری میں حکیم تخلص قرار دیا تھا - مگر چونکہ حکیم اور حکیم میں تصحیف ہے اس لئے عالی تخلص رکھا - عالی نہایت زبردست عالم - اور نہایت مشاق شاعر تھے - اگرچہ انکی شاعری میں ہندیت کا جزو زیادہ شامل ہے پھر بھی انکی مضمون آفرینی مسلم ہے - اور مضمون آفرینی کیساتھ ہی ظرافت کیساتھ طبیعت کو ایک ازلی مناسبت ہے اُسنے اور بھی سونے پر سہاگے کا عالم پیدا کر دیا ہے - یہی ظرافت انکو ہزالی فحاشی اور مزاح کی طرف لیگئی ہے - وقائع میں اسکے اکثر نمونے ملتے ہیں۔

عظیما۔ و عالی

عظیما نیشاپوری ایک نہایت مشاق شاعر تھا۔ جو مرزا فاخر مکین کا استاد اور قیدی پسر یا برادر زادہ ملا نظیری کا بیٹا تھا۔ غزلوں کا ایک دیوان۔ اور ایک مثنوی موسوم بہ فوز عظیم اس سے یادگار ہے۔ اس نے ۱۱۱۱ھ میں وفات پائی ہے عظیما نے ایک غزل کہی جو سرتا پا مسلسل ہے۔ اور نہایت ہی عمدہ ہے۔

قاصد آمد گفتمش آں ماہ سیمیں بر چہ گفت
گفت با ہجرم بساز گفتمش دیگر چہ گفت

گفت دیگر بار بند خویش نگزارد بردل
گفتمش جمع است از اضطرابم اور سر چہ گفت

گفت سر پا بدش از خاک رہ کمتر شمرد
گفتمش کمتر شمردم از تن لاغر چہ گفت

گفت جسم لاغرش را از غضب ناہم سوخت
گفتمش من سوختم در باب خاکستر چہ گفت

گفت در محشر بیکدم زندہ اش خواہیم کرد
گفتمش من زندہ گردیدم ز خیر و شر چہ گفت

گفت خیر و شر نباشد عاشقاں را در حساب
گفتمش ایں ہم حسابے از لب کوثر چہ گفت

گفت با ما بر لب کوثر نشیند عاقبت
گفتمش گر عاقبت ایں است زیں خوشتر چہ گفت

گفت دیگر نگذرد بر خاطرش بار عظیم
گفتمش دیگر بگو گفتا مگو دیگر چہ گفت

ہر صاحب ذوق کو اس غزل کی لطافت معلوم ہو سکتی ہے۔ مگر نعمت خاں عالی نے جو اس غزل کو دیکھا تو اس کے جواب میں ایک غزل کہی اور مقطع میں سخت اعتراض کیا۔ اولاً غزل ملاحظہ فرمائیے۔

پیش ہر کس میکنم ظاہر کہ آں دلبر چہ گفت
بسکہ خوش حرف است میگوید بگو دیگر چہ گفت

گر بگویم غیر دل کو محرم اسرار عشق
زیر لب دریا نمیدانم کہ با گوہر چہ گفت

میکند دل را بہ تنگ از بسکہ می پرسد ولیک
کے زبان شعلہ می فہمد کہ از اخگر چہ گفت

گفت ہر کس سوخت از غم سرمۂ بینش کشید
ہست روشن اینکہ تا آئینہ خاکستر چہ گفت

گفت ہر سنگ از گداز ایں نور پیدا کردہ
عکس مطلب مطلب است اما تو جوہر چہ گفت

گفت می پیچم بخود کانہم ز دستم می رود
صورت حرفم دلے کس پرسد ایں بستر چہ گفت

لحظۂ رو در سخن با من کن از روئے نیاز
تا بگویم آمد آں مژگاں بکف خنجر چہ گفت

گفت تیغ غمزہ ام سر میبرد خاموش باش
یا با بر و از اشارتہا بگو از سر چہ گفت

ہست عالی از عظیما در غزل سہو عظیم
زانکہ از قاصد بود یک گفت آں دلبر چہ گفت

اعتراض - مطلب یہ ہے کہ عظیما نے ہر شعر کے اول میں ایک گفت کا استعمال کیا ہے۔ اس کو ہم قاصد کا جواب مانیں گے۔ معشوق کا جواب کہاں ہے۔ لہٰذا ہر جگہ دو گفت ہونے چاہئیں۔ ایک گفت ناکافی ہے۔ یہ عظیمار کی بڑی سخت غلطی ہے۔

جواب مولانا آزاد بلگرامی - یہاں دو گفت اور ایک گفت دونوں سے کام نکل سکتا ہے۔ اور دونوں سے معشوق کا جواب سمجھا جا سکتا ہے۔ دو گفت اگر ہوں تو اس صورت میں کوئی جھگڑا ہی نہیں۔ دوسری صورت میں اس واسطے صحیح ہے کہ عاشق قاصد سے پوچھتا ہے کہ معشوق کا مقولہ کیا ہے۔ اور وہ اس صورت میں معشوق کا صرف مقولہ بیان کر دیتا ہے۔ اس صورت میں یہ سہو عظیم نہیں بلکہ سہو عالی ہے۔

دوسرے یہ کہ ہم نے جو مقطع کہ نقل کیا یہ مقطع خان آرزو کا لکھا ہوا ہے جو انھوں نے اپنے تذکرہ مجمع النفائس میں لکھا ہے مگر میرے پاس جو کلیات ہے اس میں مقطع یوں لکھا ہے ؎

عالی آخر نیست دانی گفتگوئے عشق را
تا بکے آخر کسے گوید فلاں دیگر چہ گفت

معلوم یہ ہوتا ہے کہ آخر میں اس نکتہ کو جو ہم نے لکھا ہے نعمت خاں عالی نے بھی سمجھ لیا تھا۔ اسی واسطے انھوں نے مقطع کو بدل دیا ہے

(مؤلف: مولانا آزاد کا ایک حد تک جواب صحیح ہے۔ اور مجبوراً یہ تاویل کی جا سکتی ہے۔ مگر جو توجیت عالی کے اعتراض کی تھی وہ بھی غلط نہ تھی۔ اس واسطے کہ ایک شخص جب دوسرے آدمی سے پوچھتا ہے کہ فلاں نے کیا کہا۔ تو وہ صرف اس آدمی کا مقولہ ہی نہیں بیان کرتا۔

ملا عبد الواسع ہانسوی[1] و مرزا غالب

ملا عبد الواسع نے اپنے رسالہ میں ایک قاعدہ حروف قافیہ کے متعلق لکھا ہے۔

عبد الواسع - فرق میاں نفی بکلمہ نا۔ و بے آنست کہ در اول او موصوفی واقع میشود کہ صفت بطریق مواطات محمول تواند شد و حاصل آن این چیز آں چیز نیست می شود۔ و این درجائے است کہ این چیز آں چیزے تواند شد۔ چنانچہ ناعقل و ناخردمند یا یعنی کہ آن شخص عاقل و خردمند نیست۔ و ثانی درجائیکہ صفت محمول بہ مواطات نمی تواند شد و حاصل آں این چیز آن چیز ندارد۔ میشود۔ چنانچہ بے عقل و بے خرد یعنی آں شخص عقل و خرد ندارد۔ پس بحسب این تحقیق لفظ نامراد

---

[1] ملا عبد الواسع ہانسوی - ہانسی ضلع حصار کے رہنے والے تھے۔ ملا غیاث الدین رامپوری وغیرہ کے معاصر تھے۔ عربی و فارسی زبردست عالم تھے۔ اون کا لکھا ہوا قواعد کا ایک رسالہ جو رسالہ عبد الواسع کے نام سے موسوم ہے نہایت ہی مستند ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہی
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ - ششماہی تین روپیہ
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہی

جلد ۲۳ | فہرست مضامین مارچ ۳۶ء | شمارہ ۳

(نوٹ) جب تک پرچہ کی اشاعت اپنے وقت پر نہ آئے گی تذکرۂ معرکۂ سخن ملتوی رہیگا۔ غالباً مئی کا پرچہ اپنے وقت پر اول ہفتہ میں شائع ہو جائے گا۔
منیجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد ۲۳	مارچ سنہ ۱۹۴۳ء	شمارہ ۳

مُلاحِظات

ہماری علمی درسگاہوں کی تنگ ذہنیت

دارالعلوم ندوہ کے موجودہ ناظم کا جاہلانہ تقشف

آپ دنیا کی کسی قوم سے سوال کیجئے کہ علم و مذہب میں کوئی فرق ہے یا نہیں تو وہ بلا تردد، بغیر ایک لمحہ کا پس و پیش کئے ہوئے جواب دے گی کہ علم و مذہب میں وہی فرق ہے جو زمین و آسمان میں ہے۔ کیونکہ ایک کا تعلق صرف اخلاقیات سے ہے اور دوسرے کا "ذہنیات" سے۔ اس کا دائرۂ عمل اگر اصلاح تمدن ہے تو اس کا ترقی تمدن یا زیادہ علمی زبان میں یوں سمجھئے کہ اگر ایک مابعد الطبیعیات سے تعلق رکھتا ہے تو دوسرا طبیعیات سے یعنی اگر یہ عملی زندگی کی کشمکش ہے تو وہ خیالی دنیا کی داستان ہے، اگر یہ ذہن انسانی میں اضطرار عمل پیدا کرنے والا ہے تو وہ رفع

کو سکونِ خواب میں محو کرنے والا ــــ الغرض ان دونوں میں حال و مستقبل کا فرق ہے، ہاں اور نہیں کا فرق ہے ــــ لیکن دنیا میں ایک قوم ایسی بھی ہے جو اس فرق و امتیاز کی قائل نہیں، جو حیاتِ انسانی کے تمام اعمال کو صرف مذہب ہی سے متعلق کرنا چاہتی ہے اور جو اس کارگاہ عمل اور کشاکش زندگی کے ہر پہلو کو اسی خواب آلود نگاہ سے دیکھنا چاہتی ہے جو مذہب کی غلط تعبیر سے اس نے حاصل کی ہے ــــ وہ دنیا کے تمام علوم و فنون کا مرکز و ماخذ مذہب ہی کو سمجھتی ہے، وہ واقعات تاریخی کو بھی مذہب ہی کا جزو جانتی ہے، وہ وقتی احکام کو بھی دوام و استمرار دینا چاہتی ہے اور اس کے نزدیک دنیا میں نہ ماحول کوئی چیز ہے اور نہ اس کی تبدیلی سے انسانی ذہنیت پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے ــــ اس کے سامنے صرف مذہب ہے اور اس کی دار و گیر، دین ہے اور اس کا تقشف، عبادت ہے اور اس کا پندار اور وہ اس دنیا کی زندگی کو اس مسافر کی طرح بسر کر دینا چاہتی ہے جو صرف ایک لوٹا اور کمل لے کر شام کو سرائے میں آتا ہے اور صبح کو چلا جاتا ہے ــــ آپ کو معلوم ہے وہ قوم کون سی ہے ؟ وہ قوم ہمارے علماء کرام کی ہے، جو اپنے آپ کو اسلام کا سب سے بڑا حامی و علمبردار سمجھتے ہیں درانحالیکہ ان سے زیادہ دشمن اسلام اس وقت دنیا میں کوئی نہیں، جو اپنے کو مذہبی روایات کا سب سے بڑا محقق و دانشمند باور کرتے ہیں درانحالیکہ

نہ محقق بود نہ دانشمند

چار پائے بر وکتابے چند

آئیے ہم آپ کو اس قوم کے ایک فرد کی عجیب و غریب ذہنیت کا ایک واقعہ سنائیں اور ہم آپ دونوں مل کر غور کریں کہ اس واقعہ کے اندر ہمارے اور ہماری قوم کے لئے کیا کیا درس عبرت و بصیرت پنہاں ہیں۔

اس وقت ہندوستان میں شاید ہی کوئی پڑھا لکھا مسلمان ایسا ہوگا جو دارالعلوم ندوہ سے واقف نہ ہو اور وہ حضرات جو تعلیمی معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں وہ اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ دارالعلوم ندوہ اور مسلمانوں کی دوسری درسگاہوں میں کیا فرق ہے ــــ مشرقی ہند میں سب سے بڑی درسگاہیں علوم عربیہ کی چار تھیں یا ہیں۔ ایک مدرسۃ العلوم دیوبند، دوسری مدرسۂ عالیہ رام پور، تیسری مدرسہ فرنگی محل اور چوتھی دارالعلوم ندوہ ــــ ان میں دو درسگاہیں (دیوبند اور فرنگی محل کی) تو مخصوص تھیں۔ علوم مذہبیہ کے لئے اور اب تک ان کی یہ خصوصیت کم و بیش قائم ہے۔ باقی دو درسگاہیں علوم و فنون کے لئے مخصوص تھیں اور۔ ایک طالب علم کو مذہبی انسان بنا کر نکالنا ان کا مقصود نہ تھا بلکہ ایک عالمانہ و محققانہ ذوق پیدا کرنا ان کا مدعا تھا ــــ خیر مدرسۂ عالیہ رامپور تو موجودہ نواب رام پور کے جدید نظم و نسق اور تعصب پر قربان ہو گیا اور اس کا وجود ہی باقی نہیں رہا، لیکن دارالعلوم ندوہ ہنوز موجود ہے مگر اس شان کے ساتھ کہ اگر ہم اس کے گزشتہ دور کو موجودہ دور کے ساتھ مقابلہ

کرکے دیکھیں تو وجوباً اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ

وشتان ما بین خل و خمر

اس کے دورِ اولین میں جب مولانا فاروق چریاکوٹی اس کے پرنسپل تھے، اس کی فضا باوجود ایک نئی درسگاہ ہونے کے بڑی حد تک خالص علم و فضل کی فضا معلوم ہوتی تھی اور یہ دیکھ کر مسرت ہوتی تھی کہ شاید ایک وقت ایسا آئے گا جب مسلمان بچوں کو ان کی ذہنی و عقلی آزادی کو مجروح کئے بغیر علوم مذہبیہ و حکمیہ کی تعلیم دی جائے گی اور اس میں شک نہیں کہ اس کے دورِ ثانی میں جب مولانا شبلی مرحوم نے عنانِ سیادت اپنے ہاتھ میں لی اس درسگاہ کی یہ خصوصیت بہت زیادہ نمایاں ہوگئی، لیکن ان کے بعد کا دور جو فی الحقیقت "کبرنا موت الکبریٰ" کا دور تھا ایسا ناکام ثابت ہوا اور مقاصد و نصاب کا انحطاط اس منزل تک پہنچ آیا کہ "ڈاکٹر سید عبد العلی" سے بہتر کوئی ناظم اسے لکھنؤ بھر میں نہ مل سکا ——

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر عبد العلی ندوہ کے تعلیم یافتہ ہیں، سائنس کے گریجویٹ اور لکھنؤ میڈیکل کالج کے "ام بی - بی اس" ہیں، لیکن ان اسناد کو نظم و نسق کی قابلیت سے کیا واسطہ، جبکہ اس کے لئے صرف ایک قائدانہ دماغ، ایک مصلحانہ ذہنیت، اور کارفرمایانہ قابلیت کی ضرورت ہے سید عبد العلی، ممکن ہے اچھے طبیب و ڈاکٹر ہوں، یہ بھی ناممکن نہیں کہ وہ کچھ لکھنا پڑھنا جانتے ہوں، لیکن کیا دنیا کا ہر طبیب و ڈاکٹر، ہر لکھا پڑھا انسان ایک درسگاہ کا کامیاب ناظم بن سکتا ہے —— پھر اگر یہ عہدہ انھیں صرف اس لئے تفویض نہیں کیا گیا کہ ان کے والد بزرگوار بطور وراثت ان کے لئے چھوڑ گئے تھے، تو یقیناً ان کی دوسری اہلیت سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوسکتی تھی کہ وہ نہایت ہی متقشف قسم کے مسلمان ہیں اور کارکنانِ ندوہ کا مقصد ہی یہ تھا کہ اس درسگاہ کو نہایت ہی سخت متعصب مذہبی درسگاہ بنادیا جائے۔ جس کا ثبوت ذیل کے ایک واقعہ سے ملے گا۔

سنہ ۲۹ء میں پونا سے علوم عربیہ کا ایک شایق طالب علم (عنایت علی) ہزاروں میل سفر کرکے لکھنؤ آیا اور دار العلوم ندوہ میں داخل ہوگیا۔ چونکہ موسیقی کا بھی اسے فطری ذوق تھا اس لئے وہ رات کو خارج اوقات میں میوزک کالج جاکر اس شوق کو بھی پورا کرتا تھا۔ برابر تین سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن جب ناظم ندوہ (ڈاکٹر عبد العلی) کو اس کا علم ہوا تو اپریل سنہ ۳۲ء میں انھوں نے اس غریب کو مدرسے سے علیحدہ کردیا اور کوئی عذر ان کی بارگاہ میں پذیرا نہ ہوا —— بظاہر یہ معاملہ نہایت معمولی نظر آتا ہے، لیکن حقیقتاً یہ سوال صرف کسی مخصوص طالب علم اور مخصوص ناظم کا نہیں، بلکہ ایک ایسی درسگاہ کا ہے جس کا تعلق پبلک کے مفاد سے ہے۔ اور اس اصول کا ہے جس کے ماتحت اس کا موجودہ نظم و نسق جاری ہے۔

پھر کیا میں ڈاکٹر عبد العلی (موجودہ ناظم ندوہ) سے یہ سوال کرسکتا ہوں کہ کیوں انھوں نے اس طالب علم کو

درسگاہ سے خارج کیا اور وہ کون سی حجت شرعی ہے جو اس اخراج کو واجب ٹھیرانے والی تھی ـــــ فرض کیجئے کہ کوئی عیسائی یا ہندو طالب علم محض علوم عربیہ پڑھنے کے لئے ندوہ میں آکر داخل ہو تو کیا اس کو صرف اس حجت پر باہر نکال دیا جائے گا کہ وہ صلیب کی پرستش کرتا ہے یا شام کو مندر میں جاکر ناقوس بجاتا ہے ـــــ یقیناً نہیں۔ تو پھر کیا اس سے زیادہ حیرت انگیز مثال کسی اسلامی درسگاہ کے مستبدانہ نظم و اہتمام کی کوئی اور ہو سکتی ہے کہ ایک طالبعلم باوجود مسلمان ہونے کے صرف اس بنیاد پر تعلیم سے محروم کر دیا جاتا ہے کہ اسے موسیقی سے رغبت ہے اور وہ درسگاہ کے اوقات کے علاوہ اس کے سیکھنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ کیا موسیقی کا فن کی حیثیت سے سیکھنا ناجائز ہے؟ کیا رسول اللہ اور صحابہ نے گانا نہیں سنا اور کیا تاریخ سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ بہت سے اکابر اسلام کو موسیقی کے ساتھ حد درجہ شغف حال تھا اور اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کو مان لیا جائے کہ فرط تقوے کا اقتضا یہی تھا کہ اس طالب علم کو اس شوق سے باز رکھا جاتا تو کیا ڈاکٹر عبدالعلی بتا سکتے ہیں کہ انھوں نے اس احتیاط کو خود اپنی ذات کے لئے بھی کبھی صرف کیا ہے یا نہیں اور وہ کون سی حجت شرعی ہے جس کی بنا پر وہ روزانہ متعدد غیر محرم عورتوں کے جسم میں ہاتھ لگانے سے احتراز نہیں کرتے؟ اور وہ تقوے کیسا ہے جو انھیں بہت سی ایسی دوائیں تجویز کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جن میں شمول الکحل کا ان کو یقین ہے ـــــ اگر یہ کہا جائے کہ وہ اپنے پیشہ کے لحاظ سے مجبور ہیں تو براہ کرم یہ بتایا جائے کہ ان جیسے متقی شخص کو ایسا پیشہ اختیار کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی اور کیا وہ کسی مسجد میں اذان و امامت کی خدمت انجام دینے پر قانع نہ رہ سکتے تھے۔

پھر یہ کس قدر حیرتناک امر ہے کہ ڈاکٹر عبدالعلی کے لئے تو محض پیشہ کی مجبوری نہیں بلکہ صرف مادی نفع کی غرض سے عورتوں کو ہاتھ لگانا اور مسلمانوں کو شراب آلود دوائیں پلانا تک حلال و مباح قرار دیا جائے (جو کبھی رسول اللہ نے جائز نہیں رکھا۔) اور ایک غریب طالب علم کو ایک روحانی ذوق کی تسکین کے لئے موسیقی سیکھنا بھی حرام قطعی قرار دے کر مدرسہ سے باہر نکال دیا جائے (درانحالیکہ خود رسول اللہ کا گانا سننا اور اس سے لطف اٹھانا تاریخ سے ثابت ہے) یہ سچ ہے۔

گر من آلودہ دامنم چہ عجب
ہمہ عالم گواہ عصمت اوست

اسی طالب علم نے قبل موسیقی سیکھنے کے ایک استفتاء بھی "علماء دین و مفتیان شرع متین" کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اور جو فتوی اس مسئلہ پر دیا گیا اس کا خلاصہ درج ذیل ہے :-

۱- ابوالمعاد محمد شبلی مدرس دارالعلوم نے جواب دیا کہ :-

"علم موسیقی علم ریاضی کی ایک قسم ہے اور علم ریاضی کا بجمیع اقسامہ سیکھنا مباح ہے بشرطیکہ ایسے مسائل جو خلاف شرع ہوں، اس پر عامل نہ ہو بلکہ صرف علمی حیثیت سے سیکھ لیا ہے۔ ..... بعض علوم ایسے ہوتے ہیں کہ اس کے سیکھنے والے کو معصیت کی طرف پہونچا دیتے ہیں جس کی وجہ سے اعتقاد اور عمل خراب ہو جاتا ہے۔ ان میں سے موسیقی بھی ہے اس وجہ سے "ممنوع لغیرہ" ہے۔"

۲۔ محمد شفیع حجت اللہ الانصاری فرنگی محلی کا ارشاد ہے :۔

"فن شعر گوئی اور دیگر فنون لطیفہ کی طرح علم موسیقی کی تحصیل بھی فی نفسہ مباح ہے۔ البتہ اس قسم کے علوم و فنون کی تحصیل کے بعد ان کی عملی شق کا جواز ضرور مشتبہ ہے۔"

۳۔ محمد اعظم شاہ مفتی آگرہ فرماتے ہیں :۔

"علوم و فنون سب مباح ہیں ...... خصوصاً وہ علوم جنہیں جذبات مخفیہ کا اشتعال لازم ہے ان کی تحصیل یقیناً منجر بہ فساد ہے۔"

قطع نظر اس امر سے کہ جوابات کس زبان و عبارت میں دئے گئے ہیں صرف اس پر غور کیجئے ان سے کوئی صاف و صحیح نتیجہ سائل کو مطمئن کرنیوالا پیدا ہوتا ہے یا نہیں۔ اور اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر جب ہم ان جوابات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مفتی نمبر۱ پہلے تو موسیقی سیکھنا مباح قرار دیتا ہے لیکن بعد کو اسے "ممنوع لغیرہ" قرار دیتا ہے۔ اس اصطلاح سے ان کی مراد یہ ہے کہ موسیقی چونکہ انسان کے اخلاق خراب کر دیتی ہے اس لئے اپنے اس نتیجہ کے لحاظ سے ممنوع ہے۔ یہی مدعا غالباً مفتی نمبر۳ کا بھی ہے۔

فاضل مفتی نے اگر یہ نتیجہ صرف اپنے ہی رجحانات فطرت کو پیش نظر رکھ کر نکالا ہے تو کسی کو تردید کا حق حاصل نہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ موسیقی کو مخرب اخلاق کہنا اتنی بڑی نادانی ہے کہ دار العلوم ندوہ کے ایک مدرس کو اس سے شرم کرنا چاہیئے۔ اگر مفتی حقیقتاً ہندوستانی موسیقی کے اصول، اور اس کی تاریخ سے بیخبر نہ ہوتا تو سمجھ سکتا کہ موسیقی حقیقتاً ایک عبادت ہے، ایک نیایش و گزارش ہے جو جوارح ظاہری نہیں بلکہ صرف روح کی طرف سے فطرت کے حضور میں پیش کی جاتی ہے۔ اور اگر اس کو "ممنوع لغیرہ" قرار دیا جاتا ہے تو نماز و روزہ بھی "ممنوع لغیرہ" ہیں اگر اس کا نتیجہ مکر و ریا و شقاوت قلبی نکلے، وہ مفت پلاؤ قورمہ بھی "ممنوع لغیرہ" ہے جسے کھا کھا کر تخمہ و ہیضہ کو دعوت دی جاتی ہے اور ڈاکٹر عبد العلی کا پیشۂ طبابت تو بدرجۂ اولیٰ "ممنوع لغیرہ" ہے جس میں غیر محرم عورتوں کو ہاتھ لگانے کے مواقع روز پیدا ہوتے ہیں اور ایک انسان کی "خیالی معصیت" کے علاوہ "عملی معصیت" کا بھی بہت زیادہ امکان پایا جاتا ہے۔

مفتی نمبر۲ نے علم موسیقی کو علم کی حیثیت سے سیکھنا تو جائز قرار دیا ہے لیکن اس کی "عملی شق" کے جواز

کو مشتبہ ظاہر کیا ہے معلوم نہیں "عملی شوق" سے ان کی مراد کیا ہے۔ اگر اس سے مقصود "بازاری پیشہ" کی طرح اس کو اختیار کرنا ہے تو مفتی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ خود ماہرین موسیقی بھی اس حرکت کو ناجائز قرار دیتے ہیں، لیکن صرف اس دلیل پر کہ کسی فن کو ایک شخص بری طرح استعمال کرسکتا ہے اسے ناجائز کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے ــــ علم الکیمیا حاصل کرنا ناجائز نہیں لیکن اگر کوئی شخص اس سے کام لے کر صرف زہر بنائے اور لوگوں کو زہر دے دے کر ہلاک کیا کرے تو کیا ایک خاص شخص کے اس فعل سے علم الکیمیا کا سیکھنا حرام قرار دیا جا سکتا ہے؟

علم الفقہ سیکھنا ہر مولوی کا فرض ہے لیکن اگر کوئی مفتی یا مولوی اس سے کام لے کر صرف ناجائز نکاح و طلاق کے شرعی بہانے تراشنے کا پیشہ اختیار کرے تو فقہ پر کیا الزام عاید ہو سکتا ہے اور اس کے حصول کو کیونکر ناجائز ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ ــــ متعدد مثالیں ایسے اطباء اور ڈاکٹروں کی ملتی ہیں جنھوں نے محض اپنے فن طبابت کے ذریعہ سے ساری عمر فحاشی و اوباشی میں بسر کردی، لیکن کیا اس سے اس فن کی تحصیل کو حرام قرار دے سکتے ہیں

لیکن اگر مفتی مذکور کا مدعا "عملی شوق" سے یہ ہے کہ موسیقی کا کتابی علم تو جائز ہے اور عملی ناجائز، تو مجھے مولانا کی واقفیت پر ماتم کرنا پڑے گا، کیونکہ انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ موسیقی ان علوم میں سے ہے جن کا تعلق صرف عمل سے ہے۔ اور محض کتاب پڑھ لینے سے یہ فن حاصل نہیں ہو سکتا ــــ یہ علم آواز کا ہے اور جب تک منہ سے آواز نہ پیدا کی جائے ــــ اس کے اصول کیا بتائے جا سکتے ہیں۔ پھر اگر کوئی تدبیر مولانا کے نزدیک ایسی ہے کہ بغیر سامعہ کو متاثر کئے آواز پیدا ہو جائے یا بغیر آواز کے آواز نکل سکے تو اس کا اظہار کرنا چاہئے تھا تاکہ اس عجیب و غریب اکتشاف سے دنیا محروم نہ رہتی۔

موسیقی کو کتابی علم قرار دے کر اس پر کفایت کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے مولانا کسی کو وضو و نماز کے طریقے زبانی بتا دیں اور کہدیں کہ بس اب تمہارے لئے وضو و نماز کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ محض ان ترکیبوں کا جان لینا گویا وضو کرکے نماز پڑھ لینا ہے۔

الغرض اس طالب علم کے معاملہ میں اگر ایک طرف "مفتیان شرع متین" نے فتویٰ دینے میں کم فہمی سے کام لیا تو دوسری طرف دار العلوم ندوہ کے ناظم نے ایسے استبداد سے کام لیا جو ایک پبلک درسگاہ کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتا۔

اس کا جواب کارکنان ندوہ کی طرف سے صرف یہ دیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی درسگاہ کے لائحۂ عمل میں اس کو ناجائز قرار دیا ہے کہ کوئی طالب علم ایک ہی وقت میں علوم دینیہ بھی حاصل کرے اور موسیقی بھی۔ لیکن اگر اس امتناع کا سبب یہ ہے کہ علوم دینیہ اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں تو اس میں صحت کا کوئی شائبہ نہیں اور اگر محض انتظامی نقطۂ نظر سے اس کو ضروری قرار دیا گیا تو کیا یہ بتایا جا سکتا ہے کہ ایک پبلک درسگاہ کے نظم و

اہتمام میں اس نوع کے استبداد کو ضروری قرار دینا کن ارباب علم و فضل کی روشن دماغی کا نتیجہ ہے اگر یہ فعل موجودہ ناظم کے شخصی اجتہاد و فیصلہ کا مظاہرہ نہیں

مولوی عبدالقدیر بدایونی اور مولوی عبدالحامد بدایونی

تو گوئی کہ مرغان شاطر بہ جنگ

۲۱ر جنوری کو بعد مغرب جامع شمسی بدایوں میں مسلمانوں کی ایک جماعت طلب کیجاتی ہے تاکہ جامع مسجد کی مرمت کے لئے تدابیر سوچی جائیں۔ جناب عبدالقدیر بدایونی جو "مولانا" قوم کے ایک نہایت ہی سربرآوردہ فرد ہیں صدر قرار پاتے ہیں۔ ایک صاحب مفتی سخاوت حسین کھڑے ہوکر مشورہ دینا چاہتے ہیں کہ جلسہ ابھی شروع نہ کیا جائے تو بہتر ہے، کیونکہ ابھی اکثر محلوں کے لوگ جمع نہیں ہوئے، لیکن مولانائے صدر کا پندار اس کو برداشت نہیں کرتا کہ ان کی صدارت کی کارفرمائیاں ایک لمحہ کے لئے بھی معطل حالت میں پڑی رہیں

باہمی اختلاف کی وجہ سے کچھ ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہمارے مولانا برافروختہ ہوکر ایک صاحب مولوی محمد سلیمان کو نہایت درشت لہجہ میں سخت و سست کہنے لگتے ہیں اور مولوی عبدالحامد وغیرہ اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ لیکن مخالفت ذاتی کا یہ منظر خدا کی ایک عبادتگاہ میں اسی جگہ پہونچکر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اس میں اضافہ مارپیٹ اور عمل "کفش کاری" کا بھی ہوتا ہے۔ بعد کو دوسرے دن کسی کو بازار سے گراکر زدوکوب بھی کی جاتی ہے اور مدرسہ قادریہ میں چاقو چلنے کا بھی قصہ بیان کیا جاتا ہے۔

یہ بیان ہے وہیں کے ایک مقامی اخبار العدل کا جس میں اعتبار و بصیرت کے لئے نہ کسی تفسیر و شرح کی ضرورت ہے اور نہ "مولاناؤں" کے اخلاق اسلامی پر کسی مزید روشنی ڈالنے کی۔ اسی کے ساتھ معاصر مذکور نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ ۳ر فروری کو مولوی عبدالقدیر اور مولوی عبدالحامد کو دو فریق مقرر کرکے حکام کی جانب سے مچلکے لئے گئے اور دفعہ ۱۰۷ کی کارروائی کے لئے ۱۱ر فروری عدالت نے مقرر کی—

یہ ہیں کارنامے ہمارے علماء کرام اور مذہبی رہنماؤں کے اور یہ ہیں اخلاق قوم کے ان مشایخ کے جو اپنی دراز عباؤں میں خدا جانے کتنے افسانے اپنی "کوتہ آستینوں" کے پنہاں رکھتے ہیں۔ بظاہر انکی صورت دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ انکے اندر "روح القدس" حلول کر گئی ہے، لیکن انکے معاشری اخلاق اور انکا بطون ایک ایسا ادیہ ہے جہاں طمع و خودغرضی کے شعلوں کے سوا کسی اور نور کا پتہ نہیں اور انکے اعمال کی داستان حقیقتاً عصیاں کاری کے ایسے ایسے نادر ٹکڑے اپنے اندر رکھتی ہے کہ ہم رندان بادہ خوار کا خیال بھی اس حد تک نہیں پہونچ سکتا۔ سچ ہے

کیمیائے ست عجب معرفت درگر یار — خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند

فراعنۂ مصر کی خوابگاہیں

رُودِ نیل کی آغوش میں

(اہرام مصر کو دیکھ کر)

ایک بالکل جدید نظریہ

"اے ازلی و ابدی اہرام - اے ماضی کے اسرار عظیم - اے حال کی چیستاں - اور آیندہ آنیوالی نسلوں کیلئے مایۂ حیرت و استعجاب !"

یہ ہیں وہ الفاظ جو ایک ادیب سیّاح نے اہرام مصری کے متعلق لکھے ہیں۔

اہرام کا پہلا نظارہ جب کوئی سیّاح عروس البلاد قاہرہ سے رود نیل کے مشرقی کنارہ پر اہرام کا پہلا نظارہ کرتا ہے تو فاصلہ کی وجہ سے وہ زیادہ دلچسپ تو نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اس کے دل میں کچھ اور تاثرات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ چار پانچ میل کے فاصلہ سے وہ ایسے نظر آتے ہیں گویا قریب ہی ہیں۔ اور جوں جوں سیّاح آگے بڑھتا جاتا ہے وہ دور ہوتے چلے جاتے ہیں - اور دیکھنے والے کو ان عجیب عمارتوں کی عظمت و شان پر غور کرنے کا کافی موقعہ ملتا ہے۔ یہ خاص اثر کچھ تو اہرام کی عظمت کی وجہ سے ہوتا ہے اور کچھ ان کی وضع قطع کے سبب سے - چونکہ اہرام بہت عظیم الشان اور چار برابر قاعدوں کے بڑے بڑے تودے ہیں۔ اس لئے ان میں ایسے چھوٹے چھوٹے حصے نہیں ہیں جن پر سیاح کی نظر جم سکے۔

صبح صادق کی دھندلی روشنی میں جب ان اہرام پر پہلی نظر ڈالی جاتی ہے تو وہ ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا عجیب ہیئت کے پہاڑ ہیں اور ہرم اعظم ایک ایسا پہاڑ معلوم ہوتا ہے جس کے نیچے کی زمین ایک طرف سے دب گئی ہے۔ اور وہ ایک طرف کو زیادہ جھک گیا ہے۔ جب سیّاح ان تین بڑے اور ایک چھوٹے ہرم کے قریب پہونچتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین کا یہ حصّہ بے اختیارانہ اوپر کی طرف ابھرا چلا جا رہا ہے۔ اور جب وہ تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر رہ جاتے ہیں تو اسقدر قریب معلوم ہوتے گویا آگے بڑھ کر ان کو چھو لیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب سیّاح اور زیادہ قریب پہونچتا ہے تو ان کی عظمت کا نہایت گہرا اثر اس پر پڑنے لگتا ہے۔ اور جب وہ ان کے ڈھلواں پہلوؤں پر نظر دوڑا کر ان کی چوٹیوں پر نظر ڈالتا ہے تو ٹوپی سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے

بعض مرتبہ ان اہرام کو دیکھنے والوں کے جذبات اسقدر ہیجان میں آتے ہیں اور اسقدر وحشت وہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ کہ لطف کے بجائے تکلیف پیدا ہو جاتی ہے اور غالباً اسی وجہ سے ان کے متعلق لوگ یہ بیان کیا کرتے ہیں۔ کہ ان مکروہ صورت اور بدہیئت تودوں کی تعمیر میں نہ کوئی ذوق سلیم نظر آتا ہے نہ خوبصورتی۔ ..... ہرم اعظم کی بائیں میں کھڑا ہو کر اگر کوئی شخص اس پر نگاہ ڈالے تو اس سر بفلک جلیل القدر یادگار کو دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ عرب رہنما جب اس پر چڑھ کر ادھر ادھر پھرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیڑے رینگ رہے ہیں۔ جب کوئی شخص ہرم پر چڑھنا شروع کرتا ہے اور دم لینے کے لئے کھڑا ہو کر نیچے کی طرف دیکھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ نیچے کھڑے ہوئے ہیں وہ حشرات الارض سے زیادہ بڑے نہیں۔ اور پھر جب وہ ہرم کی چوٹی کی طرف نظر اٹھاتا ہے تو اس کی عظمت وشان کی حقیقت کھلتی ہے۔ عرب رہنماؤں کی مدد سے ہرم اعظم پر چڑھنے میں نصف گھنٹہ کے قریب وقت صرف ہوتا ہے

ہرم اعظم ہرم اعظم ان اہرام میں سے ایک ہے جو شہر قاہرہ سے جانب جنوب تھوڑے سے فاصلہ پر دریائے نیل کے کنارے واقع ہیں۔ تمام اہرام میں یہی ہرم سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ کیونکہ یہ بلحاظ حجم سب سے بڑا بھی ہے۔ اور اس کے متعلق بہت سی دلچسپ روایات بھی بیان کی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں اس کے اندر بہت سے پوشیدہ راستے، سُرنگیں اور کمرے بھی ہیں۔ ہرم اعظم کے اندر بڑے بڑے وسیع ایوانات شاہی بنے ہوئے ہیں۔ جن میں طویل راستوں اور غلام گردشوں کے ذریعہ سے پہونچتے ہیں۔ ان راستوں کا داخلہ نہایت ہوشیاری سے پوشیدہ رکھا گیا تھا، حتیٰ کہ ان کے اندر صدیوں تک کوئی شخص داخل نہ ہو سکا۔ مگر اتفاق سے ان راستوں کا راز فاش ہو گیا تب لوگوں کو اندرونی زمین دوز کمروں کا حال معلوم ہوا۔ ان کمروں میں داخل ہونے کے لئے سطح زمین سے اسقدر بلند و طویل راستے کیوں بنائے گئے، یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہرم اعظم کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً بڑی گیلری کا راستہ زمین سے تقریباً ۲۸ فٹ بلند ہے۔ اور ڈھلوان ہوتا ہوا ایوان شاہی کی طرف چلا گیا ہے اگر اس راستہ کا مقصد صرف یہ ہو تاکہ بادشاہ کا تابوت ایوان شاہی میں پہونچا دیا جائے تو آٹھ فٹ اونچا راستہ بھی کام دے سکتا تھا، دروازہ کو اسقدر بلند بنانے کی کیا ضرورت تھی، یہ وہ مسئلہ ہے جو منجملہ دیگر اسرار ہرم اعظم کے ہنوز حل طلب ہے۔ ان اسرار پر ہم آیندہ بحث کریں گے۔ سب سے پہلے ہم اس کے مختصر تاریخی حالات درج کرتے ہیں۔

تاریخی حالات ہرم اعظم ملک خوفو فرعون مصر نے تعمیر کیا تھا۔ جسے انگریزی زبان میں کیوپس (Cheops) کہتے ہیں۔ اس فرعون کے عہد کی تاریخ کے بارہ میں اگرچہ ابھی تک کسی قدر شبہ باقی ہے لیکن اسقدر یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کم از کم ۲۹۰۰ سال قبل مسیح پایا جاتا تھا، اور بعض کے نزدیک اس کا زمانہ اس سے بھی ایک ہزار سال قبل تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خوفو فرعون مصر نے یہ ہرم اپنے مقبرہ کے لئے تعمیر کیا تھا۔ اور اس امر کی بھی کافی شہادتیں موجود ہیں کہ فرعون مذکور نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ایوان شاہی میں مدفون کیا گیا تھا۔

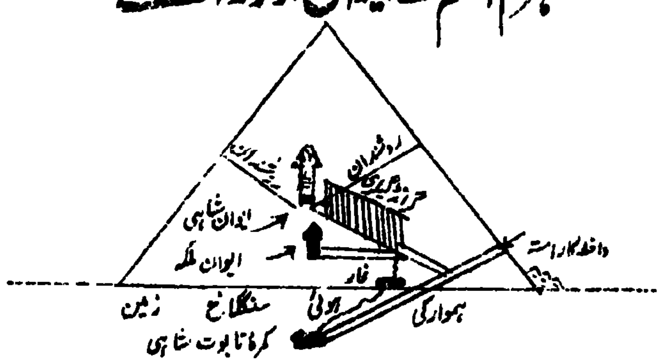
اس ہرم کی تعمیر میں لکھوکھا غلام لگائے گئے تھے۔ اور سالہاسال کی محنت شاقہ کے بعد تعمیر ہوا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ تمام کاریگروں اور مزدوروں کو ایک ایک لاکھ کی تین جماعتوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر جماعت کو تین ماہ تک کام کرنا پڑتا تھا۔ اور بقیہ دونوں جماعتیں اس جماعت کو سامان رسد پہونچانے کے علاوہ اپنا اپنا کام کرتی تھیں

اس مقبرہ کی تعمیر میں سنگ سرخ اور سنگ آہک (چونے کے پتھر) سے کام لیا گیا تھا۔ سنگ سرخ مصر سے سات سو میل کے فاصلہ پر بمقام سائینہ کھودا گیا تھا۔ اور حیرت ہوتی ہے کہ تعمیر ہرم کے لئے اسقدر بعید فاصلہ سے اتنے بڑے بڑے پتھر کے ٹکڑوں کو کیونکر لایا گیا تھا۔ دوسری حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ آلات جرثقیل موجود نہ تھے ان بھاری پتھروں کو سطح زمین سے اٹھا کر ان کی جگہ پر نصب کیونکر کیا گیا، جبکہ ہرم اعظم کی بلندی ۴۸۱ فٹ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہرم اعظم کے اندر ۲۳ لاکھ عظیم پتھر کی سلیں نصب ہیں اور ہر سل اندازاً ستر من کی ہے

تعمیر کے متعلق مختلف نظرئے

اس بارہ میں مختلف نظرئے قائم کئے گئے ہیں کہ ہرم اعظم کی تعمیر میں جو اتنے بڑے بڑے پتھر کام آئے ہیں انھیں زمین سے اٹھا کر ان کے مقام تک کیونکر پہونچایا گیا تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ ان پتھروں کو بلند کرنے کے لئے عظیم الشان منجنیقوں سے کام لیا گیا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ موٹے موٹے رسّوں میں باندھ کر مزدوروں نے اٹھایا تھا۔ لیکن صحیح قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریائے نیل کے کنارہ سے ہرم اعظم کی بنیاد تک ایک ڈھلوان راستہ بنایا گیا تھا۔ اور ہزارہا مزدور ایک ساتھ زور لگا کر ان پتھروں کو تختیوں سے اٹھا کر راستہ پر لڑھکاتے یا کھینچتے ہوئے موقعہ پر پہونچا دیتے تھے۔ اور جب ہرم کی زیرین منزل مکمل ہو جاتی تھی تو اس سڑک کی بلندی اور زیادہ کر دی جاتی تھی۔ جب ہرم اعظم مکمل ہو گیا تو یہ سڑک توڑ دی گئی اور اس کا ملبہ کسی دوسرے مقام پر پہونچا دیا گیا۔ اس سڑک کے آثار اب بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔

ہرم اعظم کے ایوان اور راستے



ہرم اعظم کے متعلق دلچسپ معلومات

ہرم اعظم کے جغرافی وقوع کے متعلق بعض بہت سی دلچسپ باتیں

بیان کی جاتی ہیں مثلاً :-

یہ کہ ہرم اعظم سے جو خط طول البلد و عرض البلد گزرتا ہے۔ اس پر دنیا بھر میں سب سے زیادہ خشکی کا حصہ پایا جاتا ہے یا یہ کہ مصر زیریں کے جس علاقہ میں ہرم اعظم واقع ہے وہ تمام دنیا کی آباد زمین کا مرکزی حصہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہرم اعظم کے مشرق و مغرب کی طرف جسقدر خشکی کا حصہ ہے اگر اس کا حساب مربع میلوں میں لگایا جائے۔ اور بالائی اور زیریں گوشوں کے مابین خط کھینچے جائیں تو یہ دونوں خط عین اس مقام پر قطع ہوں گے جہاں ہرم اعظم واقع ہے

جس مقام پر ہرم اعظم واقع ہے وہاں سے تقریباً ۳۰ درجہ عرض البلد شمالی کا خط گذرتا ہے۔ گویا وہ خط استوار اور قطب شمالی کے درمیان ایک ثلث فاصلہ پر واقع ہے۔ ہرم اعظم کے اطراف یا چاروں پہلو بالکل صحیح شمال، جنوب، مشرق و مغرب کی طرف واقع ہیں اور انھیں اسقدر صحت کے ساتھ تعمیر کیا گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ لہذا کرہ ارض کا خط محور براہِ راست اس جگہ کے نیچے سے گزرتا ہے۔ جہاں بادشاہ کا کمرہ ہے۔ ہرم اعظم ایک صاف اور ہموار شدہ سنگلاخ زمین کی سطح پر تعمیر کیا گیا ہے۔ جو غالباً ریگ صحرا دور کرنے سے نکالی گئی ہوگی۔ ہرم اعظم کے اطراف اس کی چوٹی سے ۵۱ درجہ کا زاویہ بناتے ہیں۔ اس کی بلندی ۴۸۱ فٹ ہے۔ اور ٹھوس پتھروں کا بنا ہوا ہے۔ جس کے اندر بہت سے پوشیدہ کمرے ہیں۔ اور ان کمروں تک ڈھلوان راستے جاتے ہیں۔ ہرم اعظم کے جانب شمال اندر داخل ہونے کا صرف ایک راستہ ہے۔ جو چار فٹ کے قریب اونچا اور تین فٹ پانچ انچ سے کسی قدر زائد چوڑا ہے۔ یہ دروازہ سطح زمین سے پتھروں کی ساٹھویں تہ یا منزل پر واقع ہے۔ راستہ نیچے کی طرف کچھ دور تک ڈھلوان چلا گیا ہے۔ بعد ازاں اس کے دو حصے ہو جاتے ہیں۔ ایک راستہ اوپر کی طرف چلا جاتا ہے اور دوسرا مسلسل طور پر زمین دوز ایوان میں پہونچتا ہے جو سطح زمین سے بہت نیچا اور بالکل صحیح طور پر ہرم کی چوٹی کے نیچے واقع ہے اوپر جانے والا راستہ کچھ دور کے بعد ایک عظیم الشان چھتہ یا "گرانڈ گیلری" میں پہونچتا ہے۔ جو اٹھائیس فٹ بلند اور ۱۵۰ فٹ طویل ہے۔ چھتہ کے سرے پر ایک چھوٹا سا راستہ اور ہے جو گیلری میں سے گذر کر ایک تنگ دروازہ تک پہونچتا ہے۔ یہ دروازہ ایوان شاہی کا ہے۔ جس میں بادشاہ کا تابوت رکھا گیا تھا۔ اسی ایوان کے قریب سے دو سوراخ بطور روشندان ہرم کی بیرونی سطح تک گئے ہیں؛ ایوان شاہی کے اوپر بعض خالی مقامات ہیں۔ اور ان میں جو سب سے اونچا مقام ہے اوس پر دو بڑے بڑے پتھر رکھے ہیں جن کا مقصد غالباً یہ ہے کہ ایوان شاہی کے اوپر جو پتھروں کا زبردست بوجھ ہے اس کو سہاریں۔ گرانڈ گیلری کے عین نیچے شمالاً جنوباً ایک افقی سیدھا راستہ اور ہے جو اس کمرہ میں داخل ہوتا ہے جو ملکہ کا ایوان کہلاتا ہے۔ (نقشہ دیکھنے سے یہ تفصیلات بخوبی سمجھ میں آجائیں گی۔) اس سیدھے راستہ کے شروع میں ایک اور ناہموار سرنگ ہے جو اس مقام پر پہونچتی ہے جسے زمین دوز "غار" کہتے ہیں۔ اس غار سے ایک سرنگ سب سے نیچے والے ایوان میں اترتی ہے۔ اور اسی ایوان میں راستہ کے دہانہ سے ایک سیدھا سلامی دار راستہ بھی پایا جاتا ہے۔ اس وقت تک ہرم اعظم کے اندر جو کمرے معلوم ہوے ہیں وہ یہی ہیں۔ آگے چل کر ہم ان کمروں اور خود ہرم اعظم کے متعلق جو پیمائشیں اور معلومات درج کریں گے وہ بہت دلچسپ ہوگی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ خفیہ راستے اور ایوان کیونکر معلوم ہوئے اور کس نے معلوم کئے؟ ہم جانتے ہیں کہ ہرم اعظم جب مکمل ہو گیا تھا تو اوس کو بند کر کے تمام راستے چھپا دئے گئے تھے۔ یہ گویا ولادت عیسیٰ سے صدیوں بلکہ ہزاروں برس پیشتر کا واقعہ ہے۔ اور یہ ہرم ہزاروں برس اسی طرح سربمہر رہا۔ اس کا اندرونی راز قدماء کو بھی معلوم نہ تھا۔ ابتدا میں ہرم اعظم کے اطراف پر ایک قسم کے سیمنٹ کی گچ کاری تھی۔ اور اس کے سب پہلو بالکل صاف اور چکنے تھے۔ مگر بعد میں یہ پلاسٹر دور کر دیا گیا اور اسے دیگر تعمیری کاموں میں لگا دیا گیا۔ اسی طرح ہرم کی چوٹی کے پتھر بھی اکھاڑ کر دوسری تعمیروں میں لگا دیے گئے۔ کیونکہ پہلے ہرم کی چوٹی نوکدار تھی۔ مگر اب اس کی سطح ۳۲ فٹ مربع کی ہے۔ جو میز کی طرح معلوم ہوتی ہے

خلیفہ المامون عباسی اور ہرم اعظم

اب ہم یہ بتاتے ہیں کہ ہرم اعظم کے خفیہ راستے اور کمرے کیونکر معلوم ہوئے۔ خلیفہ المامون بن ہارون الرشید پہلا شخص تھا جو ۸۲۰ء کے اوائل میں راستہ توڑ کر داخل ہوا۔ اس نے اپنے مزدوروں کو حکم دیا کہ وہ شمالی پہلو کے وسط میں توڑ کر راستہ بنائیں مگر چونکہ اس کا راستہ عین وسط میں نہیں بلکہ ۲۴ فٹ بلند جانب مشرق ہٹ کر بنایا گیا تھا۔ اس لئے ماموں کے کاریگروں کو انتہا سے زیادہ محنت کرنا پڑی۔ اور بالآخر وہ چلا اٹھے کہ اس عجیب و غریب ہرم کا کھودنا ان کے قابو سے باہر ہے مگر چونکہ ماموں عزم راسخ کر چکا تھا اس لئے مجبوراً کام جاری رہا لیکن اس قدر سست رفتاری کے ساتھ کہ چھ مہینے میں صرف سو فٹ کی سرنگ کھودی جا سکی اور راستہ کا پتہ پھر بھی نہ ملا۔ بعض کاریگروں کو ہرم اعظم کے متعلق یہ پرانی روایات یاد آئیں۔ کہ مصر کے کسی پرانے بادشاہ نے یہ کہا تھا کہ اگر وہ مصر کی تمام دولت بھی اس کام میں لگا دے گا۔ تب بھی وہ کسی ہرم کو توڑ نہیں سکے گا۔ لیکن اسی اثناء میں ان سے چند فٹ ایک طرف کسی خالی جگہ میں کوئی بڑا پتھر گرا۔ بس آواز کا سننا تھا کہ ان کی ہمتیں بندھ گئیں۔ اور انھوں نے نہایت سرگرمی کے ساتھ اپنی سرنگ اسی طرف کو دوڑانا شروع کر دی جس طرف سے پتھر گرنے کی آواز سنائی دی تھی۔ اور آخرکار ایک خالی مقام تک اپنی سرنگ پہونچا ہی دی۔ یہ مقام حد درجہ تاریک اور دشوار گذار تھا۔ یہ ایک سلامی دار راستہ تھا جو انھوں نے معلوم کیا تھا۔ اور اسی کے اندر چھت سے اکھڑ کر پتھر گرا تھا۔ اسی واقعہ سے یہ بات ثابت ہو گئی۔ کہ چھت میں جہاں سے وہ پتھر گرا تھا، ایک دوسرا راستہ شروع ہو کر ہرم اعظم کے اندر گیا ہے

چونکہ ان لوگوں کو یقین تھا کہ ہرم کے اندر بے شمار خزانہ بھرا پڑا ہے اس لئے وہ لوگ بے صبری کے ساتھ آگے بڑھے یہ راستہ صرف ۴۷ انچ اونچا اور ۴۱ انچ چوڑا تھا۔ اسی کے اندر رینگتے ہوئے وہ لوگ چلتے رہے اور بالآخر ایک طویل اور بلند چھتہ کے اندر ہو گئے جہاں شب دیجور کی سی تاریکی اور قبر کا سا سکوت طاری تھا۔ یہ راستہ یا چھتہ ان لوگوں کو اس سنگین قیدخانہ کے اور اندر لے گیا۔ جب وہ لوگ اس "گرانڈ گیلری" کے اندر داخل ہو گئے تو انھوں نے اپنے داہنی طرف ایک نہایت عمیق کنوں کا منھ دیکھا جو ۱۴۰ فٹ گہرا تھا۔ مگر اس سے آگے اسی چھتہ کا سلسلہ برابر چلا گیا تھا۔ چنانچہ وہ لوگ اس لالچ میں اور آگے بڑھتے چلے گئے کہ شاہان قدیم کا بے شمار خزانہ ان کے ہاتھ آ جائے گا۔ یہ راستہ تنگ ضرور تھا کیونکہ صرف ۶ فٹ چوڑا تھا۔

اور زمین پر صرف تین ہی فٹ چوڑا تھا۔ مگر اس کی بلندی ۲۸ فٹ تھی اور اس کی دیواروں کی سطح سنگ مرمر کی طرح صاف چکنی اور چمکدار تھی۔

ان لوگوں نے یقین کر لیا کہ واقعی دفینہ کا راستہ یہی ہے۔ الغرض وہ اس راستہ پر جو ۲۶ درجہ کا زاویہ بناتا ہے۔ آگے بڑھتے رہے۔ اور ڈیڑھ سو فٹ اور آگے پہونچ گئے۔ اس کے بعد سامنے ایک تین فٹ بلند سیڑھی راہ میں حائل ہوئی۔ اسکے بعد ایک تنگ دروازہ ملا جس کے اندر انھیں گردنیں جھکا کر گھسنا پڑا۔ پھر ایک اور تنگ راستہ ملا، بعد ازاں سنگ سرخ کا ایک اور تنگ دروازہ ملا۔ لیکن اس کے بعد وہ ایوان شاہی کے اندر داخل ہوگئے۔ اور یہی وہ منزل تھی جس کے لئے یہ تمام سر بفلک اور عجیب و غریب عمارت تعمیر کی گئی تھی۔

ایوان شاہی میں ان لوگوں نے کیا دیکھا ؟ صرف ایک شاندار کمرہ۔ ۳۴ فٹ طویل اور ۱۷ فٹ عریض اور ۱۹ فٹ بلند۔ جو صاف اور چمکدار سنگ سرخ کا بنا ہوا تھا۔ اس کے تمام پتھر بالکل چوکور اور پالش شدہ تھے۔ جو حد درجہ خوبصورتی کے ساتھ نصب کئے گئے تھے۔ مگر اس کے اندر خزانہ کا کہیں وجود نہ تھا۔

جب یہ خبر خلیفہ مامون الرشید کو ملی تو وہ حیران و ششدر رہ گیا۔ وہ بھی اپنے کاریگروں اور مزدوروں کی مدد سے ایوان شاہی تک پہونچ گیا تھا۔ مگر وہاں اس کو ایک تابوت کے سوائے کچھ بھی نہ نظر آیا۔

فی الحقیقت یہ دنیا کے محیر العقول اسرار میں سے ہے کہ آخر اس فرعون مصر کی لاش کہاں گئی جس کے لئے یہ تابوت بنایا گیا تھا اور جو اس سنگین مقبرہ میں اسقدر حفاظت کے ساتھ رکھی گئی تھی۔ یہ باور کرنے کی ہر وجہ موجود ہے کہ فرعون کی حنوط شدہ لاش ضرور اس تابوت کے اندر رکھی گئی تھی۔ اور بعد ازاں تمام اندرونی و بیرونی راستے پوری طرح احتیاط کے ساتھ سربمہر کر دیے گئے تھے۔ کیونکہ اگر فرعون کی حنوط شدہ لاش تابوت میں نہ رکھی گئی ہوتی تو پھر راستوں کے بند کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ مگر جب مامون کے لوگ کمرہ میں داخل ہوئے تو انھوں نے فرعون کی لاش کو غائب پایا اور اسی کے ساتھ تابوت کا ڈھکنا بھی۔ یہ چیزیں کیا ہوئیں یا ان کو کون لے گیا؟ یہ راز آج تک حل نہیں ہوا۔

مغربی مستشرقین

جب ۸۲۰ء میں خلیفہ المامون باللہ عباسی کے کاریگروں نے ہرم اعظم کا پہلو توڑ کر راستہ بنایا اس وقت سے گذشتہ صدی کے آغاز تک ہرم اعظم کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہا۔ لیکن ۱۶۳۷ء میں آکسفورڈ کے مشہور ماہر فلکیات پروفیسر جان گریوس نے اس کی سیر کی اور اندرونی و بیرونی حصوں کے بہت سے مقامات کی پیمائشیں لیں۔ اس کے بعد مسٹر جان ٹیلر (ولادت ۱۷۸۱ء وفات ۱۸۶۴ء) نے آکر دیکھا اور پیمائشیں لے کر بہت سے نظریے قائم کئے جن کی بعد میں پروفیسر پیازی اسمائتھ نے بہت سی تفصیلات بیان کیں۔ ۱۸۳۷ء میں کرنل ہاورڈ وائس نے بھی اس کی بہت کچھ دیکھ بھال کی اور یہی پہلا شخص تھا جس نے وہ دونوں سوراخ دریافت کئے جنھیں روشندان کہتے ہیں اور جو ایوان شاہی کے اطراف سے نکل کر ہرم کے باہر تک گئے ہیں۔ اور اسی شخص نے وہ خالی کمرے معلوم کئے جو ایوان شاہی

کی چھت بنتے ہوئے چلے گئے ہیں۔ اور جن کی تعمیر کا مقصد غالباً یہ تھا کہ اوپر کے حصّہ کا بوجھ سہار سکیں۔

یقیناً دنیا پروفیسر پیازی اسمائتھ کی ممنون ہے جن کی بدولت ہرم .... اعظم سے عوام کو اسقدر دلچسپی پیدا ہوئی۔ کیونکہ یہی وہ پہلا شخص تھا جس نے نہایت محنت اور احتیاط سے اس تعمیر کے ہر حصّہ کی تفصیل وار پیمایش کی۔ مگر افسوس ہے کہ پروفیسر مذہبی خیال کے آدمی تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنے بیانات میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ ہرم اعظم ایک "الہامی تعمیر" ہے۔ اور یہ عظیم الشان عمارت خداوند تعالیٰ کے قادر مطلق ہونے کی ایک ابدی آیۃ ہے جو بذریعہ الہام انسان پر نازل ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب نے اپنا یہ قول ہرم کی پیمائشوں پر مبنی کیا۔ جن سے ان کے نزدیک یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ "بانیان ہرم اعظم نے اپنے علم سے زیادہ عمارت بنائی"۔ پروفیسر صاحب نے یہ بات بھی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کہ ہرم اعظم فرانسیسی پیمانۂ عشری پر نہیں بلکہ انگریزی پیمانۂ فٹ اور انچ کے حساب سے تعمیر کیا گیا ہے۔ پروفیسر صاحب کی پیمائشیں واقعی حیرت انگیز ہیں۔

بعض دلچسپ اعداد و شمار

دنیا جانتی ہے کہ دائرہ کے قطر اور اس کے محیط میں جو نسبت ہے اسے یونانی حرف "پائی" π سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ کوئی صحیح عدد نہیں ہے۔ بلکہ اعشاریہ کی پانچ حد تک جو عموماً تمام کاموں کے لئے ٹھیک سمجھا جاتا ہے۔ اس کی قیمت اعدادی ۳٫۱۴۱۵۹ ہے۔ لیکن اس کی قیمت لاانتہا مقامات اعشاریہ تک نکالی جاسکتی ہے۔ ۱۸۷۳ء میں مسٹر شینکس نے اس کی قیمت اعدادی سات سو مقامات اعشاریہ تک نکالی تھی۔ یہی باعث ہے یعنی چونکہ ہم کو "پائی π" کی صحیح عددی قیمت معلوم نہیں اس لئے دائرہ کو مربع نہیں بنایا جاسکتا۔

اب ملاحظہ فرمائیے کہ ہرم اعظم کے متعلق ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس کی اصلی اونچائی کو اس کے قاعدہ کے دوگنے سے وہی نسبت تھی جو دائرہ اور قطر کے درمیان ہوتی ہے۔ یعنی "پائی π" کی بالکل صحیح عددی قیمت۔ اس بات سے یہ نتیجہ نکالا گیا تھا کہ ہرم اعظم کے تعمیر کرنے والے علم المساحت کے اس مسئلہ سے بخوبی واقف تھے۔ اور گویا انھوں نے "پائی π" کی قیمت عملاً حل کردی تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ایک سال ۳۶۵ دن سے کسی قدر زیادہ کا ہوتا ہے۔ وقت کو پورا کرنے کے لئے ہر چوتھے سال ایک دن بڑھا دیا جاتا ہے۔ اور وہ سال "سال کبیسہ" کہلاتا ہے میں ہر سال ۳۶۵٫۲۴۲۲ دن اور اعشاریہ کے لاانتہا مقامات ہوتے ہیں۔ اور ہر سال کبیسہ میں ۳۶۶ دن ہوتے ہیں۔ اب خیال فرمائیے کہ ہرم اعظم کا جو مربع قاعدہ ہے اس کی ہر طرف کی پیمایش یا لمبائی کو اگر ۳۶۶ حصوں میں تقسیم کیا جائے تو ہر حصّہ لمبائی میں کرۂ ارض کے نصف محور کا ۱/ایک لاکھ واں حصّہ کے قریب یا ۲۵ انچ انگریزی کے قریب ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہرم اعظم کا جو انجنیر تھا اس نے اس کے قاعدہ کی بنیاد رکھتے ہوئے ایک ایسا پیمانہ استعمال کیا ہوگا جو طول میں ۲۵ انچ لمبا تھا۔ اور اسوقت

اس کے ذہن میں سال کے دن اور اس کی کسر ہوگی۔ اس طرح گویا اس نے اس پیمانہ کے ذریعہ سے ہرم اعظم کے قاعدہ کی ہر سمت سال کے دلوں پر شمار کی تھی۔ اور یہ پیمانہ (یعنی ۲۵ انچ انگریزی) کرۂ ارض کے نصف محور کا ایک لاکھ حصہ ہے، اسلئے اگر اسے ۲۴۲۲، ۳۶۵ (سال شمسی کے دلوں کی تعداد) سے ضرب دیا جائے تو ہرم اعظم کے ربع قاعدہ کی ہر طرف کی صحیح پیمائش نکل آئے گی۔ اسی قسم کے واقعات سے مسز نیلر اور اسمائتھ نے یہ نتیجہ نکالا کہ تعمیر ہرم اعظم میں فٹ اور انچ کے پیمانہ سے کام لیا گیا تھا۔ پرانے مصری "ہاتھ" کے پیمانہ سے کام نہیں لیا گیا تھا جو اندازاً ۲۰۶۷ انچ انگریزی کا ہوتا ہے۔ درحقیقت ہرم اعظم کی تعمیر کا پیمانہ وہ تھا جسے "ہرمی انچ" کہتے ہیں۔ جو انگریزی انچ سے خفیف سا مختلف ہے۔ مگر عملی کاموں کے لئے قریب قریب دونوں برابر ہیں۔ لہذا انگریزی انچوں کے تمام مضروب "ہرمی انچوں" کے مضروب ہیں۔ یہ امر مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات واقعی دلچسپ ہے کہ چونکہ ہرم کے قاعدہ میں چار ضلع ہیں۔ اس لئے ان سب کی مجموعی لمبائی ۳۶۵۲۴ ہرمی انچ ہوتی ہے یعنی تقریباً سو انچ فی یوم۔

مسٹر پیٹری (Petrie) نے یہ بھی دکھایا ہے کہ اگر ۵۸۱۳ ہرمی انچوں کو انگریزی انچوں کی صورت میں منتقل کیا جائے اور انھیں ۱۰۹ میں ضرب دے کر ان انچوں کے میل بنائے جائیں تو ہمیں کرۂ ارض اور آفتاب کے درمیان کا صحیح فاصلہ معلوم ہو جاتا ہے۔ یعنی تخمیناً نو کروڑ ۲۰ لاکھ میل۔ اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ہرم اعظم کے تعمیر کرنے والوں کو یہ بھی علم تھا کہ کرۂ ارض اور ہمارے مرکزی منبع نور کے درمیان صحیح طور پر کتنا فاصلہ ہے۔

اسی قسم کے دیگر واقعات سے جو ہرم اعظم کے بیرونی حصص کی پیمائش پر مبنی ہیں یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ہرم اعظم کی تعمیر الہامی طور پر ہوئی تھی۔ اور پھر ہرم کے اندرونی راستوں اور خفیہ ایوانوں کی مختلف پیمائشیں کر کے اس خیال کی مزید توثیق کی گئی۔

مسٹر جوزف اے سیس (Joseph A. Seiss) نے اپنی کتاب "معجزہ سنگین" میں بعض اہم پیمائشیں درج کی ہیں مثلاً :-

اگر ہم ایوان شاہی کی لمبائی ۴۱۲،۱۳۲ انچ لیں اور اسے ایک دائرہ کا قطر سمجھیں اور پھر اس دائرہ کا رقبہ نکال کر اس رقبہ کو مربع کی صورت میں منتقل کریں تو اس طرح ہرم اعظم کا صحیح قاعدہ نکل آئے گا۔ اور قاعدہ کے ہر ضلع میں اتنے ہی "ہرمی ہاتھ" ہوں گے جتنے سال بھر میں دن ہوتے ہیں۔

پھر اسی عدد کو کسی مربع کا ایک ضلع فرض کیجئے۔ اور اس مربع کا رقبہ نکالئے۔ بعد ازاں اس رقبہ کو دائرہ کی صورت میں منتقل کیجئے تو اس دائرہ کا جو نیم قطر ہوگا۔ اس کی لمبائی اتنے ہی "ہرمی ہاتھ" ہوگی جتنی ہرم کی اونچائی ہے۔ علاوہ ازیں اگر ایوان شاہی میں اس کی شمالی یا جنوبی دیوار کے پتھروں کا پورا دَور لیا جائے۔ اور اسے ایوان کی لمبائی سے تقسیم کر دیا جائے تو "پائی π" یعنی $\frac{22}{7}$ حاصل ہوگا۔ اور گرانڈ گیلری اور ایوان شاہی کے درمیان جو ایک اور عقبی کمرہ ہے

اس کے بھی عرض وطول اور دیگر پیمائشوں میں اسی طرح "پائی" $\frac{22}{7}$ کا استعمال پایا جاتا ہے - علاوہ ازیں اگر اس عقبی کمرہ کے فرش کی پوری لمبائی کو اگر $\frac{22}{7}$ سے ضرب دیا جائے تو سال کے پورے دنوں کی تعداد نکل آتی ہے - اس عقبی کمرہ میں جو پتھر کا پردہ ہے اسکو اگر صاف کناروں تک ناپا جائے تو اس کی پیمائش π ۱۰۰۰۰ یعنی $\frac{22}{7}$ × ۱۰۰۰۰ نکلتی ہے۔
اسی طرح ملکہ کے ایوان میں جو طاق مشرقی دیوار میں ہے اگر اس کی اونچائی کو $\frac{22}{7}$ × ۱۰ میں ضرب دیا جائے تو ہرم اعظم کے قاعدہ کا ایک ضلع نکل آتا ہے۔ اگر ملکہ کے ایوان کی آخری دیوار کی اونچائی کو دس میں ضرب دیا جائے اور پھر اس کا جذر نکالا جائے اور پھر اسے طاق کی اونچائی سے تقسیم کر دیا جائے تو $\frac{22}{7}$ نکل آتا ہے - پھر اگر پہلے سلامی دار راستہ کی لمبائی لی جائے۔ اور اس میں پڑے حصہ کی لمبائی جمع کر دی جائے۔ یا پورے سلامی دار راستہ کی لمبائی کو $\frac{22}{7}$ سے تقسیم کیا جائے۔ تو داخلہ کے راستہ کی اس قدر لمبائی نکل آتی ہے جو دہانہ سے لگا کر پہلے چڑھنے والے راستہ تک ہے -

ہرم اعظم کی تعمیر میں ایک اور بات دیکھنے کے قابل ہے یعنی اس میں سنگین چوکوں کی چھتیسویں منزل کی موٹائی اوپر یا نیچے والی منزلوں کی اونچائی سے دوگنی ہے - اور اسی چھتیسویں منزل کا قاعدہ عقبی کمرہ کی اونچائی سے دس گنا ہے - اس عمارت کے عمودی مرکز کا فاصلہ اس بلندی کے دونوں اطراف کے قریب ترین نقطہ تک اگر دس سے تقسیم کیا جائے تو ایک سال کے دنوں کی تعداد نکل آتی ہے۔ اور اگر اسی فاصلہ کو اس نقطہ کی عمودی بلندی سے تقسیم کیا جائے تو $\frac{22}{7}$ یعنی دائرہ کے محیط اور قطر کی نسبت نکل آتی ہے۔

اسی طرح بڑے صندوق میں بھی وہی $\frac{22}{7}$ موجود ہے - صندوق کی اونچائی اور اس کی لمبائی میں وہی نسبت ہے جو ایک اور $\frac{22}{7}$ میں ہے۔ اگر صندوق کی گہرائی کو اس کی ایک لمبی طرف کے رقبہ سے ضرب دیا جائے تو $\frac{22}{7}$ ہوتا ہے۔
یہی حال ہرم اعظم کے بعض بڑے بڑے اندرونی حصص ایوان شاہی اور صندوق کا ہے - ہر چیز کی صورت ایک ہی اصول پر قایم کی گئی ہے یعنی اگر دو بڑی طرفوں کی لمبائی جمع کر کے دیکھا جائے تو وہ مجموعہ تیسری طرف کی لمبائی کا $\frac{22}{7}$ گنا ہوگا۔ مثلاً ہرم اعظم کی لمبائی اور چوڑائی اس کی اونچائی اور $\frac{22}{7}$ کا حاصل ضرب ہے۔ ایوان شاہی کی لمبائی اور چوڑائی کا مجموعہ اس کی اونچائی اور $\frac{22}{7}$ کا حاصل ضرب ہے - اور صندوق کی لمبائی اور چوڑائی کا مجموعہ اوس کی اونچائی اور $\frac{22}{7}$ کا حاصل ضرب ہے

ہرم اعظم کے حجم اور وزن کے متعلق بھی بہت سے حساب لگائے گئے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ہرم کے اندر ۹۵ لاکھ ہاتھ (مکعب) مسالہ پایا جاتا ہے (ہر ہاتھ کی لمبائی ۲۵ اِنچ ہے) ہرم کی تعمیر میں مختلف قسم کا مسالہ اور سامان صرف ہوا ہے جن کا نسبتی وزن مختلف ہے۔ بہرحال ان جملہ امور کو مدنظر رکھتے ہوئے اندازاً حساب لگایا گیا ہے کہ ہرم اعظم کا کل وزن ۵۲۷۳۸۵۴ ٹن ہے (ایک ٹن ۲۸ من کے قریب ہوتا ہے)
ہرم کے اندر کا ٹمپریچر کم و بیش یکساں قائم رہتا ہے۔ اور بیرونی ہوا کے ٹمپریچر سے بہت زیادہ کم ہے۔ مگر باینہمہ ہرم

کے اندر سخت گرمی ہوتی ہے۔ مسٹر ایل۔ ڈاؤ کوینگٹن نے ایک روشندان کی سُرنگ کو جو ایوان شاہی سے نکلی ہے صاف کرایا تھا۔ اس سے ہرم کا ٹمپریچر مستقل طور پر کئی درجہ کم ہو گیا ہے۔ اس کے متعلق مصر کے عربوں میں یہ روایت ہے کہ اگر دوسرا روشندان بھی اسی طرح صاف کر دیا جائے تو ہوا کی آمد و رفت سے رباب جیسا نغمہ پیدا ہونے لگے گا۔ اور اندرونی ٹمپریچر اور بھی زیادہ سرد ہو جائے گا۔ لیکن تاوقتیکہ روشندان کی سُرنگ صاف نہ ہو اس قول کی تصدیق نہیں کی جا سکتی۔

تعمیرِ ہرم کی وجہ یا غرض

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہرم اعظم کیوں تعمیر کیا گیا تھا؟ کیا یہ عظیم الشان تعمیر محض ایک مقبرہ تھی؟ اگر یہی مقصد تھا تو پھر اس کے اندر یہ گرانڈ گیلری اور دیگر راستے اور ایوان کیوں بنائے گئے؟ کیا ان کا کوئی اور مقصد تھا؟ اگر تھا تو وہ کیا تھا؟ ان سوالات کے لوگوں نے مختلف جوابات دیے ہیں۔ جن کا مختصر خلاصہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

اہرام اعظم کی تعمیر کے بارہ میں جو مختلف نظریے گزشتہ زمانہ میں قایم کئے گئے تھے۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں :—

(۱) اہرام مصر کی تعمیر کا مقصد یہ ہے کہ ریگستان کی طرف سے جو ریت اُڑ کر آئے اس کو روکا جائے۔ تاکہ قاہرہ اور رودِ نیل کی دوسری بستیاں محفوظ رہیں

(۲) ان کی تعمیر اس غرض سے ہوئی تھی کہ اس زمانہ کے علمار دین کی جو پُر اسرار تعلیم تھی وہ محفوظ رہے۔ اور اگر دوسرا طوفان نوح آئے تو غرقاب نہ ہو

(۳) اہرام کی تعمیر کا مقصد یہ تھا کہ ان کے اندر عمدہ فصلوں کے زمانہ میں غلّہ بھر لیا جائے تاکہ خشک سالی میں کام آئے

(۴) اہرام کی تعمیر کا مقصد محض یہ تھا کہ فراعنۂ مصر کی شوکت و عظمت اور قدیم مصر کے علم و ہنر کی نمایش کیجائے

(۵) تعمیر اہرام کی غرض و غایت یہ تھی کہ انھیں مصری اوزان اور پیمانوں کا معیار بنایا جائے

(۶) ان عظیم الشان عمارتوں کی تعمیر بذریعۂ الہام ہوئی تھی۔ اور ان کی تعمیر سے اہل مصر کی زبردست روحانی قوتوں کا اظہار مقصود تھا

بہر حال ایک مقصد تو اہرام کی تعمیر کا ضرور ظاہر ہے یعنی یہ کہ وہ شاہی مقبرے تھے۔ جس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ ایوان شاہی میں ایک تابوت موجود ہے گو اس کے اندر سے لاش اور اوس کے اوپر کا ڈھکنا غائب ہیں۔ ملک خوفو فرعون مصر کا مقصد یہ تھا کہ اس کی لاش ان پتھروں کے عظیم الشان حجرہ میں ہمیشہ تک محفوظ رہے۔ اسی لئے اُس نے اپنی عظمت و جلالت کے مطابق یہ عظیم الشان مقبرہ تیار کرایا تھا۔ جس ہوشیاری اور سلیقہ کے ساتھ ہرم پر

داخل ہونے کے مختلف راستے مخفی رکھے گئے تھے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاش اور ان خزائن کو جو اس کے ساتھ رکھے گئے پوری طرح محفوظ رکھنا مقصود تھا۔ حال ہی میں مقبرۂ توت انخ آمن فرعون مصر کے مقبرہ سے جسقدر بیش بہا خزائن برآمد ہوئے ہیں۔ ان سے اس امر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ملک خوفو فرعون مصر کی لاش کے ساتھ کس قدر خزائن مقبرہ میں رکھے گئے ہوں گے۔ یہ خزائن یقیناً ایوان شاہی اور عقبی کمرہ میں محفوظ کرکے ہرم میں داخل ہونے کے تمام راستے پوشیدہ اور سربمہر کئے گئے ہوں گے۔ ممکن ہے کہ ملکہ کے ایوان میں بھی خزائن ہوں۔ مگر افسوس ہے کہ وہ بیش بہا خزائن قطعی ڈاکوؤں یا عرب چوروں کی دستبرد سے محفوظ نہ رہے۔ الغرض یہ تو ثابت ہے کہ تعمیر ہرم کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ مقبرۂ شاہی کا کام دے۔ لیکن اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اندر جو اٹھائیس فٹ اونچی عظیم الشان گیلری بنی ہوئی ہے اس کا مقصد کیا تھا؟

اس کے متعلق یہ نظریہ قائم کیا گیا ہے کہ مقبرہ کے علاوہ ہرم اعظم کی تعمیر کا مقصد یہ بھی تھا کہ اسے ایک عظیم الشان رصدگاہ بنایا جائے۔ اور اس گرانڈ گیلری کا مقصد مشاہدۂ فلکیات تھا۔ یہ گویا ہماری عظیم الجثہ دوربینوں کی طرح ٹھوس پتھروں سے بنائی ہوئی ایک دوربین تھی۔ جس میں شیشے (　　　) نہیں تھے۔ الغرض ایوان شاہی کی حد تک ہرم اعظم کی تعمیر اسی نظریہ پر ہوئی تھی۔ ایوان شاہی گرانڈ گیلری پر واقع ہے۔ اس کے بعد ملک خوفو فرعون مصر کی وفات تک تعمیر کا کام بند کر دیا گیا۔ اور اس کے اوپر کی سطح ایک ہموار میز کی طرح رہ گئی۔ بعد ازاں جب فرعون خوفو کا انتقال ہوگیا۔ تو ایوان شاہی میں اس کی لاش رکھ کر ہرم اعظم کے بالائی حصہ کی تکمیل کر دی گئی۔ اس خیال کے اثبات کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں۔

نظریۂ رصدگاہ کے اثبات میں شہادتیں

ہرم اعظم خط عرض البلد شمالی درجہ ۳۰ کے بہت قریب تعمیر کیا گیا ہے۔ یا بالفاظ دیگر اس عرض البلد پر جہاں سے آسمان کا صحیح قطب خطِ افق سے نقطۂ سمت الراس تک کل فاصلہ کے ایک ثلث پر واقع ہے۔ یعنی جہاں ٹھیک فصل بہار یا فصل خزاں کے زمانہ میں آفتاب نصف النہار اس فاصلہ سے دو تہائی دوری پر ہوتا ہے جو خط اُفق اور نقطۂ سمت الراس کے درمیان ہے۔ ایسے رصد خانہ میں جس کا ٹھیک محل وقوع یہ ہو بعض حسابات اور اقلیدسی اشکال جن کی مسائل فلکیات میں ضرورت پڑتی ہے بہت زیادہ آسان ہو جاتے ہیں۔ نہایت تحقیق و تدقیق کے بعد اس امر کی تصدیق کی جاچکی ہے کہ ہرم اعظم اس مقام سے جو صحیح طور پر منتخب کیا جاتا صرف چند گز ہٹکر تعمیر کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ کے لوگوں کے آلات پیمائش اور طریقہ زیادہ صحیح نہ تھے۔ انھوں نے اپنی رہنمائی کے لئے صرف ایک خاص ستارہ منتخب کیا ہوگا یعنی قطب ستارہ۔ عمارت کا محل وقوع منتخب کرنے کے بعد اس کی وضع قطع کا مسئلہ پیدا ہوا اور ہم بیان کرچکے ہیں کہ ہرم اعظم کے چاروں رُخ صحیح شمال صحیح جنوب صحیح مشرق اور صحیح مغرب کی طرف واقع ہیں۔ اسقدر صحت حاصل کرنے کے لئے ٹھوس چٹان میں ایک لمبی اور سلامی دار سُرنگ کھود کر قاعدۂ ہرم کا بنیادی خط قائم کیا گیا ہوگا۔ چنانچہ ایسی سرنگ موجود ہے جو زمین دوز کمرہ کے اندر اُترتی ہے۔ جب اس طرح پوری صحت کے ساتھ سمت شمال معلوم کر لی گئی تو عمارت کی

وضع قطع اور تعمیر کا کام شروع کیا گیا۔ اور یہ صحت صرف علم نجوم کے ذریعہ سے حاصل کی گئی ہوگی۔ بعد ازاں سنگین منزلیں نہایت صحت اور خوش اسلوبی کے ساتھ تعمیر ہونا شروع ہوئیں۔ گرانڈ گیلری کا نقشہ تیار ہوکر وہ تعمیر کی گئی۔ اوّل اوّل ہرم اعظم صرف اس قدر تعمیر کیا گیا تھا جہاں تک ایوان شاہی موجود ہے۔ اب آیندہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس گرانڈ گیلری کا کیا راز ہے

گرانڈ گیلری کا راز

اس کے متعلق مشہور ماہر فلکیات رچارڈ اے پراکٹر تحریر فرماتے ہیں :-

" یہ امر یقینی ہے کہ جن لوگوں کو دُور بین کا کوئی علم حاصل نہ تھا۔ اور جو ہمارے زمانہ کے ماہرین فلکیات کی طرح صحت کے ساتھ سمتیں معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اس مقصد کے لئے یہی طریقہ رکھا ہوگا جو ہرم اعظم کی عمارت سے ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی انھوں نے ٹھوس چٹانوں میں طویل راستے نکالے اور جہاں ضرورت ہوئی معمولی انحراف شعاع کے ذریعہ سے خط نظر بدل دیا ...... اس خیال کی اسوقت اور بھی زیادہ وضاحت ہوگی جب ہم گرانڈ گیلری کے معاملہ پر غور کریں گے۔ کیونکہ ایک ماہر فلکیات کے نزدیک اس تعمیر کا سب سے زیادہ ہیئتی (Astronomical) حصہ یہی ہے۔ آپ اس مسئلہ پر کسی قدر غور فرمائیں کہ ہیئت داں جو ایک ہی وقت میں ماہر تعمیرات بھی ہو وہ اس شگاف یا سرنگ سلامی دار کو کیا شکل دیتا جس میں سے وہ اجرام سماوی کی نقل و حرکت دیکھ سکتا۔ ہیئت داں کی حیثیت سے تو وہ ایک بہت بلند مگر تنگ مقام پر بیٹھنا پسند کرتا مگر بحیثیت ایک ماہر تعمیرات کے وہ جانتا کہ وہ مقام بالکل عمودی نہیں ہو سکتا ...... گرانڈ گیلری کے عمودی سکشن یا کٹا ؤ کی صورت یہ ظاہر کرتی ہے کہ ہرم اعظم کے تعمیر کرنے والے میں ہیئت دانی اور فن تعمیر سے کمال آگاہی دونوں خوبیاں موجود تھیں۔ دیواروں کا ہر حصہ قطعی عمودی ہے، باینہمہ دیواریں بہ ہیئت مجموعی سلامی دار ہیں اگر ہم شروع ہی سے اس ہرم اعظم کا ہیئتی نقشہ نہ دیکھ پاتے اور ہم کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ اس قسم کے نقشہ کا تعلق علم ہیئت سے ہے، تو بھی ہم کو اس گرانڈ گیلری کی دوہری نوعیت سے صاف معلوم ہو جاتا کہ وہ مشاہدات فلکی کے لئے تعمیر کی گئی ہے۔ اور صرف ایک ہیئت داں کسی ماہر تعمیرات کے سامنے ایسا مسئلہ پیش کر سکتا تھا۔"

اگر یہ نظریہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ گرانڈ گیلری مشاہدات فلکی کے لئے تعمیر کی گئی تھی تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اسقدر سلامی دار گیلری میں جس کا فرش اسقدر چکنا اور جھکا ہوا ہے لوگ کس طرح بیٹھ کر مشاہدات فلکی کرتے ہوں گے؟ اس کا جواب وہ سنگین کنارے دے سکتے ہیں جو گیلری کے دونوں طرف بہت دور تک سلامی دار چلے گئے ہیں۔ یہ کنارے سلامی دار فرش سے مناسب بلندی پر واقع ہیں۔ اور اگر ان پر مضبوط چوبی تختے رکھ دیے جائیں تو ان تختوں پر بہت سے آدمی ایک دوسرے کے پیچھے بیٹھ کر مشاہدات فلکی کر سکتے ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے کی غلطیاں بھی معلوم کی جا سکتی ہیں۔ اس طرح ایک ہی وقت میں آدمی فلکیات کے متعلق آلات سے مسلح ہوکر مشاہدات فلکی کر سکتے ہیں۔

الغرض اس عظیم الشان رصدگاہ میں اجرام سماوی کی نقل و حرکت دیکھی جاسکتی تھی۔ اور علم ہیئت کے متعلق صحیح نتائج اخذ کئے جاسکتے تھے۔ رصدگاہ کا نظریہ ہم اس لئے صحیح تسلیم کرتے ہیں کہ ہرم اعظم کے تمام خفیہ راستوں اور گرانڈ گیلری کی جملہ تفصیلات کی تطبیق اسی نظریہ سے ہوتی ہے اور اگر یہ نظریہ تسلیم نہ کیا جائے تو بہت سی باتوں کی صحیح توجیہ و تاویل نہیں کی جاسکتی۔ لہٰذا ہرم اعظم کی تعمیر کا اوّل حصّہ تو رصدخانہ تھا۔ مگر بعد کو جب ملک خوفو کا انتقال ہوگیا تو اسی میں اس کا مقبرہ بھی بنا دیا گیا۔

علم احکام النجوم کا اثر

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ملک خوفو فرعون مصر کو مشاہدات فلکی سے ایسی کیا دلچسپی تھی جو یہ رصدخانہ تعمیر کیا گیا؟ اس کا ایک معقول جواب یہ ہے کہ اس زمانہ میں بھی آج کل کی طرح علم احکام النجوم یا جوتش پر زبردست عقیدہ رکھتے تھے۔ اس زمانہ کے جوتشیوں کا دعویٰ تھا کہ وہ نہ صرف اجرام سماوی کی نقل و حرکت کا مطلب سمجھتے ہیں بلکہ جو کچھ اثر ستاروں کی گردش کا حیات انسانی پر پڑتا ہے اس سے بھی واقف ہیں۔ ان لوگوں کا یہ دعویٰ نہیں تھا کہ وہ واقعی اجرام سماوی پر حکومت رکھتے ہیں۔ بلکہ وہ یہ کہتے تھے کہ ستاروں کی چال دیکھ کر وہ یہ بتا سکتے ہیں کہ اس کا حیات انسانی پر کیا نیک و بد اثر پڑے گا۔ اور بد اثر سے کیونکر بچ سکتے ہیں۔ ان کا یہ محض دعوےٰ ہی نہیں تھا بلکہ زمانۂ حال کے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کی طرح وہ اس عقیدہ پر ایمان بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ ملک خوفو فرعون مصر کا اعتقاد تھا کہ وہ اس رصدخانہ کے ذریعہ سے اجرام سماوی کی نقل و حرکت دیکھ کر مستقبل کے حالات معلوم کرسکتا ہے۔ اور یہ بھی جان سکتا ہے کہ دشمنوں پر کیونکر فتح حاصل ہو۔ اس لئے اس نے یہ عظیم الشان رصدخانہ تعمیر کرایا تاکہ اس کی سلطنت کے معاملات احکام سماوی کے مطابق انجام پذیر ہوں

دیگر اہرام

اس وقت مصر میں کم ازکم چھتیس ہرم اور بھی موجود ہیں۔ لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں جس کے اندر ہرم اعظم کی طرح راستے، خفیہ ایوان اور گیلریاں وغیرہ ہوں اور نہ ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی دلچسپی یا قدیم روایت متعلق ہے۔ انھیں معمولی مگر عظیم الشان مقبرہ سمجھنا چاہیئے۔ ان کے متعلق کوئی ثبوت ایسا نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ ان کی تعمیر کا مقصد مقبرہ کے علاوہ کچھ اور بھی تھا۔

سیزر و کلیوپیٹرا

(ڈرامہ برنارڈ شا)

(مسلسل)

موسیقار :- اونہہ۔ وہ تو صرف ایک کنیز ہے، وہ تو ایک کتے کی طرح سیکھتی ہے۔

کلیوپیٹرا :- اچھا تو میں بھی ایک کتے کی طرح سیکھوں گی کیونکہ وہ تم سے اچھا بجاتی ہے تم روزانہ ایک عشرہ تک مجھے سبق دیا کرو۔ (موسیقار جلدی سے کھڑا ہو کر آداب شاہانہ بجا لاتا ہے) اس کے بعد اگر میں کوئی غلط راگ بجاؤں تو تم کو درے لگائے جائیں گے اور اگر میں اس کثرت سے غلطیاں کروں کہ تازیانے لگانے کا موقع نہ رہے تو تم کو دریائے نیل میں ڈال دیا جائے گا۔ تاکہ گھڑیال نگل لیں۔ اس لڑکی کو ایک اشرفی دے کر ان سب کو رخصت کرو۔

موسیقار :- (بہت گھبرا کر) لیکن ایک سچے ماہر فن پر اس قدر دباؤ نہ ڈالنا چاہیئے۔

فتاتا :- (دھکا دیتے ہوئے) یہ کیا ہے ملکہ کو جواب دیتا ہے نکل باہر۔ کمبخت۔

(فتاتا اسے دھکے مار کر باہر کر دیتی ہے لڑکی اس کے پیچھے اپنا ساز لئے ہوئے جاتی ہے اور غلاموں اور عورتوں کا ایک قہقہہ ان کے پیچھے بلند ہوتا ہے)

کلیوپیٹرا :- کیا تم میں سے کوئی میرا دل بہلا سکتا ہے؟ کیا تم کو کوئی خبر یا کہانی یاد ہے؟

ایراس :- فتاتا ——

کلیوپیٹرا :- اونہہ۔ فتاتا، فتاتا، ہمیشہ فتاتا ہی کا ذکر رہتا ہے، کوئی نئی کہانی سناؤ۔

ایراس :- نہیں اس مرتبہ فتاتا بڑی خوش قسمت نکلی . . . .

(سب عورتیں ہنس پڑتی ہیں غلام چپ رہتے ہیں)

کلیوپیٹرا :- (غصہ ہو کر) تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ اس بربط نواز لڑکی کو کتنے سونے کے سکے دینے پڑیں گے۔؟

ایراس :- یہ ہم آسانی سے معلوم کر کے آپ کو بتا سکتے ہیں۔ (سب عورتیں ہنس پڑتی ہیں)

کلیوپیٹرا :- (غضبناک انداز سے) تم ہنس رہی ہو۔ لیکن میں کسی وقت بتا دوں گی کہ اسی طرح میری اطاعت کی جاتی چاہیئے؟ جیسے سیزر کی کی جاتی ہے

چارمیاں :- لمبی ناک والی (سب ہنس پڑتی ہیں)

کلیوپیٹرا :- (غصہ سے) خاموش اے چارمیاں! بیوقوف چھوٹی لڑکی نہ بن۔ کیا تجھے معلوم ہے کہ میں تم سب

کو کیوں اس قدر گستاخانہ گپ شپ کرنے دیتی ہوں
حالانکہ مجھے تمھارے ساتھ فتاتا کا سلوک کرنا چاہئے

چارمیاں: ۔ کیونکہ آپ ہر بات میں سیزر کی نقل کرنا چاہتی ہیں ۔ اور وہ ہر شخص کو اجازت دیتا ہے ۔ کہ جو چاہے کرے ۔

کلیوپیٹرا: نہیں ایک دن اس سے میں نے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے تو اس نے کہا "اپنی عورتوں کو باتیں کرنے دو ۔ ان کی گفتگو سے تم کو کوئی خاص بات معلوم ہو جائے گی ۔ مجھے ان سے کیا معلوم ہوگا ۔ ؟ میں نے پوچھا "ان کی حقیقت" اس نے جواب دیا ۔ اور ہاں جیسے ہی کہ اس نے یہ کہا تم نے اس کی آنکھیں دیکھی ہوں گی او کم ظرفو ۔ (سب ہنسنے لگتی ہیں ۔ وہ غصہ سے ایراس سے مخاطب ہوتی ہے) تم کس پر ہنس رہی ہو ؟ مجھپر یا سیزر پر ؟

ایراس: ۔ سیزر پر !

کلیوپیٹرا: ۔ اگر تم بیوقوف نہوتیں تو مجھ پر ہنستیں ۔ اور اگر تم بزدل نہ ہوتیں تو مجھ سے یہ کہتے ہوئے نہ ڈرتیں (فتاتا واپس آتی ہے) فتاتا یہ سب مجھ سے کہتی ہیں کہ تم نے پوتھینس کو میرے حضور میں پیش کرنے کے لئے رشوت لی ہے ۔

فتاتا: ۔ (قسم کھاکر) میں اپنے باپ کے دیوتاؤں کی قسم کھاکر کہتی ہوں ــــــ

کلیوپیٹرا: ۔ (قطع کلام کرتے ہوئے) کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ کسی جھوٹ بات کو چھپایا نہ کرو ۔ اگر میں تم کو اجازت دوں تو تم دن بھر اپنے باپ کے دیوتاؤں کو شہادت دینے کے لئے پکارتی رہوگی تاکہ وہ آکر تمھاری خوبیوں پر وعظ کہیں ، جاؤ رشوت لو ۔ اور پوتھینس کو حاضر کرو (فتاتا جواب دینا چاہتی ہے) جواب نہ دو جاؤ ۔

(فتاتا ۔ باہر چلی جاتی ہے کلیوپیٹرا اٹھ کھڑی ہوتی ہے ۔ اور کسی سوچ میں دروازہ سے کرسی تک ٹہلنے لگتی ہے ۔ سب کھڑے ہو جاتے ہیں)

ایراس: ۔ (اٹھتے ہوئے) ہوں ۔ میں چاہتی ہوں کہ سیزر روم واپس چلا جائے ۔

کلیوپیٹرا: ۔ (دھمکاکر) جب وہ جائے گا تو وہ دن تمھارے لئے قیامت کے برابر ہوگا ۔ تم کیوں یہ چاہتی ہو کہ وہ یہاں سے چلا جائے ؟

چارمیاں: ۔ کیونکہ وہ تم کو خوفناک حد تک عقلمند ، سنجیدہ ، عالم اور فلسفی بنائے دے رہا ہے اور اس عمر میں یہ ہمارے لئے بہت خطرناک ہے ۔

(سب عورتیں ہنس پڑتی ہیں)

کلیوپیٹرا: ۔ بس اب زبان بند کرو ۔

چارمیاں: ۔ (طنزیہ اعتراف سے) خوب ۔ خوب ہمکو سیزر کے ساتھ رہنے کی کوشش کرنی چاہئے ۔

(سب ہنستی ہیں کلیوپیٹرا زیادہ برہم ہو جاتی ہے ۔ فتاتا پوتھینس کو لے کر واپس آتی ہے)

فتاتا: ۔ (دروازہ پر سے) پوتھینس التجا کرتا ہے کہ ۔

کلیوپیٹرا: ۔ وہیں ۔ وہیں ۔ بس کافی ہے ۔ اس کو اندر آنے دو (وہ اپنی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور پوتھینس

سوا سب بیٹھ جاتی ہیں۔ پوتھینس کمرہ کے بیچ میں آتا ہے)

فتاتا :- (اپنی پہلی جگہ پر کھڑی ہو جاتی ہے) پوتھینس تمہارے باغی دوستوں کے تازہ واقعات کیا ہیں بیان کرو۔

پوتھینس :- (تمکنت سے) میں باغیوں کا دوست نہیں ہوں۔ اور ایک قیدی کو تازہ خبریں نہیں سنائی دیتیں۔

کلیوپیٹرا :- تم مجھ سے زیادہ قیدی نہیں ہو۔ اور نہ سیزر سے زیادہ۔ گذشتہ چھ مہینے تک ہم لوگ رہا یا کیوجہ سے محل میں محصور رہے۔ اب تم بالکل آزادانہ ساحل پر فوجوں کے ساتھ جا سکتے ہو۔

پوتھینس :- تم ابھی ایک بچہ ہو کلیوپیٹرا اور واقعات کو نہیں سمجھ سکتیں۔

(عورتیں ہنستی ہیں کلیوپیٹرا اُسے غور سے دیکھتی ہے)

چارمیاں :- پوتھینس مجھے معلوم ہوا کہ تم کو تازہ خبریں نہیں معلوم ؟

پوتھینس :- ہاں تم بتاؤ کیا ہے ؟

چارمیاں :- یہ کہ کلیوپیٹرا اب بالکل بچہ نہیں ہے کیا میں تم کو بتاؤں کہ بہت زیادہ معمر کس طرح بن سکتے ہیں ؟ اور بہت زیادہ عقلمند صرف ایک ہی دن میں کیونکر ہو سکتے ہیں۔

پوتھینس :- میں عقلمند بننے کو ترجیح دوں گا۔

چارمیاں :- اچھا تو روشن مینار کی چوٹی پر جاؤ۔ اور اپنے ساتھ کسی آدمی کو بھی لیتے جاؤ کہ وہ تمہارے سر کے بال پکڑ کر تم کو سمندر میں پھینک دے۔

(عورتیں قہقہہ مارتی ہیں)

کلیوپیٹرا :- وہ سچ کہتی ہے۔ پوتھینس اس کے بعد جب تم ساحل سے آلگوگے تو تمہارے دماغ سے بہت سے خیالات پریشاں رفع ہو جائیں گے۔

(عورتیں ہنستی ہیں کلیوپیٹرا کھڑی ہوتی ہے) جاؤ تم سب یہاں سے چلی جاؤ۔ میں پوتھینس سے خلوت میں گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ ان سب کو باہر نکال دو۔

فتاتا :- (وہ سب ہنستی ہوئی بھاگتی ہیں فتاتا ان کے جانیکے بعد دروازہ بند کر دیتی ہے) تم سب کس بات کی منتظر ہو ؟

فتاتا :- یہ مناسب نہیں ہے کہ ملکہ اکیلی ——

کلیوپیٹرا :- (قطع کلام کرتے ہوئے) معلوم ہوتا ہے۔ کہ فتاتا اب مجھے تمہاری قربانی تمہارے باپ کے دیوتاؤں پر کرنا پڑے گی تاکہ وہ تم کو بتائیں کہ میں مصر کی ملکہ ہوں۔

(وہ دروازہ بھیڑتی ہوئی چلی جاتی ہے۔)

کلیوپیٹرا :- (پھر بیٹھتے ہوئے) ہاں پوتھینس یہ بتاؤ کہ تم نے میرے پاس آنے کے لئے فتاتا کو رشوت کیوں دی ؟

پوتھینس :- (سنجیدگی سے اس کا مطالعہ کرتے ہوئے۔) کلیوپیٹرا یہ سچ ہے کہ تم بہت بدل گئی ہو۔

کلیوپیٹرا :- کیا تم روزانہ چھ مہینے تک سیزر سے گفتگو کر چکے ہو ؟ اگر کرو تو تم بھی تبدیل ہو جاؤ گے۔

پوتھینس :- یہ ایک عام بات ہے جو تم اس بے وقوف بڈھے سے کہہ رہی ہو۔

کلیوپیٹرا :- بیوقوف بنتا ہوا بیوقوف اکاش میں بھی

ایسی ہی ہوتی۔

پوتھینس :- تم چاہتی ہو کہ تم بے وقوف بنائی جائیں یہ کیوں ؟

کلیوپیٹرا :- جب میں بیوقوف تھی تو میرا جو دل چاہتا تھا کرتی تھی۔ سوائے اس وقت کے جب فتاتا مجھے پیٹتی تھی۔ اب جبکہ سیزر نے مجھے عقلمند بنا دیا ہے تو میری پسندیدگی اور ناپسندیدگی سے کسی کام کا تعلق ہی نہیں رہا کیونکہ اب میں وہی کرتی ہوں جو مجھے کرنا چاہئے۔ یہ عظمت ضرور ہے مگر مسرت نہیں۔ اگر سیزر چلا جائے تو مجھے توقع ہے کہ میں مصریوں پر حکومت کرسکوں گی۔ کیونکہ جو اہمیت سیزر کی میری نظروں میں ہے وہی میرے ارد گرد جمع رہنے والے بیوقوفوں میں میری ہے۔

پوتھینس :- (غور سے دیکھ کر) کلیوپیٹرا ممکن ہے کہ یہ جوانی کا غرور ہو۔

کلیوپیٹرا :- نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے،

پوتھینس :- (ہاں میں ہاں ملا کر) ممکن ہے ایسا ہی ہو۔

کلیوپیٹرا :- اچھا تو کہو تم مجھ سے کیا کہنے آئے تھے ؟

پوتھینس :- (پریشان ہو کر) میں! کچھ نہیں۔

کلیوپیٹرا :- کچھ نہیں !

پوتھینس :- بس صرف اپنی —— آزادی کے لئے التجا کرنے۔ اور کچھ نہیں۔

کلیوپیٹرا :- اس کے لئے تم کو سیزر کے حضور میں سر تسلیم خم کرنا تھا —— نہیں پوتھینس تم کسی اور تدبیر سے آئے ہو۔ جس کا انحصار کلیوپیٹرا پر ہے۔ اب کلیوپیٹرا ملکہ ہے اس لئے تمھاری تدبیر اب کارگر نہ ہوگی۔

پوتھینس :- (تعظیماً سر جھکا کر) ایسا ہی ہے۔

کلیوپیٹرا :- (مسرور ہو کر) بیشک

پوتھینس :- (غور سے آنکھیں کلیوپیٹرا پر جما کر) تو کیا درحقیقت کلیوپیٹرا ملکہ ہے۔ اور سیزر کی قیدی اور غلام نہیں؟

کلیوپیٹرا :- پوتھینس ہم سب سیزر کے غلام ہیں —— ہم سب جو مصر میں ہیں —— خواہ ہم اس کو پسند کریں یا نہ کریں۔ اور وہ جو اس کو سمجھنے کی کافی اہلیت رکھتی ہے سیزر کے جانے کے بعد یہاں حکومت کرے گی۔

پوتھینس :- تم سیزر کے جانے پر خوش ہوتی ہو۔

کلیوپیٹرا :- ہاں اگر میں خوش ہوتی بھی ہوں تو کیا ؟

پوتھینس :- کیا وہ تم سے محبت نہیں کرتا ؟

کلیوپیٹرا :- مجھ سے محبت کرتا ہے! پوتھینس! سیزر کسی سے محبت نہیں کرتا۔ وہ کون ہیں جن کو ہم چاہتے ہیں۔؟ وہی جن سے ہم کو نفرت نہیں ہوتی اس کی فطرت میں نفرت نہیں ہے۔ وہ ہر ایک سے کتے اور بچوں کی طرح گھل مل جاتا ہے اس کی مہربانی دیکھ کر مجھے تعجب ہوتا ہے۔ ماں باپ، انا، دایا نے کبھی میری اتنی خبرگیری نہیں کی۔ جتنی وہ کرتا ہے۔ یا کسی نے اپنے خیالات اس آزادی سے بیان کئے ہوں۔

پوتھینس :- اچھا تو کیا یہ محبت نہیں ؟

کلیوپیٹرا :- کیا جب وہ روم جانے لگے گا اور کسی لڑکی

سے ملاقات کرے گا۔ اور اس سے بھی ایسا ہی سلوک کرے گا تو یہ محبت ہوگی؟ اس کے غلام بری ٹیتس سے پوچھو۔ وہ اس کو بہت عزیز ہے نہیں خود اس کے گھوڑے سے دریافت کرو۔ اس کی یہ عنایت مجھ پر میری کسی خصوصیت کی بنا پر نہیں ہے۔ بلکہ اس کی فطرت ہے۔

پوتھینس:۔ لیکن یہ تم کیونکر یقین سے کہہ سکتی ہو کہ وہ تم سے ایسی محبت نہیں کرتا جیسے اور مرد اور عورتوں سے کرتے ہیں؟

کلیوپیٹرا:۔ کیونکہ میں اُسے حاسد نہیں بنا سکتی میں نے بارہا آزمایا ہے۔

پوتھینس:۔ تو شاید اب مجھ کو یہ سوال کرنا چاہیئے۔ کہ کیا تم کو اس سے محبت ہے؟

کلیوپیٹرا:۔ کیا کوئی ایک دیوتا سے محبت کر سکتا ہے؟ اس کے علاوہ مجھے ایک اور رومی سے محبت ہے ——— وہ جس کو میں نے سیزر سے بہت پہلے دیکھا تھا ——— دیوتا نہیں بلکہ ایک آدمی ——— وہ جو محبت بھی کر سکتا ہے اور نفرت بھی۔ وہ جس کو بس ضرر پہونچا سکتی ہوں اور جو مجھے بھی صدمہ پہنچا سکتا ہے۔

پوتھینس:۔ کیا سیزر کو یہ بات معلوم ہے؟

کلیوپیٹرا:۔ ہاں۔

پوتھینس:۔ اور یہ سُنکر اُسے غصہ نہیں آیا؟

کلیوپیٹرا:۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اُسے میری دل بستگی کے لئے بھیجدے گا۔

پوتھینس:۔ یہ آدمی میری سمجھ میں نہیں آتا۔

کلیوپیٹرا:۔ (نفرت سے) تم سیزر کو سمجھنا چاہتے ہو؟ تم کس طرح سمجھ سکتے ہو (تمکنت سے) میں سمجھتی ہوں۔

پوتھینس:۔ (ایک منٹ سوچنے کے بعد) حضور نے آج مجھے باریابی کا شرف بخشا اب میرے لئے کیا حکم ہے؟

کلیوپیٹرا:۔ تم خیال کرتے ہو کہ میرے بھائی کو بادشاہ بنا کر مصر میں حکومت کروگے، کیونکہ تم اس کے سرپرست ہو۔ اور وہ ایک نادان بچہ ہے۔

پوتھینس:۔ ملکہ کو اختیار ہے جو چاہیں فرمائیں۔

کلیوپیٹرا:۔ ہاں تو ملکہ کو یہ بھی کہنے کا اختیار ہے کہ سیزر تم کو اور اکیلس کو نگل جائے گا۔ اور میرے بھائی کو بھی، جیسے ایک بلی چوہوں کو نگل جاتی ہے۔ اور وہ مصر کو اس طرح اپنے قابو میں کرلے گا جیسے ایک گڈریا اپنی کملی کو بغل میں دبالیتا ہے۔ اور جب وہ سب کچھ کر چکے گا تو روم واپس جائے گا۔ اور کلیوپیٹرا کو اپنا وزیر بنا کر یہیں چھوڑ دے گا۔

پوتھینس:۔ (غصہ سے چلاکر) یہ وہ تمام عمر نہ کرے گا اس کے دس کے مقابلے میں ہمارے پاس ہزار موجود ہیں۔ اور ہم اس کو اور اس کی بھکاری فوج کو ملکر سمندر پار اُتار دیں گے۔

کلیوپیٹرا:۔ (انداز نفرت سے جانے کے لئے کھڑی ہوتی ہے) تم نے بالکل ایک کمینہ کی سی باتیں کی ہیں۔ جاؤ۔ اور اپنے ہزاروں کو لڑنے پر آمادہ کرو۔ بہت جلد۔ کیونکہ ہر گاماس سیزر کی اعانت کے لئے قریب

آپہنچا ہے۔ سیزر نے تم کو خلیج کے کنارے دو فوجی دستوں سے روک رکھا ہے اب ہم کو دیکھنا ہے کہ وہ بیس فوجی دستوں سے کیا کرتا ہے

پوتھینس:۔ کلیوپیٹرا ——

کلیوپیٹرا:۔ بس بس۔ سیزر نے تمہاری طرح کمزور اور مہمل باتیں کرکے مجھے برباد کر دیا ہے (وہ چلی جاتی ہے۔ پوتھینس غصہ کا سا چہرہ بنائے ہوئے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔ مگر فتاتا داخل ہو کر روک لیتی ہے)

پوتھینس:۔ مجھے اس ذلیل مقام سے نکل جانے دو۔

فتاتا:۔ تم غصہ کیوں ہوتے ہو؟

پوتھینس:۔ خدا کرے مصر کے تمام دیوتاؤں کا قہر اس پر نازل ہو۔ اس نے اپنا ملک رومی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

فتاتا:۔ بے وقوف کیا اس نے تم سے یہ نہیں کہا کہ سیزر یہاں سے چلا جائے تو اچھا ہے؟

پوتھینس:۔ کیا تم نے سنا ہے؟

فتاتا:۔ مجھے پہلے ہی سے فکر تھی کہ جب تم اس کے ساتھ تنہا ہو تو کسی ایماندار عورت کا بھی قریب رہنا ضروری ہے۔

پوتھینس:۔ خدا کی قسم ——

فتاتا:۔ بس کرو، اپنے خداؤں کو۔ یہاں سیزر کے خدا سب سے زیادہ طاقتور ہیں۔ کلیوپیٹرا کے پاس آنے سے تم کو کوئی فائدہ نہیں۔ تم صرف ایک مصری ہو وہ اپنے نسل والوں میں سے کسی کی بھی نہ سنے گی۔ وہ ہم سب سے بچوں کا سا برتاؤ کرتی ہے۔

پوتھینس:۔ خدا کرے وہ غارت ہو جائے

فتاتا:۔ (بددعا دیتے ہوئے) خدا کرے تمہاری زبان اس خواہش کی دعا کرنے میں سڑ جائے۔ جاؤ اور لوسیس پمپئی کے قاتل کو بلواؤ۔ وہ ایک رومی ہے ممکن ہے کہ کلیوپیٹرا اس کی سن لے۔ جاؤ یہاں سے چلے جاؤ۔

پوتھینس:۔ مجھے معلوم ہے کہ اب کس کے پاس جانا چاہیے۔

فتاتا:۔ (شبہ کرتے ہوئے) کس کے پاس؟

پوتھینس:۔ لوسیس سے بڑے آدمی کے پاس مگر وہ بات یاد کرو۔ جب تم نے سیزر کے آنے سے قبل سوچا تھا کہ مصر پر تمہاری حکمرانی ہو۔ اور میں اس کی مخالفت پر آمادہ ہوا تھا ——

فتاتا:۔ (قطع کلام کرکے) تاکہ تم خود اس پر حکومت کرو۔

پوتھینس:۔ خیر ہم ہوں یا تم۔ دونوں ایک ایسی عورت سے ہر لحاظ سے بہتر ہیں جس کا دل رومی ہو۔ جب تک میں زندہ ہوں وہ حکومت نہیں کر سکتی۔ اس لئے تم اپنی رہنمائی آپ کرو۔

(وہ چلا جاتا ہے)

کھانے کا وقت قریب آتا جاتا ہے محل کی چھت پر میز بچھی ہوئی ہے۔ روفیو اوپر چڑھ رہا ہے اس کے ساتھ ساتھ ایک غلام تپائی لئے ہوئے آرہا ہے۔ متعدد سیڑھیاں چڑھنے کے بعد وہ چھت پر پہنچ جاتے ہیں، ہلکے ہلکے پردے شمالی اور مشرقی ستونوں پر دھوپ روکنے کے لئے پڑے ہوئے ہیں۔

افسر - روفیو کو ان میں سے ایک سایہ دار مقام پر لے جاتا ہے - پردوں کو الگ کھینچنے کے لئے ایک رسّی ستونوں کے درمیان لٹکی ہوئی ہے۔

افسر :- (جھک کر) رومی سردار کو یہاں سیزر کا انتظار کرنا چاہئے۔

(غلام بالکل جنوبی ستونوں کے قریب تپائی رکھ دیتا ہے - اور پردہ کے اندر غائب ہو جاتا ہے)

روفیو :- (بیٹھتے ہوئے) اُفوہ یہ بڑی چڑھائی تھی - ہم کس قدر بلندی پر پہنچ گئے ہیں۔

افسر :- ہم محل کی چھت پر ہیں -

روفیو :- خوب۔ - اب ہم کو اور سیڑھیاں چڑھنا نہیں ہیں -

(مخالف سمت سے ایک اور افسر داخل ہوتا ہے)

دوسرا افسر :- سیزر آرہا ہے -

(سیزر غسل کے بعد ایک ارغوانی رنگ کے ریشمی لباس میں داخل ہوتا ہے اس کے پیچھے دو غلام ہیں جو ایک گدے دار کرسی لا رہے ہیں - وہ اسے بالکل شمال میں دو ستونوں کے بیچ میں رکھ دیتے ہیں - اس کے بعد وہ پردوں میں روپوش ہو جاتے ہیں - اور دونوں سردار سر جھکا کر چلے جاتے ہیں - روفیو سیزر کے استقبال کو کھڑا ہو جاتا ہے۔)

سیزر :- (اس کے قریب آکر) کیوں روفیو؟ (اس کے لباس کو استعجاب سے دیکھ کر) ایک نیا لباس تلوار کے لئے ایک نئی سنہری میان - اور تم نے اپنے بال بھی ترشوا دئے ہیں، لیکن داڑھی نہیں (وہ روفیو کی داڑھی سونگھتا ہے) ہاں اولمپس کی قسم۔ معطر ہے -

روفیو :- ہاں تو کیا - یہ میرے خوش کرنے کے لئے ہے ؟

سیزر :- (پیار سے) نہیں میرے بچے روفیو - بلکہ خود کو خوش کرنے کے لئے - اپنی سالگرہ منانے کی خاطر،

روفیو :- (نفرت سے) تمھاری سالگرہ - تمھاری سالگرہ تو ہمیشہ اس وقت ہوتی ہے جب کوئی حسین لڑکی مل جاتی ہے - یا کسی ایلچی سے دوستی پیدا کرنا مقصود ہو - گذشتہ مہینے میں تقریباً سات سالگرہ ہوئیں۔

سیزر :- (اعتراف کرتے ہوئے) یہ سچ ہے روفیو اب میں خود کو کبھی ان فریبوں میں گرفتار نہ کروں گا۔

روفیو :- ہمارے ساتھ کلیوپیٹرا کے سوا اور کون کھانا کھائے گا ؟

سیزر :- سسلی کا اپالوڈورس -

روفیو :- وہ ظریف مسخرا - پاپن جے -

سیزر :- پاپن جے ایک دلچسپ کتا ہے ——— کہانی کہتا ہے - گانا گاتا ہے اور ملکہ کی خوشامد کرنے سے ہم کو بچاتا ہے اُسے بڈھے سیاست دانوں اور ہم جیسے جنگلی ریچھوں کی کیا پروا ہے - نہیں اپالوڈورس ایک اچھا رفیق ہے -

روفیو :- ہاں - لیکن اگر اُسے یہ معلوم ہو جائے کہ زبان کس طرح بند رکھنی چاہئے تو شاید وہ بدترین ثابت ہو -

سیزر :- خدا کرے اُسے کبھی اس کا علم نہ ہو - اُف،

یہ فوجی زندگی۔ یہ بوجھل بے رحم عملی زندگی، ہم رومیوں کی بڑی شامت دہی ہے۔ ہم صرف کام کرنے والے مزدور ہیں ــــــــ ایک مکھیوں کا گروہ جن کو آدمی بنا دیا گیا ہے کاش مجھے ایک اچھی باتیں کرنے والا مل جائے ــــــــ ایسا جسکی باتوں میں خوش مذاقی اور تخیل آرائی اتنی ہو کہ بغیر کچھ اور کئے ہوئے زندہ رہ سکوں۔

روفیو:۔ ہاں کھانا ختم ہونے کے بعد اُسے تم سے گفتگو کرنے کا بہت اچھا موقع ملے گا۔ کیا تم نے اس بات پر غور کیا کہ میں وقت سے پہلے آیا ہوں؟

سیزر:۔ آہا!۔ میں نے سوچا کہ اس کا ضرور کوئی مطلب ہے؟ کیا ہے بولو؟

روفیو:۔ کیا یہاں ہماری باتیں کوئی اور سن سکتا ہے؟

سیزر:۔ اس تخلیہ کے لئے پردہ ڈالنے کی ضرورت ہو میں ابھی اس کا انتظام کرتا ہوں

(وہ تالی بجاتا ہے۔ پردے ڈال دیے جاتے ہیں۔ چھت کے بیچ میں ایک میز نظر آتی ہے جو چار آدمیوں کے لئے ہے سیزر اور روفیو کے قریب شراب کے بلوریں جام اور صراحیاں رکھی ہیں۔ ایک بارعب سردار متعدد غلاموں کے ساتھ انتظام میں مصروف ہے۔ یہاں سے مغرب کی جانب جو دالان سا چلا گیا ہے اس کے آخر میں کھڑکی سی ہے۔ جس سے آسمان نظر آتا ہے اس کے بیچ میں را کا مجسمہ ہے) اب ہر شخص ہم کو دیکھ سکتا ہے کوئی ہماری باتیں سننے کا ارادہ نہ کریگا

(وہ غلاموں کے قریب گدے دار کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

روفیو:۔ (تنہائی پر بیٹھتے ہوئے) پوتھینس تم سے گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ میں تم کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ اس سے ملو۔ یہاں عورتوں میں سازشیں ہو رہی ہیں؟

سیزر:۔ پوتھینس کون ہے؟

روفیو:۔ جس کا سر گلہری کی کھال کی طرح ہے۔ چھوٹے بادشاہ کا سرپرست جس کو تم نے قید کر رکھا تھا۔

سیزر:۔ (گھبرا کر) اور کیا وہ فرار نہیں ہو گیا؟

روفیو:۔ نہیں۔

سیزر:۔ (اٹھتے ہوئے) کیوں، تم دشمن کی نگرانی کرنے کے بجائے اس شخص کی حفاظت کرتے رہے۔ کیا میں نے تم سے ہمیشہ نہیں کہا کہ قیدیوں کو بھاگ جانے دو۔ جب تک اس کے خلاف تم کو کوئی حکم نہ دیا جائے۔ کیا اور بہت سے کھانے والے نہیں ہیں؟

روفیو:۔ ہاں۔ اور اگر تم میں ذرا بھی سمجھ ہے۔ اور مجھے اس کی گردن الگ کرنے کی اجازت دو تو تم اس کا حصہ بچا سکو گے۔ بہرکیف وہ بچ کر نہیں جا سکتا۔ تین سنتریوں نے اس سے کہا کہ اگر وہ پھر دکھائی دیا تو اس کی خیر نہیں۔ اس کے سوا وہ اور کیا کر سکتے ہیں مگر وہ یہاں ٹھہر کر پوشیدہ طور پر ہمارے حرکات و نقل دیکھنا چاہتا ہے۔

سیزر:۔ (بیٹھتے ہوئے) تو وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔

روفیو:۔ ہاں میں اس کو اپنے ساتھ لایا ہوں۔ وہ پردہ میں بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔

سیزر:۔ اور تم چاہتے ہو کہ میں اس سے ملاقات کروں۔

روفیو:۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جو تمہارے دل میں آئے گا وہی

کروگے۔ مجھے شامل نہ کرو۔

سیزر:۔ اچھا۔ اچھا اُسے آنے دو۔

روفیو:۔ (پکار کر) او محافظ۔ اپنے آدمی کو چھوڑ دے اور یہاں آنے دے (اشارہ سے) یہاں آؤ۔

(پوتھینس آکر دونوں کے بیچ میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور کبھی ایک کو اور کبھی دوسرے کو دیکھنے لگتا ہے)

سیزر:۔ (متانت سے) پوتھینس میں تم کو خوش آمدید کہتا ہوں کہو کیا خبر لائے؟

پوتھینس:۔ سیزر! میں تم کو ایک خطرہ سے آگاہ کرنے آیا ہوں۔ اور ایک نذر پیش کرنے کو حاضر ہوا ہوں۔

سیزر:۔ خطرہ کا خیال نہ کرو۔ نذرانہ پیش کرو۔

روفیو:۔ نذر کا خیال نہ کرو۔ خطرہ سے آگاہ کرو۔

پوتھینس:۔ سیزر تمہارا خیال ہے کہ کلیوپٹرا تمہاری پرستار ہے۔

سیزر:۔ (متانت سے؛ میرے دوست میں جو کچھ سوچتا ہوں، جانتا ہوں۔ تم نذر پیش کرو۔

پوتھینس:۔ میں صاف صاف کہتا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تم نے کن عجیب دیوتاؤں کی مدد سے محل اور ساحل کو محفوظ رکھا۔ اب ہم کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ ہم تمہارے دیوتاؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور ان پر فتح نہیں پا سکتے۔ میں اب تم کو دھمکاتا نہیں ——

روفیو:۔ (طنزاً) یہ آپ کی عنایت ہے

پوتھینس:۔ دیوتاؤں نے شمال مغربی ہواؤں کو اس لئے بھیجا تھا کہ ہم تم کو اپنے قبضہ میں رکھیں لیکن تم ان ہواؤں سے زیادہ طاقتور ثابت ہوئے۔

سیزر:۔ (نہایت اخلاق سے درخواست کرتے ہوئے۔ کہ وہ اصل موضوع پر آئے) ہاں میرے دوست پھر؟

روفیو:۔ بھلے آدمی جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالو۔

پوتھینس:۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ تمہارے خیمہ میں ایک باغی موجود ہے —— کلیوپٹرا۔

میجر ڈومو:۔ (اطلاع دیتے ہوئے) ملکہ تشریف لا رہی ہیں

(روفیو اور سیزر کھڑے ہو جاتے ہیں)

روفیو:۔ (پوتھینس کے کان میں) تم کو پہلے ہی سب کچھ بک ڈالنا تھا۔ اب وقت گذر گیا۔

(کلیوپٹرا نہایت قیمتی لباس میں داخل ہوتی ہے۔ اور سیزر کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ اس کی سہیلیاں فتاتا کی نگرانی میں میز کے پاس آکر جمع ہو جاتی ہیں۔ سیزر کلیوپٹرا کی خاطر اپنی نشست خالی کر دیتا ہے جس کو وہ قبول کر لیتی ہے)

کلیوپٹرا:۔ (تیزی سے پوتھینس کو دیکھ کر) یہ یہاں کیا کر رہا ہے۔

سیزر:۔ (اس کے قریب انتہائی مشفقانہ انداز سے بیٹھ کر) تمہارے متعلق مجھ سے کچھ کہنے جا رہا ہے۔ تم ابھی خود سنو گی۔ ہاں تو شروع کرو پوتھینس۔

پوتھینس:۔ (آزردہ خاطر ہو کر) سیزر! (اس کی زبان لکنت کرنے لگتی ہے)

سیزر:۔ ہاں کہو۔

پوتھینس:۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں صرف تمہارے کانوں کے لئے ہے۔ ملکہ کے لئے نہیں۔

کلیوپٹرا:۔ (غصہ کو روکتے ہوئے) یہاں ایسے ذرائع بھی

ہیں جو تم کو بولنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ اس کا خیال رہے۔

پوتھینس :- سیزر ان ذریعوں کو عمل میں نہیں لاتا۔

سیزر :- میرے دوست۔ جب ایک آدمی کو اس دنیا میں کچھ کہنا ہوتا ہے تو مشکل یہ نہیں ہوتی کہ اس سے کہلایا جائے۔ بلکہ اسے بار بار کہنے سے روکا جائے۔ مجھے اپنی سالگرہ کی تکمیل اس طرح کرنا ہے کہ تم کو رہا کردوں۔ جاؤ خدا حافظ۔ اب ہم آیندہ پھر نہ ملیں گے۔

کلیوپیٹرا :- (غصہ سے) سیزر یہ رحم بیوقوفی کی دلیل ہے۔

پوتھینس :- (سیزر سے) کیا آپ تنہائی میں میری دو باتیں سننا پسند نہ کریں گے۔ ممکن ہے کہ آپ کی زندگی کا انحصار اسی پر ہو (سیزر کھڑا ہو جاتا ہے)

روفیو :- (آہستہ آہستہ پوتھینس سے) گدھے۔ اب ہم کو کچھ دلیری کے منظر دیکھنے پڑیں گے۔

سیزر :- پوتھینس ———

روفیو :- (قطع کلام کرتے ہوئے) سیزر کھانا برباد ہو جائیگا، اگر تم اپنی زندگی اور موت پر خطبہ پڑھنے کو بیٹھے رہوگے۔

کلیوپیٹرا :- خاموش رہو روفیو۔ میں سیزر کی باتیں سننا چاہتی ہوں۔

روفیو :- (جیسے اس نے نہیں سنا) ملکہ نے اس کو پہلے بھی سماعت فرمایا ہے۔ آپ نے اپالوڈورس سے گذشتہ ہفتہ ارشاد فرمایا تھا۔ اور اس نے سوچا کہ یہ سب آپ ہی کا تھا (سیزر کی تمکنت کو صدمہ پہونچتا ہے وہ بیٹھ جاتا ہے اور کلیوپیٹرا کو گھورنے لگتا ہے۔ جس کے چہرے سے غصہ کے آثار ہویدا ہیں۔ روفیو بدستور کہتا ہے)

او محافظو اس قیدی کو نکل جانے دو۔ وہ رہا کر دیا گیا ہے (پوتھینس سے) یہاں سے چلے جاؤ تم نے اپنا موقع کھو دیا۔

پوتھینس :- (غصہ سے مغلوب ہو کر) میں بولوں گا۔

سیزر :- (کلیوپیٹرا سے) تم دیکھ رہی ہو۔ سختی سے وہ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالتا۔

پوتھینس :- سیزر تم نے کلیوپیٹرا کو وہ اصول بتا دیئے ہیں جن سے رومی دنیا پر حکومت کرتے ہیں۔

سیزر :- افسوس وہ خود اپنے آپ پر حکومت نہیں کر سکتے۔ پھر اس کا نتیجہ ؟

پوتھینس :- اس کا نتیجہ ! کیا تم اس کے حسن سے اسقدر متاثر ہو چکے ہو کہ یہ نہیں دیکھ سکتے کہ وہ تن تنہا مصر پر حکمرانی کرنے کے لئے بے چین ہے۔ اور اس کا دل تمھاری واپسی کا متمنی ہے۔

کلیوپیٹرا :- (اٹھتے ہوئے) جھوٹا۔

سیزر :- (حیرت زدہ ہو کر) کیسے اعتراضات، کیسے اختلافات؟

کلیوپیٹرا :- (شرمندہ ہو کر مگر غصہ سے کانپتے ہوئے) نہیں مجھ میں انکار کرنے کی جرأت نہیں اس کو کہنے دو۔

(وہ بیٹھ جاتی ہے)

پوتھینس :- میں نے خود اس کی زبان سے سنا ہے۔ کہ اس کے بھائی کے سر سے تاج اتار کر خود اس کے سر پر رکھوگے۔ اور خود اپنے کو بھی اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دوگے

سیزر :- (خاموشی سے) اچھا میرے دوست اور کیا یہ بالکل فطرت کے مطابق نہیں ہے ؟

پوتھینس:۔ فطری ؟ کیا مکاری پر تمھیں غصہ نہیں آتا۔

سیزر:۔ غصہ - او بے وقوف مصری - مجھے غصہ کرکے کیا کرنا ہے ؟ کیا مجھے ہوا پر غصہ آتا ہے جب وہ سارے جسم میں لرزہ پیدا کر دیتی ہے - کیا میں رات سے برہم ہوتا ہوں جب اس کی تاریکی میں اکثر ٹھوکریں کھا کھا کر مجھے گرنا پڑتا ہے - یا میں جوانی کو قہر کے انداز سے دیکھتا ہوں جب وہ چلی جاتی ہے - مجھ سے ایسی باتیں کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ کل سورج طلوع ہوگا۔

کلیوپیٹرا:۔ (برداشت نہ کرتے ہوئے) لیکن یہ غلط ہے یہ جھوٹ ہے - میں قسم کھاتی ہوں۔

سیزر:۔ گو تم نے ہزاروں دفعہ قسم کھائی اور جو قسم کھائی اس پر میں نے یقین کیا، تاہم یہ سچ ہے۔

(وہ بے حد مضطرب ہو جاتی ہے - اسے پردہ کے اندر چھپانے کی غرض سے وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے - اور پوتھینس کو روفیو کے پاس لے جاکر کہتا ہے) ادھر آؤ روفیو - مجھے پوتھینس سے کچھ کہنا ہے (وہ روفیو اور پوتھینس کو ساتھ لے کر باتیں کرتا ہوا چلا جاتا ہے -) پوتھینس اپنے دوستوں کو سمجھاؤ کہ میں ایک معقول اور مناسب فیصلہ کی مخالفت نہ کروں گا

(سب لوگ سنتے ہوئے چلے جاتے ہیں)

کلیوپیٹرا:۔ (چپکے سے) فتاتا - فتاتا۔

فتاتا:۔ (میز کے قریب سے اٹھ کر اس کے پاس جاتی ہے اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر) میری بچی - گھبراؤ نہیں اطمینان کی سانس لو ـــــ

کلیوپیٹرا:۔ (قطع کلام کرتے ہوئے) کیا وہ لوگ ہماری باتیں سن سکتے ہیں۔

فتاتا:۔ نہیں - میرے دل کے ٹکڑے - نہیں۔

کلیوپیٹرا:۔ تو غور سے سنو - اگر وہ محل سے زندہ چلا جائے تو پھر کبھی میری صورت نہ دیکھنا۔

فتاتا:۔ وہ ؟ اُف۔

کلیوپیٹرا:۔ (منہ پر مارتے ہوئے) اس کو اس طرح مارو جیسے میں تمھارے منہ پر مار رہی ہوں - اس کا سر دیوار سے ٹکرا دو - اس کو پتھروں پر گرا کر ہڈیوں کو ریزہ ریزہ کردو - اس کو مار ڈالو - ہلاک کردو۔

فتاتا:۔ (بتیسی دکھا کر) کتا مارا جائے گا۔

کلیوپیٹرا:۔ اگر تم اس میں ناکام رہو تو ہمیشہ کے لئے کالا منہ کر لینا - مجھے اپنی صورت نہ دکھانا۔

فتاتا:۔ بہتر ہے، جب تک اس کی آنکھیں نہ پھوڑ ڈالی جائیں تم میری صورت نہ دیکھنا۔

(سیزر زرق برق لباس میں روفیو اور اپالوڈورس کے ساتھ آتا ہے)

کلیوپیٹرا:۔ (فتاتا سے) جلد آؤ - جلد فتاتا ایک لمحہ کے لئے اپنی معنی خیز نگاہیں اس پر ڈالتی ہے - پھر دانت پیستی ہوئی - زرا کے پاس سے گذر جاتی ہے

(کلیوپیٹرا ایک غزال رعنا کی طرح سیزر کے پاس دوڑ جاتی ہے)

سیزر:۔ تم پھر میرے پاس آگئیں۔

(باقی آیندہ)

جوش کی شاعرانہ خامیاں

(مسلسل)

جناب جوش کی ایک نظم "شفق" کے عنوان سے ہے۔ اس میں ہر بند تین تین مصرعہ کا ہے - اور پہلے تین بند استعارات تشبیہی کے ہیں جن میں زیادہ تر محسوسات اور مناظر مرایا سے استعارہ کیا گیا ہے - باقی چار بند میں ان تاثرات کو ظاہر کیا گیا ہے جو شفق دیکھنے کے بعد شاعر کے قلب میں پیدا ہوئے ہیں۔ اغلاط معلوم کرنے سے قبل پہلے آپ اس نظم کو بھی ایک بار دیکھ لیجئے :-

پہلے تین بند یہ ہیں :-

یہ شفق کی سرخیاں ہیں یا کوئی گلزار ہے فرش سے تا عرش جو ذرّہ ہے وہ سرشار ہے
رنگ کی شہزادیوں کا چرخ پر دربار ہے

یہ شفق ہے یا جبینِ حسن پر رنگِ شباب خوابگاہ خسرو خاور کا ہلکا سا حجاب
کون شاعر کے سوا اس بزم میں ہے باریاب

یہ سنہری دھاریاں ہیرے کے یہ نقش و نگار یہ زمرد کے بیاباں، یہ طلائی برگ و بار
آئینہ ہے انتہائے صنعت پروردگار

اس کے بعد جذباتی چار بند یہ ہیں :-

یہ وہ جلوے ہیں کہ دل کے زخم دیتے ہیں لہو قلب میں بیدار ہوتی ہے کسی کی جستجو
دفعۃً سینے میں جل اٹھتی ہے شمع آرزو

ان مناظر میں اُلٹتی ہے ندی جذبات کی تیز ہو جاتی ہے دل میں آنچ محسوسات کی
خون کے آنسو رُلاتی ہے شفق برسات کی

اک ادائے خواب میں ملفوف ہے سارا جہاں ملتا جاتا ہے شفق کے رنگ میں کچھ کچھ دھواں
تیرگی میں سر بہ سجدہ ہے غرورِ آسماں

یاد آتی ہے کسی کی کجکلاہی کیا کروں چھائی جاتی ہے ہر اک شے پر سیاہی کیا کروں
یہ مناظر کھائے جاتے ہیں الٰہی کیا کروں

قبل اس کے کہ میں نظم کے نقائص کو ظاہر کروں، یہ بتا دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ اس وقت تک جوش کے کلام پر جو تنقید (دسمبر ۱۹۳۲ء، جنوری ۱۹۳۳ء، فروری ۱۹۳۳ء کے نگار میں) شائع ہوئی ہے* وہ ان کی شاعری کے صرف ایک پہلو کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہے، یعنی یہ کہ ان کے کلام میں بے ربطی کس حد تک پائی جاتی ہے اور الفاظ و تراکیب کے صحیح استعمال سے وہ کس درجہ بے خبر ہیں اور ابھی اسی پہلو پر استقصار جاری رہے گا۔ اس کے بعد تنقید کا دوسرا اہم حصہ شروع ہوگا جس میں ظاہر کیا جائے گا کہ جوش کی شاعرانہ شخصیت کیا ہے اور ان کے جذبات خواہ کتنی ہی بلند تمہید کے ساتھ کیوں نہ شروع کئے جاتے ہوں، آخر میں آکر حد درجہ پست ہو جاتے ہیں اور خود جوش صاحب کی ذاتی شخصیت ان کی شاعرانہ شخصیت کو مغلوب کرکے ان کی نظموں کو کہاں سے کہاں کھینچ کر لے آتی ہے ——— اس کے بعد میں ان کی قومی و اصلاحی شاعری پر گفتگو کروں گا کہ اس کی کیا حقیقت ہے اور جو پیغام وہ دنیا کو پہونچا رہے ہیں اس میں کتنا خلوص شامل ہے اور کتنا جذبۂ انتقام۔ پھر جب میں ان منازل سے گزر جاؤں گا تو اختر و جوش کی شاعرانہ اہلیت کا موازنہ کروں گا جو اصل موضوع سخن ہے۔

جوش صاحب کے کلام پر اس سے قبل بھی دو مرتبہ تنقیدوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا، لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب جوش کا مجموعۂ کلام بھی کافی ضخیم نہ ہوا تھا اور نہ اُن میں غالباً کوئی غلط پندار اپنی شاعری کے متعلق پیدا ہوا تھا۔ لیکن اس کے بعد سے چونکہ جوش صاحب کی شاعری نے مختلف رنگ اختیار کئے اور ہر رنگ میں بہت کافی نظمیں ان کے قلم سے نکل کر ملک میں شائع ہوئیں اس لئے اہل فن کی نگاہیں بھی ان پر پڑتی رہیں اور نہایت خاموشی کے ساتھ دیکھتی رہیں کہ ایک شاعر کی بے راہ روی بھی کافی خراج تحسین ملک سے حاصل کر سکتی ہے اگر اس کا پروپاگنڈا کیا جائے اور اسی کے ساتھ یہ بھی محسوس کرتی رہیں کہ شعر و سخن کے باب میں ہندوستان کے لوگ ہنوز اسی سطح پر ہیں جہاں صرف خوشنما الفاظ کی پرستش کی جاتی ہے اور مفہوم و معنی یا فن شعر سے کوئی سروکار نہیں رکھا جاتا۔ چنانچہ بہت سے شاعر ملک کی ناواقفیت اور نقادانِ فن کی خاموشی کی وجہ سے مشہور ہو گئے درانحالیکہ ان کا نصف سے زیادہ کلام سوائے "مہملات" کے اور کچھ نہیں ہوتا ——— اس سلسلہ میں سب سے زیادہ نقصان شاعری کو پہونچایا اس لغو خیال نے کہ بہترین شعر (اور خصوصیت کے ساتھ غزل کا شعر) وہ ہوتا ہے جس میں فلسفہ و تصوف کا کوئی نکتہ بیان کیا جائے، غوامض فطرت و اسرار قدرت سے بحث کی جائے پھر ان میں سے تو کوئی بات ہوئی نہیں اور نہ ہو سکتی تھی، مگر مہمل قسم کی غزلگوئی کا رواج ضرور ہو گیا۔ جس میں وزن و قافیہ تو ضرور رہتا ہے لیکن تغزل کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

بہرحال مدعا کہنے کا یہ تھا کہ جوش صاحب کی شاعری پر صرف ایک میری ہی نگاہ تنقید نہیں گئی بلکہ اور ارباب فن بھی اس کو اسی نظر سے دیکھ رہے تھے، چنانچہ جس وقت دسمبر ۱۹۳۲ء میں ایک عمومی تبصرہ میرا شائع ہوا تو متعدد ارباب فن میرے ہم آہنگ نکلے۔ چنانچہ یہیں لکھنؤ کے ایک نہایت مشہور شاعر اور باخبر استاد فن نے مجھکو

لکھا:—

جوش کی شاعری کے تاریک پہلو کے متعلق میں یا اور کوئی اس سے زیادہ کیا لکھ سکتا ہے جو کچھ آپ نے مختصر مگر جامع الفاظ میں استفسار کے زیرعنوان لکھ دیا۔ ان کی شاعری میں وہ تمام خامیاں اور کمزوریاں موجود ہیں جو آپ نے بیان کیں۔ ان کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ مصلحانہ شاعری شروع کردی جس کی اہلیت ان میں ہرگز نہیں ہے۔ مصلح کے لئے لازم ہے کہ سرگرم کار ہو اور جو کچھ کہے اس پر عمل بھی کرے۔ جوش اس نعمت سے محروم ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے لہجہ میں خطیبوں کی درشتی و خشونت پیدا ہو جاتی ہے اور کوئی اچھا نتیجہ مترتب نہیں ہوتا۔ ان کے علی الرغم اصلاح پر آمادہ ہونے کے بجائے لوگ ان کی مخالفت پر اُتر آتے ہیں۔

کسی خاص مذہب یا ملت کا پیرو نہ ہونا اور ملحد ہونا دو مختلف باتیں ہیں۔ میرے خیال میں حقیقی شاعر آزاد مشرب مگر خدا کے وجود کا دل سے قائل ہوتا ہے ورنہ اس کی شاعری والہانہ سرشاری سے بیگانہ رہتی ہے۔ شاعر کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ نظر میں کیف ہو اور کیف سے نظر پیدا ہو۔ یہ ملکہ پیدا نہیں ہوتا جب تک کوئی بلند آئیڈیل پیش نظر نہ ہو۔ ایسا آئیڈیل یا تو خدا ہے یا خود انسان۔ جو شخص خدا کو نہ مانے اور انسان کو بہیمی لذات میں آسودہ دیکھنا چاہے۔ مصلح بننے کا ادعا اس کو زیب نہیں دیتا۔

کہا جا سکتا ہے کہ جوش کی شاعری موجودہ نسل کی بیداری، بے چینی اور بے اطمینانی کا آئینہ ہے، قدیم رسوم کی عمارت کو مسمار کرنا چاہتی ہے مگر اس کی جگہ نئی تعمیر تجویز کرنے سے معذور ہے۔ فیصلہ اس پر ہے کہ آیا ان کی زبان جمہور کے خیالات کی ترجمان یا اس کی متفقہ آواز ہے۔ میری رائے میں ایسا نہیں ہے۔ جمہور آزادی کی خواہشمند ضرور ہے خواہ اس کے حصول میں خون کے دریا سے عبور کرنا ہو مگر کم سے کم ہندوستان میں جذبۂ جمہوریت نے یہ شکل اختیار نہیں کی ہے کہ بچوں کی طرح محض اپنی فطرت کی بنا پر کسی چیز کو کھلونا سمجھ کر پٹکے اور توڑنا چاہے۔ ہندوستان میں مادیت نے روحانیت پر کبھی فتح نہیں پائی اور نہ مستقبل قریب میں اس کا اندیشہ ہے۔ ہندوستان اب تک اٹھارویں صدی کا فرانس نہیں ہوا ہے، دہریت اگر ہے تو چند افراد میں محدود ہے اور عام طور پر خدا سے بیزاری پیدا نہیں ہوئی ہے۔ خیالات پر گاندھی حکمراں ہے نہ کہ بالشویک معتقدات رکھنے والا کوئی شخص۔

میرا مشاہدہ بتاتا ہے کہ جوش کی ذاتی مایوسیوں اور ناکامیوں نے ان کو خدا کا منکر اور سوسائٹی کا مخالف بنا دیا ہے مگر ان کے ارادے اسقدر سست اور قوائے عمل ایسے مضمحل ہیں کہ اظہار دشمنی کا آلہ بجائے کردار کے الفاظ ہیں۔

اگر کوئی شخص خدا کے وجود کا منکر اس بنا پر ہے کہ باوجود کامل غور و فکر کے خدا پر ایمان نہیں لا سکتا تو درخور سرزنش نہیں ہے مگر جو شخص صرف اس وجہ سے خدا کا منکر ہو جائے کہ اس کے مقاصد حسب منشا پورے نہیں ہوتے بلکہ حوصلوں اور ولولوں کا شکستوں سے جواب ملتا ہے تو ضرور مستوجب ملامت ہے کیونکہ اس بات پر دل سے عقیدہ نہیں رکھتا کہ خدا نہیں ہے نہ اتنی ہمت ہے کہ فسخ عزائم کو سعی پیہم کا رہبر بنائے۔ ایسا شخص گویا خدا سے باغی ہو گیا ہے اور چونکہ اخلاق کے معبد میں بھی گزر نہیں ہے خدا کو عورتوں کی طرح کوستا ہے۔ ایک بلند حوصلہ شخص کی طرح خدا کی خدائی سے قطعاً بے نیاز ہو کر اپنی ذات کو اپنا خدا نہیں ماننے لگتا۔

فنی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو جوش کی شاعری میں صرف (Fancy) کارفرما ہے (Imagination)

نہیں ہے یا برائے نام ہے۔ چیزوں کا سطحی ربط دیکھ سکتے ہیں اُن کے گہرے پنہاں تعلقات کو بے نقاب نہیں کرسکتے۔ یہی سبب ہے کہ منظر کی دلکش تصویر تو کھینچ سکتے ہیں مگر یہ نہیں بتا سکتے کہ یہ منظر کیوں دلکش ہے اور اس دلکشی میں فطرت کا کون سا پیغام ہے جس کو وہ شاعر کی زبان سے سننا چاہتی ہے اور تمنا ہے کہ دو سرے بھی سنیں اور منزل مقصود کی طرف ایک قدم آگے بڑھیں۔ مگر میں نے جو کچھ لکھا ہے بجز سمع خراشی کیا ہے۔ اس میں ایک بات بھی تو ایسی نہیں جس کی طرف آپ کے مضمون میں اشارہ نہ ہو۔

اور ایک نقاد فن نے جوش کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ :-

" زمانہ کی آزادی اتنی بڑھتی جارہی ہے کہ قیود فن اور پابندی زبان سب فضول چیزیں ہیں آپ خود صاحب فن اور وسیع النظر ہیں "

الہ آباد سے ایک مشہور اہل نظر نے لکھا کہ :-

" یہ اختر صاحب کون ہیں ؟ خوب کہتے ہیں - ان کے کلام میں جوش صاحب کے کلام کا " روڑھاپن " نہیں پایا جاتا "

گورکھپور سے ایک صاحب جو صد درجہ بالغ نظر ہیں اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں :-

" عرصہ سے مجھ پر یہ حقیقت روشن ہے کہ جوش کی شاعری سطحی، بے روح وبے مغز ہے - اور اُن کا پیغام اُس ترنم و آہنگ سے عاری ہے جس کو میں خلوص کا ترنم اور صداقت کی آہنگ سمجھتا ہوں "

اب میں پھر اپنے تنقیدی حصہ پر آتا ہوں ـــــــ شفق والی نظم تو آپ نے پڑھ لی ہوگی - اب آپ بھی میرے ساتھ ساتھ غور کیجئے اور دیکھئے کہ جو کچھ میں بیان کرتا ہوں وہ کس حد تک صحیح ہے

پہلے بند کے تینوں مصرعوں میں معنوی عدم توازن موجود ہے کیونکہ پہلے مصرعہ میں استعارۂ تشبیہی ہے جس میں شفق کی سرخی کو گلزار کہا گیا ہے - اس لئے اصولاً یا باقی دونوں مصرعوں میں بھی استعارات تشبیہی بیان کئے جاتے یا صرف ان تاثرات سے بحث ہوتی جو پہلے مصرعہ کے استعارہ سے بطور نتیجہ پیدا ہوسکتے ہیں - اگر کہا جائے کہ دوسرے مصرعہ میں اسی نتیجہ کا اظہار ہے تو غلط ہے کیونکہ پہلے اور دوسرے مصرعہ میں کوئی حرف ربط یا کاف بیانیہ نہیں رکھا گیا جو نتیجہ کے مفہوم کو واضح کرے اور نہ محض گلزار فرش سے عرش تک ذرہ ذرہ کو سرشار کرسکتا ہے - گلزار کے ساتھ کسی ایسی صفت کا اظہار ضروری تھا جو دوسرے مصرعہ کے دعوے کو ثابت کرسکتی -

تیسرے مصرعے میں پھر استعارۂ تشبیہی استعمال کیا گیا ہے - اور اس لئے پورے بند میں معنوی عدم توازن کا

عیب پیدا ہوگیا اگر یوں کہا جائے کہ تینوں مصرعوں کا مفہوم بالکل علیحدہ علیحدہ ہے تو یہ بھی صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ اس صورت میں دوسرا مصرعہ بالکل مہمل ہو جائے گا۔ اسی کے ساتھ ایک نقص اور یہ ہے کہ تیسرے مصرعہ میں بھی لفظ "یا" ہونا چاہئے تھا جیسا کہ پہلے مصرعہ میں ہے ورنہ بند مربوط نہیں ہوتا۔

دوسرے بند میں بھی یہی عیب پایا جاتا ہے کہ دوسرے مصرعہ میں باوجود استعارہ تشبیہی ہونے کے لفظ "یا" استعمال نہیں کیا تاکہ پہلے مصرعہ سے ربط پیدا ہو جاتا۔ ـــــ تیسرا مصرعہ بالکل مہمل ہے کیونکہ پہلے دونوں مصرعوں سے کوئی لفظی و معنوی علاقہ نہیں رکھتا۔

تیسرے مصرعہ میں "اس بزم" سے کس طرف اشارہ ہے؟ پہلے دونوں مصرعوں میں کوئی ذکر ایسا نہیں جس سے بزم کا مفہوم پیدا ہو سکے ـــــ دوسرے مصرعہ میں شفق کو خوابگاہ خسرو کا حجاب بتایا گیا ہے۔ جوش صاحب نے حجاب غالباً اس پردہ کے معنی میں استعمال کیا ہے جو مسہری پر پڑا رہتا ہے۔ جس کا اہمال ظاہر ہے۔ پہلے مصرعہ میں جبین حسن پر رنگ شباب کا نمایاں ہونا ظاہر کیا ہے۔ درانحالیکہ رنگ شباب کے لئے چہرہ یا رخسار مخصوص ہے نہ کہ پیشانی۔

تیسرے بند میں پہلے دونوں مصرعے اپنی اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہیں لیکن تیسرا مصرعہ پہلے دونوں مصرعوں سے علیحدہ ہو کر بالکل مہمل ہو گیا، ضرورت تھی کہ کوئی حرف ربط رکھا جاتا مثلاً یہ مصرعہ اگر یوں ہوتا:-

آئینہ ہے جن سے (ان سے) یکسر صنعت پروردگار

تو غیر مربوط ہونے کا عیب جاتا رہتا۔ اور اگر حرف ربط رکھنا منظور نہیں تھا تو اس مصرعہ کو یوں لکھتے۔

واہ ری صناعی فکر جمیل کردگار

تاکہ تیسرا مصرعہ پورا کا پورا اول دو مصرعوں کا بدل واقع ہو جاتا۔

ان تین بندوں کے بعد چار بند جذبات و تاثرات کے اظہار میں لکھے گئے ہیں یعنی شفق کو دیکھنے کے بعد جو کیفیت کسی کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے (یا شاعر کے دل میں پیدا ہوئی ہے) اس کا بیان ہے

پہلا مصرعہ ملاحظہ ہو:-

یہ وہ جلوے ہیں کہ دل کے زخم دیتے ہیں لہو

تاوقتیکہ محذوفات کو ظاہر نہ کیا جائے مفہوم پورا نہیں ہوتا۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ "یہ وہ جلوے ہیں جن کو دیکھ کر دل کے زخم لہو دینے لگتے ہیں (دیتے ہیں کے بجائے دینے لگتے ہیں ہونا چاہئے) لیکن ادا نہ کر سکا۔ بعد کے دو مصرعے صحیح و درست ہیں لیکن پورے بند کو پڑھئے تو معنوی نقص معلوم ہوسکتا ہے۔ پہلے مصرعہ میں زخموں کے لہو دینے کا ذکر ہے، دوسرے مصرعہ میں جستجو کے بیدار ہونے کا بیان ہے اور تیسرے مصرعہ میں شمع آرزو جل اٹھنے کا، حالانکہ

اصولاً ترتیب بیان یوں ہونی چاہئے تھی کہ پہلے جستجو بیدار ہوتی، پھر شمع آرزو جل اٹھتی اور آخر میں دل کے زخم لہو دینے لگتے ـــــ جب پہلے ہی مصرعہ میں دل لہو دینے لگا جو ایک انتہائی کیفیت ہے۔ تو پھر محض جستجو کا پیدا ہونا یا شمع آرزو کا جل اٹھنا کیا اہمیت رکھ سکتا ہے اور ان کے بیان سے کیا ترقی بند میں پیدا ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد کا بند ہے کہ :-

ان مناظر میں اُبلتی ہے ندی جذبات کی　　تیز ہو جاتی ہے دل میں آنچ محسوسات کی
خون کے آنسو رُلاتی ہے شفق برسات کی

تین مصرعوں میں علیحدہ علیحدہ کیفیات کا اظہار کیا گیا ہے جو فن کے لحاظ سے بالکل درست ہے لیکن پہلے مصرعہ میں لفظ "میں" کھٹکتا ہے　مقصود کہنے کا یہ ہے کہ ان مناظر کو دیکھ کر اُبلتی ہے ندی جذبات کی۔ مجھے کلام ہے۔ کہ لفظ "میں" اس مفہوم کو پورا کر سکتا ہے ـــــ دوسرے مصرعہ کا تعلق بھی انھیں مناظر سے ہے لیکن یہاں " آنچ تیز ہو جاتی ہے" جو " ندی کے ابلنے " سے بالکل متضاد بات ہے۔ علاوہ اس کے دل میں "محسوسات کی آنچ" نہیں تیز رہ سکتی۔ البتہ احساسات کی آنچ تیز ہو سکتی ہے۔ لیکن جوش صاحب جنھیں عربی کا علم بقدر فرض کفایہ بھی حاصل نہیں، محسوس و احساس کے فرق کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔

اس کے بعد کے دو بندوں میں شفق کے منظر کو تبدیل شدہ حالات میں دکھایا ہے لیکن اسقدر گھبراہٹ کے ساتھ دفعتہً " سارے جہان کو ادائے خواب میں ملفوف " دکھادیا یعنی بجائے ابتدائی کیفیت شام کے اُس کی انتہائی کیفیت دکھادی ـــ ظاہر ہے کہ " شفق کے رنگ میں جب کچھ کچھ دھواں ملتا جاتا ہے" تو وہ وقت بالکل ابتدا رشب کا ہوتا ہے اور اس وقت کسی " ایک شخص" کو نہیں بلکہ " سارے جہان کو ادائے خواب میں ملفوف " کہنا کسقدر لغو و غلط خیال ہے ـــــ اس بند کا تیسرا مصرعہ اسی بیجا تصنع و آورد کے ساتھ لکھا گیا ہے جو جوش کی شاعری کا جزو لاینفک ہے ـــــ مدعا صرف یہ کہنا ہے کہ آسمان پر تیرگی بڑھتی جاتی ہے لیکن اسے بیان کیا اس طرح کہ

تیرگی میں سر بہ سجدہ ہے غرور آسماں

آخری بند یہ ہے :-

یاد آتی ہے کسی کی کجکلاہی کیا کروں　　چھائی جاتی ہے ہر اک شے پر سیاہی کیا کروں
یہ مناظر کھائے جاتے ہیں الہیٰ کیا کروں

اس بند میں بھی پہلا مصرعہ آخر میں ہونا چاہئے تھا ـــــ اور دوسرا مصرعہ پہلے مصرعہ کی جگہ۔ اور تیسرا دوسرے کی جگہ ـــ اس صورت میں ترتیب شعری کچھ درست ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ اعتراض بدستور باقی رہتا کہ سیاہی چھا جانے

کے بعد کسی کی کجکلاہی یاد آئے" کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔ موجودگی شفق کی حالت میں تو خیر ایک معنوی کیفیت "کجکلاہی" کی پائی جاتی ہے لیکن تاریکی سے اسے کیا واسطہ، غالباً اس لئے کہ شاعر کا کجکلاہ شاید غروب شفق کے بعد ہی آتا ہوگا۔

(نوٹ) اس تنقید کے سلسلہ کا وہ حصہ بہت پُر لطف ہوگا۔ جس میں یہ دکھایا جائے گا کہ جوش صاحب کس طرح دوسروں کے کلام سے اخذ و اقتباس کرکے اپنی نظم کی تشکیل کیا کرتے ہیں۔

(باقی)

تاریخ بغاوت ہند کا ایک گمشدہ ورق

ایک ضعیف نجومی کی خطابت

وہ زمانہ ہے جب ہندوستان کے ہر گوشہ میں بدامنی و بے اعتمادی کی وبا پھیلی ہوئی ہے، وطن و ملک کی محبت کی جگہ خود غرضی و نفسانیت نے لے لی ہے، ہر چہار طرف نفاق و عناد کی آگ مشتعل ہے، ایک رئیس دوسرے رئیس کو، ایک راجہ دوسرے راجہ کو کھائے جا رہا ہے، گوشت سے ناخن جدا ہو رہا ہے اور غریب و مظلوم آبادی آگ اور خون کی راہوں سے گزر رہی ہے۔۔

انھیں امراء میں سے ایک امیر ناناؔ صاحب[1] کے نام سے مشہور ہے جو اپنے محلوں میں داد عیش دے رہا ہے اور باپ کی چھوڑی ہوئی دولت کی بدولت تمام دنیاوی لذتوں کا مالک بنا ہوا ہے اور اس کو مطلق پرواہ نہیں کہ غریب رعایا پر کیا ظلم ہو رہا ہے، کس کس طرح اس کو ستایا جاتا ہے اور ملک میں فقر و فاقہ نے نوع انسانی کے کثیر افراد کو کس حال تک پہونچا دیا ہے —— اگر لوگ انگریزوں کے پاس شکوہ و شکایت لے جاتے ہیں تو وہ اپنے کان بند کر لیتے ہیں اور اگر ناناؔ صاحب سے فریاد کرتے ہیں تو وہ کوڑوں سے خبر لیتا ہے —— آخرکار یہ حالت اسی جگہ پہونچ کر ختم نہیں ہو گئی بلکہ اس میں کچھ اور اضافہ ہوا اور انگریزوں نے علانیہ اپنی مخالفت کا اظہار کر کے تیغ و تفنگ کے ذریعہ سے اپنا تسلط قائم کر لیا۔ حالت یہ تھی کہ اگر کوئی ذرا بھی سرتابی کرتا تھا تو فوراً تہ تیغ کر دیا جاتا تھا اور ایسے آدمیوں کو جن کی طرف سے ضعیف سا امکان بھی مخالفت کا تھا۔ چن چن کر قید و بند میں ڈالا جا رہا تھا۔

---

[1] اس کا اصل نام دانند دہنپتھ تھا اور باجی راؤ پیشوا کا متبنیٰ تھا۔ نانا صاحب برٹش گورنمنٹ کا مخالف تھا کیونکہ ۸ لاکھ سالانہ کی پنشن جس کے دینے کا وعدہ سرجان مالکم نے باجی راؤ سے کیا تھا روک دی گئی تھی۔ نانا صاحب نے اس عناد کا بدلہ برٹش گورنمنٹ سے اس طرح لیا کہ کانپور میں بہت سی انگریز عورتیں اور ان کے بچوں کو قتل کر ڈالا۔ بغاوت کے فرو ہونے کے بعد نانا صاحب بھی دوسرے مفرورں کے ساتھ نیپال کی طرف بھاگ گیا اور پھر پتہ نہیں چلا کہ اس کا کیا حشر ہوا۔

نانا صاحب کے قصر میں ایک بیس سال کی حسین نوجوان لڑکی تھی جسے نانا صاحب کے باپ نے پرورش کیا تھا۔ نانا صاحب بھی اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس لڑکی نے ہر چند اسی قصر ظلم و استبداد میں پرورش پائی تھی، لیکن قدرت نے اُسے عجیب طرح کا دردمند دل عطا کیا تھا۔ اور وہ رعایا کی دردناک حالت دیکھ کر بہت کُڑھا کرتی تھی۔ اگر کبھی وہ نانا صاحب سے اس کا ذکر کرتی اور اس کو لوگوں کی تباہ حالت کی طرف توجہ دلاتی تو وہ جواب دیا کرتا کہ

"میں زندگی کی جس راہ سے گزر رہا ہوں اس کا حال تجھے نہیں معلوم، لیکن تو عنقریب دیکھے گی کہ نانا صاحب خائن نہیں ہے جیسا کہ لوگ اسے سمجھتے ہیں اور نہ وہ انگریزوں کا کاسہ لیس بننا چاہتا ہے جیسا کہ گمان کیا جاتا ہے۔"

نانا صاحب ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوا تھا اور زمانہ کا سرد و گرم کافی دیکھ چکا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ رعایا کا کیا حال ہے، وہ اچھی طرح واقف تھا کہ غریب ہندوستان اپنے سرمایہ دار مالک کے لئے کیونکر اپنے آپ کو قربان کر دیتا ہے۔ اور اس نے عہد کیا تھا کہ اپنی قوم کو اس عذاب سے ضرور نجات دلائے گا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامۂ غدر شروع ہوا اور یکے بعد دیگرے ہندوستان کے تمام حصوں میں آگ مشتعل ہو گئی۔ نانا صاحب نے بھی اس فرصت کو غنیمت جان کر اپنے خواب آزادی کی تعبیر ڈھونڈھنا چاہی، لیکن اس نے بجائے اعلان بغاوت کے خود اپنی ہی قوم کے لوگوں کو ستانا شروع کیا اور انگریزوں کی اعانت کی تاکہ وہ اور پامال کریں۔ —— اس میں نانا صاحب کا کیا راز مستور تھا؟ اس نے کیا تدبیر سوچی تھی؟ اس کا علم کسی کو نہ تھا۔

شہر کی سڑکوں پر آرائشی جھنڈیاں اڑ رہی ہیں، پھولوں سے دروازے آراستہ کئے جا رہے ہیں۔ اور ایک بڑے میدان میں کسی جلسہ کا اہتمام ہو رہا ہے —— کوئی بڑا انگریزی افسر آنے والا ہے، اور نانا صاحب کے حکم سے تمام مخلوق اس کی پذیرائی کے لئے میدان میں جمع ہو رہی ہے۔

وقت معینہ پر انگریز افسر آیا، نہایت تزک و احتشام کے ساتھ نانا صاحب نے اس کا استقبال کیا اور بلند چبوترہ پر اس کو بٹھا دیا —— نانا صاحب داہنی طرف بیٹھا ہوا تھا اور وہ لڑکی بائیں جانب —— فوج چاروں طرف احاطہ کئے ہوئے تھی

انگریز افسر کھڑا ہوا اور یوں مخاطب ہوا:—

"حاضرین! ہم آج تمہاری سرزمین میں فاتحانہ داخل ہوئے ہیں اور جس جس نے تم دو سرکشی کی ہے اس کو پوری سزا دے چکے ہیں۔ لیکن آج میں یہاں تمہارے سردار نانا صاحب کے بلانے پر آیا ہوں جو ہمارا دوست و حلیف ہے اس لئے بتاؤ کہ تم صلح کے خواہشمند ہو یا جنگ کے تاکہ ہم دوستانہ ہاتھ بڑھائیں اگر تم امن کے طالب ہو یا آگ اور خون برسائیں اگر جنگ چاہتے ہو"

یہ سننے کے بعد مجمع میں ہلچل پیدا ہوگئی اور چاروں طرف سے برہمی کے آثار نمودار ہونے لگے ـــــ انگریز افسر نے یہ سمجھ کر کہ اسنے لوگوں کو ڈرانے میں غالباً احتیاط سے کام نہیں لیا، اپنی تقریر کا رُخ بدلنا چاہا، لیکن ناناصاحب فوراً کھڑا ہوگیا اور اس نے قوم کو مخاطب کر کے کہا:۔

"تم لوگ بزدل ہو، ذلیل ہو، بے غیرت ہو، افسوس ہے کہ غیروں کی حکومت کا جوا تمھاری گردن میں پڑا ہوا ہے۔ اور تم اس لعنت کے طوق پر مطمئن معلوم ہوتے ہو، اگر کچھ بھی شرم کا احساس ہے تو اپنی آوازیں بلند کرو اور مقابلہ کے لئے طیار ہو جاؤ"

لوگوں نے یہ سنا اور ایک آواز ہوکر جواب دیا کہ ـــ "تو خائن ہے، تو نمک حرام ہے اور ہم تیرا ساتھ دینے کے لئے آمادہ نہیں" ـــــ

مجمع کی حالت اب ایسی تھی کہ شاید وہ ناناصاحب پر حملہ کر کے فنا کر دے گی، لیکن عین اسی وقت ایک ضعیف العمر انسان اپنی لاٹھی پر ٹیک لگائے ہوئے دفعۃً کھڑا ہوا ـــــ یہ ایک نجومی تھا جس کا نام لوگوں کو معلوم تھا نہ وطن سے واقفیت تھی۔ یہ گاؤں گاؤں پھرا کرتا تھا اور عبادت و ریاضت روحانی کی تعلیم لوگوں کو دیا کرتا تھا۔ ناناصاحب کی ربیبہ (لڑکی) اس کی بڑی عزت کرتی تھی اور یہ بھی اس سے بہت محبت کرتا تھا۔

لڑکی نے انگریز افسر سے کہا کہ ـــ "اس بڈھے کو کہنے دو جو کچھ کہنا چاہتا ہے" ـــ افسر یہ سُن کر خاموش ہوگیا اور بڈھے نجومی نے یوں خطاب کیا:۔

"اے میرے عزیزو، کامل پچاس سال ہوئے کہ میں صحراؤں، پہاڑوں اور جنگلوں میں پھر رہا ہوں، تم دیکھتے ہو کہ میرے ناخن کتنے بڑھے ہوئے ہیں۔ تم یہ بھی دیکھ سکتے ہو کہ میری اونگلیاں اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہیں جیسے کسی طائر کا سینہ تیروں سے چھلنی ہو جائے ـــ ایک زمانہ مجھ پر اس حال میں گزر گیا کہ سیلاب کے سیلاب میرے اوپر سے گزر رہے تھے اور میں اپنی بڑھی ہوئی تشنگی بجھانے کے لئے ایک قطرہ بھی اُن سے حاصل نہ کرتا تھا۔ سالہاسال میں نے اپنی زندگی کے اس طرح بسر کر دئے ہیں کہ تپتے ہوئے صحرا میں میرے عریاں جسم پر گرم آفتاب کی شعاعیں پڑ پڑ کر میرے عروق کے اندر خون کو خشک کرتی چلی جارہی ہیں اور میں نے سایہ کی تلاش میں ایک برگ خشک کی بھی جستجو نہیں کی ـــــ پھر یہ بھی سن لو کہ کامل دس سال میں نے جنگلوں میں اس طرح صرف کر دئے ہیں کہ جب بہت بھوکا ہوتا تھا تو ان کی چھال چاٹ لیتا تھا اور جب بہت پیاس

لگتی تھی تو رات کے آنسوؤں سے جنھیں تم شبنم کہتے ہو تسکین کر لیتا تھا، درندوں نے مجھ سے وحشت ترک کر دی تھی اور چڑیاں میرے الجھے ہوئے بالوں میں آکر بسیرا لیا کرتی تھیں۔"

نانا صاحب ہاتھ میں کوڑا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور ارادہ کیا کہ اسے خاموش کر دے، لیکن انگریز افسر نے کہا کہ نہیں اس کو اپنی تقریر ختم کر لینے دو۔

بڈھے نجومی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:-

"یاد رکھو کہ دنیا کی کوئی شے مجھے نہیں ڈرا سکتی، کسی ضرب کا مجھ پر اثر نہیں ہو سکتا کیونکہ میرا جسم تو پتھر ہو گیا ہے اور اس پر چوٹوں کا اتنا ہی اثر ہوگا جیسے پتھر کی چٹانوں سے ہوا گزر جائے ——— ہاں، تو ایک طویل زمانہ میں نے ایسی فضا میں بسر کر دیا جس کی تاریکی نہایت شدید اور جس کا سکون حد درجہ خوفناک تھا۔ میں اس تاریکی میں گھرا ہوا تھا، اس سیاہ چادر نے میری بصارت و بصیرت دونوں پر پردہ ڈال رکھا تھا کہ دفعتاً ایک دن یہ پردہ پھٹا اور ایک آسمانی کڑک نے مجھ کو بیدار کر کے کہا کہ اٹھ کھڑا ہو اور چل! معرکہ کا دن آگیا ہے۔ چل اور اپنے راستے میں اُن سُرخ بیجوں کو بکھیرتا جا جو تیری مٹھی میں بند ہیں۔ چل، اپنی کرخت راگنیوں کو فضا میں بلند کر اور پکار پکار کر سب کو بلا اور کہہ کہ "آؤ اِن خونیں کھیتیوں کو کاٹیں، اے کاہل و ناعاقبت اندیش کسانو، دن طلوع ہو گیا ہے اور آفتاب اپنے خنجر لے کر بلند ہو چلا ہے، آؤ، چلو، بڑھو اور ان سُرخ کھیتیوں کو کاٹنا شروع کرو۔"

یہ کہہ کر اُس نے انگریز افسر اور اس کی سُرخ پوش فوجوں کی طرف اشارہ کیا ——— نانا صاحب یہ سنتے ہی چیخ اٹھا۔ "اے میرے دوست تو نے بالکل صحیح کہا، کھیتی کاٹنے کا وقت آگیا ہے ——— ایک گھنٹہ نہ گزرا تھا کہ انگریزی افسر مع اپنی فوج کے قید خانہ میں پڑا ہوا تھا۔ اور جوق در جوق جماعتیں جنگ کے لئے آمادہ ہو کر چلی آ رہی تھیں

اِس واقعہ سے تو تاریخ کے صفحات خالی ہیں، لیکن اس کے بعد کا حال سب کو معلوم ہے کہ کامل دو سال تک نانا صاحب نے انگریزوں سے جنگ کی اور جب وہ کانپور میں پوری بے رحمی کے ساتھ اس "سُرخ کھیتی" کو کاٹ چکا تو ۱۸۵۹ء میں اپنی اہلیہ اور احباب و اعوان کے ساتھ کسی طرف کو نکل گیا ——— انگریزوں نے یہ خبر مشہور کی کہ نانا صاحب مارا گیا اور عنقریب اسکا سر دہلی کے بازاروں میں گشت کرایا جائیگا لیکن اسکی تکمیل کبھی نہیں ہوئی اور آج تک کسیکو نہیں معلوم کہ نانا صاحب کو آسمان کھا گیا یا زمین۔۔

موسیقی عہد نبوی و خلفاء راشدین میں

قبل عہد اسلام ایام جاہلیت میں موسیقی عربستان کے تمام بڑے بڑے مقامات میں رائج تھی۔ مکہ، یثرب، طائف، خیبر، وادی القریٰ، دومۃ الجندل، مسقط، عدن، حضرموت، حیرہ، انبار، اہواز، دمشق، بعلبک اور بصرہ وغیرہ میں ہر جگہ مختلف لحن و لہجہ کے ساتھ گانے کا رواج پایا جاتا تھا۔ لیکن جب ظہور اسلام ہوا تو لوگوں کا ذوق موسیقی کی طرف سے ہٹکر قرآن مجید کی طرف منتقل ہوگیا اور بجائے شعر و غنا کے اصلاح اجتماعی اور فتوحات ملکی کی طرف مائل ہوگئی۔ رسول اللہ کے سامنے جب شعر و شاعری کا ذکر آتا تھا یا کوئی شاعر اپنا کلام سناتا تھا تو آپ اس کے جواب میں صرف قرآن پاک کی آیت پڑھ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ طفیل بن عمرو الدوسی (مشہور شاعر) جب رسول اللہ کے پاس آیا اور اسلام اس کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے کہا کہ میں مرد شاعر ہوں جو کچھ میں کہتا ہوں پہلے اسے سن لو۔ رسول اللہ نے فرمایا کہو، سنو چند شعر عربی کے پڑھے[1] رسول اللہ نے سنکر سورۂ اخلاص پڑھی اور آخر کار یہ مسلمان ہوگیا۔ اسیطرح جب خلیفۂ ثانی نے کوفہ میں مغیرہ بن شعبہ کیطرف اپنی عامل کو بھیجا اسنے کہا کہ تمھارے شہر کے شعرائے اسلام کے باب میں جو کچھ لکھا ہے اسے سناؤ۔ پس مغیرہ نے اصحاب معلقات میں سے کسی کو لبید العامری کے پاس بھیجا جو اس وقت کوفہ میں موجود تھا — اس سے کہا گیا کہ اسلام کے بارہ میں جو کچھ تم نے لکھا ہے سناؤ۔ یہ سنکر لبید نے سورۂ بقر پیش کر دی اور کہا کہ اسلام نے شعر و شاعری کی جگہ ہم کو یہ چیز دی ہے۔ لبید بڑا مشہور شاعر عہد جاہلیت کا تھا لیکن اسلام لانے کے بعد اسنے شاعری ترک کر دی تھی۔ اور سوائے ایک شعر[2] کے دوسرا شعر نہیں کہا۔

---

[1] وہ اشعار یہ ہیں:—

لاواله الناس فالمرحربهم — ولوحاربتنا مسهب ونبوتهم
ولما يكن يوم تزول نجومه — تطيربه الركبان ذونباء ضخم
اسلماعلى خسف ولست نجالد — ومالى من ورق اذاجاءنى حتمى
فلا اسلم حتى نخمز الناس جيفة — ويصبح طيركا نسات على لحمى

[2] وہ شعر یہ ہے:—

الحمد لله اذ لم ياتنى اجلى — حتى اكتسيت من الاسلام سربالا

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ رسول اللہ کو موسیقی سے نفرت تھی یا غناء کو آپ نے حرام کر دیا تھا کیونکہ ولیمۂ عرس کے موقعہ پر خود آپ نے عورتوں کو گاتے ہوئے سنا اور منع نہیں فرمایا۔

اسی طرح جب آپ مکہ سے یثرب کی طرف ہجرت کر کے تشریف لے گئے تو انصار کی عورتوں نے آپ کے استقبال میں دف بجا بجا کر گانا گایا اور آپ نے اسے سنا ——— رسول اللہ اچھی آواز کو بہت پسند فرماتے تھے اور بلال حبشی کو اذان کی خدمت پر مامور محض اُن کے حُسنِ آواز کی وجہ سے تھا۔ آپ بلالؓ سے اکثر قرآن سنا کرتے تھے اور آپ کو بہت لطف آتا تھا۔

خود فن قرأت و تجوید کو ملاحظہ کیجئے کہ وہ لحن کے مختلف طریقوں اور تال کے نظم وقفوں سے پیدا ہوا ہے۔ اور اس فن کی اصطلاحیں اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً صرف ایک مد کو لیجئے کہ فن تجوید میں اس کی چار قسمیں کر دی گئی ہیں طبعی متصل۔ منفصل۔ لازم۔ اور یہ قسمیں حقیقتاً موسیقی کے گھٹاؤ بڑھاؤ ہیں جن کا علیحدہ نام رکھ دیا گیا ہے۔ اسی طرح اصطلاحات ادغام، اظہار، اخفاء، اقلاب، غنہ، حروف ہمس و جہر، استفالہ و ترقیق تفخیم و رخو، شدت و توسط، صفیر و اطباق، انفتاح و اذلاق، قلقلہ و وقف وغیرہ ..... کو دیکھئے کہ فی الحقیقت ان سب کا تعلق لحن و موسیقی سے ہے لیکن اس خیال سے کہ یہ فن لہو و لعب میں داخل ہو جائے موسیقی سے علیحدہ اس کی اصطلاحیں مقرر کی گئیں۔

خود قرآن کو بھی ترتیل کے ساتھ پڑھنے کا حکم ہے۔ اور ترتیل کی تفسیر میں امام نیشاپوری نے جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مخصوص وقفوں کے خوش الحانی سے الفاظ کو ادا کرنا ہی ترتیل ہے۔ بہر حال جس حد تک نفس خوش الحانی و حُسنِ صوت کا تعلق ہے اسلام نے اس کی مخالفت نہیں کی بلکہ بعض حالات میں رسول اللہ نے غناء کی طرف ترغیب بھی دلائی ہے۔ چنانچہ ایک بار انصار میں سے کسی کی لڑکی کی شادی ہوئی تو رسول اللہ نے جناب عائشہ سے دریافت فرمایا کہ کیا تم لوگوں نے اسے رخصت کر دیا جواب دیا ہاں، آپ نے پوچھا کہ تم لوگوں کے ساتھ کوئی گانے والا بھی تھا۔ آپ بولیں نہیں۔ رسول اللہ نے فرمایا کیا تمھیں نہیں معلوم کہ انصار کی قوم گانے کو بہت پسند کرتی ہے۔ کیا تم میں سے کوئی اس کے ساتھ ایسا نہ تھا جو کہتا:- اتیناکم اتیناکم فحیونا نحییکم ولولا الحبة السمراء لم نحلل بوادیکم

[1] گیت یہ تھا:-

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع
ایہا المبعوث فینا جئت بالامر المطاع

ایک بار رسول اللہ ایک کنیز کے پاس سے گزرے اس حال میں کہ وہ گا رہی تھی

هل علیّ ویحکمون ان لهوتُ من حرج

تو آپ نے یہ سنکر فرمایا　　" لاحرج انشاء الله "

ایک مرتبہ رسول اللہ نے رات کے وقت بلال کو یہ اشعار گاتے سنا اور پسند فرمایا۔

الا لیت شعری هل ابیتن لیلة　　بمکة حولی اذخر وجلیل

وهل اردن یوما میاه مجنة　　وهل یبدون لی شامة وطفیل

حضرت عمر بن الخطاب اور عبداللہ بن رواحۃ رسول اللہ کے ساتھ ساتھ سفر میں ہیں۔ چونکہ منزل طویل تھی اس لئے رسول اللہ نے چاہا کہ اونٹ کو تیز چلایا جائے اور عبداللہ بن رواحۃ سے کہا کہ اگر اونٹ " حدی خوانی " سے تیز چل سکتا ہو تو شروع کرو۔ وہ فرط حیا سے خاموش رہے، لیکن حضرت عمر نے کہا کہ تم رسول اللہ کا کہنا نہیں مانتے اس پر عبداللہ نے یہ شعر گانے شروع کئے :-

والله لولا الله ما اهتدینا　　ولا تصدقنا ولا صلینا

الکافرون قد بغوا علینا　　اذا ارادوا فتنة ابینا

ونحن عن فضلک ما استغنینا　　فثبت الاقدام ان لاقینا

وانزلن سکینة علینا

ایک بار کسی اعرابیہ نے نذر مانی کہ اگر رسول اللہ غزوہ سے صحیح وسلامت واپس آجائیں گے تو میں دف پر گانا گاؤں گی، چنانچہ جب آپ واپس تشریف لائے تو آپ نے اس کو حضور ہی کی اجازت دی اور اس کا گانا سنا۔

اسلم حضرت عمر کا غلام تھا اس سے روایت ہے کہ " ایک بار میں اور عاصم دونوں گا رہے تھے کہ حضرت عمر اس طرف سے گزرے اور ٹھہر کر سننے لگے ـــــ جب گانا ختم ہوا تو فرمایا کہ پھر گاؤ، چنانچہ ہم نے پھر اعادہ کیا۔ اور پوچھا اے امیر المومنین ہم میں سے کون بہتر گاتا ہے ـــــ جواب دیا کہ تم دونوں گدھے ہو، پوچھا کہ ہم میں کون گدھا بر تر ہے۔ آپ نے فرمایا " یہ بھی وہ بھی " ـــ میں نے کہا کہ " میں ان گدھوں میں غالباً اوّل گدھا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں تمہارا درجہ دوسرا ہے " ـــــ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ موسیقی کے نقاد بھی تھے اور برا گانے والوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔

مدینہ منورہ میں سعد بن وقاص صحابی کا ایک غلام " قند " تھا جو نہایت اچھا گانے والا تھا۔ اور جناب عائشہ محض گانے کی وجہ سے اس کا بڑا خیال رکھتی تھیں۔ ایک بار سعد بن وقاص نے اسے مارا تو آپ خفا ہو گئیں۔ اور کہا کہ جب تک سعد بن وقاص، قند کو راضی نہ کر لیں گے میں ان سے بولوں گی نہیں ـــــ چنانچہ سعد بن وقاص نے

اس کو راضی کیا اور اس کے بعد آپ اُن سے ہمکلام ہوئیں۔

الغرض جس حد تک گانے کا تعلق ہے موسیقی و غناء اسلام میں حرام نہیں ہے بعض نے اس کی حرمت کا فتویٰ دیتے ہوئے اس آیت کو استدلالاً پیش کیا ہے :۔

"ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ

بغیر علم ویتخذھا ھزوا اولئک لھم عذاب مھین ۔"

کیونکہ ان کے نزدیک غناء لھو الحدیث میں داخل ہے حالانکہ یہ آیت نضر بن حارث کے حق میں نازل ہوئی تھی جو فارس سے قدیم سیر و تاریخ کی کتابیں لاکر ترجمہ کیا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ یہ قرآن سے بہتر ہیں۔ گانے سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں ـــــــــ لیکن اس میں کلام نہیں کہ ابتداء عہد اسلام میں چونکہ صرف اجتماعی و اخلاقی اصلاح پیش نظر تھی اس لئے اس فن کی ترقی کا کوئی موقعہ نہ تھا۔

فنون لطیفہ از خود ایک قوم کی تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ نشو و نما پاجاتے ہیں۔ اس لئے ابتدائی حالت میں کسی ملک یا قوم کا ان کی طرف متوجہ ہونا کبھی فنی لحاظ سے مفید نہیں ہوسکتا خود تاریخ اسلام کو اٹھاکر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جب رسول اللہ کے بعد فتوحات وسیع ہونے لگیں اور تمدنی ترقی کے آثار پیدا ہونے لگے تو ساتھ ہی ساتھ موسیقی کو بھی ترقی ہوئی۔

عہد بنی امیہ میں عود، طنبور اور دف کے ساتھ قصاید و اشعار گانے کا رواج عام ہوگیا تھا۔ اور عہد بنی عباس میں تو موسیقی نے ایک مستقل علم و فن کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ نئی نئی راگنیاں ایجاد ہورہی تھیں، گانے کے مختلف طریقے سوچے جارہے تھے اور ماہرین کی ایک جماعت مستقلاً اسی فن کی خدمت کررہی تھی، چنانچہ یونس، احمد ابن المکی، عمرو بن بانہ، بذل المغنیہ، اسحاق موصلی، اس عہد کے خاص ماہرین موسیقی تھے۔ اور مؤلفین میں جو شہرت یعقوب بن اسحاق الکندی، ابو نصر فارابی اور بو علی بن سینا کو حاصل تھی وہ بھی ارباب تاریخ سے مخفی نہیں۔

شعاعوں کے حیرت انگیز استعمالات

انکشاف جرائم کی ایک نئی راہ

حال ہی میں نیویارک (امریکہ) کے ایک جرائم پیشہ گروہ نے نہایت ہی معمولی قسم کا عطر طیار کیا اور فکر یہ کی کہ بازار کے قیمتی سے قیمتی عطر کی طرح فروخت ہو ——— انھوں نے کامل غور کے بعد یہ تدبیر اختیار کی کہ بازار سے عطر کی ایک شیشی جس کی قیمت ۲۰ گنی تھی لے کر، شیشیاں بنانیکے کارخانہ میں گئے اور اس کو آمادہ کیا کہ بالکل اسی قسم کی شیشیاں طیار کردے۔ جب شیشیاں طیار ہوگئیں تو ان میں نہایت ہی معمولی قسم کا عطر بھر دیا اور اُن پر بالکل اسی قسم کا لیبل چھپواکر چپاں کردیے جو اس قیمتی عطر کی شیشی پر پایا جاتا تھا ——— جب یہ شیشیاں بازار میں پہونچیں اور لوگوں نے انھیں خریدا تو دوکانداروں سے شکایت کی گئی کہ عطر میں میل کیوں کیا جاتا ہے اور عمدہ عطر کے دام لے کر خراب عطر دینے کا کیا سبب ہے۔

دوکان دار غریب حیران تھے کہ یہ کیا معاملہ ہے اور ان کی سمجھ میں کوئی تدبیر نہ آتی تھی کہ بند شیشیوں کے اندر اچھے اور خراب عطر کی تمیز کیونکر کی جائے ——— آخر کار یہ معاملہ مقامی پولیس تک پہونچا اور ڈاکٹر ہرحان سے مشورہ طلب کیا گیا جو شعاعوں کے ذریعہ سے کشف جرائم میں خاص مہارت رکھتا تھا ——— یہ شیشی لے کر اپنی تجربہ گاہ میں گیا اور فوق البنفسجی شعاعیں اس پر ڈالیں اس کے بعد اور متعدد شیشیاں لے کر تجربہ کیا تو معلوم ہوا کہ اچھے عطر کی شیشی سے جو شعاعیں گزرتی ہیں وہ نیلگوں ہوتی ہیں اور خراب عطر کی شیشی سے گزرنے والی شعاعیں زرد ہوتی ہیں ——— اسی طرح اس نے لیبل پر بھی شعاعیں ڈالیں تو معلوم ہوا کہ اصلی شیشی کا لیبل چھاپنے کے لئے جو سیاہی استعمال کی گئی ہے وہ اور ہے اور نقلی شیشی کا لیبل کسی اور سیاہی سے چھاپا گیا ہے ——— آخر کار دکانداروں نے یہ آلہ خرید کر اپنی کان کی تمام شیشیوں کا امتحان کرلیا اور جتنی خراب عطر کی شیشیاں تھیں اُن کو علحدہ کردیا۔

چند موٹر ڈرائیور سڑک کے ایک جانب کھڑے ہوئے ٹائر درست کر رہے تھے کہ قریب ہی ایک خندق میں انھیں

لاش نظر آئی جس کے سر سے گولی گزر گئی تھی۔ دیکھ بھال سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی شخص سے اس کا جھگڑا ہوا تھا کیونکہ کشمکش کے نشان وہاں موجود تھے۔ اسی کے ساتھ ایک سرخ ریشمی رومال بھی گھاس پر پڑا ہوا ملا جو غالباً قاتل کا تھا اور بھاگتے وقت گھبراہٹ میں وہیں چھوٹ گیا تھا —— مقتول ایک نہایت مشہور بخیل زمیندار تھا جو اپنے کاشتکاروں کو بہت تکلیف پہونچایا کرتا تھا اور کاشتکار اس کے پاس تہدید و تخویف کے خطوط بھی بھیجا کرتے تھے —— پولیس نے خیال کیا کہ یقیناً انھیں پڑوس کے مزارعین میں سے کسی نے اس کو ہلاک کیا ہوگا اور اسی یقین کی بنا پر تفتیش شروع کر دی گئی۔ —— دوران تفتیش میں جب رومال پر غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں جا بجا مٹی کے دھبے بھی موجود ہیں جیسے پسینہ پونچھنے سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ رومال ایک ماہر فن کے پاس بھیجا گیا — اس نے جب رومال پر شعاع ڈالی تو رومال کے دھبے چمکنے لگے —— اس نے کہا کہ اس مٹی میں کوئی ایسا مادہ ہے جو فاسفورس کی طرح چمکتا ہے —— پولیس نے تمام مزارعین کے کھیتوں اور مکانوں کی مٹی کو امتحان کے لئے بھیجا تاکہ جس مزارع کے کھیت یا مکان کی مٹی ویسی ہی چمکتی ہوئی نظر آئے گی اسی کو مجرم گردانا جائے گا، لیکن پولیس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب کسی مزارع کے کھیت کی مٹی اس طرح کی نہ نکلی —— جستجو سے معلوم ہوا کہ جائے قتل کے قریب ہی ایک بڑا گڑھا ہے جس کے اندر سے کنکر نکلتے ہیں اور چینی کا برتن بنانے کے لئے مزدور یہاں سے مٹی لے جا کر فروخت کرتے ہیں۔ جس وقت اس خندق کی مٹی کا امتحان لیا گیا تو وہ بالکل اسی طرح چمکنے لگی جس طرح رومال کے دھبے چمکتے تھے۔ آخرکار تمام مزدور طلب کئے گئے اور قاتل گرفتار ہو گیا۔ اس نے بعد کو بیان کیا کہ مقتول مٹی لے جانے سے اسے روکتا تھا اس لئے غصہ میں آ کر اس نے پستول کا فیر کر دیا

امریکہ کے اخباروں میں یہ خبر شائع ہونے لگی کہ فلاں مجرم جس کا نام کابونی ہے سزایاب نہیں ہوا بلکہ اس نے ایک اور شخص کو جو بالکل اسی کا ہم شکل ہے۔ اپنی جگہ قیدخانہ میں بھجدیا ہے اور خود آزاد پھر رہا ہے —— کابونی کے چہرہ پر بھی زخم کا سا ایک داغ تھا اور جو شخص اس کی جگہ قیدخانہ گیا تھا وہ بھی ویسا ہی داغ رکھتا تھا، لیکن فرق یہ تھا کہ کابونی کا داغ بہت پرانا تھا اور دوسرے شخص کا جدید۔ اس لئے ماہر فن نے کہا کہ اس شخص کے داغ پر شعاعیں ڈال کر دیکھنا چاہئے۔ اگر داغ پرانا ہوگا تو چمکدار نیلا نظر آئے گا ورنہ نہیں۔ چنانچہ یہ تجربہ کیا گیا اور اخباروں کی خبر بالکل صحیح نکلی۔ بعد کو اصل مجرم ڈھونڈھ کر گرفتار کیا گیا اور اس کو سزا دی گئی۔

ایک بار سڑک پر ایک لاش ملی جس کے پاس کانچ کے بہت سے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ خیال کیا گیا کہ غالباً کسی موٹر سے ٹکر کھا کر یہ شخص مرا ہے اور کانچ کے ٹکڑے موٹر کے لمپ کے ہیں —— اتفاق سے تلاش کرنے پر قریب ہی کسی گراج میں ایک موٹر نظر آیا جس کا لمپ آگے کی جانب کا ٹوٹا ہوا تھا اور کانچ کے وہ ٹکڑے جو لاش کے پاس ملے

تھے قریب قریب اس کانچ سے ملتے جلتے تھے۔ جو لمپ میں لگا ہوا رہ گیا تھا۔ علاوہ اس کے یہ بھی تحقیق ہو گیا کہ گزشتہ شب کو موٹر ڈرائیور اسے لے گیا تھا اور راستہ میں شیشہ بھی ٹوٹا تھا —— الغرض اسقدر تحقیق کے بعد موٹر ڈرائیور گرفتار کیا گیا۔ اس نے کہا کہ " بیشک میں رات کو موٹر لے گیا تھا اور لمپ بھی راستہ میں ٹوٹا لیکن کسی آدمی سے ٹکرا کر نہیں بلکہ ایک اور موٹر سے ٹکرا کر جو نہایت تیزی سے گزر رہی تھی " آخرکار کانچ کے وہ ٹکڑے جو لاش کے پاس پڑے تھے اور وہ ٹکڑے جو لمپ میں لگے ہوئے رہ گئے تھے۔ ماہر فن کے پاس بھیجے گئے اور اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ لاش کے پاس جو کانچ کے ٹکڑے ملے ہیں وہ موٹر کے لمپ نہیں ہو سکتے، کیونکہ ان سے شعاعیں سبز ہو کر نکلیں اور لمپ کے شیشہ سے کسی اور رنگ کی۔ آخرکار یہ چھوڑ دیا گیا اور بعد کو جستجو سے اصل مرتکب جرم کا گرفتار کیا گیا

چکاگو کے جوار میں ایک چور تھا جو رات گئے آنے جانے والی عورتوں کو ریوالور کا فیر کر کے روک لیتا تھا اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا تھا لوٹ لیتا تھا، اور پھر فوراً ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر منہ چوم لیتا تھا اور چھوڑ دیتا تھا۔ لیکن ہاتھ میں اس کے دستانہ ضرور رہتا تھا تاکہ عورتوں کے چہرہ پر اس کے ہاتھ کا نشان نہ پایا جائے

ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا لیکن کسی طرح گرفتار نہ ہو سکا —— پولیس نہایت سرگرمی سے اس کی جستجو کر رہی تھی کہ اتفاق سے ایک رات ایک نوجوان جو نہایت اچھے ملبوس میں تھا۔ اسی مقام پر ملا جہاں گزشتہ رات اسی قسم کا ایک واقعہ ہو گیا تھا۔ اس کو گرفتار کیا گیا لیکن اس نے ثابت کر دیا کہ جس وقت واقعہ ہوا ہے وہ یہاں موجود ہی نہ تھا، پولیس نے اسے تو ضمانت پر چھوڑ دیا لیکن اس کے دستانے امتحان کی غرض سے لے لئے —— جس وقت ان دستانوں پر شعاعیں ڈالی گئیں تو معلوم ہوا کہ داہنے ہاتھ کے دستانے کے وسط میں ایک مستطیل سا نشان ایسا ہے جس سے شعاعیں عجیب رنگ کی گزرتی ہیں۔ اب مزید جستجو کے سلسلہ میں وہ لڑکی طلب کی گئی جس پر آخری بار حملہ کیا گیا تھا اور اس کے ہونٹوں پر لگی ہوئی سرخی کا امتحان لیا گیا تو اس سے بھی بالکل وہی رنگ پیدا ہوا جو دستانے کے داغ سے پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ اس سے ثابت ہو گیا کہ دستانہ اسی لڑکی کے ہونٹوں سے مس ہوا تھا اور مجرم کو سزا دی گئی

شہر کوپن ہاگن سے قریب خندق میں ایک عورت کی لاش ملی جس کے دونوں پاؤں پنڈلیوں سے کٹے ہوئے تھے۔ پولیس نے غائب ہو جانے والے لوگوں کی فہرست میں جستجو کی لیکن کچھ پتہ نہ چلا کہ یہ عورت کون ہے۔ پولیس نے عکس ریز (X-Rays) کے ذریعہ سے اس کے اندرونی اعضاء کی تصویر لی تو معلوم ہوا کہ اس کے پھیپھڑے میں سل کی بیماری کے داغ کثرت سے پائے جاتے ہیں، پولیس نے یہ دیکھ کر ان شفاخانوں کی جستجو کی جہاں اس بیماری کے مریض رکھے جاتے ہیں اور آخرکار ایک شفاخانہ میں ایک پھیپھڑے کی تصویر ملی جو بالکل عورت کے پھیپھڑے کی طرح تھو

اور پتہ چلا کہ اس عورت کا یہ نام تھا یہ پتہ تھا اور دو ہفتے ہوئے کہ وہ اپنے گھر چلی گئی تھی۔ پولیس اس کے مکان پر پہونچی اور مختلف کاغذوں اور کپڑوں کی جستجو کے سلسلہ میں اونگلیوں کے نشان بھی کسی کسی چیز پر نظر آئے اور انھیں نشانوں سے پتہ چلا کہ مقتول واقعی وہی عورت تھی بعد کو قاتل بھی ملا اور اس کو سزا ہوئی

اوپر کی چند مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ فوق البنفسجی شعاعوں سے تحقیق جرائم میں کتنی زبردست مدد ملتی ہے۔ اور ان شعاعوں کے اثرات ونتائج کس درجہ قابل یقین ہوتے ہیں۔ ماہرین فن کا بیان ہے کہ اس طریق سے ہزاروں قسم کی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں اور دنیا کی کوئی دو چیزیں ایسی نہیں ہیں جن میں ذرا سا بھی کسی قسم کا اختلاف ہو اور اس طریق عمل سے ظاہر نہ ہو جائے۔

ڈاکٹر گوڈمین نے جو اس کے بڑے ماہر ہیں اس وقت تک ۲۰ ہزار نمونے ان شعاعوں کے منضبط کر لئے ہیں اور انکا بیان ہے کہ اگر کسی جرم کی جائے وقوع پر کاغذ یا چمڑے کا کوئی ٹکڑا یا بال کا کوئی حصہ نظر آئے تو وہ بھی انکشاف جرم کے لئے کافی ہے کیونکہ شعاعی عمل کے ذریعہ سے فوراً معلوم ہو سکتا ہے کہ اس چمڑے کی دباغت کس طرح ہوئی ہے۔ اور مختلف دباغتوں کے مختلف رنگ پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح کاغذ کے ٹکڑے کا امتحان کرنے سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کاغذ کہاں کہاں رہا ہے اور وہ کن کن چیزوں سے مس ہوا ہے۔ بال کا بھی یہی عالم ہے کہ ہر چند بظاہر تمام بال ایک ہی قسم کے معلوم ہوتے ہیں، لیکن شعاعی تجربہ سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف لوگوں اور قوموں کے بال سے کتنے رنگ مختلف پیدا ہوتے ہیں۔

اس طریقہ سے اصلی ونقلی سنگ مرمر، اچھے اور بُرے ریشم کی بھی پہچان ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ آٹا کس قسم کی چکی کا پسا ہوا ہے، چنانچہ ایک چور کے کپڑوں پر آٹے کے ذرات نظر آئے اور شعاعی تحقیق سے پتہ چل گیا کہ یہ آٹا فلاں چکی کا پسا ہوا ہے۔

شعاعی تجربہ سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک عورت کے بالوں کا حسن قدرتی ہے یا مصنوعی، کیونکہ قدرتی حسن والے بالوں سے تقریباً ۱۲ قسم کی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں اور مصنوعی طور سے جو حسن پیدا کیا جاتا ہے وہ ہمیشہ ایک ہی قسم کی شعاع پیدا کرتا ہے البتہ یہ ضرور معلوم ہو سکتا ہے کہ بالوں میں کس قسم کا مسالہ، تیل، یا عطر استعمال کیا گیا ہے۔

فرض کیجئے کسی کمرہ کے اندر کوئی مقتول نظر آیا اور ماحول کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو آدمیوں میں باہم ضرور کشاکش ہوئی ہے اور بظاہر کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے قاتل کا پتہ چل سکے تو آپ سوائے خاموش رہنے کے اور کیا کر سکتے ہیں، لیکن امریکہ کی پولیس مقتول کے ناخنوں کو دیکھے گی کہ آیا اس کی نوچ کھسوٹ میں قاتل کی کھال کا کوئی حصہ تو بچ کر نہیں آگیا اور پھر شعاعی تجربہ سے فوراً معلوم کر لے گی کہ قاتل کس قوم وجنس کا تھا۔ چنانچہ امریکہ میں ایک بار

بالکل ایسا ہی اتفاق پیش آیا اور پتہ چلا کہ قاتل زنگی تھا اور چونکہ قتل کا واقعہ جاڑوں میں ہوا تھا۔ اس لئے یہ سمجھ لیا گیا کہ قاتل ضرور جنوب کی طرف سے آیا ہوگا اور آخرکار اس کا پتہ چل گیا۔

پھر یہ تمام نتائج اتفاقی نہیں ہیں بلکہ حقائق علمی کی صورت رکھتے ہیں جو مختلف ممالک یورپ میں متعدد ماہرین فن کے ہزاروں تجربہ کے بعد حاصل ہوئے ہیں۔ چنانچہ اڈمون لوکار جو فرانس کا مشہور ماہر فن ہے اس نے اسی شعاعی عمل سے فرانس کے تمام مصنوعات کا تجربہ کرکے معلوم کر لیا ہے کہ فلاں کارخانہ کے غبار سے کس قسم کی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں ـــــــ اسی طرح آگسٹ باسینی نے جو شکاگو میں علمی ذرائع سے کشف جرائم پر مامور ہے، معدنی اشیاء کی تحقیق کرکے بہت سے جرائم کا اکتشاف کیا ہے۔ اس نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں تمام زہروں کا شعاعی تجربہ کرکے نتائج درج کئے ہیں۔

نیویارک کے ڈاکٹر گوڈمین نے عورتوں کے اسباب زیبایش و آرایش کی تحقیق کی ہے اور معلوم کیا ہے کہ مختلف تیلوں، عطروں، پوڈروں، غازوں سے کتنی مختلف رنگ کی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں اور اس طرح اسنے ۲۰۰ جرائم کا اکتشاف کیا ـــــــ اسی طرح شعاعی عمل سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک ناخن کا ٹکڑا کتنے عرصہ کا کٹا ہوا ہے۔

گزشتہ سال باسینی کے معامل کیمیاوی نے اعلان کیا تھا کہ قوقازی جنس کے آدمیوں کے دانت اگر گھسے جائیں تو ان سے نیلگوں شعاع پیدا ہوتی ہے، مشرقی لوگوں کے دانتوں سے زرد اور زنگیوں کے دانتوں سے سرخ شعاع نکلتی ہے۔ چنانچہ شکاگو کے کسی گندے نالہ میں ایک لاش پائی گئی جو بالکل پھول کر خراب ہوگئی تھی اور اوس کی شناخت مشکل تھی۔ سر البتہ ٹوٹا ہوا تھا اس لئے اس کے مقتول ہونے کا یقین ضرور تھا۔ اب جستجو یہ ہوئی کہ آیا اسے چوروں نے ہلاک کیا ہے یا چینی آبادی میں قتل کیا گیا ہے۔ اس کا ایک دانت امتحان کے لئے بھیجا گیا اور اسے گھس کر شعاعی تجربہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ مقتول مشرقی جنس کا ہے اور آخرکار اسی تحقیق سے یہ اکتشاف ہوا کہ چینیوں نے اسے مار کر نالہ میں پھینک دیا تھا۔

امریکہ میں ایک ماہر فن نے اسی شعاع کا آلہ بنا کر بازار میں پیش کیا ہے اور ہر شخص اسے خرید سکتا ہے، چنانچہ بنکوں میں عام طور پر اس کا استعمال شروع ہوگیا ہے اور نہایت آسانی سے کھرے کھوٹے سکے اور اصلی و نقلی نوٹ کا پتہ چل جاتا ہے ـــــــ یورپ کے بھی اکثر بنکوں میں اس قسم کے لمپ رکھے رہتے ہیں تاکہ جعلی نوٹ اور کاغذات مالی کا پتہ ان سے چلایا جائے۔ کیونکہ اصلی نوٹوں سے نیلگوں شعاعیں پیدا ہوتی ہیں اور نقلی نوٹوں سے سبزی مائل ـــــــ

مثلثی شیشوں سے جو شعاعیں نکل کر اپنی تموجات منتشر کرتی ہیں۔ وہ بھی فواید سے خالی نہیں ہیں اگر

خورد بین تبرّو عزائی کے ساتھ ان کا استعمال کیا جائے۔ چنانچہ ایک بار کوئی امریکی فلاح اپنے داماد کے ساتھ موٹر پر سوار ہو کر گیا۔ راستہ میں موٹر الٹ گیا اور بڈھا فلاح ایک پتھر سے ٹکرا کر مر گیا۔ تفتیش کی گئی تو داماد نے بیان کیا کہ جس وقت پتھر سے موٹر ٹکرایا تو میں کود کر علیحدہ ہو گیا لیکن بڈھا فلاح نہ نکل سکا اور پتھر کے تصادم سے مر گیا۔ چند دن کے بعد معلوم ہوا کہ اس فلاح کو حال ہی میں کسی بیمہ کمپنی سے بڑی رقم ملی تھی اس لئے کچھ شبہ پیدا ہوا اور شعاعی عمل کیا گیا جس سے یہ پتہ چلا کہ بڈھے سر سے جو ریزے پتھر کے نکلے ہیں وہ اس پتھر کے ریزوں سے بالکل مختلف ہیں جس سے موٹر کا ٹکرا جانا بیان کیا جاتا تھا اور اس طرح آخر میں یہ معلوم ہوا کہ داماد نے خود اپنے خسر کو ہلاک کر کے صورت ایسی پیدا کی تھی کہ کسی کو شبہ نہ پیدا ہو۔

الغرض یہ دور شعاعوں کا ہے اور انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں اہل مغرب اسی سے کام لے رہے ہیں لیکن ہندوستان کی کم علمی و جہل کا یہ عالم ہے کہ یہاں کی آبادی کا بڑا حصہ ابھی تک عہد حجری کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اور اُسے بالکل خبر نہیں کہ قدرت کے کتنے عطیات کی طرف سے وہ محروم زندگی بسر کر رہا ہے۔

مطبوعات موصولہ

طلسم زندگی مجموعہ ہے اُن مختصر مضامین کا جو گزشتہ پندرہ سال کے اندر میاں بشیر احمد صاحب نے لکھے اور رسالۂ ہمایوں میں شائع ہوئے۔

ان مضامین کو چھ حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصّہ مناظر کا عنوان رکھتا ہے، دوسرا حصّہ صدائے روح کی سُرخی سے شروع ہوتا ہے، تیسرے حصّہ کا نام صدائے دل ہے۔ چوتھا جد وجہد سے موسوم کیا گیا ہے، پانچویں حصّہ میں سرگوشیاں ہیں اور چھٹا خیالات پریشاں کا مجموعہ ہے۔

یوں تو پنجاب میں اسوقت بہت سے انشا پرداز پائے جاتے ہیں، لیکن میاں صاحب نے اپنی سنجیدہ و متین روش کی بنا پر وہاں کے مخصوص ادیبوں میں بھی ایک خاص درجۂ امتیاز حاصل کر لیا ہے ـــــ میاں صاحب آکسفورڈ کے گریجویٹ ہیں، بیرسٹر ہیں، اپنی معاشرت و معیشت کے لحاظ سے اچھے خاصے مغربی انسان ہیں، لیکن باوجود ان تمام باتوں کے ان کا دل مشرقی ہے، ان کا احساس و تاثر مشرقی ہے اور وہ اپنے ملک کی روایات قدیمہ کا احترام کرنے میں اگر ہندوستانی نہیں تو مسلمان ضرور ہیں ـــــ اور ان کی یہ خصوصیت ان کی تمام تحریروں میں پائی جاتی ہے، چنانچہ یہ کتاب بھی جس کا بہترین نام میری رائے میں صرف "مجموعۂ پریشانی" ہونا چاہئے تھا، باوجود ادائے بیان کی مغربیت کے مشرقی روح سے خالی نہیں۔

اس کے اکثر مضامین اس انداز کے ہیں کہ اُن کو دیکھتے ہی انسان ایسا محسوس کرنے لگتا ہے کہ شاید یہ انگریزی سے ترجمہ کئے گئے ہیں، لیکن جب طرز ادا کی اجنبیت سے کچھ انس پیدا ہو جاتا ہے تو ذہن انسانی الفاظ سے ہٹکر معنی و مفہوم کو اہمیت دینے لگتا ہے جن کی نرمی و لطافت اور نزہت و پاکیزگی میں یکسر مشرقی ذوق کی "بوئے خوشدلی" محسوس ہوتی ہے۔

جو لوگ میاں صاحب کی بلند فطرت، سُلجھی ہوئی طبیعت اور ستھرے ذوق سے واقف ہیں، وہ اس مجموعہ کو دیکھنے کے بعد یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوں گے کہ ـــــ

"He has put much of himself into it" .....

اس میں بارہ رنگین وسادہ تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں جو سوائے ایک دو کے سب کی سب نہایت پاکیزہ اور فنی نقطۂ[1] نظر سے قابل داد ہیں۔ اس زیبایش و تجمیل کے علاوہ جا بجا رنگین لوحوں سے بھی دعوت نظر کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ اور طباعت وکتابت کی پاکیزگی اور جلدن خوشنائی نے تو اور بھی "عروس جمیل ولباس عزیز" کا منظر پیش کر دیا اس کی قیمت پانچ روپیہ، مسلمانوں کی اقتصادی پستی کے لحاظ سے ممکن ہے زیادہ ہو، لیکن "دلِ پُر شوق" رونمائی" میں اس سے بھی زیادہ قربانیاں کر سکتا ہے۔

نقوشِ مانی مجموعہ ہے جناب مانی جائسی کی غزلوں اور نظموں کا جسے خود انھوں نے شایع کیا ہے اور اس احتیاط کے ساتھ کہ "جس کتاب پر مصنف کے دستخط نہ ہوں وہ مسروقہ متصور ہوگی" ——— یہ گویا قانونی جواب ہے۔ دیوان ظہیر فاریابی کے اس شعر کا جس میں "در مکہ بذرد گر بیابی" کی ترغیب دی گئی ہے۔

ابتدا میں چند صفحات مانی صاحب نے اپنے حالات زندگی کے لئے وقف کئے ہیں اور پھر "فلسفۂ عشق" کی نظم سے اس مجموعہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ جو دسمبر سنہ ۱۲ء میں جناب مانی نے لکھی تھی ——— سب سے آخری صفحہ پر نومبر سنہ ۳۱ء کی لکھی ہوئی غزل پائی جاتی ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب میں ۱۹ سال کا مجموعۂ افکار "بین الدفتین" کیا گیا ہے۔ یوں تو ۱۹ سال کی عمر عنفوان شباب کی عمر سمجھی جاتی ہے، لیکن ایک شاعر کو اتنا زمانہ بغیر بوڑھے ہوئے میسر نہیں آتا اس لئے باوجود اس کے کہ جناب مانی نے اپنی تاریخ پیدائش کے بیان سے احتراز کیا ہے (شاید اس لئے کہ "عالم امکان" سے ابھی تک ان کی بہت سی توقعات جمیل وابستہ ہیں) یہ راز کھلے بغیر نہیں رہتا کہ اس وقت جناب مانی کا شمار پختہ تر عمر شعرا کے سلسلہ میں ہونا چاہئے۔ اور اسی حقیقت کو پیش نظر رکھ کر ان کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

مانی صاحب ملک کے ان شعرا میں سے نہیں ہیں جو ہند کے ہر گوشہ میں معروف و مشہور ہیں۔ اور نہ غالباً کبھی انھوں نے اس کی کوشش کی ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ بعض مخصوص حلقوں میں ان کی شاعری کو نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور مشاعروں میں بھی وہ کافی داد حاصل کر لیتے ہیں وہ نظمیں بھی لکھتے ہیں۔ اور

---

[1] پنجاب میں اب عام طور پر "نکتۂ نظر" لکھتے ہیں۔ اگر یہ خرابی صوتی (Phonetic) قسم کی ہے یعنی اہل پنجاب نقطہ کو چونکہ نکتہ بولتے ہیں۔ اس لئے لکھتے بھی ایسا ہی ہیں تو خیر، ورنہ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ بالکل غلط ترجمہ (Point of view) کا ہے۔ تفصیل کے لئے جنوری سنہ ۳۲ء کا نگار ملاحظہ ہو ———

[redacted]

غزلیں بھی، تضمین کا بھی انھیں شوق ہے اور قطعات کا بھی، لیکن سب میں ان کا وہی ایک رنگ ہے جو ایک مایوس عاشق کا ہوا کرتا ہے۔

یقیناً اُن کے کلام جوش و سرمستی نہیں ہے، رندی و بیباکی نہیں پائی جاتی، معنی آفرینی و بلندی خیال مفقود ہے، ندرت ادا و جدت بیان کا پتہ نہیں، جدید تعبیرات شاعرانہ کا نشان نہیں، لیکن ایک قسم کا سوز و گداز ضرور ہے جس میں بجائے فتادگی کے انقباض کی کیفیت زیادہ نمایاں ہے۔ اور غالباً اسی لئے ان کی شاعری دل کو متاثر تو کرتی ہے لیکن بیتاب نہیں بناتی ——— ایک اور خصوصیت ان کی شاعری کی جس میں کمتر شعراء ان کے ہمسر نظر آتے ہیں، اس کا فنی غلطیوں سے پاک ہونا ہے۔ ان کا کلام دیکھنے کے بعد انسان پر کوئی اور اثر ہو یا نہ ہو لیکن یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ شاعر جو کچھ کہتا ہے بہت سمجھ بوجھ کر کہتا . . . ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس کا کلام اغلاط و اسقام سے پاک ہو۔

آپ لکھنؤ اسکول کے شاعر ہیں لیکن صحیح رنگ تغزل کے نمونے بھی آپ کے کلام میں کافی نظر آتے ہیں۔ مثلاً :—

میں نہیں سمجھا خدا کے واسطے سمجھائیے　　آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ کیا کہدیا کیا کر دیا

نہیں فرصت تہو گی کشمکشہائے تمنا سے　　مگر جی چاہتا ہے یہ کہ تم ہو میرے قابو میں

اجازت دیجئے رونیکی اب تو دل کی حالت پر　　بہت اچھا میں آمادہ ہوا ترک محبت پر

گلہ بیجا بھی کرتا ہوں کہ اُس جلوہ کا شایاں ہوں　　ندامت ہے جو اک دن آپکے روئے حسین پر تھا

جانبر نہ ہوا میں یہ جدا بات ہے ورنہ　　ظاہر ہے کہ ہر شام کی ہوتی ہے سحر بھی

جاؤ بالیں سے اٹھو تو، موت کو آنے تو دو　　چین سے جینے نہیں دیتے ہو، مرجانے تو دو

یہ مجموعہ مجلد شائع ہوا ہے اور دو روپیہ میں دفتر رسالہ تسنیم آگرہ سے مل سکتا ہے۔ حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۰۶ صفحات کا ہے اور کتابت و طباعت کافی دلکش ہے۔

جنگِ مستقبل کا دُوربینی مُطالِعہ

۱۳ اگست سنہ ۱۹۴۰ء کا ایک تار

(جو میدان جنگ سے ایک اخبار کے نمائندہ نے بھیجا)

کل شہر نیویارک اور مضافات کے ۶۰ لاکھ آدمی ہلاک ہوگئے ۔ اس کی مختصر داستان یہ ہے کہ "کل اتحادئین" کے ۶۰۰ طیارے دفعتہً نمودار ہوئے اور انھوں نے ـــــ ڈائی فنل کلور وارسین اور کاکوڈیل ایسوسیانید گیسوں کی نہایت کثیف چادر تمام فضا میں پھیلا دی ـــــ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام عورتیں، مرد اور بچے ہلاک ہوگئے کوئی جانور بھی نہ بچا۔ اور نباتات بھی خشک ہوگئے ـــــ اس کے بعد جب ہوا چلی اور زہریلی گیس پھیلی تو دُور دُور کی بستیوں کے بھی ۲۰ لاکھ آدمی فنا ہوگئے ـــــ اسی طرح دنیا کے اور مختلف شہروں میں بھی گزشتہ دس گھنٹے کے اندر ۳ کرور ۶۰ لاکھ آدمی زہریلی گیس سے فنا ہوچکے ہیں۔

آج نیویارک، لندن، پیرس، بروکسیل، برلن، اور وائنا کھنڈر ہوکر رہ گئے ہیں۔ کیوں کہ طیاروں کے ہجوم اور گیس کے حملہ نے وہاں بھی کسی متنفس کو زندہ نہیں چھوڑا ـــــ اس جنگ کا سبب یہ ہوا کہ بندرگاہ سایگ کے متعلق دُول ارض میں اختلاف تھا اور کامل پانچ دن سے گفت و شنود ہو رہی تھی۔ امریکہ بالکل غیر جانبدار تھا ـــــ کل صبح اس مسئلہ میں دو فریق ہوگئے۔ جن سے ایک کا نام اتحادئین ہے۔ اور دوسرے کا حلفاء اور اتحادئیں نے کل ۴ بجے صبح بین الاقوامی مجلس فیصلہ کو بمقام لاہائی اطلاع دے دی کہ وہ اس کا فیصلہ ماننے کے لئے طیار نہیں ـــــ امریکہ نے بین الاقوامی مجلس کا ساتھ دیتے ہوئے اتحادئین کے خلاف کل ساڑھے چھ بجے صبح اعلان جنگ کردیا اور نتیجہ وہ ہوا جس کا حال میں نے ابھی بیان کیا۔ لوگوں

کے پھیپھڑے زہریلی گیسوں کی وجہ سے پھٹ پھٹ گئے۔ اور جو جہاں تھا وہیں دم توڑنے لگا۔

میں خود کارسن ہوا باز کے ساتھ ایک طیارہ پر چڑھ کر تحقیق حالات کے لئے روانہ ہوا۔ ہم دونوں نے محافظ گیس نقاب اپنے چہروں پر ڈال لی تھی اور فولادی نلکیوں میں اتنی مقدار آکسیجن کی بھر لی تھی کہ ۹ گھنٹے تک کام دے سکے۔ ہم لوگ صبح سات بج کر ۲۸ منٹ پر نیویارک میں اترے اور تمام سڑکوں پر مکانوں کے اندر کامل سات گھنٹے تک جستجو کی لیکن ایک شخص بھی زندہ نہ ملا۔ ہوا میں اب بھی کچھ کچھ گیس کا اثر باقی ہے۔ اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ۶۰ لاکھ آدمی جو کل تک چل پھر رہے تھے، ہنس بول رہے تھے آج جسم بے جان نظر آرہے ہیں ——— شہر کے کاروباری حصوں میں اور کارخانوں کے اندر لاشیں بچھی ہوئی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ ہوا۔ بالکل اچانک ہوا۔ اور اتنی مہلت بھی نہ ملی کہ چند منٹ پیشتر اس حملہ کی اطلاع مل جاتی اس لئے شہر کی تمام آبادی اپنے اپنے کام میں مصروف تھی کہ دفعتہً یہ بلا نازل ہوئی۔ لاشوں کے دیکھنے سے عجیب وغریب منظر سامنے آگئے۔ ایک شخص کی لاش ایسی حالت میں ملی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب گیس اس کی ناک تک پہونچی تو اپنے دونوں بازوؤں سے اپنے منہ چھپانا چاہا۔ اس کے پاس ہی اس کی گھڑی ٹوٹی ہوئی ملی جو ۲ بج کر ۵۹ منٹ پر بند ہوئی تھی۔ اور چونکہ یہ حملہ ۲ بج کر ۵۰ منٹ پر ہوا تھا۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲ منٹ کے اندر ہی اندر دنیا کے کروڑ آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے ——— بنکوں میں، کارخانوں میں، دفتروں کے اندر، گھروں میں، سڑکوں پر الغرض جدھر نگاہ جاتی ہے، سوائے لاشوں کے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی ——— ڈاک خانہ میں دیکھا۔ کہ پوسٹ ماسٹر اپنی میز کے پاس ہی مرا ہے لیکن رومال اس کے منہ پر رکھا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسنے گیس سے بچنے کی پوری کوشش کی۔ بڑے بڑے محل ویران پڑے ہیں، قیمتی فرنیچر، ریشمی پردے، نفیس نفیس برتن سب اپنی اپنی جگہ بدستور موجود ہیں، لیکن ان کا استعمال کرنے والا کوئی نظر نہیں آیا ——— بنکوں میں نوٹوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں، اشرفیوں کا انبار نظر آتا ہے، مگر نہ کوئی انکا چرانے والا باقی رہا نہ حفاظت کرنے والا۔

مشرقی حصۂ شہر میں آگ لگی ہوئی ہے اور اب تک مختلف رنگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ کیونکہ اس حصۂ شہر میں کارخانے تھے اور جب گیس نے یہاں کے کام کرنے والوں کو ہلاک کر دیا تو بوائلر اور روشن گیس کے نل پھٹے جنھوں نے چاروں طرف آگ پھیلا دی۔ اور عمارتوں کے سیمنٹ اور فولاد کے جلنے سے رنگین شعلے بلند ہونے لگے، اب بھی لگاہے کہ مختلف عمارتوں سے دھماکوں کی آوازیں آرہی ہیں ———

اس وقت نیو یارک کے مکانوں، سڑکوں اور دفتروں میں ۴۰ لاکھ لاشیں پڑی ہیں اور جب تک ان کو اٹھا کر کہیں پھینکا نہ جائے یہ شہر دوبارہ آبادی کے قابل نہیں ہوسکتا ـــــ مشرقی حصے کی لاشیں تو خیر جل کر خاک سیاہ ہوگئی ہیں ورنہ ۲۰ لاکھ لاشیں یہاں کی بھی ہٹانا پڑتیں۔

اخبار نیو یارک ٹائمس کے دفتر میں جاکر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہاں کے لوگ اپنے اپنے کام میں بالکل اخیر وقت تک مصروف رہے، کیونکہ ان کو کچھ دیر قبل اس حملہ کا حال معلوم ہوگیا تھا اور انھوں نے کھڑکیاں بند کرلی تھیں، لیکن جب گیس ان کمروں میں بھی پہونچی تو جو شخص جس جگہ جس حال میں بیٹھا تھا وہیں مرگیا۔ ایک کلرک آلۂ تلغراف کے سامنے بیٹھا بیٹھا مرگیا اس حال میں کہ دو برقی پیغام اس کے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کی عبارت یہ ہے :ـــــ

"امریکن بیڑے کے طیاروں نے جو بحر اٹلانٹک میں متعین ہیں، تین جہاز دیکھے جن پر اتحادیین کے طیارے موجود تھے ـــــ امریکہ کے طیاروں نے ان کو گیارہ ہزار گز کے فاصلہ سے دیکھ لیا تھا ـــــ جب قریب آئے تو وہ پانی میں ڈوب گئے۔ لیکن امریکن امیر البحر کا خیال ہے کہ یہ صرف دھوکا ہے اور ان کا نیو یارک پر حملہ کرنا یقینی ہے"

دوسرے پیغام میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ

"وزارۃ حربیہ اتحادیین کے طیاروں کا مقابلہ کرنے کے لئے بالکل آمادہ ہے، امریکہ نے اپنے آپ کو طیاروں کے حملہ سے بالکل محفوظ کرلیا ہے اور ان کی بربادی کے لئے خاص توپیں موجود ہیں"

لیکن افسوس ہے کہ امریکہ کی کوئی احتیاط مفید ثابت نہ ہوئی اور اتحادیین اپنا کام کرگئے ـــــ

جس وقت حملہ ہوا تو معلوم ہوتا ہے کہ لوگ دعا کے لئے جوق درجوق کلیساؤں کی طرف دوڑے ہوئے گئے۔ کیونکہ ڈیڑھ ہزار لاشیں تو کلیساے ٹرنٹی میں بڑی ہوئی ہیں، دو ہزار کلیساے پاٹرک میں، ۱۴۰۰ کنیسۂ عمانوئیل میں اور ۸۰۰ کنیسۂ ریور سائڈ میں ـــــ ایک کلیسہ کے اسپتال میں پہونچے تو دیکھا کہ ایک ڈاکٹر آلات جراحی کی میز کے سامنے مردہ پڑا ہوا ہے، ایک مریض نے جس پر عمل جراحی ہونے والا تھا، جراحی کی میز پر دم توڑ دیا ـــــ دوسری جگہ ڈاکٹر کسی مریض کا کان دیکھتے دیکھتے رہ گیا اور ایک ڈاکٹر مطالعہ کرتا ہوا مرگیا، ایک کتاب اس کے سامنے کھلی ہوئی رکھی ہے اور وہ صفحات سامنے ہیں جن میں اڈرینالین کا بیان درج ہے ـــــ

کولمبیا یونیورسٹی کی عمارت میں پہونچے تو دیکھا کہ وہاں کا پرنسپل لائبریری کے دروازہ پر مردہ پڑا ہے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ باہر دیکھنے کے لئے جارہا تھا کہ اسی وقت گیس کا بمب گرا اور سب کو ہلاک کر گیا۔

نیو یارک کے اکثر لڑکے مدرسوں ہی میں مرے کیونکہ ابھی تک وہ گھروں کو نہ لوٹے تھے —— ایک مدرسہ میں جہاں چھوٹی چھوٹی لڑکیاں پڑھتی تھیں دیکھا کہ معلّمہ پڑھاتے پڑھاتے ہی مرگئی اور لڑکیاں جو سامنے اپنی اپنی میزوں پر لکھ رہی تھیں اسی حال میں فنا ہوگئیں، اس وقت ۳۱ لڑکیاں لکھنے میں مصروف تھیں اور سب کی سب اپنے سروں کو ہاتھوں پر رکھے ہوئے تھیں۔

زمیں دوز ریلوے لائن دیکھنے کی ہمت ہم نے نہیں کی کیونکہ تمام سرنگیں لاشوں سے پٹی پڑی ہیں یہی حال بالائی ریلوے لائن اور اس کے اسٹیشنوں کا ہے۔

خیال ہوا کہ ممکن ہے نیو یارک کی سربفلک عمارتوں کے بالائی منزلوں کے لوگ کچھ بچ گئے ہوں کیونکہ گیس وزنی ہوتی ہے اور اوپر کی طرف نہیں چڑھتی چنانچہ ہم ایک عمارت میں گئے اور وہاں کے لفٹ پر سوار ہوئے مگر معلوم ہوا کہ وہ بیکار ہوچکا ہے اور تار کٹ گیا ہے —— پھر چونکہ ہماری آکسیجن کی مقدار کم ہوتی جارہی تھی اس لئے زینوں کے ذریعہ سے اور زیادہ چڑھ کر اوپر پہونچنے کی ہمت نہ ہوئی۔ تاہم ساتویں منزل تک تو کوئی شخص زندہ ملا نہیں۔

سنٹرل پارک کی تمام گھاس خشک ہوگئی ہے، پودے مُرجھا گئے ہیں اور درخت جھلسے ہوئے نظر آتے ہیں ——

ہم نے چار ہزار فٹ کی بلندی تک اپنے چہروں سے محافظ گیس نقاب نہیں اُتاری کہ مبادا اس کا اثر باقی ہو —— لیکن جب اس سے زیادہ بلند ہوگئے تو صاف ہوا ملی اور وہاں پہونچ کر میں نے ایک اخبار نکالا جو مجھے وہاں کسی مکان میں ملا تھا اور اُسے دیکھنے لگا —— اس اخبار میں ایک اڈیٹوریل نوٹ اس مضمون کا بھی نظر آیا کہ "امریکہ دشمنوں کے حملہ سے بالکل محفوظ ہے اور امریکہ کی فوج نہایت کامیابی سے طیاروں کا مقابلہ کرسکتی ہے" —— میں یہ پڑھ کر اپنے جی میں بہت ہنسا۔

اب ہم لوگ فلاڈلفیا کی طرف جارہے ہیں اور ٹائپ رائٹر میرے سامنے رکھا ہوا ہے جس پر میں یہ پیغام ٹائپ کر رہا ہوں ——

حضرت نیاز کے چند خطوط

(جو وقتاً فوقتاً انھوں نے اپنے احباب کو لکھے)

۱۷ مارچ ۱۹۲۹ء

قصۂ عشق کہ مانند ایں ہمہ ناگفتہ بسے
باتو گویم بشرطیکہ نہ گوئی بہ کسے

ظالم، یہ کیا خبر سنائی —— ہاں، ہاں یاد ہے اور خوب یاد ہے —— ذرا پھر کہنا۔۔۔ افوہ! وہ قاتل شام! ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آفتاب غروب ہو کر اب کیا کبھی نکلے گا، پھر کیا تمھیں معلوم نہیں کہ یہ اعتکاف پورے چالیس دن کا تھا اور کسی کا فر ہی کو خبر ہوئی ہو کہ صبح کب طلوع ہوتی ہے اور شام کسے کہتے ہیں —— میری اس کیفیت و حالت کو ایک شاعر مجھ سے بہت پہلے یوں نظم کر چکا تھا :-

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

اب اِس شعر کو میں "مذہبیات" میں صرف کروں یا "تھیاسوفیات" میں اس وقت تو میرے سامنے اس کا مصرف وہی ایک ذات تھی جو بقول وکٹر ہیوگو

"میرے سامنے سے گزری اور میرا زمین و آسمان سب اپنے ساتھ لے گئی"! جلّ جلالہٗ!

تو ہاں، سچ بتاؤ کیا انھوں نے مجھے پوچھا؟ خود، یا تمھارے یاد دلانے سے —— خدا کے لئے اس کا جواب میں کچھ ایسی بات نہ کہنا کہ کپڑے پھاڑ کر —— کسی طرف کو نکل تو خیر کیا جاؤں —— دوسرے لباس کی فکر کرنا پڑے —— آہ، یہ —— ناز بر فلک و حکم بہ ستارہ کنم —— کے زمانہ کی باتیں تم اب سنا رہے ہو —— اب کے (Zone) کو کچھ سمجھے یا نہیں —— یعنی عمر کا وہ دَور جب ایک انسان یہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ

[redacted]

جو کوئی آئے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں

اور انسان بھی وہ کہ

رہا ہو جس کے سر کا تکیہ دوشِ نازنیں برسوں ——— الغرض، باقی ہوس

مرزا صاحب سے کہو کہ خدا کے لئے نہ خود مجھے بلائے، نہ کسی سے بلوائے ——— اور ہاں سنو، میں تم سے بھی کہتا ہوں کہ اب لکھ دیا تو لکھ دیا، لیکن آیندہ اگر کوئی ذکر اس قسم کا کیا تو یاد رکھنا مر جاؤں گا اور پھر ظاہر ہے کہ تمھیں بھی خودکشی کرنا ہی پڑے گی ——— ہاں جی اب تو اسی حُسنِ ظن پر زندگی بسر ہو رہی ہے

سوگوارِ ماضی

نیاز

۳۰/اپریل سنہ ۲۹ء

میرے عزیز دوست، ——— یہ آپ نے کیا فرمایا ——— مَیں اور آپ کو بھول جاؤں! واللہ خود فراموشی کے بعد بھی ممکن نہیں ——— میری زندگی کی تمام گزشتہ ساعتیں تقسیم ہو چکی ہیں اور اب ان میں سے کسی پر میرا قبضہ نہیں ——— لیکن انھیں میں سے ایک ساعت ایسی بھی ہے جسے میں نے ابھی تک دل سے لگا رکھا ہے اور اس پر کسی کو قابض ہونے نہیں دیا ——— آپ باور کریں تو کہہ دوں کہ وہ ساعت وہی ہے جب آپ کے "بے پناہ" خلوص کے سامنے میں نے اعتراف تو خیر کیا مگر اعتراف کی سپر ڈال کر اپنی مفتوحیت و مغلوبیت کا اعلان کر دیا تھا دنیا صرف اپنی فتح و نصرت کی داستان یاد رکھنا چاہتی ہے مگر مجھے تو اپنی زندگی کا صرف وہی فسانہ یاد رہتا ہے، جب مجھے کوئی مغلوب کرے، پھر آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ کیا آپ ایسے "زبردست قہرمانِ محبت" فطرت روز روز پیدا نہیں کرتی کہ اُن کے کارناموں کو یوں آسانی سے بھلایا جا سکے ———

میاں، تعویق جواب کا سبب صرف "فراموشکاری" ہی نہیں ہوا کرتا، بلکہ "خود فراموشی" بھی ہوتا ہے ——— پھر اس کے کیا معنی کہ اُس کا یقین تو آ گیا اور اِس کا خیال تک ذہن میں نہ آیا ——— اچھا معاف کرتا ہوں کہ "بدگمانی" محبت کی پہلی علامت ہے ——— مجھے اپنا ایک شعر یاد آیا

چاہتے ہیں وہ کہ اظہارِ شکایت چھوڑ دوں
یعنی الفت چھوڑ دوں اسکی حکایت چھوڑ دوں

پھر اگر آپ کی یہ شکایت از قبیل " حکایت اُلفت " تھی تو خیر " خوشم بدر " ورنہ توبہ کیجئے قبل اس کے کہ آفتاب مغرب سے طلوع ہوکر " در اجابت " ہمیشہ کے لئے بند کردے ــــــ

نیاز

۲۳ر فروری ۱۹۳۱ء

بندہ نواز ـــــــ یہ کیا قیامت ہے کہ آپ نہ خود یاد کریں نہ دوسرے کو یاد کرنے دیں ـــــ یعنی وہ تو اس طرح کہ آپ لکھنؤ سے گزر جائیں اور مجھے اطلاع تک نہ دیں اور یہ اس طرح کہ جب پیامبر بھیجیں تو اس سے یہ تاکید کر دیں کہ دیکھو کوئی تحریر نہ لانا ، معقول :ـــــ اچھا اگر آپ نے خود منع نہیں کیا تو کیا وجہ تھی کہ وہ ظالم پھر کبھی نہ پلٹا ـــــ جو خط دستی بھیجنے والا تھا اسے چاک کرکے اب یہ دوسرا عریضہ لکھ رہا ہوں ـــــ میرا نقصان تو خیر کیا ہوتا ، بجائے ایک کے دو مرتبہ آپ سے باتیں کرلیں ـ لیکن آپ ہی پر بجائے ایک کے دو الزام قائم ہوگئے ـــــ حیران ہوں کہ اس کی تلافی آپ سے کیونکر ممکن ہوگی ؟ ـ کیونکہ آپ یہاں آنے کے نہیں اور میں محض زبانی یا تحریری معذرت سننے کا نہیں ، البتہ اگر آپ نے ایک بڑا پارسل دو سو " ثمر بہشتوں " کا بھیجدیا تو مجبوری ہے ، چار و ناچار مجھے " کروبیان ملاء اعلیٰ " سے کہنا ہی پڑے گا کہ بھائی معاف کردو ، زیادہ سے زیادہ چند دانے تم بھی لے لینا اگر طوبیٰ والے اجازت دیں "

نیاز

۱۴ر مارچ ۱۹۳۱ء

حضرت ـــــــ جی ہاں ، کل میر صاحب تشریف لائے تھے اور جتنی گالیاں " انھیں یاد تھیں ،سب " صرف دربان " کر گئے ـــــ میں آپ کا " دربان " ہی ہوں نا ؟ ـــــ میں نے لاکھ کہا کہ قبلہ میں نے آپ کے متعلق اُن سے کوئی بات کہی ہو تو حشر کے دن خدا کا دیدار حرام ، سایۂ طوبیٰ حرام ، کوثر و تسنیم حرام ، حور و قصور حرام ، مگر میرے پاس اس کا کیا جواب تھا کہ " اگر تم نے نہیں کہا تو انھیں کیونکر معلوم ہوا کہ میں نے اُن کے متعلق کس سے کیا بات کہی تھی " ـــــ لاحول ولاقوۃ ـــــ ذرا سوال و الزام کی اِس اُلجھن کو ملاحظہ کیجئے ـــــ میرے پاس اتنا دماغ کہاں کہ ان ضمائر کے ایک ایک مرجع کی جستجو کروں ، بہرحال آپ انھیں ایک خط لکھ کر ، میرے سر سے اس الزام کو دور کیجئے ورنہ قسم ہے آپ کے سرِ عزیز کی کہ اگر پھر انھوں نے آکر اس قسم کی گفتگو کی تو کپڑے پھاڑ کر کسی طرف کو نکل جاؤں گا ـــــ توبہ ، توبہ ، آدمی کیا ہیں

کانٹوں کا جھاڑ ہیں کہ الجھ جائیں تو جان بچانا مشکل ہو جائے ——

نیاز

---

۳۱ مارچ ۱۹۵۶ء

اے جفا ہائے تو خوشتر ز وفائے دگراں !

یہ تو فرمائیے کہ آپ نے دیوان حیاتی کیا کیا —— بر سبیل شکایت نہیں۔ بلکہ بہ طریق لجاجت پوچھ رہا ہوں —— آپ کو معلوم ہے کہ یہ نسخہ کمیاب ہے۔ اور میری ملکیت ہے بھی نہیں۔ اگر اصل مالک مجھ سے مانگ بیٹھا تو کیا میں اس سے بھی یہی کہہ دوں کہ —— ایک دشمن دین و ایمان لوٹ لے گیا ؟ اور یہ آخر مجھ سے کہا کیونکر جائے گا —— خدا احسن کے ساتھ " حسن ظن " کبھی کسی کو نہ دے —— خیر میں تو کچھ نہ کہوں گا۔ کہ شعر و رع ہے

مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے

لیکن وہ شعلہ کیوں ماننے لگا ، آپ کا تو کچھ نہ جائے گا ، لیکن میں خواہ مخواہ چور بنجاؤں گا۔ اگر آپ کو میری رسوائی میں مزہ آتا ہے تو خیر اُسے بھی گوارہ کر لوں گا ، لیکن یہ یاد رہے کہ اگر حشر میں میرا آپ کا معاملہ پیش ہوا تو آپ کا یہی ایک ظلم ایسا ہوگا جسے میں کبھی معاف نہ کروں گا اور آپ کے دادا یا نانا سید الشہداء سے التجا کروں گا کہ اس شخص کو کوثر و تسنیم کا ایک قطرہ بھی نہ دیجئے کیونکہ یہ شخص نسباً سید زادہ ہو یا نبی زادہ لیکن اخلاقاً نہایت مکروہ قسم کا یزید ہے —— پھر بتائیے آپ کیا کریں گے ——۔ بہر حال اگر اس قضیہ کو زیادہ بڑھانا مقصود نہیں تو اس کتاب کو واپس فرما دیجئے ، ورنہ آپ جانئے اور آپ کا کام پھر مجھ سے شکایت نہ ہو کہ . . . .

نیاز

---

۴ اپریل ۱۹۵۶ء

مکرمی —— آپ کی غزل دیکھی —— آپ کو معلوم نہیں میں مقالاً عرصہ ہوا اپنے آپ کو بیگانۂ " سخن " بنا چکا ہوں اور اسی لئے فکر و احساس کے لحاظ سے میری تنقید اس باب میں بہت سخت ہوتی ہے — بہ تعمیل ارشاد غزل دیکھ لینے میں مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے ، لیکن اگر " دیکھنا " اصلاح و مشورہ کے مفہوم میں آپ نے استعمال کیا ہے تو میری معذرت قبول فرمائیے ، کیونکہ استاد بننے کا نہ مجھ میں سلیقہ ، نہ اہلیت۔ میری

زندگی خود یکسر متعلمانہ ہے اور ہر وقت استاد و رہبر کی آرزومند۔ البتہ ایک مشورہ آپ کو ضرور دوں گا اور وہ یہ کہ آپ اس مشغلہ کو ترک کر دیں تو بہتر ہے، کیونکہ میں آپ میں غزلگوئی کی اہلیت بہت کم پاتا ہوں — ممکن ہے کسی وقت مشق و مطالعہ کے بعد آپ نظمیں اچھی کہنے لگیں، لیکن غزل میں آپ کامیاب نہیں ہو سکتے —

مجھے معلوم نہیں کہ آپ کی کیا عمر ہے، کیا مشغلہ ہے، لیکن یہ فرض کر لینے کے بعد بھی کہ آپ نوجوان ہیں فکر معاش سے آزاد ہیں، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ غزل کی طرف کیوں مائل ہیں — کہنے کی بات نہیں لیکن کہنا پڑتی ہے کہ پہلے کہیں دل لگائیے، پھر وارداتِ دل لکھئے، محض وصل و ہجر کی سنی سنائی باتیں لکھ دینا غزل نہیں ہے — "انچہ از دل خیزد بر دل ریزد" کے اصول کو ہمیشہ سامنے رکھئے — معاف فرمائیے، اگر میری صاف گوئی سے آپ کو تکلیف پہونچی ہو —

نیاز

---

۱۰ اپریل ۳۳ء

کیسی دعا، کہاں کا سلام — "زمانہ درپئے جنگ ست یا علی مددے" کا وقت ہے اور جو اس گم — آپ کو معلوم ہے نہ میں جسمانی لذت کا طالب کہ کھانے میں، مرغ و ماہی کی جستجو ہو۔ نہ عیش و طرب کا خواہشمند کہ ریشمی گدّوں میں پڑے پڑے زہرہ کی بھیرویں سننے کی تمنا ہو — ایک گدایانہ سکون قلب چاہتا ہوں، سو فطرت اس کی بھی روادار نہیں، اور فطرت کیا میں تو احباب کی بھی یہی حالت دیکھتا ہوں۔ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ آپ ادھر سے گزر جاتے اور مجھے اسٹیشن تک پہونچنے کا بھی موقعہ نہ دیتے — بہتر ہے ستائے جائیے، ظلم کئے جائیے یہاں تک کہ میں ہلاک ہو جاؤں۔ لیکن اگر مقصود یہی ہے تو آپ کیوں اپنا ہاتھ کسی کے خون سے رنگین کریں

چہ لازم ست کہ بدنام قتل من باشی
ستارہ و فلک و بخت و روزگاری ست

نیاز

---

۱۲ مئی ۳۳ء

ریل میں ہوں اور یہ شعر گنگنا رہا ہوں

ہفت آسماں بہ گردش و مادر میانہ ایم
غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ می رود

ناممکن تھا کہ " آسمان وجور آسمان " کے ساتھ آپ کا خیال نہ آجاتا ——— اس لئے یہ اطلاعی تحریر بھیج رہا ہوں ——— اگر مُہر سے آپ کو معلوم ہو سکے کہ کس اسٹیشن پر پوسٹ کر رہا ہوں تو مجبوری ہے ورنہ میں تو بتانے کا نہیں ———

اگر کشمیر چلنے کا عزم راسخ ہوگیا تو لکھئے، میں بھی "عمر رفتہ" کو واپس بلانے کا اہتمام کروں۔ اور لالہ رُخ کے ویران باغ کے پائیں میں کس جگہ دفن ہو جانے کی دعا مانگوں ! ——— ایک ہفتہ کے اندر واپس آجاؤں گا ——— اور ڈاک میں سب سے پہلے آپ کے جواب کی جستجو کروں گا ———

نیاز

شہوانیات

یا

تاریخ الفحشاء

"جنسیات" (Sexology) کے موضوع پر اُردو میں بالکل پہلی کتاب

حضرت نیاز فتحپوری کے قلم سے

اس کتاب میں موضوع متعلق کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس پر تاریخی، جنسی و نفسیاتی روشنی نہ ڈالی گئی ہو ——— اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ فحش دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوا، مختلف ملکوں اور قوموں کے مذہب و تمدن پر اسکا کیا اثر پڑا، اس باب میں انسانی سائکالوجی نے کیسے کیسے عجیب و غریب منظر پیش کئے اور بہت سی ایسی ہستیاں جنکے متعلق کبھی فحش کا خیال بھی نہ ہو سکتا تھا تحقیق کے بعد کس درجہ فحاشی ثابت ہوئیں ——— الغرض یہ کتاب ایک نادر مجموعہ ہے برسوں کی تحقیقات و کاوش کا جو نہایت ارزاں صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ کتاب زیر طباعت ہے اور حجم ۵۰۰ صفحات کے قریب ہوگا۔ قیمت کا اندازہ ابھی نہیں ہو سکا، لیکن ناظرین نگار کے ساتھ خاص رعایت کیجائیگی۔ غالباً اخیر اپریل میں شائع ہو سکے۔ نصف کتاب چھپ چکی ہے۔ نصف چھپ رہی ہے ——— زیادہ تعداد میں خریدنیوالوں کے لئے ۲۵ فیصدی کمیشن۔

منیجر نگار لکھنؤ

بابُ المُراسلة والمناظرہ

معراجِ نبوی اور ٹسڈل

(از مولوی عبد المالک صاحب آروی)

پرچہ ملا، شکریہ ——— میرے مضمون کے متعلق آپ نے جو اختلافی نوٹ لکھا ہے، میں نے پڑھا اگر آپ اس کے صحیح جواب کے متعلق اشارتاً بھی لکھدیتے تو میں غور کرتا۔ میرا اور آپ کا تمام افکار وعقاید پر متفق ہو جانا ضروری نہیں، لیکن مناسب یہ تھا کہ آپ اسکے متعلق اپنی رائے کا بھی اظہار کرتے، اگر میرا ضمیر اس کو تسلیم کر لیتا تو بہتر تھا آپ کی بعض رایوں کے ساتھ اس باب میں بھی میں آپکا ہمنوا ہو جاتا ——— میرا تو خیال ہے کہ جواب صحیح دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اگر معراج کے باب میں قرآن سے الگ ہو کر حدیث تاریخ سے کوئی بحث کرتا ہے تو خواہ مخواہ حدیث و تاریخ کے واقعات کے خلاف کیوں جائے ——— معترض کو چونکہ آیات قرآنی سے تمام تفصیلات معراج کا حال معلوم نہیں ہو سکتا، اس لئے اس نے قرآن سے الگ ہو کر حدیث کی بحث اٹھائی ——— اپنے موضوع کے لحاظ سے اس کو قرآن ہی تک محدود رہنا تھا، جب صورت یہ اختیار کی گئی تو ضروری ہوا کہ احادیث و تاریخ سے یہ ثابت کر دیا جائے کہ روایت معراج متاخرین کی جدت طرازی کا نتیجہ نہیں، بلکہ خود سرورِ کائنات نے بیان کیا تھا اب رہ جاتی ہے یہ بات کہ پہلوی زبان سے یہ مماثل روایت کیونکر آنحضرت تک پہونچ سکتی ہے - اس کے لئے ہماری اور غیروں کی تاریخیں بھری ہوئی ہیں۔ واقعات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت پہلوی زبان کے ماہر نہ تھے ——— ٹسڈل صاحب کی کیسی حماقت ہے کہ انھوں نے ماخذ بھی نکالا تو زردشت مذہب سے ——— انھوں نے یہ بھی

لکھا ہے کہ زردشت کے متعلق بھی ایسی ہی روایت ملتی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ حضرت مسیح اور ایلیا وغیرہ کے معراج کے متعلق خود عیسائیوں نے افسانہ گھڑ لیا ہو ـــــ میرا عقیدہ یہ ہے کہ بہتیری باتیں جو آج خرافات میں شامل ہیں وہ کبھی حقیقت تھیں لیکن انسان کی حاشیہ آرائیوں نے ان کو اعجوبہ بنا دیا"ـــــــــ

(نگار) میرے فاضل دوست، میں اس وقت یہ بحث نہ کروں گا کہ خود آپ کی تحریر میں بعض باتیں ایک دوسرے کی معارض واقع ہیں بلکہ اصل مسئلہ کی طرف متوجہ ہو کر یہ بتاؤں گا کہ ڈاکٹر ٹسڈل کا اعتراض کیا ہے اور آپ کے مضمون سے اس کا اعتراض کسی طرح رفع نہیں ہوتا ـــــــ اگر آپ نے میرے اختلافی نوٹ کا غائر مطالعہ کیا ہوتا تو غالباً آپ کو بھی اختلاف نہ ہوتا بہرحال پہلے اعتراض سُن لیجئے :-

(۱)

ڈاکٹر ٹسڈل کا بیان ہے کہ پہلوی زبان کی کتاب ارتاوراف نامک میں جو رسول اللہ سے ۴۰۰ سال پہلے بہ عہد اردشیر بابکان کے زمانہ میں لکھی گئی تھی، تقریباً اسی قسم کے تمام واقعات درج ہیں جو معراج نبوی کے متعلق احادیث میں پائے جاتے ہیں

(۲) ایران کے علاوہ ہندوستان کی قدیم سنسکرت کتابوں میں بھی ارجن کی سیاحت آسمانی کا تذکرہ اسی کے مماثل پایا جاتا ہے

(۳) بعض مشکوک الصحۃ عیسائی کتابوں میں پولوس اور ابراہیم کا بھی سفرِ افلاک اسی کے مماثل پایا جاتا ہے۔

اس سے ڈاکٹر ٹسڈل کا مدعا یہ اعتراض کرنا ہے کہ واقعۂ معراج کی کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ صرف رسول اللہ کی عظمت ثابت کرنے کے لئے بعد کے لوگوں نے زردشتی کتاب ارتاوراف نامک، سنسکرت کے قصۂ اندرلوک گمن اور عیسوی لٹریچر وژیو پالی اور عہدنامۂ ابراہیمی سے اخذ کرکے یا ان کی تقلید میں معراج کی داستان آنحضرت سے منسوب کر دی۔

اب اس کے بعد آپ اپنے جواب کو ملاحظہ کیجئے (جو فروری ۱۹۵۳ء کے نگار میں شائع ہوا ہے) - آپ نے سارا زور اس بات پر صرف کیا ہے کہ معراج کی روایتیں بعد کی گھڑی ہوئی نہیں ہیں بلکہ اس واقعہ کو خود رسول اللہ نے بیان کیا تھا ـــــ گویا آپ کے جواب کی روح صرف یہ قرار پائی کہ چونکہ یہ سب کچھ فرمودۂ رسول ہے اس لئے غلط ہونے کی کوئی وجہ نہیں ـــــ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ آپ مخاطب کو پہلے مسلمان سمجھ لیتے ہیں اور پھر یہ جواب

دیتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی تشدّد کی طرح رسول اللہ کی رسالت پر ایمان لانے والا مسلمان نہیں ہے تو خود ہی غور فرمائیے کہ اس پر اس جواب کا کیا اثر ہو سکتا ہے —— بجائے اس کے کہ جواب سے قائل ہو، وہ تو اور زیادہ خوش ہوگا کہ آپ کے جواب سے تو خود رسول اللہ کی ذات گرامی مورد الزام قرار پاتی ہے۔ اور وہ نہایت آسانی سے کہہ دے گا کہ اگر معراج کی روایت صحابہ نے نہیں گھڑی بلکہ خود رسول اللہ نے بیان کی ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ نے کذب بیانی سے کام لیا۔

آپ کے جواب کا یہ پہلو کہ رسول اللہ نہ پہلوی زبان سے واقف تھے اور نہ اس وقت یہ روایتیں مشہور تھیں صد درجہ کمزور ہے، کیونکہ بعثت نبوی سے قبل و بعد دونوں زمانوں میں ایران و عرب کے درمیان بہت وسیع تعلقات پائے جاتے تھے۔ خود ابتدائے عہد رسالت میں شام، ایشیائے کوچک اور فلسطین پر عربوں کا قبضہ پایا جاتا تھا۔ اور اس سے قبل خود قبیلۂ قریش کے سرداران (نوفل و مطلب) نے ایران سے تجارتی معاہدہ کیا تھا — الغرض عرب و ایران کے باہمی تعلقات ایّام جاہلیت اور عہد سعادت دونوں میں تاریخ سے ثابت ہیں، اس لئے یہ ناممکن ہے کہ ایرانی روایات عرب میں رائج نہ ہوئی ہوں —— اس کا ثبوت ایک معترض خود کلام مجید اور احادیث سے دے سکتا ہے۔ چنانچہ ابن ہشام کی وہ روایت "کہ رسول اللہ کے مقابلہ میں نضر بن حارث نے شاہان ایران کے قصے سنا کر کہا کہ قسم ہے خدا کی محمدؐ مجھ سے اچھے داستان گو نہیں ہیں اور ان کی باتوں میں سوائے اساطیر الاولین کے اور کچھ نہیں ہوتا" اس کے ثبوت میں پیش ہو سکتی ہے۔

سورۂ فرقان کی آیت ۵ [1] اور سورۂ قلم کی آیت ۱۵ [2] میں انھیں اساطیر الاولین کے الزام کا ذکر موجود ہے —— علاوہ اس کے سورۂ نحل کی آیت مندرجۂ ذیل سے یہ امر زیادہ صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ پر جو یہ الزام عاید کیا جاتا تھا کہ آپ کو کوئی شخص اور سکھاتا ہے تو وہ سکھانے والا فارسی زبان کا جاننے والا ہو سکتا تھا وہ آیت ذیل میں درج کی جاتی ہے :-

ولقد نعلم انھم یقولون انما یعلمہ بشر۔ لسان الذی یلحدون الیہ اعجمی وھذا لسان عربی مبین —— یعنی ہم کو معلوم ہے وہ لوگ کہتے ہیں کہ (رسول اللہ کو) کوئی انسان سکھاتا

---

[1] وقالوا اساطیر الاولین اکتتبھا فھی تملیٰ علیہ بکرۃ واصیلا (انھوں نے کہا کہ یہ تو پرانے قصے ہیں جنکو (رسول اللہ نے) لکھوالیا ہے اور صبح و شام ان کو سنائے جاتے ہیں)

[2] اذا تتلیٰ علیہ آیاتنا، قالوا اساطیر الاولین (جب ہماری آیتیں ان لوگوں کو سنائی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ تو پرانی داستانیں ہیں)

ہے ـــــ (حالانکہ) اس شخص کی زبان جس پر سکھانے کا الزام رکھا جاتا ہے عجمی ہے اور قرآن کی زبان عربی ہے ف٥ "ہر چند عجمی سے صرف فارسی ہی زبان مراد نہیں ہو سکتی لیکن فارسی زبان بھی عجمی زبانوں میں شامل ہے عجمی بول کر زیادہ تر فارسی زبان ہی مراد ہوتی تھی ـــــ اس لئے اگر معترض یہ کہے کہ اسی عجمی زبان جاننے والے نے جس کا ذکر کلام مجید میں پایا جاتا ہے، رسول اللہ کو ارتا وراف کی روایات معراج سنائی ہوں گی تو آپ کس دلیل کی بنا پر اس سے انکار کر سکتے ہیں۔ جبکہ سورۂ نحل اور سورۂ بنی اسرائیل (جس میں معراج کا بیان ہے) دونوں مکہ میں نازل ہوئیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایرانی روایات معراج اس وقت عام ہوتیں اور رسول اللہ بھی انھیں روایات کو سامنے رکھ کر اپنی معراج کا حال بیان کرتے تو بہت سے صحابہ اس کی تصدیق کیوں کرتے اور کیوں نہ سمجھ جاتے کہ یہ باتیں تو ایرانی لٹریچر سے ماخوذ ہیں ـــــ لیکن یہ دلیل خصم کے لئے مفید یقین نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ کہہ سکتا ہے کہ اوّل تو یہ ضروری نہیں کہ ارتا وراف کی یہ روایتیں اسقدر عام ہو گئی ہوں کہ تمام صحابہ انھیں جانتے ہوں۔ اور ایک غیر مسلم ہونے کی حیثیت سے یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ ممکن ہے ایسا لوگوں نے کیا ہو اور تاریخ و روایات سے مسلمانوں نے ان واقعات کو حذف کر دیا ہو یا یہ کہ صحابہ نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی محض خوش اعتقادی کی بنا پر یہ باور کر لیا ہو کہ جب زردشت کو معراج ہوئی تھی تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے رسول کو نہ ہو۔ الغرض اس جواب سے معترض کو آپ نہ ساکت کر سکتے ہیں اور نہ اس کے قلب میں ایقانی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔

پھر میں کہتا ہوں کہ اس کو بھی جانے دیجئے۔ معترض تو صرف یہ ثابت کر رہا ہے کہ معراج کا بیان کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ اساطیر الاولین میں بھی بعینہ وہی حالات پائے جاتے ہیں جو معراج نبوی کے متعلق احادیث میں نظر آتے ہیں ـــــ اس لئے اب جواب کی صورت یا تو یہ رہ جاتی ہے کہ سرے سے اسی کا انکار کیا جائے کہ ایسی کوئی روایت اساطیر الاولین میں پائی جاتی ہے، لیکن یہ ممکن نہیں۔ یا پھر دوسری صورت یہ کہ جس طرح رسول اللہ کی معراج پر ایمان لایا جاتا ہے، زردشت اور ارجن کی معراج پر بھی ایمان لایا جائے لیکن اس کے لئے غالباً آپ طیار نہ ہوں گے

ف٥ اس جگہ یہ بحث غالباً دور از کار ہو گی کہ وہ شخص کون تھا ـــــ اس باب میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ اور متعدد نام اس سلسلہ میں لئے جاتے ہیں۔ بعض، جبر ـــــ یاسر ـــــ قیس وغیرہ کا نام لیتے ہیں ـــــ بعض نے سلمان فارسی کا نام لیا ہے اور بعض اسی راہب کو سمجھتے ہیں جسے رسول اللہ نے عالم طفلی میں ابو طالب کے سفر شام کے وقت دیکھا تھا۔

میرے نزدیک تو ڈاکٹر ٹسڈل کا یہ کہنا کہ معراج کی تفصیل رسول اللہ نے خود کبھی بیان نہیں کی بلکہ بعد کے لوگوں نے وضع کر لی ہے! اتنی بڑی صفائی رسول اللہ کی طرف سے ہے کہ اس سے زیادہ بہتر صورت جواب کی ممکن ہی نہیں، لیکن آپ اسی کے مخالف ہو کر خود رسول اللہ کو مورد الزام بنانا چاہتے ہیں اور اس الزام کو اس طرح دفع کرتے ہیں کہ کیا رسول اللہ پہلوی زبان جانتے تھے، کہ ان کو ان روایات کا علم ہو گیا —— خود انصاف فرمائیے کہ یہ دلیل کسقدر کمزور، کس درجہ نامربوط اور کیسی ضعیف ہے —— اعتراض کی نوعیت تو ایک ایسی حقیقت پر مبنی ہے جس سے انکار ممکن نہیں اور آپ جواب دیتے ہیں احتمالات وقیاسات سے، روایات وتاریخ سے اور روایات وتاریخ بھی کون سی؟ خود آپ ہی کی، آپ ہی کے مذہب کی اور آپ ہی کی لکھی ہوئی ——

بہرحال جبکہ احادیث اور خود کلام مجید سے یہ امر ثابت ہے کہ لوگ رسول اللہ پر یہ الزام لگاتے تھے کہ آپ دوسروں سے سیکھ سیکھ کر (جن میں کوئی عجمی زبان کا بھی جاننے والا تھا) اساطیر الاولین بیان کیا کرتے ہیں۔ جواب کا یہ پہلو اختیار کرنا کہ آپ خود عجمی زبان سے ناواقف تھے یا یہ کہ عجمی روایات کا علم اس وقت ہر ہر شخص کو ہونا چاہئے تھا کوئی معنی نہیں رکھتا —— اور ڈاکٹر ٹسڈل کے اعتراضات کا جواب صرف اسی طرح ممکن ہے کہ یا تو روایات معراج کو موضوع قرار دے کر رسول اللہ کی ذات گرامی کو ان سے پاک قرار دیا جائے۔ یا واقعات معراج پر ایمان لانے کے بعد زردشت وغیرہ کی معراج کو بھی اک حقیقت ثابتہ تسلیم کیا جائے۔

معلومات

کیا خودکشی جنون ہے؟

باوجودیکہ تہذیب و مدنیت اسقدر ترقی کر گئی ہے، عقل و فراست کی روشنی سے لوگوں کے دل و دماغ منور ہو چکے ہیں، لیکن پھر بھی بے عقلی کے جراثیم کہیں نہ کہیں ضرور نشو و نما پاتے ہیں اور بعض عجیب طریقوں سے اس کا ظہور ہوا کرتا ہے ــــ مثلاً ایک خودکشی ہی کو لیجئے کہ کوئی مذہب ایسا نہیں جس نے اس کی مذمت نہ کی ہو، دنیا کا کوئی متمدن قانون ایسا نہیں جس میں اقدام خودکشی کے لئے سزا نہ مقرر ہو، معمولی سا معمولی انسان سمجھ سکتا ہے کہ اس میں کتنا اجتماعی نقصان پنہاں ہے، لیکن پھر بھی ایسے لوگ نظر آجاتے ہیں جو باوجود شدید مذہبی انسان ہونے کے، باوجود قانون کے احترام کے خودکشی کر لیتے ہیں اور ایسے عجیب طریقوں سے کہ سوائے خرابی دماغ کے کوئی اور توجیہ ہو ہی نہیں سکتی ــــ چند مثالیں ان طریقوں کی ملاحظہ ہوں:ــ

(۱) ٹریسٹ (اطالیہ) کا ایک شخص جو بجلی کا ماہر تھا ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا اور وہ بھی اس سے بہت تعلق رکھتی تھی۔ ایک دن انھوں نے کہا کہ سعادت ابدی حاصل کرنے کا طریقہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ دونوں ایک ساتھ مر جائیں۔ چنانچہ ایک دن دونوں گھر سے باہر نکلے اور شہر سے باہر ایک ایسے مقام پر پہونچے جہاں بہت قوی تار بجلی کے اوپر سے گزر رہے تھے ــــ اس شخص نے بجلی کا ایک تار لے کر اپنے اور اپنی محبوبہ کے گرد لپیٹا اور دوسرا سرا اُن تاروں پر پھینک دیا جو سڑک کے ستونوں میں تنے ہوئے تھے۔ اور اس طرح آن واحد میں دونوں کا دم نکل گیا اس حال میں کہ ایک دوسرے سے بغل گیر تھا۔

(۲) امریکہ میں دانتوں کا ایک ڈاکٹر (باول) تھا۔ اس نے عجیب طرح سے خودکشی کی اور بجائے زہر کھانے یا گیس سے دم گھونٹنے کے اس نے یہ ترکیب اختیار کی کہ اس نے اپنی بیوی کے جوتے پہنے اور پھر دنداں سازی کی کرسی پر بیٹھکر بیوی کے موزوں سے اپنے پاؤں کرسی سے باندھے اور اپنے سامنے دیوار میں آئینہ لٹکا کر اپنا گلا گھونٹا تاکہ نزع کی تکلیف میں جو آثار اس کے چہرہ پر ظاہر ہوں انھیں دیکھتا رہے۔

(۳) امریکہ کا ایک شخص (بنجامن ناٹکنس) تھا اور شراب پر نگال کی تجارت کیا کرتا تھا اتفاق سے اسے کاروبار میں خسارہ ہوا اور اس نے خودکشی کا ارادہ کر لیا۔ لیکن یہ ارادہ جس طریقہ سے پورا کیا گیا وہ سخت حیرت انگیز

تھا۔ ایک دن شام کو اسنے اپنی بیوی اور مہمانوں سے کہا کہ میں باغ میں ٹہلنے کیلئے جارہا ہوں۔ وہاں پہونچکر اس نے جیب سے پارہ کی ٹکیاں نکال کر کھائیں، پھر استرا نکال کر اپنے ہاتھ کی شرائین کاٹ ڈالیں۔ ہر چند یہی دونوں طریقے جان لینے کے لئے کافی تھے لیکن اسنے اسی پر کفایت نہیں کی بلکہ سرکے کے پیپے میں کود پڑا۔ اور انتہائی تکلیف کے ساتھ اپنی جان دی

(۴) بعض لوگ آسان ذرائع سے خودکشی کرنا چاہتے ہیں اور بعض انتہائی تکلیف کی صورت اختیار کرتے ہیں چنانچہ روس کی ایک امیرہ (پرنسس آناولبلسکی) پیرس کے مشہور بلند برج ایفل سے کودی لیکن بجائے اسکے کہ وہ باہر کی طرف کودتی اندر کی طرف کودی اور لوہے کی سلاخوں سے ٹکرا کر اپنی جان دی

(۵) وینس کا ایک شخص (ماتیولوفات) سخت مذہبی خیال کا آدمی تھا۔ اُسنے مسیح کے تتبع میں اپنے آپکو مصلوب کرکے جان دی یعنی پہلے تو اپنے ہاتھ پاؤں میں کیلیں ٹھونک کر تختہ کے ساتھ جڑدیں اور پھر اس صلیب کو اپنے کمرے کی کھڑکی کی چھت میں رسّی باندھ کر اس طرح لٹکایا کہ وہ آہستہ آہستہ زمین کی طرف آئے لیکن زمین تک نہ پہونچ سکے۔

(۶) روس کی ایک مشہور رقاصہ تھی اسنے اپنے ایک محبوب کے ساتھ ملکر اسطرح خودکشی کی کہ دونوں ایک ساتھ اوپرا ہاؤس کی بلند ترین چھت سے کود پڑے ——

سانپ کا گوشت

دو سال ہوئے ارکاڈیا (امریکہ) کے ایک آدمی نے صوبۂ فلوریڈا میں دو بڑے سانپ مارے اور جب انکی کھال کھینچی تو ان کا گوشت بالکل سالمون مچھلی کا سا نظر آیا اسنا انکا سرکاٹکر گوشت پکاکر کھایا تو اسے بہت لذیذ معلوم ہوا —— اسنے مزید تجربہ کرنے کے لئے اپنے بعض احباب کی دعوت کی اور منجملہ اور کھانوں کے سانپ کا گوشت بھی ان کے سامنے پیش کیا۔ سبھوں نے اسکی بہت تعریف کی اور نہایت شوق کیساتھ اسے کھایا۔

اس کے بعد اس شخص نے سوچا کہ سانپ کا گوشت مچھلی کی طرح ڈبوں میں بند کرکے بازار میں پیش کرنا چاہئے۔ چنانچہ اس تجربہ میں بھی وہ کامیاب ہوا اور بازار میں اس گوشت کی مانگ بہت بڑھ گئی

سانپ پکڑ کر کارخانہ کے اندر تار کے صندوقوں میں ڈال دیے جاتے ہیں اور بندوق سے ان کے سر اُڑا کر دُم کی طرف سے لٹکا دیے جاتے ہیں یہاں تک کہ ان کا خون صاف ہو جائے —— اس کے بعد ان کی کھال کھینچ کر ان کا تیل نکال لیا جاتا ہے اور پھر نرم آنچ میں ان کو دو گھنٹہ تک پکا کر گلا لیتے ہیں —— جب ہڈیاں علیحدہ ہو جاتی ہیں تو نمک اور سیاہ مرچ کا سفوف چھڑک کر پھر آگ پر رکھ دیتے ہیں —— اس کے بعد گوشت کے ٹکڑے ڈبوں میں بند کرکے ہوٹلوں اور بازاروں میں بھیج دیے جاتے ہیں۔ جہاں یہ بحساب ایک گنی فی پونڈ فروخت ہوتے ہیں۔

ادب اُردو کا مکمل ذخیرہ

تاریخ اُردوئے قدیم | وہ مکمل جامع تاریخ ہے جسمیں زبان اردو اور اسکی نظم و نثر کی مفصل اور مکمل تاریخ اور عہد بعہد کی ترقیوں کا مکمل تذکرہ ہے زمانہ ابتدائے زبان اُردو سے لیکر بارہویں صدی ہجری کے نصف اول تک کا ذکر اور اسی کے ضمن میں تمام شعراء اور مصنفین کے نہایت صحیح اور بیحد دلچسپ حالات بھی تحریر ہیں جسکو حکیم سید شمس اللہ قادری ماہر علوم آثار قدیمہ نے عربی فارسی اردو انگریزی فرانسیسی جرمنی وغیرہ کی مشہور و مستند کتابوں سے اخذ کرکے مرتب و مدون کیا۔ جو سنہ ۱۹۲۶ء سے عثمانیہ یونیورسٹی کے امتحان ایم۔ اے میں بھی داخل ہے قیمت عہ

تاریخ ادب اُردو | یعنی ہسٹری آف اُردو لٹریچر کا اردو ترجمہ۔ جسمیں نظم و نثر کی تاریخی ترقیوں کو اس حسن و خوبی کیساتھ دکھایا گیا ہے کہ اس سے بہتر آجتک کسی کتاب میں اسکی نظیر نہیں ملتی۔ خوبی یہ ہے کہ دور اول سے لیکر زمانہ حال تک کے تمام شعراء اور نثر نگاروں کے واقعات زندگی اور انکے سوانح کو بھی انتہائی شرح و بسط کے ساتھ دکھایا گیا ہے ساتھ ہی ساتھ تنقیدی نظر بھی ڈالی گئی ہے دو جلدیں ہیں ایک میں نظم دوسری میں نثر کا تذکرہ ہے۔ قریب قریب سو مصنفین کی تصاویر بھی اس میں دی گئی ہیں۔ اور انڈکس بھی شامل کیا گیا ہے اس میں دوسرے تذکروں کی غلطیاں بھی دکھائی گئی ہیں چھپائی اس قدر مرغوب ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ قیمت لعہ

تذکرۃ الخواتین | اردو اور فارسی کی نہایت مشہور و معروف شاعرہ عورتوں کا جامع تذکرہ ہے۔ بہترین کلام کا تذکرہ ہے اور عورتوں کا کوئی تذکرہ اس سے بہتر نہیں دیکھا گیا۔ قیمت عہ

دیوان خواجہ میر درد | خواجہ میر درد کے کلام کو نہایت صحت کے ساتھ نہایت قدیم نسخوں سے ملا کر چھاپا گیا ہے۔ شروع میں خواجہ صاحب کا تذکرہ اور انکے شاگردوں کے جامع حالات مقدمہ میں درج ہیں قیمت ۱۲ر

مذہب الاسلام | ایک خاص قسم کا تذکرہ جس میں مسلمانوں کے تمام فرقوں کے حالات و عقاید کا نہایت تفصیل اور تشریح کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور دعوے کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے بہتر اس فن میں کوئی کتاب نہیں ہے نہایت دلچسپ کتاب ہے قیمت للعہ

سخن شعراء | مولوی عبدالغفور صاحب نساخ کا لکھا ہوا اردو شعرا کا نہایت جامع تذکرہ ہے اور مشکل سے اس میں اس شان کے شعرا چھوٹے ہیں۔ جابجا کلام کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے نہایت عمدہ اور نایاب تذکرہ ہے قیمت عہ

تذکرۂ حسینی فارسی | اسقدر بہترین اور دلچسپ تذکرہ ہے کہ شاید اسکی نظیر فارسی کے کسی دوسرے تذکرہ میں آپکو نہ ملسکیگی۔ شعراء کے حالات اور کلام کے علاوہ جسقدر لطائف انسے متعلق ہیں وہ بھی لکھدیے گئے ہیں یہ تذکرہ زمانہ عالمگیر بادشاہ میں لکھا گیا تھا قیمت الر

تذکرۂ گلشن بیخار | نواب مصطفےٰ خاں مرحوم کا مشہور اور مقبول اردو شعرا کا زبان فارسی میں تذکرہ ہے قیمت ۱۰ر

انتخاب نادرہ | تمام شعراء کے بدیع اور لطیف لطائف کو تواریخ کی کتابوں سے انتخاب کرکے لکھا گیا ہے قیمت ۱۴ر

المشتہر منیجر نولکشور پریس صیغۂ بکڈپو لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شایع ہوتا ہے۔
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ (ہے)
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے۔

جلد ۲۳	فہرست مضامین اپریل سنہ ۳۳ء	شمارہ ۴

نگار

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۳	اپریل ۳۳ء	شمارہ ۴

ملاحظات

دار العلوم ندوہ کے متعلق کچھ اور انکشافات

عبد العلی ناظم ندوہ کے استبداد پر ایک اور مہر توثیق

گزشتہ ماہ کے ملاحظات لکھنے کے بعد ہمارا ارادہ نہیں تھا کہ " دار العلوم ندوہ " کی داستان کو جس میں نہ ہمارے لئے کوئی لذتِ ندرت ہے، نہ کیفیت افادیت، بار بار ملک کے سامنے پیش کریں۔ لیکن اس خیال کو پیش نظر رکھکر کہ ممکن ہے ملک کے لئے اس میں کچھ نہ کچھ سامان بصیرت و عبرت موجود ہو، مناسب یہی معلوم ہوا کہ اس درسگاہ کی موجودہ حالت اور اس کے ناظم (عبد العلی) کی ذہنیت کو ایک بار پوری طرح بے نقاب کر دیا جائے، تاکہ ہماری قوم جان لے، کہ اس درسگاہ کی امداد کرنا بنجر زمین میں آبپاشی کرنے سے زیادہ نہیں اور یہاں بچوں کو تعلیم کے لئے بھیجنا ان کے دل و دماغ پر ہمیشہ کے لئے غلامی کی مہر لگا دینا ہے۔

" دار العلوم ندوۃ العلماء " کے شاندار اور پُرہیبت وجلال نام کو سنکر دنیا غالباً یہ باور کرتی ہوگی کہ علوم عربیہ کی یہ کوئی نہایت ہی مہتم بالشان درسگاہ ہوگی - اس کے ذرّہ ذرّہ سے علوم وفنون کے دریا ابل رہے ہونگے، اس کے مختلف حجروں میں علامۂ تیمیہ اور ابو العلاء المعری بیٹھے ہوئے درس حکمت دے رہے ہوں گے - اور اسکے ایوانوں میں ہزارہا شائقین طلبہ ہر وقت مصروف مطالعہ نظر آتے ہوں گے، لیکن غالباً دنیا یہ معلوم کرکے حیران رہ جائے گی کہ دار العلوم ندوہ میں طلبہ کی تعداد سیکڑوں تک بھی نہیں پہونچتی اور ان میں تقریباً سب وہی ہیں جو دار الاقامہ میں رہتے ہیں اور جنکو ان کے والدین نے " دار العلوم " کے لفظ سے مرعوب ہوکر یہاں کسب " علوم و فنون " کے لئے بھیجدیا ہے ——— رہا یہ امر کہ یہاں کن کن علوم کی تعلیم ہوتی ہے، نصاب کس درجہ بلند ہے، کیسے کیسے مشاہیر علم وفضل یہاں کے اساتذہ ہیں، کن قابل ہاتھوں میں یہاں کی عنان حکومت پائی جاتی ہے - اور آئین نظم ونسق میں پبلک کی نمایندگی کس حد تک پائی جاتی ہے ——— ان تمام باتوں پر میں اس وقت روشنی ڈالوں گا جب تمام اطلاعات مجھے فراہم ہوجائیں ——— میں نے ڈاکٹر عبد العلی ناظم ندوہ کو ایک تحریر بطور استفسار بھیجی ہے - اگر انہوں نے جواب دینے کی زحمت گوارا فرمائی جسکا مجھے یقین نہیں توخیر، ورنہ پھر میں دوسرے ذرایع سے تمام ضروری اطلاعات ومعلومات اس درسگاہ کے متعلق حاصل کرکے پبلک کو آگاہ کرونگا -

گزشتہ ماہ کے ملاحظات میں ایک طالب علم عنایت علی (صحیح نام عنایت اللہ ہے) کے اخراج کا حال بیان کیا گیا تھا، لیکن شوق موسیقی کیوجہ سے کسی طالب علم کو محروم تعلیم کردینے کی ایک مثال ناظم ندوہ اور بھی قائم کرچکا ہے جسکا حال مجھے بعد کو معلوم ہوا -

ایک طالب علم علاء الدین احمد حیدر آباد سے بغرض تعلیم یہاں بھیجا گیا تھا جو وہاں کا وظیفہ یاب بھی تھا - جب کامل ۸ سال کا زمانہ یہاں تعلیم پاتے ہوئے اسے گزر گیا تو ذوق موسیقی کی بناء پر اسے بھی نکالا گیا - اور معتمد مالیات حیدر آباد (نواب فخر یار جنگ بہادر) کو ناظم ندوہ نے انتہائی زہد وورع کی نمایش کرتے ہوئے ایک تحریر بھیجی کہ علاء الدین احمد کا وظیفہ (غالباً تیس روپیہ ماہوار) بند کردیا جائے، کیونکہ وہ خارج اوقات مدرسہ میں، میوزک کالج بھی جاتا ہے ——— نواب فخر یار جنگ نے جو ہندوستان کی کسی معمولی درسگاہ کے ناظم نہیں، بلکہ حیدر آباد ایسی بڑی ریاست کے معتمد مالیات ہیں، جواب دیا کہ محض موسیقی سے ذوق رکھنا کوئی الزام کی بات نہیں - اگر وہ دار العلوم کی تعلیم کے لحاظ سے ناکارہ ثابت ہورہا ہے تو اطلاع دی جائے ——— لیکن چونکہ طالب علم تیز تھا اور اس نے علاوہ امتحانات دار العلوم کے یونیورسٹی کے امتحان عالم میں بھی کامیابی حاصل کرلی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ ناظم اس کی بدشوقی کی شکایت نہ کرسکتا تھا ——— الغرض نتیجہ یہ ہوا کہ مستبد ناظم نے اس طالب علم کو دار العلوم میں پڑھنے کی اجازت نہ دی اور فخر یار جنگ بہادر نے اس کے وظیفہ میں بیس روپیہ کا

اور اضافہ کرکے پنجاب بھیجدیا

خود اسی عنایت اللہ طالب علم کو اس سے قبل ایک بار اور نکالا گیا تھا جسکی داستان سننے کے قابل ہے ناظم ندوہ نے بلاکر اس سے کہا۔ (اور غالباً تحریری حکم بھیجا) کہ چونکہ تم بعض گمراہ کن رسائل کا مطالعہ کرتے رہتے ہو اس لئے تمھیں چاہئے کہ "عبدالماجد دریابادی" کے پاس جاکر تجدید ایمان کرو اور اپنے اعتقادات کی اصلاح چاہو—— چنانچہ یہ ملحد و مرتد اس "قبلۂ ایمان و کعبۂ اسلام" کے پاس دریاباد شریف گیا، اور واپس آیا۔ چند دن بعد پھر ہدایت ہوئی کہ دوبارہ جاکر "توجہ باطنی" حاصل کی جائے لیکن معلوم نہیں صاحب توجہ میں کوتاہی کی کمی تھی یا معمول میں ظلمت و تاریکی کی زیادتی کہ ناظم ندوہ مطمئن نہ ہوا اور داڑھی منڈوانے کا الزام قائم کرکے اس کے اخراج کا حکم صادر کیا گیا۔ یہ طالب علم عبدالعلی ناظم ندوہ کے پاس آیا اور توبہ کی کہ آیندہ داڑھی نہ منڈواؤں گا، لیکن اس شحنۂ اسلام (ناظم ندوہ) نے صرف زبانی اقرار کو کافی نہ سمجھ کر حکم دیا کہ اس قسم کا ایک تحریری عہدنامہ پیش کرو۔ چنانچہ اس نے ایک کاغذ پر لکھ دیا کہ "اگر اسلام نام ہے صرف داڑھی رکھنے کا تو میں آیندہ داڑھی نہ منڈواؤں گا"

ظاہر ہے کہ اس تلخ حقیقت کے اظہار کو ایک متقشف مسلمان کیونکر برداشت کرسکتا تھا۔ اس لئے عہدنامہ کی عبارت نامنظور کی گئی اور دوسرا عہدنامہ مرتب ہوا جس میں "محض شریعت اسلام کا احترام کرتے ہوئے داڑھی چھوڑدینے" کا اقرار کرایا گیا اور پھر کہیں خدا خدا کرکے دوبارہ اس کو پڑھنے کی اجازت دی گئی۔

داڑھی کے باب میں موجودہ ناظم ندوہ کو جس درجہ غلو و انہماک ہے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ حال ہی میں حضرت ناظم نے ایک اور حکم نافذ کیا ہے کہ آیندہ کوئی طالب علم نہ انگریزی وضع کے بال رکھے اور نہ داڑھی منڈوائے —— اس حکم کے نفاذ پر بعض طالب علم "بارگاہ نظامت کبریٰ" میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ "اے خداوند اخلاق و ایمان اور اے خدائے دارالعلوم ندوۃ العلماء کم از کم اتنی اجازت تو دیدے کہ ہم اپنے بالوں کو بڑھا سکیں" —— چنانچہ اس پر ارشاد ہوا کہ "ہاں تم زلفیں رکھ سکتے ہو" اور اس کی اجازت یقیناً ملنی چاہئے تھی کیونکہ خود رسول اللہ نے بھی سر کے بالوں کو "گاہے تا دوش و گاہے تا بناگوش" بڑھنے کی اجازت دی تھی یقیناً عبدالعلی صاحب کیطرف سے جو احکامات شرعی اس طرح سے نازل ہوتے رہتے ہیں ان میں انکی نیت پر کوئی حملہ نہیں.... کیونکہ انھوں نے اسلام کو جتنا اور جس انداز سے سمجھا ہے اتنا ہی اور اسی طرح وہ دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں، لیکن اگر یہ تمام پابندیاں، یہ تمام احتیاطیں صرف اس لئے ہیں کہ سنت نبوی ہاتھ سے نہ جائے، کوئی ایسا طریق عمل اختیار نہ کیا جائے جو رسول اللہ نے اختیار نہیں فرمایا تھا، تو پھر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ عبدالعلی ناظم ندوہ کو اپنی عاقبت سے زیادہ طلبۂ دارالعلوم کی عاقبت کی کیوں فکر ہے اور وہ پہلے اپنے آپ کو کیوں اس معیار کا مسلمان نہیں بناتے جو دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ عبد العلی صاحب نے خود کبھی داڑھی نہیں منڈائی یہاں تک کہ اب اس نے "مربع" قسم کی ایک بہترین داڑھی کی صورت اختیار کرلی ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ انھوں نے اپنے سر کے بال بھی اتنے بڑھالئے ہیں کہ شانہ کرنے کے بعد وہ کانوں کی لو تک آجاتے ہیں، لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا سنت نبوی کی پیروی یہیں تک آکر ختم ہوجاتی ہے۔ اور معاشرت و زندگی کے اور جتنے پہلو ہیں ان سب کو اس پابندی سے مستثنیٰ رہنا چاہئے ——— یقیناً رسول اللہ نے کبھی داڑھی نہیں منڈوائی۔ لاریب کہ انھوں نے کبھی انگریزی وضع کے بال نہیں رکھے ——— لیکن کیا انھوں نے کبھی اس وضع کی شیروانی و اچکن کا استعمال کیا تھا، جو عبد العلی صاحب استعمال کرتے ہیں، کیا رسول اللہ نے اس تراش کی ٹوپی کبھی استعمال کی تھی جو عبد العلی صاحب کے سر مبارک پر نظر آتی ہے۔ کیا آنحضرت نے اس کاٹ کا پاجامہ کبھی پہنا تھا جو ناظم ندوہ استعمال کرتا ہے، کیا کسی روایت سے رسول اللہ کا کبھی اس گھومنے والی کرسی پر بیٹھنا ثابت ہے، جس پر ڈاکٹر عبد العلی صاحب ہر صبح و شام متمکن نظر آتے ہیں۔ اور کیا نبی آخر الزماں نے کبھی کسی نامحرم عورت کے جسم کو ہاتھ لگایا جسے ڈاکٹر صاحب نے بہ حیثیت پیشہ کے اختیار کیا ہے ۔ ؟

یہاں پہونچ کر علماء شریعت، بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ کی بحث لیکر بیٹھ جاتے ہیں تاکہ وہ اپنے بہت سے افعال و اعمال کے جواز کی تاویل کرسکیں، لیکن چونکہ معاشرت انسانی میں حسن و قبح کا سوال (جو بنیاد ہے بدعت حسنہ و بدعت سیئہ کے سمجھنے کی) بالکل انفرادی رائے کی چیز ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ عبد العلی صاحب کے لئے تو میز و کرسی، تانگہ و موٹر، شیروانی و پاجامہ بدعت حسنہ قرار پائے اور دوسرے شخص کے لئے سر کے اگلے حصہ کے بالوں کا بڑھالینا بدعت سیئہ میں شمار ہو۔

اگر اصولاً کسی شخص میں انگریزی وضع کے بال رکھنے کے بعد نمایش و زیبایش کا شوق پیدا ہوسکتا ہے جو ایک طالب علم کے لئے موزوں نہیں تو بالکل اسی طرح کرسی پر بیٹھنے اور موٹر پر سوار ہونے کے بعد ایک شخص میں عجب و غرور پیدا ہوسکتا ہے جو ایک ڈاکٹر کے لئے کسی طرح مناسب نہیں ——— اور اگر عبد العلی صاحب کا مرتبہ اس سے بہت بلند ہے کہ ان کے اخلاق پر دنیاوی اسباب جاہ و جلال کا کوئی اثر ہو، تو ان کو یہ کیونکر معلوم ہوگیا کہ دوسرا شخص جو انگریزی وضع کے بال رکھنا چاہتا ہے اس کی فطرت اُن سے کم بلند ہے ——— پھر اس کو بھی جانے دیجئے اگر یہ ممانعت محض فتنہ کے اندیشہ کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے، تو کیا زلفیں بڑھا لینے کی اجازت میں اس فتنہ کی پرورش کا سامان نہیں پایا جاتا ——— زیادہ سے زیادہ اگر کوئی فرق ہوسکتا ہے تو یہ کہ انگریزی وضع کے بال رکھنے میں مردانہ شوق نمایش پیدا ——— ہونے کا اندیشہ ہے تو زلفیں بڑھا لینے میں نسائی کیفیت کے نشو و نما کا،

بہر حال یہ ہیں وہ چھوٹی چھوٹی باتیں جن پر ناظم کی توجہ صرف ہوتی ہے اور یہ ہیں اُن کی وہ رواداریاں جنھوں نے اس درسگاہ کی حالت کو سقیم بنا رکھا ہے۔ اب اسی کے ساتھ چند کلمے شیخ صاحب (حمید حسن قدوائی) کے متعلق بھی سن لیجئے جن کو اس درسگاہ کے مہتمم ہونے کا فخر حاصل ہے۔ یہ بزرگ کتابی قابلیت کے لحاظ سے جو کچھ بھی ہوں۔ مجھے اس کا علم نہیں لیکن اپنی ذہنیت کے اعتبار سے ان کو ناظم ندوہ کے حریف کامل ہونیکا دعویٰ ہے۔ صرف ایک واقعہ اس کے ثبوت میں پیش کر دینا غالباً کافی ہوگا۔

کلکتہ کے چند فاضل مرد اور وہیں کی چند گریجوئیٹ عورتیں لکھنؤ آتی ہیں اور یونیورسٹی ہال میں ان کے لکچروں کا انتظام ہوتا ہے —— دار العلوم ندوہ کے طلبہ بھی عمارات یونیورسٹی کے قریب رہنے کی وجہ سے واقف ہو جاتے ہیں اور ان کا شوق علم کشاں کشاں لکچر روم تک پہونچا دیتا ہے —— جب یہ واپس آتے ہیں۔ تو جناب مہتمم ان کو طلب کرتے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے کہ "تم لوگوں کو شرم نہیں آتی کہ عورتوں کا لکچر جا کر سنتے ہو اور ندوہ کو بدنام کرتے ہو" —— اگر ان الفاظ میں طلبہ کو غیرت دلانا اس لئے نہیں تھا کہ ان میں سے کوئی ان عورتوں کا حریف علم بننے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا، تو پھر اس برہمی کا اندازہ مشکل ہے جو مہتمم صاحب کے غیرت دلانیوالے الفاظ سے ظاہر ہو رہی ہے، کیونکہ طلبہ کا نامحرم عورتوں کو جا کر دیکھنا یا اُن کی آواز کو سننا کوئی ایسی معمولی بات نہ تھی جس کو مہتمم صاحب کی شب زندہ دارانہ خصوصیات آسانی سے برداشت کر سکتیں۔

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ طلبۂ ندوہ کی ذہنی آزادی کو روکنے کی اور تدابیر بھی اختیار کی جاتی ہیں مثلاً یہ کہ مہتمم صاحب ان کو ملک کے تمام اخبارات و رسائل دیکھنے کی اجازت نہیں دیتے، بہت سی ایسی کتابیں لائبریری سے اُن کو نہیں دی جاتیں جن کے مطالعہ سے ان کے تقشف دور ہونے کا اندیشہ ہے اور اس قسم کا سلوک ان سے کیا جاتا ہے جسے خوددار طبیعتیں برداشت نہیں کر سکتیں، چنانچہ سنا گیا ہے کہ ایک بار کسی طالبعلم (غلام محی الدین) نے مہتمم صاحب کو امتحان کے کمرہ میں زدوکوب بھی کی اور جس کے متعلق میں نے ناظم ندوہ سے مفصل کیفیت دریافت کی ہے۔

متعدد طلبہ میرے پاس ایسے آئے اور آتے رہتے ہیں جو ندوہ اور وہاں کے ارباب نظم کے طرف سے لبریز شکایت ہیں اور معلوم ہوا کہ بعض طلبہ کا وہاں سے چلا جانا اور جدید طلبہ کا داخل نہ ہونا۔ اس تنگ ذہنیت اور اس بد نظمی کی وجہ سے ہے —— انگریزی تعلیم کے لئے بھی وہاں ایک درجہ کھولا گیا ہے لیکن غالباً اس لئے کہ پبلک پر اپنی آزادہ روی اور روشن خیالی کا اثر ڈال کر مالی امداد حاصل کی جائے، ورنہ عملاً اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اخبارات میں ناظم ندوہ کی طرف سے پبلک کے سامنے چندہ و عطیات کے لئے اپیل تو ضرور کبھی کبھی

پیش کردی جاتی ہے، لیکن ارباب ندوہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر کبھی غور نہیں کرتے کہ کیا قوم اپنے بچوں کو وہاں صرف اس لئے بھیجنے کے لئے طیار ہو سکتی ہے کہ جب دس سال کا طویل زمانہ ختم کرنے کے بعد وہ وہاں سے نکلیں تو یکسر داڑھی ہی داڑھی نظر آئیں اور روشن خیالی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا "نقطۂ سویدا" ان کے دلوں میں نہ پایا جائے!

حقیقت یہ ہے کہ ذہنی آزادی کے لحاظ سے اس وقت مسلمانوں کی صرف ایک ہی درسگاہ جامعۂ ملیہ (دہلی) ایسی ہے جس پر ہماری قوم ناز کر سکتی ہے لیکن افسوس ہے کہ قوم اس کی طرف سے بے پرواہ ہے اور داڑھیوں کے رعب نے اب تک ہم میں "سیاہ و سفید" کی تمیز کی اہلیت پیدا نہیں کی

وہائٹ پیپر

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ گول میز کانفرنس کی داستان کیا ہے، یہ بار بار اکابر ہند کا لندن جا جا کر لوٹ آنا کس مقصود کی تگ و دو ہے فیڈریشن کس نعمت ربانی کا دوسرا نام ہے، صوبوں کی خود مختاری کی حقیقت کیا ہے، لامرکزی طریق حکومت سے ہندوستان کو کیا برکات ملنے والی ہیں، اور یہ کہ ملک کی آزادی کا کب تک انتظار کیا جائے تو میں سورۂ طٰہٰ کی وہ آیتیں سنا دوں گا جن میں موسیٰؑ اور فرعون کا مقابلہ دکھایا گیا ہے اور پھر وہائٹ پیپر کی طرف اشارہ کرکے کہہ دوں گا کہ

اذا جاء موسیٰ والقی العصا　　فقد ابطل السحر والساحر

کیونکہ وہائٹ پیپر واقعی ایک عصائے موسوی ہے جس نے گول میز کانفرنس کے سحر و طلسم کو باطل کر کے رکھ دیا اور "وعدہ پر جینے والوں" کی آنکھ سے پردہ ہٹا کر یہ حقیقت پوری طرح واضح کر دی کہ

ازیں فزوں نتوانی بمن جفا ورنہ
تو آں نئی کہ جفائے توانی و نکنی

وہائٹ پیپر کیا چیز ہے-؟ یہ بیان ہے حکومت برطانیہ کا جو مطالبات ہند کے جواب میں شایع کیا گیا ہے، یہ تفسیر ہے اُن الہامات و تمشابہات سیاست کی جو گول میز کانفرنس میں خدا کے چند برگزیدہ بندوں پر نازل ہوئی اور یہ تعبیر ہے اس خواب آزادی کی جس نے سالہا سال سے وطن و اہل وطن کو بیقرار و مضطرب بنا رکھا تھا

پھر کیا آپ نے اس صحیفۂ قسمت کا مطالعہ کر لیا۔ اس نوشتۂ مقسوم کا مدعا جان لیا اور اپنی بڑھی ہوئی تمناؤں کے خون کئے جانے کی داستان سُن لی؟ — ممکن ہے بعض جماعتوں کو نے نوازانِ برطانیہ کا یہ نغمہ کوئی جدید چیز معلوم ہو، ہو سکتا ہے کہ بعض اُن حضرات کے نزدیک جو "کشود نقاب" کی تاخیر اور "ازدحام تمنا" کے تماشہ میں مصروف تھے یہ کوئی جدید جلوہ طرازی ثابت ہو، لیکن ارباب نظر جانتے تھے کہ برق کی عبادت کرنے والوں کو ہمیشہ اسی طرح "افسوس حاصل" کرنا پڑتا ہے اور اپنی ذات پر اعتماد نہ کرنے والوں کیلئے دنیا ہمیشہ اسیطرح بے

اعتماد ثابت ہوتی ہے

کہا جاتا تھا کہ گول میز کانفرنس، سائمن کمیشن رپورٹ سے کچھ ترقی کرکے، آیندہ کی اصطلاحات پر غور کر رہی ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ ملک کی مکمل آزادی تو کجا، اسے ڈومی نین ہوم رول کی رعائتیں بھی نہیں دی جاتیں۔ بیان کیا جاتا تھا کہ ہوم گورنمنٹ کے اختیارات اور وائسرائے کی ملوکانہ حیثیت میں بہت کمی پیدا ہو جائے گی، لیکن جب پردہ اٹھا تو معلوم ہوا کہ ان کے چہروں سے جلال و استبداد اور زیادہ ہویدا ہے ——— پھر کیا ہندوستان میں کوئی ایک جماعت بھی ایسی نظر آتی ہے جس نے اس کو نگاہ پسندیدگی سے دیکھا ہو، کوئی ایک متنفس ایسا ہے جس نے حکومت کے اس فیصلہ کو انصاف پر محمول کیا ہو، اس لئے اب سوال نہ آیندہ کے اعتماد کا ہے نہ ماضی کی حسرت کا بلکہ اتفاق کامل اور اتحاد تام کے ساتھ اس امر پر غور کرنے کا کہ

کلید بستگی تست غم، بجوشش ای دل
تو گر چنیں نہ گدازی، گرہ کشائے تو کیست؟

مغربی زبانوں کے ادب لطیف پر ایک سرسری تبصرہ

ادب لطیف (Fine Literature) کی اصطلاح انگریزی زبان میں سب سے پہلے ڈین سوفٹ مصنف "سفر نامہ گولیور" نے استعمال کی۔ اس سے پہلے صرف ادب (Literature) کا لفظ رائج تھا جس میں شاعری۔ ڈرامہ۔ افسانہ۔ تنقید۔ مکتوبات عشقیہ و غیر عشقیہ۔ تاریخ۔ حکمت فلسفہ وغیرہ سبھی کچھ شامل تھے۔ لیکن ادب لطیف کا مفہوم محدود ہے اور . . . . صرف شاعری، ڈرامے، مکتوبات، افسانے، رومانیات، ہلکی تنقیدیں اور ادبی یا شاعرانہ تصوف اس کے ماتحت سمجھے گئے ہیں۔

انگریزی ادب

تاریخی حیثیت سے انگریزی ادب چھ ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے (۱) قدیم ترین زمانہ سے لیکر چاسر تک (۲) چاسر سے عہد "نشاۃ الثانیہ" (Renaissance) تک (۳) عہد الیزبتھ (۴) دور "بازگشت" یا (Restoration) (۵) اٹھارویں صدی (۶) انیسویں صدی و مابعد۔

قدیم زمانہ سے چاسر تک

انگریزی زبان کی ابتدا ان ٹیوٹانک قوموں سے ہوتی ہے جو پانچویں صدی میں ڈنمارک اور شمالی جرمنی سے ہجرت کرکے جزائر برطانیہ میں آبسے۔ یہ لوگ تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھے اور ان کا مذہب عناصر پرستی تھا۔ وہ اپنے ساتھ کچھ روایات و اساطیر اور ان سے متعلق کچھ غیر مکتوب منظومات لائے تھے جو زیادہ تر رزمیات پر مشتمل تھیں۔ ان میں سے "بیوولف" کی رزمیہ نظم قابل ذکر ہے۔

چھٹی صدی سے مسیحیت کے تسلط کے ساتھ ساتھ ادب انگریزی کی بھی جلاو تہذیب ہوتی گئی۔ جہاں تک تاریخی تحقیق و تدقیق سے معلوم ہوسکا ہے سب سے پرانے انگریزی کے مصنف جن کے نام لئے جا سکتے ہیں الڈہلم اور وینیربل بیڈ ہیں۔ موخر الذکر ایک ممتاز مورخ تھا۔ اسی زمانہ میں کیڈمن کے مذہبی منظومات بھی قابل ذکر ہیں انگریزی نثر نگاری کی بنیاد شاہ الفریڈ کے عہد میں پڑی جس نے لاطینی زبان سے متعدد مذہبی کتابوں کے ترجمے کئے۔ "اخبار اینگلو سکسن" کی تدوین اسی کے زمانہ سے شروع ہوئی اور ۱۱۵۴ء تک جاری رہی۔ گیارہویں صدی میں "فتح نارمن" کے ہاتھوں انگریزی قوم کی معاشرت اور ہیئت اجتماعی میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا۔ کیونکہ اب تک اہل دربار اور شرفا کی زبان لاطینی تھی لیکن "فتح نارمن" کے بعد فرانسیسی زبان رائج ہوگئی اور لاطینی صرف کلیسا کی زبان ہوکر رہ گئی۔ انقطاعیہ نظام حکومت کا

غاز بھی اسی " فتح " کے بعد سے ہوا - اور ادبیات پر اس کا یہ اثر پڑا کہ انگریزی زبان صرف کوچہ و بازار کی زبان رہ گئی ور جتنی قابل قدر تصنیفیں تھیں وہ سب فرانسیسی زبان میں ہونے لگیں -

بارہویں اور تیرہویں صدی میں انگریزی ادبیات کا دائرہ بہت محدود تھا - زیادہ تر نثر میں تصنیفیں ہوئیں اور وہ بھی ہب و اخلاقیات سے متعلق - لیکن اس عہد کے شعراء کے کارنامے جو ابتک محفوظ رہ سکے ہیں ان سے پایا جاتا ہے کہ شاعری وال پر نہ تھی اور عوام میں ایک اوسط قسم کا شاعرانہ مذاق موجود تھا - تیرہویں صدی میں فرانسیسی تہذیب کے زیر ثر انگلستان میں شاعری کی ایک نئی صنف وجود میں آئی جسکو " رومان " کہتے ہیں - چنانچہ انگریزی اور فرانسیسی دونوں بانوں میں متعدد " رومان " لکھے گئے جو بطور یادگار ابتک موجود ہیں - ان میں سے " بادشاہ آرتھر اور اسکے کارنامے " اور نک ہارن " زیادہ مشہور ہیں - اس کے علاوہ فرانسیسی زبان سے کچھ ترجمے بھی ہوئے جن میں کچھ مذہبی کتابیں - کچھ رومان اور کچھ شاعری شامل ہیں -

چاسر سے " نشاۃ الثانیہ " تک | یہ دور ادبیات انگریزی کے طالب علم کے لئے ایک خاص دلچسپی رکھتا ہے کیونکہ علاوہ اپنی ادبی شان و شوکت کے یہ زمانہ آنیوالی ترقیوں کا آئینہ بردار ہے - اس عہد کا سب سے بڑا مایۂ ناز ادیب چاسر (۱۳۴۰ء تا ۱۴۰۰ء) ہے - اس کے کارنامے اسوقت کے بہترین ملکی و غیر ملکی روایات کا مجموعہ ہیں جنمیں جگہ جگہ مصنف کی ذاتی طباعی خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہے - " حکایات کینٹربری " سے تقریباً ہر وہ شخص واقف ہے جس کو ذرا بھی ادبیات انگریزی سے دلچسپی ہے - یہ حکایتیں اپنے انداز بیان - ظرافت اور کردار نگاری کے لحاظ سے انگریزی زبان میں شاہکار تسلیم کر لی گئی ہیں - چاسر اگرچہ اس زمانہ کی مشہور ترین ہستی ہے لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ اس کے علاوہ اور کوئی شاعر یا ادیب اس زمانہ میں نہ تھا - چھوٹے بڑے شعرا بہت سے تھے - جن میں سے اکثر کے ناموں کا بھی اب پتہ نہیں چلتا - " موتی " (Pearl) جو ایک گمنام شاعر کی تصنیف ہے اور بڑی ادبی خوبیوں کی چیز ہے اسی عہد کی یادگار ہے - یہ نظم شاعرانہ اور مذہبی خیالات کا ایک لطیف امتزاج ہے -

پندرہویں صدی میں آئیے تو معلوم ہوگا کہ یہ زمانہ زیادہ تر نقالی اور کورانہ تقلید کا زمانہ تھا - چاسر کی شاعری معیار مان لی گئی تھی اور جو کچھ لوگ لکھتے تھے اسی کو پیش نظر رکھ کر لکھتے تھے - لیکن اس صدی کے شعراء اگرچہ انھوں نے خیالی تمثیلی اور اخلاق اور ہر طرح کی نظموں میں طبع آزمائی کی لیکن چاسر کی خصوصیت کسی کو پھر نصیب نہ ہو سکی - عوام پسند شاعری بھی اس زمانہ میں روز افزوں ترقی پر تھی اور اس قسم کی شاعری کی بہترین مثال (Ballads) ہیں جنکا ایک مجموعہ پرسی (Percy) نے اپنی مشہور کتاب " قدیم انگریزی شاعری کے باقیات الصالحات " میں شامل کر دیا ہے - پندرہویں صدی کی ایک خاص چیز مذہبی تمثیلیں بھی ہیں جو " اسرار غیب " معجزات اور اخلاق

سے متعلق تھیں۔ ان تمثیلوں کی نمائش ملک کے مختلف حصوں میں ہوتی رہتی تھی اور ان کی غرض و غایت یہ تھی کہ عوام کو دلچسپ پیرایہ میں اخلاقی سبق دئے جائیں۔

اس دور کی نثر بھی تبلیغی اور تعلیمی اغراض کے لئے وقف تھی۔ نثر نگاروں میں کیپ گریو (Capgrave)، پیکاک (Pecock)، کیکسٹن (Caxton) خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ کیکسٹن نے پہلے پہل انگلستان میں طباعت کو رواج دیا۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ مشہور سرطامس میلوری ہے۔ جنھوں نے "اساطیر آرتھر" کو یکجا کر کے "مرگ آرتھر" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو اپنے زور بیان اور رنگینی کے لحاظ سے غیر فانی ہے۔

پندرھویں صدی کے مصنفین کی ایک قابل لحاظ خصوصیت یہ بھی ہے کہ سب نے اس بات کی کوشش کی کہ ادبیات کو روزمرہ زندگی سے غیر متعلق اور بیگانہ نہ ہونے دیں۔ اس عہد میں متعدد عورتوں نے بھی تصنیفیں کیں۔ سب سے زیادہ مشہور و معروف جولیانا کے "الہامات عشق حقیقی" ہیں۔

اسی اثناء میں یورپ میں وہ دماغی بیداری شروع ہوگئی جسکو "نشاۃ الثانیہ" کہتے ہیں اور جس نے بہت سے ممالک کی علمی اور معاشی حالت کو آناً فاناً بدل کر رکھ دیا۔ اس تحریک کی ابتدا اطالیہ سے ہوئی اور بتدریج یورپ کے اور حصوں میں پھیل گئی۔ اطالوی ادبیات کا کچھ نہ کچھ اثر چاسر کے کارناموں میں بھی پایا جاتا ہے لیکن درحقیقت یہ اثر شروع شروع ارباب علم کے حلقہ تک محدود رہا۔ یہاں پر اس بات کو بھولنا نہیں چاہیئے کہ جہاں تک انگریزی ادب کا تعلق ہے وہ اپنے عہد وسطی سے کبھی بیگانہ نہیں ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ "نشاۃ الثانیہ" کے غیر ملکی اثرات بہت بڑی حد تک انگلستان کی معاشرت میں سرایت کر چکے تھے۔ لیکن ملک کے ادبی روایات ان کی بدولت مٹے نہیں بلکہ اور وسعت پاگئے

عہدِ الیزبتھ

"دنیائے تخیلی" مصنفہ مور (۱۵۱۶ء) سے لے کر المنائہ "سمسن لا ادریہ" مصنفہ ملٹن (۱۶۶۷ء) تک ادبیات انگریزی کا ایک دور ہے۔ جس میں ملکہ الیزبتھ کے زمانہ کے تمام ادبی کارنامے آجاتے ہیں۔ یہی زمانہ ہے جبکہ انگلستان میں "نشاۃ الثانیہ" نے اپنا زور دکھایا۔

سب سے پہلے اس دور کے نثر نگاروں کو لیجئے جنکے کارنامے بہ حیثیت مجموعی علمی اور مذہبی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس طرز کا پہلا مصنف سرطامس مور ہے جو ایک عالم اور مدبر تھا۔ اس کی "دنیائے تخیلی" (Utopia) انگریزی زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ "جمہوریت" افلاطون کی طرح اس میں بھی یہ بحث کی گئی ہے کہ "ریاست" کا تخیلی معیار کیا ہونا چاہیئے۔ اسکم مصنف "مدرس" بھی اسی زمانہ کا ایک ممتاز اور جامع العلوم شخص تھا۔

اس دور کے مصلحین میں لاٹیمر سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اس کے اصلاحی خطبات خلوص جذبات اور بلاغت کا بہترین نمونہ ہیں اور اُن سے اس زمانہ کی معاشرت اور رسم و رواج پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ مصلحین کے سلسلہ میں فاکس سے قطع نظر نہیں کیا جا سکتا جس کی "کتاب الشہدا" تاریخی لحاظ سے ایک بڑی چیز ہے اس سے ہم کو اس وقت کے مذہبی تعصبات کا پتہ چلتا ہے۔

جرمی ٹیلر اس عہد کا سب سے آخری مذہبی مصنف ہے۔ اس کے خطبات مقبول عام ہوتے تھے۔ لیکن اس کو اخلاقیات سے بہ نسبت الٰہیات کے زیادہ شغف تھا۔

اب ہم اہل علم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جن میں سب سے بڑھا چڑھا شخص فرانسس بیکن تھا جو مجمع العلوم ہونے کے علاوہ ایک زبردست مدبر بھی تھا۔ اس نے مختلف مسائل پر مضامین لکھے جن میں فلسفہ اور سائنس بھی شامل ہیں۔ ایک اور فلسفی جو بیکن کا ہم عصر تھا یہاں لائق ذکر ہے یعنے طامس ہابس مصنف لیویاتھن "سیاسیات" پر اپنے طرز کی ایک نئی کتاب ہے۔ فلسفہ میں ہابس کو اخلاقیات سے زیادہ دلچسپی تھی اس نے بڑی کاوشوں کے بعد اخلاقیات کی تطبیق اپنے عہد کی مادیت سے کی اور دنیائے اخلاقیات میں ایک نئی طرح ڈالی "عہد الیزبتھ" کی شاعری بھی "نشاۃ الثانیہ" سے اسی حد تک متاثر ہوئی جس حد تک کہ ادبیات کی دوسری شاخیں۔ معنوی اور صوری دونوں حیثیتوں سے اس میں تبدیلیاں رونما ہوگئیں۔ نظم کی بعض قسمیں مثلاً "سانٹ" (غزلیہ) اور "اوڈ" (خطابیہ) یک قلم اطالوی شاعری سے لے لی گئی ہیں۔ اور اب انگریزی زبان کی مستقل چیزیں ہوگئی ہیں۔ "سانٹ" کی ابتدا انگلستان میں سرطامس ویاٹ ...... اور ارل آف سرے سے ہوئی۔ الیزبتھ کے عہد میں "سانٹ" کو شیکسپیر اور سرسڈنی فلپ نے درجۂ کمال کو پہونچا دیا شیکسپیر کے "سانٹ" اب تک اظہار جذبات کی بہترین مثالیں سمجھی جاتی ہیں۔

غیر تمثیل نگار شعرا میں اڈمنڈ اسپنسر کا پایہ بہت بلند ہے۔ اس کی سب سے مشہور تصنیف "ملکۂ پرستان" (Faerie Queene) ہے۔ اس کے تمام کارناموں میں "نشاۃ الثانیہ" کے آثار نمایاں ہیں۔ "ملکۂ پرستان" کے علاوہ اس کی ایک اور نظم بہت مقبول ہوئی جس کا عنوان "گڈریہ کا روزنامہ" (Shepherds Calender) ہے۔

یوں تو "عہد الیزبتھ" میں ہر طرح کی نظم و نثر کی اشاعت ہوتی رہی لیکن اس دور کی سب سے زیادہ جلیل القدر خصوصیت تمثیل ہے۔ اگرچہ جیسا پہلے بتایا گیا ہے مذہبی اور اخلاقی ڈرامے ازمنۂ وسطےٰ سے چلے آرہے تھے لیکن یہ کہنا غلط نہیں کہ انگلستان میں ڈرامہ کا رواج زیادہ تر عہد الیزبتھ سے ہوا۔ سولھویں صدی کے آخر تک ڈرامہ ابتدائی حالت میں تھا اور اس کے علمبردار للی (Lyly) کِڈ (Kyd) اور ....

پیل (Peele) اور گرین (Greene) تھے۔ پہلا انگریزی ڈرامہ نگار جس نے ڈرامہ کے فن کو چار چاند لگا دئے وہ کرسٹو فرمارلو (Christopher Marlowe) تھا۔ "ڈاکٹر فاسٹس" "تیمور اعظم" اور "مالٹا کا یہودی" اس کے بہترین ڈرامے ہیں۔

مارلو کے بعد شکسپیر کا زمانہ آتا ہے۔ شکسپیر دنیا کی مشہور ترین ہستیوں میں گنا جاتا ہے اور اس کے ڈرامے ابتک اسی ذوق وشوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزی زبان سے شکسپیر کے ڈرامے اور انجیل نکال دو تو زبان بے مایہ ہو جائے اور یہ بڑی حد تک درست ہے۔ شکسپیر کی عظمت کا راز یہ ہے کہ فطرت انسانی کی عجیب وغریب مصوری میں آج تک کوئی اس کے مرتبہ کو نہ پہونچ سکا۔ اس کے یہاں افراد ڈرامہ تخیلی ہستیاں نہیں ہوتے بلکہ دنیائے گوشت و پوست سے تعلق رکھتے ہیں۔

سترہویں صدی کے وسط تک بہت سے ڈرامہ نگار نکل آئے۔ شکسپیر کی فطانت تو کسی کو نصیب نہیں ہوئی لیکن اوسط درجہ کے ڈرامہ اکثروں نے لکھے ان میں بن جانسن سب سے آگے ہے جو اپنے مطلب کو بڑی سہولت اور سلاست کے ساتھ ادا کرتا ہے۔ اس کے ڈراموں میں ایک روح ایک نشاط ضرور پایا جاتا ہے مگر اس ملکۂ شعری کا کہیں پتہ نہیں جو شکسپیر کا طغرۂ امتیاز تھا۔

بن جانسن کے بعض معاصرین مثلاً چاپمین مترجم ہومر۔ ڈکنسن۔ بیومانٹ اور فلچر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ بیومانٹ اور فلچر نے مل کر کئی عشقیہ ڈرامے لکھے۔ جن میں "فلاسٹر" اور "ایک دوشیزہ کا المناکیہ" عوام میں زیادہ مشہور ہوئے۔ اس قسم کے عشقیہ ڈرامے ۱۶۴۲ء تک لکھے جاتے رہے لیکن بعد کو پیورٹن حکومت نے تھیٹروں کو بند کر کے آئندہ چند سال کے لئے ڈرامے کو گوشۂ خمول میں ڈال دیا۔

"دور بازگشت" انگلستان میں جمہوریت کے بعد اسٹورٹ شاہنشاہی کی بحالی کے ساتھ قوم کا معاشی اور دماغی مطمح نظر بھی بدل گیا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ بادشاہ معہ اپنے خاندان اور معاونین کے اپنی جلاوطنی کے زمانہ میں مختلف ممالک میں زندگی بسر کرتے رہے اور وہاں کے عادات و اطوار اور ادبیات سے آشنا ہوتے رہے۔ فرانس کا تمدن خصوصیت کے ساتھ ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کرتا رہا۔ چنانچہ شاہنشاہی کی بحالی پر فرانس کا اثر اہل دربار میں بہت نمایاں تھا۔ اور یہ اثر پھر بتدریج سارے انگلستان میں پھیل گیا۔

اب اہل قلم میں اجتماعیت بڑھنے لگی اور وہ یہ کوشش کرنے لگے کہ کوئی ایسی چیز نہ لکھی جائے جو عوام میں مقبولیت نہ حاصل کر سکے۔ اسی سلسلہ میں شاعری کو عقل و استدلال کے زیر اثر لاکر ابہام خیال پرستی اور خالص وجدانیت کا قلع قمع ہو گیا۔ اور شعرا مبالغہ اور دوراز کار خیالات سے گریز کرنے لگے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں تنقید کا جوش بڑھ گیا۔

ان انقلابات کا سب سے زیادہ نمایاں اثر نثر نگاری پر پڑا۔ مصنفوں اور خطیبوں نے عوام الناس کو متوجہ کرنے کی غرض سے اپنے اسلوب بیان کو سادہ، رواں اور دلکش بنانا شروع کیا۔ عقل و استدلال کا زور انگلستان میں رفتہ رفتہ فرانس سے کہیں زیادہ بڑھ گیا اور ادبیات کے دائرہ سے نکل کر حکمت و فلسفہ کی قلمرو میں تحقیق و تبصرہ کی نئی روح پیدا ہوگئی۔ نیوٹن کے "مبادیات" جو "طبیعیات جدید" کی بنیاد سمجھے گئے ہیں اور لاک کا "رسالہ متعلق بہ درکِ انسانی" دونوں اسی نئی تحریک کے نتیجے ہیں۔

اس زمانہ میں تنقیدیں بھی بے شمار لکھی گئیں جو زیادہ تر چھوٹے مضامین یا ہجو اور طنز کی صورت میں ہوتی تھیں مکاتیب اور روزنامچے اس دور کی خاص یادگاریں ہیں۔ سب سے مشہور روزنامچہ ساموئیل پیپس کا ہے جو ۱۶۵۹ء سے ۱۶۶۹ء تک کے زمانہ پر محیط ہے۔ یہ روزنامچہ اپنی فاش گوئیوں کی وجہ سے بے انتہا دلکش ہے۔ مختصر مضامین لکھنے والوں میں لارڈ ہیلی فیکس اور سر ولیم ٹمپل ممتاز مانے گئے ہیں۔ مذہبیات میں آئزک بیرو کے خطبات اپنے زور استدلال اور بلاغت کے اعتبار سے بے مثل ہیں۔ جان بنین (John Bunyan) کی تصنیف موسوم بہ "سلوک سالک" (The Pilgrim's Progress) ایک تمثیلی حکایت ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ روح کو نجات کیونکر حاصل ہوتی ہے۔

اس دور کی نظموں میں کوئی امتیازی خصوصیت نہیں ہے۔ سڈلے۔ ڈارسٹ۔ افرا بن وغیرہ کی نظموں میں دور گزشتہ کے خصوصیات نمایاں ہیں۔ اینڈرو مارول اور جان اولڈہم کی شاعری میں کچھ علامتیں دور گذشتہ کی ہیں اور کچھ دور زیر بحث کی۔

ہجو گوئی البتہ عروج پر تھی۔ اور فطرت انسانی کے مضحکہ انگیز رخ کو بے نقاب کرنے میں مصنف اور اس کے پڑھنے والوں کو بڑا مزہ آتا تھا۔ سب سے دلچسپ ہجو ساموئیل بٹلر کے "ہیوڈبراز" (Hudibras) کو مانا جاتا ہے

ڈرامہ کا بھی وہی حال تھا جو شاعری کا تھا۔ ڈرامہ نویسوں نے کوئی خاص طباعی نہیں دکھائی بلکہ شکسپیر یا اس وقت کے فرانسیسی ڈرامہ کا اتباع کرتے رہے۔ اور اس سلسلہ میں تین ڈرامہ نویسوں کا نام لیا جاسکتا ہے طامس آٹوے۔ ولیم کانگریو اور ولیم وائچرلی۔

دور زیر بحث کا سب سے بڑا صاحب قلم ڈرائڈن ہے۔ تنقید کا مادہ اس میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ اس کے مضامین پڑھنے کے بعد اس کی طباعی کے ساتھ ساتھ ایک توازن و سنجیدگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس نے اکثر ترجمے بھی کئے جن میں ورجل کا ترجمہ مشہور ہے۔ اس نے ڈرامے بھی لکھے جن میں شکسپیر اور فرانسیسی "المیات" کے آثار روشن طور پر نمایاں ہیں۔

اٹھارہویں صدی

پچھلے دور کے اثرات اس دور میں اور زیادہ مستحکم نظر آتے ہیں۔ استدلالیت اور عقلیت کا زور خصوصیت کے ساتھ بڑھ رہا تھا اور عوام میں سنجیدہ اور معقول کتابوں کی اشاعت کثرت سے ہو رہی تھی۔

اجمالاً کہا جا سکتا ہے کہ اٹھارہویں صدی نثر اور عقلیت کی صدی تھی۔ نثر صاف ستھری اور سلیس ہوتی تھی۔ صحافت اور مکتوب نگاری کی بھی نشو و نما ہونے لگی اور ناول نویسی کی بنیاد پڑ گئی۔

اس دور کے چند نثر نگاروں کے نام انگریزی دنیائے ادب میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ جوزف ایڈیسن کی طرز نگارش سادگی۔ صفائی۔ جامعیت اور نزاکت کے لحاظ سے مشہور ہے۔ اس کا ہم عصر رچرڈ اسٹیل موقت الشیوع اور ہنگامی ادبیات کا موجد ہے۔ اس نے "ٹیٹلر" (Tatler) اور پھر اس کے بعد اسپکٹیٹر (Spectator) جاری کیا۔ انھیں لوگوں کے ہم چشموں میں جوناتھن سوفٹ بھی تھا جس کو طنزیات کا بادشاہ سمجھنا چاہیئے۔ اس کو اپنی سیاسی امنگوں میں مایوس ہونا پڑا تھا اس لئے انفرادیت اور انانیت اس پر غالب آ گئی۔ "اسٹیلا کے نام روزنامچے" (Journal to Stella) میں اس نے اپنی مایوسیوں کا بیان کیا ہے۔ اس کی ہجو "سفرنامہ" "گولیور" (Gulliver's Travels) مشہور ہے جس کو پڑھ کر سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں سوفٹ کو بنی نوع انسان سے کتنی نفرت ہو گئی تھی۔

اس سلسلہ میں لارڈ بولنگ بروک کے سیاسی۔ تاریخی اور فلسفیانہ مضامین کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو اپنی رنگینی اور سنجیدگی میں بہت بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ ڈینیل ڈیفو (Daniel Defoe) جو پیسے کمانے کے لئے لکھا کرتا تھا اور جس کو پیشہ ور انشا پرداز کہنا چاہیئے "حکایت رابن سن کروسو" (Robinson Crusoe) کی وجہ سے ساری دنیا میں شہرت حاصل کر چکا ہے۔ ناول کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے۔

موجودہ طرز کے ناول کی بنیاد انگلستان ہی میں پڑی۔ اس سے قبل افسانوں، رومان اور اساطیر کی کمی نہ تھی لیکن طویل دلچسپ اور سبق آموز ناولوں کا وجود نہ تھا۔

اس عہد کے ممتاز ناول نویسوں کے نام یہ ہیں:— سامویل رچرڈسن مصنف "پامیلا" (Pamela) و "کلارسا" (Clarissa) ہنری فیلڈنگ جس کا "ٹام جونس" اٹھارہویں صدی کا شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ رچرڈسن کے ناول شرفا کی زندگی سے متعلق ہوتے تھے۔ تین اور ناول نویس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ٹوبیاس اسمالٹ مصنف "راڈرک رینڈم" (Roderick Random) لارنس اسٹرن مصنف "ٹرسٹرام شینڈی" (Tristram Shandy) و "خیالی سفرنامہ" (Sentimental Journey) اور آلیور گولڈ اسمتھ جس کا ناول "وکار آف ویکفیلڈ" (Vicar of Wakefield)

تاثر اور ظرافت دونوں میں بے مثل ہے۔ اس ناول کا موضوع انگلستان کی دیہاتی معاشرت ہے۔

اٹھارہویں صدی کے مکتوب نویسوں میں لیڈی میری وارٹلے مانٹیگو۔ لارڈ چسٹرفیلڈ اور ہورس والپول کو یاد رکھنا چاہیے۔

ڈاکٹر جانسن کی بھاری بھرکم ہستی اس دور میں ایک زبردست چیز تھی۔ ان کے علمی اور تنقیدی مضامین مع ان کی " فرہنگ " کے اٹھارہویں صدی کے اہم کارناموں میں سے ہیں۔ ڈاکٹر جانسن کے ساتھ ان کے مشہور عالم سوانح نگار باسول کو نہ بھولنا چاہیے۔ مورخوں میں ہیوم مصنف "تاریخ انگلستان" رابرٹسن مصنف "تاریخ اسکاٹلینڈ" اور گبن مصنف "زوال سلطنت روما" مشاہیر شمار ہوتے ہیں۔

برک کے " افکار متعلق بہ انقلاب فرانس " (Reflections on the French Revolution) سیاسیات میں ایک امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ فلسفیوں میں ہیوم اور برکلے قابل مطالعہ ہیں۔ " انسائیکلو پیڈیا بریٹانکا " پہلی بار بمقام اڈنبرا اسی صدی یعنے ۱۷۶۸ء میں شایع ہوئی۔

اٹھارہویں صدی کا سب سے نامور ڈرامہ نویس شریڈن ہے ــــــ اٹھارہویں صدی کی شاعری حجم اور تنوع دونوں اعتبار سے نثر کے مقابلہ میں کہیں زیادہ محدود ہے۔ اس زمانہ کا سب سے زبردست شاعر پوپ مانا جاتا ہے۔ اس نے اپنی طباعی کو کہیں نہیں دکھایا بلکہ ہمیشہ پچھلے دور کی تقلید کرنے میں عمر گذاری اُسنے غیر زبانوں سے ترجمے کئے۔ اس کا " ہومر " ابتک مستند ترجمہ مانا جاتا ہے اٹھارہویں صدی کے اواخر میں پوپ اور مقلدین پوپ کے خلاف ایک شدید احتجاج شروع ہوا۔ جنکو اس احتجاج کی علمبردار شعرا کی وہ جماعت تھی جنکو شاعری میں تصنع اور مبالغہ سے سخت نفرت تھی۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ شاعری کو فطرتی جذبات کے تابع ہونا چاہیے۔ عقلیت سے وہ برگشتہ تھے اور جذباتیت کے زبردست حامی۔ ان کا ایمان یہ تھا کہ شاعر کے لئے بہترین مواد دیہات کی سیدھی سادی زندگی ہے نہ کہ مہذب جماعتوں کے تکلفات گرے مصنف " نوحہ بر گور غریباں " ۔ گولڈ اسمتھ مصنف " قریۂ ویراں "۔ بلیک۔ کالنس اور کوپر انگلستان میں اسی دَور کے بڑے شعرا گذرے ہیں۔ برنس اسکاٹلینڈ کا شاعر تھا جو عشقیہ جذبات نگاری میں ایک نئی طرز کا موجد ہے۔

انیسویں صدی

اس دور کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے (۱) " رومانی بیداری " کا دور (۲) عہد وکٹوریہ (۳) بیسویں صدی یا دور حاضر۔

ہم بتا چکے ہیں کہ اٹھارہویں صدی شاعری کے لحاظ سے " ہماں ہیگویم " کی صدی تھی یعنے شعرا متقدمین کی آنکھ بند کرکے تقلید کر رہے تھے اور اسی کو اپنے لئے ناز و افتخار سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ شاعری نے اس دور میں کمالات حاصل نہیں کئے۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں چند شعرا ایسے پیدا ہوگئے جنکو قدرت کی

رنگینیوں میں شاعری کے لئے بہترین مواد نظر آنے لگے اور انھوں نے قدرت کو موضوع شاعری بنالیا۔ اس گروہ کے پیشرو کوپر وغیرہ تھے لیکن اس کا سب سے زبردست شاعر ورڈسورتھ ہوا ہے جس کی ساری شاعری کا دار و مدار انسان اور کائنات اور دونوں کے باہمی تعلق پر ہے۔ "رومانی دور" کی امتیازی خصوصیت یہی ہے۔ جو ورڈسورتھ کی شاعری میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ یہ رومانیت رفتہ رفتہ سارے یورپ میں پھیل گئی اور اس کا محرک انقلاب فرانس تھا۔

"رومانی دور" کے بعد "عہد وکٹوریہ" آتا ہے جو امن وبہبود کا زمانہ تھا۔ ارباب علم وادب کے دماغ میں ہیجان پیدا کرنے والے اسباب فرو ہو چکے تھے اور اہل قلم کو اپنے اوقات غور و تامل۔ اسلوب بیان کی تکمیل اور تنقید وغیرہ میں صرف کرنے کا پورا موقع حاصل تھا۔

انیسویں صدی کے آخر میں غور وفکر اور تنقید کی اسی صلاحیت نے ترقی کر کے کردار نگاری اور تجزیہ نفسیاتی صورت اختیار کرلی۔ اور یہ دراصل ناروے کے مشہور ڈرامہ نگار ابسن کا اثر تھا۔ اس طرح انگلستان میں نفسیاتی ڈرامہ کا آغاز ہوا۔ یہ تجزیہ نفسیاتی صرف ڈرامہ تک محدود نہیں رہا بلکہ اور اصناف ادب تک پہنچ گیا۔

اسی زمانہ میں امریکہ کے ادبیات کو بھی عروج ہوا۔ اس سے پہلے بھی امریکہ میں مصنف گذر چکے تھے لیکن ان کے قلم کی جولانی سیاسیات و مذہبیات تک محدود تھی۔

کہا جاتا ہے کہ "رومانی دور" کی ابتدا ورڈسورتھ اور کولرج کی ان نظموں سے ہوتی ہے جو ۱۷۹۸ء میں ایک ساتھ مجموعہ کی صورت میں شائع ہوئیں۔ اور جو عوام کی زندگی سے متعلق ہیں۔ پسینہ سے روٹی کمانے والے غریب اور تنگ حال مزدوروں کی زندگی اور قدرت اور ماوراء قدرت میں کیا رابطہ ہے؟ لاہوت و ملکوت کو عالم ناسوت سے کیا تعلق ہے؟ فاقہ مست "گلیم پوشوں" اور شکم سیر "کج کلاہوں" میں خدا سے کون قریب تر ہے؟ ان نظموں کے پڑھنے کے بعد یہ سوالات حل ہو جاتے ہیں۔

ورڈسورتھ ایک صوفی شاعر تھا۔ مگر اسکا تصوف نظری نہ تھا بلکہ عملی تھا۔ اس کو "شاعر فطرت" کہا جاتا ہے نظام فطرت کے مطالعہ سے لذتیں حاصل کرنے کا اس کو خاص ملکہ تھا۔ اس کی مشہور نظمیں عموماً مختصر ہیں جن میں "بقائے دوام" (Immortality)۔ "ٹنٹرن ابی" (Tintern Abbey) اور "منظومات متعلق بہ لوسی" بہت مرتبہ رکھتی ہیں۔ ورڈسورتھ کا معاصر اور دوست کولرج تخیل کا بادشاہ تھا۔ اپنے دماغ کے اعتبار سے وہ یکتائے عصر تھا۔ اس کی ادبی اور علمی تنقیدیں ابتک نصاب میں داخل ہیں بحیثیت شاعر کے اسکو مافوق الفطرت اور غیر ناسوتی مباحث میں زیادہ مزہ ملتا تھا۔ "معمر جہازراں" (The Ancient Mariner)، "کبلا خاں" (Kubla Khan) اور "کرسٹابل" (Christabel) اسکی مقبول عام نظمیں ہیں۔

اگر صرف زبان کی شیرینی اور اسلوب کی دلکشی دیکھنا ہے تو کیٹس سے بہتر شاعر کوئی نہیں۔ اس کے یہاں فنون لطیفہ کا معیار یہ تھا کہ حسن کو نمایاں کر دیا جائے۔ اس کی مشہور نظمیں مثلاً "خطاب بلبل" (Ode to the Nightingale) "خطاب بہ خزاں" (Ode to Autumn) اور "بیرحم حسینہ" (La belle dame sans merci) پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی زبان کیسی پیاری زبان ہے۔

شیلی کا نظریہ حسن انوکھا تھا۔ وہ ایک "عقلی حسن" (Intellectual beauty) کا قائل تھا۔ چنانچہ اس عنوان کی اسنے ایک نظم بھی لکھی ہے۔ اس کے یہاں حسن کے وہ معنے تھے جو فلاسفہ کے یہاں "حقیقت" سے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ یا یوں سمجھو کہ وہ "جلال" کو "جمال" سمجھتا تھا۔ طویل نظموں میں "پرومیتھیس بے زنجیر" (Prometheus unbound) بہت مشہور ہے۔ یہ ایک تمثیلی نظم ہے اور اسکا خلاصہ یہ ہے کہ عقل کو رسم و رواج کی بندشوں سے آزاد ہونے کی پوری کوشش کرنا چاہیئے۔ شیلی کی چھوٹی نظموں میں "بادل" (The cloud) "خطاب بہ لوا" (To the sky lark) "خطاب بہ باد مغرب" (Ode to the west wind) اور "ادونائیس" (Adonais) انگریزی شاعری میں جواہر ریزے مانے جاتے ہیں۔ "ادونائیس" ایک مرثیہ ہے جو شیلی نے کیٹس کے مرنے پر لکھا تھا۔

لارڈ بائرن عجیب و غریب مزاج و طبیعت کا آدمی تھا۔ اور چونکہ شاعر تھا اس لئے اسنے اپنے معاصرین پر اپنی نرالی شخصیت کا کافی اثر ڈالا۔ زندگی کی مایوسیاں اور فریب کاریاں اس کی شاعری کا موضوع تھیں۔ اور زبان اور صنعت میں خدا نے اس کو کچھ ایسی دلکشی دی تھی کہ نہ جانے کتنے جوان اور منچلے شعرا اس کے اتباع کو اپنے لئے فخر سمجھنے لگے۔ جیتے جی کسی شاعر کو بائرن کی طرح شہرت اور مقبولیت نہیں حاصل ہوئی۔ اس کی سب سے مشہور نظم "چائلڈ ہیرلڈ" (Childe Herold) ہے لیکن اس کا شاہکار "ڈان جوان" (Don Juan) ہے۔ اس کے کئی منظوم افسانے بھی مشہور ہیں جو ترکی اور یونان کی مخاصمت سے متعلق ہیں اور جو بائرن کی "یونان پرست" طبیعت کا نتیجہ ہیں۔ ان میں "گبر" (Giaour) اور "عروس ابائڈوس" (Bride of Abydos) اپنے ادبی محاسن کے لحاظ سے مشہور ہیں۔

"عہد وکٹوریہ" کی ابتدا لارڈ ٹینی سن سے ہوتی ہے۔ ٹینی سن کو موزوں الفاظ استعمال کرنے اور بحر و وزن کے انتخاب میں ید طولیٰ حاصل تھا اور یہی اس کی عظمت کا راز ہے۔ اس کی ہر نظم ترنم اور رنگینی سے بھری ہوتی ہے۔ "لطخ خوار" (The Lotos eaters) "خاتون شیلٹ" (The lady of Shallot)

"شاہنامہ" (The idylls of the king) اور "بیادگار" (In memoriam) اس کی معرکتہ الآرا نظمیں ہیں۔ موخرالذکر ایک دردناک مرثیہ ہے جو ٹینی سن نے اپنے عزیز دوست آرتھر ہیلم کی ناگہانی موت پر لکھا تھا۔

رابرٹ براؤننگ سلاست بیان اور حسن بیان کی بالکل پروا نہیں کرتا۔ وہ قاموسی معلومات رکھنے والا آدمی تھا۔ اسی وجہ سے اس کی شاعری کو سمجھنا مشکل ہے۔ غالب اور بیدل کی طرح اس کی عبارت نامانوس اور اجنبی الفاظ کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس کے خیالات بہت بلند ہوتے ہیں اور وہ زبان کو اپنے خیالات کے مطابق بنا لیتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ ٹینی سن کا بالکل ضد ہے۔ چنانچہ "پیراسلسس" (Paracelsus) اور "ساؤل" (Saul) وغیرہ کا پڑھنا اگرچہ "کوہ کندن" سے کسی طرح کم نہیں لیکن اس کے بعد ایک شخص کو جواہرات کی کان مل جاتی ہے۔ ان نظموں میں جس گہرے فلسفہ کی تبلیغ کی گئی ہے۔ وہ درحقیقت اس قابل ہے کہ اس کو سمجھنے کے لئے دردسر گوارا کیا جائے۔ براؤننگ کا سب سے دلچسپ منظوم افسانہ "انگوٹھی اور کتاب" (Ring & the book) ہے۔

میتھو آرنلڈ شاعر اور نقاد دونوں تھا۔ "سہراب و رستم" اس کی مقبول عام نظم ہے اس کی شاعری تشبیہات و استعارات کے اعتبار سے مشرقی شاعری سے قریب تر ہے۔

ڈانٹے گبریل راسٹی شعراء کی اس جماعت سے تعلق رکھتا ہے جس نے ازمنۂ وسطےٰ اور بالخصوص اطالیہ کے روایات شاعری کو از سر نو رواج دینے کی کوشش کی۔ راسٹی کا دوست سوئنبرن ایک عناصر پرست شاعر تھا۔ وہ حسن صوری کا شیدائی تھا۔ اس کی عشقیہ نظمیں انسانی جذبات کو برانگیختہ کرنے والی ہیں۔ "اطلانتہ کالیڈن میں" (Atlanta in Calydon) اور "ہارتھا" (Hertha) اس کے مایۂ ناز کارنامے ہیں۔

یہاں جارج میریڈتھ کو بہ حیثیت شاعر کے نہ بھولنا چاہیے جس کی "وادی کی محبت" (Love in the valley) انگریزی زبان میں بہترین عشقیہ نظم مانی جاتی ہے۔ فٹز جرلڈ نے اس زمانہ میں رباعیات خیام کا ترجمہ کرکے ساری دنیا میں شہرت حاصل کر لی۔ لیکن اس عہد کی زبردست ترین ہستیاں رُڈیارڈ کپلنگ اور ٹامس ہارڈی ہیں یہ دونوں نہ صرف انیسویں صدی کے مشاہیر ہیں بلکہ بیسویں صدی میں بھی ادبی مجلس کے صدر نشین سمجھے جاتے ہیں۔ طامس ہارڈی ابھی حال میں مرا ہے لیکن کپلنگ ابھی زندہ ہے اور اس کی شاعری برطانوی قیصریت کی حامی ہے۔

رابرٹ برجز آج کل ملک الشعراء ہے۔ لیکن اس کی شاعری پچھلی صدی کی یادگار ہے۔ ایٹس ایک صوفی شاعر ہے۔ حقیقت نگار شعراء میں جان میسفیلڈ ایک موقر شاعر ہے۔

بیسویں صدی کے دوسرے ممتاز شعرا میں جان ڈرنک واٹر اور روپرٹ بروک کے نام لینا ضروری ہے۔

"رومانیت" (Romanticism) کا جوش جو تمام یورپ پر مسلط ہو چکا تھا۔ امریکہ میں بھی پہونچا۔ اس عہد کی مریکی شاعری صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے انگریزی شاعری سے ملتی جلتی ہے۔ دونوں ملکوں کے شعرا کو قدرت اور انسانیت کے ساتھ الفت ہے۔ تصوریت اور انفرادیت کا عنصر بھی دونوں میں برابر ہے۔ امریکہ کا سب سے پہلا شاعر جسکا نام تاریخ ادبیات میں لیا جا سکتا ہے۔ برایانٹ تھا۔ اس کی شاعری کو معنوی لحاظ سے قومی اور ملکی کہا جا سکتا ہے۔ اڈگر ایلن پو تخیل کا بادشاہ ہے اور اپنے پڑھنے والوں کو ایک سیمابی دنیائی سیر کرا دیتا ہے۔ "زاغ شب رنگ" (The Raven) اس کے نوادر تخیل میں سے ہے "انابل لی" (Annabel Lee) اس کی بڑی دلکش عشقیہ نظم ہے جو ترنم اور تاثر میں ڈوبی ہوئی ہے۔

امریکہ کے دوسرے عہد کے شعرا میں، ویٹیر لاویل اور لانگ فیلو قابل ذکر ہیں۔ انیسویں صدی کے وسط سے آخر تک والٹ وٹمین کے نوادر شعری کا زمانہ تھا۔ بہ حیثیت شاعر کے وہ بالکل ایک انوکھی ہستی ہے۔ عروض و قافیہ کی بندشوں سے وہ بالکل آزاد ہے۔ لیکن اس کے خیالات اور جذبات میں بڑی گہرائی ہے۔ کارخانۂ قدرت کی بے جان چیزوں میں وہ ایک جان ایک روح محسوس کرتا ہے اور ان سے تاثرات قبول کرتا ہے حال کے امریکی شعرا میں رابن سن۔ فراسٹ اور ایمی لاول بہت معزز سمجھے جاتے ہیں۔

انیسویں صدی اور بیسویں صدی نثاری میں بھی اور صدیوں سے بہت آگے بڑھ گئیں۔ نثاری میں سب سے پہلے افسانہ اور ناول کو لیجئے انیسویں صدی کے آغاز میں ہم کو دو شہرۂ آفاق ناول نویس نظر آتے ہیں یعنے سر والٹر اسکاٹ اور جین آسٹن۔ اسکاٹ تاریخی ناولوں کے لئے مشہور ہے جنکو وہ شاعرانہ زبان میں بیان کرتا ہے۔ وہ الفاظ کے ذریعہ سے پوری مصوری کا حق ادا کرتا ہے جین آسٹن اسکاٹ سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اپنے زمانہ کی انگریزی معاشرت سے بحث کرتی ہے اور فطرت انسانی کی نازک پیچیدگیوں کو بڑے مزے سے حل کر دیتی ہے۔ اس کا سب سے ہر دلعزیز ناول "غرور و تعصب" (Pride and Prejudice) ہے۔ ان کے بعد عہد وکٹوریہ کے ناول نویس آتے ہیں۔ ان میں سب سے آگے ڈکنس اور تھیکرے کو جگہ دی جاتی ہے۔ ڈکنس کو انگلستان کے ادنیٰ درجے کے لوگوں سے زیادہ ہمدردی تھی اور اُس نے اپنے ناولوں کو انھیں کی معاشرت کے لئے وقف کر دیا۔ ان ناولوں میں زندگی کی حقیقت۔ زندگی کا دُکھ اپنے اصلی رنگ میں نظر آتے

ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ڈکنس طنز اور تمسخر کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اس کے مشہور ناولوں میں۔ "اخبار پک وک" (Pickwick papers) "الیور ٹوسٹ" (Oliver Twist) اور "ڈیوڈ کاپر فیلڈ" (David Copperfield) ہیں۔

تھیکرے کے ناولوں میں بھی ظرافت اور کردار نگاری کا پورا لطف ہے لیکن اس کا تمسخر تلخ اور جارحانہ ہوتا ہے۔ انگریزوں کی مہذب اور شائستہ جماعت سے وہ زیادہ اپنے ناولوں کے لئے مواد لیتا ہے۔ "وینٹی فیئر" (Vanity Fair) اور "نیوکمس" (Newcomes) اس کے شاہکار ہیں۔ ناول نویسوں میں دو عورتوں کا ذکر نہایت ضروری ہے۔ چارلٹ برانٹی اور جارج ایلیٹ۔ چارلٹ برانٹی کے ناول "جین آئر" (Jane Eyre) نے ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ جذبات انسانی کو اخلاقی مسائل سے لڑا دینے میں جس آزادی اور خلوص سے اُس نے کام لیا ہے وہ اس کے نام کو کبھی مٹنے نہیں دیں گے۔ جارج ایلیٹ جس کا اصلی نام میری این ایوانس تھا ایک زبردست اہل قلم تھی۔ اُس نے ناولوں کے ذریعہ ایک خاص فلسفہ زندگی کی تبلیغ کی ہے۔ "ایڈم بیڈ" (Adam Bede) "سائلس مارنر" (Silas Marner) اور "رومولا" (Romola) اس کے بہترین ناول ہیں۔ اس کے بعد اینتھنی ٹرولوپ۔ لارڈ لٹن چارلس کنگسلے اور عورتوں میں مسز ہمفری وارڈ اور روڈا براؤٹن کا درجہ آتا ہے۔

جارج میریڈتھ اپنی الجھی اور نامانوس طرز نگارش کے باوجود عہد وکٹوریہ کے اکابر میں شمار کیا جاتا ہے۔ "خود پرست" (The Egoist) اس کا سب سے مشہور اور مشکل ناول ہے۔ اس کے آسان ترین ناولوں میں "ڈیانہ آف دی کراسویز" (Diana of the Crossways) کو بڑی مقبولیت حاصل ہے۔

طامس ہارڈی کو لوگ "قنوطی" (Pessimist) کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسنے زندگی کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور زندگی کی اصلیت کو سمجھ گیا ہے۔ اس کو فطرت انسانی اور بالخصوص عورت کی بدقسمتی سے سچی ہمدردی ہے۔ اس کی عبارت میں ایک سحر ہوتا ہے جو پڑھنے والوں پر غالب ہو جاتا ہے اس کی نثر ابتدا سے انتہا تک حقیقتاً شاعری ہوتی ہے۔ "ٹس آف دی ڈربرولس" (Tess of the D'Urbervilles) اور "جوڈ دی آبسکیور" (Jude the Obscure) اس کے سب سے زیادہ موثر ناول ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب تک اس کے تمام ناولوں۔ مختصر افسانوں اور منظومات کا مطالعہ نہ کیا جائے اس کا فلسفہ سمجھ میں نہیں آسکتا۔

رابرٹ لوئی اسٹونسن کو خطرات کے افسانے لکھنے میں ید طولےٰ تھا۔ نو سے نوے برس کے لوگ اس کے

قصوں کو یکساں دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ "خزانوں کا جزیرہ" (Treasure Island) عوام میں بہت پسند کیا جاتا ہے۔

دورِ جدید کے افسانہ نویسوں میں رڈیارڈ کپلنگ کو ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ مختلف النوع ناول اور افسانہ لکھنے والوں میں غالباً ایچ۔ جی۔ ولس سے بہتر آدمی انگلستان میں نہیں پیدا ہوا۔ اس کے بعض ناول مثلاً "وقت کی کل" (The Time Machine) سرتاسر خیالی پرواز ہیں۔ بعض مثلاً "این ویرونکا" (Ann Veronica) تعلقات انسانی سے بحث کرتے ہیں اور بعض مثلاً "بشاپ کی روح" (The Soul of a Bishop) دورِ حاضر کے مذہبی اور اخلاقی مسائل سے متعلق ہیں۔ ارنلڈ بنٹ (Arnold Bennett) بھی ایک بہت مشہور و معروف ناول نویس ہے۔ وہ اپنی نکتہ رس نگاہ اور مشاہدۂ زندگی کے لئے ممتاز ہے۔

گالسورتھی اور جوزف کونریڈ بھی دنیائے فسانہ نویسی میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اول الذکر ایک کامیاب ڈرامہ نویس بھی ہے۔

امریکہ کی ناول نویسی فینی مور کوپر سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد اڈگر ایلن پو کے خیالی اور پراسرار افسانوں کی دھوم مچ گئی۔ اسی زمانہ میں نیتھینیئل ہاتھارن کے افسانوں کی شہرت ہوئی۔ اس کا مشہور ترین ناول "سرخ حرف" (Scarlet Letter) ہے جو اس وقت کی ریاکارانہ مذہبی زندگی کو بے نقاب کرتا ہے۔ کچھ دنوں بعد میرین کرافورڈ کے ناولوں کو بھی خاصی شہرت ملی۔

ہنری جیمس ایک نفسیاتی ناول نویس ہے۔ اس کا اسلوب اپنی پیچیدگی میں اپنی آپ نظیر ہے۔ اس کا مشہور ناول "ایک عورت کی تصویر" ہے۔ جیک لنڈن اسٹونسن کی طرح خطرات کی داستانیں بیان کرنے میں زبردست ملکہ رکھتا ہے۔

عورتوں میں اڈتھ وارٹن کا "دورِ معصومیت" (The Age of Innocence) قابلِ ذکر ہے۔ ان کے علاوہ دوئم درجہ کے ناول نویسوں کی امریکہ میں کمی نہیں۔

اب ناول سے ہٹ کر اس دور کے اور اصنافِ نثر کو لیجئے۔ انگلستان میں لیمب کے مضامین ایلیا (The Essays of Elia) کو ایک تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ ہیزلٹ۔ لے ہنٹ اور ڈی کوئنسی کے تنقیدی مضامین بھی اسی دور یعنے انیسویں صدی کے اوائل کی چیزیں ہیں۔ اسی صدی میں چند سال بعد مذہبی اور علمی

مضامین شایع ہوئے۔ ان میں کارڈینل نیومین کے مضامین اور ڈاروِن کے کارنامے ہمیشہ یادرہیں گے تاریخی مضامین میں مکالے اور کارلائل کا کوئی ثانی نہیں۔ مکالے ماضیات کو حرف غلط سمجھتا ہے لیکن کارلائل اس کے برعکس سلف پرستی کی تحریک کرتا ہے۔ وہ اپنے زمانہ کی صنعتی اور معاشی ترقی کا قائل نہیں۔ دوسرے نامور مورخوں میں فروڈ۔ گرین اور لیکی کے نام گنائے جاسکتے ہیں۔ جان اسٹورٹ مل معاشیات و اخلاقیات کا ایک زبردست ماہر گذرا ہے۔ "فلسفۂ طبعی" (Natural Philosophy) اور "حیاتیات" میں ہکسلے۔ والیس اور اسپنسر کو یاد رکھنا ضروری ہے۔

فنون لطیفہ اور معاشیات میں جان رسکن کے نظریات غیرفانی ہیں۔ جمالیات اور شاعری میں ولیم مارس کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ متفرقات اور تنقیدات عالیہ میں میتھیو آرنلڈ لزلی اسٹیفنس۔ پروفیسر سینٹس بری اڈمنڈ گاس۔ اینڈرو لینگ اور پیٹر کے نام سرفہرست ہوں گے۔

امریکہ میں انیسویں صدی میں سب سے پہلے ایمرسن کا ذکر ضروری ہے۔ وہ فلسفی بھی تھا اور شاعر بھی۔ اور ایک خاص فلسفہ کا علم بردار تھا جس کو اصطلاحاً (Transcendentalism) "وجدانیت" یا "مافوقیت" کہتے ہیں۔ لیکن امریکی ادبیات فلسفہ اور تصوف تک محدود نہ تھے۔ تاریخ کے میدان میں امریکہ ایک خاص حیثیت رکھتا تھا۔ پرسکاٹ اور ماٹلے مشہور مورخ ہوئے ہیں۔ ظریفانہ ادبیات کی بھی کمی نہ تھی۔ ہومس اور مارک ٹوین کی ظرافتوں اور بذلہ سنجیوں کو انگریزی دنیائے ادب ابتک نہیں بھولی ہے۔ چند سال بعد فرنس کی شہرت کا زمانہ آتا ہے جس نے ایک بڑا زبردست کام یہ کیا کہ شکسپیر کے مختلف نسخوں کو ملاکر ایک نسخہ تیار کیا اور اس کو معہ تحشیہ کے شائع کیا۔

انگلستان کی طرح امریکہ میں بھی آجکل متعدد نامہ نگاروں نقادوں اور سوانح نگاروں کی کثرت ہے جن کے نام گنانا بیکار ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر میں ڈرامہ از سر نو زندہ ہوا اور اسکا سب سے بڑا سبب ناروے کے مشہور ڈرامہ نویس ابسن کی مقبولیت ہوئی۔ لیکن اب معاشی اور تمدنی مسائل کو ڈرامہ کا موضوع بنالیا گیا ہے۔ اس نئی نسل کے سب سے پہلے ڈرامہ نویس آسکر وائلڈ اور پنیرو ہیں۔ لیکن دور جدید کے مشہور ترین ڈرامہ نویس برنارڈ شا اور گالسورتھی ہیں۔ دونوں فطرت انسانی کا مطالعہ کرتے ہیں اور کردار و اخلاق کا بہترین تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ دونوں نے ہیئت اجتماعی کی خامیوں اور کمزوریوں کو بیرحمانہ طریقہ سے بے نقاب کرنا اپنا نصب العین بنا لیا۔

ہے۔ مزید براں شا کو فطرت نے تمسخر و استہزا کی ایک ایسی قوت عطا کی ہے کہ دردناک باتوں کو وہ مضحکہ بنا کر رکھ دیتا ہے۔ اس کو حال میں "نوبل پرائز" ملا ہے۔ گالسورتھی میں طنز و تضحیک کی صلاحیت کم ہے۔ اس لئے اس کے ڈرامے زیادہ موثر ہوتے ہیں۔ "انصاف" ([illegible]) اور "زیکار" (St- [illegible]) اس کے شاہکار ہیں۔ آخر میں ڈرامہ نویس کی حیثیت سے ہم سر جیمس بیری کو بھی قطع نظر نہیں کر سکتے "پیٹر پین" ([illegible]) اور "میری روز" (Mary Rose) اس کے مشہور ڈرامے ہیں ——— امریکہ میں بھی متعدد ڈرامہ نویس ہوئے۔ لیکن عجیب تماشہ یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ اہل امریکہ تھیٹر اور سنیما کے بڑے حامی ہیں۔ ان میں انگریزوں کی طرح ڈرامہ نویسی کے مشاہیر نہیں پائے جاتے ہیں۔

راکھی

(۱)

چنار گڑھ کا قلعہ گھرا ہوا تھا۔ توپوں کی گھن گرج سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر سمت دھوئیں کی مسموم فضا میں حملہ آور سپاہیوں کے دستے بے در پے ڈھالوں کو سپر کئے ہوئے سمندر کی موجوں کی طرح آگے بڑھتے جاتے تھے۔ قلعہ کی فصیل پر شیر خاں مستعدی کے ساتھ کمان کر رہا تھا اسکے ایک اشارہ پر ہزاروں تیر، بڑی بڑی پتھر روغن نفط اور گولے بہ یک وقت برسنے لگتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ حملہ آوروں کا بڑھتا ہوا نہ تھمنے والا سیلاب قلعہ کی آہنی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر لاشوں اور زخمیوں کو چھوڑ کر اُلٹے پاؤں لوٹ جاتا تھا۔ یہ سلسلہ مسلسل ایک گھنٹہ سے جاری تھا اور اب رفتہ رفتہ حملہ آوروں کے جوش میں کمی ہوتی جا رہی تھی کہ یکایک قلب فوج میں جنبش ہوئی اور ایک خوشرو نوجوان جس کے چہرے سے عجیب قسم کا تقدس برستا تھا، نمودار ہوا۔ یہ دوسرے افسروں کی طرح فوجی لباس پہنے ہوئے تھا۔ مگر اس کے عمامہ میں ایک بیش قیمت بڑی سی مرصع کلغی لگی ہوئی تھی۔ یہ ہندوستان کا نوجوان شہنشاہ ہمایوں تھا۔ اس نے گھوڑے کو آگے بڑھایا اور ساری فوج کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وہ ہر ہر دستہ کے سامنے گھوڑے کو چند لمحوں کے لئے روک لیتا اور سپاہیوں کی ہمت بڑھاتا۔ اس نے دو گھنٹے کے اندر ساری فوج کا جائزہ لے لیا۔ اور ایک لمبا چکر کاٹ کر پھر قلب فوج میں واپس چلا آیا۔ شہنشاہ کی ہمت افزائی اور اس کی موجودگی نے سپاہیوں میں ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا کر دیا تھا۔ گولوں کی زور و شور سے بارش ہونے لگی اور ہر دستہ جان پر کھیل کر کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح قلعہ کی دیوار پر چڑھ جائے۔ اور شہنشاہ کی نظروں میں سرخروئی حاصل کرے، بارہا ایسا ہوا کہ چند جانباز سیڑھیاں لگا کر سر کو ہتھیلی پر رکھ کر دیوانہ وار چڑھے مگر سیڑھیاں نیچے گرا دی گئیں اور چڑھنے والوں کو یا تو جان سے ہاتھ دھونا پڑا یا زخموں سے چور ہو کر نیچے گرے۔ اب شام ہو رہی تھی۔ اور ہمایوں بیتاب تھا کہ جس طرح ہو آج ہی قلعہ فتح ہو جانا چاہیئے۔

"بیرم خاں قلعہ آج ضرور فتح ہو جانا چاہیئے" شہنشاہ نے کہا۔

"جہاں پناہ! اب تو شام ہو چکی مگر کل قلعہ ضرور فتح ہو جائے گا۔ کیونکہ رسد بند ہو جانے کی وجہ سے قلعہ والے فاقے کر رہے ہیں۔ اور ان کے لئے سوائے قلعہ حوالہ کر دینے کے کوئی چارہ نہیں۔ کل انشاءاللہ تعالیٰ کوکب ہمایونی چنار کے قلعہ پر لہراتا ہوا نظر آئیگا۔" بیرم خاں نے کہا۔

اتنے میں شہنشاہ کی نظر چند جانباز سپاہیوں پر پڑی جو قلعہ کی دیوار پر سیڑہی لگاکر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے مگر قلعہ والوں نے سیڑھی نیچے گرادی تھی اور وہ زمین پر تڑپ رہے تھے۔ شہنشاہ اس جانبازی کے نظارہ کی تاب نہ لاسکا اور اُس نے مصمم ارادہ کرلیا کہ خود سیڑہی لگاکر قلعہ کی فصیل پر چڑھ جائے گا۔ اس نے بیرم خاں کو اپنے اس ارادہ سے مطلع کیا۔

" بالکل بیکار ہے۔ جہاں پناہ ! کل قلعہ ضرور فتح ہو جائے گا۔ شام ہوچکی ہے اور رات بھر کی تاخیر کے لئے ایسی عزیز جان کو جس کی قیمت کونین کی سعادت سے بلند تر ہے۔ ہلاکت میں ڈالنا۔ دانشمندی کے خلاف ہے " بیرم خاں نے کہا۔

" اچھا جیسی تمھاری رائے۔ رات کی تاریکی پھیل رہی ہے۔ اب طبل بازگشت بجنے کا حکم دو۔ کل میں خود اپنے جانباز سپاہیوں کے ساتھ قلعہ کی دیوار پر چڑہوں گا " شہنشاہ نے کہا۔

جواب میں بیرم خاں نے مودبانہ سر کو جھکالیا۔

(۲)

رات تاریک تھی اور ایک تہائی حصہ اس کا گذر چکا تھا۔ ہمایوں کے فوجی کیمپ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دن کے تھکے ماندے سپاہی پڑے بے خبر سو رہے تھے۔ البتہ کہیں کہیں سے زخمیوں کے کراہنے کی ..... آوازیں آرہی تھیں۔ اور پہرہ کے سپاہی چاروں طرف گشت لگا رہے تھے۔ اس سناٹے میں شاہی خیمہ کے اندر کسی خاص معاملہ پر گفتگو ہو رہی ہے۔

" اراکین سریر سلطنت ! آپ کو معلوم ہے کہ فردوس مکانی دشمنوں کے ساتھ ہمیشہ انتہائی فیاضی، رحم، اور محبت کے ساتھ پیش آئے۔ پس ابد دولت کے لئے بھی مناسب ہے کہ فردوس مکانی کے پاک نقش قدم کی اتباع کرتے ہوئے۔ اسی مقدس فیاضی، رحم، اور محبت کے سرسبز اور شاداب درخت کی ہمیشہ آبیاری کرتے رہیں۔ شیر خاں اب اپنے جرم کا اقرار کرتا ہے اور معافی کا خواستگار ہے۔ غور کرو، سوچو، سمجھو، اور بتلاؤ کہ اُسکو کیا جواب دیا جائے " شہنشاہ نے کہا۔

" جہان پناہ ! لیکن شریر، کمینہ، اور احسان فراموش افغانوں کے ساتھ رحم، انصاف کا خون، اور احسان فراموشی کی حمایت ہے۔ شیر خاں کی یہ صرف مکاری ہے۔ فردوس مکانی کے سامنے بھی اس نے اسی طرح سر اطاعت خم کردیا تھا۔ اور فردوس مکانی نے اس کو ہمیشہ کے لئے معاف کردیا تھا مگر اس احسان فراموش نے اس کا جو صلہ دیا وہ جہان پناہ سے پوشیدہ نہیں " ایک سردار نے کہا۔

" احسان فراموش ! بالکل احسان فراموش !! ان طوطا چشم افغانوں سے وفا کی امید لاحاصل

ہے " دوسرے سردار نے جوش سے کہا۔
" بڑے نمک حرام ہیں کمبخت " تیسرے سردار نے چہرہ پر شکن ڈال کر کہا۔
اتنے میں چوبدار داخل ہوا۔ اور جھک کر مجرا بجالایا اور کہا۔
" عالیجاہا! چتوڑ سے دو راجپوت سوار آئے ہیں۔ اور اُن کی التجا ہے کہ ابھی باریابی کا شرف بخشا جائے کیونکہ وہ شہنشاہ کے نام ایک اہم پیام لائے ہیں "
" چتوڑ ...... راجپوت —— اہم پیام۔ نہ معلوم کیا بات ہے " شہنشاہ نے آہستہ آہستہ کہا۔ پھر بہ آواز بلند کہا کہ " اچھا فوراً حاضر کرو "

(۳)

" تم لوگ کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ - اور وہ کونسا اہم پیام ہے جس کے لئے بغیر صبح کا انتظار کئے ہوئے تم نے باریابی کی اجازت مانگی " شہنشاہ نے ہمہ تن متوجہ ہو کر پوچھا۔
" مہابلی " ایک راجپوت نے ادب سے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر کہا۔ " ہم کوئی راجپوت ہیں اور چتوڑ کے سچے سیوک .... ہم اسوقت چتوڑ سے آرہے ہیں اور مہابلی کے نام اپنی مہارانی سریمتی کرناوتی کا ایک خط لائے ہیں "
شہنشاہ کی آنکھیں اس دوران گفتگو میں برابر اُن کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اور اس کی آنکھوں سے فیاضی، رحم، اور بہادری کا سچا نور برس رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور ہاتھ کو بیتابی کے ساتھ بڑھا کر بولا۔ " وہ خط کہاں ہے؟ "
اس کے جواب میں اُس راجپوت نے ایک دوسرے راجپوت کے ہاتھ سے جو اُس کے پاس کھڑا تھا ریشمی خریطہ جلدی سے لے کر شہنشاہ کے سامنے پیش کیا۔
شہنشاہ نے وہ خریطہ میر منشی کو دیا اور کہا " مضمون سے ابدولت کو آگاہ کرو "
میر منشی نے خط کو خریطہ سے نکالا۔ خط کے اوپر ایک جہانگیری کے قسم کی کوئی مرصع چیز لپٹی ہوئی تھی۔ یہ قیمتی جواہرات سے مرصع تھی اور اس میں سونے کی زنجیر خوبصورتی کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ میر منشی نے اس کو باحتیاط تمام کھول کر علحدہ رکھا اور خط کھول کر مضمون کی طرف متوجہ ہوا۔ خط کا مضمون یہ تھا:-

رام جی[1] اکلنگ جی گنیش جی

---

[1] رام جی، اکلنگ جی، گنیش جی، - یہ تین محافظ دیوتا تھے جن سے ہر کام میں مدد مانگی جاتی تھی۔

" مہابلی کے کنول جیسے قدموں پر بے شمار سلام عریضۂ نیاز حضور کو ایسے وقت میں لکھ رہی ہوں جبکہ میرے بدن کا ایک ایک قطرۂ خون آنیوالی ہولناک مصیبت کے تصور سے خشک ہو چکا ہے۔ وقت بڑا نازک ہے اور زیادہ تاخیر مجھے ہمیشہ کے لئے تباہی و بربادی، اور ذلت کے عمیق سمندر میں غرق کر دے گی۔ میں حضور کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔ اور میرا پیارا چتور بہادر شاہ والی گجرات کی فوجوں سے گھرا ہوا ہے۔ چتور کے سپے سپوت اپنے سروں کو ہتھیلی پر لئے ہوئے ہیں مگر " پلچھ توپوں " کے سامنے اُن کی بہادری کارگر نہیں ہوتی اور وہ چتور کے ناموس کی قربانگاہ پر بھیڑ بکریوں کی طرح " پلچھ توپوں " کے چھروں سے بیرحمی کے ساتھ ہر روز ذبح ہو رہے ہیں۔ ایسے وقت میں یہ " راکھی " آپ کی خدمت میں بھیج رہی ہوں اور امید کیسی کامل یقین ہے کہ آپ اس کو قبول کریں گے۔ کیونکہ بہادری کے قانون کے مطابق میری بھیجی ہوئی " راکھی " کو قبول کرنا اور اس کو باندھ کر میرا راکھی بند بھائی ہو جانا آپ پر فرض ہے۔ . . . . . میں دیکھ رہی ہوں کہ میری بھیجی ہوئی " راکھی " میرے بھائی شہنشاہ ہمایوں کی کلائی پر بندھی ہوئی ہے۔ . . . . اب اس کی لاج آپ کے ہاتھ ہے۔ . . . . . . میرے مقدس بھائی —— اب بلا کسی تاخیر کے جلد آئیے اور اپنی بہن کی عزت وحشیوں کے ہاتھ سے بچائیے اور اپنے شیر خوار بھانجے اودے سنگھ کی حفاظت کیجئے . . . . "

آپ کی بہن
کرناوتی
۲۵ ر اماوس سمبت ۱۵۸۹ [1]

ہمایوں خط کا مضمون بڑے غور سے سُن رہا تھا۔ خط کا مضمون ختم ہو چکا تھا اور اب اس کو کسی غور و فکر کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اس وقت اپنے فطری جذبہ سے سرشار تھا اور فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کو کیا کرنا چاہیئے۔

" راکھی کہاں ہے ؟ - میری کلائی پر باندھ دو " شہنشاہ نے نوجوان راجپوتوں سے مخاطب ہو کر کہا —— پہلا نوجوان راجپوت جو اپنے ساتھی سے آگے کھڑا ہوا تھا آگے بڑھا، شہنشاہ کے قدموں کو بوسہ دیا، اور اس نے شہنشاہ کے داہنے ہاتھ کی کلائی پر راکھی باندھ دی۔ اور تب اس نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر پرنام کیا اور چند قدم ہٹ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

اس وقت دونوں نوجوان راجپوتوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

" شیر خاں کو جواب دے دو کہ مابدولت نے اس کا جرم معاف کیا اور وہ کل حضور میں آ کر مابدولت کی

[1] سمبت ۱۵۸۹ مطابق ۳۳-۱۵۳۲ء

اظہار خوشنودی کی سند حاصل کرے،، شہنشاہ نے میر منشی سے کہا۔
میر منشی نے جواب میں سر کو جھکا دیا۔
"میرے بہادر دوستو! میں پرسوں صبح کو یہاں سے اپنی پوری فوج کے ساتھ چتور کی جانب کوچ کرونگا اور اپنی بہن کرناوتی کی حفاظت کا فرض ادا کروں گا۔ اس کے لئے میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اپنے بہادر سپاہیوں کی عزیز جانیں، خود اپنی جان، رنتھمبور کا قلعہ۔ غرضکہ اپنی بہن کرناوتی کی حفاظت کی ہر ممکن قیمت میں ادا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ تم لوگ بھی سستالو اور رابدولت کے ہمراہ رکاب روانہ ہو،، شہنشاہ نے نوجوان راجپوتوں کو کہا۔
"مہابلی! حضور کا حکم سر آنکھوں پر ہے . . . مگر مناسب ہے کہ ہم لوگ صبح ہی روانہ ہو جائیں اور جلد از جلد چتور پہونچ کر اپنی مہارانی کو حضور کی آمد آمد کی نوید جانفزا سنائیں۔ تاکہ سر میتی مہارانی کو اطمینان ہو، سپاہیوں کے دل بڑھ جائیں، اور دشمن سشنکر کانپ اٹھیں" پہلے نوجوان راجپوت نے جواب دیا۔
"تمہاری رائے انسب ہے —— جاؤ —— میری اجازت ہے —— خدا حافظ —— میری بہن کو جلد میرا پیام پہونچاؤ۔ میں بھی قریب قریب تمہارے ساتھ ہی پہونچوں گا" شہنشاہ نے جواب دیا۔

(۴)

ابتدائے آفرینش سے چتور کے نام میں ایک تقدیس ہے۔ یہ راجستھان کا کعبہ ہے، بیت المقدس ہے، کاشی ہے اور سب کچھ ہے۔ اس سے سچی بہادری کا نام زندہ ہے۔ اس سے بہادران راجستھان کے سروں میں اولوالعزمی کا سودا، آنکھوں میں بیداری، اور جگر میں تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چتور کی پاک سرزمین پر جب کبھی "وحشیوں[۵]" کا حملہ ہوا تو بہادران راجستھان نے اس کی دفاع کے لئے اپنا خون پانی کی طرح بہادیا۔ اس کی گود میں حیرت انگیز بہادری کے ہزاروں کارنامے کھیل رہے ہیں —— ایسے کارنامے جنکی مثال تاریخ کے صفحات پر مشکل سے مل سکتی ہے۔ آج بھی جبکہ والی گجرات سلطان بہادر شاہ اپنے قہار لشکر کے ساتھ منڈو کے راجہ کی معیت میں اپنے باپ مظفر شاہ کی ذلت کا انتقام لینے کے لئے چتور کی پاک سرزمین کو گھیرے ہوئے پڑا ہے تو فدائیوں کی کمی نہیں ہے۔ بوندی کا بہادر فرزند پانچ سو بہادر راجپوتوں کے ساتھ، جھالور کا راجہ سونیگر راؤ، ابو کا راجہ دیو راؤ، اور راجستھان کے بہت سے سورما مقدس چتور کی دفاع کے لئے پہنچ گئے ہیں۔

---

۵ راجستھان کے لوگ اپنے حملہ آوروں کو اسی نام سے یاد کرتے تھے۔

مگر اس مرتبہ چتوڑ کا حملہ آور عظیم الشان لشکر لے کر آیا تھا ——— ایسا عظیم الشان لشکر کہ راجستھان کی ابتدائے تاریخ سے لے کر آج تک کبھی دیکھا یا سنا نہ گیا تھا۔ لشکر عظیم کے علاوہ عجیب غریب آلات کا مقابلہ تھا جنکے آگے بہادران راجستھان کی بہادری کارگر نہ ہوتی تھی۔ رومی خاں "بلچھ توپوں[1]" کے ذریعہ سے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ وزنی گولے برساتا تھا۔

(۵)

۱۲ر جیٹھ ۱۵۸۹ سمبت (مطابق ۳۳-۱۵۳۲ء) کی بھی عجیب ہولناک صبح تھی۔ گولے یمین ویسار سے پھٹ پھٹ کر گر رہے تھے اور چتوڑ کا قلعہ دھوئیں کی مسموم فضا سے چھپا ہوا تھا۔ چند ماہ کی متواتر گولہ باری کی وجہ سے قلعہ کی دیواریں اور فصیلیں چور ہو چکی تھیں اور اب قلعہ میں کوئی دم باقی نہ تھا۔ لیکن مایوسی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی بہادران راجستھان کے ہاتھوں سے ایک لمحہ کے لئے بھی سرفروشانہ جرأت، آہنی استقلال، اور امید کا سر رشتہ نہ چھوٹتا تھا۔ آج جنگ اور گولہ باری کا سارا زور شور درۂ بیکا پر تھا۔ یہاں بوندی کا بہادر راجکمار پانچ سو ہارا راجپوتوں کے دستہ کے ساتھ کمان کر رہا تھا اس دستہ کے اوپر رومی خاں اپنی پوری طاقت کے ساتھ گولے برسا رہا تھا اور بہادر شاہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ جس صورت سے ہو سکے اس درہ پر قبضہ کر لیا جائے کیونکہ قلعہ کی فتح اسی درہ کی فتح پر منحصر تھی۔ .... مگر درہ کی حفاظت بوندی کا راجکمار کر رہا تھا اور "بلچھ توپوں" کی کی آتشباری، بیشمار لشکر، اور بہادر شاہ کی ساری دانشمندیاں بیکار ثابت ہو رہی تھیں۔ رومی خاں رات ہی سے سرنگ بچھانے میں مصروف تھا۔ اس نے درہ کے جانباز محافظوں کو توپوں کے گولوں اور گجرات کے بیشمار لشکر کے دماغ کی طرف متوجہ رکھا اور اس طرح سے سرنگ کو نہایت ہی ہوشیاری کے ساتھ مکمل کر لیا ——— کامل ایک گھنٹہ گذر چکا ہے کہ فلیتہ میں آگ لگائی جا چکی ہے ——— مگر درۂ بیکا کے جانباز محافظ آنے والی ہولناک مصیبت سے بے خبر دفاع کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ گولے یمین ویسار سے پھٹ پھٹ کر گر رہے ہیں۔ تلوار اور نیزے چاروں طرف سے برس رہے ہیں۔ مگر چند سو جانباز راجپوتوں کا وجود ایک مضبوط چٹان ہے ——— درۂ بیکا کے چٹانوں سے بھی مضبوط ——— بہت زیادہ مضبوط ——— جس سے بے شمار فوجوں، گولوں، تلواروں اور نیزوں کا سیلاب ٹکرا ٹکرا کر اُلٹے پاؤں واپس چلا آتا ہے — ایک دھماکا ہوا اور درۂ بیکا اڑ گیا ... اور اس کے ساتھ بوندی کا راجکمار مع اپنے چند سو بہادر راجپوتوں کے راہی جنت ہوا۔ دشمنوں کی فوج میں خوشی کا نعرہ بلند ہوا کیونکہ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ بس اب قلعہ فتح ہو گیا لیکن انھیں معلوم نہ تھا کہ یہ چتوڑ کا قلعہ ہے دشمنوں

---

[1] راجپوتوں کو توپ سے بڑی نفرت تھی چنانچہ اسی بنا پر وہ اس کو "بلچھ" کہا کرتے تھے

کو بہت دیر تک خوشی نصیب نہیں ہوئی کیونکہ جب دہوئیں کا ابر چھٹا تو انھوں نے دیکھا کہ بہادران چتور کا دوسرا دستہ مقابلہ کے لئے کھڑا ہوا ہے۔ یہ راؤ درگا تھا جو چندوت کے بہادر سردار ستو اور دودو اور دوسرے بہادران راجستھان کے ساتھ، بوندی کے راجکمار کی جگہ لینے کے لئے پہونچ گیا تھا۔ گرچند راجپوت ایک بیشمار لشکر اور "پلھ" آلات حرب کا کب تک مقابلہ کرتے۔ ہوا وہی جو ہونا تھا سب کے سب چتوڑ کی عزت وحرمت پر فدا ہوگئے۔ مگر اب بھی دشمنوں کی مراد پوری نہ ہوئی کیونکہ رانی جواہر بائی راٹھور نے ان کی جگہ لے لی تھی۔ رانی فوجی لباس پہنے ہوئے تھی اور بہادر راجپوتوں کو للکار للکار کر دشمنوں کی صفوں کو درہم برہم کر رہی تھی مگر اس بہادر راجپوتنی کا بھی وہی حشر ہوا جو ہونا تھا۔

اب دفاع فضول تھا۔ محض جنون تھا اس لئے بہادر راجپوتوں نے آخری فیصلہ کر لیا کہ ہم سب لوگ کٹ مریں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر اودے سنگھ کو بچانا ضروری تھا۔ کیونکہ چتوڑ کے دفاعی دستہ کی سرداری وہی کر سکتا ہے جس کی رگوں میں شاہی خون دوڑتا ہو۔ اس لئے دیولا کے راجکمار باگھ جی نے فوراً بڑھ کر میواڑ کا علم اٹھالیا۔ اور اودے سنگھ کو بوندی کے راجکمار سورتان کے سپرد کر دیا گیا۔ ان ضروری انتظامات کے بعد قلعہ کا پھاٹک کھول دیا گیا۔ راجپوتانہ کے موسم گرما کا آفتاب پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ تمازت آفتاب، لوؤں کی لپٹ، اور ناقابل برداشت گرمی کی حدت کی وجہ سے کسی انسان کا کھڑا ہونا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ لیکن گجرات کا لشکر کثیر تھا، سامان رسد، اور ہر قسم کے سامان وافر تھے اس لئے گجراتی لشکر برابر بڑھ رہا تھا —— مگر چتور کے جانباز سپاہیوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ سامان رسد اور دوسرے ضروری سامان بھی ختم ہو چکے تھے۔ لیکن اس وقت وہ فتح کے لئے نہیں۔ مرنے کے لئے آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ گجرات کے عظیم الشان لشکر کو دھیان میں نہیں لارہے تھے کہتے ہیں کہ گھمسان کا معرکہ ہوا۔ شام تک جنگ جاری رہی اور جانباز ان چتوڑ ایک ایک کرکے کٹ مرے۔

یہاں تو یہ ہو رہا تھا اور قلعہ کے اندر تیرہ ہزار عورتیں زعفرانی ساریاں پہنے، ماتھے پر سیندور کا ٹیکہ لگائے، گویا کہ وہ دوسری دنیا میں اپنے شوہروں سے ملنے کے لئے جارہی ہیں، رانی کرناوتی کے ساتھ جلتی ہوئی آگ میں کود پڑیں اور اس طرح سے انھوں نے اپنی مقدس آبرو —— جو گنگا کے مقدس پانی کی طرح پاک تھی۔ جورات کے چمکیلے ستاروں سے زیادہ چمکیلی تھی —— جو بہار پر آئی شبنمی صبح سے زیادہ دلفریب تھی، گجرات کے "وحشی" سپاہیوں کے ہاتھوں سے بچالی۔

(۶)

چنار گڑھ سے چتور تقریباً ۵۲۵ میل ہے۔ ہمایوں نے شیر شاہ کا اظہار اطاعت قبول کرنے کے بعد

ابنی بہن کرناوتی اور اپنے بھانجے اودے سنگھ کو بہادر شاہ والی گجرات کے حملہ سے بچانے کے لئے چتوڑ کی طرف کوچ کر دیا۔ لیکن ایک عظیم الشان لشکر، سامان رسد، سامان حرب، یہ سب اسباب تھے جن کی وجہ سے تیزی کے ساتھ منزل طے نہیں کی جا سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہمایوں سارنگ پور پہونچا تو اس کو چتوڑ کی ہولناک تباہی کی اطلاع ملی۔ اس کے کلیجہ پر ایک چوٹ لگی۔ اس کا دل بے حد حساس، واقع ہوا تھا۔ بہت دیر تک غم و غصہ کے گہرے سمندر میں ڈوبا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور فوراً بہادر شاہ کو جو اب تک چتوڑ ہی میں تھا ایک خط لکھا۔ خط میں بہادر شاہ کو بہت ملامت کی گئی تھی اور اس کو خبردار کیا گیا تھا کہ جو حشر چتوڑ کا اس کے ہاتھوں ہوا ہے۔ وہی حشر گجرات کا ہونے والا ہے۔

(۷)

بہادر شاہ کا لشکر بہت بڑا تھا، سامان حرب کی بھی کمی نہیں تھی، پھر چتوڑ کی فتح نے گجراتی سپاہیوں کے حوصلے بھی بڑھا دیئے تھے۔ گجراتی سرداران فوج کے حوصلے بھی بڑھے ہوئے تھے اور ان کی رائے تھی کہ فوراً حملہ کر دیا جائے لیکن رومی خاں کی رائے ہوئی کہ اُردو کے چاروں طرف حصار باندھ کر جنگ کی جائے۔ بہادر شاہ رومی خاں کی گولہ اندازی کا لوہا مانے ہوئے تھا اور اس کو صائب الرائے بھی سمجھتا تھا اس کے علاوہ اس پر کچھ ایسا رعب چھا گیا تھا کہ اس نے رومی خاں کی رائے پر ہی عمل کرنا مناسب سمجھا۔

مالوہ کے علاقہ میں منڈو کے قریب میدان جنگ قرار پایا۔ گجراتیوں نے اپنے فوجی کیمپ کے چاروں طرف خندقیں کھود دی تھیں اور بڑی بڑی توپیں لگا دی تھیں۔ اس سے یہ تو ضرور ہوا کہ ہمایوں کا ایک لشکری بھی گجراتی کیمپ کے اندر گھسنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ دقت یہ تھی کہ گجراتی لشکر کا ایک سپاہی بھی اپنے حصار سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ گجرات، مالوہ، اور دوسرے مقامات کے راستوں پر جہاں سے رسد پہونچ سکتی تھی، مغلوں کا قبضہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کو مشکل سے دو مہینے گذرے تھے کہ سامان رسد کی کمی سے سپاہی اور گھوڑے بھوک سے مرنے لگے۔ مجبور ہو کر بہادر شاہ ایک رات چپ چاپ اپنے پانچ امراء کیساتھ شاہی خیمہ سے نکل کر منڈو بھاگ گیا۔ گجراتی سپاہیوں کو جب اپنے بادشاہ کی غداری کی خبر ملی تو وہ ادھر اُدھر منتشر ہو گئے اور سارا فوجی کیمپ مع مال و اسباب اور آلات حرب کے ہمایوں کے لئے چھوڑ گئے۔ لیکن ہمایوں کو تو بہادر شاہ کی گرفتاری کی لو لگی ہوئی تھی۔ وہ فوراً اپنی پوری فوج کے ساتھ بہادر شاہ کے تعاقب میں منڈو کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب ہمایوں منڈو پہونچا تو رات ہو چکی تھی۔ اور اتفاق سے رات بھی اندھیری تھی اور پھر سفر کی تکان سے چور بھی تھا لیکن بہادر شاہ کو گرفتار کرنے کے لئے بے چین تھا ——— ایسا بے چین تھا کہ رات کی تاریکی، سفر کی تکان، غرضکہ کسی قسم کی مشکل اس کی بے چینی کی آگ کو بجھا نہیں سکتی تھی۔ اسی وقت

شہر کے گوشہ میں فوج کے دستے پھیلا دیے گئے کہ جس گوشہ میں ملے فوراً پکڑ کر حاضر کرو۔ گھنٹوں کی تلاش کے بعد اُس مقام کا سُراغ ملا جہاں وہ چھپا ہوا تھا۔ ایک دستہ فوراً روانہ کیا گیا۔ دستہ اس کے خیمہ کے دروازہ تک پہونچ چکا تھا اور قریب تھا کہ وہ گرفتار ہو جائے لیکن جان ایسی پیاری چیز ہے کہ انسان بسا اوقات اپنی جان بچانے کے لئے شیر سے زیادہ بہادر، ہوا سے زیادہ تیز، اور لومڑی سے زیادہ چالاک ہو جاتا ہے۔ بہادر شاہ اگرچہ سویا ہوا تھا لیکن خطرہ کی آہٹ پاتے ہی فوراً جاگ گیا اور بجلی کی سرعت کی طرح اپنے چند رفقا کے ساتھ جان بچاکر نکل بھاگا۔

ہمایوں کو جب خبر ملی تو اس نے فوراً تعاقب شروع کیا۔ بہادر شاہ منڈو سے بھاگ کر چمپانیر پہونچا اور فوراً قلعہ بند ہو گیا مگر ہمایوں بھی برق بلا کی طرح پیچھا کئے ہوئے تھا۔ بہادر شاہ ابھی سامان درست بھی نہیں کرنے پایا تھا کہ ہمایوں پہونچ گیا۔ ہمایوں جوش میں بھرا ہوا تھا۔ قلعہ کی دیوار میں لوہے کی لمبی لمبی میخیں ٹھونک دی گئیں اور اکتالیس سپاہی جان پر کھیل کر قلعہ کی فصیل پر چڑھ گئے۔ ان میں ہمایوں بھی تھا۔ پھر کیا تھا۔ ان جانباز سپاہیوں نے خود شہنشاہ کی قیادت میں دربانوں کو مار کر قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ اور آن کی آن میں ہمایونی لشکر قلعہ کے اندر تھا۔ قلعہ کے فتح ہوتے ہی گوشہ گوشہ میں بہادر شاہ کی تلاش ہونے لگی۔ مگر اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بڑی تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ چور دروازہ سے نکل کر احمد آباد کی جانب بھاگا ہے۔ شہنشاہ نے فوراً تعاقب شروع کر دیا۔ لیکن احمد آباد پہونچ کر معلوم ہوا کہ شہنشاہی لشکر کے شہر میں داخل ہوتے ہی کھمبے کی طرف بھاگا ہے۔ اب ہمایوں نے صرف تھوڑے سے جانبازوں کو منتخب کر لیا اور باقی لشکر کو وہیں چھوڑ دیا اور کھمبے کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن جب کھمبے پہونچا تو معلوم ہوا کہ شہنشاہ کے شہر میں داخل ہوتے ہی وہ بندر دیپ کی طرف بھاگ گیا۔ ہمایوں دانت پیس کر رہ گیا کیونکہ بیچ میں سمندر حائل تھا جس کو عبور کرنا ناممکن تھا۔ مجبوراً چمپانیر واپس آیا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ مرزا عسکری اور یادگار ناصر مرزا دونوں مل کر آگرہ پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور شیر خاں نے بہار اور بنگال میں بڑی طاقت پکڑ لی ہے اور اس کی طاقت نے ایک خطرناک صورت اختیار کر لی ہے۔ ہمایوں نے وہاں سے فوراً آگرہ کی طرف کوچ کر دیا۔

(۸)

واقعات بد سے بدتر ہوتے گئے اور متعدد مقامات پر شکست، ناکامی، اور مایوسی کے بعد ہمایوں کو ہندوستان کا شاہی تخت چھوڑ کر جلا وطن ہونا پڑا۔ لیکن باوجود ان تمام مصائب کے ہمایوں اپنے دل میں ایک اطمینان اور مسرت کی ٹھنڈک محسوس کرتا تھا کیونکہ ایک بلند تخیل کے لئے اُس کو تخت سے ہاتھ دھونا پڑا تھا ——— ایسا بلند تخیل جس کی قیمت ہندوستان کے شاہی تخت سے بہت زیادہ تھی۔ مدتیں گذر گئیں، زمانہ ہو گیا مگر ہمایوں کا نام اب بھی عزت، احترام، اور محبت سے لیا جاتا ہے۔

شبلی ابراہیمی ایم۔ اے

جوش کی شاعرانہ لغزشیں

گزشتہ ماہ کے نگار میں جوش صاحب کی صرف ایک نظم شفق کی تنقید نے کافی صفحات لے لئے، لیکن جزئیات کی بحث سے یہ فائدہ یقینی ہے کہ جن نوجوانوں کو شعر وسخن کا شوق ہے وہ سمجھ سکیں گے کہ یہ فن کسقدر نازک ہے اور محض خوبصورت الفاظ کو ایک مخصوص وزن وقافیہ کے ساتھ فراہم کر دینا شاعری نہیں ہے ——— غزل میں چونکہ ایک شعر کا دوسرے شعر سے مربوط ومتعلق ہونا ضروری نہیں، اس لئے اس میں تو "خیالات پریشاں" کے لئے گنجائش کافی ہے، مگر کسی خاص عنوان سے کوئی نظم لکھنا آسان کام نہیں ——— اس میں محاکات وجذبات، الفاظ وتراکیب، تخیل وتصور سب کو باہم گر مربوط ومتوازن ہونا چاہئے اور اس میں کسی ایک لفظ کا بھی بے محل استعمال ہو جانا ایسا ہی ہے جیسے ساز کے کسی تار کا اتر جانا یا گانے میں کسی ایک سُر سے "کنڈرا" ہو جانا

غزل گویا ایسے متفرق نقوش کا مرقع ہے جنھیں نقاش نے مختلف اوقات میں مختلف کیفیات کے ساتھ کاغذ پر پیش کیا ہے، اور ایک کا دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن نظم ... ایک ایسی تصویر ہے جس میں مصور اس کے پس منظر (Back ground) کی فضا، اس کے خطوط کے انحنا، اس کے سایوں (Shade) کے اتار چڑھاؤ اور اس کے رنگوں کے امتزاج سے صرف ایک ہی کیفیت کو پیش کرنا چاہتا ہے اور تمام ماحول کو اپنے اس مرکزِ خیال کی طرف کھینچ لانا چاہتا ہے جو نقش نہیں بلکہ خود نقاش کی انفرادیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے شاعر جسقدر غزل میں آزاد ہے اسیقدر نظم میں پابند ہے اور ایک نقاد اگر غزل کے ایک ایک شعر پر علیحدہ علیحدہ تنقید کرنے کے لئے مجبور ہے تو نظم میں اس کو شروع سے لے کر اخیر تک ایک ایک شعر کو مسلسل ومربوط کر کے دیکھنا پڑتا ہے کہ کہاں کیا نقص ہے اور کون لفظ بے محل استعمال کیا گیا ہے ——— میں مثالاً جوش کی ایک مختصر نظم درج کر کے اس مسئلہ کو زیادہ واضح طور پر بیان کرنا چاہتا ہوں ——— نظم کا عنوان ہے "وطن میں پہونچا دے" اس لئے جس طرح ہم تصویر کے عنوان کو دیکھ کر نقش کے خطوط وغیرہ پر غور کرتے ہیں اسی طرح ہمکو نظم کا بھی مطالعہ اسی عنوان کو سامنے رکھ کر کرنا چاہئے۔ عنوان سے یہ مفہوم ظاہر نہیں ہوتا کہ شاعر کس کے لئے وطن میں پہونچا دینے کی التجا کرتا ہے یعنی وہ خود وطن پہونچنا چاہتا ہے یا کسی اور کو بُلانا چاہتا ہے۔ لیکن نظم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کو وطن میں پہونچانا چاہتا ہے۔ اور عنوان، نظم کے پہلے مصرعہ کے دوسرے ٹکڑے سے حاصل کیا گیا ہے، اب آپ

پہلے نظم کے اشعار سن لیجئے :۔

نگارِ رفتہ کو یارب وطن میں پہونچا دے — دوبارہ دُرِ عدن کو عدن میں پہونچا دے
خدائے مہر و وفا، اس نگار شیریں کو — دوبارہ غمکدۂ برہمن میں پہونچا دے
خنک نسیم کو دے گلستاں میں اذن خرام — چمن کی جان کو یارب چمن میں پہونچا دے
افق اُداس ہے نور سحر کو واپس کر — غزال شہر ختن کو ختن میں پہونچا دے
دوبارہ اس صنموں کے صنم کو بارِ خدا — جوارِ بتکدۂ برہمن میں پہونچا دے
وہ اپنے حسن سے محفل، میں اپنے عشق سے بزم — اس انجمن کو پھر اس انجمن میں پہونچا دے

فسردہ جوشؔ ہے بے یار نادرہ گفتار
سخن کی شمع کو بزم سخن میں پہونچا دے

اول کے پانچ شعروں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر محبوب کو اس کے وطن میں دیکھنے کی تمنا کرتا ہے لیکن اخیری دو شعروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاعر محبوب کو اپنے پاس بلانا چاہتا ہے اور لفظ وطن استعارتاً استعمال کیا گیا ہے اسلئے عنوان کا مفہوم تو متعین ہو گیا کہ شاعر خدا سے یہ التجا کرتا ہے کہ اس کے محبوب کو اس کے پاس پہونچا دے لیکن قبل تنقیدی نگاہ ڈالنے کے یہ معلوم کر لینا بھی ضروری ہے کہ محبوب کی جدائی بربنائے مجبوری تھی یا بربنائے برہمی۔ یعنی محبوب خود خفا ہو کر چلا گیا تھا یا واقعات و حالات نے اس کو شاعر سے جدا کر دیا تھا ـــــ سو نظم کے سرسری مطالعہ سے ذہن سامع یہی سمجھتا ہے کہ محبوب کا چلا جانا کسی مجبوری کی بنا پر تھا۔ اور وہ خود برہم ہو کر نہیں گیا تھا ـــــ اچھا اب آئیے اس خیال کو سامنے رکھ کر دیکھیں کہ نقاش اس نقش میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔

پہلے مصرعہ کا پہلا فقرہ "نگارِ رفتہ" ہے اور ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس نقش کی ابتدا ہی غلطی سے ہوتی ہے ـــــ شاعر نگارِ رفتہ کہتا ہے یعنی وہ نگار جو چلا گیا ہے ـــــ درانحالیکہ فارسی میں لفظ رفتہ جب کسی انسان کے صفت قرار دیا جاتا ہے تو اس کے معنے وارفتہ و مدہوش کے ہوتے ہیں۔ غیر ذی انسان کے لئے اس کا استعمال بیشک "گزرے ہوئے" کے معنی میں آتا ہے جیسے عہد رفتہ۔ شباب رفتہ وغیرہ اور یہ ظاہر ہے کہ یہاں شاعر کی مراد نگار رفتہ سے اس کا وہ محبوب ہے جو اس کے پاس سے چلا گیا ہے، جو صحیح نہیں۔

دوسرے مصرعہ میں خدائے مہر و وفا کہہ کر شاعر نے محتمل الضدین کیفیت پیدا کر دی ہے۔ یعنی اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ محبوب بیوفا ہے اس لئے خدائے مہر و وفا سے التجا کی گئی کہ وہ محبوب کے دل میں کیفیت مہر و وفا پیدا کر دے۔ اور یہ بھی سمجھ میں آسکتا ہے کہ وہ بڑا وفا کوش ہے۔ اس لئے خدا کو اس کے مہر و وفا کا واسطہ دلایا گیا۔ پہلے مصرعہ کے دوسرے ٹکڑے میں نگار کی صفت شیریں قرار دی گئی ہے۔ جو غلط تو نہیں لیکن بے محل

ضرور ہے کیونکہ سارے شعر میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا موجود نہیں جو لفظ شیریں کے استعمال میں حسن پیدا کرسکے۔ دوسرے مصرعہ میں "غمکدۂ برہمن" کا اقتضا، یہ تھا کہ کافر یا کوئی اور مناسب صفت تلاش کی جاتی۔

چوتھے شعر کے دوسرے مصرعہ میں غزال شہرختن بجائے غزال ختن کا صرف مصرعہ پورا کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ لفظ شہر نہ یہ کہ بیکار بلکہ نامناسب بھی ہے کیونکہ ہرن شہر میں نہیں رہتے بلکہ صحرا میں رہا کرتے ہیں۔ اسی طرح پانچویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں جوار بتکدۂ برہمن کا جوار بھی وزن پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ صنموں کے صنم کو بتکدہ کے اندر پہونچنا چاہئے نہ کہ جوار بتکدہ میں کہ اس سے برہمن کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔

یہ تو وہ نقائص ہوئے جن کا تعلق الفاظ یا ترکیب الفاظ سے ہے اور گویا ایک نقش کے وہ اسقام ہیں۔ جو درمیانی خطوط سے متعلق ہیں۔ لیکن اس نظم میں معنی و مفہوم کے لحاظ سے بھی ایک عیب ہے جسے نقاشوں کی اصطلاح میں "اختلاف موضوع و پس منظر" کہتے ہیں۔ اس کو میں ذرا وضاحت کے ساتھ ظاہر کردینا مناسب سمجھتا ہوں:-

اس نظم کے پہلے دو شعر سے تو یقینی طور پر اس کا پتہ نہیں چلتا کہ محبوب کا چلا جانا از خود برہمی تھا یا بربنائے مجبوری، لیکن تیسرے شعر اور پانچویں شعر سے یہ معاملہ صاف ہوجاتا ہے تیسرے شعر کا پہلا مصرعہ ہے:-

خنک نسیم کو دے گلستاں میں اذن خرام

اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تو آنے کے لئے طیار ہے لیکن کچھ اسباب و حالات ایسے ہیں۔ جو آنے نہیں دیتے۔ اذن کے لفظ نے اسکو بالکل صاف کردیا۔ اس کی تصدیق چوتھے شعر کے پہلے مصرعہ سے بھی ہوتی ہے، کیونکہ اس میں بھی واپس کرکے الفاظ سے یہی متبادر ہوتا ہے کہ محبوب کا چلا جانا کسی مجبوری کی بنا پر تھا۔ اسی کے ساتھ اب اور نہایت نازک بات یہ پیدا ہوتی ہے کہ جبکہ محبوب وفاشعار تھا تو اصولاً عاشق کو اپنے زمان ہجراں کے ہر پہلو کو بغیر اس کے ناقص و نامکمل دکھانا چاہئے تھا، چنانچہ شاعر نے اس کا التزام بھی کیا ہے کہ اپنے کو عدن کہا تو اُسے دُرِ عدن ظاہر کیا، اپنے کلبۂ احزاں کو اگر غمکدۂ برہمن کہا تو اوسے نگار شیریں کے نام سے یاد کیا، خود اپنے آپ کو چمن کہا تو اُسے جان چمن ثابت کیا وغیرہ وغیرہ لیکن چھٹے شعر میں اس التزام کے بالکل خلاف ایک ایسی بات کہدی جو نظم کی اصل روح کے بالکل منافی ہے یعنی

وہ اپنے حسن سے محفل، میں اپنے عشق سے بزم

اس سے قبل شاعر اپنی ہر کیفیت کو تشنہ اور اپنی ہر حالت کو ناقص و ناتمام ظاہر کرکے محبوب کو یاد کر رہا تھا لیکن اس مصرعہ میں اس نے اپنی حیثیت بالکل محبوب کے برابر ثابت کردی کہ اگر وہ اپنے حسن کے لحاظ سے محفل ہے تو میں اپنے عشق کے لحاظ سے ایک مستقل بزم ہوں۔ اور اس طرح شاعر نے اپنی فریاد، اپنی پکار، اپنی

تمنا اور اپنی تشنگی کی کیفیات کو بالکل خاک میں ملا کر رکھدیا - اور اشعار میں تو شاعر اپنے محبوب کو اس لئے بلاتا تھا کہ بغیر اس کے کوئی کیفیت اس کی مکمل نہ ہوسکتی تھی لیکن اس شعر میں وہ دفعتاً فتادگی کو چھوڑ کر انانیت کی حالت اختیار کرلیتا ہے اور نظم کی اصل روح برباد ہوجاتی ہے۔ عدن اگر در عدن کا طلبگار ہے تو بالکل درست ہے، بتکدہ اگر صنم کا منتظر ہے تو ایسا ہونا چاہئے، ختن میں اگر غزال ختن واپس آجائے یا بزم سخن میں کوئی شمع سخن تشریف لے آئے تو ختن اور بزم سخن دونوں کی خوش نصیبی ہے۔ لیکن جب عاشق اپنے آپ کو محبوب کے مقابلہ میں ایک مستقل انجمن سمجھنے لگے تو اسے اس نوید و طلب کا کیا حق حاصل ہے انجمن کا انجمن میں آنا بجائے خود یوں بھی کم مہمل نہ تھا، لیکن نظم کے مقصد کے لحاظ سے شاعر کا یہ ادعا تو اہمال سے بھی زیادہ کسی اور لفظ سے یاد کئے جانے کا مستحق ہے۔

یہ ہیں شاعری کے وہ نازک نقائص جن تک نہ ہر شاعر کی نگاہ جاتی ہے نہ ہر نقاد کی۔ لیکن جب ان کو بیان کردیا جاتا ہے تو ہر شخص ان کے ماننے پر مجبور ہوتا ہے۔ خود شاعر بھی ان کو محسوس کرکے دل ہی دل میں اعتراف کرتا ہو گو لوگوں کو سمجھانے کے لئے وہ یوں زبانی لاکھ تاویلیں کیا کرے۔

مشکل سے جوش کی کوئی نظم ایسی نظر آئے گی جس میں اس نوع کے نقائص نہ پائے جائیں۔ مثلاً ایک اور نظم ملاحظہ کیجئے۔ جس کا عنوان التجا ہے اور جس کے ہر شعر میں بادِ صبا سے خطاب کیا گیا ہے :-

ادھر بھی بادِ صبا آ بہار کی سوگند — شمیم طرۂ گیسوئے یار کی سوگند
کھلا دے میرے چمن میں بھی غنچۂ امید — خروش آمدِ فصلِ بہار کی سوگند
بھڑا دو رنگی امید و بیم سے دل کو — طلسم گردش لیل و نہار کی سوگند
مری حیات کو بھی کر شگفتگی سے دوچار — تبسم سحر و حسن یار کی سوگند
مرے دماغ پہ بھی ڈال پرتوِ جاناں — تجھے شعاعِ سرِ کوہسار کی سوگند
جلادے حسن کے سینہ میں آرزو کا چراغ — ضمیر سنگ میں روح شرار کی سوگند
بتا بکھرتی ہو کس طرح زلف شانہ پر — نزول رحمتِ پروردگار کی سوگند
سکھا جمال کو ایفاء عہد کا دستور — جلالِ صبح شب انتظار کی سوگند
سنا فسانۂ رفتار جاں فروز نگار — جواں خرامی ابر بہار کی سوگند
وفا کی دُکھتی ہوئی رگ کو لوٹس کو دے آرام — کنار یار و لب جوئبار کی سوگند

سنادے جوش کو بھی یار نازنیں کا سخن
فسون زمزمۂ آبشار کی سوگند

ممکن ہے آپ کو یہ نظم بالکل بے عیب نظر آئے، لیکن آئیے میرے ساتھ غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس میں بھی اس قسم کا عیب پایا جاتا ہے جو اس سے قبل کی نظم میں دکھایا گیا ہے۔

آپ اس نظم کو پڑھنے کے بعد معلوم کریں گے کہ ہر شعر میں بادِ صبا سے خطاب کرکے کسی نہ کسی چیز کی قسم اس کو دلائی گئی ہے اور پھر اس سے کسی نہ کسی خدمت کی التجا کی گئی ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں ایسی ہونا چاہئے جن سے بادِ صبا کو قریب یا بعید کا کوئی تعلق رکھنا چاہئے ورنہ قسم و التجا دونوں مہمل قرار پائیں گے۔ اب آپ ایک ایک شعر کو پڑھ کر غور کیجئے کہ وہ اس معیار پر صحیح اترتا ہے یا نہیں؟

پہلا شعر اس لحاظ سے بالکل درست ہے کیونکہ بادِ صبا کا خَمِ طرۂ گیسوئے یار سے بھی ایک نوع کا تعلق پایا جاتا ہے اور اس کی روانی کے لحاظ سے بُلانا بھی نامناسب نہیں ہے۔ اسی طرح دوسرا شعر بھی بے عیب ہے۔ کیونکہ بادِ صبا کا تعلق فصلِ بہار اور غنچہ دونوں سے ہے، لیکن تیسرا شعر اس لحاظ سے لغو ہے کیونکہ "امید و بیم کی دوڑتی کو چھڑانا" بادِ صبا کا کام نہیں۔ اسی طرح چوتھے شعر میں حسنِ یار سے اس کا کوئی تعلق نہیں جو اس کی قسم دلائی جائے تبسمِ سحر تو ٹھیک ہے لیکن اسی کے ساتھ حسنِ یار کا اضافہ کوئی معنی نہیں رکھتا ——— پانچویں شعر میں اس سے التجا کی جاتی ہے کہ "مرے دماغ پہ بھی ڈال پرتو جاناں" درانحالیکہ بادِ صبا یا ہوا کے خواص سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

چھٹا شعر پورا کا پورا اس لحاظ سے بے معنی ہے کیونکہ نہ "ضمیرِ سنگ میں روحِ شرار" سے اس کا کوئی واسطہ ہے اور نہ بادِ صبا چراغ جلا سکتی ہے، بلکہ وہ تو چراغ کو بجھا دینے والی ہے ——— آٹھویں شعر میں بھی یہی نقص ہے کیونکہ "ایفاءِ عہد کا دستور سکھانا" بادِ صبا کے فرائض میں شامل نہیں۔ اسی طرح دسویں شعر میں "کنارِ یار" بالکل بے محل استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ بادِ صبا، کنارِ یار سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

اسی نوع کا معنوی اہمال جوشؔ کے اُن دو شعروں میں بھی پایا جاتا ہے جو "نغمۂ قفس" کے عنوان سے انھوں نے لکھے ہیں:-

آگ ہی لحن طائرِ آزاد؛ خاک ہے طائرِ قفس کے لئے
ہم صفیرو گلے کی ساخت کو بھی کیا اسیری بگاڑ دیتی ہے

شاعر کا مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہی ایک لحن ہے جو طائرِ آزاد کے لئے آگ کا حکم رکھتی ہے اور طائرِ مقید کے لئے خاک کا ——— لیکن الفاظ اس مفہوم کے مساعد نہیں۔ اوّل تو لحنِ طائرِ آزاد کو آگ کہنا بجائے خود بہت تصریح طلب ہے۔ معلوم نہیں اس کی لحن کو آگ کس لحاظ سے کہا گیا، اگر مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ ایک طائر آزاد کی لحن آگ بنکر خود اس کو جلا ڈالتی ہے تو درست نہیں اور اگر مدعا یہ ہے کہ وہ کسی اور چیز میں آگ لگا دیتی ہے

تو الفاظ سے متبادر نہیں۔ اسی طرح طائرِ قفس کے لئے خاک ہونا بھی کوئی معنی نہیں رکھتا، اگر اس سے مراد یہ ظاہر کرنا ہے کہ طائرِ قفس کے لئے وہ لحن خود خاک ہے تو بالکل بے معنی بات ہے اور اگر مقصود یہ کہنا ہے کہ وہ طائرِ مقید کو خاک کر دیتی ہے تو ظاہر ہے کہ آگ ہی بنکر خاک کرے گی، اور اس طرح دونوں لحن یکساں ہوکر رہ جائیں گے اور ان میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا ـــــ علاوہ اس کے سب سے بڑا نقص اس شعر میں یہ ہے کہ دوسرے مصرعہ میں لفظ ہے کا فاعل، پورا فقرہ "لحن طائرِ آزاد" واقع ہوتا ہے حالانکہ طائرِ قفس کے لئے جو لحن خاک کا کام دیتی ہے وہ لحن طائرِ آزاد نہیں بلکہ خود اس طائرِ قفس کی لحن ہے ۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہے کا فاعل صرف لحن ہے تو درست نہیں کیونکہ وہ پہلے مصرعہ میں ترکیب اضافی کے ساتھ آیا ہے اور اصولاً پورے فقرہ کو فاعل ماننا پڑے گا۔ اگر لحن بہ غیر اضافت کے واقع ہوتا تو یہ تاویل درست ہوسکتی تھی۔

باقی

سیزر و کلیوپیٹرا

ڈرامہ برنارڈ شا

(مسلسل)

کلیوپیٹرا:- میں سمجھی کہ تم مجھ سے ناراض ہو - اپالوڈورس خوش آمدید - (وہ اپنا ایک ہاتھ سیزر کی کمر میں ڈال دیتی ہے اور دوسرا ہاتھ اس کے لبوں کے آگے بڑھا دیتی ہے)

اپالوڈورس:- کلیوپیٹرا روز بروز بہت حسین ہوتی جا رہی ہے۔

کلیوپیٹرا:- کیا سچ ہے؟ اپالوڈورس؟

اپالوڈورس:- جی ہاں - بالکل سچ، میرے رفیق روفیو نے سمندر میں ایک موتی پھینکا تھا - لیکن سیزر نے جال میں ایک ہیرے کا شکار کیا -

سیزر:- نہیں سیزر نے ایک درد کا شکار کیا - میرے دوست آؤ اب کھانے پر چلیں - کھانے پر -

(سب جاتے ہیں)

کلیوپیٹرا:- (اچھلتی ہوئی) ہاں کھانے پر - میں نے تمھارے لئے دعوت کا حکم دیا ہے سیزر -

سیزر:- ہاں - اچھا تو کیا کیا ہے؟

کلیوپیٹرا:- مور کا دماغ -

سیزر:- (جیسے اس کے منہ میں پانی بھر آیا ہو -) اپالوڈورس مور کا دماغ -

اپالوڈورس:- مجھے بلبل کی زبان مرغوب ہے۔

(وہ دسترخوان کے پاس جاتا ہے)

کلیوپیٹرا:- روفیو بھنا ہوا خنزیر؟

روفیو:- (حریصانہ انداز سے) خوب (وہ اپالوڈورس کے قریب کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

سیزر:- (اپنی جگہ دیکھ کر جو میز کے بالکل کونے پر ہے) میرا چمڑے کا صوفہ کیا ہوا؟

کلیوپیٹرا:- (دوسرے کونے پر بیٹھ کر) میں نے تمھارے لیے نئے صوفے منگوائے ہیں۔

میجر ڈومو:- سیزر، یہ صوفے مالٹا کے بنے ہوئے ہیں اور ان کے اندر گلاب کی پتیاں بھری ہوئی ہیں -

سیزر:- گلاب کی پتیاں - کیا میں بوٹ کا کیڑا ہوں (وہ صوفے کو کھینچ کر علیحدہ کر دیتا ہے اور اس کے نیچے فرش پر بیٹھ جاتا ہے)

کلیوپیٹرا:- شرم کی بات ہے - میرے نئے صوفے -

میجر ڈومو:- سیزر کی بھوک رفع کرنے کے لئے کیا حاضر کیا جائے؟

سیزر:- تمھارے پاس کیا کیا ہے؟

میجر ڈومو:۔ سمندری خار پشت۔ سیاہ اور سفید چھلیاں بھونے۔ گھونگے، سیپ۔

سیزر:۔ مچھلی بھی ہے؟

میجر ڈومو:۔ جی ہاں۔

سیزر:۔ برطانوی کستورا مچھلی؟

میجر ڈومو:۔ برطانوی کستورا مچھلی سیزر۔

سیزر:۔ تو پھر وہی منگاؤ (میجر ڈومو غلام کو حکم دیتا ہے اور غلام اس کی تعمیل کو چلا جاتا ہے) میں برطانیہ میں غلام رہ چکا ہوں ——— خشکی کا وہ آخری ٹکڑا جو تمام دنیا کو گھیرنے والے سمندر میں واقع ہے۔ میں وہاں قیمتی موتیوں کی تلاش میں گیا تھا۔ ہم برطانوی موتی کی حکایت سنا کرتے تھے۔ لیکن اس کی تلاش میں ہم نے برطانوی کرم صدف پایا۔

اپالوڈورس:۔ تمام نسلیں تمکو اس کیلئے دعا دینگی۔ (میجر ڈومو سے) سمندری خار پشت میرے لئے۔

روفیو:۔ کوئی خشک چیز نہیں جس سے شروع کریں۔

کلیوپیٹرا:۔ میجر ڈومو۔ بھنے ہوئے مرغ لاؤ۔ بھنے ہوئے مرغ۔

روفیو:۔ ہاں یہ کافی ہوگا۔

کلیوپیٹرا:۔ (لالچ سے) جنگلی بطخ میرے لئے۔

میجر ڈومو:۔ سیزر اپنی مرضی کے مطابق شراب کا انتخاب خود کریں تو بہتر ہے۔

سیزر:۔ میرے لئے سادہ پانی لاؤ۔

روفیو:۔ (بیحد آزردہ خاطر ہوکر) میرے لئے سسلی کی شراب لاؤ۔

کلیوپیٹرا:۔ (منہ بناکر) سیزر تم کو دعوت دینے میں تضیع اوقات کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ ہمارے کھانے تمکو پسند نہیں آتے۔

سیزر:۔ اچھا۔ اچھا۔ مجھے لیبیا کی شراب دو۔ (میجر ڈومو سیزر کا جام بھر دیتا ہے پھر کلیوپیٹرا اور اپالوڈورس کا) لیکن جب میں روم واپس جاؤں گا۔ تو ان فضول خرچیوں کے متعلق قوانین نافذ کروں گا اور ان قوانین کی سختی سے پابندی کراؤں گا۔

کلیوپیٹرا:۔ اس کی اس وقت کوئی فکر نہ کرو۔ آج تو تم کو اور لوگوں کی طرح عیش پسند بننا ہی پڑے گا۔ (وہ اپنا ہاتھ میز پر آگے کی طرف بڑھا دیتی ہے)

سیزر:۔ اچھا صرف ایک مرتبہ میں اپنے آرام کی قربانی کروں گا ——— (اس کا ہاتھ چوم کر) اب تم کو اطمینان ہوا یا نہیں؟

کلیوپیٹرا:۔ اور اب تم اس بات کا یقین تو نہیں کرتے کہ میں تمہارے روم چلے جانے کی متمنی ہوں۔

سیزر:۔ میں کسی بات پر یقین نہیں کرتا۔ میرا دماغ سو گیا ہے۔ اس کے علاوہ کون جانتا ہے کہ میں روم واپس جاؤں گا یا نہیں؟

روفیو:۔ (خوفزدہ ہوکر) کیا؟

سیزر:۔ روم میں اب میرے لئے اور کیا نئی چیز رہ گئی ہے، وہاں کے تمام سال یکساں ہوتے ہیں اور وہ کوئی نئی بات بجز اس کے پیش نہیں کرینگے کہ میں زیادہ بڈھا ہوتا جا رہا ہوں۔

اپالوڈورس:۔ مصر کی حالت بھی ویسی ہی ہے۔ بڈھی

آدمی جب زندگی سے عاجز آجاتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے دریائے نیل کے منبع کے سوا اور سب کچھ دیکھ لیا ہے -

سیزر:- (ایک خاص تاثیر کے ساتھ) اور وہ دریائے نیل کا منبع کیوں نہیں دیکھتے؟ کلیوپیٹرا - کیا تم میرے ساتھ دیکھنے چلوگی؟ کیا ہم روم کو چھوڑ دیں؟ روم جس نے عظمت حاصل کی ہے محض یہ جاننے کے لئے کہ عظمت چھوٹے آدمیوں کی قومیت کو کس طرح فنا کر دیتی ہے؟ کیا میں تمھارے لئے ایک نئی سلطنت کی بنا ڈالوں - اور اس غیر معلوم عظمت میں بٹھانے کے لئے ایک مقدس شہر تعمیر کردوں؟

کلیوپیٹرا:- (مسرت سے) ضرور - ضرور - ضرور -

روفیو:- اب وہ افریقہ کو بھی فتح کرے گا -

اپالوڈورس:- واقعی یہ بہت اچھی تحریک ہے - اس میں سیزر صرف ایک فاتح سپاہی ہی نہیں ہے - بلکہ ایک جدت آفریں شاعر اور ایک آرٹسٹ بھی ہے - اور ہم کو اس مقدس شہر کا نام تجویز کرنا چاہئے - اور اس کے نام سے لیبیا کی شراب کا جام پینا چاہئے

سیزر:- اس کا نام خود کلیوپیٹرا رکھے گی!

کلیوپیٹرا:- اس کا نام "سیزر کا نذرانہ اپنی محبوبہ کو" ہوگا -

اپالوڈورس:- نہیں نہیں - اس سے زیادہ وسیع کوئی ایسا نام بتاؤ جو ستاروں والے آسمان کی غیر محدود فضا پیدا کرنے والا ہو -

سیزر:- (غیر دلچسپ انداز سے) صرف "وادیٔ نیل" ہی کیوں نہو؟

کلیوپیٹرا:- نہیں نیل میرا جد ہے - اور وہ ایک دیوتا ہی اوہ - میں نے کچھ اور سوچا ہے خود نیل ہی اس کا نام تجویز کرے گا - ہم کو اسی سے کہنا چاہئے -

(میجر ڈوموسے) اس کو بلواؤ - (تینوں آدمی ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں - مگر میجر ڈومو چلا جاتا ہے) (ایک پادری ایک چھوٹا سا مجسمہ ابوالہول کا لئے ہوئے آتا ہے - پادری میز کے پاس آکر مجسمے کو بیچ میں رکھ دیتا ہے تینوں آدمی اس سے متاثر نہیں ہوتے - تاہم وہ کسی قدر تحیرزدہ ہو جاتے ہیں -)

سیزر:- یہ کیا خرافات ہے؟

کلیوپیٹرا:- تم کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا - یہ خرافات نہیں ہے - اس کو جائز طریقہ سے انجام دینے اور اس کو خوش کرنے کے لئے ہمیں کسی چیز کی قربانی کرنا چاہئے - لیکن میرا خیال ہے اگر اسے صرف تھوڑی سی شراب دے دی جائے تو کافی ہوگی -

اپالوڈورس:- (اپنا سر پلٹا کر دا کی طرف دیکھتا ہے -) ہم اپنے باز نما سر والے دوست سے کیوں نہ پوچھیں!

کلیوپیٹرا:- (بے چینی سے) اُف - وہ تمھاری باتیں سُنکر غصہ ہو جائے گا -

روفیو:- میرا خیال ہے کہ نیل کا منبع اس کے وطن سے باہر ہے -

کلیوپیٹرا:- نہیں میں اپنے چھوٹے ابوالہول کے سوا اور کسی کو اس کا نام نہ رکھنے دوں گی - کیونکہ جب سیزر آکر مجھ سے ملا تو میں اسی جگہ پر تھی - (وہ سیزر کو

دیکھ کر پادری کی طرف پلٹتی ہے) جاؤ میں خود پادری ہوں۔ اور تمھاری خدمت میں خود انجام دونگی۔

(پادری سر تعظیم خم کرکے چلا جاتا ہے۔)

اب ہم سب کو مل کر نیل سے درخواست کرنی چاہئے شاید وہ میز پر کھٹکھٹائے گا۔

سیزر:- کیا۔ میز کی کھٹ کھٹ؟ کیا اس جمہوریت کی آٹھویں صدی میں بھی واہمہ پرستی جاری ہے؟

کلیوپیٹرا:- واہمہ پرستی نہیں ہے۔ ہمارے پادری میز و تسے سیکڑوں باتیں دریافت کرتے ہیں۔ اپالوڈورس کیا یہ سچ نہیں ہے؟

اپالوڈورس:- ہاں۔ ہاں۔ میں خود اس کا معتقد ہوں جب کلیوپیٹرا پادری ہے تو اپالوڈورس اسکا شاگرد ہے حلف اٹھانے کی تحریک کرو۔

کلیوپیٹرا:- تم کو میرے ساتھ کہنا چاہئے۔ "باپ نیل۔ اپنی آواز ہم کو سناؤ۔"

چاروں مل کر:- (مجسمہ کے سامنے اپنے اپنے گلاس اٹھاکر) باپ نیل اپنی آواز ہم کو سناؤ۔ (ایک انسان کی انتہائی درد و کرب میں نکلی ہوئی آواز جواب دیتی ہے۔ سب خوفزدہ ہوکر اپنے اپنے جام رکھدیتے ہیں۔ اور سننے لگتے ہیں۔ سیزر کلیوپیٹرا پر نظر ڈالتا ہے۔ اور اُسے دیوتا کے سامنے اپنی شراب انتہائی تشکر آمیز نگاہوں سے انڈیلتا ہوا پاتا ہے اپالوڈورس اچھلتا ہوا چھت کے کنارے آواز سننے کو جاتا ہے)

سیزر:- (کلیوپیٹرا کو گھور کر) یہ کیا تھا؟

کلیوپیٹرا:- کچھ نہیں۔ شاید کسی غلام کو مار رہے ہیں

روفیو:- میں قسم کھاکر کہتا ہوں کہ اس کے اندر ایک شخص چاقو لئے ہوئے موجود ہے۔

سیزر:- (اچھلتے ہوئے) خون!

اپالوڈورس:- (پیچھے اپنا ہاتھ خاموش رہنے کو ہلاتا ہے۔) اوہ۔ خاموش۔ کیا تم لوگوں نے سنا؟

سیزر:- دوسری آواز؟

اپالوڈورس:- (میز کے پاس واپس آکر) نہیں میں خیال کرتا ہوں کہ ساحل پر کوئی چیز گری ہے۔

سیزر:- (بہت خوفزدہ ہوکر) میز سے ہٹ کر ستونوں کے قریب آتا ہے روفیو اس کی بائیں جانب ہتا ہے اور اپالو دوسری جانب۔

کلیوپیٹرا:- (اب بھی اپنی پہلی جگہ میز پر بیٹھے ہوئے) سیزر کیا تم مجھے چھوڑ دوگے؟ اپالوڈورس کیا تم جاتے ہو؟

سیزر:- اپالوڈورس صحن میں جاکر دیکھو کیا ہوا؟

(اپالوڈورس سر کو جنبش دے کر چلا جاتا ہے جس سیڑھی سے روفیو ادھر چڑھا تھا)

کلیوپیٹرا:- تمھارے سپاہیوں نے کسی کو مار ڈالا۔ خیر تو اس میں کیا حرج ہے؟

(ساحل کی طرف سے ایک شور سنائی دیتا ہے۔)

(سیزر اپالوڈورس کے ساتھ جانا چاہتا ہے کہ روفیو ایک ہاتھ سے اس کا کندھا پکڑکر روک لیتا ہے۔ اس اثنا میں فتاتا چھت کے آخری کنارے سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی آتی ہے۔ اسکی آنکھوں میں ایک مضمحل آسودگی جھلکتی ہے سیزر سمجھتا ہے کہ شاید وہ شراب زیادہ پی گئی ہے)

روفیو:- (آہستہ سے) ان دونوں نے کوئی سازش کی ہے۔

فتاتا:۔ ملکہ پھر اپنے غلام کے چہرہ کو دیکھ رہی ہے۔

(کلیوپیٹرا ایک لمحہ کے لئے تعریف کن انداز اس کے قتل کے ارادے کے اظہار کو محسوس کرتی ہے پھر وہ اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن میں حائل کر لیتی ہے اسے دیوانہ وار پیار کرتی ہے اور تمام زیور توڑ کر اس کے سر پر لاد دیتی ہے ——— دونوں آدمی اس منظر کی طرف سے پلٹ کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں۔ فتاتا آہستہ آہستہ قربانگاہ کے پاس پہنچتی ہے۔ دا کے سامنے جھک جاتی ہے اور اسی حالت میں عبادت کرتی ہے سیزر روفیو کو ستون کے پاس چھوڑ کر کلیوپیٹرا کے پاس جاتا ہے)

سیزر:۔ (پرجستجو انداز سے) کلیوپیٹرا کیا ہوا؟

کلیوپیٹرا:۔ (مبہوت ہو کر) عزیز سیزر کچھ نہیں (وہ اس کے پاس محبت آمیز انداز سے جاتی ہے) پیارے سیزر کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟ تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟ میں نے تمام وقت تمہارے ساتھ گذارا ہے۔ مجھے کیا معلوم کیا ہوا۔؟

سیزر:۔ (موثر انداز سے) یہ سچ ہے۔

کلیوپیٹرا:۔ (بعد اطمینان سے اس سے محبت کا اظہار کرتی ہے) درحقیقت یہ سچ ہے۔ (وہ اس کے اظہار محبت کا جواب نہیں دیتا) روفیو تم بھی جانتے ہو کہ یہ سچ ہے۔

(شور یکایک بلند ہو کر غائب ہو جاتا ہے)

روفیو:۔ مجھے اب معلوم ہو جائیگا۔ (وہ لمبے لمبے ڈگ بڑھا کر قربان گاہ کی طرف جاتا ہے اور فتاتا کے شانے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔) خاتون محترم مجھے آپ کی ضرورت ہے۔

فتاتا:۔ (اٹھتے ہوئے) میری جگہ ملکہ کے پاس ہے۔

کلیوپیٹرا:۔ اس نے کوئی نقصان نہیں پہونچایا روفیو۔

سیزر:۔ (روفیو سے) اس کو ٹھہرنے دو۔

روفیو:۔ (قربانگاہ پر بیٹھ کر) بہت خوب تو میری جگہ بھی یہیں ہے۔ اور اب تم لوگ خود دیکھ سکتے ہو کہ کیا واقعہ ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں ایک طوفان بے تمیزی برپا ہے۔

سیزر:۔ (متین اضطراب سے) روفیو۔ اطاعت کے لئے ایک وقت ہوتا ہے۔

روفیو:۔ اور استقلال کا بھی ایک موقع ہوتا ہے

(وہ اپنے دونوں ہاتھ باندھ لیتا ہے۔)

سیزر:۔ (کلیوپیٹرا سے) اس کو باہر جانے کا حکم دو۔

کلیوپیٹرا:۔ ہاں میں حکم دوں گی۔ سیزر میں ہمیشہ تمہارے حکم کی تعمیل کروں گی۔ کیونکہ مجھے تم سے محبت ہے فتاتا باہر چلی جاؤ۔

فتاتا:۔ ملکہ کا حکم میری مرضی ہے۔ میں ملکہ کے بلانے کے لئے قریب ہی ٹھہرتی ہوں (وہ را کے پاس سے گذر کر جاتی ہے)

روفیو:۔ (ساتھ ساتھ) سیزر یہ یاد رکھو کہ تمہاری جان کا محافظ بھی قریب ٹھہرا ہوا ہے۔

(وہ اس کے ساتھ چلا جاتا ہے)

کلیوپیٹرا:۔ (سیزر کی اس اطاعت کا احساس کرتے ہوئے جو وہ روفیو کی کرتا ہے اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور ستونوں کے درمیان بیچ پر بیٹھ جاتی ہے)

کلیوپیٹرا:۔ تم روفیو کو کیوں اجازت دیتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ اس طرح پیش آئے۔ تم کو

اُسے بتانا چاہئے کہ اسکا کیا مرتبہ ہے ؟

سیزر: - اس کو میرا دشمن بنا سکھاؤ - تاکہ وہ اپنے خیالات مجھ سے چھپائے جیسا کہ تم اس وقت چھپا رہی ہو -

کلیوپیٹرا: - (اس کا خوف پھر عود کر آتا ہے) سیزر تم یہ کیوں کہتے ہو - درحقیقت میں تم سے کچھ نہیں چھپا رہی ہوں - تم میرے ساتھ اس طرح پیش آنے میں غلطی پر ہو - (وہ رونے لگتی ہے) میں صرف ایک بچہ ہوں - اور تمھارا دل پتھر کا ہوا جاتا ہے محض اس خیال سے کہ کوئی شخص مار ڈالا گیا ہے - میں اس کو برداشت نہیں کر سکتی - (وہ ارادتاً رونے لگتی ہے - وہ اس کو انتہائی غمگین اور بے پروہ انداز سے دیکھتا ہے وہ پھر ادھر دیکھتی ہے اور یہ معلوم کرکے کہ اسے ترس نہیں آیا - یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ وہ اپنے جذبات سے کشمکش کرکے ان پر قابو پانا چاہتی ہے اٹھ بیٹھتی ہے) ہاں مجھے معلوم ہے کہ تم آنسوؤں سے نفرت کرتے ہو - اب تم کو ان سے صدمہ نہ پہونچے گا - میں جانتی ہوں کہ تم غصہ میں ہو - صرف رنجیدہ ہو، میں اس قدر بے وقوف ہوں کہ جب تم مجھ سے سرد مہری سے گفتگو کرتے ہو تو میں اس سے پریشان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی - دراصل تم سچائی پر ہو - یہ خیال کرنا کہ کوئی مارا گیا یا کسی کو صدمہ پہونچا - بہت خوفناک اور تکلیف دہ ہے - اور میرا خیال ہے کہ حقیقت میں کوئی خطرناک ——— (اس کی آواز نفرت کا لہجہ اختیار کرکے حلق میں رک جاتی ہے)

سیزر: - تم کو کس نے خوفزدہ کر دیا - ؟ تم نے کیا کیا ہے ؟ (ساحل پر ایک بگل کی آواز آتی ہے) اہا یہ آواز جواب کی طرح معلوم ہوتی ہے -

کلیوپیٹرا: - (تھرتھراتی ہوئی بیچ پر گر پڑتی ہے اور ہاتھ سے منہ چھپا لیتی ہے) میں نے تم کو دھوکہ نہیں دیا - سیزر میں قسم کھا کر کہتی ہوں -

سیزر: - مجھے معلوم ہے - میں نے تم پر اعتماد نہیں کیا - (وہ اس کی طرف سے پلٹ کر جانے کا ارادہ کرتا ہے کہ اپالو اور برٹینس پتھیس کو گھسیٹتے ہوئے لاتے ہیں روفیو ساتھ آتا ہے سیزر کانپ اٹھتا ہے) پھر پمپی کا قاتل !

روفیو: - میرا خیال ہے کہ سارا شہر پاگل ہو گیا ہے وہ محل کو مسمار کرنے اور ہم کو بھگا دینے پر تلا ہوا ہے میں نے مجمع کو صحن سے باہر کرتے وقت اس کو پکڑا ہے -

سیزر: - اس کو چھوڑ دو (وہ اس کے بازو چھوڑ دیتے ہیں) پتھیس شہریوں کو کس بات پر غصہ ہے ؟

لوسیس: - تم نے کیا سوچا ہے سیزر ؟ پوتھینس انکا بے حد عزیز رہنما تھا -

سیزر: - پوتھینس کو کیا ہوا ؟ میں نے اسے ابھی رہا کر دیا - ادھا گھنٹہ بھی نہ گذرا ہوگا - کیا انھوں نے اسے باہر نہیں جانے دیا ؟

لوسیس: - ہاں زمین سے ساٹھ فیٹ بلند گیلری کی کمان میں وہ مردہ ٹھہرا ہے اور اس کی پسلیوں میں ایک چاقو تین فیٹ لمبا پیوست ہے - وہ پمپی کی طرح مردہ ہے -

سیزر: - (بے حد خوفزدہ ہو کر) قتل کر ڈالا گیا - ہمارا قیدی - ہمارا مہمان (وہ برہم انداز سے روفیو کی طرف دیکھتا ہے) روفیو ———

روفیو:۔ (سوال پر غور کرتے ہوئے موقرانہ انداز سے) جس نے ایسا کیا وہ ایک عقلمند اور تمہارا دوست تھا۔ (کلیوپیٹرا بے حد نڈر ہو جاتی ہے) لیکن ہم میں سے کسی نے اس میں حصّہ نہیں لیا۔ اس لئے مجھ پر غصّہ ہونا بیکار ہے (سیزر پلٹ کر کلیوپیٹرا کو دیکھتا ہے)

کلیوپیٹرا:۔ (اٹھ کر تحکمانہ انداز سے) وہ ملکۂ مصر کے حکم سے مارا گیا۔ میں سیزر کی طرح خواب دیکھنے والی نہیں ہوں۔ جو ہر غلام کو اپنی توہین کرنے کی اجازت دوں۔ روفیو نے ابھی بیان کیا کہ میں نے اچھا کام کیا۔ اب دوسرے حاضرین بھی اس کا فیصلہ کریں گے۔ (وہ دوسروں کی طرف پلٹتی ہے) اس پوتھینس نے مجھ سے اس امر کی خواہش کی کہ میں اس کے ساتھ سازش کر کے سیزر کو ٹالمی اور اچیلس کے حوالے کر دوں۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس نے مجھے کوسا اور پھر سیزر کے پاس آیا کہ تنہائی میں اس کو سمجھا کر اپنی اس مکاری کو میرے سر تھوپے میں نے اس کو اس دغابازی کو عملی جامہ پہناتے وقت پکڑ لیا۔ اس نے میری توہین کی یعنی ملکۂ مصر کی۔ میرے منہ پر۔ سیزر مجھ سے انتقام نہ لے گا۔ اس نے اس سے گفتگو کی اور پھر اس کو رہا کر دیا۔ کیا میں خود اپنا انتقام لینے میں حق بجانب نہ تھی؟ بولو۔ لوسیس۔!

لوسیس:۔ میں اس کو غلط نہیں کہہ سکتا۔ لیکن سیزر اس کے معاوضہ میں تمہارا شکریہ ادا نہ کرے گا۔

کلیوپیٹرا:۔ بولو۔ اپالوڈورس۔ کیا میں غلطی پر تھی؟

اپالوڈورس:۔ میں صرف ایک ہی لفظ الزام کا پاتا ہوں اور بے حد خوبصورت۔ تم نے مجھے اپنا ایک سردار کہہ کر مخاطب کیا ہوتا۔ اور میں کشتی میں اس غیبت کرنے والے کو قتل کر ڈالتا۔

کلیوپیٹرا:۔ (مطمئن انداز سے) اب میں تمہارے غلام سے بھی پوچھنا چاہتی ہوں۔ سیزر! بری ٹینس بول کیا میں غلطی پر تھی؟

بری ٹینس:۔ اگر مکاری، جھوٹ اور بیوفائی کی کوئی سزا نہ دی جاتی تو سوسائٹی جنگلی درندوں کی ایک تماشہ گاہ بنجاتی۔ جہاں وہ ایک دوسرے کو پھاڑ کھاتے۔ سیزر غلطی پر ہے۔

سیزر:۔ (اضطراب آفریں خاموشی سے) تو معلوم ہوتا ہے کہ فیصلہ میرے خلاف ہے۔

کلیوپیٹرا:۔ (بہت زور دیکر) سنو سیزر! اگر اسکندریہ میں ایک بھی ایسا آدمی مل جائے جو یہ کہے کہ میں غلطی پر ہوں تو میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ محل کے پھاٹک پر اپنے غلاموں کے ہاتھوں سے سولی پر لٹک جاؤنگی۔

سیزر:۔ اگر ساری دنیا میں ایک آدمی، ابھی یا کبھی یہ جاننے کے لئے مل سکے کہ تم نے غلطی کی تو اس آدمی کو یا تو میری طرح ساری دنیا کو فتح کرنا پڑیگا یا اس کے ذریعہ سولی پر چڑھ جائے گا۔ (سڑکوں کا شور پھر سنائی دیتا ہے) تم سنتی ہو۔ یہ دروازے پر کھٹکھٹانے والے بھی انتقام اور قتل پر یقین کرتے ہیں۔ تم نے ان کے رہنما کو قتل کر ڈالا تو یہ بھی جائز معلوم ہوتا ہے کہ وہ تم کو قتل کریں ——— اگر تم کو اس میں شک ہو تو اپنے چاروں مشیروں سے دریافت کر لو

اور اس سچائی کے نام پر۔ (انتہائی نفرت سے زور دیتا ہے) کیا میں ان سب کو اپنی ملکہ کے قتل کرنے پر قتل نہ کروں گا۔ اور اس کے عوض یہاں کے باشندے مجھے اس لئے قتل کر ڈالیں گے کہ میں نے ان کے وطن کو لوٹا اس پر حملہ کیا۔ اور کیا روم ان قاتلوں کو قتل کئے بغیر چین سے بیٹھے گا؟ محض دنیا پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ روم کس طرح اپنی عزت اور فرزندوں کا انتقام لیتا ہے۔ اور اس لئے تاریخ کی انتہا پر۔ قتل کی نسل، عزت، سچائی اور امن کے نام سے بڑھتی رہے گی۔ یہاں تک کہ دیوتا ان خون آشامیوں سے بیزار ہو جائیں اور ایک ایسی قوم پیدا کریں۔ جو سمجھ سکتی ہے۔

(خوفناک شور۔ کلیوپیٹرا خوف سے زرد پڑ جاتی ہے) وہ لوگ سنیں جن کی توہین نہ ہونی چاہئے۔ ان کے پاس جاؤ۔ تاکہ الفاظ سمجھ میں آسکیں۔ تم ان کو بوتھینس کے الفاظ سے زیادہ دلخراش اور روح فرسا پاؤ گے۔ (آہستہ آہستہ ایک وقار کے ساتھ اٹھتے ہوئے) اب ملکۂ مصر کو انتقام کا حکم سنانے دو۔ اور اپنی محافظت کی طیاری شروع کرنے دو۔ کیونکہ اس نے سیزر کو قبول نہیں کیا۔

(وہ جانے کو پلٹتا ہے)

کلیوپیٹرا:۔ (خوفزدہ ہو کر اس کے پاس دوڑ کر گھٹنوں پر گرتے ہوئے) سیزر مجھے برباد نہ کرو۔ اور اس محل کو بچاؤ۔

سیزر:۔ تم نے حیات و موت کی طاقتیں خود لے لی ہیں۔ میں صرف ایک خواب دیکھنے والا ہوں۔

کلیوپیٹرا:۔ لیکن وہ مجھے مار ڈالیں گے۔

سیزر:۔ اور کیوں نہ ماریں؟

کلیوپیٹرا:۔ رحم ——

سیزر:۔ رحم۔ کیا یہ اس قدر جلد اس حالت پر پہونچ گیا ہے کہ تم کو سوائے رحم کے اور کچھ نہیں بچا سکتا۔ کیا اس نے بوتھینس کو بچایا؟

(وہ اپنے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے اٹھتی ہے اور پھر نہایت مایوسانہ انداز سے بنچ پر جا بیٹھتی ہے۔ اپالوڈورس اپنی ہمدردی کا اظہار کرنے کے لئے اس کی بنچ کے پیچھے جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اب آسمان کا رنگ بدلتا ہے اور وہ بہت جلد تاریکی ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ستون اور مجسمے دھندلے نظر آنے لگتے ہیں)

روفیو:۔ وعظ کافی ہو چکا۔ دشمن پھاٹک پر آگیا ہے۔

سیزر:۔ (اس کی طرف پلٹ کر غصہ سے) ہاں۔ اور اتنے مہینوں تک اس کو کس بات نے دروازہ پر روک رکھا تھا یہ میری بیوقوفی تھی، جیسا تم کہتے ہو۔ یا تمہاری دانائی؟ اس مصری خون کے سمندر میں کس کے ہاتھوں نے تم لوگوں کے سروں کو موجوں سے اوپر رکھا؟ (کلیوپیٹرا سے) اور پھر بھی یہ حالت ہے کہ سیزر ایک شخص کو حکم دیتا ہے۔ "دوست تم آزاد ہو اور آزادانہ جا سکتے ہو" اور تم، جو اب میری تلوار پکڑ کر اپنی ننھی سی جان کی حفاظت کے لئے کہہ رہی ہو یہ جرأت کرو۔ کہ چھپ کر نکل جاؤ۔ اور اس کی پیٹھ پر

چاقو سے حملہ کرو۔ ؟ اور تم او سپاہیو، شریف اور ایماندار ملازمو۔ اس قتل کی تعریف کرتے ہو اور اس کی داد دیتے ہو اور کہتے ہو کہ "سیزر غلطی پر ہے۔" دیوتاؤں کی خواہش ہے کہ میں اپنا ہاتھ کھول دوں اور تم سب کو طوفان میں ڈوب جانے دوں۔

کلیوپیٹرا:۔ (ایک مکارانہ توجہ کیساتھ) لیکن سیزر اگر تم ایسا کرو گے تو اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارو گے۔

(سیزر کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگتے ہیں)

روفیو:۔ (بیحد مبہوت ہو کر) جیوپیٹر کی قسم یہی وہ لفظ ہیں جو سیزر کو مجبور کریگا کہ وہ یہاں سے نکلکر شہر میں چلا جائے اور ہم لوگوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دئے جانے کے لئے یہاں چھوڑ دے (سیزر سے) کیا تم ہمکو محض اسلئے چھوڑ دو گے کہ ہم بیوقوف ہیں ہمیں قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ میں فطرتاً اسکو اسی خوبی سے انجام دیتا ہوں جیسے ایک کتا بلی کو مارتا ہے۔ ہم سب تمہاری پاپوش کے پاس پڑے رہنے والے کتے ہیں۔ لیکن ہم ہمیشہ سے آپ کے وفادار رہے ہیں۔

سیزر:۔ افسوس۔ روفیو۔ میرے لڑکے میرے لڑکے ہم سب کتوں کی طرح سڑک پر مرنے والے ہیں۔

اپالوڈورس:۔ (اپنی جگہ سے) سیزر تم جو کچھ کہتے ہو اس کو صحیح ہونا چاہئے۔ تاہم میں کلیوپیٹرا ہی کا طرفدار ہوں۔ اگر ہمکو مرنا ہی ہے تو اسے کسی آدمی کی محبت یا کسی آدمی کے بازوؤں کی طاقت کی ضرورت نہ ہو گی۔

کلیوپیٹرا:۔ (روکر) لیکن میں مرنا نہیں چاہتی۔

سیزر:۔ (رنجیدگی سے) او وہ کم ظرف۔ کم ظرف۔

لوسیس:۔ (کلیوپیٹرا اور سیزر کے بیچ میں آکر) سنو سیزر۔ تم حقیر اور ذلیل کہہ سکتے ہو۔ لیکن اس سے میرا مفہوم یہ بھی ہے کہ جسقدر زیادہ ممکن ہو میں زندہ رہوں۔

سیزر:۔ اچھا۔ میرے دوست تو معلوم ہوتا ہے تم سیزر سے زیادہ زندہ رہو گے۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ میں نے کوئی جادو کیا ہے جس نے تمھاری فوج اور سارے شہر کو اتنے دنوں تک جیسے کہ ہی پر روک رکھا۔ کل ان کو مجھ سے کیا عداوت تھی کہ وہ میرے خلاف کھڑے ہو کر اپنی جان خطرہ میں ڈالدیتے۔ لیکن آج ہم نے ان کے رہنما کو مارکر ان کے سامنے ڈال دیا۔ اور اب ہر شخص اس خون کے نشیمن کو صاف کرنے پر آمادہ ہے۔ کیونکہ ہم ایسے ہی ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ تو اب ہمت سے کام لو۔ اور اپنی تلواروں پر باڑھ رکھو پمپئی کا سر جدا ہو چکا ہے، اور سیزر کا سر بھی عمر طبعی کو پہنچ گیا ہے۔ ؟

سیزر:۔ (شکست کے انداز سے) وہ جس نے کبھی کوئی توقع نہیں کی، کبھی ناامید نہیں ہو سکتا۔ سیزر، عیش اور غم کے وقت صرف اپنی قسمت کی تحریر ہی پر نظر رکھتا ہے۔

لوسیس:۔ قسمت پر نظر رکھتا ہے۔ اور وہ سیزر پر اسی طرح مسکرائیگی جیسی ہمیشہ مسکراتی رہی ہے۔

سیزر:۔ (غیر ارادی سختی سے) کیا تم میری ہمت افزائی کا ارادہ رکھتے ہو؟

لوسیس:۔ میں آپکے سامنے اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔ میری ضرورت ہو تو میں اپنی جگہ بدل سکتا ہوں۔

(سیزر یکایک زمین پر آکر، اس کو غور سے دیکھتا ہے اور یہ نتیجہ نکالتے

ہوئے کہ اس پیشکش کے پردہ میں کوئی راز ہے) کیا اس جگہ ؟

لوسیس:- ہاں اسی جگہ!

روفیو:- کیا تمھارا خیال ہے کہ سیزر اس قدر پاگل ہے کہ وہ تم پر اعتماد کرے گا۔

لوسیس:- میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھ پر اسوقت تک بھروسہ نہ کرے جبتک فتحمند نہ ہو جائے۔ میں صرف اپنی زندگی کے لئے درخواست کرتا ہوں اور سیزر کی فوج کی کمان کرنے کی۔ اور چونکہ سیزر بہت صاف سودا کرتا ہے اس لئے میں بیعانہ بھی ادا کر دوں گا۔

سیزر:- بیعانہ ادا کر دے گا۔ کیسے ؟

لوسیس:- ایک خوشخبری سے۔

روفیو:- کیا خوشخبری ؟

سیزر:- کیا خبر۔ کیا خبر۔ کیا میرے لڑکے روفیو تم نے کہا! کمک آگئی ہے۔ اور کیا خبریں ہم سے متعلق ہیں۔ کیا لوسیس ایسا نہیں ہے۔ میتھری ڈیٹس آرہا ہے۔

لوسیس:- اس نے پلوسیم پر قبضہ کر لیا ہے

سیزر:- (مسرت سے) لوسیس سپٹمیس اس وقت سے تم میرے ایک سردار ہو۔ روفیو۔ مصریوں نے اپنے ہر ایک سپاہی کو میتھری ڈیٹس کو روکنے کے لئے نیل پر بھیجا ہو گا۔ اب سڑکوں پر آدمیوں کے ہجوم کے سوا اور کچھ نہیں ہے

لوسیس:- بالکل درست ہی میتھری ڈیٹس بڑی سڑک سے ممفیس کیطرف جا رہا ہے تاکہ دہانے کے ادہر سے دریا پار کرے۔ اچیلس وہاں اس سے مقابلہ کرے گا۔

سیزر:- اچیلس سیزر سے وہاں لڑیگا۔ دیکھو روفیو۔

(وہ میز کیطرف دوڑ کر میز پوش اٹھا لیتا ہے اور انگلی شراب میں ڈبا کر اسپر ایک نقشہ بناتا ہے لوسیس اور روفیو اس کے پاس آکر دیکھنے لگتے ہیں۔ تقریباً روشنی غائب ہو جاتی ہے) یہاں محل ہے (نقشہ پر انگلی سے دکھا کر) یہاں میدان ہے۔ تم (روفیو) بیس آدمی لو اور اس سڑک (نقشہ پر دکھا کر) سے جانیکا بہانہ کرو۔ اور جب وہ تم پر سنگباری کریں۔ تو اسطرف سے فوج کے پار لے جاؤ۔ میرے راستے ٹھیک ہیں۔ کیا ٹھیک ہیں لوسیس ؟

لوسیس:- ہاں یہ انجیر کا بازار ہے۔

سیزر:- (اسکو سننے کے لئے بہت گھبراہٹ سے) ہاں ہم نے ان کو یہاں پہونچ کر دیکھا تھا۔ اچھا (وہ کپڑا میز پر پھینک دیتا ہے اور پھر ستونوں میں آتا ہے) جاؤ بری ٹینس ٹیرونس سے کہو کہ نصف ساعت میں مغربی جھیلوں کے لئے ہماری فوجیں جہاز پر قبضہ کر لیں۔ میرے گھوڑے اور زرہ بکتر لاؤ (بری ٹینس جاتا ہے) باقی کے ساتھ میں جھیل کیطرف روانہ ہو جاؤں گا۔ اور میتھری ڈیٹس سے ملنے کیلئے نیل تک پہونچ جاؤں گا۔ جاؤ لیوسیس یہ پیغام پہنچا دو۔

(لیوسیس بری ٹینس کے بعد خود بھی تیزی سے چلا جاتا ہے)

اپالوڈورس لاؤ اپنی تلوار مجھے دو اور اس مہم میں میرا دایاں بازو بنکر مجھے مدد دو۔

اپالوڈورس:- بسر و چشم۔

سیزر:- (اس کا ہاتھ پکڑ کر) کیا تم کام کرنیکو تیار ہو ؟

اپالوڈورس:- ہاں فن کے لئے تیار ہوں۔ فن سپہ گری کے لئے (وہ لیوسیس کے پیچھے خود بھی تیزی سے جاتا ہے اور کلیوپیٹرا کو یک لخت بھول جاتا ہے)

روفیو:۔ آؤ۔ یہ ایک قسم کا شغل ہے۔

سیزر:۔ (مسرت سے) کیا یہ نہیں ہے میرے لڑکے؟ (وہ تالی بجاتا ہے۔ غلام میز کیطرف آتے ہیں) اب ان فضولیات کی ضرورت نہیں۔ جاؤ یہ تمام چیزیں لیکر یہاں سے چلے جاؤ۔ میری نظروں سے ان کو جلد دور کرو۔ (غلام میز کو ہٹانے لگتے ہیں اور پردے ستونوں کو ڈھانکتے ہوئے کھینچ لئے جاتے ہیں) روفیو۔ تم سڑکوں کے متعلق اچھی طرح سب جانتے ہو؟

روفیو:۔ جی ہاں۔ مجھے یقین ہے کہ میں بخوبی واقف ہوں میں ان سڑکوں پر ہر وقت جا سکتا ہوں۔

(بگل کی آواز نیچے صحن سے آتی ہے)

سیزر:۔ تو آؤ۔ اب ہمکو فوج سے گفتگو کرکے انکا دل بڑھانا چاہیئے۔ تم ساحل پر جاؤ میں صحن کیطرف جاتا ہوں۔ (وہ سیڑھی کی طرف جاتا ہے)

کلیوپیٹرا:۔ (اپنی جگہ سے اٹھکر جہاں وہ ابتک بالکل خاموش پڑی تھی اور کسی نے اس کی پروا نہ کی تھی سیزر کی طرف ڈرتے ڈرتے اپنے ہاتھ دراز کرتے ہوئے) سیزر

سیزر:۔ (پلٹ کر) ایہہ۔

کلیوپیٹرا:۔ کیا تم مجھے بھول گئے ہو؟

سیزر:۔ میں اس وقت مشغول ہوں۔ جب میں واپس آؤں گا تو تمہارے معاملات کا تصفیہ کیا جائیگا۔ خدا حافظ۔ اب صبر اور استقلال سے کام لو۔

(وہ بالکل بے اعتنائی اور انہماک کے انداز سے جاتا ہے وہ مٹھیاں بند کرکے اٹھتی ہے۔ اور اس کے چہرہ پر انتہائی غیظ و غضب کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔)

روفیو:۔ کھیل کھیلا جاتا ہے اور ہارا جاتا ہے کلیوپیٹرا اور عورت کو ہمیشہ بدترین حصہ ملتا ہے۔

کلیوپیٹرا:۔ (غصہ سے) جاؤ۔ اپنے آقا کے ساتھ جاؤ۔

روفیو:۔ (اسکے کان میں دوستانہ) پہلے ایک بات سنو۔ اپنے قاتل سے کہو کہ اگر پوتھینس مناسب طریقہ سے مارا جاتا یعنی گردن کے ذریعہ سے —— تو وہ اسقدر ہنگامہ نہ مچاتا۔ تمہارے آدمی نے اس کے کام کو تقویت دی۔

کلیوپیٹرا:۔ تمکو کیسے معلوم ہوا کہ وہ ایک آدمی تھا؟

روفیو:۔ (متحیر و پریشان ہوکر) تم نہیں تھیں۔ جب یہ واقعہ ظہور میں آیا تو تم ہمارے پاس تھیں (وہ انداز نفرت سے اسکی طرف سے اپنی پیٹھ پلٹا لیتی ہے۔ وہ اپنا سر ہلاتا ہے اور باہر جانے کیلئے پردہ کھینچ لیتا ہے اب یہ خوشگوار چاندنی کا وقت ہے، میز ہٹا دیگئی ہے۔ فضا تاروں اور چاند کی روشنی میں بھری ہے کی قربانگاہ پر مصروف عبادت نظر آتی ہے روفیو چونک پڑتا ہے۔ پھر پردہ دوبارہ آہستہ سے بند کر دیتا ہے۔ اور آہستہ سے کلیوپیٹرا کو مخاطب کرتا ہے) کیا وہ یہ تھی؟ اپنے ہاتھ سے؟

کلیوپیٹرا:۔ (دھمکاکر) جو بھی ہو۔ میرے دشمنوں کو چاہیئے کہ اس کی طرف سے خبردار رہیں۔

روفیو:۔ (دانت پیسکر اس کو دیکھتے ہوئے) کلیوپیٹرا میں اسکو دیکھوں گا۔ (وہ وعدہ کے استحکام کی خاطر اپنا سر ہلاتا ہے اور اپنی تلوار میان میں رکھتا ہوا پردہ سے باہر نکل جاتا ہے)

رومی سپاہی:۔ (نیچے صحن میں) سیزر زندہ باد۔ سیزر زندہ باد۔ (کلیوپیٹرا سنتی ہے پھر بڑا بگل بجتا ہے اور اس کے ساتھ اور بگلوں کی آوازیں آتی ہیں)

کلیوپیٹرا:- (اپنے ہاتھ مل کر پکارتے ہوئے) فتاتا - فتاتا - اندھیرا ہو گیا ہے اور میں تنہا ہوں میرے پاس آؤ (سکوت)

فتاتا (دور سے) فتاتا (سکوت) بے چین ہو کر وہ پردوں کی رسّی کھینچ لیتی ہے اور پردے علیحدہ ہو جاتے ہیں فتاتا، مردہ، سر تن سے جدا، را کی قربان گاہ پر پڑی ہوئی ہے - خون سفید پتھر پر بہہ رہا ہے -

ایکٹ پنجم

تہوار کا دن -

ٹھیک دوپہر - محل کے سامنے فوج آراستہ کھڑی ہوئی ہے - مشرقی ساحل پر سیزر کی فوجیں زرق برق لباس میں نظر آ رہی ہیں اور اس پل کے قریب کھڑی ہیں جہاں سے اپالوڈورس قالین لیکر اترا تھا - ایک دستہ محافظ گذرگاہ پر نگرانی کے لئے یہاں متعین ہے - جہاں سے ایک فرش سڑک پر بچھا دیا گیا ہے - جو محل کے سامنے مرکزی پھاٹک پر شمال کی جانب مڑ جاتا ہے - پھاٹک کی کشادہ سیڑھیاں کلیوپیٹرا کی سہیلیوں سے معمور ہیں جو نہایت چمکدار اور ریشمی اور رنگین لباس میں ملبوس ہیں - اور پھولوں کا ایک باغ معلوم ہوتی ہیں - سامنے کے حصے میں اسکے محافظ صف باندھے کھڑے ہیں - شمالی حصے میں رومی سپاہ استادہ ہے ان میں بلزنار، عجمی اور رسالدار، نہایت اچھے لباس پہنے ہوئے موجود ہیں - (اپالوڈورس شہریوں کے درمیان سے راستہ نکالتا ہوا آتا ہے اور رومی سپاہ کے پیچھے سے افسروں کو پکارتا ہے)

اپالوڈورس:- کیا میں گذر سکتا ہوں ؟

رسالدار:- جاؤ تسلی کے اپالوڈورس -

(سپاہی اُسے جانے کو راستہ دیتے ہیں)

بلزنار:- کیا سیزر قریب ہے ؟

اپالوڈورس:- ابھی نہیں - وہ ابھی بازار ہی میں ہے - میں سپاہیوں کا شور و غل زیادہ نہ سن سکتا تھا - ایک شخص نصف گھنٹہ تک فوجی جوش و خروش کا اظہار کرنیکے بعد سمندر کی ہوا میں سانس لینے کی خواہش کرتا ہے -

عجمی:- کہو کیا خبر لائے ؟ کیا اس نے پادریوں کو قتل کر ڈالا ہے ؟

اپالوڈورس:- نہیں - وہ اس حالت میں اُس سے بازار میں ملے کہ انکے سروں پر راکھ پڑی ہوئی تھی اور وہ اپنے دیوتاؤں کو ہاتھ میں لئے ہوئے تھے - انھوں نے اپنے دیوتا اسکے قدموں پر ڈالدیئے - ان دیوتاؤں میں قابل دید ایپس (Apis) تھا - جو سونے اور ہاتھی دانت کا ایک عجیب و غریب مجسمہ تھا - میری رائے سے اسنے اسکے معاوضہ میں بڑے پادری کو دو ٹیلنٹس دیئے

بلزنار:- (خوفزدہ ہو کر) ایپس - صرف دو ٹیلنٹ ہیں پھر بڑے پادری نے کیا کہا ؟

اپالوڈورس:- اسنے ایپس سے رحم و کرم کی درخواست کی -

بلزنار:- اب اسکی وجہ سے ملک میں قحط اور طوفان آئے گا -

عجمی:- اوہ - ایپس نے کیوں اچیلس سے سیزر کو مروا نہیں ڈالا - اپالوڈورس، جنگ کی کوئی تازہ خبر ؟

اپالوڈورس:- چھوٹا ٹالمی غرق کر دیا گیا -

بلزنار:- غرق کر دیا گیا - کیسے ؟

اپالوڈورس:- اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ - سیزر نے تین طرف سے ایک ہی وقت حملہ کیا - اور سب کو نیل میں بھگا دیا - ٹالمی کا بیڑا ڈوب گیا -

بلز نار:۔ یہ سیزر ایک عجیب الخلقت آدمی ہے! کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ جلد آئے گا؟

اپالوڈورس:۔ جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو وہ بہو دیوں کا قضیہ طے کر رہا تھا۔

(شمال کی جانب سے بگلوں کی آواز آتی ہے اور لوگوں میں ایک ہل چل مچ جاتی ہے۔ سیزر کے آنے کی اطلاع ہوتی ہے)

عجمی:۔ اس نے ان کا کام ختم کر دیا۔ وہ دیکھو آ رہا ہے۔

(وہ سری سپاہ کے سامنے اپنی جگہ پر دوڑتا ہے۔)

بلز نار:۔ (اسکے ساتھ) وہ دیکھو سیزر آ رہا ہے۔

(سپاہی بالکل سیدھے کھڑے ہو کر اپنا لباس درست کرتے ہیں۔

اپالوڈورس مصری سپاہ کی طرف جاتا ہے)

رسالدار:۔ (گذرگاہ کے محافظ کے پاس دوڑ کر) سیدھے کھڑے رہو۔ سیزر آ رہا ہے۔

(سیزر روفیو کے علاوہ اور اپنے تمام مصاحبوں کے ہمراہ آتا ہے۔ بری ٹینس ساتھ ساتھ ہے۔ سپاہی نعرۂ مسرت کے ساتھ اس کا استقبال کرتے ہیں۔)

سیزر:۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میرا جہاز میرا منتظر ہے۔ بس مصر کو خدا حافظ کہنے کا وقت آ گیا ہے۔ اور روفیو اب میرے جانے سے قبل اور کس کام کی تکمیل باقی رہ گئی ہے؟

روفیو:۔ (اسکی بائیں جانب سے) آپ نے ابھی اس صوبہ کے لئے کوئی رومی گورنر نہیں مقرر کیا۔

سیزر:۔ (اسکی طرف متحیرانہ انداز سے دیکھ کر انتہائی متانت سے) تم میری مدد کرنے والے اور مجھے اس مصیبت سے نجات دلانیوالے، اپیوٹیر کے فرزند اعظم پر کیا اس کے مشتری کی قسم

کے متعلق کیا کہتے ہو؟

روفیو:۔ کیوں، اس کی تم کو پھر ضرورت پڑیگی۔ کیا آپ نے یہ فراموش کر دیا کہ وطن واپس جاتے وقت آپکو راستے میں تین یا چار لشکروں سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔؟

سیزر:۔ بالکل درست۔ خیر مگر اب یہ بتاؤ کہ تم اپنے متعلق کیا کہتے ہو؟

روفیو:۔ میں! میں ایک گورنر۔ تم کیا خواب دیکھ رہے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ میں ایک آزاد شدہ آدمی کا بیٹا ہوں؟

سیزر:۔ (شفقت سے) کیا سیزر نے تم کو اپنا فرزند کہکر نہیں مخاطب کیا؟ (تمام حاضرین کو مخاطب کر کے) ایک منٹ کیلئے خاموش رہو اور جو کچھ میں کہتا ہوں غور سے سنو۔

رومی سپاہ:۔ سیزر کا حکم سنو۔

سیزر:۔ ایک رومی گورنر کی خدمات، صفات، مرتبہ اور نام سنو۔ خدمات کے لحاظ سے سیزر کی ڈھال، اوصاف کے لحاظ سے سیزر کا دوست۔ مرتبہ کے لحاظ سے ایک رومی سپاہی۔ (رومی سپاہ نعرۂ مسرت بلند کرتی ہے) اور نام نامی روفیو۔ (فوج دوبارہ نعرۂ مسرت بلند کرتی ہے)

روفیو:۔ (سیزر کے ہاتھ کو بوسہ دیکر) ہاں میں سیزر کی ڈھال ہوں۔ لیکن جب میں سیزر کے شانوں کے ساتھ نہ رہوں تو یہ ڈھال بیکار چیز ہو گی۔ خیر۔ مگر کوئی حرج نہیں (وہ اپنے آپ کو سنبھالتا ہے اور چلا جاتا ہے)

سیزر:۔ میرا برطانوی غلام کہاں ہے؟

بری ٹینس:۔ (سیزر کے دائیں ہاتھ کی طرف بڑھ کر) سیزر۔ وہ یہاں موجود ہے۔

سیزر:۔ مجھ سے یہ بتاؤ کہ تم سے کس نے کہا تھا کہ تم دلدل کی جنگ میں اپنے وطن کے جنگی نعرہ لگاتے ہوئے

کو ڈرپوک تم نے کسکو ناشائستہ ناموں سے مخاطب کیا؟

بری ٹینیس :- سیزر - میں آپ سے یہ التجا کرتا ہوں کہ جو الفاظ جوش و خروش کے عالم میں میری زبان سے نکل گئے ان کو معاف کیجئے۔

سیزر :- اور تم نے کسطرح نہر کو پار کیا جب تم تیر نہیں سکتے۔

بری ٹینیس :- میں نے آپکے گھوڑے کی دم پکڑ لی تھی۔

سیزر :- بری ٹینیس، یہ ایک غلام کے کام نہیں ہیں بلکہ ایک آزاد آدمی کے کارنامے ہیں۔

بری ٹینیس :- سیزر میں آزاد ہی پیدا ہوا تھا۔

سیزر :- لیکن انلوگوں نے تمکو سیزر کا غلام کہکر مخاطب کیا۔

بری ٹینیس :- صرف سیزر کا غلام ہی بنکر میں نے حقیقی آزادی حاصل کی ہے۔

سیزر :- (متاثر ہوکر) بہت خوب کہا۔ جیسا کہ میں ناشکر گزار ہوں۔ اسی لحاظ سے میں تمکو آزاد کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن اب ایک لاکھ ٹیلنٹ کے معاوضہ میں بھی تمکو جدا نہ کروں گا۔ (وہ دوستانہ طور پر اسکے شانے پر تھپتھپانے لگتا ہے۔ بری ٹینیس اس کا ہاتھ پکڑ کر چومتا ہے)

بلز نار :- (عجمی سے) یہ رومی جانتا ہے کہ آدمیوں کو کس طرح اسکی اطاعت کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔

عجمی :- ہاں۔ ایسے انکسار پسند آدمی جو کبھی اسکے خوفناک دشمن نہیں بن سکتے۔

بلز نار :- او چالاک - او ترشرو۔

سیزر :- (اپالوڈورس کو مصری صف میں دیکھ کر پکارتے ہوئے) اپالوڈورس - میں مصر کا آرٹ تمھاری نگرانی میں دیتا ہوں۔ یاد رکھو۔ روم کو آرٹ سے محبت ہے اور وہ اسکی ترقی کی خاطر بلا چون وچرا مدد دینے کو تیار ہے

اپالوڈورس :- سیزر میں سمجھتا ہوں۔ روم خود آرٹ پیدا نہ کریگا۔ لیکن جو دوسری قومیں پیدا کرینگی وہ ان کو خرید کر اپنے ساتھ لے جائیگا۔

سیزر :- کیا۔ روم آرٹ پیدا نہ کریگا۔ کیا صلح وامن کوئی آرٹ نہیں ہے؟ کیا جنگ ایک آرٹ نہیں ہے؟ کیا گورنمنٹ ایک آرٹ نہیں ہے؟ کیا تہذیب ایک آرٹ نہیں ہے؟ ہم تمکو یہ سب چیزیں صرف چند زیورات اور جواہرات کے عوض دے رہے ہیں۔ اور تم اس سودے سے بہت فائدے میں رہوگے۔ (پلٹ کر، روفیو) اور اب سوار ہونے سے پہلے کس کام کی تکمیل باقی رہگئی ہے؟ (کوشش کرکے یاد کرتے ہوئے) ہاں مجھے خیال پڑتا ہے کہ کوئی بات مجھے یاد نہیں آرہی ہے۔ وہ کیا ہو سکتی ہے؟ ہاں - ہاں، اسکو نامکمل ہی رہنا چاہئے۔ روفیو خدا حافظ۔

روفیو :- سیزر میں تم کو بغیر ڈھال کے روم جانے کی اجازت دینے پر مجبور ہوں۔ وہاں بہت سے دشمن ہیں۔

سیزر :- کوئی حرج نہیں ہے، میں واپس جاتے وقت اپنی زندگی کے فرائض ختم کر دونگا۔ اور پھر میں بہت دنوں تک زندہ رہونگا۔ اسکے علاوہ میں نے موت کے خیال کو ہمیشہ ناپسند کیا ہے۔ بہتر ہو تاکہ میں مار ڈالا جاؤں۔ خدا حافظ۔

روفیو :- (ایک آہ بھر کر ہاتھ اٹھاتے ہوئے) خدا حافظ۔

(وہ دونوں مصافحہ کرتے ہیں)

سیزر :- (اپالوڈورس کی طرف ہاتھ ہلاکر) خدا حافظ، اپالوڈورس اور تمام میرے دوست

[redacted]

(سیزر رجاد کیطرف بڑھتا ہے۔ کلیوپیٹرا۔ رنجیدہ اور سیاہ لباس میں ملبوث، بغیر کسی زیور یا جواہرات کے، محل سے اتر کر سیڑھیوں پر آتی ہے۔ سیزر اسکو اسوقت دیکھتا ہے جب وہ بولتی ہے) کیا کلیوپیٹرا کیلئے اس روانگی میں کوئی حصّہ نہیں ہے۔

سیزر:- (مسرت سے) آہ۔ میں سوچ رہا تھا کہ کچھ کرنا باقی ہے (روفیو سے) روفیو تم نے مجھے کس طرح اس بات کو بھول جانے دیا؟ (جلدی سے اسکی طرف دوڑ کر) اگر میں تم کو دیکھے بغیر چلا جاتا تو کبھی اپنی اس غلطی کو معاف نہ کرتا (وہ اس کے ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ اور سب کے بیچ میں لاتا ہے۔ .... اور اس کے کہنے کے مطابق کرتی ہے) کیا یہ سوگ میرے لئے ہے؟

کلیوپیٹرا:- نہیں۔

سیزر:- (افسوس سے) اوہ۔ یہ میری کس قدر کم فہمی تھی! یہ تمھارے بھائی کے لئے ہے!

کلیوپیٹرا:- نہیں!

سیزر:- پھر کس کے لئے؟

کلیوپیٹرا:- اپنے رومی گورنر سے دریافت کرو جسکو تم نے ہمارے لئے چھوڑ دیا ہے۔

سیزر:- روفیو؟

کلیوپیٹرا:- ہاں۔ روفیو (وہ نفرت سے اس کی طرف اشارہ کرتی ہے) وہ جو اب سیزر کے نام سے یہاں کا حاکم ہے۔ سیزر کی تقلید کرتا ہے۔ اور سیزر کے قوانین پر چلتا ہے۔

سیزر:- کلیوپیٹرا وہ اسطرح حکومت کریگا جیسی اس سے ممکن ہے اسنے اب یہ کام اپنے سر لیا ہے۔ اور اپنی منشا کے مطابق کرے گا۔

کلیوپیٹرا:- تمھاری منشا کے مطابق نہیں۔

سیزر:- (پریشان ہوکر) میری منشا سے کیا مطلب ہے؟

کلیوپیٹرا:- بغیر سزا کے۔ بغیر انتقام کے اور بغیر انصاف کے۔

سیزر:- (اعتراف کرتے ہوئے) ہاں۔ یہی ٹھیک راستہ ہے۔ سب سے زیادہ ممکن اور مناسب راستہ۔ (روفیو سے) روفیو اگر تم سے ہوسکتا ہے تو اس پر یقین کرو۔

روفیو:- کیوں۔ سیزر میں اس پر یقین کرتا ہوں۔ تم نے بہت پہلے مجھے اس پر یقین دلا دیا ہے۔ لیکن دیکھو۔ تم آج نومیڈیا کے سفر پر روانہ ہو رہے ہو۔ اب یہ بتاؤ کہ اگر وہاں ایک بھوکے شیر سے سامنا ہو تو تم اس کو اپنے نگل جانے پر سزا نہ دوگے؟

سیزر:- (تعجب سے سوچتے ہوئے کہ اس سے اسکا کیا مطلب ہے) نہیں۔

روفیو:- نہ اس سے ان لوگوں کے خون کا انتقام لوگے جن کو اس نے شکار کیا۔

سیزر:- نہیں۔

روفیو:- نہ اسکو اسکے جرم پر تنبیہ کروگے۔

سیزر:- نہیں۔

روفیو:- تو پھر تم اس سے اپنی جان بچانے کے لئے کون سا طریقہ استعمال کروگے۔؟

سیزر:- (تیزی سے) بندۂ خدا مار ڈالوں گا۔ جیسا کہ

وہ خود کرے گا۔ اس شیر کے استعارہ سے کیا مقصد ہے تمہارا ؟

روفیو :- کیوں ؟ کلیوپیٹرا کے پاس ایک شیرنی تھی جو اس کے حکم سے لوگوں کو قتل کر ڈالتی تھی۔ میں نے سوچا کہ کہیں وہ کسی روز تمکو قتل کر دینے کا حکم نہ دیدے۔ اگر میں سیزر کا شاگرد نہ ہوتا تو میں نے اس شیرنی کے ساتھ معلوم نہیں کیا کیا مخلصانہ باتیں کی ہوتیں۔ ! میں نے اس کو سزا دی ہوتی۔ میں نے اس سے پوتھنیس کا انتقام لیا ہوتا۔

سیزر :- (اعادہ کرکے) پوتھنیس !

روفیو :- (جاری رکھتے ہوئے) میں نے اس کا امتحان کیا ہوتا۔ لیکن ان تمام بیوقوفیوں کو میں نے پس پشت ڈال دیا۔ اور بغیر کسی افسوس کے اس کی گردن جدا کر دی۔ اور اسی وجہ سے کلیوپیٹرا تمہارے پاس ماتمی لباس میں آئی ہے

کلیوپیٹرا :- (غصہ سے) اس نے میری کنیز فتاتا کا خون کیا ہے۔ سیزر اس کا خون تمہاری گردن پر بھی ہے۔ اگر تم اس کو آزاد چھوڑ دو۔

سیزر :- (تیزی سے) بہتر ہے میری گردن پر ہو۔ کیونکہ یہ بہت اچھا ہوا۔ روفیو۔ اگر تم نے اپنے آپ کو منصف کی جگہ بیٹھا پایا ہوتا۔ اور اس عورت کو متعدد رسوم کے بعد کسی جلاد کو قتل کرنے کے لئے دیا ہوتا۔ کہ انصاف کے نام سے لوگوں کے سامنے اس کی گردن ماری جائے تو میں دوبارہ کبھی تمہارے ہاتھوں کو نہ چھوتا۔ لیکن یہ فطری قتل ہے۔ میں اس پر خوف زدہ نہیں ہوتا۔

(روفیو مطمئن ہوکر کلیوپیٹرا کی طرف دیکھ کر سر ہلاتا ہے کہ وہ اس بات کو ذہن نشین کر لے)

کلیوپیٹرا :- (طفلانہ ارادے سے) اب تمام دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ سیزر کس قدر غیر انصاف پسند اور دھوکہ باز ہے۔

سیزر :- (اس کا ہاتھ تعریفانہ پکڑ کر) آؤ مجھ سے ناراض نہ ہو۔ مجھے اس طوطاتیا کے لئے افسوس ہے۔ (وہ ہنستی ہے) او ہو۔ تم ہنس رہی ہو۔ کیا اس سے مطلب مکرر اتحاد ہے ؟

کلیوپیٹرا :- (ہنسی پر خود سے غصہ ہوکر) نہیں۔ نہیں نہیں۔ البتہ صرف تم کو طوطاتیا کہتے سن کر ہنسی آتی ہے۔

سیزر :- کیا ! اب بھی بچہ ہی ہو کلیوپیٹرا ؟ کیا میں نے تمکو ایک عورت نہیں بنا دیا۔

کلیوپیٹرا :- یہ تم ہو جو ایک بڑے بچے ہو۔ تم مجھے بیوقوف بنانا چاہتے ہو۔ کیونکہ تم سنجیدگی سے پیش نہیں آتے لیکن تم نے میرے ساتھ ناروا سلوک کیا ہے۔ اور میں تم کو معاف نہیں کرتی۔

سیزر :- مجھے خدا حافظ کہو۔

کلیوپیٹرا :- میں نہ کہوں گی۔

سیزر :- (خوشامد آ) میں روم سے ایک بہت اچھا تحفہ تم کو بھیجوں گا۔

کلیوپیٹرا:۔ (تمکنت سے) روم مجھے کیا دے سکتا ہے جو مصر میں موجود نہیں۔

اپالوڈورس:۔ سیزر یہ سچ ہے۔ اگر تحفہ یقینی خوبصورت ہوگا۔ تو وہ مجھے تمہارے لئے اسکندریہ میں خریدنا پڑیگا۔

سیزر:۔ میرے دوست تم ان خزانوں کو شاید بھول بیٹھے ہو جنکی وجہ سے روم مشہور ہے۔ تم انکو اسکندریہ میں نہیں خرید سکتے

اپالوڈورس:۔ سیزر وہ کیا ہیں۔

سیزر:۔ اسکے فرزند۔ او کلیوپیٹرا مجھے معاف کرو اور خدا حافظ کہو۔ اور میں تمکو ایک آدمی بھیجوں گا جو سر سے پاؤں تک روم کا شریف ترین انسان ہوگا۔ عمر نہیں کر تند اور دبلا اور سنگدل نہیں۔ اسکا سر گنجا نہ ہوگا۔ نہ اسکے کندھے جھکے ہونگے۔ بلکہ تیز اور چالاک۔ مضبوط اور نوجوان۔ دن بھر لڑنیوالا۔ اور رات بھر عیش اڑانے والا۔ کیا تم سیزر کے بدلے ایسا آدمی لوگی ؟

کلیوپیٹرا:۔ اس کا نام۔ اس کا نام۔

سیزر:۔ مارک انطونی ؟

روفیو:۔ خاتون تم اس سودے میں گھاٹے میں رہوگی۔ اگر انطونی کو سیزر کے بدلے لوگی۔

سیزر:۔ تو اب تم مطمئن ہو !

کلیوپیٹرا:۔ تم بھولوگے تو نہیں !

سیزر:۔ میں نہ بھولوں گا۔ خدا حافظ۔ مجھے توقع نہیں کہ اب ہم دونوں کی پھر کبھی ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ۔

(وہ اس کی پیشانی کا بوسہ لیتا ہے۔ وہ بہت متاثر ہوتی ہے سیزر جہاز پر سوار ہوجاتا ہے)

رومی سپاہی:۔ (جب وہ اپنا پاؤں جہاز پر رکھتا ہے۔) زندہ باد سیزر۔ خدا حافظ۔

(وہ جہاز پر پہونچ کر روفیو کو ہاتھ کے اشارہ سے جواب دیتا ہے۔)

اپالوڈورس:۔ (کلیوپیٹرا سے) عزیز ملکہ آنسو نہ بہاؤ۔ انھوں نے تمہارے غلام کا دل توڑ دیا۔ وہ چند روز کے بعد واپس جائے گا۔

کلیوپیٹرا:۔ مجھے اُمید نہیں ہے۔ لیکن میں رونا ضبط بھی نہیں کرسکتی۔

(وہ اپنا رومال سیزر کی طرف ہلاتی ہے۔ اور جہاز حرکت کرتا ہے)

رومی سپاہی:۔ (اپنی تلواریں ہوا میں بلند کرکے) سیزر زندہ باد

محشر عابدی

حضرت نیاز کے چند خطوط

(جو وقتاً فوقتاً انھوں نے اپنے احباب کو لکھے)

۲ر جنوری ۱۹۳۱ء

محترم۔ آپ کا افسانہ (یعنی آپ کا لکھا ہوا ———) نظر سے گزر چکا ہے لیکن دل و دماغ سے نہیں ——— بُرا نہ مانیئے تو عرض کروں کہ اسنے دل و دماغ کو اپنی طرف متوجہ کیا ہی نہیں ——— الفاظ پاکیزہ ہیں، زبان صاف ہے، خیالات بلند ہیں، موضوع پسندیدہ اور نتیجہ برمحل ہے، لیکن پھر بھی جب غور کرتا ہوں کہ یہ فسانہ کیونکر ہوا تو حیران رہجاتا ہوں ——— میں آپ کو بتاؤں کہ فسانہ کے ضروری اجزا کیا ہیں۔ ایک ——— کسی واقعہ میں بہ حیثیت واقعہ ہونے کے "واقعیت" کا پایا جانا۔ دوسرے نفسیاتی طور پر کسی کے کردار یا سیرت کو نمایاں کرنا۔ اسے انگریزی میں (Characterization) کہتے ہیں۔ تیسرے پلاٹ کو اتنے اور ایسے اجزا میں تقسیم کرنا کہ پڑھنے والے کو ایک سے زائد بار خود اپنے ذہن سے خلا پُر کرنا پڑے۔ چوتھے ہلکا سا مزاح خواہ وہ محض الفاظ سے پیدا کیا جائے یا مفہوم سے ——— اگر پلاٹ میں کوئی کیفیت رومان کی پیدا کر کے تھوڑا سا تمثیلی رنگ (Dramatic Touch) دیدیا گیا تو اور زیادہ دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔ کسی ایک مسئلہ پر مکالمہ میں صفحات کے صفحات رنگین کر دینا خلاف آئین فسانہ نگاری ہے ——— یہ درست ہے کہ بہترین فسانے وہی ہوتے ہیں جن میں ٹریجڈی کا عنصر غالب ہو، لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ دہلی کے ایک مشہور فسانہ نگار کی طرح اسکو ایک مستقل عذاب کی طرح سر پر نازل کیا جائے، کہ ایک خاندان کی تباہی دکھانے پر آئے تو باپ کو ہیضہ میں مبتلا کر کے فنا کر دیا، ماں کو طاعون سے ہلاک کر دیا، بھائی کو سانپ سے ڈسوا دیا اور بہن کو کنوئیں میں ڈھکیل کر ختم کر دیا۔

یورپ میں فسانہ نگاروں کے طبقے علٰحدہ علٰحدہ ہیں، بعض محض معاشرتی افسانے لکھتے ہیں، بعض نے جاسوسی و سراغرسانی کے واقعات لکھنا اپنا فن بنا لیا ہے، بعض صرف علمی مسائل پیش کرتے ہیں بعض نے تاریخ کو لے لیا ہے

بعض نے دلیکن بہت کم ، صرف عشق و محبت کو اختیار کیا ہے ـــــــــ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کا رجحان اس آخری قسم کی طرف زیادہ ہے ، سو بہتر ہے اسکو اختیار کیجئے ، لیکن خدا کے لئے ہیرو اور ہیروئن کو اسی دنیا کی مخلوق رہنے دیجئے ، ملاء اعلیٰ کی اس آبادی سے جہاں گناہ و لغزش سے کوئی واقف ہی نہیں ، اپنے افسانے کے افراد منتخب نہ کیجئے ۔ امید ہے کہ آپ اسکو خالص دوستانہ مشورہ سمجھکر برہم نہ ہونگے ـــــــــ

نیاز

۸ر جنوری ۳۱ء

ادھر دیکھئے ، میں آپ کا نہ زر خرید غلام ہوں ، نہ آپ نے کہیں جہاد کیا کہ تقسیم مال غنیمت کے وقت قیدی کی حیثیت سے آپ کی ملکیت میں مجھے سونپا گیا ہو ـــــــــ پھر آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرنا میرا دین و ایمان کیوں ہو محبت کا قیدی ہوں ، نگاہ لطف کا غلام ہوں ، سو مجھ سے محبت کیجئے اور اپنا سمجھئے ، نظر الفت سے کام لیجئے اور اپنا زندانی جانئے ۔ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی سرتابی کروں تو ذبح کر ڈالئے ـــــــــ مگر یہ کیونکر ممکن ہے کہ نفرت کرکے مجھسے مذمت لیجئے ، گریز و احتراز بھی کیجئے اور مالک و آقا بھی بنے رہئے ـــــــــ کلیوپیٹرا سے زیادہ ظالم تو آپ ہو نہیں سکتے ، سو وہ بھی صبح کے وقت ایک غلام کے سامنے اسی وقت زہر کا پیالہ پیش کرتی تھی جب اپنی زندگی کی ایک پوری زریں رات پہلے اسکے آغوش میں بسر کر لیتی تھی ـــــــــ

یہاں تشریف لائیے ، اور جب تک میں آپ سے بیزار نہ ہو جاؤں میرے پاس رہئے ۔ اسکے بعد اگر مجھے عذر ہو ، تو جو سزا میں تجویز کروں مجھپر جاری کیجئے ۔ سرسری نظر کیسی ، میں تو ایک ایک فقرہ ، ایک ایک لفظ پر دشمن کی سی نگاہ ڈالوں گا ، اور نہایت بیدردی کے ساتھ قطع و برید سے کام لونگا ۔ آپ آئیں تو سہی ـــــــــ لیکن ہاں ، ایک شرط اور ہے اُسے بھی سُن لیجئے ـــــــــ اپنے ساتھ آپ اُن حضرت کو نہ لائیے گا جو "جوابی پوسٹ کارڈ" کی طرح آپ سے کسی وقت جُدا ہونے کا نام ہی نہیں لیتے ـــــــــ مانا وہ نہایت مرد معقول ہیں ، لیکن کیا کروں مجھے تو ان کی صورت دیکھتے ہی خفقان سا ہونے لگتا ہے اور ایسا محسوس کرتا ہوں کہ معلوم نہیں کس وقت خدا کا کوئی شدید عذاب مجھپر نازل ہو جائے ۔ لیکن اگر آپ بغیر اُن کے نہ آسکتے ہوں تو انھیں کہیں اور ٹھیرا دیجئے گا اور آدھی رات کے بعد جب میرے سو جانے کا یقین ہو جائے اُن سے مل آیا کیجئے گا ۔

نیاز

۲۵ر جنوری ۱۹۳۱ء

محترم - یہ آپ نے کیونکر سمجھ لیا کہ آپکا مضمون نگار میں درج نہ ہوگا۔ آپ بھیجیں تو سہی ——

اے خوشا وقت کہ آئی وبصد ناز آئی

ہر چند میری راہ "ترکستان" ہے اور آپ سیدھے کعبہ کی طرف جارہے ہیں، لیکن میں اتنا کافر بھی نہیں ہوں کہ وہاں کی باتیں سننا مجھے گوارا نہ ہوں —— اور پھر یوں بھی —— "کیا بُت خانہ ویراں ہوگیا" - ایسا معمولی واقعہ نہیں ہے کہ میں اسے بھول جاؤں - اسلئے میرے آپ کے درمیان اس سے زیادہ کوئی فرق نہیں کہ آپ نے جو راہ اختیار کی ہے اُس پر بھی اطمینان نہیں اور ہر وقت کسی کی "بے نیازی" کا ڈر لگا ہوا ہے، یہاں یہ عالم ہے کہ جب کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے تو گڑگڑا کر ایک بار کہہ اُٹھتے ہیں کہ

بیار بادہ کہ ما ہم غنیمتیم بسے

اور پھر کسی تازہ گناہ کی طرح ڈال دیتے ہیں —— میں آپ کے مرتبہ تک پہونچنا نہیں چاہتا اور آپ میرے مرتبہ تک پہونچ نہیں سکتے —— ایک شعر اسوقت یاد آگیا ہے اُسے بھی سُن لیجئے اور دو چار گالیاں مجھے سُنا دیجئے، ہنسیں گے تو آپ کیا ؟

جمال صورت اگر واژگوں کنم بینند
کہ خرقۂ پشمینی طلا، موبافت ست

امیدوار جہنم
نیاز

۲ر فروری ۱۹۳۱ء

غضب خدا کا پورے ۵۶۳ دن تم کو کانگریس کے بتوں کی سیوا کرتے گذر جائیں اور اسوقت تک "کافری" کی ایک ادا بھی تم میں نہ آئے —— لاحول ولا قوۃ۔

برہمن می شدم گر اینقدر زناری بستم

یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ ہندو کوئی "دین" ہے —— ہندو نام ہے ایک خاص سوشل جماعت کا، ایک مخصوص معاشرتی نظام کا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ جس طرح تمہارے یہاں کے مولوی ایک مسلمان کو کافر و ملحد بنا دیتے ہیں، کبھی ہندوؤں کی طرف سے بھی کسی کو اپنی جماعت سے خارج کرکے "غیر ہندو" ہونے کا اعلان کیا جاتا ہے۔ یہ گوشت سے ناخن جُدا کرنے کی رسم آپ ہی کے یہاں ہے —— بہر حال میری نصیحت تو تمہارے لئے

وہی ایک ہے کہ :-

بال بکشا و صفیر از شجر طوبیٰ زن
حیف باشد چو تو مرغے ست اسیر قفسے!

طوبیٰ سے مراد یہاں "قامت دوست" ہے۔

اگر خدا کا اعتقاد ناگزیر ہے تو نوع انسانی میں تفریق مذہب و مسلک کا خیال اتنی بڑی توہین خدا کی ہے کہ شاید ہی اسکو معاف کیا جا سکے ——— کس وہم میں مبتلا ہو؟ انسان پیدا ہوئے ہو انسانوں کی طرح جیو اور انسانوں کی طرح جان دو ——— یہ "نزاع کفر و دین" کیسی؟

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست
خود سخن در کفر و ایماں می رود

نیاز

---

۱۰ فروری ۱۹۶۲ء

بے اختیار جی چاہتا ہے کہ تم اسوقت پاس ہوتے اور میں سب کے سامنے تمہاری پذیرائی یوں کرتا کہ "آئیے جناب یزید علیہ الرحمۃ" ——— یزید اسلئے کہ تم نے ایک سیدزادہ کا خون کیا اور علیہ الرحمۃ اسلئے کہ تم بھی بہرحال "اولاد رسول" میں شامل ہو ——— بندۂ خدا یہ تو سوچا ہوتا کہ قصور اُس غریب کا تھا یا اسکے ننھے ننھے بچوں کا۔ بہرحال قدرت تو تمہیں اس کی سزا یہاں دینے کی نہیں اور مین یہ چاہتا بھی نہیں، تاہم ایک تدبیر میرے ذہن میں ہے اور وہ یہ کہ تمہارے اس جرم کی پاداش میں، مین اپنے آپ کو ایک مستقل عذاب میں مبتلا کر دوں یعنی جب تک وہ غریب کہیں برسر کار نہ ہو جائے اسکے تمام مصارف برداشت کروں۔ پھر ظاہر ہے کہ تم اسکے ساتھ نہیں تو کم از کم میرے ساتھ ضرور ہمدردی کروگے ورنہ تمکو معلوم ہے کہ "ہتیا" دینے میں مجھے کتنا کمال حاصل ہے۔ بھائی اب بھی ممکن ہو تو اسے اپنی جگہ پر بحال کر دو آئندہ اگر ایسی غلطی اس سے سرزد ہو تو پھر رحم نہ کھانا ——— مین جانتا ہوں کہ وہ حد درجہ نالائق و نامعقول ہے۔ لیکن تم تو ایسے نہیں ہو۔ تمہارے آبا و اجداد تو برائی کا بدلہ ہمیشہ بھلائی سے دیا کرتے تھے، یہ تمہیں کیا ہو گیا؟ - مین جواب کا منتظر ہوں اور بے چینی کے ساتھ!

نیاز

۱۲ر فروری ۱۹۳۱ء

اجی کہاں کی دعا، اور کیسی زاری و التجا ؟ کون سنتا ہے ، کسے فرصت کہ ہم تم ایسے خس و خاشاک کو "بیم برق" سے محفوظ رکھے ـــــــ آپ مسلمان ہیں تو ہوا کریں ، خدا تو مسلمان نہیں ۔ پھر آپ کس دلیل پر محض پیرو اسلام ہونے کی وجہ سے " فلاح و فراغ " کا مستحق جانتے ہیں ۔

فریدالدین عطار پر بھی ایک بار یہی کیفیت احساس طاری ہوئی تھی ۔ منطق الطیر میں ایک جگہ انھوں نے اسی خیال کو یوں ظاہر کیا ہے :ـــ

" ایکبار نہایت ہی دیندار لیکن صد درجہ خستہ حال شخص سر راہ کھڑا ہوا تھا کہ امیر وقت کے چند زریں کمر غلام ، شال و حریر میں لپٹے ہوئے گھوڑوں پر سوار سامنے سے گزرے ۔ اس مفلس دیندار کو جسے نہ پیٹ بھر کھانا نصیب ہوتا تھا نہ ستر پوشی کے لئے کپڑا ، یہ منظر دیکھکر پہلے تو اپنی حالت پر افسوس ہوا اور پھر غصہ آیا کہ میں باوجود اتنی شب زندہ داریوں کے یوں پریشان ہوں اور امیر وقت جو ہر وقت گناہ میں مبتلا رہتا ہے اتنا دولتمند ہے کہ اپنے غلاموں کو بھی اس شان سے رکھتا ہے ـــــ یہ سوچکر اسنے خدا سے شکایت کرنا شروع کی اور آخر کار خدا پر یہ الزام اسنے قائم ہی کر دیا کہ

بندہ پروردن بیاموز از عمید

یعنی اے خدا غلاموں کی پرورش کرنا امیر وقت سے سیکھ "

تمکو معلوم ہے کہ اسی لئے میں نے زندگی کا ایک ڈھب ایسا اختیار کیا ہے جس میں منت و سماجت کا سوال ہی نہیں ، یعنی بھوکا رہتا ہوں اور ہنستا ہوں ۔ بیوی بچوں کی وجہ سے تکلیف ہے تو سب کو زہر دیدو ۔ میں مہیا کر دونگا ان فضول شکایتوں سے کوئی فائدہ نہیں ، دربار داری اور خوشامد تم سے ہونا نہیں ۔ اسے ، جبتک جیو انسان رہکر جیو ، اور انسان رہکر جینا یہی ہے کہ اپنے سوا ساری دنیا کو حرف غلط سمجھو ـــــ اگر فاقہ کرکے زندگی بسر کرنا ہے تو آجاؤ ، میرے پاس رہو ، مگر میں نے تمہیں پہلے ہی کب رخصت کیا تھا کہ اب بلاؤں ـــــــ خیر ،

نیاز

۲ر مارچ ۱۹۳۱ء

اس وقت تم پر اسقدر پیار آرہا ہے کہ بے اختیار " میری جان " لکھنے کو جی چاہتا ہے درآنحالیکہ تمہارا " دشمن جان و دل" ہونا " نص قطعی " سے ثابت ہے ـــــ " نص قطعی " سے مراد کلام اللہ نہیں بلکہ تجربۂ نیاز ہے ـــــ بات یہ ہے کہ آج صبح کو مولانا تشریف لائے اور انھوں نے مجھے اُن تمام مہمانداریوں کا حال بیان کیا جو تمنے انکے لئے صرف کیں ـــ اور محض اسلئے کہ انھوں نے میرا نام لے دیا تھا ـــ کیا یہ پیار آنے کی بات نہیں ـــــ میں سوچتا ہوں کہ کیا ہو اگر میں خود کبھی پہونچ جاؤں ۔ ...

عرصہ ہوا کہ کچھ اسی نوع کے جذبات دل میں موجزن تھے کہ بے اختیار یہ شعر ہو گیا تھا

جاؤں پرے ان کی، جب یہ حالت اپنی الفت کی
میں کہتا ہوں کہ کیا ہو جو چھوڑ دیں گر وہ دل آزاری

ہو گیا؟ انتقال ہو جائے ــــــ اچھا تیار رہو ہولی میں آ۔ ا ہوں اور وہیں تمہارے مکان پر خورشید کی زبان سے کافی میں پوسے دو گھنٹہ تک ــــــ ہولی آج چلے جانے کال۔ سیاں نہیں آئے جیا گھبرائے ــــــ سنونگا، مگر شرط یہ ہے کہ سوائے شاہد و مشہود کے اور کوئی وہاں نہ ہو۔ یہانتک کہ تم بھی نہیں

نیاز

۱۰ر مارچ ۱۹۳۱ء

میرے بھائی،

کیوں خواہ مخواہ وقت ضایع کرتے ہو۔ میں سچ کہتا ہوں غزل کہنا تمکو کبھی نہ آئیگا کیونکہ یہ مشغلہ بغیر کہیں دل لگائے کوئی تعلق رکھتا نہیں اور دل لگانے سے تمہیں ٹھیری ازلی نفرت۔ پھر تمہیں بتاؤ کہ کام چلے تو کیونکر؟ محبت، کو تم جنون و دیوانگی سمجھتے ہو، لیکن غزل گوئی کو بڑی فرزانگی! قربان جائیے اس عقل و فراست کے ــــــ پھر بد قسمتی سے قیام آپکا ایسی جگہ ہے، جہاں سوائے "نوک مژگاں" اور "شب ہجراں" کے کسی اور بات کی داد ملتی نہیں ــــــ اسلئے اور گمراہ ہوتے جا رہے ہو ــــــ بہر حال اگر یہ مشغلہ تم سے نہیں چھوٹ سکتا، تو کم از کم مجھے تو معاف ہی رکھو اور آیندہ کوئی بات ایسی نہ لکھو جس سے میرا خیال تمہاری شاعری کی طرف منتقل ہو سکے

میں نے سنا تھا کہ بھائی مراد باوجود ان تباہ حالیوں کے حج کو جانیوالے ہیں۔ خدانخواستہ یہ خبر صحیح تو نہیں؟ ہائے یہ بھی دنیا کا کتنا بڑا سانحہ ہے کہ ایک بھائی کو شاعری نے تباہ کیا اور دوسرے کو مذہب نے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ یہ عذاب تمہاری شاعری ہی کی وجہ سے نازل ہوا ہے، اور تمہاری غزلگوئی سے گھبرا کر وہ غریب ترک وطن پر آمادہ ہوا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس غریب کے پاس اتنی دولت کہاں کہ وہ یہ جسارت کرتا ــــــ غالباً قرض لیا ہو گا یا جائداد کا کوئی حصہ رہن کیا ہو گا ــــــ اللھم احفظنا من کل بلاء ــــــ

نیاز

۲۰ر مارچ ۱۹۳۱ء

اے صاحب ــــــ کچھ تو کہو جواب میں ہاں نہ سہی، نہیں سہی!

ظاہر ہے کہ آپکے انکار سے مجھے تکلیف یقیناً ہو گی، لیکن اس انتظار کی "تپ دق" سے تو چھٹکارا نصیب ہو جائیگا ــــــ مرزا جی روز صبح کو فرشتہ موت کی طرح نازل ہو جاتے ہیں اور میں خون کا سا گھونٹ پی کر خاموش رہ جاتا ہوں ــــــ

تم کچھ لکھو تو میں اُن سے کہوں کہ ہاں بھئی کچھ دو اور یہ نہ کرو ــــــ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو اپنے مصالح کے لحاظ سے جواب دینے میں پس و پیش کرنا چاہئے۔ لیکن اے میرے بھائی "پس و پیش" کی بھی حد ہوا کرتی ہے ــــــ میں تمکو مجبور نہیں کرتا کہ ان کی تمام خواہشیں پوری کر دو، لیکن اگر بغیر کسی حرج و نقصان کے ان کی ہزار درخواستوں میں سے کسی ایک کو قبول کر سکو تو کیا آخرۃ میں "ساقی کوثر" کی شفاعت سے محروم ہو جاؤ گے ــــــ

بہر حال میں تو اب تمکو لکھنے کا نہیں۔ وہ اگر زیادہ ستائیں گے تو اُن کو لیکر اسٹیشن جاؤنگا اور الہ آباد کا ٹکٹ لیکر ریل میں سوار کرا دونگا اور کہدونگا کہ دیکھئے اگر آپ لوٹ کے آئیں تو میرے پاس آنے کی زحمت گوارا نہ کیجئے گا کیونکہ میں ابھی جا کر سنکھیا کھائے لیتا ہوں اور آپکو زندہ ملونگا ــــــ لاحول ولا قوۃ، عجیب مہمل انسان ہو ــــــ

نیاز

۲۵، مارچ ۳۱ء

رات کس درجہ یاد آئے ہو تم

ہائے ایک پوری رات سنکر و بیخودی میں گزر جائے اور تم مجھ سے دور رہو" "واقعہ کربلا" تو نہیں مگر "دہلی کی تباہی" کے بعد غالباً یہ دوسرا ظلم اپنی قسم کا تھا جسے قدرت نے روا رکھا ــــــ اچھا سنو ٹھیک ۸ بجے "شمع کا نوری" روشن ہوئی ہاں ہاں وہی ــــــ ہاتھ آجائیں اگر ہاتھ لگائے نہ بنے ــــــ اُف وہ گلابی رنگ کا آنچل ــــــ یہ معلوم ہوتا تھا کہ چہرہ کی روشنی ایک جگہ قائم ہو کر رہ گئی ہے۔ باور کرو کہ معصوم آنکھوں کی "عصیاں کاریاں" بالکل بے نقاب تھیں اور میری روح لرزاں تھی اُس موج بادہ کے ساتھ ساتھ جو آنکھوں کے "جام نرگسیں" سے تبسم نما جھلکی پڑ رہی تھی ــــــ بے حجابی بڑھی، تکلف گھٹا اور امین کے پر جلال سروں میں رادھا و کرشن کی وہ کہانی شروع ہو گئی جسنے "محفل عالم" "کافری" کو یکسر نغمہ و رنگ بنا رکھا ہے، وہ کرشن کا بازو تھام لینا اور پھر کسی کا لجائی ہوئی ادا سے "ہٹو، چلو، شیام موری بہیاں نا مرورو" کہنا ــــــ اُف، دُہائی ہے مرلی والے کی!

رات بھر مسلسل تیر و پیکاں کی بارش شاید کافی سزا نہ تھی کہ صبح کو بھیرویں سے بھی ذبح کرنے کی ضرورت سمجھی گئی ــــــ تمہیں معلوم ہے کہ اس سے قبل ایکبار اسی بھیرویں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا ــــــ ظالم کی یادداشت تو دیکھو بالکل وہی چیز، وہی سماں، وہی ادا ــــــ پھول گیندوا نا مارو۔ لگت کریجوا میں چوٹ

تم پوچھتے ہو میں نے شعر کہنا کیوں ترک کر دیا۔ خدا کے لئے بتاؤ ان باتوں کا جواب ہمارے تمہارے پاس کیا ہے:—

"دیکھو خدا کے لئے رحم کرو، گیندے کے پھول سے مجھے نہ مارو، کیونکہ اس سے جسم تو یقیناً مجروح نہیں ہوتا لیکن کلیجہ پر ایسی چوٹ لگتی ہے کہ برداشت نہیں ہو سکتی"

بیان و زبان بالکل معمولی، تشبیہ و استعارہ اسی دنیا کا، لیکن مفہوم؟ یقیناً ماورار سرحد ادراک، "اگر گوش حقیقت نیوش" ہو ــــ تمہارے ذکر سے ایک لمحہ فارغ بسر نہیں ہوا ــــ اچھا سال گذشتہ کا وہ واقعہ یاد ہے۔ اور ہاں وہ مصرعہ بھی دماغ میں محفوظ ہے؟ ــــ "میرا دامن چھوڑئے اپنا گریباں پھاڑیئے"

خدا کرے تم اسی لمحہ کی یاد میں گریباں چاک یہاں پہونچ جاؤ ــــ

نیاز

---

۲۸ مارچ سنہ ۳۱ء

بھائی معاف کرنا، تمہاری تحریر کا جواب غیر معمولی تعویق سے جا رہا ہے۔ اگر باور کرو تو کہوں کہ یہ تاخیر بالکل غیر اختیاری تھی اور باوجود کوشش کے جواب دینے پر طبیعت مائل نہ ہو سکی ــــ آج اس خیال سے کہ اپنی وضع کیوں چھوٹی جائے، چار و ناچار یہ تحریر بھیج رہا ہوں ــــ تمہاری سیکڑوں التجاؤں کا صرف ایک جواب میرے پاس ہے اور وہ یہ کہ سب "نامنظور"! ــــ دلیل و سبب بتانے پر میں مجبور نہیں لیکن ہوں بھی تو کہہ سکتا ہوں کہ بلا دلیل ــــ بے سبب ــــ یونہی ــــ میری مرضی ــــ پھر تم کیا کرو گے ــــ

قسم لیلو جو میں اسوقت سفر کے "حال" میں ہوں۔ یقیناً موسم زیادہ ناخوشگوار نہیں، لیکن کیا کروں اسوقت پا بزنجیر ہوں۔ بیگم علیل، بچی مضمحل، اور مین دیوالیہ۔ بھائی! ایک وقت میں تین تین پہاڑ تو فرہاد بھی نہیں کاٹ سکتا تھا۔ مین کس شمار میں ہوں۔

اجمیر والوں کا کیا حال ہے؟ تمہارے جنون کی تو خیر حقیقت معلوم ہے، مگر اُدھر سے ہنوز اطمینان نہیں۔ خدا کرے تم سے بہتر "کمانداروتیرانداز" کوئی مل گیا ہو اور تمہاری "ترکی" تمام ہو چکی ہو ــــ دنیا میں تم سے زیادہ طویل القامت لوگ موجود ہیں، لیکن شاید ہی کسی کے دل و دماغ ایک دوسرے سے اتنے فاصلہ پر واقع ہوں جتنے تمہارے ہیں ــــ مین پوچھتا ہوں کہ آخر یہ پندار تمہیں کس بات کا ہے؟ کیا بتاؤں وہاں پہونچ نہیں سکتا ورنہ تمکو دکھا دیتا کہ

پلٹتی ہیں نگاہیں کیونکر

کوئی اور تازہ بشارت ہوئی ہو تو اطلاع دو۔ اس ہجوم افکار میں تھوڑی دیر ہنسنے ہی کا سامان سہی۔

نیاز

ے عزیز گرامی میاں الطاف تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ "بڑے بھائی جان جو امانت ــــ مین حیران کہ یہ کہہ کیا رہے ہیں، لیکن صرف اس خیال سے کہ ممکن ہے ان کے مصلحت سے کوئی جھوٹ بولا ہو، لاعلمی کا اظہار مناسب نہ سمجھا اور اصولی گفتگو کے طور پر

ظاہر ہے
مرزا جی [illegible]

ان سے کہا کہ "بڑے بھائی کی امانت چھوٹے بھائی کو یونہی مل سکتی ہے۔ ان سے کہہ دیجئے کہ وہ خود آکر لے لیں"۔۔۔ یہ سننا تھا کہ حضرت وہیں بگڑ گئے اور اس قدر غل مچایا کہ محلہ والے یہ سمجھے شاید میں کسی کو قتل کر رہا ہوں ۔۔۔ اب کیا بتاؤں کہ اپنی حماقت پر کتنا افسوس کر رہا تھا۔ اور منہ پیٹ رہا تھا کہ کیوں میں جھوٹ بولا ۔۔۔ اب یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں نے تو یوں ہی کہہ دیا تھا ۔۔۔ آخر کار خدا خدا کرکے گھنٹوں کی "بحث و تمحیص" کے بعد اس فیصلہ پر انھیں راضی کیا کہ اپنے بھائی کے پاس جانے کا کرایہ مجھ سے لیں اور وہاں سے انھیں بھیج دیں ۔۔۔ خدا کے لئے تمھیں بتاؤ یہ کیا معمہ تھا اور حنیف صاحب نے یہ بلا میرے سر کیوں مسلط کی تھی ۔۔۔ چونکہ تم ان کے "خلوتیان راز" میں سے ہو، اس لئے حقیقت کا علم تم کو ضرور ہوگا ۔۔۔ ان کو اپنی طرف سے یہ تمام ماجرا لکھ کر مجھے اطلاع دو کہ اگر پھر کبھی وہ حضرت تشریف لائیں تو میں جھوٹ بولنے کا کونسا پہلو اختیار کروں ۔۔۔ خدا جانے لوگ کس طرح عمر کی عمر جھوٹ بول کر گزار دیتے ہیں۔ یہاں تو جب کبھی اس کی نوبت آئی نتیجہ ایسا ہی "دردناک" نکلا ۔۔۔

نیاز

۵؍ اپریل ۳۱ء

نماز شروع کر دی۔ اچھا کیا، خدا مبارک کرے۔ لیکن یہ بتاؤ کہ اس مرتبہ کونسا نیا شکار پیش نظر ہے، اُس مرتبہ تم نے نماز کی پابندی کی تو غریب منیر کو تباہ کر دیا اور وضو کراتے کراتے اس کے چہرہ کو اچھا خاصا "کیمخت" بنا دیا ۔۔۔ اس مرتبہ نظر عنایت کس پر ہے ۔۔۔ خدا بچائے ان پیرزادوں سے کہ یہ عبد بنکر بھی معبود ہی بنے رہتے ہیں ۔۔۔ میرا فلسفہ نماز کا خواہ کتنا ہی ناقابل عمل ہو، لیکن اسکے بلند ہونے سے تمھیں بھی انکار نہیں پھر جو تم نماز پڑھتے ہو صرف گناہ کرنے کیلئے، عبادتیں کرتے ہو محض بارگاہ معصیت کو وسیع کرنیکی غرض سے، تو خدا کیلئے بتاؤ کیا اس نشست و برخاست کے علاوہ کوئی اور نسخہ تمھیں معلوم نہیں ۔۔۔ لاحول ولاقوۃ ۔۔۔ یہ کیا لغو حرکت ہے ۔۔۔ گناہ کرتے ہو تو گناہ کرنے والوں کی سی صورت بھی بناؤ ۔۔۔ اس سے کیا فائدہ کہ مسجد میں سجدہ کر کرکے جو خاک اپنی پیشانی پر اٹھاؤ، اسے کسی کے آنچل سے صاف کرتے پھرو ۔۔۔ اُف وہ تمھارا نماز میں "القارعہ" کی عین کو استفراغ کی حد تک حلق سے بار بار نکالنا اور پھر اسکی تھوڑی دیر بعد ہی کسی کو "ایفاء عہد" پر شرعی بحجر دیکر آخر کار وعدہ پورا کرا ہی لینا ۔۔۔ کیا کبھی بھول سکتا ہوں ۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ عبادت کا یہ ڈھنگ کسی کو آجائے تو دنیا میں اس سے زیادہ لذیذ مشغلہ اور کیا ہو سکتا ہے مگر یہ معاملہ تو "تا نہ بخشد خدائے بخشندہ" کا ہے ۔۔۔ سعی و کوشش سے بجز اسکے اور کیا ہو سکتا ہے کہ "غریب میر مر رہے"

نیاز

باب المراسلۃ والمناظرہ

(جناب ملک محمد سمیع اللہ خاں صاحب تحصیلدار کالپی)

معاف فرمائیے گا یہ چند سطور جذبۂ دل سے متاثر ہو کر آپ کو لکھ رہا ہوں گو نفس مطلب دو الفاظ سے زیادہ نہیں کہ میں بھی آپ کے رسالہ نگار کو ہر بار کا ایک خریدار ہونا چاہتا ہوں۔ اور خدا نے چاہا تو اپنے حلقۂ احباب میں نگار کے اور بھی خریدار پیدا کرنے کی کوشش کروں گا۔

یوں تو آپ کا نام نامی عرصہ سے سنتا تھا۔ مگر اس سے قبل نہ تو آپ کے متعدد و مسلسل مضامین دیکھے تھے اور نہ کبھی شرف نیاز کا موقع حاصل ہوا تھا۔ ایک شوق تو پورا ہو رہا ہے۔ دوسری تمنا دیکھئے کب بر آئے۔ اخباروں میں آپ کے علم اور عقائد کے متعلق بہت پروپگنڈا ہوتا رہا۔ مگر میں نے آپ کے مضامین دیکھنے کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ اتفاق سے میرے ایک دوست نے جو یہاں ڈاکٹر ہیں۔ نگار کا ایک مضمون دکھلایا۔ اس کا پڑھنا تھا کہ شوق و جستجو کا یہ عالم ہوا کہ بہت سے پرانے پرچے نگار کے منگوا کر اور چن چن کر آپ ہی کے مضامین دیکھے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ لطف بیان آپ کا حصہ ہے۔ اور واقفیت عامہ سے اکثر مضامین آپ کے لبریز ہوتے ہیں۔ آپ کے بعض بعض اصول اور عقاید سے گو مجکو اتفاق نہیں۔ تاہم پھر بھی جو کچھ آپ کر رہے ہیں وہ بہت ہے۔ اگر آپ معاف فرمائیں تو میں کہوں کہ جس طرح ایک طرف مولویوں کی جماعت اپنی کوتاہ نظری میں نقطۂ بُعد پر ہے اسی طرح وسعت خیالی اور آزاد روی میں جناب۔ دوسرے کنارے پر ہیں۔ اگر کاش بین بین کے نیک اصول پر آپ اتر آئیں تو شاید مسلم سوسائٹی کے واسطے جوہر بے بہا ثابت ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کا علم۔ آپ کی فراست۔ آپ کی ذہانت اور آپ کی قوت استدلال ایسی ہے کہ آپ جو چاہیں ثابت کر سکتے ہیں۔ مگر خدارا یہ تو فرمائیے کہ صحیح راستہ سوائے ایک کے دوسرا کیسے ہو سکتا ہے جیسا کہ آپ کا خیال ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اعمال حسنہ اچھی چیز ہیں لیکن بلا صحیح وسیلہ کے کسی بارگاہ میں رسائی نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر رہبر صحیح ہے تو منزل مقصود پر آدمی پہنچ

جائے گا ورنہ باوجود کوشش اور محنت کے بھٹک جائے گا۔ یہی طور میرے خیال میں قرب الٰہی کا بھی ہونا چاہیے۔ معاف کیجیے گا میری اس جسارت کو کہ آپ جیسے جید عالم متبحر کے مضامین پر ایک قسم کی رائے زنی کرتا ہوں۔ لیکن یہ الفاظ محض ایک رو میں قلم سے نکل گئے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میرے دل کو آپ کی طرف سے نادیدہ کیوں انسیت سی پیدا ہو گئی ہے

(نگار) مجھے یہ معلوم کر کے ازبس مسرت حاصل ہوئی کہ آپ نے میرے عقاید اور مقاصد نگار کے متعلق جو رائے قایم کی ہے وہ نگار کا مطالعہ کرنے کے بعد قائم کی ہے اور آپ نے عوام کی طرح محض مولویوں کے غلط پروپاگنڈا پر اعتماد کر کے مجھے کافر و ملحد سمجھنے کا ثواب حاصل نہیں کیا۔

آپ اپنی تحریر میں ایک جگہ ظاہر فرماتے ہیں کہ "میرے بعض اصول و عقاید سے آپ کو اتفاق نہیں۔" بہتر ہوتا اگر آپ ان کی صراحت فرما دیتے، کیونکہ تحریر گرامی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کا جو اعتقاد میں نے معلوم کیا ہے بعینہ وہی اعتقاد میرا بھی ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اصولاً آپ کو میرے کس خیال سے اختلاف ہے —— ممکن ہے کہ آپ نے بعض فروعی مسائل کو اصول میں شامل کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہو یا یہ کہ میری بعض تعبیرات کو آپ ناپسند فرماتے ہوں۔ بہر حال آپ ہی کے دو مقررہ اصول کو سامنے رکھ کر اظہار خیال کی اجازت چاہتا ہوں، ممکن ہے یہ پردہ اٹھ جائے اور پھر آپ مجھے بھی اسی جگہ پر پائیں جہاں آپ کا پائے ثبات قائم ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ اعمال حسنہ اچھی چیز ہیں لیکن بلا صحیح وسیلہ کے کسی بارگاہ میں رسائی کیسے ہو سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ کے خیال میں قرب الٰہی بھی ضروری چیز ہے —— معاف فرمائیے اگر میں سب سے پہلے آپ سے یہ سوال کر دوں کہ "کسی بارگاہ میں رسائی ہونے" کا کیا مفہوم ہے اور "قرب الٰہی" سے آپ کا کیا مقصود ہے —— اگر قرب الٰہی اور بارگاہ کی رسائی سے آپ کا مدعا ایک ہی (اور غالباً ایسا ہی ہوگا) تو آئیے سب سے پہلے اسی مسئلہ پر غور کر لیں کہ مذہبی زبان میں یہ الفاظ بول کر کیا مفہوم مراد لیا جاتا ہے اور حقیقت کے لحاظ سے یہ کیا ہیں؟ اتنا تو غالباً آپ بھی تسلیم کرتے ہوں گے کہ "قرب الٰہی" سے وہ نزدیکی یا مواصلت مراد نہیں ہو سکتی جیسی اس دنیا میں دو انسانوں یا دو مادی اشیاء کے درمیان پائی جاتی ہے اور نہ "بارگاہ کی رسائی" سے اس نوع کا قرب مقصود ہو سکتا ہے جیسا ایک غریب کسان کو کبھی کبھی آپ کے حضور میں حاصل ہو جاتا ہے —— پھر جب حقیقت یہ نہیں ہے تو غور کرنا چاہیے کہ اہل مذہب کی اس سے کیا مراد ہے اور وہ اس پند و موعظت سے کس نتیجہ پر پہونچنا چاہتے ہیں ——

میں اس وقت ذات باری کی حقیقت سے بحث نہیں کروں گا اور نہ اس الجھن میں پڑوں گا کہ اس کی ذات و صفات میں تفریق ممکن ہے یا نہیں، بلکہ نہایت سادگی کے ساتھ صرف اس تعلق پر غور کروں گا جو خدا یا قدرت کے

ساتھ نوع انسانی کو حاصل ہے ـــــ یہ امر یقیناً محتاج صراحت نہیں کہ وہ خدا جسکو بے نیاز مطلق کہا جاتا ہے، وہ آفرینگار اعظم جو اپنی ذات سے ایک مستقل کمال ہے اور وہ قدرت جو بلا کسی رعایت کے ہر وقت مصروف کار ہے، کسی فانی مخلوق کی کبھی محتاج نہیں ہو سکتی اور نہ ہمارا کوئی فعل اس کو کسی طرح متاثر کر سکتا ہے ـــــ پھر جب حالت یہ ہے تو ظاہر ہے کہ ہمارے اعمال کا اثر ہماری ہی ذات پر ہونا چاہئے، ہماری ہی زندگی کو ان سے متاثر ہونا چاہئے اور ہماری اچھائیوں یا برائیوں کا دائرۂ اثر ہماری معاشری و تمدنی زندگی سے آگے نہ بڑھنا چاہئے ـــــ یعنی اگر ہم اچھے کام کریں گے تو اس کا نتیجہ ہمارے ہی لئے بہتر ہوگا۔ اور اگر معاصی و بد اخلاقی میں مبتلا ہوں گے تو ہم خود تباہ و برباد ہوں گے ـــــ یہی ہے وہ نکتہ جس کو کلام مجید میں کہیں اس طرح ظاہر کیا گیا ہے کہ

ان اللہ لا یغیر بقوم حتے یغیر و مابانفسہم

کسی جگہ ـــــ ان اللہ یھدی من یشاء ـــــ کہہ کر اس کی توثیق کی گئی ہے اور کہیں طرز بیان بدل کر اسی حقیقت کو اس طرح ظاہر فرمایا ہے کہ ـــــ فھل یھلک الا القوم الفاسقون ـــــ اور کسی جگہ ـــــ ان الارض یرثھا عبادی الصالحون ـــــ سے اس راز کو کھول دیا گیا ہے۔

بہر حال آپ تمام کلام مجید کا مطالعہ کر جائیے کوئی ایک آیت بھی ایسی نہ ملے گی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ ہمارے اعمال خدا کو بھی کسی طرح متاثر کر سکتے ہیں اور اس کی برہمی یا خوشنودی کا مفہوم ہماری تباہی یا فلاح کے علاوہ کچھ اور ہے۔ اس لئے قرب الٰہی یا رسائی بارگاہ کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ٹھہرتا کہ اگر ہم اچھے اعمال کے پابند ہوں گے تو فلاح و ترقی کی صورت میں جو نتیجہ پیدا ہوگا۔ اسے مذہبی زبان میں قرب الٰہی سے تعبیر کریں گے اور اس کے برعکس اگر ہمارے اخلاق ذلیل و ردی ہوں گے تو تباہی و بربادی میں مبتلا ہو جائیں گے اور یہی ہے خدا سے دوری یا اس کی برہمی و ناخوشی ـــــ پھر اگر آپ خیال کو اور زیادہ وسیع کریں اور خدا و انسان کے تعلق پر زیادہ غائر نگاہ ڈالیں تو بہ آسانی یہ بھی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ دوزخ و جنت بھی اپنی اسی اہلیت و نااہلیت سے متعلق ہے۔ اور قومی خوشحالی و بربادی کے اظہار کے لئے "جنات نعیم" اور "اسفل السافلین" سے بہتر الفاظ کوئی اور ہو ہی نہ سکتے تھے۔

بہر حال اس سے تو آپ کو بھی انکار نہیں کہ انسان کو عقل و ہوش عطا کئے جانے کا اقتضا یہی ہونا چاہئے کہ اس سے

لہ عام طور پر اس کے یہ معنے لئے جاتے ہیں کہ اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے حالانکہ یھدی کا مفعول پورا فقرہ من یشاء واقع ہوا ہے اور یشاء کا فاعل من ہے۔ اس لئے معنے یہ ہوں گے کہ اللہ ہدایت دیتا ہے اس کو جو خود اپنی ہدایت چاہتا ہے۔

نیاز

اچھے کاموں کی توقع کی جائے جو مقصود آفرینش ہے ـــــ پھر جب اصل چیز صرف اعمال حسنہ قرار پائے تو یہ کہنا کہ بلا صحیح وسیلہ کے کسی بارگاہ میں رسائی کیسے ہو سکتی ہے صرف یہی معنی رکھ سکتا ہے کہ ہم کو درستی اخلاق کے لئے کوئی صحیح و موثر طریقہ ضرور اختیار کرنا چاہیئے ـــــ لیکن اس طریقہ یا وسیلہ کو اصل مقصود نہ قرار دینا چاہیئے ـــــ

الٰہیات کا مشہور مسئلہ ہے کہ آلہ یا ذریعہ صرف ایک آلہ یا ذریعہ ہونے کی حد تک قابل اختیار ہوتا ہے نہ کہ اصل مقصود کی حیثیت سے ـــــ اور یوں بھی روز کی زندگی میں ہم اس حقیقت کا مطالعہ کر سکتے ہیں کہ وسیلہ و مقصود، جادہ و منزل میں کتنا فرق ہے۔

اگر آپ نے اس حد تک میرے صحیح مدعا کو سمجھ لیا ہے تو بہ آسانی آپ کو معلوم ہو سکے گا کہ میرے اعتقادات اور ایک مولوی کے اعتقادات میں کیا فرق ہے ـــــ میں کیا کہتا ہوں اور وہ کیا سمجھانا چاہتا ہے ـــــ اصول مذکورۂ بالا کی بنا پر میرا کہنا یہ ہے کہ تمام مذاہب عالم کا مقصود انسان کے اخلاق کو درست کرنا تھا۔ اور ان میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے ہر نیا دین اپنے پہلے دین کے لحاظ سے زیادہ مربوط و مستحکم آئین لے کر آتا تھا، حتےٰ کہ اسلام کا ظہور ہوا اور اس نے ایک حرف آخر کی صورت سے ہمیشہ کے لئے انسان کو کسی اور مذہب کی استمداد سے بے نیاز کر دیا ـــــ لیکن اسلام کا مذہب کیا تھا، اسلام کی تعلیم کیا تھی؟ ـــــ (یہاں ایک بہت باریک نکتہ ہے جسے گوشگزار کرنا چاہتا ہوں) ـــــ صرف یہی کہ محض اخلاق حسنہ پیدا کرنا ہی اصل مذہب ہے، اور کسی مذہب کی پابندی صرف اس خیال سے کہ محض اس کی پابندی نجات و فلاح کے لئے کافی ہے بالکل بے اصل چیز ہے ـــــ یہی وہ راز تھا جس کو غالب نے یوں بیان کیا ہے کہ

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یعنی اصل ایمان نام ہے مذہب " ترک مذہب" کا، محض درستی اخلاق کا اور اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اب اسلام کے ظہور کے بعد کسی مذہب کی ضرورت دنیا میں باقی نہیں رہتی، کیونکہ اس کا مفہوم ہی یہ ہے کہ بغیر کسی پابندی رسم و رواج یا شعائر ظاہری کے صحت اخلاق کو مطمح نظر قرار دیا جائے ـــــ

پھر اگر حقیقت یہ نہیں ہے تو بتائیے کہ اسلام کا فطری مذہب ہونا کیا معنی رکھتا ہے، رسول اللہ کا رحمۃ للعالمین ہونا کیا مفہوم رکھ سکتا ہے اور مسلمان کیونکر اخوت عامہ کے عالمگیر رشتہ سے شرق و غرب کے تمام انسانوں کو باہم گرہ وابستہ کر سکتے ہیں۔

میں نے کبھی نہیں کہا کہ نماز و روزہ بری چیز ہے بلکہ ہمیشہ یہی ظاہر کیا کہ اگر ان سے درستی اخلاق مقصود ہو تو ان کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ لیکن میں اس کا قائل کبھی نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہوں کہ محض نماز پڑھ لینا یا ایک مہینے کے روزے رکھ لینا ہی اصل ایمان ہے ـــــ یہ سب ذرائع و وسائل ہیں مقصود حقیقی

تک پہونچنے کے اسلئے اگر یہ منزل تک پہونچانے والے ثابت نہ ہوں تو ان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی اور ہماری تمام عبادات جسد بے روح کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس جگہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر عبادات اسلام بجائے خود ضروری نہیں اور محض اخلاق حسنہ ہی پر انحصار ہو نجات کا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ غیر مسلم افراد بھی جو پاکیزہ اخلاق رکھتے ہیں ناجی نہ ہوں اور اس طرح اسلام کی خصوصیت پھر کوئی باقی نہیں رہتی —— میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ بیشک یہی ہونا چاہئے کیونکہ میں نجات کا مفہوم لیتا ہوں وہ جو اسی دنیا کے فلاح و ترقی سے متعلق ہے اور وہ یوم آخرۃ - یوم میثاق - وغیرہ سے متعلق کرتے ہیں جن کا میں قائل نہیں اور نہ کوئی عقلی دلیل ان کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے علی الخصوص اس وقت جبکہ خود کلام مجید سے میرے قول کی تائید ہوتی ہے۔

آپ اگر تعلیمات اسلام کی روح پر غور کریں گے (اور یقیناً آپ نے غور کیا ہوگا) تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس سے زیادہ سادہ چیز کسی مذہب نے پیش نہیں کی —— رہا اس روح کو پیدا کرنا سو اس کے لئے بیشک عوام کی ذہنیت کو سامنے رکھکر ایک خاص لٹریچر پیدا کرنا پڑا اور اس طرح، آخرۃ - معاد - عذاب - ثواب - دوزخ - جنت - قرب الٰہی وغیرہ کی سیکڑوں اصطلاحات جاری ہوگئیں ورنہ

عباراتنا شتیٰ و حسنک واحد

اس میں کلام نہیں کہ میں بھی وسعت خیال کے لحاظ سے انتہائی نقطہ پر ہوں اور مولوی بھی اپنی تنگی خیال میں جواب نہیں رکھتا، لیکن یہ "بین بین" کیا چیز ہے۔ اگر مذہب نام اسی چیز کا ہے جو مولوی بتاتا ہے تو اس کو آج نہیں تو کل مٹ جانا ہے اور پھر اس کے بعد اس کی بقا کی صورت صرف وہی ہے جو میں پیش کر رہا ہوں۔ پھر اب یہ آپ کی خوشی ہے کہ جو تاریکی کل مٹنے والی ہے اُسے آج ہی ترک کر دیں یا کل پر اٹھا رکھیں

جاں بجاناں دہ وگرنہ از تو بستاند اجل
خود تو منصف باش ایدل ایں نکو یا آں نکو

باب الاستفسار

(متعلق بہ مذہبیات)

(جناب محمد عمر صاحب صدیقی تلہری)

جریدہ "انصاف امرتسر" میں "الہامات اور کرامتوں" کے عنوان کی اتحت چند نوٹ "Free Mussalman" کے حوالہ سے شائع ہوئے ہیں جو بڑی حد تک میرے خیالات کا آئینہ ہیں یا یوں کہئے کہ ایک عرصہ سے یہی اور اسی قسم کے خیالات میرے دل و دماغ پر مستولی ہیں اور جو باوجود کوشش کے بھی میرے دل سے دور نہ ہوئے - اور معاف کیجئے اگر یہ کہوں کہ "نگار" کو بھی اس باب میں میں نے اپنا ہمنوا نہ پایا - بہرحال میں انکو استفسارات کی شکل میں یہاں پر درج کرتا ہوں اور آپ کی رائے معلوم کرنیکا متمنی ہوں - اگر آپ کچھ حرج نہ سمجھیں تو "نگار" کی کسی قریبی اشاعت میں اسپر (اپنے نقطۂ نظر) روشنی ڈالئے کہ شاید آپ ہی کے ذریعہ سے کچھ تسکین قلب حاصل کرسکوں :-

(۱) اگر قرآن - انجیل - وید - توریت - زبور وغیرہ کتب مقدسہ الہامی ہیں تو ان میں اختلاف کیوں ہے ؟

(۲) کیا کسی الہامی کتاب نے کوئی ایسی بات دنیا کو بتلائی ہو کہ اُس وقت دنیا کو معلوم نہ تھی ؟

(۳) مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق اگر قرآن کے نازل ہونے سے باقی الہامی کتب مقدسہ منسوخ ہوگئی ہیں تو پھر توریت - زبور - انجیل کے ماننے والوں کو ان سے ہٹا کر قرآن کی طرف لگانے کا خدا نے کوئی موثر طریقہ اختیار کیوں نہیں کیا ؟ جس سے کہ وہ بغیر ہچکچاہٹ بلا شک و شبہ کے قرآن پر ایمان لے آتے -

(۴) اگر محض رسول اللہ پر کلام اللہ نازل ہوکر یہ کہنے سے کہ پہلی کتابیں منسوخ ہوگئیں وہ منسوخ بھی جاتی تو پھر رسول اللہ

کے بعد بہا، اللہ پر الہامی کتاب نازل ہونے اور اس میں یہ لکھا ہونے سے کہ قرآن منسوخ ہوگیا کیوں اُسے منسوخ نہ سمجھا جائے ؟ جب کہ ایسا دعوےٰ ہر نبی کرسکتا ہے۔ اور کرتا رہیگا۔

(۵) دنیا میں جتنی الہامی کتابیں ہیں سب کو ایک جگہ جمع کرلیا جائے اور اُن کی تعلیم پر غور کیا جائے تو ان میں کوئی ایسی بات نہ ملے گی جسے کہ دنیا پہلے سے نہ جانتی ہو ان کتابوں میں تقریباً ایسی باتیں درج ہیں جو ضروریات زندگی کے نقطۂ نظر سے بہت ہی معمولی سمجھی جانی چاہئیں اور کوئی اہم بات ان میں نہ ملے گی۔ مثلاً انسان طرح طرح کی بیماریوں سے تکالیف اٹھاتا ہے اور قدرت کے پاس امراض کو دور کرنے والی اچھی اچھی ادویات بھی موجود ہیں مگر خدا نے بذریعۂ الہام آج تک کبھی کسی مرض کا شافی علاج نہ بتلایا۔ انسانی دماغ نے اپنے لئے خود تورات دن کی محنت اور مشقت سے کئی ایجادیں کی ہیں اور قدرت کے پوشیدہ و مخفی راز معلوم کئے ہیں اور آئندہ کرتا رہے گا۔ مگر الہام نے قدرت کے کسی مخفی راز پر آجتک روشنی نہیں ڈالی جس سے کہ انسان کو اتنا حیران و پریشان نہ ہونا پڑتا۔

کیا کسی الہامی کتاب نے دنیا کی اذیت کے احساس کو بند کرنے کے لئے کلوروفارم طیار کرنے کا طریقہ بتلایا ؟ کیا کسی کتاب نے تیرتھ یاترا یا زیارت مقامات مقدسہ کے لئے ریل گاڑی یا موٹر کار بنانے کی ترکیب بتائی ؟ کیا کسی مذہبی کتاب نے مصیبت کے وقت ایک دوسرے کو خبر دینے کے لئے تار یا ٹیلیفون بنانا سکھایا ؟ - کیا کسی مذہبی رہنما نے اپنی کرامات سے چیچک یا طاعون کو دنیا سے دور کردیا ؟ یا خدا سے ہم کلام ہوکر ریڈیم کے خواص معلوم کئے ؟ آخر وہ کون سی باتیں ہیں جو محض قیاسی اور خیالی باتوں پر لڑنے اور مرنے کے علاوہ الہامی کتابوں نے سکھلائی ہیں۔ اور جن سے کہ دنیا کی ترقی اور راحت میں کسی نئے باب کا اضافہ ہوا ہے ؟

(نگار) جو شکوک آپ نے ظاہر کئے ہیں، وہ آج کل ہر ذی فہم شخص کے دل میں پیدا ہو رہے ہیں اور اگر مذہب و متعلقات مذہب کو بالکل اسی روشنی (تاریکی ؟) میں دیکھا جائے، جو قدیم خیال کے اہل مذہب و ارباب دین کی طرف سے پیش کی جاتی ہے اور اگر اُن تمام بیانات کو جو خدا، نبی، الہام، وحی، اور کتاب اللہ کے متعلق وہ ظاہر کرتے ہیں یقین کرلینا ضروری ہو، تو اس میں کلام نہیں کہ جو اعتراضات آپ نے کئے ہیں یا اہل علم کیطرف سے کئے جاتے ہیں، ان کا کوئی جواب نہیں ہوسکتا اور اس کے ساتھ ساتھ ایک دن ساری دنیا کو (اہل مذہب کے نقطۂ نظر سے) ملحد و کافر ہو جانا ہے ——— یہاں ہندوستان میں تو خیر ابھی دو ہی چار جماعتیں ایسی

قائم ہوئی ہیں جو مذہب کے خلاف پروپاگنڈا کر رہی ہیں لیکن مغرب میں تو ایک طوفان برپا ہے اور مذہب نے ابھی شکست کو نمایاں طور پر تسلیم کر لیا ہے ـــــــ منکرین خدا نے اپنے کلب قائم کر رکھے ہیں، اپنی سوسائٹیاں بنالی ہیں۔ اپنے اخبار و رسائل شائع کرتے ہیں، اپنی کتابیں چھاپ چھاپ کر مفت تقسیم کر رہے ہیں اور علی الاعلان خدا کا انکار کر کے تمام انبیا اکرام کو گالیاں دے رہے ہیں ــ آپ کو شاید یہ سنکر حیرت ہوگی کہ امریکہ کی ملحد جماعت نے جس میں بڑے بڑے اہل علم شامل ہیں حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ کس استدلال پر اور کس اخلاقی قانون کے زیر اثر خدا کے وجود کو کلیساؤں کی صورت میں قائم کئے ہوئے ہے - اور وہ کیوں نہیں تمام عبادتگاہیں مسمار کر کے نوع انسانی کو اس مکر و فریب کے جال سے آزاد کراتی ــــــ ایک پُر لطف قصہ سنئے :-

امریکہ میں دستور ہے کہ سال میں ایک دن مقرر ہے جسکا نام " ادائے شکریہ کا دن " (Thanksgiving Day) رکھا گیا ہے۔ اس دن عام تعطیل ہوتی ہے اور کلیساؤں میں خدا کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے ــ ــ جب ملحدوں اور منکرین خدا کی یہ سوسائٹی وہاں قائم ہوئی تو اس نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ یا تو اس دن کی تعطیل بند کر کے شکریہ کی رسم کو بند کیا جائے ورنہ ایک دن اور بھی تعطیل کا مقرر کیا جائے جس کا نام (Blames giving Day) ہو اور اس دن بجائے شکریہ کے خدا پر الزام رکھنے کے لئے عام جلسے کئے جائیں !

کیونکہ اُن کے نزدیک اول تو خدا کو ماننا ہی سرے سے حماقت ہے اور اگر مانا جاتا ہے تو پھر کیوں نہ دنیا کے تمام تکالیف و مصائب کا الزام اس پر رکھا جائے

امریکہ میں الحاد (Atheism) نے اب ایک مستقل علم و فن کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور کثیر تعداد میں وہاں سے کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں اور مقبول ہو رہی ہیں ـــــــ بہرحال اس میں کلام نہیں کہ موجودہ دَور " لامذہبیت " کا دَور ہے، دنیا رفتہ رفتہ " مذہب " کی طرف سے بیزار ہوتی جا رہی ہے۔ اور اگر واقعی نوع انسانی کو اب بھی مذہب کی ضرورت ہے تو دنیا میں صرف ایک ہی مذہب (اسلام) ایسا ہے جو اس سیلاب کا مقابلہ کر کے لوگوں میں پھر ایک ایقانی و اذعانی کیفیت پیدا کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کی صحیح روح کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے ـــــ آپ باور کیجئے میں یہ دعوے ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک شخص ثالث کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں، کیونکہ میں جانتا ہوں لوگوں کو مذہب کے خیال سے کیوں نفرت پیدا ہوتی جا رہی ہے اور اسلام کیوں ان تمام الزامات سے بلند ہے جو دوسرے مذاہب پر اہل علم کی طرف سے عاید کئے جاتے ہیں ـــــــ خیر، یہ تو میرے خیالات پریشاں تھے جو آپ کے استفسار کو دیکھ کر بے اختیارانہ زبان پر آگئے اور جن کو غالباً آیندہ کسی صحبت میں

زیادہ تفصیل کے ساتھ پیش کروں گا ——— فی الحال آپ اپنے سوالوں کا مختصر جواب سن لیجئے:-

(۱) آپ کا پہلا سوال یہ ہے کہ اگر کتب مقدسہ الہامی ہیں تو ان میں اختلاف کیوں ہے؟ لیکن آپ نے اختلاف کی صراحت نہیں فرمائی ——— بہرحال اگر یہ اختلاف متعلق ہے حالات و واقعات سے تو ایسا ہونا ناگزیر ہے کیونکہ ان کتابوں کے اوقات بھی مختلف تھے اور زمانہ و وقت کے لحاظ سے ہدایت کے طریقوں میں اختلاف ہونا ضروری ہے ——— اگر آپ یہ فرمائے کہ ان کتابوں میں باہم تضاد ہے یعنی اصول اخلاق کے لحاظ سے ان میں تباین پایا جاتا ہے تو بیشک اعتراض درست ہو سکتا تھا ——— علاوہ اس کے جتنی مقدس کتابیں اس وقت پائی جاتی ہیں وہ سب نہ اپنی حقیقی حالت پر ہیں اور نہ اُن اصلی زبانوں میں ہیں۔ جن میں وہ پیش کی گئی تھیں اس لئے کون کہہ سکتا ہو کہ ترجمہ ہوکر امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ان میں کیا کیا تحریفات شامل نہیں ہوئیں ——— صرف ایک قرآن بیشک ایسی کتاب ہے جو ابھی تک اصلی زبان میں بغیر کسی تغیر و تبدل کے پائی جاتی ہے، سو آپ خود بخود کر سکتے ہیں کہ اس کا اصول تعلیم کتنا صاف ہے اور اس کی آیتوں میں باہم کسی قسم کا تضاد نہیں پایا جاتا۔

(۲) آپ کا دوسرا اعتراض پیدا ہوتا ہے آپ کے اس خیال و یقین کی بنا پر کہ آپ نے الہامی کتابوں کو علمی کتابوں کا مرتبہ دینا چاہا ہے، درانحالیکہ الہامی کتابیں صرف وہ الفاظ و خیالات ہیں جو انتہائی روحانی تاثر کے عالم میں اصلاح ملک و قوم کے لئے بے اختیارانہ انبیاء کے منہ سے نکل گئے ہیں، اس لئے آپ انکی کتابی حیثیت کو کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ بلکہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ان کے ذریعہ سے کتنے آدمیوں کو راہ راست پر لایا گیا ——— پھر اس صورت میں سوال نئی بات بتلانے کا ہو ہی نہیں سکتا ——— کیونکہ اصول اخلاق تو بہرحال ہر زمانہ اور ہر ملک میں ایک ہی رہے ہیں۔ اور مختلف انبیاء نے انھیں کو اپنے اپنے زمانہ کے لحاظ سے قایم کیا۔

(۳) کسی کتاب کا دوسری کتاب سے منسوخ ہوجانا افادہ و استفادہ کے لحاظ سے از خود ہوجایا کرتا ہے اس لئے اس کے اظہار میں کوئی خرابی نہیں ——— اگر قرآن کی تعلیمات واقعی اتنی مکمل ہیں۔ کہ ان کے ہوتے ہوئے دوسری اخلاقی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی تو ظاہر ہے کہ وہ منسوخ ہو ہی جائیں گی کیونکہ عملاً اُن سے استفادہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ رہا یہ امر کہ خدا نے کیوں نہ کوئی موثر طریقہ ایسا اختیار کیا کہ ساری دنیا بلا پس و پیش قرآن پر ایمان لے آتی۔ سو میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ خدا کو اس کی کیا ضرورت تھی اور کسی کے کفر و ایمان کا اثر اس کی ذات پر کیا

پڑتا ہے۔ نہ خدا یہ چاہتا ہے کہ کوئی مسلمان ہو جائے نہ وہ یہ چاہتا ہے کہ کوئی کافر بنا رہے۔ انسانی اخلاق کی صحت و خرابی خود انسان ہی کے لیے مفید و مضر ہے۔ خدا کو کیا پروا ہ ہے۔

(۴) اگر قرآن کے بعد واقعی کوئی کتاب ایسی پیش کی گئی ہے جو اخلاقی تعلیم کے لحاظ سے بلند تر ہے تو قرآن از خود منسوخ ہو جائے گا۔ اس میں کسی کے کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جب تک ایسا نہ ہو اس سوال کا اٹھانا ہی دور از کار ہے۔

(۵) بیشک کسی الہامی کتاب نے تار یا ٹیلی فون بنانا نہیں سکھایا، ریڈیم کے خواص دریافت نہیں کئے امراض کا موثر علاج نہیں بتایا، ریل اور موٹر کی ایجاد کی طرف رہبری نہیں کی۔ لیکن کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ریڈیم کے خواص دریافت کرنے والوں، ریل اور موٹر ایجاد کرنے والوں اور تار و ٹیلی فون بنانے والوں نے اس وقت تک کسی ایسے نسخہ کی طیاری میں کامیابی حاصل کر لی ہے جو اخلاق کو درست کرنے والا اور معصیت کے خیال کو دل سے محو کر دینے والا ہو ——— پھر اگر واقعی نظام تمدن کا تعلق ریڈیم اور ٹیلی فون سے نہیں بلکہ اخلاق انسانی سے ہے تو آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کس کو خدا کی خدمات زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

آپ اگر الہام کے حقیقی مفہوم کو جان لیں اور اسی کے ساتھ اس حقیقت کو کہ الہامی کتب کا مقصد صحیح کیا تھا۔ تو غالباً آپ کے دل سے از خود یہ تمام خدشات دور ہو جائیں ——— نگار کے صفحات میں اس سے قبل متعدد مقالات ایسے نکل چکے ہیں کہ اگر وہ کسی کے سامنے ہوں تو نہ یہ اعتراضات کسی کے ضمیر میں پیدا ہو سکتے ہیں اور نہ مذہب کے حدود سے آگے بڑھ کر وہ مذہب سے کوئی اور دنیاوی خدمت لینے کی توقع کر سکتا ہے۔

ہولی

دل میں شورش - روح میں مستی - ہواؤں میں گداز   آرزوؤں میں کشاکش - ولولوں میں سوز و ساز
طبع فطرت مستیوں پر - رنگِ موسم لاجواب   ہر نظر موجِ لطافت - ہر نفس موجِ شراب
نوجوانی کا تبسم - کمسنی کے قہقہے   شادمانی - ہاتھا پائی - رنگ رلیاں چہچہے
رنگ میں ڈوبے ہوئے دامن معطر سارِیاں   سرخ چہرے - نقرئی باہیں - عبیری انگلیاں
آنکھ کا امرت - لبوں کا شہد - چہروں کے گلاب   گردنوں کی دل فروزی - کاکلوں کا پیچ و تاب
پائے سیمیں کے کنول - روشن جبینوں کے ہلال   گیسوؤں کے ابر میں گلرنگ مانگوں کا جمال
نرم لہجوں کا ترنم - مست چالوں کی بہار   سبزۂ خوابیدہ پر جیسے خرامِ جوئے بار
دستِ نازک کر رہے ہیں نغز بو گلکاریاں   بھر کے ماری جا رہی ہیں رنگ کی پچکاریاں
رنگ کے دھبوں سے فرشِ خاک ہے صحنِ چمن   ہر طرف ہے لالہ و گل کا شہابی بانکپن

جگمگاتی ہیں فضا میں قوس کی رنگینیاں
ہر گلی کوچے میں گائی جا رہی ہیں ہولیاں

ذوقی (بی اے)

ابرِ کرم سے خطاب

کس مقدس میکدے سے جھوم کر نکلا ہے تو   کونسی گنگا کی چوکھٹ چوم کر نکلا ہے تو
آ رہا ہے کس ادا سے کیف برساتا ہوا   ایک پرچم کی طرح بیتاب لہراتا ہوا!
غرق ہے کس کیفِ روحانی میں اے ابرِ کرم   محو ہے کس فکرِ نورانی میں اے ابرِ کرم

ڈھونڈھ کوئی پاک دنیا اپنی الفت کے لئے   منتخب کر وہ زمیں بارانِ رحمت کے لئے
جس جگہ بھٹکی ہوئی انسانیت آباد ہو   جس جگہ انسان کا ٹوٹا ہوا دل شاد ہو

یہ جہنم زار اس الطاف کے قابل نہیں   رحمتوں کی جس پہ بارش ہو یہ وہ محفل نہیں
جس جگہ مذہب فروشی کا لقب ہے رہبری   جس جگہ ہے کارفرما زہد کی جادوگری
پنڈلیوں تک خرقۂ زہد و ورع آیا ہوا   لیکن آنکھوں میں رعونت کا نشہ چھایا ہوا
داڑھیوں میں معصیت کی تیرگی گوندھی ہوئی   راہبانہ شکل و صورت حرص میں ڈوبی ہوئی
معصیت کوشی کے پیکر، نفس سرکش کے مرید   خلد کے تاجر، خدا کو بیچنے والے پلید!

آہ یہ دنیا جہاں خوفِ خدا کوئی نہیں   فاقہ کش مزدور کے خوں کی بہا کوئی نہیں
جس جگہ سرمایہ داری کا لقب تہذیب ہے   جس جگہ کتوں کی عف عف خطبۂ تادیب ہے
رات بیخوابی سے کٹتی ہے جہاں انسان کی   گل رہی ہیں ہڈیاں انصاف کی، ایمان کی
بے محابا دیوِ باطل ہے جہاں خنجر بدست   جس جگہ تعزیر کے قابل ہے مردِ حق پرست

اس زمیں پر سانپ اور اژدر برسنے چاہئیں
برق گرنی چاہیے، پتھر برسنے چاہئیں

عدم

کلام مرزا جعفر علی خاں آثر لکھنوی

دل کی حد و ہوئی ہی ہاندازِ آشنا   تجھ سے حذر ہے ای نگہ نازِ آشنا
ہمت کہ دور منزلِ مقصود اب نہیں   آنے لگی ہی کانوں میں آوازِ آشنا
بیدل کیطرح مجھ سے بھی پنہاں ہا اثر   "انجام کارِ دشمن و آغازِ آشنا"

داغِ عشق کی مے سے چھلک رہا ہے   اک پھول ہی جو مہک رہا ہے
آنکھیں کب کی برس چکی ہیں   کوندا ابتک لپک رہا ہے
اب آئے بہار یا نہ آئے   آنکھوں سے لہو ٹپک رہا ہے
ہے دور بہت زمانِ وعدہ   اور دل ابھی سے دھڑک رہا ہے
کس نے وحشی آثر کو چھیڑا   دیوار سے سر پٹک رہا ہے

ہشیار کو اک آن میں دیوانہ بنا دے   دیوانہ جسے نرگسِ مستانہ بنا دے
بدمست کو ہشیار کہ ہشیار کو بدمست   جو چاہے جسے گردشِ پیمانہ بنا دے
سُن ای دلِ ناشاد وہ کیا پوچھ رہے ہیں   حسرت کی نگاہوں کو اب افسانہ بنا دے
دامن نہ ہو آلودہ آثر گردِ دوئی سے   مقصود کو مطلوب سے بیگانہ بنا دے

کوئی روٹھا ہوا پھر مہرباں ہی   مرے حسرت بھرے دل تو کہاں ہے
خدارا ہمت ای پائے شکستہ   نظر کے سامنے وہ آستاں ہے
نشیمن سے جو اٹھا تھا اسیرو   مری آنکھوں میں ابتک وہ دھواں ہے
قفس میں ہو گیا اکثر یہ دھوکا   ستارا صبح کا یا آشیاں ہے
نگاہیں ملکے جھکنا، دل کا جانا   مری آنکھوں میں ابتک وہ سماں ہے
مژہ نمدیدہ، چہرہ زرد، لب خشک   اثر پندارِ خودداری کہاں ہے

کلام دلؔ شاہجہان پوری

رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہے دل پر وہ مصیبت ہوتی ہے میں تارے گنتا رہتا ہوں جب دنیا غافل سوتی ہے

ای حسن ستم پرور تیری ہر چھیڑ قیامت ہوتی ہے جس راہ میں سر دھنتا ہے کوئی اس راہ میں کانٹے بوتی ہے

قدرت کی چمن آرائی کا گو ایک اثر ہے دونوں پر غنچے ہیں کہ ہنستے رہتے ہیں شبنم ہے کہ ہیم روتی ہے

ہے جنکے مقدر میں ساحل کیا خوف انھیں طغیانی کا جو ڈوب رہا ہو اس کو تو ہر موج قیامت ہوتی ہے

گو پیش نظر کوئی بھی نہ تھا گھبرا کے جدہر دیکھا یہ سنا کیا میرے تغافل کا شکوہ تقدیر ہی تیری سوتی ہے

ناوک ہے کہ پیکاں ناوک کا ای عشق اسے میں کیا سمجھوں اک ٹیس سی دل میں اٹھتی ہے رہ رہ کے کھٹک سی ہوتی ہے

ہیں اشک رواں اور اشکوں میں شامل ہے عرق پیشانی کا محشر میں ندامت قاتل کی دامن کا لہو اب دھوتی ہے

کشتی ہے مری محفوظ فنا اس کی ہے بقا گہرائی میں جس نے بھی کیا رخ ساحل کا وہ نذر تلاطم ہوتی ہے

ہنگامِ غمِ حسنین اے دلؔ ہر اشک کا یہ حاصل سمجھو

رہ جائے تو نوکِ نشتر ہے بہ جائے تو سچا موتی ہے

کلام عبدالمجید حیرت بی۔اے

زباں سے اگر کچھ کہا چاہتا ہوں تو شائستۂ امتنا چاہتا ہوں
تصور میں جس کے مزے لے رہا ہوں اُسے آنکھ سے دیکھنا چاہتا ہوں
جسے دیکھتا ہوں، مجھے دیکھتا ہے خدا جانے میں کیا کہا چاہتا ہوں
دل خوں شدہ کی حکایت نہ پوچھو عزیزو، سنبھالو، گرا چاہتا ہوں
خدا ہی کو معلوم ہے یہ تو حیرت کہ اسکے سوا اور کیا چاہتا ہوں

نہ دوا ہی نہ کچھ دعا میری اب تو سن لے مرا خدا میری
کون کرتا ہے مجھ غریب پہ رحم کون سنتا ہے التجا میری
ڈھونڈتا ہوں سکون دل حیرت یہ خطا ہے تو ہے خطا میری

اس طرح جس کی سزا دی جائے وہ خطا بھی تو بتا دی جائے
کام آئے گا کسی کے کوئی ؟ یہ توقع ہی اٹھا دی جائے
غم الفت ہی وہ شے ہے حیرت زندگی جس میں مٹا دی جائے

مایوس نہ ہو انساں گزرے جو مصیبت سے کٹ جاتی ہے ہر مشکل تھوڑی سی عزیمت سے
ناکام و فارہ کر، پامالِ جفا ہو کر واقف تو ہوئے کچھ ہم دنیا کی حقیقت سے
وہ وقت بھی اے حیرت ہر وقت نہیں رہتا جو وقت کہ کٹتا ہے رو رو کے مصیبت سے

کون کہتا ہے کہ پورا مرا ارماں ہو جائے کچھ تو تسکین دل زار کا ساماں ہو جائے
آرزو کوئی تو بر آئے دل مضطر کی کوئی مشکل تو گنہگار کی آساں ہو جائے
کام آئینۂ حیرت کا فقط اتنا ہے جب کوئی سامنے آجائے تو حیراں ہو جائے

کلام فراق گورکھپوری

شکست رنگ کے آئینہ دار بھی کچھ تھے چمن میں دیکھ لیا تھا جنھوں نے صحرا کو
نثار پرسش غم کے ترے کرم کے نثار ہیں غیر میں بھی کچھ اید وست عشق رسوا کو
گداز شیشۂ نازک ہے یا دلِ لرزاں بھرا ہے عشق نے صہبائے تاب فرسا کو
بتا کہ دولت کونین کیا کرے وہ دل کہ تجھ سے بھی نہ جو بدلے تری تمنا کو

کر ترک بھی دنیا کو دنیا کی طلب بھی کر ملتے ہوئے دنیا سے بچتے ہوئے دنیا سے

ہم سے کیا ہو سکا محبت سے تو نے تو خیر بے وفائی کی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہے۔
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ مفت روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (عہ) ششماہی تین روپیہ (ے)
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۳	فہرست مضامین مئی ۱۹۳۳ء	شمارہ ۵

نگار

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۳	مئی ۱۹۳۳ء	شمارہ ۵

ملاحظات

دار العلوم ندوہ کے کچھ اور اندرونی حالات

میں نے ۲۲ مارچ کو ایک تحریر ناظم ندوہ کے پاس روانہ کی تھی اور چند باتیں درسگاہ کے آئین نظم ونسق کے متعلق ان سے دریافت کی تھیں۔ لیکن آج تک انھوں نے جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی وہ سوالات یہ تھے :

(۱) موجودہ تعداد طلبہ کی کیا ہے اور کتنے طلبہ دار الاقامہ میں رہتے ہیں

(۲) نصاب تعلیم درجہ وار کیا ہے۔

(۳) انگریزی کی تعلیم نصاب میں کہاں تک رکھی گئی ہے اور اس پر کس حد تک عملدرآمد ہوتا ہے۔

(۴) کتنے طلبہ کو وظیفہ ملتا ہے۔ اور اس کی مقدار ماہانہ کیا ہے۔

(۵) کشمیر سے کتنے طلبہ بلائے گئے تھے اور ان کی تعلیم اور ان کے وظائف کا کیا انتظام ہوا اور کب ؟
(۶) دارالعلوم کے سالانہ مصارف کیا ہیں
(۷) کہاں کہاں سے کتنی امداد سالانہ مقرر ہے۔
(۸) کیا طلبہ کو عام اجازت ہے کہ وہ جس اخبار و کتاب کو چاہیں مطالعہ کر سکتے ہیں اگر عام اجازت نہیں ہے تو کیوں اور کون کون سے اخبار و رسائل یا کتابیں ممنوع المطالعہ ہیں
(۹) گزشتہ ۵ سال میں کتنے طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ (۱۰) طلبہ ذیل کے اخراج کا کیا سبب تھا۔
عبدالسلام - عبدالحیٰ - عنایت اللہ - علاء الدین احمد - غلام حسن الدین - رئیس احمد جعفری -
(۱۱) دفتر نظامت کے سالانہ مصارف کیا ہیں
(۱۲) انتظامیہ کمیٹی کے ممبر کون کون ہیں
(۱۳) انتظامیہ کمیٹی کے ممبر مقرر کرنے کا کیا قاعدہ ہے اور پبلک کا نمایندہ اس کمیٹی میں کون ہے۔
(۱۴) کیا یہ صحیح ہے کہ کسی طالب علم (غلام محی الدین) نے مہتمم دارالعلوم کو مارا اور کیوں
(۱۵) کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے انگریزی وضع کے بال رکھنے اور داڑھی منڈانے کی ممانعت کی ہے لیکن زلفیں رکھنے کی اجازت دیدی ہے
(۱۶) آپ کب سے نظامت کے عہدہ پر مامور ہیں اور اس دوران میں آپ نے کوئی قدم کسی خاص اصلاح کی طرف اٹھایا اور کیا ؟
(۱۷) کیا یہ صحیح ہے کہ بنگال کا کوئی طالب علم حال ہی میں بعارضہ چیچک مبتلا ہو کر فوت ہوا اور آپ نے علاج کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور جب یاد دہانی کی گئی تو آپ نے ہمیشہ بھول جانے کا عذر پیش کیا
(۱۸) کتنے معتمد فی الحال کام کرتے ہیں۔ ان کے نام کیا ہیں اور کیا فرائض ہیں
(۱۹) آپ کتنے سال کے لئے ناظم مقرر کئے گئے ہیں۔ یا یہ خدمت ہمیشہ کے لئے آپ کو تفویض ہوئی ہے
(۲۰) آیندہ ناظم اور معتمدین کا انتخاب ہوگا یا نہیں اور ہوگا تو کب اور اس کے متعلق کیا قواعد ہیں۔

میں جانتا تھا کہ وہ کبھی ان سوالات کا جواب نہ دیں گے، کیونکہ جب کسی کی دکھتی ہوئی رگ پکڑ لی جائے تو دھوکا دینے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ تکلیف کا اظہار کئے بغیر خاموشی سے اس کو گوارا کر لیا جائے، لیکن میں نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ناظم کو مخاطب کیا۔ کیونکہ اصول کا اقتضا یہی تھا۔ اور انھوں نے جواب نہیں دیا۔ کیونکہ معاملہ "کشف ساق" کا تھا پی کر رہ گئے۔

اس دوران میں چند اور اطلاعات بھی مجھے موصول ہوئیں جن کے متعلق ناظم ندوہ سے استفسار ضروری

ہے لیکن خط کے ذریعہ سے جواب حاصل کرنے کی توقع چونکہ بیکار ہے اس لئے میں نگار ہی کے ذریعہ سے ان کو بھی بارگاہ نظامت کبریٰ تک پہونچانا چاہتا ہوں :-

(۱) حال ہی میں ہز اکسلنسی نواب صاحب چھتاری کے ہاتھوں ایک مسجد کا سنگ بنیاد "سرزمین ندوہ" میں قائم کرایا گیا ہے - لیکن اس سے قبل غالباً نواب سر مزمل اللہ خاں سے بھی ایک مسجد کا سنگ بنیاد نصب کرایا گیا تھا۔ اور جب اعلیحضرت حضور نظام تشریف لائے ہیں تو اس وقت بھی کسی مسجد کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اس لئے دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا واقعی متعدد مسجدیں علیحدہ علیحدہ طیار ہو رہی ہیں جن کا سنگ بنیاد متعدد بار رکھا گیا، یا ایک ہی مسجد کے مختلف حصوں کا سنگ بنیاد مختلف لوگوں سے رکھوایا گیا۔ اگر کسی مسجد کی تعمیر کا یوں تجزیہ کرکے مختلف لوگوں کو سنگ بنیاد نصب کرنے کی سعادت کا موقعہ دینا کوئی دینی یا شرعی تدبیر ہے تو خیر، ورنہ اگر محض حصول زر کیلئے یہ سب کچھ کیا گیا ہے تو کیا یہ طریق عمل "ولا تشتروا بآیاتی ثمناً قلیلا" میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) کیا یہ صحیح ہے کہ حال ہی میں مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی نے دار العلوم کے مدرس ادب عربی (ہلالی عرب) کو دیکھ کر ان کی کٹی ہوئی داڑھی پر اعتراض کیا اور جب ہلالی صاحب کو معلوم ہوا تو انھوں نے برہم ہو کر اپنا استعفا ناظم کے پاس روانہ کیا،

(۳) کیا یہ درست ہے کہ مولوی حبیب الرحمان شروانی کی طرف سے بندرہ وظائف صرف ان لڑکوں کے لئے مخصوص ہیں جو داڑھی چھوڑنے میں دیگر طلبہ سے سبقت لے جائیں اور کیا کبھی ایسا بھی ہوا کہ "شروانی" وظیفہ کسی طالب علم کا داڑھی منڈوانے یا کٹوانے کی وجہ سے بند کر دیا گیا ہو۔ کیا ناظم صاحب تکلیف فرما کر ان مستورِ اللحیۃ طلبہ کے نام بتا سکتے ہیں، جن کو یہ وظائف ملتے ہیں

(۴) کیا یہ صحیح ہے کہ ایک طالب علم "حسن شنی" سہ ماہی امتحان دیکر اپنے مکان چلا گیا اور جب سالانہ امتحان ختم ہونے کے بعد واپس آیا تو مولوی حیدر حسن صاحب مہتمم نے اس کو اونچے درجہ میں ترقی دیدی۔ لیکن جب دیگر طلبہ نے احتجاج کیا تو پھر اس کو نیچے درجہ میں اُتار دیا گیا — اگر یہ درست ہے تو کیا ناظم صاحب ندوہ مہتمم کے اس طرز عمل کا کوئی سبب بتا سکتے ہیں اور نیز یہ کہ اُن کے کانوں تک یہ معاملہ پہونچا یا نہیں اور پہونچا تو انھوں نے کیا کارروائی کی۔

(۵) کیا یہ درست ہے کہ وظیفہ یاب طالب علموں کے ساتھ مہتمم کا سلوک اچھا نہیں ہے اور ایسے طلبہ کو معمولی سی معمولی غلطی پر "مدرسہ سے روٹی پانے" کا طعنہ دیا جاتا ہے، درانحالیکہ اسی قسم کی غلطی اگر غیر وظیفہ یاب طلبہ سے ہو تو پرواہ نہیں کی جاتی۔ اگر یہ صحیح ہے تو کیا ناظم ندوہ بتا سکتے ہیں کہ یہ کس قسم

کا اخلاقی مظاہرہ ہے اور ناظم نے اس جانب کوئی توجہ کی ہے یا نہیں

(۶) کیا یہ صحیح ہے کہ مہتمم مدرسہ جس وقت درس حدیث دیتے ہیں تو ان کے درس کا اکثر حصہ مشتمل ہوتا ہے صرف راویوں کی تکذیب و جراحت پر اور ان کے نزدیک ایک راوی کی صحت و ثقاہت کا معیار صرف یہ ہے کہ وہ "مسلک ابو حنیفہ" کی تائید کرنے والا ہو۔ کیا ناظم نے خود کبھی ان کے درس میں جاکر اس امر کی تحقیق کی ہے ؟

(۷) کیا یہ درست ہے کہ غیر مقلد طلبہ کے ساتھ مہتمم خصوصیت کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتے ہیں اور عصبیت سے کام لے کر امتحان میں ان کو قصداً فیل کیا جاتا ہے۔

(۸) کیا یہ صحیح ہے کہ مہتمم مدرسہ سوائے علمائے حنفی کے دیگر مسالک کے علما کو درس و تدریس کے وقت بُرا کہا کرتے ہیں اور ان پر بیجا حملے کرتے رہتے ہیں۔

(۹) کیا یہ صحیح ہے کہ طلبہ کے لئے وظیفہ تو دس روپیہ ماہوار کے حساب سے وصول کیا جاتا ہے اور ان پر بمشکل پانچ سات روپیہ صرف کئے جاتے ہیں۔

میں ناظم صاحب کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہ تمام اطلاعات مجھے دار العلوم ندوہ ہی کے طلبہ و اساتذہ کے ذریعہ سے حاصل ہوئی ہیں اور اگر ان میں غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے تو ان کو تفصیل کے ساتھ جواب دینا چاہئے۔ لیکن اگر انھوں نے سکوت اختیار کیا تو میں سمجھوں گا کہ یہ اطلاعات واقعی درست و صحیح ہیں اور پھر میں ان تمام حالات و واقعات پر پوری طرح تنقید کر کے پبلک کو اخبارات و رسائل، جراید و پمفلٹ کے ذریعہ سے متنبہ کروں گا کہ "دار العلوم ندوہ" کی انتظامی حالت کس قدر خراب و ردی ہے اور ملک کو اس کی اعانت کی طرف سے دستکش ہو جانا چاہئے۔

ہندوستان کی ایک فلاکت زدہ قوم سے چند اصولی اور سادہ باتیں

یاد رکھو کہ صرف زمین ہی گردش نہیں کرتی بلکہ کائنات کی ہر چیز گردش میں ہے، یہاں تک کہ خود نظام شمسی بلکہ وہ عالم کہکشاں بھی جس کا ایک حقیر حصہ نظام شمسی ہی، ہر وقت گردش کی حالت میں ہے اور ہر ہر ذرہ میں ہر لمحہ کچھ نہ کچھ انقلاب ہوتا رہتا ہی۔ پھر غور کرو کہ جب زندگی کے اصول بدل جائیں، لوگوں کی ذہنیت بدل جائے، آسمان و زمین بدل جائے تو ترقی کے اصول کیوں نہ بدلیں گے، قانون و شریعت میں کیوں نہ تغیر کی ضرورت ہوگی۔ پھر اگر کوئی قوم ایسی ہی جو صرف اپنے اسلاف کی ترقی کو سامنے رکھکر اور انھیں کے اصول پر کاربند ہو کر آگے بڑھنا چاہتی ہی تو اسکو سمجھ لینا چاہئے کہ اس نے اپنا سفر اس حال میں شروع کیا ہی کہ اسکی پشت منزل کی طرف ہی اور منہ ایک عمیق غار کی جانب۔

پھر یوں بھی میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں کونسی گری ہوئی قوم ایسی ہی جسکا ماضی کسی وقت درخشاں نہیں ہا اور

جس کے اسلاف نے ترقی نہیں کی - اس میں خصوصیت نہ مسلمانوں کی ہے نہ ہندوؤں کی، اس لئے اسلاف کے حالات پر غور کرکے یہ نہ دیکھو کہ انھوں نے کس طرح ترقی کی بلکہ یہ دیکھو کہ ان کو زوال کیوں ہوا - اور یہیں سے یہ نکتہ واضح ہوگا کہ ترقی کا اولین اصول زمانہ و اقتضاء زمانہ کا ساتھ دینا ہے - اور جب تک اس کا ساتھ کسی قوم نے دیا ترقی کرتی رہی اور جب اس کا لحاظ نہ رکھا تو زوال شروع ہوگیا - اگر اسلاف نے کسی خاص اصول کے ماتحت ترقی کی تھی تو وہ اسی وقت کیلئے موزوں بھی تھی، آج ان کے نقش قدم پر چلکر کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں - یقیناً اسلاف کے کارنامے ہمکو اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے تاکہ ہم اُن سے پیچھے نہ ہٹنے پائیں، لیکن انکے اصول کار کو بالکل بھلا دینا چاہیے کیونکہ اب وہ بیکار ہیں اور ان کی تقلید تضیع اوقات -

مسلمانوں کے انحطاط کا بڑا سبب یہی قدامت پرستی ہے - وہ سمجھتے ہیں کہ ہم عہد سعادت و عہد خلفا کی پالیسی یا طریق کار کو اختیار کرکے ترقی کرسکتے ہیں، درانحالیکہ آج اُن میں سے ایک بات بھی ہمکو کامیاب نہیں بنا سکتی - وہ زمانہ اپنے ماحول کے لحاظ سے ایسا تھا کہ جو قوم عزم راسخ کے ساتھ تلوار لیکر اٹھ کھڑی ہوتی کامیاب ہوجاتی، لیکن آج تو کوئی ایسا کرے - پہلے اگر صرف قوت بازو سے حکمرانی ہوتی تھی تو آج علم و دماغ سے ہوتی ہے، پہلے اگر ترقی کا مفہوم صرف نان شعیر کی فراوانی تھا تو آج گنج شایگاں کی معموری پر بھی قناعت نہیں کی جاتی -

اب اس بحث کو ذرا محدود دائرہ میں لاکر سیاسیات ہند پر منطبق کیجئے اور مسلمانوں میں جو عام احساس اپنی گری ہوئی حالت اور ہندوؤں کی ترقی کا پیدا ہوگیا ہے اس پر غور کرکے کسی نتیجہ تک پہونچنے کی کوشش کیجئے -

جس نے کچھ بھی مطالعہ دور حاضر کا کیا ہے وہ بہ آسانی معلوم کرسکتا ہے کہ موجودہ عہد میں، کامیابی کا راز، صرف پروپگنڈا میں مضمر ہے - اور یہ صرف اس لئے کہ وسائل آمد و رفت اور ذرائع خبر رسانی کی ترقی اور دیمقراطی طریق تنظیم سے رائے عامہ کے اقتدار کا اثر نہایت وسیع ہوتا جارہا ہے اور کسی امتیازی حیثیت اختیار کرنے کے لئے یہ بالکل لازم ہوگیا ہے کہ رائے عامہ کو اپنا طرفدار بنایا جائے جس کا واحد طریقہ پروپگنڈا ہے - ہندو قوم کی عزت، بین الاقوامی دنیا میں، صرف اس وجہ سے ہوئی کہ اُس کے بعض افراد، دنیا کی رائے عامہ کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں - رابندر ناتھ ٹیگور نے شاعری میں شہرت پیدا کی، بوس اور رامان نے سائنس میں، رادھا کرشنا نے فلسفہ میں اور گاندھی نے ایک ایسا نیا فلسفہ پیش کیا جو یورپ کے لئے بالکل نئی چیز تھا - یورپ عجائب پرست ہے - نئی چیز کی جستجو میں ہر وقت سرگرداں رہتا ہے - اگر کوئی نیا فلسفہ، نیا مذہب، نئی تحریک، یورپ کے سامنے یورپ کے اشتہار اور پروپگنڈا کے طریقوں کو اختیار کرکے پیش کی جائے تو یورپ کی ہمدردی اور طرفداری حاصل کرنا بہت آسان کام ہے - مشرقی ممالک کی ایک عرصہ سے یہ غلامانہ ذہنیت ہوگئی ہے کہ جس چیز کی مغرب تعریف کردیتا ہے وہ انھیں بھی اچھی نظر آنے لگتی ہے - ان کو اپنی چیزیں بھی وہی اچھی نظر آتی ہیں جنھیں یورپ ایک دفعہ اچھا کہدیتا ہے - اس لئے افراد اور اقوام کی کامیابی کے لئے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ ایسی تحریکیں شروع کی جائیں جو دنیا کی رائے عامہ کو اپنی طرف جذب کرسکیں - ایسی تحریکیں کیا ہوسکتی ہیں - ظاہر ہے کہ ایسی تحریکیں وہی ہوسکتی ہیں جو یورپ کی سمجھ میں آسکیں - اور جنکا لائحہ عمل مغربی طریق

سے مشابہ ہو۔ آپ فلسفہ، تصوف و مذہب کے نہایت باریک نکات پر مغز پاشی کیجئے، شعر و ادب کے جواہر پارے پیش کرتے رہیئے، علمی و اخلاقی و سیاسی و معاشرتی تحریکیں شروع کیجئے۔ لیکن جب تک آپ یورپ کی توجہ اپنی طرف جذب کرنے میں کامیاب نہ ہوں گے، ان سب کا انجام یقینی طور پر ناکامی ہوگا۔ البتہ اگر آپ کا انداز بیان و طریق کار مغربی اصول کے مماثل ہے۔ اور اہل مغرب کی سمجھ میں آنے والا ہے تو آپ کی کامیابی ممکن نظر آنے لگتی ہے۔ مشرق کی اس وقت جسقدر بھی کامیاب تحریکیں ہیں، وہی ہیں جو ابتدا میں یا تو مغرب کے اتحاد عمل سے یا ان کے طریق کار کی تقلید کے ساتھ شروع کی گئی ہیں۔ مغرب جن تحریکوں کو سمجھ سکتا ہے۔ ان میں ممتاز مرتبہ تحریک مساوات، آزادی اور قومیت کو حاصل ہے۔ مذہب کی بنیاد پر جسقدر تحریکیں شروع ہوتی ہیں اُنھیں تعلیم یافتہ اقلیت تو شاید سمجھ سکتی ہے لیکن وہ بھی بہت مشکل سے، مگر رائے عامہ کو اُن سے کبھی کوئی ہمدردی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ایک جماعت کا، اپنے مذہبی امتیاز کی وجہ سے، مخصوص مراعات او حقوق کا مطالبہ کرنا اُن کی فہم سے بالاتر ہے۔ مذہب ایک مدت ہوئی، یورپ کی قومی تحریکوں سے خارج ہو چکا ہے۔ وہاں کی تحریکیں سیاسی اور اقتصادی ہوتی ہیں۔ قومی آزادی، ملکی صنعت کی ترقی، تقسیم دولت کی اصلاح کی تحریکیں ان کے نزدیک سمجھ میں آنے والی تحریکیں ہیں۔ لیکن مذہب کو قائم رکھنے والی تحریکیں ان کے نزدیک عہد وسطےٰ اور عہد تاریک کی خوفناک یادگاریں ہیں۔ اسی لئے جو افراد و اقوام یورپ کی ہمدردی حاصل کر کے کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ اپنے آپ کو ابتداءً اس سانچے میں ڈھال لیں۔ شاعر ہیں تو اپنی نظم میں یہی کیفیت پیدا کریں، فلسفی سائنس داں، مدبر غرض جو کچھ بھی ہیں وہ یورپ کی اس مخصوص ذہنیت کو اپنا رہنما بنائیں۔ اور جب وہ ایک دفعہ رائے عامہ کی توجہ جذب کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر اپنی مخصوص تہذیب و معاشرت، اپنی زبان، اپنے مذہب و اپنی تمام خصوصیات کو کامیاب کر سکتے ہیں۔ یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر برطانوی پارلیمنٹ میں انگریزوں کے نمائندے گاندھی ٹوپی اوڑھ کر جاتے ہیں۔ اور بڑے بڑے لکھ پتی کھدر پہننا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں

مشرق میں ایک ہولناک جنگ کے آثار ترقی پیداوار کے آئندہ پروگرام میں، سوویٹ روس، اپنی عسکری قوت کو ترقی دینے کا تہیہ کر چکا ہے۔ ہوائی طاقت کو وہ خصوصیت کے ساتھ بڑھانا چاہتا ہے۔ اور اپنے ہوائی بیڑے کو دنیا میں سب سے زیادہ مضبوط بنا رہا ہے۔ مختلف قسم کے ہوائی جہاز مثلاً بم پھینکنے والے، تارپیڈو لیجانے والے، ڈریڈناٹ، کروزر، وغیرہ بکثرت بنائے جا رہے ہیں۔ مطمح نظر یہ ہے کہ جو طاقت برطانیہ کو اپنی بحری بیڑے سے حاصل ہے وہی طاقت، روس کو اپنی ہوائی بیڑے سے حاصل ہو جائے۔ اس مطمح نظر کو پورا کرنے کے لئے وہ ایک بے پناہ عزم کے ساتھ سرگرم کار ہے۔ یہ مطمح نظر کوئی پوشیدہ راز نہیں ہے جسکا علم فوج ہی کے صرف چند اعلیٰ افسروں کو حاصل ہے، بلکہ یہ ایک قومی مطمح نظر ہے جس کا اعلان ملک کے گوشہ گوشہ میں کیا جا چکا ہے اور جس کی تکمیل جمہور روس کا ہر ہر فرد اپنا ذاتی فرض خیال کرتا ہے

نوجوانوں کو اس اسکیم سے جو دلچسپی ہے اور جس جوش و خروش سے وہ اس کی تکمیل میں حصہ لیتا چاہتے ہیں اس سے حکومت پوری طرح فائدہ اٹھا رہی ہے

روسی طرح ہوائی بیڑے کا سردار، ایک شخص مسمی برانانف ہے۔ جو نہ خود ہوا باز ہے اور نہ کوئی ماہر انجنیر، لیکن اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اُسے تنظیم میں بڑا ملکہ حاصل ہے۔ اور نگرانی کرنے اور ولولۂ عمل پیدا کرانے میں اس کا مقابلہ کوئی دوسرا شخص نہیں کر سکتا۔

روس کا خیال ہے کہ بحری قوت کا زمانہ ختم ہو رہا ہے اور ہوائی قوت کا زمانہ شروع ہو رہا ہے۔ روس اس بات کی پوری کوشش کر رہا ہے کہ ہوائی قوت میں وہ کسی حریف سے پیچھے نہ رہے۔ وقتی طور پر اس مسئلہ کو اس وجہ سے بھی اور زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے کہ روس اور جاپان کے تعلقات، منچوریا کے قضیہ کی وجہ سے کافی کشیدہ ہو گئے ہیں۔ علاوہ اس کے جرمنی اور فرانس کے عسکری معاہدہ سے بھی روس بدظن ہے۔

جرمنی کے کارخانوں کو حال ہی میں، روس نے ایک ہزار ٹن ہوائی جہاز کے سامان کے لئے آرڈر دیا ہے اور آسٹریا کے کارخانوں سے ایک سو ساٹھ دوربین کے شیشے منگوائے گئے ہیں۔ روس میں اس وقت تئیس بڑے کارخانے ایسے ہیں جو ہوائی جہازوں کے بنانے میں مصروف ہیں۔ یورپ کے ایک بڑے کارخانہ دار کا خیال ہے کہ روس کے ہوائی جہاز کے کارخانوں کی اہلیت پیداوار، امریکہ کے کارخانوں سے بھی زیادہ ہے۔ اور اس کے وہ دو سبب بیان کرتا ہے اولاً یہ کہ روس میں جنگ کے مخالفین کی جماعت مفقود ہے دوسرے وہاں کے مہتمین سرمایہ داروں کو منافع تقسیم کرنے کے لئے مجبور نہیں ہیں۔ روس کے پاس اس وقت تقریباً سترہ سو ہوائی جہاز ہیں اور عنقریب ان کی تعداد تین ہزار ہو جائے گی۔

روس کے ہوائی بیڑے کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں پیراشوٹ (وہ چھتری جس کے ذریعہ سے نیچے اترتے ہیں) کے استعمال کو ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ اور ہوا بازوں کو تاکید ہے کہ وہ کسی حال میں بھی اپنی مشین کو نہ چھوڑیں اور کوشش کر کے اسے زمین پر واپس لائیں۔ اس میں شک نہیں کہ برطانیہ اور امریکہ کے مقابلہ میں روس میں ابھی تک بہت سی خامیاں ہیں۔ لیکن اس کے کام کرنے والوں میں ایسا عجیب و غریب ولولۂ عمل پایا جاتا ہے کہ وہ بہت جلد اپنی خامیوں کو رفع کر کے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے مبارزطلبی کر سکیں گے۔

مغربی زبانوں کے ادب لطیف پر تبصرہ

(۲)

ادبیات فرانسیسی

آغاز فرانسیسیوں کا سلسلۂ نسب قوم "گال" (Gaul) سے ملتا ہے اور باوجود تمام معاشرتی و تمدنی انقلابات کے اس قوم کی خصوصیتیں فرانسیسیوں میں اب بھی نمایاں ہیں فرانسیسی زبان میں تین عناصر غالب نظر آتے ہیں - لاطینی - کلٹک (Celtic) اور " بربری " (Barbarians)

جہاں تک تاریخی تحقیق کام دے سکی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ادبیات فرانسیسی کی ابتدا گیارہویں صدی سے ہوتی ہے - لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت تک فرانسیسی زبان کافی حد تک مرتب و مدون ہو چکی تھی - اگرچہ نویں صدی تک اس ملک کی ادبی و علمی زبان لاطینی تھی - فرانسیسی صرف عامیوں کی زبان تھی -

جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ معنے نہ نکالنا چاہیے کہ گیارہویں صدی سے پہلے فرانسیسی زبان میں کوئی ادب نہ تھا - اس میں شک نہیں کہ گیارہویں صدی سے پہلے فرانس میں مرتب ادبیات کا پتہ نہ تھا لیکن تبرکات و نوادر کے طور پر ان نغمات و رزمیات کو پیش کیا جا سکتا ہے جو ساتویں صدی عیسوی سے بھی پہلے کی چیزیں ہیں - رزمیات میں قدیم ترین مجموعہ " چانسان ڈگسٹے " (Chanson - de - Geste) کے نام سے مشہور ہے جو زیادہ تر فرانس کی تاریخ و روایات اور بالخصوص شارلمین اور اس کے غازیوں کے کارناموں سے متعلق ہیں - ان میں سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ پاکیزہ " رزم رولاں " (Chanson de - Roland) ہے جس میں شارلمین کی آخری لڑائی اور اس کے غازی رولاں کی موت کا بیان ہے - محاربات شارلمین کے مقابلہ میں دوسری طرف شاہ آرتھر اور اس کے غازیوں کے کارنامے بھی منظومات کی شکل میں موجود ہیں - ان میں سب سے مشہور نظم تشریسیٹن ڈی ٹرائس کی لکھی ہوئی اور بارھویں صدی کے آخری دور کی چیز ہے -

تیرھویں صدی سے تاریخ نگاری کی ابتدا ہوئی۔ اس عہد کا نامور مورخ جان ویل (Joinville) ہے جو سینٹ لوئی (St. Louis) کا دوست تھا اور جس نے نویں جنگ صلیبیہ کے واقعات کو نہایت پاکیزہ اور خوبصورت زبان میں بیان کیا ہے۔ اس کے بعد ولہارڈوئن (Villehardouin) نے چوتھی جنگ صلیبیہ کو قلمبند کیا۔

ان صدیوں میں فرانس کے اندر عشقیہ شاعری کا رواج نہ تھا۔ البتہ لائر (Loire) کے جنوب میں دو چار غزل گو موجود تھے۔ رزمیات کے مقابلہ میں عوام کے لئے ایک اور قسم کے منظومات موجود تھے جن کو "رومان ڈی رینارٹ" (Roman-de-Renart) کہتے ہیں یہ دراصل ہجویہ نظمیں تھیں اور روزمرہ کی عام زندگی کو مضحکہ انگیز پیرایہ میں بیان کرتی تھیں۔

ان کے پہلو بہ پہلو "حکایات" (Fabliaux) بھی تھیں جو زیادہ تر ہجویہ تھیں۔ لیکن ان میں بعض نہایت سنجیدہ متین اور پُراثر بھی تھیں۔ "رومان ڈی لاروز" (Roman-de-la-Rose) کو تیرھویں صدی کا اہم ترین کارنامہ سمجھا جاتا ہے جو دو شاعروں کی متفقہ کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس کو گولامی (Guillaume) نے ۱۲۳۷ء کے قریب لکھنا شروع کیا اور ۴۰۰۰ سطریں اووڈ (Ovid) کے طرز پر لکھ ڈالیں۔ اس کے بعد ۱۸۰۰۰ سطریں ژین ڈی میون (Jean-de-Meung) نے لکھ کر شامل کر دیں اور حکمت و فلسفہ سے ان کو معمور کر دیا۔ اس عہد کا ایک ممتاز خوش بیان واقعہ نگار فرائسارٹ (Froissart) ہے۔ دینیات میں گرسان (Gerson) ایک خاص وقعت رکھتا ہے۔ وہ ایک بلیغ اور خوش بیان خطیب تھا۔ "تقلید مسیح" (The Imitation of Christ) جو اب عام طور پر کیمپس (Kempis) کی تصنیف مانی جاتی ہے اکثر گرسان سے منسوب کی جاتی ہے۔

پندرھویں صدی میں فرانس ادبی نقطۂ نظر سے زیادہ تر خشک و بے رنگ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن عشقیات میں چارلس ڈارلیاں (Charles-d'Orleans) اور فرانسے ولاں (Francois Villon) کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ موخرالذکر ایک اوباش و قزاق مگر ایک زبردست شاعر تھا طنز و تمسخر۔ جذبات کی مصوری اور تاثر۔ ہر چیز میں اس کو ملکہ حاصل تھا۔

انگلستان کی طرح فرانس میں بھی تھیٹر کا وجود قدیم ہے۔ لیکن ازمنۂ وسطےٰ تک یہاں بھی ڈرامہ مذہبیات و اخلاقیات کی حدود سے آگے نہیں بڑھا۔ پندرھویں صدی میں فلپ ڈی کمینیز (Philippe de Commynes) کا نام لینا بھی ضروری ہے جو لوئی یازدہم کے عہد کا واقعہ نگار تھا اور تین بادشاہوں کا

عہد حکومت میں مشیر دولت رہ چکا تھا۔ تدبر و سیاست میں اس کو خداداد ملکہ تھا اور اس کا انداز بیان سادہ اور دلکش ہوتا ہے۔

"نشاۃ الثانیہ"

سولھویں صدی سے فرانسیسی ادبیات پر "نشاۃ الثانیہ" کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوتے ہیں۔ یورپ کے اور ممالک کی طرح فرانس میں بھی ادبی بیداری کا خاص سبب ادبیات قدیمہ کی چھان بین ہے۔ لوگوں کو شوق ہوا کہ اسلاف کے علمی و ادبی کارناموں کو پھر سے زندہ کیا جائے اور اس شوق کے ساتھ ساتھ ادبی مذاق کی جلا ہوتی گئی۔

قوم کی مطمح نظر میں جو تغیر ہو گیا تھا اس کی علامتیں سب سے پہلے کلیمنٹ میرو (Clement Marot) کی تصنیفوں میں نمایاں ہیں جن میں ایک ناقابل بیان انداز ظرافت اور ایک خاص شاعرانہ لطافت موجود ہے۔ میرو کے ساتھ سینٹ جیلے (Saint Gelais) کا نام لینا بھی ضروری ہے۔ جس نے پہلے پہل اہل فرانس کو "سانٹ" (Sonnet) یعنی غزلیات سے آشنا کیا۔

اس دور کی ایک گرانقدر ہستی فرانسے رابیلے (Francois Rabelais) ہے۔ اُس نے نثر میں دو رزم نامے "گارگنٹوا" (Gargantua) اور "پینٹاگرویل" (Pantagruel) کے ناموں سے لکھے۔ جو ظریفانہ مبالغہ، زور بیان اور شان و شوکت کے لحاظ سے بے مثل تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ہجو کے پردہ میں انسانی فطرت کو بے نقاب کرنے میں رابیلے کو شکسپیر کا سا کمال حاصل تھا۔

سولھویں صدی کے آخری نصف حصہ سے فرانسیسی شاعری میں ایک نئی تحریک شروع ہوئی۔ اس کی علم بردار شعرا کی وہ جماعت تھی جس کو "خوشۂ پروین" (The Pleiade) کہتے ہیں۔ اس جماعت کے سرآوردہ نمایندے رانسارڈ (Ronsard) وڈبیلے (Du Bellay) پونٹس ڈی ٹیارڈ (Pontus de Tyard) بیف (Baif) جاڈیل (Jodelle) ڈاریٹ (Daurat) اور بیلو (Belleau) تھے۔ ان لوگوں کی ساری کوشش یہ تھی کہ فرانسیسی زبان میں ایسے شاہکار لکھے جائیں جو ادبیات قدیمہ کے مدمقابل بن سکیں۔

ان میں سب سے زیادہ مشہور و معروف رانسارڈ ہے۔ لیکن باستثنائے چند اس کے رزمیات زیادہ ترگراں اور غیر دلچسپ ہیں۔ بعض "غزلیات" (Sonnets) پاکیزہ ہیں۔

اس عہد کی نثر عموماً تراجم تک محدود رہی امیو (Amyot) نے پلوٹارک کا ترجمہ کیا۔ اور کالون

(Calvin) نے مذہبی کتابوں کا۔

لیکن سولھویں صدی کا سب سے بڑا نثر نگار مانٹین (Montaigne) ہوا ہے جس کے "مضامین" (Essais) سارے یورپ میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ غالباً نثر مضامین لکھنے کی ابتدا یورپ میں اسی شخص سے ہوئی۔ وہ اپنے مضامین میں اپنی ذاتی و انفرادی زندگی کو واقعات کثرت سے بیان کرتا ہے اور اس پیرایہ میں کہ پڑھنے والے کو گراں نہیں گزرتا۔ ظرافت اور تخیل کے ساتھ سلاست و روانی کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیتا۔ اس کے "مضامین" فرانسیسی زبان میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو انگریزی زبان میں چارلس لیمب (Charles Lamb) اور رابرٹ لوئی اسٹونسن (Robert Louis Stevenson) کے "مضامین" اور عوام میں اسی کثرت سے پڑھے بھی جاتے ہیں۔ ہر مزاج اور ہر طبیعت کے لوگ مانٹین کو انہماک اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ کبھی تو وہ ابیقورس کی طرح ہم کو شادباشی کا سبق دیتا ہے اور کبھی "رواقیوں" (Stoics) کی طرح سنجیدگی اور ثقاہت کی تبلیغ کرتا ہے۔ کبھی اس کا انداز بیان بلیغ اور پر مغز ہوتا ہے اور کبھی وہ بالکل روزمرہ پر اتر آتا ہے اور سیدھی سادی عام فہم باتیں عام فہم زبان میں بیان کرتا ہے۔ اس کے اسلوب کو نہ قدیم کہا جا سکتا نہ جدید ہاں حسین وجمیل ضرور کہا جا سکتا ہے۔

سترھویں صدی

سترھویں صدی کے پہلے نصف حصہ تک ادبیات فرانس کی رَو وہی تھی جو پچھلی صدی میں رہ چکی تھی۔ لیکن مالہربی (Malherbe) کی ذات سے شاعری میں کچھ جدتیں شروع ہوئیں۔ مالہربی کی زندگی میں اس کی قدر نہیں ہوئی۔ مگر بعد میں تمام شعرا نے اس کی تقلید کو ضروری سمجھا۔ اس کی نظمیں سلاست بیان اور موسیقی کی بہترین مثالیں ہیں۔ فرانسیسی شاعری میں جو بے عنوانیاں شروع ہو گئی تھیں۔ ان کی روک تھام کو مالہربی نے اپنا فرض اوّلین سمجھ لیا تھا۔ مالہربی کے ساتھ ہم کو ریگنیئر (Regnier) کا نام بھی یاد رکھنا ہے جو آخر سترھویں صدی کا ایک زبردست ہجوگو تھا سترھویں صدی کے اوائل تک ڈرامہ نویسی میں وہی سولھویں صدی کی پابندیاں چلی آ رہی تھیں یعنی یا تو مذہبی ڈرامے لکھے جاتے تھے یا متقدمین مثلاً سینکا (Seneca) اور یوری پیڈیز (Euripides) کے اتباع میں تمثیلیں تصنیف ہو رہی تھیں۔ ہارڈی اور میرو (Mairet) مشہور ڈرامہ نویس تھے ۱۶۳۶ء میں پیرے کارنے (Pierre Corneille) نے بڑی کاوشوں کے بعد "فرانسیسی المیہ" کی طرح ڈالی جو نوعیت کے لحاظ سے دیگر ممالک کے "المیات" (Tragedie) سے مختلف ہے۔ "سپہ سالار" اس کا مشہور المناٰمہ ہے۔ اس کے ڈراموں کی سب سے بڑی خصوصیت واقعیت ہے۔

واقعہ نگاری کا شوق اس کو اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ کارنئے مواد کی تلاش میں کبھی تاریخ سے باہر نہیں جاتا تھا اور صرف سلاطین وابطال کے کارناموں کو تمثیل کی صورت میں پیش کرتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانہ کی پبلک کو عوام سے زیادہ شاہوں اور سرداروں کے ساتھ دلچسپی تھی اور وہ انھیں کی داستانیں سننا زیادہ پسند کرتی تھی۔

اس عہد کا مشہور فلسفی ڈیکارٹ (Descartes) تھا لیکن چونکہ اس کی طرز نگارش پر ادبی رنگ غالب ہے اور اس کی نثر میں سسرو (Cicero) کی سحر نگاری کا لطف ہے اس لئے اس کو تاریخ ادبیات میں جگہ دینا چاہئے۔ اس کی تین تصنیفیں مشہور ہیں۔ "مقالات متعلق بہ طریق" (Discourse) جس میں طریق استدلال سے بحث کی گئی ہے۔ "تامل" (Meditation) جس میں اس کا خاص فلسفہ ہے اور "علامات جذبات" (Traite des passions)، جو مسئلہ جبر و اختیار سے متعلق ہے۔ ڈیکارٹ کا خیال ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ریاضت کرکے اپنے جذبات پر پورا قابو حاصل کر سکتے ہیں اور اس طرح ارادہ کو داعیات نفس پر محکم بنا سکتے ہیں۔ کارنئے ڈرامہ نویس کا مرکزی فلسفہ بھی یہی ہے۔

ڈرامہ نویسی میں کارنئے کا حریف ژین ریسین (Jean Racine) تھا۔ ریسین کے ہر طرف دشمن پیدا ہوگئے اور آخر میں بیچارے کو تمثیل کی دنیا سے کنارہ کش ہونا پڑا۔ لیکن پھر بعد کو میڈم ڈی مینٹیان (Madame de Maintenon) کی فرمائش پر ڈرامے لکھنے لگا۔ اس کا شاہکار "اطالی" (Athalie) اور "استر" (Esther) اسی دور کی پیداوار ہیں۔ اس کے علاوہ ریسین نے مذہبی گیتوں کے سوا کچھ نہیں لکھا۔ ریسین اپنے محاسن شعری کے اعتبار سے فرانسیسی ادب میں وہی مرتبہ رکھتا ہے جو انگریزی ادب میں ملٹن کا ہے۔

فرانسیسی مصنفین میں سب سے زیادہ ہردلعزیز اور مشہور عالم مولئیر (Molière) ہے اس کی شاعری میں فرانس کی قومی خصوصیتیں بحد تمام نمایاں ہیں۔ مولئیر کی ذاتی زندگی ایک سلسلہ تھی طرح طرح کی صعوبتوں کا اور اس کی گردوپیش کے حالات بھی اس کے لئے کچھ کم سخت اور تاب آزما نہ تھے مولئیر اپنے "مضحکیات" (Comedies) کے لئے مشہور ہے جو ہر قوم اور ہر ملک میں دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ اس کی طرز نگارش خامیوں سے پاک نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے عجلت کے ساتھ لکھتا ہے اور پھر اس پر نظر ثانی کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ باوجود اس کے وہ نہ صرف ایک تمثیل نگار کی حیثیت سے ممتاز ہے بلکہ اس کے اسلوب میں جو خصوصیت ہے وہ اس کو

(Calvin) نے مذہبی کتابوں کا۔

لیکن سولھویں صدی کا سب سے بڑا نثر نگار مانٹین (Montaigne) ہوا ہے جس کے "مضامین" (Essais) سارے یورپ میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ غالباً مختصر مضامین لکھنے کی ابتدا یورپ میں اسی شخص سے ہوئی۔ وہ اپنے مضامین میں اپنی ذاتی و انفرادی زندگی کے واقعات کثرت سے بیان کرتا ہے اور اس پیرایہ میں کہ پڑھنے والے کو گراں نہیں گزرتا۔ ظرافت اور تخیل کے ساتھ سلاست و روانی کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیتا۔ اس کے "مضامین" فرانسیسی زبان میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو انگریزی زبان میں چارلس لیمب (Charles Lamb) اور رابرٹ لوئی اسٹونسن (Robert Louis Stevenson) کے "مضامین" اور عوام میں اسی کثرت سے پڑھے بھی جاتے ہیں۔ ہر مزاج اور ہر طبیعت کے لوگ مانٹین کو انہماک اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ کبھی تو وہ ابیقورس کی طرح ہم کو شاد باشی کا سبق دیتا ہے اور کبھی "رواقیوں" (Stoics) کی طرح سنجیدگی اور ثقاہت کی تبلیغ کرتا ہے۔ کبھی اس کا انداز بیان بلیغ اور پر مغز ہوتا ہے اور کبھی وہ بالکل روزمرہ پر اتر آتا ہے اور سیدھی سادی عام فہم باتیں عام فہم زبان میں بیان کرتا ہے۔ اس کے اسلوب کو نہ قدیم کہا جا سکتا نہ جدید ہاں حسین و جمیل ضرور کہا جا سکتا ہے۔

سترہویں صدی سترہویں صدی کے پہلے نصف حصہ تک ادبیات فرانس کی رو وہی تھی جو پچھلی صدی میں رہ چکی تھی۔ لیکن مالہربی (Malherbe) کی ذات سے شاعری میں کچھ جدتیں شروع ہوئیں۔ مالہربی کی زندگی میں اس کی قدر نہیں ہوئی۔ مگر بعد میں تمام شعرا نے اس کی تقلید کو ضروری سمجھا۔ اس کی نظمیں سلاست بیان اور موسیقی کی بہترین مثالیں ہیں۔ فرانسیسی شاعری میں جو بے عنوانیاں شروع ہو گئی تھیں۔ ان کی روک تھام کو مالہربی نے اپنا فرض اولین سمجھ لیا تھا۔ مالہربی کے ساتھ ہم کو ریگنیئر (Regnier) کا نام بھی یاد رکھنا ہے جو آخر سترہویں صدی کا ایک زبردست ہجوگو تھا سترہویں صدی کے اوائل تک ڈرامہ نویسی میں وہی سولھویں صدی کی پابندیاں چلی آرہی تھیں یعنی یا تو مذہبی ڈرامے لکھے جاتے تھے یا متقدمین مثلاً سینکا (Seneca) اور یوری پیڈیز (Euripides) کے اتباع میں تمثیلیں تصنیف ہو رہی تھیں۔ ہارڈی اور میرو (Mairet) مشہور ڈرامہ نویس تھے ۱۶۳۶ء میں پیرے کارنئے (Pierre Corneille) نے بڑی کاوشوں کے بعد "فرانسیسی المیہ" کی طرح ڈالی جو نوعیت کے لحاظ سے دیگر ممالک کے "المیات" (Tragedie) سے مختلف ہے۔ "سپہ سالار" اس کا مشہور المناماہ ہے۔ اس کے ڈراموں کی سب سے بڑی خصوصیت واقعیت ہے۔

واقعہ نگاری کا شوق اس کو اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ کارنے مواد کی تلاش میں کبھی تاریخ سے باہر نہیں جاتا تھا اور صرف سلاطین و ابطال کے کارناموں کو تمثیل کی صورت میں پیش کرتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانہ کی پبلک کو عوام سے زیادہ شاہوں اور سرداروں کے ساتھ دلچسپی تھی اور وہ انھیں کی داستانیں سننا زیادہ پسند کرتی تھی۔

اس عہد کا مشہور فلسفی ڈیکارٹ (Descartes) تھا لیکن چونکہ اس کی طرز نگارش پر ادبی رنگ غالب ہے اور اس کی نثر میں سسرو (Cicero) کی سحر نگاری کا لطف ہے اس لئے اس کو تاریخ ادبیات میں جگہ دینا چاہئے۔ اس کی تین تصنیفیں مشہور ہیں۔ "مقالات متعلق بہ طریق" (Discours) جس میں طریق استدلال سے بحث کی گئی ہے۔ "تامل" (Meditations) جس میں اس کا خاص فلسفہ ہے اور "علامات جذبات" (Traité des passions) جو مسئلہ جبر و اختیار سے متعلق ہے۔ ڈیکارٹ کا خیال ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ریاضت کر کے اپنے جذبات پر پورا قابو حاصل کر سکتے ہیں اور اس طرح ارادہ کو داعیات نفس پر حکمراں بنا سکتے ہیں۔ کارنے ڈرامہ نویس کا مرکزی فلسفہ بھی یہی ہے۔

ڈرامہ نویسی میں کارنے کا حریف ژین ریسین (Jean Racine) تھا۔ ریسین کے ہر طرف دشمن پیدا ہو گئے اور آخر میں بیچارے کو تمثیل کی دنیا سے کنارہ کش ہونا پڑا۔ لیکن کچھ بعد کو میڈم ڈی مینٹیان (Madame de Maintenon) کی فرمائش پر ڈرامے لکھنے لگا۔ اس کا شاہکار "اطالی" (Athalie) اور "استر" (Esther) اسی دور کی پیداوار ہیں۔ اس کے علاوہ ریسین نے مذہبی گیتوں کے سوا کچھ نہیں لکھا۔ ریسین اپنے محاسن شعری کے اعتبار سے فرانسیسی ادب میں وہی مرتبہ رکھتا ہے جو انگریزی ادب میں ملٹن کا ہے۔

فرانسیسی مصنفین میں سب سے زیادہ ہر دلعزیز اور مشہور عالم مولئیر (Molière) ہے اس کی شاعری میں فرانس کی قومی خصوصیتیں بحد تمام نمایاں ہیں۔ مولئیر کی ذاتی زندگی ایک سلسلہ تھی طرح طرح کی صعوبتوں کا اور اس کی گرد و پیش کے حالات بھی اس کے لئے کچھ کم سخت اور تاب آزما نہ تھے مولئیر اپنے "ضحکیات" (Comédies) کے لئے مشہور ہے جو ہر قوم اور ہر ملک میں دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ اس کی طرز نگارش خامیوں سے پاک نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے عجلت کے ساتھ لکھتا ہے اور پھر اس پر نظر ثانی کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ باوجود اس کے وہ نہ صرف ایک تمثیل نگار کی حیثیت سے ممتاز ہے بلکہ اس کے اسلوب میں جو خصوصیت ہے وہ اس کو

ایک مسلم الثبوت اہل قلم ماننے پر مجبور کرتی ہے۔ مولئیر کے ڈراموں میں واقعیت غالب ہے۔ وہ زندگی کو واقعاتی زاویہ نگاہ سے پیش کرتا ہے اور اس کے افراد محض دنیائے تخیل کی مخلوق نہیں ہوتے۔

"ثارتوفی" (Tartuffe)۔ "ڈان ژواں" (Donjuan) "بیمار وہم" (La Malade Imaginaire) اور "بیزار خلق" (La-Misanthrope) مولئیر کے دست و قلم کی بہترین پیداوار ہیں جو ایک طرف تو نفس انسانی کے مجروح حصوں کو نمایاں کر کے ہمارے اندر ایک طوفانِ اضطراب پیدا کر دیتی ہیں اور دوسری طرف زندگی کے مضحکہ انگیز پہلوؤں کو بھی پیش کر کے ہم کو قہقہہ مارنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ سترہویں صدی کا سب سے بڑا شاعر لافانٹین (La Fontaine) ہوا ہے۔ نیرنگِ قدرت کا احساس جسقدر اس میں تیز تھا اسی قدر فطرت انسانی کا بھی وہ نبض شناس تھا۔ بعض اوقات تو وہ اپنی تحریر میں شگفتہ اور دلشاد نظر آتا ہے بعض اوقات سنجیدہ اور متین ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی نہایت پُر اثر طریقہ سے محزون و دلگیر نظر آتا ہے۔ لافانٹین کی عبارت میں ایک نشاط۔ ایک لطیف ترنم اور ایک پُر کیف روانی ہوتی ہے۔ وہ ایک حقیقت نگار تھا اور خواہمخواہ کی خیال آرائیاں نہیں کرتا تھا۔

سترہویں صدی کے دوسرے نصف حصہ میں نثر نگاروں کی کمی نہ تھی۔ لیکن ان میں کم ایسے تھے جنکو گرانمایہ کہا جا سکے۔ سب سے بڑا نثر نگار اس زمانہ میں لاراشیفوکو (La Rochefoucauld) ہے جس نے اپنی زندگی کے تجربات، اقوال کی صورت میں پیش کئے۔ اس کے خیالات گہرے تو ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر انفرادی ہوتے ہیں اس کے علاوہ پانچ اور نثر نگار ہیں جن کو نثر نگاری کی پہلی صف میں جگہ دی گئی ہیں اور ان کے نام یہ ہیں۔ پاسکل (Pascal) بوسوے (Bossuet) مادام ڈی سیوگنی (Madame de Sevigne) لابرائیر (La Bruyr) اور فینی لان (Fenelon) لیکن ان سب میں ممتاز پاسکل تھا جو جامع العلوم تھا۔ سائنس ریاضیات اقلیدس اور طبیعیات میں اس کو یکساں تبحر حاصل تھا۔ تیس برس کی عمر میں وہ ان علوم سے بیزار ہو گیا۔ تشکیک و ارتیاب کو چھوڑ کر ایمان و ایقان کی طرف راغب ہوا اور مذہب کی تبلیغ شروع کر دی۔ اس کی نثر میں وہی اثر ہے جو انگریزی میں نیومین (Newman) کا تمغۂ امتیاز ہے۔

فرانس کے مقررین میں بوسوے کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ اس کے خطبات فصاحت و بلاغت میں جواب نہیں رکھتے۔ بوسوے کی ساری عمر تبلیغ و تلقین میں بسر ہوئی۔

مادام ڈی سیوگنی کو اس کے مکاتیب نے شہرت دی۔ مکتوب نگاری میں اہل رائے نے اس کو "ملکہ" کا

خطاب دیا ہے۔ اس کے خطوط اس کی لڑکی اور دوستوں کے نام ہیں اور حسن عبارت - رنگینیٔ ادا - شگفتگی میں بے مثل ہیں -

لابرائیر نے طیو فراسطوس کا ترجمہ کیا لیکن وہ اپنے مقالات کے لئے زیادہ مشہور ہے - اس کے فلسفہ کا ملخص یہ ہے کہ انسان کی زندگی نہایت پرصعب ہے اور بے چینی انسان کا مقدر ہے - ہم اپنی تمام عمر سکون کی تلاش میں بسر کر دیتے ہیں اور ہم کو سکون ملتا ہے مرنے کے بعد -

لابرائیر کے اسلوب میں ایک خاص بات ہے جس میں کچھ سترہویں صدی کی جھلک ہے اور کچھ اٹھارہویں صدی کی - فینی لان سترہویں صدی کا آخری ادیب ہے - اس کو ادبیات سلف سے عشق تھا اور اسی کے ساتھ کیتھلک مذہب کا وہ زبردست پیرو تھا - اس نے جو کچھ لکھا ہے اس میں یہ دونوں خصوصیات نمایاں ہیں -

اٹھارہویں صدی

اٹھارہویں صدی کا پیشرو لابرائیر تھا لیکن اس صدی کی ابتدا فانٹنیل (Fantenelle) سے ہوتی ہے جس نے اوّل اوّل تو المناسے (Tragedies) لکھے لیکن بعد کو اپنے بذلہ سنجانہ اسلوب کی بدولت شہرت حاصل کی - اس نے سائنس کے ابتدائی مسائل کو سہل زبان میں بیان کرکے عوام میں رائج کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں مذہبی خرافات پر پے درپے حملے کئے -

اس صدی کی شاعری میں کوئی بات قابل لحاظ نہیں - جو عشقیہ نظمیں لکھی گئیں وہ اب بھلادی گئی ہیں - اور والٹیر اور اس کے دیگر ہم پلہ مشاہیر کی شاعری ٹھوس ہے جس میں شعریت کا پتہ نہیں - ڈرامہ نگاروں میں لاشاسی (La Chaussee) کا نام ہمیشہ یاد رہے گا - اس نے گھریلو زندگی کو ڈرامے کا موضوع بنایا - یہ اپنے رنگ کی فرانس میں پہلی کوشش تھی -

اٹھارہویں صدی کے نثر نگار زیادہ اہمیت رکھتے ہیں - سب سے پہلے مانٹیگوے کے نام کو یاد رکھنا چاہئے - اس نے " دو پارسیوں کے خطوط " (Lettres persanes) کے عنوان سے چند خیالی مکاتیب لکھے ہیں جن میں در اصل اس نے اپنے عہد کی معاشرت کے ہر پہلو کو بے نقاب کیا ہے - اس کی طرز تحریر میں آب و تاب اور ایک بلیغ اختصار ہے -

اٹھارہویں صدی کے درمیانی زمانہ پر والٹیر کی گرانمایہ شخصیت غالب رہی - بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ پوری صدی پر غالب رہا - اس کی زندگی اس کے معتقدات کی بدولت طرح طرح کی ناہمواریوں میں گذری - وہ دو دفعہ باستیل میں قید کیا گیا اور اس کے بعد وہ دوسرے ممالک میں پرشور زندگی بسر کرتا

رہا۔ والٹیر کا مزاج وحشیانہ طور پر چڑچڑا تھا۔ اس کی صحت ہمیشہ خراب رہی اور ان سب آلام کا اثر قدرتاً اس کے طرز تحریر پر بھی پڑا۔

والٹیر کی عظمت کا راز کیا ہے؟ سب سے پہلے تو اس کی دقتِ احساس اور ذکاوت فہم سے ہم مرعوب ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی ہمت اور اس کا حوصلہ۔ اس کی تیزی اور اس کا اضطراب جو اس کے ایک ایک حرف سے ظاہر ہے۔ اس کا اسلوب نہ فصیح ہے نہ شاعرانہ۔ وہ ہر چیز پر عقل واستدلال کے پہلو سے نظر ڈالتا تھا اور انسان کی حماقتوں پر روتا نہ تھا بلکہ ان کو جارحانہ تمسخر سے تیست ونابود کر دینے کی کوشش کرتا تھا۔

والٹیر مکتوب نگاری اور صحافت میں اپنا ثانی نہیں رکھتا اور اس کے علمی وادبی کارناموں کی فہرست طویل ہے۔ تاریخ میں "عہد لوئی چہاردہم" (La Siecle Louis quatorze) المناموں میں "زئیر" (Zaire) "میروپ" (Merope) اور "الزائر" (Alzire) مضحکات میں "لاپروڈ" (La prude) فلسفہ میں "لغات فلسفہ" (La Dictionnaire philosophe) والٹیر کے غیر فانی کارنامے ہیں۔ ان کے علاوہ اُس نے نہ جانے کتنی نظمیں۔ کتنے مقالات اور کتنے افسانے لکھے۔ افسانوں میں "ذادگ" اور "کینڈیڈ" (Candide) مشہور ہیں۔

اسی زمانہ میں حکما کی ایک گروہ نے اصلاح معاشرت کے لئے آواز بلند کی اور عقل وانسانیت کو رائج کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اسی جوش میں "انسائیکلوپیڈیا" جیسا زبردست کام انجام پاگیا جس میں انسان کی زندگی کے ہر رخ پر مکمل تبصرہ کیا گیا۔ اس کام میں ڈڈیرو (Diderot) نے سب سے زیادہ نمایاں حصّہ لیا۔

اٹھارھویں صدی کا سب سے بڑا شخص روسیو (Rousseau) ہے جو ایک گھڑی ساز کا لڑکا تھا اور مروجہ تعلیم وتربیت سے بہت کم بہرہ ور۔ اس نے زندگی میں متعدد پیشے اختیار کئے اور کسی میں ثابت قدم نہیں رہا۔ وہ تمام عمر آوارہ اور خانہ بدوش پھرتا رہا۔ مرتے دم تک اس کو سکون واطمینان نصیب نہیں ہوا۔

روسیو فرانس کے ادبیات جدیدہ کی روح رواں ہے اس نے ادبیات میں وہ چیزیں داخل کردیں جنکو "رومانیت" (Romanticism) اور "قدرت پرستی" (Naturalism) کہتے ہیں۔ اس نے انسان کے مادی رُخ کا نہیں بلکہ اس کی روح کی گہرائیوں کا

مطالعہ شروع کیا اور اس مطالعہ کو ادبیات کا موضوع بنایا۔ اس لحاظ سے وہ جرمنی کے مشہور فلسفی شاعر گوئٹے (Goethe) سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اور اس کو شاعر نہ کہنا چاہیئے۔ وہ اپنے عہد کا کاہن تھا۔

روسیو کا پیغام یہ تھا کہ ہم کو قدرت کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہیئے۔ قدرت نے ہم کو آزاد۔ بیفکر اور مسرور پیدا کیا ہے۔ جماعت نے طرح طرح کی رسمی زنجیروں میں جکڑ کر ہم کو غلام اور ہماری زندگی کو پرمحن بنا دیا ہے۔ اگر ہم اپنی روح کی نجات چاہتے ہیں تو ہم کو پھر وہی معاشرت اختیار کرنا چاہیے جو قدرت کے منافی نہ ہو۔

"ایمیلی" (Emile) اور "معاہدۂ اجتماعی" (Contrat Social) روسیو کے دماغ کی بہترین پیداوار ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے "اعترافات" (Confessions) لکھے ہیں جس میں اس نے اپنی ذاتی زندگی کے ہر رُخ کو بے نقاب کر دیا ہے۔

اٹھارہویں صدی کا سب سے بڑا ماہر سائنس بفون (Buffon) گذرا ہے اور اس کی "تاریخ طبعی" (Histoire Naturelle) اپنے زمانہ کا ایک زبردست کارنامہ علمی ہے۔

دورِ جدید

گذشتہ دور میں والٹیر اور روسیو جو بیج بو گئے تھے۔ وہ "انقلاب فرانس" میں بار آور ہوئے۔ لیکن جہاں ہر طرف مختلف قسم کی شورشیں پھیلی ہوئی تھیں وہاں ایک شاعر اپنے گرد و پیش کے طوفان سے بے خبر شاعری کے بہترین نمونے پیدا کر رہا تھا۔ یہ آندری شینار (Andre Chenier) تھا۔ اس کی خطابیہ نظمیں (Odes) اس کے مرنے کے بعد شائع ہوئیں۔ اس کے "افکار جدید" (Pensees Nouveaux) کو پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں اس خیال پرستی اور تصوریت کا شائبہ بھی نہیں جو آنے والے عہد کی امتیازی خصوصیت ہو کر رہ گئی تھی۔ اس میں زیادہ تر حکیمانہ خیالات ہیں جو تشنۂ علم کے لئے کافی سامان آسودگی فراہم کر سکتے ہیں۔ لیکن بعد کو اس نے چند نظمیں لکھیں جس میں اس نے قدیم نصرانیت بالخصوص یونانیت کی صدق دل سے حمایت کی ہے۔ اس کی بہترین نظمیں "جوان قیدی" (La Jeune Captive) اور "نابینا" (L'Aveugle) ہیں۔ تیس برس کی عمر میں اس کو "گلوٹین" کے ذریعہ قتل کیا گیا۔ لیکن اس کے بعد کے شعراء نے اس کی تقلید اختیار کر لی اور اس طرح اس

کی شاعری عرصہ تک زندہ رہی۔

نثر میں شیکسپیئر کے ہم عصر برنارڈین سینٹ پیرے نے "پال اور ورجنی" لکھ کر اپنے کو غیر فانی بنالیا۔

پہلا شاعر جس نے دور جدید کے خصوصیات کی نمائش کی شاتو بریاں —— (Chateaubriand) ہے جو ۱۷۶۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۴۸ء میں مرگیا۔ اوس نے نثر ونظم دونوں میں نئی طرح ڈالی۔ شاعری میں وہ روسیو کا اتباع کرتا تھا۔ نثر میں بھی وہ ایسی ہی برگزیدہ ہستیوں کا مقلد تھا۔ اس نے نثر میں رزمیات لکھے۔ بحث طلب مسائل پر مقالے لکھے۔ تقریریں کیں۔ تدبر وسیاست میں اپنے کو نمایاں رکھا۔ غرضکہ اس کا اثر مختلف سمتوں میں تھا اور آئندہ نسل تک رہا۔ "روح مسیحیت" (Le Génie du Christianisme) اس کی ایک مقبول عام کتاب ہے جس میں اُس نے یہ دعوی کیا ہے کہ حسن وشاعری کا بہترین مظہر مسیحیت ہے۔ رزمیات میں "شہدا" (Les Martyrs) اس کا شاہکار ہے۔ ان کے علاوہ اس نے سفرنامے اور تزک (Mémoires) بھی لکھے ہیں۔ بائرن کی طرح شاتو بریاں بھی ہر افسانہ اور ہر رومان میں اپنی ہی ذات کو ہیرو کی صورت میں پیش کرتا رہتا ہے۔ شاتو بریاں کا اثر بعد کے شعرا مثلاً تیری (Thierry) اور مشیلے (Michelet) پر بھی رہا۔ موخرالذکر نے شاعری کے ذریعہ تاریخ کو عوام میں رائج کیا۔

شعرا میں لے اور خلوص کے اعتبار سے لامارٹین (Lamartine) اپنا ہمسر نہیں رکھتا۔ اس کی نظمیں الہامی ہوتی ہیں۔ اس کے خیالات میں ندرت اور تصنع کا کوئی شائبہ نہیں ہے اس لئے اس کی شاعری میں ہم آہنگی ہے جو اکثر ندرت پسند طبائع پر گراں گذرتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لامارٹین کی شاعری خالص شاعری ہے اور محبت۔ مذہب اور قدرت اس کے موضوع ہیں۔ اس کے "تصورات" (Méditations) "نغمات" (Harmonies) اور "تبصرات" (Recueillements) نے لوگوں میں اُن جذبات کو ابھار دیا جو عرصہ سے دبے پڑے ہوئے تھے۔ لیکن اس کی شاعری کی بہترین یادگاریں "جھیل" (Le Lac) "صلیب" (Le Crucifix) اور "تمہیدات" (Les Préludes) ہیں۔

اس دور کی ایک ممتاز ہستی الگزینڈر ڈوما (Alexander Dumas) ہے جس کے دو تاریخی ناول دنیا کے ہر حصہ میں مقبول ہو چکے ہیں اور وہ "مانٹی کرسٹو" (Mon

[illegible]) اور ”تین تفنگچی“ (Three Musketeers) ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے چند ڈرامے بھی لکھے لیکن ڈرامہ کی دنیا میں وکٹر ہیوگو (Victor Hugo) کا اقتدار زیادہ تھا اگرچہ اس کے ڈراموں میں تصنع۔ اخلاق اور کبھی کبھی طفلانہ جوش پایا جاتا ہے۔ ہیوگو میں خداداد تغزل تھا۔ اور اس کے ڈراموں میں جہاں یہ تغزل نمایاں ہوجاتا ہے وہاں ایک عجیب نشاط و تازگی اور وجدانی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔

ہیوگو کا تغزل نہ صرف فرانس کے لئے بلکہ تمام یورپ کے لئے ایک چیز ہے۔ سوئنبرن کی طرح اسکو بھی ایک بانسری سے مشابہت دی گئی ہے جس کی ہر سانس ایک سرمدی نغمہ ہو کر نکلتی تھی۔ شاعری میں سوائے شیکسپیر اور روس کے مشہور شاعر پشکن (Pushkin) کے کوئی ہیوگو کے سامنے ٹھیر نہیں سکتا۔ اس میں جو عیب ہے وہ یہ ہے کہ اس کی تصنیفات میں ظرافت اور شگفتگی کی جھلک مطلق نہیں ہے اور اس کے لب و لہجہ میں افسردگی کے ساتھ انانیت اور خودنمائی پائی جاتی ہے۔ نثر میں ”ستم زدوں کی داستان“ (Les Miserables) اور ”پیرس کا کلیسا“ (Notre-Dame-de-Paris) ہیوگو کی بہترین یادگاریں ہیں۔ اور ان میں بھی وہی خوبیاں اور خامیاں ہیں جو اس کی شاعری میں بتائی جاچکی ہیں۔

الفریڈ ڈی وگنی (Alfred-de-Vigny) ہیوگو کا مد مقابل ہے مگر اس میں تخیل کی اتنی زیادتی نہیں ہے اور اس کا مذاق زیادہ رچا ہوا ہے۔ اس میں تصنع بھی بہت کم ہے اور اس کی افسردگی میں گہرائی ہے اس لئے کہ وہ غور و تامل سے زیادہ کام لیتا ہے۔ اس کی شاعری میں بھی غمگینی اور حسرتناکی ہے لیکن اس میں ایک خاص شان ہے۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں ادبیات فرانس میں کچھ نمایاں تغیرات ہوئے۔ اس دور کا علمبردار الفریڈ ڈی مسے (Alfred-de-Musset) ہے اس میں انفرادیت ہر جگہ نمایاں ہے۔ اس کی امیدیں اور اس کی مایوسیاں۔ اس کی مسرتیں اور اس کے رنج سب شخصی و انفرادی ہیں اس طرح ادب میں انفرادیت کی بنیاد پڑی۔ مسے نے جو کچھ لکھا اس میں جذبات کی شدت۔ بے ساختگی۔ الفاظ کا ترنم ممتاز خصوصیتیں ہیں۔

تھوفائل گاٹیر (Theophile Gautier) فرانسیسی شاعری میں وہی مرتبہ رکھتا ہے جو انگریزی شاعری میں راسیٹی (Rossetti) کا ہے۔ گاٹیر کی شاعری یکسر مصوری ہے۔ مادام ڈی اسٹیل (Madame-de-Stael) جو شاتوبریاں کی معاصر تھی۔ اس دور کی نثر میں ایک خاص پایہ رکھتی ہے۔ اور اس کے ناول دلچسپی سے خالی نہیں۔ گاٹیر کی

طرح جارج سانگ (George Sand) کے ناولوں میں بھی تغزل اور جذباتیت نمایاں ہے۔ سانگ فطرتاً حقیقت نگار تھی لیکن یہ زمانہ اور ماحول کا اثر تھا کہ وہ " رومانیت " (Romanticism) سے بچ کر نکل نہ سکی۔

فرانسیسی ناول میں حقیقت نگاری کا موجد آنرے ڈی بالزک (Honoré de Balzac) سمجھا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ واقعات کا مطالعہ کرتا تھا اور ان کو بڑی رنگینی کے ساتھ پیش کر دیتا تھا۔ لیکن بالزک میں بہت سی خامیاں تھیں مثلاً مذاق صحیح کی کمی۔ مطالعہ قدرت کی طرف سے بے بیگانگی وغیرہ تاہم ہم اس کی ذہانت اور فطانت کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اٹھارہویں صدی میں بیرانشے (Béranger) کے نغمات بھی خاص چیز ہیں۔ فرانس کے طبقہ اوسط میں ان کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔ بیرانشے کے خیالات میں عمومیت ہے لیکن اس کے اسلوب میں شاعری کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ تنقید میں سین بودی (Sainte Beuve) ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ اس کی تنقید صرف ادبیات تک محدود نہیں ہے بلکہ سیاسیات و قومیات پر بھی مشتمل ہے۔

اسٹنڈہال (Stendhal) فطرت انسانی کے مطالعہ کے لئے مشہور ہے۔ اس کو قدرتی مناظر کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ اپنے ادبی کارناموں میں انسان کا کردار اور اس کے داعیات نفس کی تحلیل پیش کرتا ہے۔ اس کی قدر اس کے مرنے کے بہت دنوں بعد ہوئی۔ اور انگلستان میں اب بھی بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ اس وقت تک فرانس میں فلسفہ اور ناول کی رد بدل چکی تھی۔ ناول نے واقعہ نگاری کی صورت لے لی اور فلسفہ تمام تر " اجابیت " یا " واقعیت " (Positivism) ہو کر رہ گیا تھا۔ یعنے فلاسفہ مظاہر علمی سے آگے بحث کرنا فعل عبث سمجھنے لگے تھے۔

ارنسٹ رینان (Ernest Renan) (۱۸۲۳ء تا ۱۸۹۲ء) نے اس دور میں " اصل مسیحیت " (Origines du Christianisme) کے نام سے ایک تصنیف چھ جلدوں میں پیش کی جن میں " حیات مسیح " (Vie de Jésus) بہت مشہور ہے۔ رینان ایک متبحر شخص تھا اور نثاری میں ایک خاص ملکہ رکھتا تھا۔ اس نے تاریخی، علمی اور ادبی مکالمے لکھے ہیں جو اب تک دلچسپی سے خالی نہیں سمجھے جاتے۔

ہپولائٹ ٹین (Hippolyte Taine) رینان کا ضد مقابل تھا۔ " انقلاب فرانس کی تاریخ " " انیسویں صدی میں فرانس کا فلسفہ " اور " ادبیات انگریزی کی تاریخ " اس کے مشہور ترین کارنامے ہیں۔

ٹین کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان کا کردار اور اس کی شخصیت لازمی نتیجہ ہوتی ہیں اس کے ماحول اور اس کے زمانہ کا۔ چنانچہ اس نے جتنی تاریخیں لکھی ہیں ان میں اسی نظریہ کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ بہ حیثیت فلسفی کے وہ "جبریت" (Determinism) کا قائل تھا۔ رینان ہر چیز سے نیک فال نکالتا تھا لیکن ٹین ہر چیز میں ایک تاریک پہلو دیکھتا تھا اور اس سے بری فال لیتا تھا۔ وہ کسی مذہب کا قائل نہ تھا۔ انسان کو وہ ایک قابل نفرت چیز سمجھتا تھا۔

۱۸۶۰ء تک "رومانیت" کا جوش ختم ہو رہا تھا لیکن اس وقت "رومانیین" کی ایک نئی نسل وجود میں آگئی۔ اس نسل کا سب سے بڑا ادبی ساحر ایک شاعر ہے یعنی تھیوڈور ڈی بان ول (Theodore-de-Banville) اس کے بعد "قنوطیون" (Pessimismes) کا ایک گروہ پیدا ہوا جن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ادبیات میں ظاہری دلکشی پیدا کرنے کا ان کو سودا تھا۔ اس زمانہ میں فرانس کے ادبیات اور فنون لطیفہ پر مشرقی "جبریت" اور تشاؤم کا اثر غالب ہو رہا تھا۔

بوڈیلیئر (Baudelaire) کی قنوطیت (pessimism.) میں مذہبی عنصر نمایاں ہے۔ اس نے فرانسیسی شاعری میں چند نئے اسالیب کی بنیاد ڈالی اس کی نظمیں ایک خاص ادبی شان رکھتی ہیں جس کی بنا پر بعض اس کو فرانس کے بہترین شعرا میں شمار کرتے ہیں۔

پال وارلین (Paul Verlaine) کا رتبہ فرانس کے متغزلین (Lyric poets) میں سب سے بلند ہے۔ اس نے بھی فرانسیسی شاعری میں جدتیں کیں۔ اس کی سادگی اس کا ابہام۔ اس کا کسی حد تک طفلانہ حیرت و استعجاب ہم کو انگلستان کے کولرج اور جرمنی کے ہائنہ (Heine) کی یاد دلاتے ہیں۔

آرتھر رمبو (Arthur Rimbaud) (۱۸۵۴ء سے ۱۸۹۱ء تک) نثر و نظم دونوں اعتبار سے صوفی اور صاحب حال ہے اور اس کا اثر آئندہ نسلوں پر زبردست پڑا۔

گستاو فلابرٹ (Gustave Flaubert) (۱۸۲۱ء تا ۱۸۸۰ء) نے افسانہ نگاری میں ایک نئی طرح ڈالی جس کو مبہم طور پر واقعہ نگاری کہا گیا ہے اس کا شاہکار "مادام بواری" (Madame Bovary) ہے جو مشاہدات و تجربات پر مبنی ہے اور جس میں زندگی کی مصیبتوں اور معصیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ ادب و صناعی کو فلابرٹ کا مذہب سمجھنا چاہیے جس پر خلوص کے ساتھ وہ ثابت قدم رہا۔

گائے ڈی موپاساں (Guy-de-Maupassant) (۱۸۵۰ء تا ۱۸۹۳ء) دنیا کے مشہور مختصر افسانہ لکھنے والوں میں سے ہے۔ منظر کشی میں اس کو کمال حاصل تھا۔ جو کچھ اس کی نظر سے گذرتا ہے اس کو بعینہٖ الفاظ میں بیان کر دیتا ہے۔ اور جو تصویر وہ ایک بار پیش کر دیتا ہے۔ وہ کبھی پڑھنے والے کے دماغ سے محو نہیں ہوتی۔ اس کے معتقدات بھی مایوس کرنے والے ہیں اور اس کے لب و لہجہ میں بھی ایک خاص قسم کی "قنوطیت" ہے۔

اس کے بعد ایمیل زولا (Emile Zola) (۱۸۴۰ء تا ۱۹۰۲ء) کی واقعہ نگاری نے شہرت پائی۔ وہ واقعات کو عریانی کے ساتھ بیان کرتا ہے اور اس سطح سے نیچے نہیں۔ اس نے اپنے افسانوں کو نفسیاتی تحلیل پر قایم کرنا چاہا اور خاندانی خصوصیات کی نظریۂ توارث (Heredity) سے توجیہ کرنا چاہی مگر آج اس کے نظریات کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ اس سلسلہ میں دو ناول نگار اور بھی قابل ذکر ہیں یعنی آکتاؤ فیولے (Octave Feuillet) اور الفانسی ڈاڈے (Alphonse Daudet)۔

۱۸۵۰ء کے بعد سے ڈرامے نثر میں لکھے جانے لگے اور اس میں ایمیل آژیر (Emile Augier) اور الگزنڈر ڈوما سب سے ممتاز تھے۔ ان کے بعد وکٹوریاں سارڈو (Victorien Sardou) نے بھی کافی شہرت حاصل کی۔

اس دور کی تنقید میں اولیت کا شرف بردنی ٹیر (Brunetière) کو حاصل ہے۔ وہ فلسفی تھا، ماہر الٰہیات تھا۔ خطیب تھا۔ اس نے روایات قدیمہ کی پرزور حمایت کی تنقید و تبصرہ میں اب تک اس کا لوہا مانا جاتا ہے۔

ژولیز لیمائٹر (Jules Lemaître) بھی فرانس کا مشہور نقاد ہے جو اناطول فرانس کا ہم عصر ہے۔ اس کی تنقیدوں میں تازگی اور تنوع کی چاشنی ہوتی ہے۔

اناطول فرانس کا شمار انیسویں صدی کے اکابر میں ہے۔ اس کا انداز بیان اچھوتا ہوتا ہے۔ اس کا طنز والٹیر کے طنز سے ہم سری کرتا ہے۔ انسان کا اس نے غائر مطالعہ کیا ہے اور وہ اپنے نتائج کو نہایت دلکش اور موثر پیرایہ میں پیش کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہجو و استہزا کی چاشنی نے اس کے افسانوں کو اور بھی مزیدار بنا دیا ہے۔

اناطول فرانس کے عہد کے مورخوں میں لاوسی (Lavisse) فلسفیوں میں برگساں (Bergson) اور ریبو (Ribot) تمثیل نگاروں میں کیورے (Curel)

برنسٹائن (*Bernstein*) اور ٹرسٹان برنارڈ (*Tristan Bernard*)
ممتاز مرتبہ رکھتے ہیں۔
گذشتہ جنگ عظیم کے ساتھ ادبیات فرانس میں نئے نئے موضوع داخل ہوگئے اور وہ اب تک قائم ہیں۔

موجودہ ادبیات فرانس سے جہاں تک اندازہ لگایا جاسکتا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رومانیت اور مادیت دونوں سے لوگ بیزار ہیں۔ اور غالباً کوشش یہ ہے کہ دونوں کے امتزاج و اعتدال سے ایک نئی چیز پیدا کی جائے لیکن ابھی یہ کوشش بارور نہیں ہوئی ہے اس لئے ادبیات فرانس نے کوئی مخصوص ہیئت ابھی تک اختیار نہیں کی ہے۔

سانپ کا فیصلہ

تارا کسی خیال میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنی خوبصورت سڈول ٹانگوں کو پھیلایا اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔ وہ اپنی نازک حسین انگلیوں سے انگور کے دانے خوشوں سے توڑ توڑ کر مضمحل انداز کیسا تھ منہ میں رکھتی جاتی تھی اور اُس کی قدیم دایہ مینا، اُس کی کمر پر خوشبودار تیل کی مالش کر رہی تھی۔

تارا نے مینا کی منت سماجت کر کے، وہ راز معلوم کر لیا تھا جس کی اسے کئی دن سے جستجو تھی اور اس لئے اس نے نہایت اطمینان سے اپنی بوڑھی دایہ کے لاڈ پیار کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ تارا کے ماں نہ تھی۔ اسی لئے مینا اسے جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ مینا نے اُسے بچپن سے پالا تھا اور اب اُس کی جوانی ورعنائی دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی۔

تارا، کئی دن سے دیکھ رہی تھی کہ مینا کسی غیر معمولی اضطراب میں مبتلا ہے۔ لیکن اس کے چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ جب ایک دن اس نے مینا کو اپنے بستر کے پاس روتا ہوا دیکھا تو اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ اصل حقیقت کا پتہ ضرور لگائے گی۔ چنانچہ اس نے مینا کی خوشامد کر کے اس راز کو معلوم کر ہی لیا۔ بات یہ تھی کہ تارا کی شادی ہونے والی تھی۔ اور نیری جس سے بچپنے میں اس کی منگنی ہو چکی تھی، ولایت سے تعلیم حاصل کر کے واپس آ گیا تھا۔ جب نیری کے باپ نے شادی کا تقاضا کیا تو ادھر مینا کے ذمہ یہ خدمت سپرد ہوئی تھی کہ وہ وقت مقررہ تک، تمام انتظام کو مکمل کر دے۔

اس خبر سے، تارا کی طبیعت میں، تھوڑی دیر کے لئے، سخت ہیجان برپا ہوا، لیکن زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہا۔ اُسے شادی کی کوئی خواہش نہ تھی۔ وہ اپنے باپ ہی کے گھر رہنا چاہتی تھی جہاں مینا، اس کی جا اور بے جا نازبرداری کے لئے ہر وقت مستعد رہتی تھی۔ اس کے دل میں خیال پیدا ہوتا تھا کہ نیری معلوم نہیں کس انداز کا آدمی ہو۔ میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں۔ ممکن ہے وہ بدصورت، دبلا پتلا، ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو۔ ممکن ہے وہ مجھے کام کرنے پر مجبور کرے اور جب میں کام نہ کروں تو مجھے خوب مارے۔ میں اپنی انگلیوں کا حسن کام کر کے غارت نہ کروں گی۔ میں نے سوائے پھلوں اور پھولوں کے توڑنے کے کبھی کوئی دوسرا کام کیا ہی نہیں ہے۔ میں گھر کا کام کیسے سنبھال سکوں گی۔

وہ سیتا کی طرح کام کرنا اور اس کی طرح ہر وقت تھکی ہاری نظر آنا پسند نہ کرتی تھی۔ سیتا اس کی سہیلی تھی اور مینا کی سخت گیری اور قدامت پسندی نے، صرف اسی سے ملنے کی اجازت، اسے دے رکھی تھی۔ سیتا ہی کے ذریعہ سے اُسے باہر کی دنیا کی جھلک نظر آتی تھی۔ سیتا کا شوہر، اُسے کبھی اس بات پر مارتا تھا کہ تیرے لڑکا کیوں نہیں ہوتا اور کبھی اس بات پر کہ تو چپاتیاں کیوں جلا دیتی ہے۔ مینا اس کے ان تمام اندیشوں کو یہ کہکر رفع کرنا چاہتی تھی کہ بیٹی، تیری کا باپ، امیر ہے تیری پڑھا لکھا اور سمجھ دار ہے۔ وہ تو تجھے ملکہ بنا کر رکھے گا — لیکن اس کی بات کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

وہ جواب دیتی "لیکن مجھے یہ معلوم کیسے ہو کہ وہ حسین اور عقلمند ہے۔ میں نے تو اُسے کبھی نہیں دیکھا" اور پھر نہایت لجاجت سے مینا کے گلے میں باہیں ڈال کر کہتی۔ "مینا، میری اچھی مینا۔ صرف ایک دفعہ تو مجھے اُسے دکھا دے"

مینا، ناراض ہو کر جواب دیتی "ہائیں۔ بیٹی۔ کیسی باتیں کرتی ہے۔ تو ایک اونچے خاندان کی راجپوت بیٹی ہے۔ تجھے شرم و لحاظ بالکل نہیں آتا۔ تیرے اندر یہ ذلیل جستجو کیسے پیدا ہوئی۔ تیرا باپ سنے گا تو کیا کہیگا۔ (اور پھر لہجہ بدل کر پیار سے) اے میری پیاری فاختہ، اگر ان باتوں کی تیرے باپ کو خبر ہوگئی تو میری اور تیری دونوں کی خیر نہیں ہے۔ اے میری جان۔ ایسی باتیں نہ کیا کر"

لیکن تارا کی اس سے تسکین نہ ہوتی تھی۔ رواج کی پابندی، اس کی بے چین طبیعت کے لئے ایک بارگراں تھی۔ وہ شادی سے پہلے، اپنے منگیتر کو دیکھنا چاہتی تھی۔ آخر کار مینا کچھ تو اپنی عادت سے مجبور ہو کر اور کچھ اس خیال سے کہ معلوم نہیں جب یہ بیاہ کر اپنے شوہر کے یہاں چلی جائے گی تو بے تکلفی اور محبت کی وہ خصوصیت جو مجھے اب حاصل ہے، باقی رہے یا نہ رہے، اس کی ضد پورا کرنے پر راضی ہو ہی گئی۔

شادی کی رسم ادا ہونے میں ابھی چند ہفتے باقی تھے۔ مگر تارا نے، اپنی جستجو پسند طبیعت سے مجبور ہو کر، اپنے منگیتر کو، اپنے مکان کے برابر، سڑک سے گذرتے ہوئے، جھانک کر دیکھ ہی لیا۔ اور خوشی سے اس کا دل اچھلنے لگا۔ اس سڑک سے تیری روز گذرتا تھا۔ اور اب تارا کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ اسے روزانہ دیکھا کرتی تھی اور اس کے دیکھنے کے بعد اس کی نبض کی رفتار میں جو تیزی پیدا ہو جاتی تھی اس سے، اُسے یقین ہو گیا کہ وہ اس نوجوان سے جو اپنی سرو قامتی اور اعضا کی مضبوطی کے لحاظ سے بالکل دیوتا معلوم ہوتا تھا، محبت کرنے لگی ہے۔ اب اس کے دل کو ایک دوسرا خیال ستانے لگا۔ کیا وہ بھی مجھ سے ایسے ہی محبت کرے گا، وہ اوپر نگاہ اٹھا کر کیوں نہیں دیکھتا کہ میری ایک جھلک دیکھ سکے۔ شاید وہ مجھے

بدصورت اور نحیف و نزار یا ورکرتا ہے۔ شاید وہ بھی اُس لڑکی سے شادی کرنا پسند نہیں کرتا جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا۔ اُسے کیسا تعجب ہوگا جب شادی کی رات کو، وہ میرے چہرہ سے آنچل اٹھائے گا اور دیکھے گا کہ اس کی دولھن کیسی حسین ہے۔

تارا، اپنے خیالات میں اسی طرح دیر تک محو رہی اور پھر کروٹ لے کر، اس طرح لیٹ گئی گویا وہ سونے والی ہے۔

اُس شام کو، نیری، سوداگر رنجیت کا اکلوتا بیٹا، حسب معمول گھر واپس جا رہا تھا۔ وہ اس لڑکی کے خیال میں منہمک تھا۔ جس سے یونیورسٹی میں اسے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور جسے اب وہ، اپنی شادی کا زمانہ نزدیک آتا دیکھ کر، بھول جانا چاہتا تھا لیکن نہ بھول سکتا تھا۔ وہ انھیں خیالات کی کشمکش میں منہمک تھا کہ ایک سُرخ پھول، اس کی نگاہ کے سامنے سے گذرتا ہوا، اس کے قدموں کے نزدیک گرا۔ نیری نے متعجب ہو کر اُسے اٹھایا اور اس برآمدہ کی طرف نگاہ ڈالی جہاں سے پھول آسکتا تھا۔ حیرت و استعجاب سے اس کی نگاہ اس تصویر پر جم کر رہ گئی جو اس نے وہاں دیکھی۔

دو سیاہ خوبصورت آنکھیں اس کو دیکھ رہی تھیں۔ بال، رات کی طرح سیاہ۔ گورے چہرہ کا احاطہ کئے ہوئے تھے۔ اور باریک سُرخ لبوں سے، تبسم اُبلا پڑتا تھا۔

ایک گلاب کا پھول اس کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا پیکر انسانی میں اوپر،

آن کی آن میں، یہ تصویر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنے حواس درست کرکے وہاں سے روانہ ہوتا۔ چہار دیواری سے ایک دریچہ کھلا۔ ایک ہاتھ باہر نکلا اور اس نے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ نیری بیتابانہ اندر داخل ہوا اور کواڑ اندر سے بند کر لئے۔

اس کا مقابلہ، ایک بار پھر، اسی سے ہوا جسے وہ برآمدہ میں دیکھ چکا تھا۔ یہاں وہ، اُسے ،اور زیادہ حسین نظر آئی۔ ایک نازک اندام گورے رنگ کی حسین لڑکی جس کا جسم ساری میں لپٹا ہوا تھا اور بال بکھر رہے تھے۔ نیری، بیتابانہ آگے بڑھا۔ لڑکی نے، محبت کی چنگاری، اس کی آنکھوں میں دیکھی اور خوش ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ پھر مسرت سے ہنستے ہوئے اس نے کہا "نیری، رنجیت کے بیٹے، اگر تجھ میں ہمت ہے تو مجھے پکڑ لے" اور یہ کہکر تیتری کی طرح ادھر ادھر بھاگنا شروع کیا۔

نیری کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک پیدا ہوئی اور وہ اپنی یونیورسٹی کی محبوبہ کو، بھی بھول گیا۔ وہ

اسی سفید تیتری کے تعاقب میں، وارفتگی کے ساتھ دوڑنے لگا۔ مسرور بچوں کی طرح دونوں دوڑتے رہے۔ تارا، اسے کاوے دیتی رہی، درختوں، گلاب کی جھاڑیوں، پھولوں کے کنجوں کے درمیان سے ہو کر دہ گزرتے رہے اور جب نیری اس کے پکڑنے میں کامیاب نہ ہوا تو تارا نے ہنسنا شروع کیا۔ اس کی ہنسی سے، نیری نے اپنی کوششوں کو دوچند کردیا اور آخرکار ——— تارا، نیری کی آغوش میں، سختی کے ساتھ گرفتار ہوگئی اور جب تارا نے جس کا چہرہ، دوڑنے کی وجہ سے تمتما رہا تھا، نیری کو، اپنے لبوں پر، مہر محبت ثبت کرنے کی اجازت دی تو دونوں خوب ہنسے۔ لیکن جب نیری نے اُسے دوبارہ پیار کرنے کی کوشش کی تو اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "نہیں۔ نہیں۔ اب تمھیں میرے باپ کے آنے سے پہلے بھاگ جانا چاہیے" نیری نے جواب دیا۔ لیکن، اے حسینہ، جب تک مجھے تیرا نام نہ معلوم ہو میں تجھے کیسے چھوڑ سکتا ہوں" تارا بل کھا کر اس کی گرفت سے آزاد ہوگئی اور دور کھڑی ہو کر اسے چڑھانے لگی۔ "اے نیری، میں تیری منگیتر تارا ہوں۔ وہی دُبلی، بدصورت دولھن جس کی تجھے تمنا ہے"

اس احساس سے کہ میری منگیتر، یہی حسین دوشیزہ ہے۔ نیری کی رگوں میں خون نہایت تیزی سے دوڑنے لگا۔

تارا نے اسے ستانا شروع کیا اور پوچھا "کیوں۔ نیری، سچ بتا، کیا میں واقعی ایسی بدصورت ہوں کہ تیری بیوی بننے کی اہلیت نہیں رکھتی"

نیری نے پُرمسرت آواز سے کہا "تارا، میرے پاس یہاں آؤ" لیکن تارا پھر پر لگا کر اُڑ گئی۔ اور اس غیر متوقع ہنگامہ سے جس نے اس کی پُرسکون زندگی میں ایک شعریت پیدا کرکے، گزشتہ ایام کی بے کیف یکسانیت کی تلافی کردی تھی، پوری طرح لطف اندوز ہوتی رہی۔ البتہ دروازہ کے قریب، اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو اس کے حوالہ کردیا۔ اور ایک مختصر بوسہ کے بعد نیری وہاں سے باہر نکل آیا۔

تارا خوش خوش اُس جگہ سے مُڑی اور دوڑ کر مکان کے اندر جانا ہی چاہتی تھی کہ اس کا باپ، سامنے والے پیپل کے پیچھے سے قدم بڑھا کر سامنے آگیا۔ ایک نگاہ ڈالتے ہی تارا کو معلوم ہوگیا کہ اس کا باپ تمام راز سے واقف ہوگیا ہے۔ اب اس کی نگاہیں نیچی تھیں اور ہاتھ بند ہے ہوئے تھے اور اپنے باپ کے بولنے کی منتظر تھی کیونکہ کوئی راجپوت لڑکی بلا اپنے باپ کے ایماء کے لبوں کو جنبش نہیں دے سکتی۔

لیکن تارا اتنی خوفزدہ نہ تھی جتنا اسے ہونا چاہیے تھا۔ وہ خوف زدہ کیوں ہوتی جب کہ اس کا دل

تمنوں سے معمور تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس کے باپ کو اس سے ذرا بھی الفت ہے تو وہ ضرور تمام معاملہ کو سمجھ جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہمدردی کرے گا۔

ایک مختصر آواز نے اسی خاموشی کو توڑا۔ "تارا - میری طرف دیکھو" تارا نے نگاہ اٹھائی اور اسنے اُن قہر آلود آنکھوں میں جن سے وہ دوچار تھی ذرا سا شائبہ ہمدردی اور الفت کا نہ پایا۔

"تارا، یہ تونے کیا کیا ؟ کیا مینا، سٹھیا گئی ہے کہ اُس نے تجھے اس طرح ذلیل ہونے کی اجازت دیدی -" پھر آواز میں غصہ کی سرد مہری پیدا کرکے اس نے جواب طلب انداز میں کہا۔ "لڑکی - یہ تیرا عاشق کون تھا۔"

" ابا - یہ تو میرا منگیتر نیری تھا - وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں اُس سے - ابا مجھے معاف کرو ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا "

اُس نے بات کاٹ کر کہا "گناہ نہیں کیا۔ یہ گناہ کم ہے جو تو کر چکی ہے۔ تجھے شرم نہیں آتی - کیا تو نہیں جانتی. . . . . . ."

"لیکن، ابا، وہ تو مجھ سے محبت کرتے ہیں ——"

"بس خاموش! محبت۔ محبت کس چیز کا نام ہے ؟ ایک شریف لڑکی کو محبت سے واسطہ ؟ شریفوں کے دل میں محبّت نہیں ہوتی بلکہ ان کا دل احساس فرض اور وفاداری سے معمور ہوتا ہے - ماں باپ اور شوہر کی خدمت واطاعت تیرا شعار ہونا چاہیئے تھا۔ تونے مجھے ذلیل کر دیا . . . . . . تو کہتی ہے نیری کو تجھ سے محبت ہے - لیکن کیا تو سمجھتی ہے کہ میں تجھے اس بات کی اجازت دوں گا کہ تو اپنے منگیتر کو بھی میری طرح ذلیل و رسوا کرے - یہ ناممکن ہے۔ اپنے کمرے میں جا اور میرے حکم کا انتظار کر جو میں تیری دایہ کی زبانی تجھ تک پہونچا دُوں گا "

تارا نے کانپتے ہوئے، لیکن اس بات سے خوش ہوکر کہ اس آفت ناگہاں سے جلد چھٹکارا ملا، نہایت ادب سے سر جھکایا اور اپنے باپ کے سامنے سے چلی گئی - اس کے باپ کو اس سے کوئی محبت نہ تھی - اس کی نسبت، بچپن میں، نیری کے ساتھ، صرف اس لئے کی گئی تھی کہ نیری کے معزز خاندان سے رشتہ قائم ہو جائے - دستور کے مطابق، نیری اپنی منگیتر کو صرف شادی کی رات کو ہی دیکھ سکتا تھا اس سے پہلے ہرگز نہیں -

تارا کی عجیب کیفیت تھی - وہ اپنی خیالی دنیا کی رنگین فضاؤں سے، اصلی دنیا کی تلخ حقیقتوں کی طرف یک لخت، منتقل ہونا نہیں چاہتی تھی اور مشترک جذبات کے ساتھ، مینا کی آمد کا انتظار کر رہی تھی - مینا

بڑے انتظار کے بعد آخرکار آئی۔ لیکن جب اس نے تارا کو اپنی آغوش میں لے کر اس کے باپ کے احکام سنائے تو اس کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ تھیں۔ حکم یہ تھا کہ تارا، اسی وقت، اپنی جوانی کے انتہائی نکھار کے زمانہ میں، مندر کی خدمت پر مامور ہو جائے اور ایک قدیم رواج کی خلاف ورزی کی پاداش میں، اپنی بقیہ زندگی کے تمام ایام تپسّیا میں بسر کر دے۔

تارا کی آنکھیں حیرت و رنج سے کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔ "یہ کبھی سچ نہیں ہو سکتا۔ میرا باپ محض ایک رواج کی پابندی کے لئے مجھ پر ایسا ظلم ہرگز نہیں کر سکتا۔ اپنے منگیتر سے محبت کرنے میں کون سی ذلت ہے۔ میرا باپ اس بات کو کیوں معیوب خیال کرتا ہے۔ نیری مجھ سے محبّت کرتا ہے۔ اس کی آنکھیں اس کی محبت کا راز برملا کہہ چکی ہیں۔ نیری ایک بیہودہ رسم کے ٹوٹ جانے کی بنا پر مجھ سے کبھی ناراض نہ ہوگا۔ پھر میرے باپ کو اس کا کیوں اس قدر خیال ہے۔ میری شادی نیری کے ساتھ ہو رہی ہے۔ ان کے ساتھ نہیں ہو رہی ہے۔ انھیں کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ میری مسرتیں مجھ سے ہمیشہ کے لئے چھین لیں۔ اور مجھے مندر کی سنگیں دیواروں میں پابند رہنے کے لئے مجبور کریں۔ میں گھر سے بھاگ جاؤں گی اور.......

.... اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھوں میں اضطراب اور بے چینی سے روشنی پیدا ہو گئی اور مینا کو خوب جھنجھوڑ کر، اس نے اس کے آنسو خشک کئے اور پھر بھاگ نکلنے کے متعلق سازشیں ہونے لگیں۔ طے یہ پایا کہ نیری کو تارا کی پوری حالت سے مطلع کیا جائے اور اس کے مشورہ سے بھاگ نکلنے کی تدبیر کی جائے۔

شام کسی نہ کسی طرح گذر گئی۔ لیکن تارا برابر مینا کی آمد اور نیری کے پیغام کا انتظار کرتی رہی۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ مینا غریب پکڑی گئی ہو۔ اس خیال پر، تارا کو ہنسی آئی اور دل میں سوچنے لگی کہ میرا باپ جب اس بغاوت کا حال سنے گا تو بے ہوش ہو جائیگا۔ مینا، آخرکار، دبے پاؤں واپس آئی اور تارا نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن مینا اسقدر بدحواس تھی کہ اس سے بات کا صحیح پتہ ملنے میں بھی کچھ وقت صرف ہوا۔ تدبیر یہ طے پائی تھی کہ کل، دن نکلنے سے تین گھڑی پیشتر، نیری، پھلوں کے باغ میں تارا کا انتظار کرے گا اور پھر دونوں نیری کے چچا کے یہاں بھاگ جائیں گے۔ جہاں ان کی شادی ہو جائے گی۔

تارا نے مینا کو مسرت کے عالم میں، سینے سے لپٹا لیا۔ اور اُسے پیار کر کے کہنے لگی۔ "اے مینا، دیکھو تو کیسے اچنبھے کی بات ہو گی۔ ایک راجپوت لڑکی کو کسی نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کرتے بھی سنا ہے۔

تین بج چکے ہیں۔ رات خاموش اور سرد ہے۔ چاند کی روشنی زرد اور پھیکی ہو چکی ہے۔ تارا آہستگی سے

اپنے مکان سے نکلتی ہے۔ اس کی سپید ساری پر ایک سیاہ چادر لپٹی ہوئی ہے۔ اس کا دل مسرور ہے اور اس کے قدم ہلکے اٹھ رہے ہیں۔ اسے امید ہے کہ وہ بہت جلد آزاد ہو جائے گی۔ اور محبت و احساس فرض میں اس کے لئے کوئی امتیاز باقی نہ رہے گا۔ اور وہ اپنے شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری رسمی مجبوری اور بے چارگی کے ساتھ نہیں بلکہ قلبی لذت و مسرت کے ساتھ کرے گی۔ اسے اسقدر خوشی تھی کہ وہ گانا اور زور سے ہنسنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے پاؤں کی چاپ اسے محتاط رہنے کے لئے خبردار کر رہی تھی۔ اب وہ پھلوں کے باغ میں، لانبی گھاس کے کنارے سے ہو کر گذر رہی تھی۔ آدھا راستہ طے ہو چکا تھا کہ اسے ایک سایہ سا راستہ سے گذرتا ہوا معلوم ہوا۔ اس کے ذہن نے کہا کچھ نہیں کوئی ٹہنی ہل رہی ہے۔ لیکن خوف و ہراس سے اسے بھوتوں کی موجودگی کا وہم ہونے لگا۔ اور غیر ارادی طریقہ پر اسکی رفتار میں تیزی پیدا ہو گئی۔ ایک ٹہنی کے ٹوٹنے سے وہ اور بھی خوفزدہ ہوئی اور دوڑنے لگی۔ بدحواسی میں، ایک بیل سے اس کا پاؤں الجھا اور وہ گر گئی۔ کوئی چیز اُسے اپنے نیچے رینگتی معلوم ہوئی اور پھر ایک پھنکار سی سنائی دی اور سانپ کے پھن جیسی کسی چیز نے اس کی کلائی میں ایک ہلکی سی ضرب لگائی اور رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

تارا نے عین اُسی وقت، اپنے منگیتر کو سامنے کھڑا ہوا دیکھا اور وہ اسی بات کے احساس سے قاصر رہی کہ یہ ہوا کیا۔ اُسے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔ ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ وہ اس کی طرف دوڑی اور بہت جلد اس کے بازوؤں کی گرفت میں پہونچ گئی۔ جب نیری نے اس کی کلائی کو پکڑا تو وہ ذرا جھجکی۔ لیکن دونوں کو اس بات کا قطعی احساس نہیں ہوا کیونکہ دن کے واقعات کے اعادہ سے دونوں ہنسی کے مارے بیتاب تھے۔ اس وقت ہنسنا کیا سہل معلوم ہو رہا تھا۔ سخت گیر باپ، احساس فرائض، رسم و رواج کی زنجیریں اور مندروں کی سنگین دیواریں سب لغو اور نگاہ سے اوجھل تھیں۔

تھوڑے عرصہ کے بعد، نیری نے تارا کے چہرے پر اضمحلال کے آثار دیکھنا شروع کئے۔ لیکن تارا نے ہنسکر ان علامات کو مٹانے کی کوشش کی اور گھاس پر گرنے کا واقعہ بیان کیا۔ جب نیری نے اس کی کلائی کو دبایا تو پھر غیر ارادی طور پر وہ جھجکی۔ اس مرتبہ نیری نے دیکھ لیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ مجھے زخم دکھلاؤ لیکن وہاں زخم نہ تھا، ہتیلی کے اوپر صرف دو بدنما نشان بنے ہوئے تھے۔

اُس نے گھبراہٹ سے پوچھا۔ "تارا۔ تجھے گرے ہوئے کتنی دیر ہوئی۔ کیا کسی چیز نے تجھے کاٹا تھا۔"

"کیوں۔ نہیں تو۔" اس نے جواب دینا شروع کیا۔ لیکن پھر پھنکار اور اپنے نیچے کسی چیز کا رینگنا اُسے یاد آگیا۔ نیری کی آنکھیں پھیل گئیں۔ جب اس نے پورا قصہ سنا اور ایک سخت خوف اس پر طاری ہو گیا۔

اس کے بیان سے سانپ کا کاٹنا ثابت ہوتا تھا۔ لیکن زہر شرائین میں سرایت کر چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ

اُس کے اثرات چہرے سے ظاہر ہو رہے تھے۔ اس کے پاس اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ اس خوفناک حقیقت کو جہاں تک ہو سکے تارا سے پوشیدہ رکھے۔ اسنے اپنے رومال سے اس کی کلائی کو باندھ دیا اور دُکھتے ہوئے اور بے قرار دل کے ساتھ اس نے کوشش کی کہ اپنی نگاہوں سے کسی تکلیف کا اظہار نہ ہونے دے۔ لیکن تارا سب سمجھ چکی تھی۔ اس کی آنکھیں خوف و ہراس سے پھیل گئیں۔ "نیری۔ پھن والی چیز سا...... ... سانپ تھی! آہ۔ خدا کے لئے انکار نہ کرو۔ لیکن۔ نیری۔ کیا۔ کیا میں مرجاؤں گی۔"

"نہیں۔ نہیں۔ میری جان" اُس نے چلا کر کہا اور اپنے سینے سے دبا کر لپٹا لیا۔ اس نے سوچا کہ دیوتا ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔ اب وہ نہیں مر سکتی۔ میں نے اس کے نازک گلاب جیسے وجود کو اپنے دل پر نقش کر لیا ہے۔ ابھی ایک لمحہ ہوا، مسرور و شاداں، زندگی اور صحت سے معمور؛ وہ میرے بازوؤں کی گرفت میں آچکی ہے اب۔ موت.........

تارا نے بیتابی اور بے صبری سے لپٹتے ہوئے کہا "نیری۔ مجھے اپنے بازوؤں کی گرفت میں مضبوطی سے پکڑے رہو اور میں بہادری سے مقابلہ کی کوشش کروں گی۔ کیونکہ تیری معیت میں یہ تکلیف بھی بے حقیقت ہے"

جب ایک چیخ اس کے لبوں سے نکلی اور اس کا چہرہ متغیر ہونے لگا، تو نیری کو اس کی محبت نے بتایا کہ اسے اس وقت کیا کرنا چاہیے۔ اس نے تارا کو اپنے دل سے لگائے رکھا اور تسکین دیتا رہا۔ کیونکہ اس کی زندگی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔

نیری نے اُسے پیار کیا اور آہستہ آہستہ کہا "اے تارا، تجھے ایک دفعہ پا لینے کے بعد، چھوڑ دینا بڑی سخت اذیت ہے........"

جوں جوں وقت گزرتا گیا، مہلک زہر آہستہ آہستہ دل کی طرف بڑھتا رہا۔ کوشش کے ساتھ تارا نے نگاہ جما کر اس کو دیکھا۔ ایک غیر فانی محبت تارا کی آنکھوں میں ضوفگن تھی اور نیری کی آنکھیں بھی اس محبت کا جواب ایسی ہی پاک اور ابدی محبت سے دے رہی تھیں۔

وہ جھکا اور اس نے اس کے لبوں کو بوسہ دیا۔ اس کے بازوؤں کی گرفت میں اس حسین دوشیزۂ گلاب نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔ جس حسن و نزاکت کے ساتھ نیری کی زندگی میں وہ داخل ہوئی تھی اس حسن و نزاکت کے ساتھ اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کر کے رخصت ہو گئی۔

(ترجمہ از السٹریٹڈ ویکلی)

محمد عاقل ایم۔ اے (علیگ)

جنم اشٹمی کی تقریب میں

اڈیٹر نگار کی تقریر

جناب صدر و حاضرین جلسہ ——

گزشتہ سات سال قیام لکھنؤ کے زمانہ میں میرے لئے یہ بالکل پہلی فرصت ہے کہ مجھے کسی مجمع میں زبانی اظہار خیال کا موقعہ ملا ہو اور مجمع بھی کافروں کا —— معاف فرمائیے یہاں میں نے لفظ کافر منکر و ملحد کے معنی میں استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ اس مفہوم میں استعمال کیا ہے جو دنیائے شعر و محبت میں نہایت ہی عزیز و محبوب ہستی کے لئے مستعمل ہوتا ہے اور باور کیجئے کہ ہنود جماعت بعض اعتبارات سے مجھے صد درجہ عزیز و محبوب ہے۔

بہر حال میرے لئے بڑی مسرت کی بات ہے کہ آج میں آپ حضرات کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہوں اور ایسے تہوار کی تقریب میں جو ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے اور اس ایک مقدس رات کی یادگار میں جب ایک برگزیدہ ہستی نے عالم وجود میں آ کر حیات انسانی کے بہت سے نئے اوراق پلٹ کر رکھ دیئے۔

افسوس ہے کہ صرف کل شام کو مجھے یہاں حاضری کی دعوت دی گئی اور مجھے بالکل موقعہ نہیں ملا کہ میں اس مہتم بالشان تقریب کے لئے کوئی قابل ذکر خدمت انجام دے سکتا، تاہم تعمیل ارشاد میں حاضر ہو گیا ہوں اور اپنی پریشان خیالی پر اظہار معذرت کرتا ہوں۔

حضرات، میں ایک زمانہ سے مذاہب عالم کا مطالعہ کر رہا ہوں اور جنھوں نے نگار کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اچھی طرح واقف ہیں کہ اپنی آزاد خیالی کے بدولت مجھ پر کیسے کیسے سخت حملے ہوئے اور ہو رہے ہیں، لیکن میں یہ کہنے سے کبھی باز نہیں رہ سکتا کہ مطالعۂ مذاہب کے سلسلہ میں، جس نتیجہ پر میں پہونچا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ یا تو مذاہب سب کے سب لغو و مہمل ہیں یا سب کے سب سچے ہیں۔ وہ اس لحاظ سے کہ دنیا میں کوئی خونریزی و خون آشامی ایسی نہیں ہوئی جس میں مذہب کا ہاتھ نہ رہا ہو اور یہ اس حیثیت سے کہ جب ہم ان کی تعلیمات کو دیکھتے ہیں

تو ان کی سچائی سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتے۔

دنیا میں مذہب کے ہمیشہ دو پہلو رہے ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق عقائد سے ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو اعمال سے وابستہ ہوتا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ ایک کا نام "فلسفۂ مذہب" ہے اور دوسرے کا معاشرت وتمدن۔ پھر یہ تو اکثر ہوا کہ کسی قوم نے ان میں سے کسی ایک پہلو کو لے لیا اور معراج ترقی تک پہونچا دیا، لیکن ایسا کمتر دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی جماعت کے دونوں پہلو مکمل رہے ہوں اور غالباً یہ کہنا خلاف حقیقت نہ ہوگا کہ ہندوؤں کی جماعت میں بہت کچھ اس تکمیل کی صلاحیت پائی جاتی ہے، کیونکہ اگر ایک طرف ان کا فلسفۂ ویدانت اپنی جگہ فلسفۂ مذہب پر آخری لفظ کی حیثیت رکھتا ہے تو دوسری طرف کاروبار حیات میں ان کی تقسیم عمل کامیابی کا بڑا راز ہے۔

آپ کو غالباً معلوم ہوگا کہ ہندو کوئی مذہب نہیں ہے۔ بلکہ یہ لفظ ایرانی الاصل ہے۔ قدیم اہل ایران دریائے سندھو کو دریائے ہندھو کہا کرتے تھے اور بعد کو ادھر کے رہنے والوں کو بھی اسی لفظ سے پکارنے لگے یہ تو خیر لغوی تحقیق ہوئی مگر میں تو حقیقت کے لحاظ سے بھی یہی کہتا ہوں کہ ہندو اصطلاحی معنے میں کوئی مذہب نہیں ہے۔ بلکہ سوسائٹی کا ایک نظام ہے، دنیاوی کاروبار میں تقسیم عمل کا ایک طریقہ ہے اور آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرنے کا دستور۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مذہب میں نہ کبھی کسی شخص پر کفر والحاد کا فتوےٰ لگا کر اسے مذہب سے خارج کیا جا سکتا ہے اور نہ اصولاً آپ انکار کر سکتے ہیں اگر کوئی اور شخص آپ کی جماعت میں شامل ہونا چاہے، لیکن معاف فرمائیے اگر میں کہوں کہ جس طرح دنیا کی اور تمام قوموں نے اپنے اصول حیات ومعاشرت کو بھلا دیا، اسی طرح آپ نے بھی اسے بھلا دیا۔ اور آج ہی نہیں بلکہ اس سے پہلے بھی بارہا بھلایا اور جب بھلایا کوئی نہ کوئی شخص آپ میں ضرور ایسا رونما ہوا جس نے اس بھولے ہوئے سبق کی یاد دلائی۔ پھر کیا آپ کو یا کسی اور کو اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ جب بدی آٹھ بھدرا کو کرشن جی مہاراج عالم وجود میں آئے تو یہ زمانہ وہ نہ تھا جب آپ اپنی زندگی کے اصل مقصد کو بھلا چکے تھے۔ اور کیا ضرورت نہ تھی کہ کوئی ریفارمر یا مصلح اس وقت پیدا ہوتا اور آواز حق بلند کرتا ؟

پھر اس وقت ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ وہ رام چندر جی کی طرح چھتری جماعت کے ہیرو تھے مہابھارت میں پانڈوں کے دست راست تھے، یا بھگوت گیتا کے بیان کے مطابق وشنو کے اوتار، نہ ہم کو اس تحقیق کی حاجت ہے کہ وشنو پران کی روایات کے مطابق متھرا میں رادھا اور گوپیوں کے ساتھ ان کی زندگی کا ابتدائی زمانہ کس ریاضت میں بسر ہوا یا اپنی حیات کے آخری لمحے دوارکا میں کس طرح گزارے، بلکہ دیکھنا صرف یہ ہے کہ جس چیز کا انھوں نے درس دیا، جس بات کی انھوں نے تعلیم دی وہ کیا تھی اور کیسی تھی۔ پھر

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ بھگتی سے بہتر تعلیم، فلسفۂ اخلاق و تصوف کی کوئی اور ہو سکتی ہے؟

روحانی صداقت، اخلاقی پاکیزگی، داستان محبت، پیام آزادی، باطل کا مقابلہ، حق کی حمایت، اگر آپ ان تمام باتوں کو دنیا کی کسی شاعری میں یکجا دیکھنا چاہتے ہیں تو بھگوت گیتا پڑھئے اور عالم سے بے نیاز ہو جائیے۔

افسوس ہے کہ میں اس زبان سے واقف نہیں جس میں بھگوت گیتا کا مطالعہ کرنا چاہیے لیکن جس حد تک ترجموں سے استفادہ کا تعلق ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھ پر کم کسی کتاب کا اتنا اثر ہوتا ہے جتنا بھگوت گیتا کا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والے کا سینہ جذبات کے طوفان سے لبریز ہے اور انسانی زبان اس کو ظاہر کرنے سے عاجز ہے، لیکن وہ لوگ جو صرف الفاظ کے پیرو نہیں ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ جو سیلاب ان محدود لفظوں میں نہیں آسکا ہے، جو سمندر اس کوزہ میں نہیں سما سکا ہے اس کی حقیقت کیا ہے اور وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟

آپ کو غالباً معلوم ہوگا کہ جب پندرہویں صدی کے اخیر میں ولبھ نے راجپوتانہ و گجرات میں اور ایک دوسرے مہاتمانے بنگال میں وشنوئی رفارمر کی حیثیت سے تعلیمات بھگوت گیتا کو از سر نو زندہ کرنا چاہا اور پھر انیسویں صدی میں سوامی نارائن جی مہاراج نے اس تحریک میں اور زیادہ قوت پیدا کرنا چاہی، تو دفعۃً لوگوں کے خیالات میں کیا انقلاب برپا ہوا اور کس طرح لوگ جوق در جوق اسی تحریک کی طرف کھنچکر آنے لگے ــــ مگر میں پوچھتا ہوں کہ آج جبکہ شمالی ہند میں بہت بڑی جماعت پرستاران کرشن کی موجود ہے، بھگوت گیتا کی کس تعلیم پر عمل کیا جا رہا ہے۔ اور آپ نے ہندوستان کے اس پیغمبر اعظم کی بتائی ہوئی راہوں پر چلنے کی کس حد تک کوشش کی ہے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ بھگوت گیتا کی اصل روح تمام دنیا کے انسانوں کو بھائی سمجھنا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ شاید اس مجمع میں اس وقت بھی بہت سے ہندو بھائی ایسے ہوں گے جو مسلمان کا تو خیر ذکر ہی کیا، خود اپنی ہی جماعت کے کسی دوسرے فرد کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہ کھائیں گے۔ افسوس ہے آپ لوگ انسان کو صرف اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ اس کے سر پر چوٹی ہے یا نہیں، وہ دھوتی پہنتا ہے یا پاجامہ اس کے سر پر ترکی ٹوپی ہے یا فلٹ کیپ، حالانکہ انسان نام ظاہری وضع قطع کا نہیں بلکہ اس کے بطون کا ہے، اس کے دل کا ہے جس میں سما جانے کے لئے خدا کوئی تفریق نہیں کرتا ــــ اگر آپ لوگ اس حقیقت کو سمجھ جائیں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے مذہب سے زیادہ امن پسند و صلح کل مذہب کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

معاف فرمائیے اگر میں کہوں کہ آپ بھی دوسرے مذہب والوں کی طرح اپنے مذہب سے بہت دور ہٹ گئے ہیں اور جو تعصب ان میں پایا جاتا ہے وہی آپ میں بھی ہے

در میان کافراں ہم بودہ ام
یک کمر شایستۂ زنار نیست

پھر اب سے ایک چوتھائی صدی قبل تو اس تفریق کو برداشت کیا جا سکتا تھا، کفر و اسلام کے درمیان جو زبردستی کی خلیج حائل کر دی گئی ہے۔ اس کو نظر انداز کیا جا سکتا تھا، لیکن اب کہ ہندوستان نہایت نازک دور سے گزر رہا ہے، مسجد و مندر کی تفریق، اذان و ناقوس کا امتیاز کسی طرح قابل برداشت نہیں اور ہندو جاد۔ مسلمان پانی کی پکار کسی طرح نہیں سنی جاتی۔

پھر میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آج آپ حضرات جو کرشن جی کی یادگار منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں اس سے کیا مراد ہے۔ اگر اس سے مقصود صرف تھوڑی دیر کی گرمی محفل ہے تو خیر، ورنہ آپ کو یہاں سے یہ عہد کر کے اٹھنا چاہئے کہ آپ چھوت چھات کی زنجیروں کو توڑ دیں گے۔ جسے کرشن جی نے کبھی پسند نہیں کیا اور اس اخوت عام، اس (Universal Brotherhood) کو اپنا نشان منزل بنائیں گے جو ہندو معاشر کا اولین اصول ہے۔

آپ نے بھگوت گیتا میں پڑھا ہوگا۔ کرشن جی، ارجن سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:۔

> "اے ارجن مجھ سے اور تجھ سے بہت سی قوتوں نے جنم لیا ہے پس، اے
> بھارت کے پوت یاد رکھ کہ دنیا میں جب کبھی نیکی معدوم ہوئی اور بدی
> پیدا ہونے لگی، میں نے نیکی کی حمایت اور بدی کے استیصال کے لئے ہمیشہ
> اپنے آپ کو ظاہر کیا"

پھر بتائیے کیا اس وقت نیکی معدوم نہیں ہے، کیا بدی اس وقت حکمراں نہیں ہے۔ تو کیا کرشن جی کا یہ کہنا غلط ہو سکتا ہے اور کیا وہ اپنے آپ کو ظاہر نہیں کریں گے۔ یقیناً کریں گے مگر صرف اس طرح کہ آپ میں سے ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو کرشن کا پرستار کہتا ہے۔ ان کی تعلیم پر عمل کرے۔ اور ذات پات کی بندشوں، چھوت چھات کی پابندیوں، مذہب و ملت کی زنجیروں کو توڑ کر صرف اس مذہب کی پیروی کرے جس کا نام محبت ہے اور جسے چرواہوں کے گوپال، گوالنوں کے گوپی ناتھ، رکمنی کے شوہر، رادھا کے محبوب، شیام رنگ کرشن نے بتایا تھا اور جس کی مرلی کے مقدس نغمے اب بھی تمام عالم میں گونج سکتے ہیں اگر آپ لوگ مذہب کا مفہوم صرف "انسانیت" و "انسانیت پرستی" قرار دے لیں۔

مکتوبات نیاز

۱۰ مارچ سنہ ۲۲ء

عزیز من - مانا کہ نگاہوں سے دور ہو لیکن دل سے تو نہیں ــــــ میں نے اس سے پہلے بھی تمھیں لکھا تھا کہ فرصت نکالو اور چند دن کے لئے یہاں آجاؤ، لیکن تمہارا وعدہ اور میرا انتظار دونوں ایک ہی سے نکلے ــــــ یہاں مالوہ میں خصوصیت کے ساتھ بارش کا زمانہ بہت پُرلطف ہوتا ہے ــــ بادہ طلب بھی اور بادہ ریز بھی ــــــ اور غالباً یہیں کے متعلق غالب نے

بادہ نوشی ہے بادپیمائی

لکھا تھا ــــــ تم آجاؤ تو شاید کچھ "جراُت رندانہ" پیدا ہو جائے، ورنہ یہاں تو تمام ولولے سرد ہو چکے ہیں اور ساری اُمنگیں خاک ــــــ اس لئے اپنے لئے نہیں آتے تو میرے لئے زحمت اختیار کرو، یہ تمھارا دعوائے ایثار آخر کس دن کام آئے گا ــــ جب میں نہ ہوں گا ؟ اچھا خدا حافظ

نیاز

---

۱۴ اپریل سنہ ۲۲ء

صدیق الاجل ــــــ آپ کا فرمان سر آنکھوں پر - لیکن یہ تو فرمائیے کہ

طاقتِ نغمہ و پرواز کہاں سے لاؤں

"عرش" سے نیچے اُتر کر "فرش" کی دنیا پر بھی کبھی کبھی غور کرنے کی عادت ڈالئے ہائے کمبخت نظیری، کیا کہ گیا ہے !

بزیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را
نواگران نخوردہ گزند را چہ خبر

تو بھائی، تم ٹھیرے "نواگران نخوردہ گزند" میں سے، اس لئے تمھیں کیا خبر کہ یہاں کتنے صاحب

اس وقت تک ڈس چکے ہیں ——— مگر خوش رہو کہ گاہے گاہے پوچھ تو لیتے ہو، ناکردہ گناہوں کی حسرتوں میں ہیجان تو پیدا کر دیتے ہو ——— میاں الیاس کہاں ہیں ——— میں نے سنا تھا کہ انھوں نے ——نہیں نہیں —— کسی سے اُن سے نکاح کر لیا ہے اگر یہ خبر خدانخواستہ صحیح ہے تو میری تعزیت ان تک پہونچا دو، کیونکہ آج نہیں تو کل کسی کو جان دینا ضرور ——— توبہ، کسقدر ظالم انسان ہے؟ محسن کش تو بہت دیکھنے میں آئے لیکن "محبوب کش" آج تک کسی کو نہ دیکھا تھا ——— یہ شاید تیسرا شکار ہے اللھم زد فزد

نیاز

بے دیکھے کہدیا کہ چنے ہم نہ کھائیں گے
کچے کہاں ہیں یار اُبالے ہوئے تو ہیں

سچ کہتا ہوں آج بے اختیار جی چاہ رہا ہے کہ تم سے کچھ ایسی ہی باتیں کروں ——— نہایت بے تکلفانہ اور حد درجہ سطحی و سفیہانہ! ——— اُف یہ عقل و ہوش کی دنیا بھی کسقدر تکلیف دہ آزار کی دنیا ہے ——— بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید دماغ کی تمام رگیں ٹوٹ جائیں گی

تو پھر آجاؤ نا، ایک بار ہم تم دونوں پھر بے وقوف بنکر کم از کم ایک رات تو اس طرح بسر کر دیں کہ صبح اٹھیں تو دماغ پورا سکون محسوس کر رہا ہو ——— بادلوں کے ٹکڑوں کو دیکھیں اور حیرت کریں کہ ان کی نقل و حرکت سے کیسے کیسے جانوروں کی شکلیں بنتی ہیں، جلدی جلدی انھیں گزرتے ہوئے دیکھیں اور کہیں کہ دیکھو چاند کتنی تیزی سے بھاگا جا رہا ہے ——— گھنٹوں چاند کو دیکھتے رہیں اور کہیں کہ واقعی بڑھیا چرخا کاتتی ہوئی نظر آ رہی ہے ——— چڑیوں کو دیکھیں اور ایک دوسرے سے کہیں کیوں جی کس مزہ سے ان کی زندگی بسر ہوتی ہے، جہاں جی میں آیا پھُر سے اُدھر اڑ گئیں، پھُر سے ادھر اڑ آئیں ——— کسقدر جی چاہتا ہے کوئی کہانی سنائے، لیکن کہانی اس قسم کی جس میں ایک شاہزادہ کو تین راستوں پر جانے کی اجازت مل جاتی ہے۔ لیکن چوتھے راستہ پر جانے کی ممانعت ہوتی ہے، وہ شکار کی غرض سے وزیر زادہ کو ساتھ لے کر جنگل میں پہونچتا ہے اور جان بوجھ کر اُسی چوتھے راستہ پر ہو لیتا ہے، کچھ دور چل کر دریا کے اندر اُسے لعل تیرتے ہوئے ملتے ہیں، وہ اس سُراغ پر ایک مکان تک پہونچتا ہے جہاں چھینکے میں کسی خوبصورت شاہزادی کا کٹا ہوا سر لٹکا ہوا ہے اور اس سے خون کے قطرے ٹپک ٹپک کر لعل بنتے جاتے ہیں، پھر دیو آتا ہے اور شاہزادہ اس کو ہلاک کر کے شاہزادی کو اپنے ساتھ لے آتا ہے ——— یا پھر اس قسم کی کہانیاں —— جن میں کوئی شاہزادہ کسی طلسمی شہر

میں پہونچتا ہے جہاں ہر چیز پتھر کی نظر آتی ہے ——— دفعۃً ایک آواز پیدا ہوتی ہے اور یہ پلٹ کر دیکھتا ہے اور خود بھی پتھر کا ہو جاتا ہے ——— یا پھر اس طرح کی جن میں کوئی شاہزادی مسحور شاہزادہ کے جسم سے جادو کی سوئیاں نکالتی ہے لیکن جب صرف آنکھوں کی سوئیاں باقی رہ جاتی ہیں تو کنیز اس خدمت کو انجام دیتی ہے اور آخر کار خود شاہزادی بن جاتی ہے ——— یا پھر ایسی جن میں سر پر جادو کی کیل ٹھونک کر کسی شاہزادہ کو چڑیا بنا دیا جاتا ہے۔ اور شاہزادی اتفاق سے اس چڑیا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کیل کو محسوس کر لیتی ہے اور اس کے نکالتے ہی وہ چڑیا فوراً ایک خوبصورت شاہزادہ میں تبدیل ہو جاتی ہے ——— آہ ———، وہ زمانہ اب کیونکر واپس آئے ——— وہ شام کو دریا کے کنارے لایعنی طور پر بیٹھے رہنا، وہ دوپہر میں باغوں میں جا جا کر چوری چھپے امرود لتوڑ توڑ کر کھانا ——— وہ چاندنی راتوں میں گھنٹوں آنکھ مچولا کھیلنا اور پھر دبے پاؤں گھر واپس آنا ——— معلوم ہوتا ہے کہ ایک موج سلسبیل تھی جو گزر گئی، نسیم کا ایک جھونکا تھا جو آیا اور غائب ہو گیا

انسان احمق و بیوقوف پیدا ہوا اور حماقت ہی میں اس کے لئے سکون ہے ——— اللہ محفوظ رکھے عقل و فراست سے جس نے انسان کو کبھی نہ ٹوٹنے والے دام میں پھانس رکھا ہے ——— وہ لیجئے کوئی صاحب "مولانا، مولانا" پکار رہے ہیں، اچھا رخصت۔ کیونکہ مجھے پھر وہی مکر و فریب کی باتیں کرنا ہیں اور کسی کو دھوکا دے کر خود اپنے آپ کو بھی دھوکا دینا ہے ———

نیاز

۲۰؍ اپریل ۲۳ء

محترمہ لکھ نہیں سکتا کہ آپ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹی ہیں اور یوں آپ کو کس طرح مخاطب کروں؟ بھی اس سے ایک اجنبیت ظاہر ہوتی ہے جسے میں پسند نہیں کرتا ——— عزیزہ لکھ سکتا ہوں بشرطیکہ آنکہ مجھے یقین ہو اس امر کا کہ آپ چھوٹے عزیزوں کی طرح میرا کہنا مان لیں گی ——— کل ہی آپ کے شوہر اور میرے محبوب دوست . . . کی مفصل تحریر مجھے ملی، جس سے مجھے باہمی کشمکش کا حال معلوم ہوا ——— آج آپ کی تحریر سے اور زیادہ توثیق ہو گئی ——— سنئے اگر کوئی بات خلاف مزاج ہو تو بھی سنئے ——— کہ ہندوستان کی عورت ابھی اس سطح پر نہیں آئی جو مغرب میں پائی جاتی ہے ——— خدا وہ وقت لائے کہ یہاں بھی وہ کلہ بکلہ مرد کو جواب دے سکے، لیکن جب تک وہ ساعت نہ آئے، "محض آرزو کو حاصل" سمجھ لینا قرین عقل نہیں ——— یاد رکھئے اس وقت تک کہ عورت معاش کے لحاظ سے بے نیاز نہ ہو جائے اُسے کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ مرد کے ساتھ درجۂ مساوات کی مدعی ہو ——— پھر چونکہ یہاں کا مرد عورت کی اس بیچارگی کو پوری طرح محسوس کرتا ہے، اس لئے قدرتاً اُس

میں ایک جذبۂ انانیت و تفوق پیدا ہونا چاہئے۔ عورت اسے برداشت نہ کرے گی تو کرے گی کیا؟ ——— ایک بات

دوسری بات جو میرے خیال میں عام طور پر باہمی کشمکش کا سبب ہوا کرتی ہے، عورت کا جذبۂ رشک اور اس کی "کاوش پسندی" ہے ——— یعنی وہ اس کوشش میں کہ مرد پر پوری طرح مستولی ہو جائے اس کی جائز تفریحوں اور ضروری آزادیوں میں بھی مخل ہونے لگتی ہے اور ہر وقت اس فکر میں لگی رہتی ہے کہ مرد کہاں جاتا ہے، کس کس سے ملتا ہے اور کس جگہ کتنا اپنا وقت صرف کرتا ہے ——— زیادہ محبت کرنے والی عورتوں میں "جاسوسی" کی یہ کیفیت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے اور رات دن وہ اس فکر میں مبتلا رہتی ہیں ——— نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرد چند دن تک تو اسے برداشت کر لیتا ہے لیکن جب اس کے جذبۂ خودداری کو زیادہ ٹھیس پہنچنے لگتی ہے تو عورت کی طرف سے ایک قسم کی کیفیتِ احتراز اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے جو بڑھتے بڑھتے زیادہ خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے

میں سمجھتا ہوں کہ آپ بھی اسی قسم کی "محبت" کا شکار ہیں اور یہی اصل سبب تعلقات کی ناخوشگواری کا ہے ——— پھر میں پوچھتا ہوں کہ جب تک آپ کے حقوق پورے ہو رہے ہیں اور آپ کے ساتھ محبت و خلوص کا سلوک ہو رہا ہے، آپ کیوں اس جستجو میں خواہ مخواہ اپنے دل دکھاتی رہتی ہیں کہ "وہ" کہاں جاتے ہیں۔ اور کیا کرتے ہیں ——— میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ہندوستان میں زن و شو کی باہمی ناچاقی کا سبب ۸۰ فی صدی یہی ہوتا ہے اور میں اس باب میں یقیناً عورت کو خطاوار ٹھیراتا ہوں

مجھے معلوم ہے کہ انھیں آپ سے بہت محبت ہے (اور آپ کو بھی اس کا اعتراف ہے) پھر کیوں نہ آپ اس یقین پر قانع رہ کر مسرور زندگی بسر کریں اور کیوں نہ آپ انھیں اس کا موقعہ دیں کہ وہ "ہلکے ہلکے گناہ" کر کے کسی "بڑے گناہ" سے بچے رہیں۔ اگر واقعی ان کی آزادی میں کوئی صورت "گناہ" کی پیدا ہوتی ہے ——— امید ہے کہ آپ کسی وقت تنہائی میں سکونِ دل کے ساتھ میری تحریر پر غور کریں گی اور اگر آپ کی نسوانی فطرت اس پر عمل نہیں کر سکتی اور آپ یہی چاہتی ہیں کہ "رنجش بیجا" سے آپ کو "منفعل" نہ ہونا پڑے تو میں خود ان کی طرف سے

می آرم اعتراف گناہِ نبودہ را

آپ کا مخلص

نیاز

۲ / مئی ۱۹۲۲ء

باز نگاہے! تمھیں معلوم ہے کہ مایوسی کے کس دَور سے گزر رہا ہوں - یعنی

راضی ہوں گر اعدا بھی کریں فیصلہ اپنا

مگر تم نے تو اس خط میں وہ بات لکھی کہ اب کیا کہوں —— نہ آنکھوں کو اعتبار، نہ دل کو اعتماد، کیونکر باور کرلوں، اسی لئے چاہتا ہوں کہ پھر تصدیق ہو جائے —— ایک بار پھر وہی کہدو، اور سچ مچ جلا لو —— تمھاری بزیرائی کی ہمت نہیں، تمھارے دیدار کی تاب نہیں —— مگر پھر بھی تمھیں "دعوت امتحان" دیتا ہوں! — آؤ اور اُن تمام فتنہ سامانیوں کے ساتھ آؤ جو تمھاری فطرت ہیں اور میری روح کی لذت —— اچھا تو بتاؤ کس تاریخ، کس دن، کس ساعت، یہ چودھویں کا چاند میرے "ظلمت خانہ" میں طلوع کرے گا؟ اجی جاؤ بھی مذاق کر رہے ہو، بنا رہے ہو، —— سچ کہتا ہوں مجھے تو اُس وقت بھی یقین نہ آئے گا جب تم میری آغوش میں ہوگے اور میں تمھارے شانہ پر سر ڈالے ہوئے آنسو بہا رہا ہوں گا آہ

نیاز

---

۴ / جون ۱۹۲۲ء

آپ کی رہبری و چارہ سازی میں کلام نہیں، لیکن اس کا کیا علاج کہ

من از آتش دخاں بینم تو آتش از دخاں بینی

آپ کے نزدیک معیشت و معاشرت کا تغیر پہلا قدم ہے ملک کی آزادی کی طرف، میں کہتا ہوں کہ اس کے لئے صرف انقلاب احساس اور عزم دلیر درکار ہے —— تاہم مجھے کھادی کے استعمال سے اختلاف نہیں، چپل پہننے سے احتراز نہیں، میں تو ان دونوں چیزوں میں خاص قسم کی روحانیت پاتا ہوں خصوصیت کے ساتھ گورے رنگ اور صاف چہرہ پر تو اس کے نکھار کا عجب عالم ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ چہرہ کا کشمیری رنگ اور سواری کے لئے موٹر کہاں سے لاؤں —— کھادی پہننا اور بری صورت لئے ہوئے بازار میں جوتیاں چٹخاتے پھرنا مجھے پسند نہیں —— کیا یہ کھادی کی توہین نہیں؟

آپ کے لئے یقیناً موزوں ہے کیونکہ آپ کو خوش قسمتی سے دونوں نعمتیں حاصل ہیں۔ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ ناز کی طرح اب کھادی سے بھی زیادہ تر نمائش کا کام لیا جاتا ہے اور مقصود کا سوال بہت کم لوگوں کے سامنے ہے۔ اس لئے چند دن اور غور کرتے دیکھئے۔ شاید نقد و نسیہ کی تمیز کوئی بہتر صورت اختیار کرلے۔ ذاکر

سے پوچھیے کہ نام تو یہ اور فراموشکاری کا یہ عالم کہ گویا ہمارا شمار خدا کی مخلوق میں ہی نہیں۔ معاذ اللہ۔

نیاز

۱۰ر جون ۲۲ء

محبی ——— آپ بھی کیا پرانا قصہ لے کر بیٹھے ہیں ——— نہ اب امیر موجود نہ داغ، نہ اُن کی شاعری کی ضرورت، نہ ان کی غزل سرائی سننے کی کسی کو فرصت۔ نہ جان عالم پیا رہے، نہ محمد شاہ رنگیلے ——— اور تو اور ——— بقول شخصے سرسید اور ذکاء اللہ بھی تو نہیں رہے، پھر اب غزل و موسیقی کا کیا خاک لطف! ——— میں بھی اس وقت آپ کی طرح بے تکی ہانک رہا ہوں ——— اگر اس میں بھی آپ کو شاعری نظر آتی ہے تو آداب عرض کرتا ہوں اور حسن سماعت کی داد دیتا ہوں۔ لیکن "مکرر ارشاد ہو" کی شرط نہیں۔ کہئے تو یہ مضمون نذر آتش کر دوں (صرف اس رعایت سے کہ آتش بھی ایک شاعر کا تخلص تھا) ورنہ بیمہ کرکے سر بہ مہر خدمت گرامی میں بھیج دوں تاکہ شافع محشر کے سامنے وقت ضرورت آپ اس کو پیش کر سکیں

نگار کا رنگ آپ کو معلوم، میرے ذوق سے آپ آشنا، زمانہ کی ضرورت سے آپ آگاہ ——— پھر بھی پورے ۲۲ صفحے ان مہملات میں سیاہ کر دیے ——— بندۂ خدا اتنا وقت کسی اور لذیذ گناہ میں صرف کرنے، اور کچھ نہیں تھا تو دو چار گالیاں ہی مجھے سنا دیتے کہ تمھیں نہیں تو مجھی کو کچھ لطف آجاتا ——— لاحول ولا قوۃ

نیاز

۲۸ر جون ۲۲ء

معقول، اِدھر مجھ سے تو یہ کہنا کہ میں انھیں جانتا بھی نہیں، اُدھر میرے متعلق ان کے سامنے ایک مستقل باب بحث و گفتگو کا کھول دینا ——— میرے پاس جو تحریر اُن کی آئی ہے، بھیجتا ہوں

ادھر لاؤ ذرا دستِ حنائی

پکڑ لیں چور کا دل ہم یہیں سے

مانا کہ جو کچھ آپ کر رہے ہیں اس میں سوائے محبت و خلوص کے کچھ نہیں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ محبت کا احسان ماننے والے دولت کے احسان کو مشکل سے قبول کر سکتے ہیں ——— آپ سے تو میں نے یوں ہی برسبیل تذکرہ کہہ دیا تھا کہ وہ چاہیں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے، مگر آپ نے شاید اس کو میری طرف سے "حسنِ طلب" قرار دیا ——— مہربانی فرما کر انھیں لکھ دیجیے کہ مجھے اُن کی امداد کی ضرورت نہیں ——— میں خود بھی ان پر ظاہر کر چکا ہوں

" محبت انسان کو ذلیل کردیتی ہے " ــــــ اس کی ایک مثال یہ بھی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی ــــــ " گدائے متکبر " ہوں اور پیسہ لینے کے بعد سوڈنڈے مارنے کا احسان دوسروں پر رکھنا چاہتا ہوں ــــــ سو بتاؤ ایسے احمق دنیا میں مجھے کہاں ملیں گے ــــــ آیندہ اس التفات وخلوص سے مجھے معاف رکھئے اور یہ سمجھنا چھوڑ دیجئے کہ جو بات کہی جاتی ہے اس میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی غرض دنیاوی ضرور شامل ہوتی ہے ــــــ مجھے تو ان کی اس دیانی ہمدردی نے رات بھر بے چین رکھا ــــــ خدا جانے کیا ہوتا اگر وہ عملاً اظہار ہمدردی کرتے ــــــ مجھے نہ ان کی نیت پر شبہ ہے ؛ نہ آپ کی محبت پر ــــــ کہنے کی بات نہیں مگر کہتا ہوں کہ کسی نے میرے ساتھ بھلائی کی اور مجھے اس سے نفرت ہوئی ، کیونکہ خواہ مخواہ یہ خیال دل میں پیدا ہونے لگتا ہے کہ وہ مجھے ذلیل سمجھتا ہوگا ــــــ پھر تمھیں بتاؤ کہ ایسا نامعقول شخص احسان کئے جانے کے قابل ہے ــــــ اگر ان سے موجودہ صاحب سلامت ترک کرانا ہو تو خیر ، ورنہ انھیں لکھ دو کہ اس معاملہ کو یہیں تک رکھیں اور مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں

ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

نیاز

---

۵ / جولائی سنہ ۲۲ء

کرم گسترا ــــــ رہبری کا شکریہ ، لیکن کیا کروں میری گمراہی تو سکندر کی سی ہے کہ خضر بھی " آب حیواں " تک پہونچانے میں کامیاب نہ ہوئے ــــــ میں آپ کی ہدایت پر ایک سے زاید بار ان کی صحبت " مراقبہ وسلوک " میں شریک ہو چکا ہوں ــــــ گھنٹوں سر جھکائے رہنے کے بعد گردن میں درد تو ضرور پیدا ہو گیا ، لیکن دل پر اتنا بھی اثر نہ ہوا کہ " حضرت " کی صورت ہی مجھے اچھی معلوم ہونے لگتی !

فرمایا ــــــ " کیا چاہتے ہو " ــــــ میں نے جواب دیا ــــــ " روحانیت " ــــــ بولے ــــــ " روحانیت سے کیا مراد ہے " ــــــ میں نے کہا ــــــ " بادہ خواری کی توفیق اور گناہ کرنے کی صلاحیت ! " قریب تھا کہ گردن میں ہاتھ دے کر مجھے نکال دیتے ۔ لیکن میں نے کہا ــــــ " جناب غصہ کی کوئی بات نہیں ، جب روحانیت کا مفہوم خود آپ مجھ سے دریافت کر رہے ہیں تو سوائے اس کے کیا عرض کروں میں تو آپ کے پاس خود یہی سوال لے کر آیا ہوں اور آپ الٹا مجھی سے دریافت کرتے ہیں " ــــــ یہ سنکر خیر غصہ تو کیا کم ہوتا ، لیکن ایک حد تک ضبط پر قادر ہو گئے اور فرمایا ــــــ " پھر بھی تمھارے نزدیک کوئی نہ کوئی مفہوم روحانیت کا ہوگا ، وہی معلوم کرنا چاہتا ہوں " ــــــ میں نے کہا ــــــ " میرے نزدیک روحانیت نام ہے صرف پاکیزہ اخلاق کا " ــــــ دریافت فرمایا ــــــ " کوئی مثال دو " ــــــ میں نے جواب دیا کہ " مثلاً گاندھی جی "

اب آپ کیا پوچھتے ہیں کہ یہ سنکران کا کیا حال ہوا۔

ایک ایک زبان میں ہزار ہزار گالیاں مجھے اور لاکھ لاکھ غریب گاندھی کو دے ڈالیں ——— میں نہایت خاموشی سے سنتا رہا اور جب وہ کامل آدھ گھنٹہ تک گلفشانیاں ختم کرنے کے بعد خاموش ہوئے تو میں نے کہا —— "بہتر ہے میں رخصت ہوتا ہوں، کیونکہ پہلا درس اخلاق کا تو آپ کی طرف سے آج ختم ہو گیا، اگر اس سے جانبر ہو گیا تو پھر حاضر ہوں گا — ورنہ غالباً نجات کے لئے اسی قدر کافی ہے" ——— پھر جی میں تو آیا کہ ان حضرت کو ایک بار بے نقاب کر کے نگار کے صفحات پر لے ہی آؤں، لیکن اس خیال سے کہ شاید آپ برہم ہو جائیں خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا ——— اب آپ کبھی آئیں گے تو آپ ہی کے ساتھ دوسرا درس لینے چلوں گا ——— یوں تو مجھ کو ہمت ہوتی نہیں !

نیاز

کتاب شہوانیات کے بعض عنوانات یہ ہیں

فحاشی کی تعریف فحاشی کے اسباب مذہبی فحاشیاں مذہبی فحاشیوں کی علامتیں
فحاشی پر عمومی تبصرہ مقدس مباشرت مجلگی کے اسباب فحش کی ابتدا فحاشی قدیم روم میں
استلذاذ بالمثل استلذاذ بالنفس استلذاذ بالوحش استلذاذ بالنفس استلذاذ بالخیال
استلذاذ بالادویہ فحاشی عہد قدیم میں فحاشی قرون وسطی میں عہد جدید اور فحاشی
اخلاق جنسی کا ماضی حال اور مستقبل وغیرہ وغیرہ

اگر آپ نے ابھی تک یہ کتاب ملاحظہ نہیں فرمائی تو اب طلب کیجئے ۔ ضخامت ۲۷۵ صفحات قیمت علاوہ محصول مجلد ہے، غیر مجلد ہے ۔
خریداران نگار سے ایک روپیہ کی رعایت ۔

منیجر نگار لکھنؤ

جوش کی شاعرانہ لغزشیں

اس وقت تک جوش کی شاعری پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے ممکن ہے بعض حضرات کو یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ میں جوش کو شاعر نہیں سمجھتا، یا یہ کہ ان کے کلام میں سوائے اغلاط و اسقام کے کچھ اور ہوتا ہی نہیں ــــ اگر یہ خیال کسی نے قائم کیا ہے تو صحیح نہیں، کیونکہ میں دسمبر ۱۹۴۲ء کے نگار میں صراحتہً بیان کر چکا ہوں کہ جوش شاعر پیدا ہوئے ہیں اور ان بعض خصوصیات دماغ کے ساتھ جو ایک شاعر میں پائی جانا چاہیئے۔ اسی کے ساتھ میں اس کا بھی اعتراف کر چکا ہوں کہ اُن کی شاعری میں حلاوت و عذوبت، ندرت و رنگینی کی کمی نہیں لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ ناواقفیت یا غلط پندار نے ان کو صحیح راستہ سے ہٹا کر غلط راہ پر ڈال دیا ہے۔ اور انھوں نے اپنی فطرت و طبیعت، اہلیت و احساس کے خلاف ترنمات کو چھوڑ کر (جو ان کی زندگی کا اقتضاء خصوصی ہے) اصلاحیات کو لے لیا جس کے لئے ان کا دل و دماغ کسی طرح موزوں نہیں۔

مانا کہ دنیا سراسر مکر و ریا ہے، خدع و فریب ہے، اور بہت سی مثالیں ایسی ملتی ہیں کہ لوگوں نے اسی غلط بنیاد پر ترقی کی سربفلک عمارتیں طیار کر لیں، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ شاعرانہ مکر بغیر کھلے ہوئے نہیں رہتا۔ اور بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کوئی شاعر اپنے چہرہ کے اصلی خط و خال کو چھپائے ہوئے منزل طے کر گیا ہو ــــــ پھر ایک شاعر کا مکر یہی ہے کہ وہ ایسی بات کہے جو اس کے دل میں نہیں ہے، اور ایسا درس لوگوں کو دے جس پر وہ عامل نہیں ہے ــــ شاعر حقیقتاً فطرت کا پیامبر ہے؛ قدرت کا ایلچی ہے اور اس کا کام یہی ہے کہ وہ بلاکم و کاست وہی بیان کرے جو اس کی افتاد کا اقتضاء ہے خواہ وہ کیسی ہی زبردست معصیت کا نشر و اعلان کیوں نہ ہو۔

جوش صاحب رنگین فضا میں پیدا ہوئے، رنگین ماحول میں زندگی بسر کی اور ہر چند حالات و اسباب نے یا خود ان کی فطرت و جبلت نے اس رنگا رنگی میں بھی ان کو کبھی پست وادی سطح سے اوپر ابھرنے نہیں دیا، تاہم جس حد تک فکر و احساس کا تعلق ہے وہ تھے اسی عالم آب و رنگ کے آدمی اور اسی عالم کی باتیں ان کو کرنا چاہیئے تھیں، لیکن اُن کے غلط پندار نے جو ڈاکٹر اقبال کی شاعری کو دیکھ کر ان کے اندر پیدا ہوا تھا، یہ خیال ان کے دماغ میں مرتسم کر دیا کہ وہ اصلاح قومی اور وطن پرستی کی خدمت بھی بوجہ احسن انجام دے سکتے ہیں، درانحالیکہ اُن میں اس کی اتنی اہلیت بھی نہیں جتنی مجھ میں اذان دینے یا مسجد میں امامت کرنے کی ہے ــــ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنا

اصلی رنگ چھوڑ کر اس رنگ کا اکتساب کرنے لگے اور اس نوع کے جذبات کا پیوند لگانے سے جو ایک مختلف صورت ان کو اپنے کلام کی نظر آئی تو اسے وہ "طوبیٰ" سمجھنے لگے، درانحالیکہ خود ان کے حال کے لحاظ سے وہ "شجر ممنوع" سے زیادہ نہ تھا۔

"شاعر پیدا ہوتا ہے، بنتا نہیں" یہ نہایت مشہور مسئلہ ہے۔ مگر ایک شاعر ہی پر موقوف نہیں، ہر شخص ایک خاص استعداد قدرت کی طرف سے لے کر آتا ہے اور اسی اہلیت پر اس کی ترقی کی بنیاد قائم ہوتی ہے یعنی اگر اس نے صحیح اندازہ کر کے اسی راہ کو اختیار کر لیا جس پر چلنے کے لئے وہ پیدا ہوا تھا تو منزل تک پہونچ جاتا ہے ورنہ اس کا بھٹک جانا یقینی ہے۔ بالکل یہی حال جوش کا ہوا کہ جس سطحی مگر رنگین شاعری کے لئے وہ وضع ہوئے تھے اس سے رفتہ رفتہ وہ دور ہوتے گئے۔ اور اس رنگ کی شاعری میں پڑ گئے جو ان کے حال و باطن سے کوئی دور کا بھی علاقہ نہ رکھتی تھی۔ پھر چونکہ ان کے لئے یہ بالکل اکتسابی و تکلفی چیز تھی اس لئے مجبوراً انھوں نے دوسروں کے جذبات سے استفادہ شروع کیا اور ایک ناتمام نقل پیش کرنے سے زیادہ وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے ——— چنانچہ اگر کوئی شخص استقصا کرے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ جس طرح رباعیات میں انھوں نے صرف خیام کی ترجمانی اور غزلیات میں حافظ و نظیری کا رنگ اڑانے کی کوشش کی، اسی طرح انھوں نے قومی، اصلاحی و فلسفیانہ شاعری میں اقبال کو سامنے رکھا۔ انگریزی خیالات سے فائدہ اٹھایا اور علاوہ اس کے جو جذبات شعر میں ڈھلنے کے قابل مل گئے ان کو "حصۂ غازی" سمجھ کر وزن و قافیہ میں جکڑ دیا ——— ہر چند یہ کوئی معیوب بات نہیں، اور تقلید و تتبع سے بلند ہو کر گزر جانے والے بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جوش کوئی طبع خلاق لے کر نہیں آئے بلکہ ہمیشہ دوسروں کے چراغ سے اپنا چراغ جلانے کے عادی ہیں۔ اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں جس سے میرے اس قول کی تصدیق ہو سکے گی۔

کلکتہ کے روزنامۂ ہند کی اشاعت، ۱۰ر اگست ۱۹۴۱ء میں بنگال کے مشہور انقلابی شاعر قاضی نذر اسلام کی ایک بنگلہ نظم کا ترجمہ اردو میں شائع ہوتا ہے جس کا عنوان ہے۔ "ناؤ ڈگمگا رہی ہے" اس کے مترجم کوئی صاحب "اختر حسین رائے پوری" ہیں ——— یہ نظم مفہوم کے لحاظ سے بالکل سیاسی و انقلابی نظم ہے جس میں "مادر وطن کے پاسبانوں" سے خطاب کر کے بحر و طوفاں، کشتی و ناخدا سے متعلق تشبیہات و استعارات میں "رجزیہ انداز" سے جذبات قومی کو ابھارا گیا ہے۔

اس کی اشاعت کے سترہ دن بعد ۲۴ر اگست کو جناب جوش کی نظم اسی اخبار میں "ناخدا کہاں ہے" کے عنوان سے شائع ہوتی ہے جو یکسر تقلید ہے۔ قاضی نذر الاسلام کے جذبات کی اور وہ بھی ناقص و ناکمل۔ قاضی صاحب نے اپنی نظم میں منظر طوفان و سیلاب وغیرہ پیش کرتے ہوئے جا بجا جذبات کو ابھارنے والے الفاظ

بھی استعمال کئے ہیں اور اخیر میں رجائی کیفیت پیدا کردی ہے ــــ لیکن جوش صاحب نے صرف گرداب، طوفان، کڑک وغیرہ کے مناظر پیش کئے ہیں اور کشتی کو ڈوبتا ہوا دکھا کر قنوطی رنگ پر اس کو ختم کردیا ہے - خیر یہ تو کوئی نقص نہیں ہے بلکہ معاملہ جرأت و ولولہ کا ہے لیکن خود نظم کے اندر جو نقائص پائے جاتے ہیں وہ ضرور قابل توجہ ہیں - پہلے آپ نظم سن لیجئے :-

ناخدا کہاں ہے؟

خبر لو اے ساکنانِ ساحل! کہ ہر نفس جان پر گراں ہے　　چھڑی ہوئی دیر سے لڑائی زبوں عناصر کے درمیاں ہے
تمام دنیا غرق غرق ہے، تمام عالم دھواں دھواں ہے　　حقیر تنکے کی طرح کشتی کبھی یہاں ہے کبھی وہاں ہے
کوئی خدا کے لئے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے؟ کہاں ہے؟

ہر اک صدا ہیبت آفریں ہے، ہر ایک آواز پُرخطر ہے　　بلا کی پُروائی چل رہی ہے، چھڑی ہوئی جنگ بحر و بر ہے
غضب کے گرداب پڑ رہے ہیں، عظیم طوفان زور پر ہے　　تھپیڑے کھاتا ہوا سفینہ کبھی ادھر ہے، کبھی ادھر ہے
کوئی خدا کے لئے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے؟ کہاں ہے؟

ہواؤں کی سنسناہٹیں ہیں، سیاہ موجوں کے ہیں تھپیڑے　　نہ آئے دریا کو وجد کیونکر گھٹا جب اپنا رباب چھیڑے
ہر ایک گرداب میں وہ قوت کہ ڈوب جائیں ہزار بیڑے　　بلا ہیں سیلاب کے طمانچے، غضب ہیں طوفان کے دریڑے
کوئی خدا کے لئے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے؟ کہاں ہے؟

نہ روشنی کا کوئی منارہ، نہ کوئی ساحل کا راستا ہے　　غضب ہی بپھرا ہوا سمندر فلک کی جانب ہُمک رہا ہے
فلک بھی جھنجھلا چکا ہے اتنا زمیں کے اوپر جھکا ہوا ہے　　اور اہلِ کشتی میں جس کو دیکھو الگ الگ ہی، خفا خفا ہے
کوئی خدا کے لئے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے؟ کہاں ہے؟

ڈراؤنی رات غیظ میں ہے، بھرے ہوئے ہیں تمام جل تھل　　گھٹاؤں سے آسماں ہے بھاری، زمین طوفاں سے ہے بوجھل
نصیبِ دریا میں ہے تلاطم، بپا ہے دھارے میں ایک ہلچل　　بھنور نکالے ہوئے ہیں آنکھیں، گرج رہے ہیں سروں پہ بادل
کوئی خدا کے لئے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے؟ کہاں ہے؟

گھٹا کی پُرہول گڑگڑاہٹ، دلوں پہ ضربیں لگا رہی ہے　　کڑک کے فتنے اٹھا اٹھا کر گرج کے سکے بٹھا رہی ہے
سیاہ رو موت ظلمتوں میں مہیب پرچم اڑا رہی ہے　　وہ دیکھو کشتی بھی ڈوبنے کو بھنور کے جبڑے میں آ رہی ہے
کوئی خدا کے لئے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے؟ کہاں ہے؟

مبارک، اے دشمنو! مبارک، یہ کامرانی، یہ شادمانی　　سلام لو اے عزیز یارو! کہ اب نہیں شکلِ زندگانی!!
کہا سنا سب معاف کردو، بھلا دو باتیں نئی پرانی　　ہٹو کہ وہ جھک چلا سفینہ، اٹھو کہ آنے لگا وہ پانی!!!
کوئی خدا کے لئے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے؟ کہاں ہے؟

اس سات بند کے مخمس میں شاعر نے کتنی غلطیاں کی ہیں ؟ اس کو ملاحظہ فرمائیے -

(۱) پہلے بند کا دوسرا مصرعہ ہے :-

چھڑی ہوئی دیر سے لڑائی زبوں عناصر کے درمیاں ہے

علاوہ تعقید کے جو (چھڑی ہوئی) اور (ہے) کے درمیان سات الفاظ کے بیچ میں حائل ہو جانے سے پیدا ہوتی ہے، سب سے بڑی غلطی اس میں لفظ (زبوں) کے استعمال کی ہے ـــــ شاعر نے لفظ (زبوں) یہاں "تباہ کرنے والے" یا "نقصان رساں" کے معنے میں استعمال کیا ہے درانحالیکہ اس کے معنے "ضعیف و ناتواں اسیر و گرفتار" "بیچارہ و ضعیف" کے ہیں جو شاعر کے مفہوم کے بالکل برعکس ہیں۔ چنانچہ فارسی کا محاورہ ہے کہ "زبونِ چہار زبانی کمن" یعنی "اسیر عناصر اربع کمن" ـــــ

میرزا صائب کا شعر ہے :- ؎

خصم غالب را زبوں صبر و تحمل می کند
از تواضع سیل را مغلوب خود دل می کند

(زبوں نالی) اور (زبونی) بھی اظہار عجز کے معنی میں آتا ہے

والہ ہروی لکھتا ہے :- ؎

یا مُردی کار کُن یا ترک کُن مردانہ کار
کمتر از کار زباں باشد زبوں نالی مرا

حافظ شیراز کا شعر ہے :-

چرخ برہم زنم ار غیر مرادم گردد
من نہ آنم کہ زبونی کشم از چرخ فلک

چونکہ یہ لفظ (خراب و برہم) کے معنی میں بھی آتا ہے اور اُردو میں یہ دونوں لفظ اپنے اصلی مفہوم سے ہٹ کر (بُرے) اور (غضبناک) کے معنے میں آتے ہیں اس لئے (زبوں) کے معنی بھی (بُرے) اور (غضبناک) کے سمجھ لئے گئے درانحالیکہ فارسی میں (خراب و برہم) "خستہ حال و پریشاں" کے معنے میں آتا ہے۔ جو اصل مفہوم ہے (زبوں) کا ـــــ شاعر کو اس جگہ (عناصر) کی صفت میں کوئی ایسا لفظ لانا چاہئے تھا جو تباہ کن اور غضبناک کے معنے دیتا نہ کہ (ضعیف و بیچارہ) کے

(۲) دوسرا بند صاف ہے، لیکن تیسرے مصرعہ میں ایک لفظ بالکل بھرتی کا ہے۔ مصرعہ یہ ہے :-

غضب کے گرداب پڑ رہے ہیں عظیم طوفان زور پر ہے

اس میں لفظ عظیم بالکل بیکار وزن پورا کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ جب (زور پر ہے) کہدیا گیا تو پھر (عظیم) کا استعمال کوئی معنی نہیں رکھتا ـــــ طوفان کی عظمت اور اس کے زور میں کوئی فرق نہیں۔

(۳) تیسرا بند ہے :-

ہواؤں کی سنسناہٹیں ہیں سیاہ موجوں کے ہیں تھپیڑے　　نہ آئے دریا کو وجد کیونکر گھٹا جب ایسا رباب چھیڑے
ہر ایک گرداب میں وہ قوت کہ ڈوب جائیں ہزار بیڑے　　بلا ہیں سیلاب کے طمانچے غضب ہیں طوفان کے دڑیڑے
کوئی خدا کیلئے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے؟ کہاں ہے ؟

اسمیں ایک غلطی تو تیسرے مصرعہ میں ہے۔ یوں کہنا چاہئے تھا کہ "ہر ایک گرداب میں وہ قوت ڈبو کے رکھدے ہزار بیڑے" کیونکہ (قوت) کے بعد (کہ) بیانیہ استعمال ہوا ہے تاکہ گرداب کی قوت کا حال موثرانہ وجارحانہ ([illegible]) انداز میں بیان کیا جائے، لیکن برخلاف اسکے شاعر نے طرز ادا متاثرانہ ومنفعلانہ ([illegible]) اختیار کیا جو غلط تو نہیں لیکن خلاف فصاحت ضرور ہے۔

دوسرا مصرعہ اس بند کا بالکل بدلدینے کے قابل ہے، کیونکہ جس بند میں ہواؤں کی سنسناہٹ، موجوں کے تھپیڑوں، سیلاب کے طمانچوں اور طوفاں کے دڑیڑوں کا ذکر کیا جائے (جو واقعی نہایت ہولناک مناظر ہیں) اس میں رباب چھیڑنے اور وجد میں آنے کی گنجائش کیونکر نکل سکتی ہے ـــــ دفعۃً طوفان وسیلاب کا ذکر کرتے کرتے محفل نشاط کا تلازمہ شروع کر دینا اور "رزم" سے "بزم" میں آجانا فن بلاغت کے لحاظ سے نہایت سخت عیب ہے۔

(۴) چوتھے بند کا پہلا مصرعہ ہے :-

نہ روشنی کا کوئی منارہ نہ کوئی ساحل کا راستہ ہے

"ساحل کا راستہ" خشکی میں دیکھا جاتا ہے نہ کہ پانی میں اور پانی بھی طوفانی سمندر کا ! اس حال میں۔ "ساحل کا سراغ، ساحل کا نشان، ساحل کا پتہ" تو کہہ سکتے ہیں لیکن ساحل کا راستہ نہیں کہہ سکتے۔

تیسرے مصرعہ میں لفظ (زمین) میں اعلان (نون) نہیں ہے، لیکن پانچویں بند کے دوسرے مصرعہ میں "زمین وطوفان" دونوں میں اعلان نون موجود ہے اور (آسمان) میں نہیں ہے۔ اس کے متعلق بہرحال ایک قاعدہ مقرر ہے اور اگر اُس کی پابندی کی جائے تو یقیناً یہ اختلاف کبھی درست نہیں ہو سکتا۔

(۵) پانچویں بند کا پہلا مصرعہ ہے :-

ڈراؤنی رات غیظ میں ہے بھرے ہوئے ہیں تمام جل تھل

اس کے دوسرے ٹکڑے میں محاورہ غلط استعمال ہوا ہے۔ جل تھل بھرنا محاورہ نہیں ہے بلکہ جل تھل ہو جانا بولتے ہیں۔ یوں کہیں گے کہ دنیا جل تھل ہو گئی، نہ یہ کہ جل تھل بھر گئے

(۶) اس بند کا پہلا شعر یہ ہے:-

گھٹا کی پُر ہول گھڑگھڑاہٹ ڈلوں پہ ضربیں لگا رہی ہے
کڑک کے فتنے اٹھا اٹھا کر گرج کے سکے جما رہی ہے

اس میں تین لفظ گھڑگھڑاہٹ، کڑک اور گرج استعمال ہوئے ہیں ــــ یقیناً گرج اور کڑک میں فرق ہے لیکن گھڑگھڑاہٹ اور گرج دونوں ایک چیز ہیں، اس لئے یہ کہنا کہ گھڑگھڑاہٹ گرج کے سکے بٹھا رہی ہے، درست نہیں۔

اس بند کا چوتھا مصرعہ ہے:-

وہ دیکھو کشتی بھی ڈوبنے کو بھنور کے جبڑے میں آ رہی ہے

اس مصرعہ کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والا خود کشتی پر نہیں ہے اور کسی دوسری کشتی کے متعلق خبر دے رہا ہے۔ درانحالیکہ پورے بند سے ثابت یہ ہوتا ہے کہ کہنے والا خود کشتی میں موجود ہے۔ یہ غلط انداز بیان (وہ دیکھو) اور (آ رہی ہے) سے پیدا ہوتا ہے ــــ بجائے (آ رہی ہے) کے (جا رہی ہے) ہونا چاہئے اور (وہ دیکھو) کی جگہ (یہ دیکھو)

(۷) ساتویں بند کا چوتھا مصرعہ ہے:-

ہٹو کہ وہ جھک چلا سفینہ، اٹھو کہ آنے لگا وہ پانی

اس میں ہٹو اور اٹھو کا مخاطب کون ہے۔

بند کے پہلے تین مصرعوں میں دوستوں اور دشمنوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور اسی سلسلہ میں چوتھے مصرعہ کے اندر (ہٹو) اور (اٹھو) استعمال ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مخاطب بھی وہی ہوں گے۔ درانحالیکہ وہ کشتی کے اندر نہیں ہیں اور اُن کو ہٹنے یا اُٹھنے کا مشورہ دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ چوتھے مصرعہ کا خطاب دفعتہً بدل کر خود اہل کشتی کی طرف ہو گیا ہے تو بھی صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ہٹ کر اور اٹھ کر کہاں جائیں گے

(باقی)

کشاکش حیات پر ایک تحقیقی نظر

(۱)

یہ کہنا غالباً غیر صحیح نہ ہوگا کہ قدیم انسان کو اس خیال سے بہت کم تعلق تھا کہ وہ کتنے عرصہ تک زندہ رہے گا۔ کیونکہ اس کا وقت سب سے زیادہ صرف بقاء حیات کے جھگڑوں میں گذرتا تھا۔ اور اس کو زمانۂ حال یا زیادہ سے زیادہ اپنے مستقبل قریب کے سوا اور کسی بات پر غور کرنے کا موقعہ بہت کم ملتا تھا۔ لیکن جب انسان معازل ارتقاء طے کرتا گیا تو اس کی توجہ اپنے زمانۂ حیات کی طرف بھی ہونے لگی جیسا کہ زبور کی ایک دعا سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے :-

" خداوندا تو مجھے یہ معلوم کرنے کی توفیق دے کہ میری زندگی کے دن کتنے ہیں۔ تاکہ مجھے محسوس ہو کہ میں کس قدر بے حقیقت اور فانی چیز ہوں "

لیکن اس بات کا ثبوت بہت کم ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے دن بڑھانے کی کوئی تدبیر اختیار کی کیونکہ اوّل تو علم طب کی ترقی نہایت دھیمی رفتار کے ساتھ ہوئی جو اصل محرک اس خیال کی ہے اور دوسرے جہل عامہ نے انسانی خیال کی اس طرف رہبری نہیں کی۔ چنانچہ قدیم زمانہ کے لوگ بیماری کو موت کو جادو یا بھوت پریت کے اثر کی طرف منسوب کرتے تھے اور ہندوستان کے جہلاء اب تک یہی سمجھتے ہیں

لیکن جوں جوں انسان نے تہذیب و تمدن میں ترقی کی، اس کی توجہ اس طرف بھی زیادہ مائل ہوتی گئی اور وہ غور کرنے لگا۔ کہ موت کے اسباب کیا ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے مختلف اعضاء انسانی کے غیر فطری افعال پر بھی غور کیا، تشخیص امراض کے سلسلہ میں انھوں نے یہ بھی معلوم کیا کہ انسان کی جس حالت کو موت سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ دراصل امراض کی وجہ سے بعض اعضاء جسمانی میں تغیر پیدا ہونے کا نتیجہ ہے۔ لیکن انھوں نے لاش پر عمل جراحی کرکے کبھی یہ بات معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ جسم کے اندر وہ کیا تغیرات پیدا ہوئے۔ جنکا نتیجہ موت ہو۔ اس زمانہ میں لوگ "پوسٹ مارٹم" (لاش کی چیر پھاڑ) کے سخت خلاف تھے۔ اور جو لوگ ضرورتاً ایسا کرتے بھی تھے تو نہایت ڈرتے ہوئے۔

یوروپ میں ویسالیوس کے زمانہ تک جو لوگ علم تشریح الاعضاء سیکھتے تھے وہ بجائے اس کے کہ خود کسی لاش کو چیر پھاڑ کر اعضاء کی تشریح سیکھیں، صرف حکیم جالینوس کی کتابیں پڑھ کر علم تشریح سیکھا کرتے تھے۔ عملی طور پر اگر تعلیم ہوتی بھی تھی تو وہ صرف ادنیٰ قسم کے جانوروں کی لاشوں پر اور اس کام کے لئے خنزیر کو خاص طور پر منتخب کیا جاتا تھا۔ علم تشریح کا درس دیتے ہوئے پروفیسر جالینوس اور بوعلی سینا کی کتابیں کھول کر پڑھتا جاتا تھا اور اس کا مددگار ایک لانبی جریب ہاتھ میں لے کر لاش کے مختلف اعضاء کی طرف اشارہ کرکے بتاتا جاتا تھا ویسالیوس اس طریقہ کا ہمیشہ سخت مخالف رہا اور اکثر شکایت کیا کرتا تھا کہ اس کا اُستاد جنٹریس اپنے چاقو سے قلم تراشی کے سوائے کوئی کام نہیں لیتا۔

الغرض لاشوں کی چیر پھاڑ کرکے تشریح اعضاء معلوم کرنے کے لوگ سخت مخالف تھے۔ اور اب ماہرین طب اپنی معلومات کو مکمل کرنے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ اور یہ امر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ پوسٹ مارٹم کے سوا دنیا میں کوئی طریقہ ایسا نہیں جس سے طبی معلومات میں مزید اضافہ ہو سکے۔

چنانچہ اس سلسلہ میں اب صرف یہ مرحلہ طے کرنا باقی رہ گیا ہے کہ بیماریوں کے اسباب کے رد کرنے کا کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ تحقیقات کرنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض صورتوں میں جن اسباب کے ماتحت موت واقع ہوئی وہ ہرگز رونما نہ ہوتے اگر تقدم بالحفظ پر عمل کیا جاتا اور اسی زمانہ سے علم طب انسدادیہ (Science of preventive Medicine) کو ترقی ہونا شروع ہو گئی۔

ابھی کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ انسان نے نظریہ جراثیم اختراع کیا۔ جسے اب دنیا نے پوری طرح تسلیم کر لیا ہے۔ موسیو پاسٹیور نے علم طب میں جو شاندار کارنامہ انجام دیا اس سے بلاخوف تردید اب یہ نظریہ قائم ہو گیا ہے کہ بہت سے امراض جن کے اسباب و علل اس وقت تک پردۂ خفا میں تھے، درحقیقت بعض نہایت باریک خوردبینی جراثیم کے جسم میں داخل ہو جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور انھیں جراثیم کی وجہ سے موت واقع ہوتی ہے۔ اور اب طب انسدادیہ ترقی کرتے کرتے اسقدر کامیاب ہو گیا ہے کہ جو موذی اور متعدی امراض کچھ عرصہ پیشتر عالم انسانی میں تہلکہ ڈال دیتے تھے ان کو بڑی حد تک قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔ ان انسدادی تدابیر کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بچوں کی تعداد اموات میں کمی ہو گئی۔ اور اس طرح گویا انسان کی زندگی کے اوسط طول میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

جوں جوں حیوانات کے مدارج حیات بلند ہوتے جاتے ہیں۔ ان کی وہ قوت تجدید شباب (Rejuvenation) بھی زائل ہوتی جاتی ہے جو بعض ادنیٰ قسم کے جانداروں میں پائی جاتی ہے

یعنی جب حیوان منازل ارتقا طے کرتے کرتے انسان کے درجہ تک پہونچ جاتا ہے تو اس کی وہ قوت تجدید قطعی زائل ہو جاتی ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنا کوئی ضائع شدہ حصہ پھر پیدا کر لیا کرتا تھا۔

چنانچہ کینچوے کی قسم کے جانور (Unicellular organism) جو ارتقا جسمانی کے طبقہ ادنیٰ میں ہیں وہ اس لحاظ سے قطعی "لافانی" ہیں کہ ان کو فطری طور پر موت لاحق نہیں ہوتی۔ اگر ماحول موافق حال ہو تو فارامیسیم (paramecium.) یعنی پانی اور دیگر سیال چیزوں میں پائے جانے والے نہایت باریک خوردبینی کیڑے) کی ساڑھے آٹھ ہزار پشتیں یوں ہی گزر جاتی ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ان حیوانات کی جو نسلیں یکے بعد دیگرے ارتقائی حالت میں پیدا ہوتی ہیں ان میں کسی قسم کی ترقی نہیں ہوتی۔ الغرض جوں جوں حیوانات کی زندگی زیادہ ترقی یافتہ ہوتی جاتی ہے اور ان کے مختلف اعضاء و جوارح کے افعال مخصوص ہوتے جاتے ہیں۔ اس کی قوت تجدید بھی زائل ہوتی جاتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ بعض قسم کے رینگنے والے کیڑوں میں ایسی قوت تجدید حیات ہوتی ہے کہ اگر ان کے جسم کا $\frac{1}{25}$ حصہ بھی کاٹ دیا جائے تو وہ نشو و نما پاکر پورا کیڑا بن جائے گا۔ اور یہ نئے کیڑے پرانے کیڑے سے جس کے جسم کا ٹکڑا لیا گیا تھا زیادہ تیز ہوتے ہیں۔

اس وقت باوجود اس یقین کے کہ کسی نہ کسی دن موت کا آنا ضرور ہے، انسان اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ موت کا وقت جس قدر ملتوی ہو سکے غنیمت ہے۔

زندگی اور موت کا درمیانی وقفہ ایسا نہیں ہو چشم زدن میں طے ہو جائے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ سانس بند ہو جانے کے بعد یا ڈ گھنٹہ تک قلب کی حرکت جاری رہتی ہے۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں۔ کہ بعض اعضاء کے خلایا (cells) موت طاری ہونے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ اگر ان خلایا کو مناسب حالات اور موافق ماحول میں رکھ دیا جائے تو وہ ایک غیر معین مدت تک زندہ رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ شخص یا فرد جس کا ان خلایا سے تعلق تھا کبھی کا مر چکا ہے

تحفظ ذات اور خواہش حیات یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں جو نوع انسانی کی فطری خصوصیت سمجھی جاتی ہیں۔ اور زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے کی خواہش کیساتھ یہ تمنا بھی پیدا ہوتی ہے کہ زندگی اچھی طرح بسر ہو۔ کیونکہ اگر انسان کی قوت فکر، اور قوت احساس زائل ہو جائے تو اس کے لئے زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے کی خواہش بیکار ہے۔ ایسا شخص۔ . . . ایک ایکٹر ہے۔ جو اپنا پارٹ ختم ہو جانے کے بعد بھی اسٹیج پر فضول کھڑا ہے۔ جب انسان کی ذہنی سرگرمیاں زائل ہو جائیں۔ اس وقت طول حیات کی آرزو قطعی ہیچ ہے۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہیئے کہ زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کی جسمانی و دماغی صحت بھی کسی قدر بحال رہے۔

تطویل حیات کی جسقدر فکر انسان کو اس زمانہ میں دامنگیر ہوئی ہے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی - اور جسقدر اس مسئلہ پر انسان کا دماغ آجکل غور کر رہا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں کیا۔ اب اس پر مختلف پہلوؤں سے غور کیا جا رہا ہے اور ایسے ایسے لوگ غور کر رہے ہیں جن کے نقطہ ہائے نظر قطعی مختلف ہیں، قومی اور بین الاقوامی جماعتیں بھی اس مدعا کے حصول کے لئے سرگرم ہیں اور حکومتوں کو بھی یہ فکر لاحق ہے کہ اس کی رعایا کیونکر طول حیات حاصل کر سکے متعدی امراض کے انسداد میں محکمہ صحت عامہ کے کارکن ہر وقت مصروف عمل رہتے ہیں۔ اور انسداد امراض کی غرض سے سختی کے ساتھ قرنطینے قایم کئے جا رہے ہیں۔

مختلف جماعتوں نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ اپنی قوم کے شہریوں کی صحت کا تحفظ کیا جائے۔ اور کوئی سیاسی جماعت اس وقت تک برسر اقتدار نہیں رہ سکتی۔ جب تک وہ اپنے شہریوں کے لئے عمدہ پانی کی بہم رسانی، صفائی کی مناسب تدابیر، قواعد حفظان صحت کے مطابق سامان خورونوش کی فراہمی اور متعدی امراض کے انسداد کی تدابیر عمل میں لانے کا فرض اپنے ذمہ نہ لے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انسان زمانۂ قدیم میں زیادہ عرصہ تک زندہ رہتا تھا۔ اور اب اس کی عمر گھٹ گئی ہے۔ اور اس کا ثبوت وہ بائبل سے دیتا ہے۔ حالانکہ اس سلسلہ میں اوّل تو یہی بات قابل تشریح ہے۔ کہ بائبل میں جو لفظ "سال" استعمال کیا گیا ہے وہ دراصل انہی معنی میں ہے جس سے ہم لوگ آشنا ہیں یا کسی اور معنی میں۔ اس میں شک نہیں کہ موسیٰ اور یعقوبؑ کی عمریں اپنے زمانہ کی اوسط عمروں سے زیادہ طویل ہوئیں۔ ——— لیکن قدیم مصریوں کے مقابر سے جو پُرانی تحریریں برآمد ہوئی ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب سے دو ہزار برس پیشتر انسان کی عمر طبعی تیس برس تصور کی جاتی تھی۔ بچوں اور کمسن لڑکوں میں شرح اموات اب سے کہیں زیادہ تھی۔ البتہ رومیوں میں انسان کی عمر طبعی کسی قدر زیادہ سمجھی جاتی تھی۔ مشہور ہے کہ انھیں ڈاکٹروں سے سخت نفرت تھی اور جب یونانی اطبا نے رومتہ الکبریٰ میں آباد ہونا شروع کیا تو رومیوں نے ان کی طرف بہت کم توجہ کی۔ مؤرخ پلائنی (Pleiny) نے اس بارہ میں لکھا ہے کہ :- "طبابت کا پیشہ اختیار کرنا اہل رومہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ اور جو معدودے چند طب پڑھتے تھے۔ وہ درحقیقت یونانی ہوگئے تھے۔"

انسان کی عمر طبعی کے متعلق سب سے پہلا نقشہ مشہور ماہر فلکیات ہیلی (Halley.) نے تیار کیا تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس کے نام سے ایک دُمدار ستارہ مشہور ہے۔ ہیلی نے اپنے مرتب کردہ نقشہ میں دکھایا تھا کہ شہر برسلا (واقع جرمنی) میں ۱۶۹۱ء میں انسان کی عمر طبعی پیدائش کے وقت ۳۳ برس شمار کی

جاتی تھی۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں انگلستان کے اندر انسان کی عمر طبعی ۳۹ برس سمجھی جاتی تھی، لیکن جب سے تمام مہذب و متمدن دنیا میں حفظان صحت کے متعلق عظیم بیداری پیدا ہوئی۔ اس وقت سے انسان کی عمر طبعی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے کی خواہش کا نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ انسان نے تطویل حیات کی تدابیر معلوم کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ موت کا ایک دن آنا لازمی ہے۔ لیکن انسان کی خواہش یہی ہے کہ موت کا دن جب تک ملتوی رہے اسی قدر اچھا ہے۔ اور اس میں اس کی کوششیں صرف علمی یا سائنٹفک تدابیر تک ہی محدود نہیں رہیں۔ بلکہ وقتاً فوقتاً اس کام کے لئے انسان نے نہایت عجیب و غریب بلکہ مضحکہ انگیز تدابیر اختیار کی ہیں۔

دنیا کے مختلف ملکوں میں بڑے بڑے حوصلہ مند اور بہادر لوگ " امرت " کی تلاش میں سرگرداں پھرے آبحیات کی تلاش میں سکندر اعظم نے طبقۂ ظلمات کی خاک چھانی۔ یورپ میں پونس ڈیلین چشمۂ حیات کی تلاش میں مارا مارا پھرا۔ الغرض انسان کی خواہش ہر زمانہ میں یہی رہی۔ کہ بیماری، انحطاط، اور موت سے محفوظ رہے۔

ہمارے ہی زمانہ میں انحطاط سے بچنے کے سیکڑوں عجیب و غریب نسخے ایجاد ہوتے ہیں۔ سیکڑوں ترکیبیں قیام صحت اور استقرار شباب کی بیان کی جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ غذا پر زور دیا جاتا ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ تطویل حیات کا راز خالص نباتاتی غذا میں مضمر ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ فلاں چیز کھائی جائے تو صحت اور زندگی بحال رہتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کھٹی دودھ کا استعمال آبحیات کا کام دیتا ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ کہ ایسی چیزیں کھائی جائیں جن میں کسی قدر نشۂ بھی ہو۔ اور کوئی کہتا ہے کہ زندگی چاہو تو نشہ آور چیزوں کے پاس نہ جاؤ۔ لیکن لطف یہ ہے کہ جس قدر کسی غیر معمولی چیز کی سفارش کی جاتی ہے اسی قدر لوگ اس کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ غذا کا تعلق تطویل حیات اور قیام صحت سے بہت زیادہ ہے۔ اور اسی سلسلہ میں بہت سے سائنسدانوں نے بعض خاص غذاؤں کی سفارش بھی کی ہے یہ بھی درست ہے کہ بعض کے فقدان کا نتیجہ بیماری ہوتا ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بعض خاص قسم کی چیزوں کا کھانا خاص خاص بیماریاں پیدا کرتا ہے ایک جدید نظریہ قائم ہوا ہے کہ زیادہ تر وہ اغذیہ استعمال کی جائیں جن میں "وٹامین" (Vitamins جوہر حیات) زیادہ ہوں۔

حکیم پلوٹارک نے جو قواعد و ضوابط صحت کے متعلق قائم کئے ہیں ان میں زیادہ غذا پر بحث کی گئی ہے اور اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ انسان کو اپنی صحت قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ سادہ غذا استعمال کرنا چاہئے۔

صحت کے سلسلہ میں دوسری چیز جس پر زیادہ زور دیا گیا ہے وہ "ورزش" ہے یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ اگر عضلات جسم کی حالت درست رکھنا منظور ہو تو ورزش ضرور کی جائے۔ اگر روزمرہ کھلی ہوا میں اعتدال کے ساتھ تھوڑی سی ورزش کرلی جایا کرے تو اس سے انسان کی صحت جسمانی درست رہتی ہے۔ تمدّن کی ترقی کے ساتھ ساتھ ورزش جسمانی کی بھی ضرورت بڑھتی جاتی ہے۔ زمانہ قبل از تاریخ کے انسان کی تو یہ حالت تھی کہ وہ خوراک کی تلاش میں سرگرداں پھرتا تھا۔ اور اس طرح اس کی ورزش کافی ہو جاتی تھی۔ علاوہ ازیں اس کے لئے یہ بھی لازمی تھا کہ خود کو جنگل کے درندوں یا دشمن قبائل کی تاخت و تاراج سے محفوظ رکھنے کے لئے مضبوط رکھے۔ اور اس لئے اسے لازمی طور پر ورزش کرنا پڑتی تھی۔ پھر چونکہ قدیم انسان کے پاس اپنی ٹانگوں کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نقل و حمل نہیں تھا۔ اس لئے وہ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام رقبہ پیادہ پا طے کیا کرتا تھا۔ نہ کوئی راستہ تھا نہ سڑک نہ دریاؤں پر کوئی پل تھا۔ گرمی اور سردی، بارش اور برف سے اس کی جان عذاب میں رہتی تھی۔ اور ہمسایہ کے دشمن قبائل جو قتل و غارت کرتے تھے وہ علیحدہ۔ جو لوگ جسمانی لحاظ سے کمزور یا ناکارہ ہوتے تھے وہ ایسی زندگی کی سختیوں کو ہرگز برداشت نہ کرسکتے تھے۔ اس لئے وہ طے مراحل اور قطع منازل کرتے کرتے یا تو راستہ پر خود ہی گر پڑتے تھے یا ان کے ساتھی ان کو چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ الغرض اس وقت صرف وہی لوگ زندہ رہ سکتے تھے جن کے ہاتھ پاؤں طاقتور اور دل مضبوط ہوں۔ اس زمانہ میں نہ کوئی اسپتال تھا۔ نہ کوئی خیراتی شفاخانہ یا محتاج خانہ۔ نکموں اور بیماروں کے لئے کوئی جائے پناہ تھی۔ الغرض جسقدر . . . . بقائے زندگی کے لئے سامان خورد نوش کا ہونا لازمی ہے اسی طرح سے انسان کے لئے ورزش جسمانی بھی ناگزیر چیز ہے۔ موجودہ تمدن نے زندگی کی راہ میں بہت کچھ سہولتیں پیدا کردی ہیں۔ انسان بغیر تکلیف اٹھائے ایک جگہ سے دوسری جگہ چلا جاسکتا ہے۔ محنت سے بچنے کے صدہا طریقے ایجاد ہوگئے ہیں کہیں بجلی ہے کہیں ٹیلیفون۔ کہیں تلغراف ہے۔ کہیں موٹرکار اور کہیں لاسلکی۔ جن کے ذریعہ سے معمولی آمدنی کا آدمی بھی اپنی زندگی بآرام بسر کرسکتا ہے۔

الغرض فی زمانہ انسان پر کوئی ایسی محنت نہیں پڑتی جس سے اس کی ورزش جسمانی پوری ہوسکے۔ اس لئے سخت ضرورت ہے کہ انسان کو ورزش جسمانی کی ترغیب دی جائے۔ تطویل حیات کے لئے آج کل بیمہ کمپنیاں اسی اصول پر عمل کررہی ہیں۔

جو لوگ اعضا، و جوارح کے افعال و فرائض سے واقف ہیں کہ انسان کے جسم میں اگر بعض خاص غدود نشوونما پا جائیں تو صحت پر بہت مفید اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل خاص قسم کے غدودوں کے بارہ میں بہت محنت سے تفتیش کی جارہی ہے۔ اور تجربوں سے دکھلایا جارہا ہے کہ اگر انسان کے جسم میں بعض

خاص غدود داخل کردیے جائیں تو ان کے ذریعہ سے انسان کی عمر بڑھ جاتی ہے ——

کچھ عرصہ سے اس امر پر بھی بہت کچھ غور و خوض کیا جا رہا ہے کہ کسی بیماری کا تعلق والدین یا آباؤ اجداد سے کیا ہے۔ اور اگرچہ ابھی اس قسم کی تحقیق و تدقیق کی ابتدا ہے۔ لیکن یہ امر روز بروز واضح ہوتا جاتا ہے۔ کہ انسان کے طول عمر پر جسقدر اثر اس کے آباؤ اجداد یا والدین کی صحت اور طاقت کا پڑتا ہے اسقدر کسی اور چیز کا نہیں پڑتا۔ اور یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ طویل العمر اسلاف کے اخلاف بھی طویل العمر ہوتے ہیں۔ اور کوتاہ عمر والدین کے بچے بھی عموماً کوتاہ عمر کے ہوتے ہیں۔

یہ امر مسلم ہے کہ ہر فرد بشر جو دنیا میں پیدا ہوتا ہے اس کو قدرت کی طرف سے خاص نوعیت کے خلایا خاص مقدار میں عطا ہوتے ہیں۔ بعض صورتوں میں یہ نوعیت ادنیٰ اور بعض صورتوں میں اعلیٰ ہوتی ہیں۔ آجکل زیادہ تر اموات عوارض قلب یا شرائین کی وجہ سے واقع ہوتی ہیں اور عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو والدین مرض صرع میں مبتلا ہوتے ہیں ان کے بچوں کے جسم کی رگیں بھی ادنیٰ قسم کی ہوتی ہیں۔

جن لوگوں کی نسبت یہ معلوم ہو چکا ہے کہ انھوں نے اوسط سے زیادہ عمر طبعی پائی ہے ان کی زندگیوں پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنا غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ لوگوں کے سوانح حیات کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند تعالے نے تطویل حیات کا کام جس دیوتا کے سپرد کیا ہے۔ اس کی نظر انتخاب بھی کچھ عجیب وغریب واقع ہوئی ہے۔ جب ہم ان "جوانان صد سالہ" کی سوانحعمریوں کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ تو ان کی ولادت اور ابتدائی زندگی کے حالات نہایت مبہم نظر آتے ہیں۔

جب ہم ان لوگوں سے ان کی تطویل زندگی کا راز دریافت کرتے ہیں تو ان کے جوابات اکثر مبہم مغالطہ انگیز بلکہ متضاد و متباین ہوتے ہیں۔ ایک پیر صد سالہ بیان کرتا ہے کہ اس کے طول حیات کا راز یہ ہے کہ اسنے نہ کبھی تمباکو نوشی کی نہ کبھی مسکرات کا استعمال کیا۔ دوسرا کہتا ہے کہ اس کی طویل زندگی تمباکو کے استعمال اور اعتدال کے ساتھ شراب خواری کی رہین منت ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ وہ عمر بھر برابر گوشت کھاتا رہا۔ دوسرا کہتا ہے کہ اس نے کبھی گوشت کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ایک شخص کہتا ہے کہ وہ ہمیشہ برابر روزمرہ ورزش کرتا رہا اور دوسرا کہتا ہے کہ اس نے کبھی اتنی بھی محنت نہیں کی کہ بازار ہی جا کر کوئی چیز خرید لایا ہو۔

ان پیران صد سالہ کی دماغی حالت بھی مختلف دیکھی گئی ہے۔ ایک شخص کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ نہایت سنجیدہ اور متین ہے اس کا حافظہ بھی اچھا ہے اور طبیعت میں بھی سکون ہے۔ دوسرے شخص کو دیکھتے ہیں کہ وہ حد درجہ کا سریع الحس ہے ذرا سی بات پر غضبناک ہو جاتا ہے اور ادنیٰ سی بات پر اس کے جذبات

منتقل ہو جاتے ہیں۔ امریکہ کے پریزیڈنٹ جان ایڈمیس (John Adams) نے اکیانوے سال کی عمر پائی تھی۔ مگر وہ اسقدر سریع الغضب تھا کہ ذرا ذرا سی بات میں آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔

اکثر حضرات اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ انسان کی دماغی و ذہنی حالت کا اس کی صحت جسمانی پر بعید اثر پڑتا ہے۔ ہمیں اس نظریہ پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن ہنوز یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچی کہ انسان کی ذہنی قوتیں اس قسم کو کسی بیماری سے محفوظ رکھ سکتی ہیں یا اس کے قویٰ کے انحطاط کو روک سکتی ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ "ہم نے کوئی فلاسفر ایسا نہیں دیکھا جو دانت کے درد سے رو نہ دیا ہو"

بہرحال تطویل حیات اور اس بات کی کوششوں کا سلسلہ ابھی جاری ہے کہ قوائے انسانی کے قدرتی انحطاط کو روکا جائے۔ تاکہ عمرِ انسانی میں اضافہ ہو سکے۔

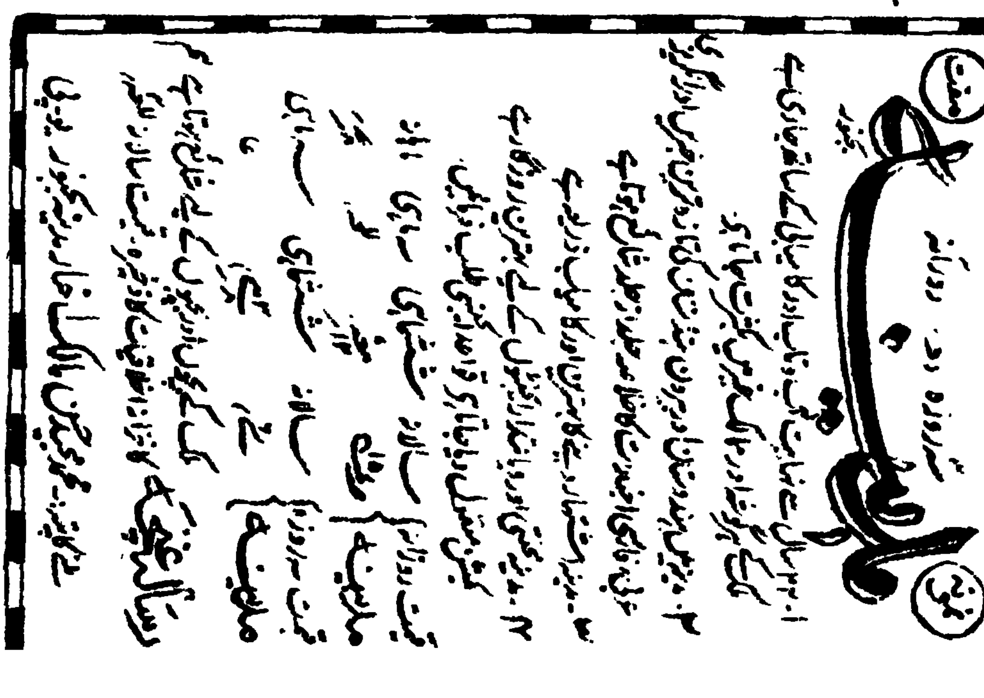
اس مختصر بحث کے بعد جب ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کیا امور ہیں جن کا انسان کی عمر پر اثر پڑتا ہے تو سب سے پہلی بات یہ نظر آتی ہے کہ والدین کے قویٰ اور ان کی صحت کو عمدہ ہونا چاہیئے تاکہ بچہ کے خلایا بھی اچھے ہوں طویل العمر اسلاف کے اخلاف عموماً طویل العمر ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب اس طرح بچہ کو عمدہ قویٰ حاصل ہو جائیں تو آیندہ زندگی میں اس کو ان قدرتی وسائل سے باحتیاط کام لینا سکھایا جائے۔ آپ کے پاس قلب و جگر اور دیگر اعضائے رئیسہ کی عمدہ قوتوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ اب یہ آپ کا کام ہے۔ کہ خواہ ان طاقتوں کو یک لخت صرف کر دیں یا کفایت شعاری کے ساتھ کام لیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ حفظانِ صحت کے اصول پر عمل کرکے اپنے ان خداداد قویٰ میں اضافہ کیا جائے۔ کام کاج، کھیل کود، سونے بیٹھنے کے متعلق کوئی ضابطہ مقرر کیا جانا تو محال ہے۔ کیونکہ ہر شخص کو اپنے ماحول اور حالات کردہ پیشہ کے مطابق کام کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ باتیں ہر شخص کے لئے مختلف ہوتی ہیں۔ جو چیز ایک شخص کو موافق ہوتی ہے وہی چیز دوسرے شخص کو مضر پڑتی ہے۔ اس لئے تمام آدمیوں کے لئے کوئی خاص ضابطہ مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ چوتھی بات یہ ہے کہ جو شخص اپنی عمر زیادہ کرنا چاہے وہ ہر بات میں اعتدال مدِ نظر رکھے۔ اور نشہ کی چیزوں سے حتی الامکان محترز رہے۔

علم طب اسقدر ترقی کر چکا ہے کہ ہر شخص کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ جو امراض ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتے ہیں ان سے کس طرح محفوظ رہنا چاہیئے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ایک سمجھدار شخص اپنے بچوں کو چیچک، تپ محرقہ، یا سرخ بخار وغیرہ میں مبتلا ہونے سے محفوظ نہ رکھ سکے۔

تاریخی زمانہ میں علم الاغذیہ کو کبھی اسقدر ترقی نصیب نہ ہوئی تھی جسقدر کہ اس زمانہ میں ہو چکی ہے۔ اس لئے ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ واقفیت رکھے۔

اب معاملہ رہ گیا خصوصیات خاندانی کا سو ارتقار حیات کے ابتدائی مدارج میں تو انسان اصول انتخاب فطرت کے زیر اثر کام کرتا تھا۔ لیکن مہذب اور متمدن ہونے کے بعد وہ اس منزل سے بہت دور نکل گیا ہے۔ اب ہر ملک کے شعبۂ صحت عامہ کے فرائض اس سے بھی متجاوز ہو چکے ہیں کہ امراض متعدی کا انسداد کیا جائے کیونکہ انسان بے قوتی خواہ کمزور ہوں یا طاقتور گروہ ہر طرف حفاظتی قوانین کے ذریعہ سے محفوظ ہے۔ اور اب ہر ملک کا خزانۂ عامرہ اور اس کی خیراتی انجمنیں لکھوکھا روپیہ صرف کرکے ان لوگوں کی جانیں بچاتی ہیں جو قدیم زمانہ میں نذر اجل ہو جاتے تھے۔ یہ تو نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے ضعیف القویٰ لوگوں کا استیصال کر دیا جائے۔ لیکن یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد دنیا میں زیادہ نہ بڑھے۔

اگرچہ فی زمانناعرصہ تک زندہ رہنے کی خواہش بہت بڑھ گئی ہے۔ لیکن علم کی ترقی کے ساتھ باخبر لوگوں کے دلوں سے موت کا خوف بھی زائل ہو گیا ہے۔ اور جوں جوں انسان اپنی فطری موت کے قریب پہونچتا جاتا ہے اتنی ہی موت اس کو کم بھیانک معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور انسان دنیا میں اپنا کام ختم کرنیکے بعد مطمئن.... دل کے ساتھ با مردانہ قدم رکھتا ہوا اس عالم کی طرف روانہ ہو جاتا ہے جہاں کا حال آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا



بابُ المناظرۃ والمراسلۃ

(جناب مولوی عبدالمالک صاحب آروی)

مارچ کے رسالہ میں آپ نے میرے خط کے جواب میں جو بحث کی ہے، میں نے پڑھی، آپ حدیث معراج کو موضوع قرار دیتے ہیں، اس لئے کہ اگر اس کو صحیح تسلیم کیا جاتا ہے: تو (معاذ اللہ) ذات رسول اللہ مورد الزام ہوتی ہے، کیونکہ ڈاکٹر ٹسڈل کی روایت کے مطابق "ارتا دراف نامک" اور " اندرالوک گیمنم" وغیرہ میں بھی معراج اسلامی کے مثل واقعات پائے جاتے ہیں، آپ اس صورت میں بحث کی دو صورتیں قرار دیتے ہیں یا تو معراج نبوی کے واقعہ سے جو احادیث میں مذکور ہے یکسر انکار کر دیا جائے یا پھر ارجن اور زردشت کی معراج پر بھی ایمان لایا جائے۔

میرا علمی عقیدہ ہے، کہ دنیا کی ساری تاریخ میں احادیث سب سے زیادہ صحیح اور معتبر ہیں کیونکہ روایات کی تنقید و تصحیح کے سلسلہ میں احادیث کے لئے جو انتظام کیا گیا۔ اس کی نظیر دنیا کی کسی قومی یا ملی تاریخ میں نہیں ملتی، لہٰذا بہ حیثیت ایک جویائے حق میرا ایمان ہے، کہ معراج کی حدیث صحیح ہے اور خود آں حضرت سے مروی ہے، اسی لئے ڈاکٹر ٹسڈل کے ہفوات کا ترجمہ پیش کر کے میں نے تنقید میں یہی ثابت کیا کہ ڈاکٹر صاحب جو محض ظن و قیاس کی بنا پر اس کا اظہار کر رہے ہیں کہ روایت معراج مسلمانوں نے اپنے پیغمبر کی عظمت و جلال قایم کرنے کیلئے مجوسیت اور برہمنیت کے نمونہ پر گڑھ لی ہے، صحیح نہیں، چونکہ معراج کی حدیث میرے نزدیک مستند ہے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کی قیاس آرائی کی تردید کر دی گئی، اور بتا یا گیا کہ معراج کی حدیث خود آں حضرتؐ سے مروی ہے۔ آپ فرماتے ہیں اس صورت میں خود آں حضرتؐ پر اعتراض وارد ہوتا ہے، کہ انھوں نے "ارتا دراف نامک" کی داستان کے مثل اپنی معراج کا واقعہ وضع کر لیا، چونکہ تاریخ اس کی شاہد ہے، کہ آں حضرتؐ پہلوی زبان سے واقف نہ تھے، اس لئے آپ ایک غیر مسلم معترض

کی طرف سے یہ قیاس پیش کرتے ہیں کہ آں حضرت کے زمانہ میں ایک ایسا "عجمی" موجود تھا جس کی طرف لوگوں کا گمان تھا، کہ وہ آپ کو سکھاتا ہے، اس سلسلہ میں آپ نے سورۂ نحل کی یہ آیت درج کی ہے،

یقولون انما یعلمہ بشر ، لسان الذی یلحدون لوگ کہتے ہیں آپ کو کوئی آدمی سکھا جاتا ہے، اس شخص
الیہ اعجمی وھذا لسان عربی مبین - کی زبان جس کی طرف منسوب کرتے ہیں عجمی ہے، اور یہ صاف عربی زبان ہے

اس میں شک نہیں بعض مفسرین نے جن میں زمخشری اور بیضاوی بھی ہیں اس " اعجمی " سے سلمان فارسیؓ کی ذات مراد لی ہے، لیکن ایک مفسر قرآن کے لئے محقق تاریخ بھی ہونا ضروری نہیں اس لئے ہمارے مفسرین نے اس باب میں تاریخی غلطی کی، تعجب تو یہ ہے کہ آپ نے بھی اس سے استدلال کرلیا اور آپ کا بھی گمان غالب یہ ہے کہ اس "عجمی" سے حضرت سلمان فارسیؓ مراد ہیں، حالانکہ اصحاب سیر و تاریخ سے یہ پوشیدہ نہیں، کہ حضرت سلمان فارسیؓ مدینہ میں ایمان لائے، یہیں پہلی مرتبہ آپ کو سرورِ کائنات کا دیدار میسر ہوا، اور یہیں بنی قریظہ کے ایک یہودی سے مسلمانوں نے آپ کو آزاد کرایا، خود آں حضرتؐ نے اپنے دست مبارک سے تین سو درخت لگائے اور حضرت سلمانؓ کی آزادی کے معاوضہ میں اس یہودی کو دیا، اس " اعجمی " سے ایک رومی غلام مراد ہے، جو نصرانیت کا پیرو تھا، صاحب موضح القرآن کی یہی رائے ہے، جارج سیل نے جتنے اسمار گنائے ہیں ان میں جبر (عمرو بن الحضرمی کے یونانی غلام) عابش، قیس، یاسر وغیرہ ہیں اور یہ تمام حضرات نہ تو ایرانی تھے، اور نہ مجوسی مذہب کے پیرو، حضرت سلمان فارسی کا نام بھی سیل نے حاشیہ پر لکھا ہے، لیکن اس کو زمخشری کی رائے سے غلط فہمی ہوگئی، سورۂ نحل مکی ہے، اور سلمان فارسیؓ مدینہ میں آئے. اس لئے آپ کا یہ قیاس کہ آں حضرت کو ان کی وساطت سے اردادراف نامک کی روایت پہونچ سکتی تھی، رد ہوجاتا ہے، حیرت ہے کہ آپ نے محض ظن و قیاس سے کام لے کر یہ تو لکھ دیا کہ سلمان فارسی کے ذریعہ ارداد راف نامک کی روایت آں حضرت تک پہونچ سکتی تھی، لیکن اس پر غور نہ فرمایا کہ اس کے مقابلہ میں نضر بن حارث جیسا ماہر ادبیات ایران موجود تھا، اور اس لئے عربوں کو اس سے آگاہ نہ کیا در آنحالیکہ وہ فارس کے سلاطین کا تذکرہ کرکے قرآن مجید کو " اساطیر الاولین " کہا کرتا تھا، اور اپنے پندار میں سرورِ کائنات کو حریف قرار دیکر خود کو خرافیات قدیمہ کا زیادہ ماہر بتاتا تھا، اب آپ کا یہ لکھنا کہ اسلامی مورخوں نے اس واقعہ کو حذف کردیا ہوگا، کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے، کیا مورخین اسلام " غیب بیں " تھے کہ انھوں نے ہونے والے مناظروں کا حال کئی صدیاں قبل معلوم کرلئے، اگر اسلامی علما اور مورخین اسی پیش بینی اور احتیاط تحریری سے کام لیتے تو تاریخ اسلام میں وہ بے شمار واقعات درج نہ ہوتے جن کا غلط مفہوم پیدا کرکے آج محققین منہ کی کھاتے ہیں، اگر ڈاکٹر تسڈل کے ہفوات، اور خرافات پریشان پر ایمان لانا ضروری ہے تو زیادہ

سے زیادہ زردشت اور ارجن کی معراج کے واقعات کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے، اس کے جواب میں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ قرآن مجید نے تمام قوموں کے ہادیوں اور انبیا کے وجود کو تسلیم کیا ہے، لکل قوم ھاد اس لئے اگر پہلوی اور سنسکرت زبانوں میں معراج کے واقعات ملتے ہیں تو انکار کی کوئی وجہ نہیں قیاس کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ پہلوی اور سنسکرت چونکہ "اندو جرمانیہ" (Indo Germania) لغات کی شاخیں ہیں اس لئے بہت ممکن ہے، دونوں ایک ہی ماخذ کی بگڑی ہوئی صورتیں ہوں اور آریہ قوم کے کسی نبی کو واقعۃً معراج ہوئی ہو، زردشت، اور ارجن کے حالات وسوانح میں چونکہ خرافیات کا غالب اثر ہے، اس لئے معراج کی روایت کے متعلق کسی ذات کی تعیین نہ ضروری ہے، اور نہ ممکن، ہم یہ ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ جس طرح سامی قوموں کے مسیحؑ، ایلیا، اور محمدؐ کو معراج ہوسکتی ہے، اسی طرح آریہ اقوام کے انبیا و رسل کو بھی معراج ہوسکتی تھی، یہ اور بات ہے، کہ ہم تحقیق و استقرائی بنا پر کسی ذات کی تعیین سے انکار کردیں

(نگار) ہرچند بار بار ایک ہی مسئلہ پر رد و قدح کوئی دلچسپ مشغلہ نہیں، لیکن چونکہ آپ کو میرے بیان کی طرف سے تھوڑی سی غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے اس لئے اس کو دور کرنا ضرور ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ میں سورہ نحل کے "اعجمی" سے حضرت سلمان فارسی کی ذات مراد لیتا ہوں۔ حیران ہوں کہ آپ نے میرے کس فقرہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا۔ میں نے مارچ کے رسالہ میں آپ کے مراسلہ کا جواب دیتے ہوئے کسی جگہ اشارتاً بھی ظاہر نہیں کیا کہ میرے نزدیک اعجمی سے مراد سلمان فارسی ہیں بلکہ فٹ نوٹ میں صراحتاً یہ درج کردیا تھا کہ "یہ بحث غالباً دور از کار ہوگی کہ وہ شخص کون تھا۔ اس باب میں مفسرین کا اختلاف ہے، بعض جبر۔ یاسر۔ قیس۔ وغیرہ کا نام لیتے ہیں اور بعض نے سلمان فارسی کا نام لیا ہے"

۱۔ معترض تو سورۂ نحل کی آیت پیش کرکے صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ کوئی اعجمی ضرور تھا جس کے متعلق لوگ کہا کرتے تھے کہ آں حضرت کو سکھاتا رہتا ہے۔ اب رہا یہ امر کہ وہ کون تھا اور کون نہیں خارج از بحث ہے۔ اور نہ معترض سے یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ وہ اعجمی کون تھا۔ یہ آپ کا کام ہے کہ اس کی تعیین کیجئے یا نہ کیجئے

۲۔ غنیمت ہے کہ آپ معراج نبوی کی حدیث کو صحیح تسلیم کرنے کی ضد میں اس حد تک تو آگئے کہ زردشت و ارجن کی معراج کو بھی ممکن سمجھنے لگے ــــ محبت کی یہی وہ منزل ہے۔ جس کا ذکر کسی شاعر نے ان

الفاظ میں کیا ہے ؎

اس حال کو پہونچے ترے قصّہ سے کہ اب ہم
راضی ہیں گر اعدا بھی کریں فیصلہ اپنا

لیکن اتنی خامی ہنوز آپ میں باقی ہے کہ کسی جگہ "خرافیات" کا اثر غالب آپ کو نظر آتا ہے، کہیں "تحقیق و استقراء" کی بناء پر آپ کو "تعیین ذات" میں تامل ہوتا ہے۔ لیکن خود اپنے معاملہ میں نہ کہیں "خرافیات" کا شائبہ نظر آتا ہے نہ "تحقیق و استقراء" آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ حالانکہ جو نقطۂ نظر آپ دیگر مذاہب کی تحقیق کیلئے قائم کرتے ہیں بالکل وہی دوسرے مذہب والوں کا آپ کے مذہب کے باب میں ہوتا ہے اور جس طرح آپ اپنے کو دلائل و براہین کی بناء پر سچا سمجھتے ہیں بالکل اسی طرح وہ بھی اپنے آپ کو "برحق" یقین کرتا ہے ——— اس لئے بے لاگ تنقید کا اقتضاء تو یہی ہے کہ سب سے علیحدہ ہو کر شخص ثالث کی حیثیت سے غور کیا جائے اور یہی وہ چیز ہے جس کا ہمیشہ فقدان رہا ہے اور رہے گا، جب تک آزادانہ رائے قائم کرنے کی صلاحیت شروع ہی سے نہ پیدا کی جائے۔

کسی خاص ماحول میں پیدا ہونے اور مخصوص عقائد کی باتیں گہوارہ ہی سے کان میں پڑنے کا بڑا اثر ہوا کرتا ہے اور یہ نقوش دماغ میں اتنے گہرے مرتسم ہو جاتے ہیں کہ انسان سن شعور کو پہونچنے کے بعد بھی ان کے اثرات کو نہیں مٹا سکتا۔ اور یہی وہ اثر ہے جو با اینہمہ روشن خیالی و علم و فضل آپ کو اپنی جگہ سے ہٹنے نہیں دیتا ——— ورنہ حیرت ہے کہ آپ اور مجموعۂ احادیث کو دنیا کی سب سے زیادہ صحیح و معتبر تاریخ قرار دیں، جن میں رسول اللہ کی شان نبوت کے خلاف ایک دو نہیں سیکڑوں واقعات نظر آتے ہیں۔

بہر حال ڈاکٹر ٹسڈل نے تو صرف بربنائے روایت واقعۂ معراج پر بحث کی تھی کہ آخر کار مجبوراً آپ کو زردشت و ارجن کی معراج بھی دبی زبان سے تسلیم کرنا پڑی، لیکن حیران ہوں کہ آپ کیا کریں گے۔ جب از روئے عقل و درایت بحث کرنے کے بعد ..... زردشت کی معراج اور ارجن کی سیاحت آسمانی دونوں لغو و غلط قرار پائیں گے۔ کیا آپ اس صورت میں بھی ان دونوں کی تکذیب پر تو آمادہ ہو جائیں گے۔ اور خود اپنے یہاں کے واقعۂ معراج کو قرین عقل قرار دینے میں بدستور زور آزمائی کرتے رہیں گے۔

میرے عزیز و مکرم دوست، نہ مذہب بری چیز ہے اور نہ اس کے مقاصد برے۔ لیکن اگر

مذہب عقل و ہوش چھین لینے والا ثابت ہو تو خود ہی فیصلہ فرمائیے کہ اس کی حمایت کون کرسکتا ہے ۔ مذہب ذریعہ ہے تزکیۂ اخلاق کا اور اخلاق کی درستی عقلی ضرورت ہے ۔ اس لئے اصولاً مذہب کو بھی عقلی ضرورت ماننا پڑے گا ۔ یہ کیا تماشہ ہے کہ جس چیز کے وجود کو ہم از روئے عقل ضروری سمجھیں اسی پر غور کرنے کے لئے ہم عقل سے کام نہ لیں ——— اسی لئے میں مذہب کے تمام اصول و معتقدات کو پہلے درایت و فراست کی کسوٹی پر کس کر دیکھتا ہوں ، اگر وہ اس طرح کامل العیار نکل آئے تو پھر روایتوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں ، ورنہ ان پر نگاہ بھی نہیں ڈالتا ۔

پھر سچ بتائیے کیا واقعات معراج پر آپ نے درایتاً کبھی نظر ڈالی ہے اور کیا رسول اللہ کا براق پر سوار ہو کر درجہ بدرجہ آسمانوں پر چڑھنا اور ملائکہ و انبیاء سے وہ تمام باتیں کرنا جن کا تفصیلی ذکر حدیث میں موجود ہے ۔ آپ بالکل صحیح باور کرتے ہیں ——— اگر آپ کے نزدیک اس میں کوئی استحالۂ عقلی نہیں ہے ۔ اور اس کو حقیقتاً بالکل واقعہ سمجھتے ہیں ، تو مجھے ایک آہ بھر کر خاموش رہ جانے کے علاوہ کچھ نہیں کہنا ، لیکن اگر آپ کا ضمیر واقعات معراج کو تمثیلی یا روحانی حیثیت سے زیادہ کوئی جگہ نہیں دیتا تو پھر آپ اس حدیث کی صحت پر کیوں اصرار کرتے ہیں جو رسول اللہ کے "معراج جسمانی" کو بالکل ارجن اور زردشت کی سیر آسمانی کی طرح پیش کر رہی ہے ، اور کیوں نہیں آپ لسٹڈل کے ہمزبان ہو کر رسول اللہ کی ذات گرامی سے اس الزام کو دفع کر دیتے کہ خود انھوں نے ان واقعات کو بیان کیا ۔۔

باب الاستفسار

موجودہ فن تمثیل کی ابتدا مغرب میں

(جناب مولوی عبدالغنی صاحب ۔ رائے پور)

کیا آپ براہ کرم مطلع فرما سکتے ہیں کہ مغرب میں موجودہ فن تمثیل کی ابتداء
کیونکر ہوئی اور اول اول کیا صورت اس کی تھی ؟

(نگار) فن تمثیل کی ابتداء یورپ میں قرون وسطیٰ سے ہوتی ہے گیارھویں اور تیرھویں صدی کے درمیان وہاں ایک جماعت آوارہ گرد شعراء کی پیدا ہوئی جنھیں تروباڈور (Troubadour) ... کے نام سے موسوم کرتے تھے اور غیر معمولی شہرت و قبولیت ان کو حاصل ہوئی۔ خصوصیت کے ساتھ عورتوں کا طبقہ تو اس درجہ مانوس تھا۔ کہ امراء و ملوک کو بھی اپنی بیویوں اور بیٹیوں کی طرف سے اطمینان باقی نہ رہا۔ کیونکہ تاریک راتوں میں سیاہ ریشمی لباس پہن پہن کر وہ خود بھی ان سے ملنے باہر نکل جاتی تھیں اور پوشیدہ طور پر انھیں بھی اپنے حجروں میں بلا لیتی تھیں ——— اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ان میں سے بعض شعراء نہایت اچھے خاندان کے ہوتے تھے اور دوسرا یہ کہ فن شعری اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ان کا وہی مرتبہ تھا جو جاہلیت کے شعراء عرب کو حاصل تھا۔ یہ لوگ ہمیشہ حسن و جمال ہی کی داستان کو نہیں دہراتے تھے بلکہ لوگوں میں جذبات شجاعت و حماست بھی پیدا کرتے تھے، چنانچہ اس لحاظ سے تالیور کے نام سے ایک

میں نقش و دوام کی حیثیت ...... حاصل کر لی ہے کیونکہ جب انگلستان نے ولیم کے ساتھ جنگ کی ہو تو نارمنڈیلو کے لشکر کے آگے آگے یہی تھا اور سب سے پہلے اسی نے وار کر کے دشمن کے دو سپاہی ہلاک کر ڈالے تھے۔

ایک بڑا سبب ان کی اہمیت کا یہ بھی تھا کہ اس زمانہ میں نہ تفریح کے اسباب کافی تھے۔ اور نہ دوسرے مقاموں کے حالات معلوم کرنے کا کوئی بہتر ذریعہ حاصل تھا اور چونکہ اس جماعت کے ذریعہ سے یہ دونوں باتیں حاصل ہو جاتی تھیں اس لئے امرا و ملوک کے طبقہ میں بھی ان کی بڑی عزت کی جاتی تھی اور جب کبھی کوئی جماعت ایسے شعرا کی پہونچ جاتی تھی تو یوں سمجھئے کہ عید ہو جاتی تھی۔

ایسا شاعر ہمیشہ ایک طائفہ یا جماعت کی صورت میں سیاحت کیا کرتا تھا یعنی اس کے ساتھ پہلوانی کا فن جاننے والے، فنون سپہگری کے ماہر، موسیقی کے استاد اور دیگر لہو و لعب کے مشاق سبھی طرح کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ وہ خود تو گھوڑے پر سوار ہو کر چلتا تھا لیکن اس کے ساتھی سب اس کے جلو میں پیدل چلتے تھے۔

جب یہ کسی امیر کے قصر کے پاس پہونچتا تھا تو اپنے آدمیوں کے ذریعہ سے چاروں طرف اپنی آمد کا ڈھنڈورا پٹوا دیتا تھا اور منادی کرنے والے اس کی فصاحت و بلاغت کی تعریفیں کر کر کے لوگوں میں ہلچل ڈال دیتے تھے۔ اس خبر کے شائع ہوتے ہی امیر اپنے قلعہ کے خندق پر پل گرا دیتا تھا اور اس جماعت کو شہر کے اندر جانے کی اجازت مل جاتی تھی —— جب وہ شہر کے اندر داخل ہوتے تھے تو امیر کے نمایندے ان کا استقبال کرتے تھے اور ان کے قیام و طعام کے لئے بہترین انتظام کیا جاتا تھا —— اس کی خبر جب پس پردہ پہونچتی تھی تو عورتوں میں بھی خاص ہیجان پیدا ہو جاتا تھا اور وہ اپنی آرائش و زیبائش کی تکمیل میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اٹھا رکھتی تھیں محض اس امید پر کہ شاعر شاید انہی پر گرویدہ ہو جائے اور ان کے حسن و جمال پر نظمیں لکھ کر شہرت دوام دیدے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی امیر اس اندیشہ سے ان کی پذیرائی نہیں کرتا تھا اور ان کو قصر کے اندر بزم شعر و سخن یا محفل رقص و سرود قائم کرنے کی اجازت دیتا تھا، لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر "شاعر" کو برہم کر دیا تو پھر وہ ملکوں ملکوں اس کی برائیاں بیان کر کر کے رسوا بھی کر دے گا، اور اگر اس کو خوش رکھا تو ہر جگہ تعریف بھی کرتا پھریگا۔

عورتوں کے میلان کا بھی اہم سبب یہی تھا کیونکہ اس زمانہ میں نقل اخبار کے ذریعہ تو تھے نہیں کہ ایک جگہ کا حال دوسری جگہ آسانی سے پہونچ جاتے اور لڑکیاں قدرتاً یہ چاہتی تھیں کہ دوسرے شہروں اور ملکوں میں ان کے حسن کے افسانے پہونچیں اور بہتر سے بہتر شوہر انھیں حاصل ہوں۔ چنانچہ اس خدمت کو "شاعر" بخوبی انجام دیتا تھا اور اپنے شعروں میں ایک لڑکی کے حسن کا ذکر کر کے دھوم مچا دیتا تھا —— لیکن اس کا معاوضہ

بھی "شاعر" رات کی تنہائیوں میں کافی سے زیادہ وصول کرلیتا تھا۔

"شاعر" کے ساتھ جو جماعت پہلوانوں وغیرہ کی رہتی تھی وہ اصل میں ان مشلین کی اولاد تھی۔ جو چھٹی صدی سے قبل اطالیہ کے تماشہ گاہوں میں کثرت سے نظر آتے تھے۔ لیکن جب شمال یوروپ کی وحشی قوموں نے اطالیہ کو فتح کیا تو انھوں نے ان مشلین کو بھی دیکھا اور ان کے کرتب وغیرہ دیکھ کر سخت حیرت انھیں ہوئی لیکن چونکہ وہ ان فاتحین کی توہین آمیز نقلیں بھی کیا کرتے تھے۔ اس لئے تماشہ گاہیں برباد کردی گئیں اور تماشہ کرنے والے تمام اکناف یوروپ میں منتشر ہوگئے ـــــ چنانچہ انھیں لوگوں کی نسل تھی جو "شاعر آوارہ گرد" کے ساتھ رہتی تھی اور مختلف شہروں میں گھوم پھر کر تماشے دکھایا کرتی تھی۔

ان لوگوں نے ایک "فانوس سحری" بھی ایجاد کیا تھا جسے موجودہ تصاویر متحرکہ کی ابتدا سمجھنا چاہئے۔ گردباد ور شاعروں کی جماعت اپنا تماشہ ہمیشہ کھانے کے بعد دکھایا کرتی تھی جب شراب کے نشہ سے حاضرین پوری طرح مغلوب ہوتے تھے۔ روشنیاں گل کردی جاتی تھیں اور صرف "جادو کا فانوس" آڑ میں روشن رہتا تھا۔ جماعت کا سردار تماشائیوں سے پوچھتا تھا کہ کیا وہ شیطان کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی دفعتاً دیوار پر ایک سایہ عجیب الخلقت انسان کا نظر آتا تھا جس کے بڑے بڑے سینگ ہوتے تھے۔ لوگ دیکھ کر خائف ہوجاتے تھے۔ اور ان کی غیرمعمولی قوتوں کا یقین کرکے ان سے ڈرنے لگتے تھے ـــ

اس کے بعد ایک زمانہ وہ آیا جب "شاعر" اس جماعت سے علیحدہ ہوگیا اور ان بازیگروں کی اخلاقی حالت بہت خراب ہوگئی۔ یعنی سربازار تماشہ کرنے کی حالت میں یہ لوگوں کی جیبوں سے چیزیں چرانے لگے۔ اور سخت بدنام ہوگئے۔ اسی کے ساتھ یہ لوگ امرا کی بری بری نقلیں بھی کیا کرتے تھے، آخرکار ۱۵۷۲ء میں ایک قانون وضع کیا گیا کہ جب تک کوئی باضابطہ اجازت نہ حاصل کرلے اس قسم کے تماشہ نہیں دکھا سکتا۔

یہ لوگ علاوہ ان شعبدوں کے دواؤں کی تجارت بھی کیا کرتے تھے اور بالکل اسی طرح جیسی آج کل ہندوستان میں سڑک پر سانڈے کا تیل بیچنے والے کیا کرتے ہیں ـــــ ان کی ترکیب یہ ہوتی تھی کہ مثلاً ایک شخص دفعتہً تماشہ دکھاتے دکھاتے تھک کر کرسی پر بیٹھ جاتا تھا اور زور زور سے کھانسنے لگتا تھا۔ اس کے بعد وہ تیل کی شیشی نکال کر اپنے گلے پر ملتا تھا اور کھانسی فوراً دور ہوجاتی تھی۔ معاً اسی وقت انھیں میں سے ایک شخص جو ہجوم میں شامل ہوتا تھا، باہر نکل کر کہتا کہ مجھے بھی کھانسی ہے اور اگر مجھ کو فایدہ ہوجائے تو جانوں کہ تمھاری دوا مفید ہے۔ یہ کہہ کر زور زور سے کھانسنے لگتا، لیکن دوا ملتے ہی کھانسی دور ہوجاتی اور اس طرح لوگوں کو یقین دلا دلا کر دوائیں بیچتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مجمع میں سے کوئی زخمی

شخص نکلتا اس حال میں کہ زخموں سے خون بہتا ہوتا، لیکن دوا کا استعمال ہوتے ہی خون بند ہو جاتا - حقیقتاً یہ تمام باتیں مصنوعی ہوا کرتی تھیں - اور کسی خاص تدبیر سے جسم میں زخم کی کیفیت پیدا کر لی جاتی تھی -

جب لندن میں (Puritans) کا زور ہوا تو ان بادیگروں کو یوں سڑک پر مجمع عام میں تماشہ کرنے کی ممانعت کر دی گئی اور لندن سے باہر ایک عمارت بنا دی گئی - جس کا نام (Theatre) رکھا گیا - یہ عمارت اصل میں دیوار کا ایک حصار تھا جس پر چھت قائم نہیں کی گئی تھی ——— اس کے بعد دوسری عمارت طیار کی گئی جس کا نام (Curtain) رکھا گیا اور یہ تھی ابتدا یوروپ میں اسٹیج کی اور ایکٹروں کی جنھیں عربی میں ممثلین کہتے ہیں -

سنہ ۳۱ء کے اکتشافات

(صحت انسانی کے متعلق)

انسان کی موجودہ ترقی مختلف علوم وفنون سے وابستہ ہے اور انھیں میں ایک وہ ہے جس کا تعلق انسان کی صحت سے ہے۔ یوروپ میں ایک جماعت مستقلاً اس تحقیق وجستجو میں لگی رہتی ہے کہ امراض کو دنیا سے محو کر دیا جائے اور انسان کی عمر طبیعی کا اوسط اگر عمر خضر تک نہیں پہونچ سکتا تو کم از کم سو تک تو ضرور پہونچ جائے۔ اس سلسلہ میں جو اکتشافات سنہ ۳۱ء میں ہوئے ہیں انکا بیان فائدے سے خالی نہیں۔

(۱) انگلستان کے مشہور فاضل سر لیونارڈ ہیل نے عرصہ تک اس امر پر غور کیا کہ برودت وحرارت کا احساس مختلف لوگوں میں کیوں کم وبیش ہوتا ہے۔ کسی کمرہ میں دو آدمی بیٹھے ہوئے ہیں ان میں ایک کھڑکی بند کرنے پر اصرار کرتا ہے، دوسرا اس کے کھول دینے پر۔ ایسا کیوں ہے؟

فاضل موصوف کی تحقیق اس باب میں یہ ہے کہ ناک کے اندر جو اعصاب پائے جاتے ہیں۔ وہ جلد کی سطح اور اندرونی پردوں کے درمیان پھیلے ہوئے ہیں۔ اور چونکہ بعض لوگوں کی جلد حرارت کو زیادہ جذب کرنے کی اہل ہوتی ہے اور بعض کی کم اس لئے گرمی سردی کے احساس میں یہ تفاوت پایا جاتا ہے۔

(۲) زکام ونزلہ کے متعلق اب سے قبل یہ خیال کیا جاتا تھا کہ جراثیم سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ لیکن اب ثابت ہوا کہ اس کے بھی جراثیم ہوتے ہیں لیکن اتنے دقیق وباریک کہ خوردبین کے ذریعہ سے بھی ان کو نہیں دیکھ سکتے ـــــ امریکہ کے ڈاکٹر کنڈال کی تحقیق ہے کہ اس کے جراثیم تو وہی معمولی خوردبینی جراثیم ہوتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ وہ اتنے چھوٹے ہو جاتے ہیں کہ کسی طرح نظر نہیں آتے۔

(۳) ڈاکٹر کردکشانک نے متعدد تجربوں کے بعد یہ بات معلوم کی ہے کہ وہ لوگ جن کی طبیعت یاس و اضمحلال کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے وہ جراثیمی بیماریوں میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں کیونکہ ان میں اثر قبول کرنے کی بہت صلاحیت ہوتی ہے اور وہ جراثیم کی مقاومت اچھی طرح نہیں کر سکتے کیونکہ وہ

سانسیں جلدی جلدی لیتے ہیں اور آکسیجن کی کافی مقدار ان کے پھیپھڑوں میں نہیں پہونچتی جو جراثیم کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے۔

(۴) امریکہ کے ایک ڈاکٹر جان واکر نے ثابت کیا ہے کہ صابون کے جھاگ جراثیم کو ہلاک کرنے میں بہت مفید ثابت ہوتے ہیں جو کہ پھیپھڑوں کے التہاب، خون کی سمیت، اور انفلوئنزا کے جراثیم بھی اس سے فنا ہو جاتے ہیں۔

(۵) ایک فلم کے ذریعہ سے آنسوؤں کے افعال ہلاکت جراثیم کے متعلق انگلستان میں دکھائے گئے اور ثابت کیا گیا کہ آنسو جراثیم کو نہ صرف ہلاک کر دیتے ہیں بلکہ بالکل محو کر ڈالتے ہیں۔ آنسو میں ایک خاص مادہ لائسوزم پایا جاتا ہے جو جراثیم کا سخت دشمن ہے۔ چونکہ آنکھ نہایت نازک عضو ہے اور جراثیم سے متاثر ہونے کی اس میں بہت زیادہ اہلیت پائی جاتی ہے اسی لئے قدرت نے اس میں آنسو پیدا کر دیے تاکہ آنکھوں کی حفاظت ہو سکے۔

(۶) کچھ عرصہ سے خیال تھا کہ انسان کی جلد میں بھی کوئی مادہ ایسا موجود ہے جو امراض سے بچاتا ہے۔ چنانچہ امریکہ کے مشہور ڈاکٹر ہوکمز نے اس مادہ کے وجود کو ثابت کر دیا اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ حبشیوں کی جلد میں نسبتاً دفع امراض کی بہت زیادہ اہلیت پائی جاتی ہے۔

(۷) ہچکی کا ایک عجیب و غریب علاج ڈاکٹر گولڈن نے دریافت کیا اور وہ یہ کہ معمولی کاغذ کا بڑا لفافہ جس میں بازار والے کپڑا وغیرہ لپیٹ کر دیتے ہیں ناک اور منہ پر رکھکر سانس لیا جائے۔ اس طرح کاغذ کا کاربن دماغ کے مرکز عصبی کو متاثر کرتا ہے اور ہچکی دور ہو جاتی ہے۔

(۸) دانتوں کی خرابی کا ذمہ دار عدم صفائی اور منہ کے جراثیم کو بتایا جاتا تھا لیکن اب معلوم ہوا کہ اس کا بڑا سبب غذا ہے۔ کیونکہ اگر ایسی غذا استعمال کی جائے جس میں وٹامین اور چونہ کے مرکبات کی کمی ہو تو دانت خراب ہو جاتے ہیں۔

(۹) مچھروں، مکھیوں اور پسوؤں کے دور کرنے کے متعلق بہترین طریقہ ڈاکٹر منرو نے یہ بتایا کہ اگر کھڑکیوں کے شیشے سرخ، زرد یا نیلگوں ہوں تو ان کیڑوں سے نجات مل سکتی ہے۔ کیونکہ حشرات کو ان رنگوں سے سخت نفرت ہے۔

"دُنیا"

ہمنشیں! مجروحِ غم ہوں، جان کھونے دے مجھے
خلق کی بیگانگی پر، آہ، رونے دے مجھے

گرچہ مجھ پر بھی ستم ڈھائے ہیں، دُنیا نے بہت
حشر اٹھائے ہیں جہانِ فتنہ آرا نے بہت

دردِ محرومی، غمِ ناشادمانی کے لئے
میں بنا ہوں تلخیٔ ناقدردانی کے لئے

زندگی میں روح کے اجزا، پریشاں کر دئیے
میں نے اپنے دل کے ٹکڑے نذرِ دوراں کر دئیے

بزم رو میں صبح کی جب جھلملاتے ہیں چراغ
مدتوں کھولا ہے جوشِ فکر سے میرا دماغ

شب کی خاموشی میں، جب سوتی ہے نبضِ جستجو
مدتوں برسا ہے میری چشمِ گریاں سے لہو

کیف کی اس فصل میں جب مسکراتی ہے بہار
مدتوں میں تشنہ کامی سے رہا ہوں بیقرار

چاندنی کے رقص میں جب گنگناتی ہے صبا
مدتوں کانپی ہے میرے نالۂ غم سے فضا

اس فضائے نور میں جب حسن الٹتا ہے نقاب
مدتوں بیگانۂ عشرت رہا میرا شباب

عیش کے اُس عہد میں، جب پھول بنجاتی ہے خاک
مدتوں میں کاوشِ غم سے رہا ہوں سینہ چاک

اُس جہاں سالی میں جب ہر چیز ہوتی ہے حسیں
مدتوں دھندلی رہی ہے، میری دنیا کی جبیں

آہ اس سعیٔ و عمل کا دیکھنا، ہمدم! مآل
میں ہوں اور اک مستقل کیفیتِ حزن و ملال

خاک کو تابندگی بخشی ضیائے مہر نے — میری جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا دہر نے
لیکن اے ہمراز! میں اس پر نہیں اندوہگیں — خلق کی بیگانگی سے یہ مرا مطلب نہیں
صبر سے پیتا میں اپنی زندگی کا تلخ جام — خوں رُلاتا ہے مجھے دنیائے فانی کا نظام
آہ دنیا، سر بسر معمورۂ وہم و قیاس — زندگانی ہے جہاں وابستۂ اندوہ و یاس
جس میں ظلمت آفریں ہے مہر تاباں کا جلال — یاد جور ناتمامی ہے جسے ناز کمال
ملے جہاں گردش میں اک ٹوٹا ہوا سا جام عقل — عقل ہے، جس بزم میں آئینۂ اوہام عقل
ہیں جہاں نا آشنا اسرار فطرت سے دماغ — جادۂ تکمیل ہے اور بیر مکتب کا چراغ
دل جہاں سینوں میں ہیں نامحرم احساس درد — قبر کے مانند تیرہ، برف کے مانند سرد
زہر دولت ہے جہاں انساں کی نبضوں میں رواں — روح کی وادی ہے اور ابر غلامی کا دھواں
جسم ہیں اک سطح پر، مجروح، آزاد و اسیر — ہے جہاں انسان، ننگ روح و محروم ضمیر
جسمیں نفرت سے سُنا جاتا ہے فطرت کا پیام — ہے گراں جس کی طبیعت پر محبت کا نظام

چھیڑتی ہے سازِ نواب گردش ایام کیا
دیکھئے ہوتا ہے اس آغاز کا انجام کیا

"رعنائی غم"

تو سطح بیں ہی ناداں! دھوکے میں آگیا ہے　　لفظوں کو تو نے اصلی مقصد بنالیا ہے
غمناک عاشقی کی فرضی کہانیاں ہیں　　بے کیف آنسوؤں کی جھوٹی روانیاں ہیں
"ڈوبی ہوئی ہیں نبضیں، ڈھلنے لگا ہے منکا　　ساماں ہو رہا ہے عشاق کے کفن کا"
"اکھڑی ہوئی ہیں سانسیں ہنگام نزع طاری　　اٹکی ہوئی ہے ہچکی ہوتی ہے دم شماری"
"احباب بیٹھے ہیں بالیں پہ آکے سینہ　　ماتھے پہ آگیا ہے اب موت کا پسینہ"
"میت پڑی ہوئی ہے۔ اک حشر کا ہے عالم　　روشن ہے شمع بالیں۔ برپا ہے شورِ ماتم"
لے دے کے تیرے غم کی ہے کائنات اتنی　　اس پہ ترا یہ دعویٰ، دعوائے غم پرستی
کم عقل! عمر بھر میں یہ کی ہے جانچ تو نے　　غم کو سمجھ لیا ہے دوزخ کی آنچ تو نے
کتنی حسین شے ہے تو جانتا نہیں ہے!　　لیلائے غم کی صورت پہچانتا نہیں ہے
تو "غم" سمجھ رہا ہے "غم کی علامتوں" کو　　ساحل پہ ڈھونڈتا ہے تہ کی حقیقتوں کو
ناداں! گداز غم تو خود مستقل زباں ہے　　رنگیں تجلیوں کی رنگین داستاں ہے

فریاد کی تو کوئی مخصوص لے نہیں ہے
نالہ کسی کا ہے پابند لے نہیں ہے　(غالب)

ذوقی

التجا

ای خدا ای جفاکشوں کے خدا　　سخت جانوں، بلاکشوں کے خدا
خوں آشام امتحانوں میں　　دے جگہ مجھکو کامرانوں میں
عزم کو عزم آہنیں کر دے　　دلمیں غیرت کی بجلیاں بھر دے
تشنۂ عیش کامرانی ہوں　　طالب سوز جاودانی ہوں
دلمیں جوشِ کمال پیدا کر　　طلب لازوال پیدا کر
عرش پیما نگاہ دے مجھ کو　　قوّتِ بے پناہ دے مجھ کو
زندگی دی تو سرخوشی بھی دے　　کیف صہبائے زندگی بھی دے
واقفِ عرض و التجا ہے تو　　حالِ دل خوب جانتا ہے تو
اپنے الطاف سے مرے مالک　　دُکھ کا درمان دے مرے مالک
جانگزا ہے عذابِ ناکامی　　تاکجا اضطرابِ ناکامی
بے نیازِ غمِ جہاں کر دے
سرخرو کر دے، کامراں کر دے

عدم

قطعات

عشرت جاوید

فرصت ہی، کوئی فکر نہیں، گنج باغ ہے　　بھیگی ہوا ہی، ابر ہے، دیوانِ اغ ہے
ای دنیوی شکوہ و زر و جاہ کے خیال!　　مجھ سے نہ بول، عرش پہ میرا دماغ ہے

شبیہ شاعر

سوزِ درون و برقِ نہاں کی جھلک سے رخ　　آئینہ دار ہی دلِ خانہ خراب کا
تصویر بھی بدلتی ہے کاغذ پہ کروٹیں　　دھندلا سا عکس ہی یہ مرے اضطراب کا

زبانِ محبت

ہر چند نامرادِ محبت ہے بیزباں!　　موسیقیِ حزیں ہی مگر اُسکی ترجماں
بجتا ہی جب ستار تو یہ جانتا ہوں میں　　دہرا رہا ہے کوئی مرے غم کی داستاں

اختر انصاری دہلوی

نعرۂ عشق

دار پر چڑھ کے مسکراتا ہوں
موت سے زور آزماتا ہوں

زندگی کو ابھارتا ہوں میں
زلفِ ہستی سنوارتا ہوں میں

بے تکلف ہی رسم و راہ مری
توڑ دیتی ہے دل نگاہ مری

روح کا سرمدی خرام ہوں میں
عرش والوں سے ہمکلام ہوں میں

موت مجھ سے نظر چراتی ہے
دیکھ کر مجھ کو کانپ جاتی ہے

دستِ قدرت کا شاہکار ہوں میں
دوشِ اقبال پر سوار ہوں میں

باقی صدیقی
(راولپنڈی)

غزل اثر رحمانی

خیال آتے ہی دل بیخود ہوا ہے
وہ چشمِ مست کتنی کیف زا ہے

وفا کیسی - کہ محرومِ جفا ہے
یہ دل اس پر بھی مجبورِ وفا ہے

اسی نے تجھ کو پایا ہے - ہمیشہ
جو تیری جستجو میں کھو گیا ہے

کسی کے ٹوٹے دل کو جوڑ دینا
یقیناً حاصلِ مہر و وفا ہے

سمجھتے ہیں اسے کچھ اہلِ دل ہی
محبت میں فنا ہونا بقا ہے

تمہارے جبر سہتے سہتے دن رات
ہمیں بھی صبر آخر آچلا ہے

برتتے ہو اسی سے غیریت تم
جو دل سی چیز تمکو دے چکا ہے

خرابِ عاشقی - ناکامِ حسرت
مرا دل اب خدا کس کام کا ہے

اثر ثابت ہوا یہ تجربہ سے
جوانی ہے تو جینے کا مزا ہے

کیفیات

جوہرِ مطلب نہیں شرمندۂ عرضِ کلام ہر نگاہِ یاس ہے ٹوٹے ہوئے دل کا پیام
ذرّہ ذرّہ بن گیا آئینہ دارِ جوششِ حسن کس قدر حیرت اثر تھی شوخیٔ موجِ خرام
ہے بہت میرے لئے اک عشوۂ نیم التفات کون ہوتا ہے خریدارِ متاعِ ننگ و نام
کیوں نہ ہو شانِ کرم میں شوخیٔ رنگِ ستم حسن کی فطرت میں ہے ذوقِ وفا کا احترام
اس نگاہِ ناز کا طالب ہوں جو مخصوص ہو ننگِ ذوقِ عشق ہے کیفِ نگاہِ لطفِ عام
عشق میں منت کشِ حرف و حکایت کون ہو جب خموشی میں بھی ہے رعنائیٔ حسنِ کلام

قطعہ

بادہ نوشانِ طرب ہیں اور تکلیفِ خمار اب نہ وہ میخانہ باقی ہے نہ وہ صہبا و جام
الحذر خمیازۂ کیفیتِ عیش و نشاط سرگراں ہیں خستہ جاں ہیں تشنہ لب ہیں تلخ کام

انتہائے خود فراموشی نے آنکھیں کھول دیں
فطرتِ سفاک کا اللہ رے جوشِ انتقام

کوکب شاہجہانپوری

معلومات

دُنیا کا دورِ تجمیل

چند سال قبل کی بات ہے کہ حسن و جمال کی جستجو صرف تماشہ گاہوں اور تھیٹروں میں ہوا کرتی تھی، یعنی جو عورتیں نغمہ و رقص کا پیشہ اختیار کرتی تھیں انھیں کو اس امر کی ضرورت ہوتی تھی کہ وہ اپنے آپ کو خوبصورت بنا کر پیش کریں، لیکن اب حالات بالکل بدل گئے ہیں۔ اور حسن و جمال کی طلب دنیا میں اسقدر بڑھ گئی ہے کہ عملی زندگی کے کسی شعبہ میں اس وقت تک کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی، جب تک ظاہری حسن و جمال بھی حاصل نہ ہو —— خانگی خدمت کے لئے ایک حسین لڑکے یا لڑکی کی جستجو ہوتی ہے تاکہ اس کو دیکھ کر وجدان کو صدمہ نہ پہونچے، دفاتر میں کلرکی کے لئے جمیل عورتوں کی تلاش ہوتی ہے تاکہ اہل دفتر کی قوت عمل میں ہیجان پیدا ہوتا رہے، دوکانوں میں خوش گل عورتوں کی ضرورت ہے تاکہ خریدار متوجہ ہوں، اسکولوں میں خوبصورت معلمات درکار ہوتی ہیں تاکہ بچوں کے نفسیات پر اچھا اثر پڑے، ہوٹلوں میں خدمت کے لئے صاحب جمال لڑکیاں ڈھونڈی جاتی تھیں تاکہ لوگ کھنچ کھنچ کر وہیں پہونچیں اسپتالوں میں تیمارداری اور علاج کے لئے بھی حسین عورتوں ہی کی جستجو ہے تاکہ بیمار جلد اچھا ہو جائے۔ (در انحالیکہ اس باب میں مشرقی نقطۂ نظر یہ ہے کہ —— خوش طبیبے ست بیا تا ہمہ بیمار شویم)

اس میں کلام نہیں کہ جنگ عظیم نے غیر معمولی تباہیاں عالم میں پھیلائیں لیکن انھیں کے ساتھ "فن تجمیل" کی بنیاد ڈال کر بڑی حد تک تمام نقصانات کی تلافی بھی کر دی —— جو لوگ جنگ میں بیکار ہوئے تھے محض ان کے اعضاء درست کرنے کے لئے ڈاکٹری کا ایک نیا شعبہ ظہور میں آیا تھا۔ لیکن اب اسی شعبہ نے "فن تجمیل" کو ہاتھ میں لے کر دنیا کی بدصورتی و بدوضعی محو کر دینے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے، اور یورپ کے جمالیاتی ذوق پر اتنا زبردست اثر اس کا پڑا ہے کہ بُرے اخلاق کو تو وہ نظر انداز بھی کر سکتے ہیں لیکن بُری صورت کے لئے ان کے یہاں کوئی جگہ نہیں۔ چنانچہ حال ہی کا واقعہ ہے کہ امریکہ میں ایک شخص نہایت بدصورت تھا اور کوئی شخص اس سے کسی کام کے لینے پر راضی نہ ہوتا تھا۔ آخر کار اس نے مجبور ہو کر خودکشی کا ارادہ کیا، لیکن زندگی باقی تھی اس لئے قبل وقوع موت کے لوگوں کو پتہ چل گیا اور وہ شفاخانے بھیجدیا گیا۔ یہاں فن تجمیل کی جراحی سے اس کی بدصورتی دور کر دی گئی اور اسے ملازمت مل گئی — اس سے قبل تو یہ تھا کہ صرف ناک کان وغیرہ کی معمولی بدنمائی کو جراحی سے دور کر دیا کرتے تھے، لیکن اب تو چہرہ و جسم کے ہر

حصّہ کے قبیح ترین عیب کو دور کردیتے ہیں اور وہاں اخباروں میں ڈاکٹروں کے اشتہارات نکلتے رہتے ہیں کہ جسکو حسین بننا ہو ہم سے رجوع کرے۔

دو سال ہوئے کہ نیویارک میں ایک خیراتی شفا خانہ فن تجمیل کا قائم کیا گیا ہے اور وہاں بغیر کسی فیس کے بدصورتی کا علاج کیا جاتا ہے ——— ایک عورت کا واقعہ ہے جو اپنی بدصورتی کی وجہ سے نہایت خراب وشکستہ حالت میں زندگی بسر کرتی تھی، لیکن عمل جراحی کے بعد اس کی مالی حالت نہایت اچھی ہوگئی اور لوگوں کو پہچاننا دشوار ہوگیا کہ آیا واقعی یہ وہی عورت ہے یا کوئی اور۔

پھر یہ ذوق وہاں صرف کمسن عورتوں ہی میں نہیں پایا جاتا بلکہ ساٹھ ساٹھ سال کی بڑھیا عورتیں بھی عمل جراحی کی اذیتوں کو برداشت کرتی ہیں اور صرف اس لئے کہ جب وہ آئینہ دیکھیں تو خود اُن کو اپنی صورت بُری نہ معلوم ہو ———

اس میں شک نہیں کہ بہ نسبت مردوں کے عورتوں کو اس کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ بعض کو یہ تمنا ہوتی ہے کہ ان کا شوہر ان سے محبت کرتا رہے۔ بعض کو یہ ڈر رہتا ہے کہ کہیں ان کی ملازمت نہ جاتی رہے، بعض کو جو تھیٹر وغیرہ میں نوکری کرتی ہیں یوں بھی بقاء حسن کی ضرورت ہوتی ہے اور جو مطلقہ یا دوشیزہ ہیں۔ وہ شوہر کی تلاش وجستجو میں اپنے آپ کو جمیل ظاہر کرنے پر مجبور ہیں ——— بعض ایسی عورتیں بھی ہیں جو بلا ضرورت محض غرورِ حسن کی رعایت سے اپنے کان چھوٹے، دہانہ تنگ، اور آنکھیں بڑی کرالیتی ہیں تاکہ ان کا فتنۂ حسن اور سحرِ کشش اور زیادہ بے پناہ ثابت ہو۔

پھر یہ شوق صرف عورتوں ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ مردوں میں بھی عام ہوتا جاتا ہے چنانچہ ڈاکٹر ہوارڈ کرام جو اس فن کا بڑا ماہر ہے۔ لکھتا ہے کہ ایک بار میرے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ میرے چہرہ پر عمل جراحی کرکے خط وخال اور شباہت بدل دو۔ مجھے شبہ ہوا کہ کہیں یہ کوئی مجرم تو نہیں ہے جو اپنی شکل میں تبدیلی پیدا کرکے سزا سے محفوظ رہنا چاہتا ہے، چنانچہ میں نے پولیس کو اطلاع دی ——— (کیونکہ وہاں کا قانون ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے چہرہ کی شباہت تبدیل کرائے تو پولیس کو اطلاع دینی چاہیئے تاکہ وہ تحقیق کرے کہ گرفتاری کے ڈر سے تو وہ اپنی صورت تبدیل نہیں کراتا) ——— اور جب وہاں سے تصدیق ہوگئی کہ یہ کسی جرم میں مطلوب نہیں ہے تو میں نے عمل جراحی کیا۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے اپنی بیوی سے بہانہ کیا کہ وہ باہر سفر پر جارہا ہے اور خفیہ طور پر عمل جراحی کرالیا۔ جب گھر واپس آیا تو چہرہ پر پٹیاں وغیرہ بندھی ہوئی تھیں۔ بیوی نے پوچھا تو کہدیا کہ کسی حادثہ کی وجہ سے چہرہ مجروح ہوگیا ہے۔ جب زخم اچھے ہوگئے اور پٹیاں کھولی گئیں تو بیوی نے وہاں

عالم ہی دوسرا دیکھا، نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار خود بیگم کو بھی اپنے چہرہ پر جراحی کرا کے شوہر کے مقابل حسین بننا پڑا ۔۔۔۔۔

پھر اگر لوگوں کا میلان اسی طرح بڑھتا رہا اور عمل تجمیل کے ذریعہ سے چہرہ و جسم کے معائب و نقائص دور ہوتے رہے، تو یقیناً ایک زمانہ وہ آئے گا۔ جب نسل پر اس کا اثر پڑے گا۔ اور اولاد خود اتنی حسین و جمیل پیدا ہونے لگے گی کہ عمل جراحی کی ضرورت باقی نہ رہے گی ۔۔۔۔۔ بہر حال موجودہ انسان نے فطرت کے ساتھ جو جنگ اختیار کی ہے اسی کا ایک پہلو یہ بھی ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں کامیابی قدرت کو حاصل ہوگی یا انسان کو۔

بنک کس نے ایجاد کیا بنک کا کاروبار ایسی چیز ہے کہ اگر آپ کسی سے پوچھیں گے کہ اس کا رواج کب سے ہے تو وہ فوراً کہہ دے گا کہ یہ زمانۂ حال کی چیز ہے اور موجودہ تمدن و تہذیب نے اسے قائم کیا ہے۔ لیکن عراق میں علماء طبقات الارض کی تحقیق یہ ہے کہ اب سے ۲۷۰۰ سال قبل اہل بابل بنک اور اس کے فواید سے واقف تھے۔

ایک تختی زمین سے برآمد ہوئی ہے اور اس کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیح سے ۷۰۰ سال قبل بابل میں ایک بنک قائم تھا جس کا نام ایکیبی تھا اور اس میں موجودہ بنکوں کی طرح شرکا بھی تھے ۔۔۔۔ اس بنک میں لوگوں کی جسارت جاریہ (Current account) بھی تھے۔ امانتیں بھی رکھی جاتی تھیں، تمسکات بھی جاری کئے جاتے تھے اور اس کے حصے بھی مقرر تھے۔ لیکن چونکہ کاغذ اس وقت تک ایجاد نہ ہوا تھا اس لئے اینٹوں پر کندہ کر کے اسے پکا لیتے تھے تاکہ تحریر محفوظ رہے۔

فرانس کا قومی خزانہ شہر پیرس کے وسط میں فرانس کا وہ بنک واقع ہے جس کے اندر حکومت فرانس کی دولت سونا اور سونے کی اینٹوں کی صورت میں ایک جگہ ڈھیر ہے۔ مشہور ہے کہ سونے کے لحاظ سے اس وقت کوئی ملک فرانس سے زیادہ دولتمند نہیں کیونکہ دنیا میں جتنا سونا پایا جاتا ہے اس کے تہائی حصہ کا مالک فرانس ہے ۔۔۔۔ ہزاروں لوگ روزانہ اس عمارت کے پاس سے گزر جاتے ہیں، اور انھیں مطلق خبر نہیں کہ اس کے اندر کتنے قارونوں کی دولت محفوظ ہے ۔۔۔۔ اس بنک کی عمارت بظاہر نہایت معمولی ہے، لیکن یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ عمارت کا اصل حصہ جہاں یہ خزانے محفوظ ہیں، زمین کے اوپر پایا ہی نہیں جاتا بلکہ وہ زیر زمین منزل در منزل چلا گیا ہے ۔۔۔۔ خزانہ سب سے نیچے کے عمیق غار میں رکھا ہوا ہے اور وہاں تک پہونچنے کے لئے بجلی کا ایک (Lift) بنایا گیا ہے جو بغیر کسی آواز کے اوپر نیچے آتا جاتا ہے۔ چاروں طرف بجلی کی روشنی ہے اور ہوا صاف رکھنے کے لئے خاص خاص

آلات نصب کیے گئے ہیں ـــــ سب سے نچلی منزل میں پہونچنے کے بعد ایک نہایت مستحکم دروازہ فولاد کا نظر آتا ہے جس کے کھولنے اور بند کرنے کے لئے بجلی کا انجن کام کرتا ہے ـــ اس دروازہ کا طول قد آدم کے برابر ہے۔ لیکن اس کی دبازت یا موٹائی چھ آدمیوں کی دبازت کے برابر ہے اگر وہ برابر برابر ایک صف میں کھڑے کیے جائیں یہ دروازہ اسقدر محفوظ ہے کہ نہ کوئی گولہ اس پر اثر کرسکتا ہے نہ بجلی کا شعلہ اسے پھونک سکتا ہے۔ دروازہ کے کھلتے ہی ایک آہنی سرنگ ملتی ہے جو اندر ہی اندر ایک وسیع فولادی مکان تک پہونچادیتی ہے۔ جہاں خزانہ محفوظ ہے ـــ یہاں کے کام کرنے والوں کے لئے ۸۰ دن کے لئے تمام ضروری اشیاء فراہم کردی جاتی ہیں۔ اور وہ اس مدت کے بعد دوسری جماعت آجاتی ہے جو اتنے ہی دنوں تک یہاں کام کرتی ہے یہاں کی روشنی اور آبرسانی کا انتظام بالکل علیحدہ ہے اور شہر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ـــــ یہاں نہ صرف سونا اور قیمتی تمسکات محفوظ ہیں، بلکہ فنی وادبی نوادر بھی اسی جگہ مقفل کردئے گئے ہیں۔

دنیا کی وسیع ترین عمارت اس وقت تک امریکہ اپنی سر بفلک عمارتوں کے لئے بہت مشہور تھا لیکن اب اس نے وسعت تعمیر کی طرف بھی قدم اٹھاکر ساری دنیا کو شکست دیدی ہے ـــــ چنانچہ حال ہی میں شکاگو کی " عمارت تجاری " کا افتتاح ہوا ہے جس کو دنیا کی وسیع ترین عمارت کہنا چاہئے۔ اس کی بلندی تو اتنی زیادہ نہیں ہے کیونکہ صرف ۲۲ منزلیں اس میں پائی جاتی ہیں لیکن اسکی وسعت اور گہرائی بہت غیر معمولی ہے ـــــ یہ عمارت حقیقتاً بجائے خود ایک مختصر سا شہر ہے جس کے اندر ہر قسم کے کارخانے پائے جاتے ہیں۔ اس کے اندر بازار ہیں، کارخانے ہیں، دفاتر ہیں، بینک اور ہوٹل ہیں، سینما اور تھیٹر ہیں، ڈاکخانے اور تار گھر ہیں، باغات اور کھیل گھر ہیں۔ الغرض تمدن جدید سے متعلق کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو وہاں نہ پائی جائے۔
اس عمارت میں پانچ ہزار کمرے، دس ہزار کھڑکیاں اور سات ہزار دروازے پائے جاتے ہیں۔ یہاں دس بڑے بڑے انجن، بجلی پیدا کرنے کے لئے نصب ہیں اور ۲۰۰ موٹر ([illegible]) ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں۔

مُصفّی

طبِ یونانی کا تازہ کرشمہ

انسان کی زندگی کا مدار خون پر ہے خون اگر خراب ہوگیا ہے تو آدمی کی تندرستی قائم نہیں رہ سکتی۔ **ہندوستانی دواخانہ دہلی**۔ 'مصفی' ایجاد کرکے تمام ملک کو مقابلہ کی دعوت دیتا ہے۔ اور بلاخوف تردید دعویٰ کرتا ہے کہ صفائی خون کے لئے مصفیٰ سے بہتر دوا آج تک نہ ایشیا پیش کرسکا ہے نہ یورپ۔ مصفی ہندوستان کی جڑی بوٹیوں کا خلاصہ ہے۔ اور **مسیح الملک ثانی حکیم حاجی محمد احمد خاں صاحب** کے مشورہ سے جدید سائنٹفک طریق پر طیار کیا گیا ہے۔ خون کی خرابی سے پیدا ہونے والے ہر مرض کی تیر بہدف دوا ہے۔ کھجلی۔ داد۔ پھنسیاں وغیرہ حتیٰ کہ سوزاک۔ آتشک۔ اور جذام کا زہریلہ مادہ بھی اس کے استعمال سے ہمیشہ کے لئے نابود ہوجاتا ہے۔ اوس کی خوراک چائے کا ایک چمچہ ہے۔ اور بلحاظ نفع مصفی درحقیقت اکسیری چیز ہے۔

قیمت ١٢ خوراک کی شیشی صرف ١٢/ محصول ذمہ خریدار

ترکیب استعمال

ایک خوراک صبح ایک شام تھوڑے پانی میں ملاکر اور اگر مرض کا جوش زیادہ نہ ہو تو دن میں ٣ مرتبہ استعمال کیا جائے۔

ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ٢٢ دہلی سے طلب کیجئے

ذکر کہ در عرف عام شہرت دارد غلط محض است بے مراد و ناکو کر باید گفت لیکن اگر بے ذکر بایں معنی کہ آں شخص لوکر نماند استعمال کنند جائز باشد مولوی گوید ؎

عاشقاں از بے مرادیہائے خویش
باخبر گشتند از مولائے خویش

اعتراض مرزا غالب ۔ وہ میاں صاحب ہانسی کے رہنے والے بہت چوڑے چکلے جناب عبدالواسع فرماتے ہیں کہ بے مراد صحیح اور نامراد غلط ۔ ارے تیرا ستیاناس جائے ۔ بے مراد اور نامراد میں وہ فرق ہے جو آسمان اور زمین میں ہے ۔ نامراد وہ ہے کہ جس کی کوئی مراد کوئی خواہش کوئی آرزو نہ برآوے ۔ بے مراد وہ کہ جس کا صفحۂ ضمیر نقوش مدعا سے سادہ ہو از قسم بے مدعا و بے غرض و مطلب ۔ حسبۃ للہ ان دونوں امروں میں کتنا فرق ہے ۔ نابروا ۔ اور ناکام ۔ اور نادرست اور ناچار کہ یہ مخفف ناچارہ اور ناہار کہ یہ مخفف " ناآہار " ہے اور نامراد اور ناانصاف ۔ یہ سب درست ۔ ہائے کہاں گئے ہانسی والے مُلّا ۔

(مؤلف) ملائے ہانسوی کا مقصد کلام یہ ہے کہ نا اکثر مشتقات اور صفات پر داخل ہوتا ہے جیسا کہ نابالغ اور ناسموع اور لفظ بے اسمائے غیر صفت پر جیسا کہ بے دانش و بے علم و بے شعور و بے زر لیکن حسب قول صاحب فرہنگ انندراج بعض جگہ اس کے برعکس بھی پایا جاتا ہے ۔ جیسا کہ تواں ۔ اور امید کہ یہ دونوں لفظ غیر مشتق ہیں ۔ ان پر حرف نفی خلاف قیاس بجائے بے کے نا داخل ہوتا ہے ۔ اور ناتواں و ناامید کہا جاتا ہے ۔ بے تواں اور بے امید مستعمل نہیں ہے ۔ جیسا کہ سعدی نے کہا ہے ؎ امید ہست پرستندگان مخلص را کہ ناامید نگردد ز آستان الٰہ ۔ یا خواجہ حافظ ؎

ہاں مشو ناامید چوں واقف نۂ ز اسرار غیب
باشد اندر پردہ بازیہائے پنہاں غم مخور

بعض جگہ ایسے مرکبات بھی نظر آئے کہ ایک ہی لفظ پر دونوں لفظ داخل ہوئے ہیں ۔ جیسے کہ بے سپاس اور ناسپاس وغیرہ وغیرہ

میرے خیال میں ملا عبدالواسع نے جو قاعدہ لکھا ہے وہ صحیح ضرور ہے اس واسطے کہ قواعد کی اکثر کتابیں اوس کی تائید کرتی ہیں ۔ مگر انھوں نے چونکہ مستثنیات کا ذکر نہیں کیا اسی لئے مرزا غالب کو اعتراض کا موقع مل گیا ۔ ورنہ اصل میں خلاف قیاس ۔ اور شاذ کے طریق پر وہ الفاظ واقع ہوئے جنھیں مرزا نے اپنے واسطے دلیل قاطع سمجھا ہے ۔ اور اس قسم کے شاذ الفاظ کی عربی کے علم صرف میں کوئی انتہا نہیں ہے ۔ اسی لحاظ سے ملا عبدالواسع پر یہ اعتراض واقع نہیں ہوتا اور چونکہ تمام متقدمین کا اوسی قاعدہ پر اجماع ہے اس لئے مرزا کی رائے اتنے لوگوں کے مقابلے میں نہیں مانی جاسکتی ۔ یہ اور بات ہے کہ بے مراد اور نامراد کے دو خاص معنے آپ کے یہاں ہوگئے مگر ان پر قاعدہ کی بنا نہیں رکھی جاسکتی ۔

علی سرہندی و اعجاز اکبر آبادی

شاہ آفریں لاہوری نے حاکم لاہوری سے اور حاکم نے مولانا آزاد بلگرامی سے یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک زمانے میں وزیر خاں کی مسجد میں موزوں طبعوں کے مجمعے رہتے تھے۔ صحن مسجد میں چند لوگ جمع ہوتے اور شعر خوانیاں ہوا کرتی تھیں اتفاق سے ایک روز مجمع میں ملا محمد سعید اعجاز اکبر آبادی بھی شریک تھے۔ شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ عمدہ عمدہ شعر پڑھے جا رہے تھے۔ کسی نے ناصر علی کا یہ شعر پڑھا ؎

صریر خامہ میدانم کہ با طبعت نمی سازد ؛
دریدی نامہ۔ دل صد پارہ شد۔ قاصد زلیخا

له ناصر علی علی سرہندی کا سلسلۂ نسب حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ اوّل میں سیف خاں بدخشی کے ملازم ہوئے۔ جب سیف خاں الہ آباد کی صوبہ داری پر متعین ہوئے تو ناصر علی بھی الہ آباد میں عرصہ تک مقیم رہے۔ جب سیف خاں کا انتقال ہو گیا تو یہ سرہند چلے گئے۔ نہایت بے باکی اور رندی سے اوقات گزاری کرتے رہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ چار شنبہ آخر ماہ صفر کو سیر باغ کے لئے گئے تھے اور وہیں بیٹھے ہوئے شراب پی رہے تھے کہ اتنے میں شیخ محمد معصوم خلف حضرت مجدد قدس سرہما اُدھر سے گزرے ناصر علی سے خفا ہو کر پوچھا کہ یہ کیا ہے ـــــــ ناصر علی نے جواب دیا۔ "مے کہ ملائکہ میخورند" اس فقرہ سے علماء میں اتنی برہمی ہوئی کہ فتوؤں کے بعد ناصر علی کے قتل کا محضر تیار کیا گیا۔ اور یہ سخت آفت میں مبتلا ہوئے۔ میر محمد زماں راسخ کو یہ واقعہ معلوم ہوا۔ اپنے بال بچوں کو ساتھ لیا اور ناصر علی سے کہا کہ جان بچانا ہے تو میرے ساتھ چلے چلو۔ غرض کہ کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکال کر دہلی پہونچایا۔ یہاں پہونچ کر بھی دنوں تک وہی رنگ رلیاں مناتے رہے۔ آخرکار توفیق الٰہی نے دستگیری کی اور تمام مکروہات سے توبہ کر کے شیخ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہو گئے۔ آخر میں ذوالفقار خاں ابن اسد خاں کے مصاحب ہو گئے۔ چنانچہ جس روز پہلی مرتبہ قصیدہ نذر گزرانا تو قصیدہ کا یہ مطلع پڑھا ؎

ای شان حیدری ز جبین تو آشکار
تیغ تو در نبرد کند کار ذو الفقار

یہ سُنکر نواب موصوف نے ناصر علی کو باقی قصیدہ پڑھنے سے منع کر دیا۔ اور کہہ دیا کہ بس کافی ہے۔ اس مطلع ہی کا صلہ میں نہیں دے سکتا ہوں۔ اس کے بعد ایک ہاتھی اور تیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ مگر ناصر علی نے سب روپیہ مستحقین کو تقسیم کر دیا

آخر عمر میں دلّی میں تھے اور یہیں ۲۰ رمضان المبارک ۱۱۰۸ھ ہجری میں مرحوم ہو کر جوار مزار حضرت نظام الدین اولیاؒ میں مدفون ہوئے۔

اعتراض ملا محمد سعید اعجاز۔ عجیب بات ہے کہ صریر خامۂ عاشق سے تو معشوق کو نفرت ہوتی ہے اور اس آواز کو نہیں سن سکتا مگر کاغذ کے پھٹنے کی آواز سے کوئی اثر نہیں ہوتا۔ حالانکہ صریر قلم باریک بھی ہے اور عاشق اس سے دور بھی ہے۔ اور کاغذ کی دریدگی کی آواز قریب بھی ہے اور صریر قلم سے زیادہ بھی۔

جواب شاہ آفریں۔ معشوق اپنے قلم کی آواز کہ جو خط لکھنے میں نکلتی ہے برداشت نہیں کر سکتا یہاں صریر خامہ سے وہی صریر مراد ہے۔

جواب آزاد بلگرامی۔ صریر خامہ کو اگر عاشق کے قلم کی آواز مانیں تو وہ اس لئے معشوق کو گوارہ نہیں ہے کہ عاشق سے وہ حرکت ظہور میں آئی۔ اور خط کے چاک کرنے میں جو آواز پیدا ہوئی وہ اپنے ہاتھ سے پیدا ہوئی اسی لئے گوارا ہے۔ اور اس صورت سے دونوں حالتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ناصر علی نہ پسندید کہ بے برگیم آوارہ کنند جگر لعل و گہر چشم گہر سازم داد

اعتراض نامعلوم۔ لعل گہر ساز مسموع نہیں ہے اور کلام اساتذہ میں نہیں پایا جاتا۔

جواب مولانا آزاد۔ ناصر علی کے شعر میں چشم گہر ساز صحیح کہا گیا ہے۔ اس کی سند اشرف مازندرانی کے اس شعر سے دی جاسکتی ہے ؎

نرخ اشکم مشکن کین گہر لعلی را چشم بیچارہ بصد خون جگر ساختہ است

جس طرح موتی بنایا جاسکتا ہے اسی طرح لعل بھی بنایا جاتا ہے

ناصر علی ؎ اگر آں ہلال ابرو بمیاں نشستہ باشد مہ نو بچشم مردم مژۂ شکستہ باشد

مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ہلال ابرو یعنی میرا معشوق بھی وہاں موجود ہو جہاں مہ نو دکھائی دے تو مہ نو کو دیکھ کر لوگوں کو ایسی تکلیف ہو جیسی کہ آنکھ میں ٹوٹی ہوئی یا مڑی ہوئی پلک سے ہوتی ہے۔

اعتراض آزاد بلگرامی۔ پہلے تو معشوق کو اس شعر میں ہلال ابرو کہا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ ابرو کو ہلال سے بوجہ خوبصورتی کے مشابہ ٹھہرایا ہے۔ پھر اسی ہلال کو بمقابلہ ابروئے معشوق کے مژۂ شکستہ چشم قرار دیدیا اور اس صورت میں یہ ایک مذمت ہوئی۔ لہذا دونوں میں بڑا فرق ہے۔ یعنی کوئی وجہ نہیں کہ ایک جگہ وہی شے اچھی ٹھہرائی گئی اور پھر اسی کو برا بھی کہا۔

ناصر علی نے عالمگیر کی مدح میں یہ شعر کہا تھا جس پر میر عبدالجلیل بلگرامی نے اعتراض کیا ؎

محی الدین محمد زیب اورنگ فضائے شش جہت بر شوخیش تنگ

اعتراض۔ عالمگیر کا لقب محی الدین بسکون حائے حطی و بائے بے تشدید ہے۔ کیونکہ احیا از باب افعال کا اسم فاعل اسی طرح آئے گا۔

ناصر علی در تعریف اسپ ؎ بفکر لامکاں سیرش ہم آہنگ فضائے نہ فلک بر شوخیش تنگ

اعتراض میر عبد الجلیل۔ بادشاہ اور گھوڑے کی تعریف ایک ہی طور پر کی گئی ہے اور یہ نہایت ہی خلاف ہے۔ کیونکہ یہ مصرع بادشاہ کی مدح میں بھی ہے ع فضائے شش جہت بر شوخیش تنگ۔ دوسرے یہ کہ بادشاہ کو شوخ کہنا کچھ اچھا نہیں ہے۔

ناصر علی نے اس شعر کو بھی مثنوی سے نکال دیا۔ مگر مولانا آزاد نے سرو آزاد میں بیان کیا ہے کہ ایک نہایت قدیم مثنوی میں یہ شعر بہ تغیر الفاظ اس طرح دیکھا گیا۔ ؎

شہنشاہ جہان ہوش و فرہنگ محی الدین محمد زیب اورنگ

غالب و نظم طباطبائی[1]

غالب۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

مرزا غالب نے اس شعر کے معنی اپنے ایک خط میں لکھے ہیں۔ کہ ایران میں رسم ہے کہ دادخواہ کاغذ کے کپڑے پہنکر حاکم کے سامنے جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جلانا۔ یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا لے جانا۔

اعتراض۔ مصنف کا یہ کہنا کہ ایران میں رسم ہے کہ دادخواہ کاغذ کے کپڑے پہنکر حاکم کے سامنے جاتا ہے۔ میں نے یہ ذکر نہ کہیں دیکھا نہ سنا۔ اس شعر میں جب تک کوئی ایسا لفظ نہ ہو جس سے فنا فی اللہ ہونے کا شوق اور ہستی اعتباری سے نفرت ظاہر ہو۔ اس وقت تک اسے بامعنی نہیں کہہ سکتے۔ کوئی جان بوجھ کر تو بے معنی کہتا نہیں یہی ہوتا ہے کہ وزن و قافیہ کی تنگی سے بعض بعض ضروری لفظوں کی گنجائش نہ ہوئی اور شاعر سمجھا کہ مطلب ادا ہو گیا۔ تو جتنے معنے کہ شاعر کے ذہن میں رہ گئے اسی کو المعنی فی بطن الشاعر کہنا چاہیے۔ اس شعر میں مصنف کی غرض یہ تھی کہ نقش تصویر فریادی ہے۔ ہستی بے اعتبار و بے توقیر کا اور یہی سبب ہے کاغذی پیرہن ہونے کا ہستی بے اعتبار کی گنجائش نہ ہو سکی اس سبب سے کہ قافیہ مزاحم تھا۔ اور مقصود تھا مطلع کہنا۔ ہستی کے بدلے شوخی تحریر کہہ دیا۔ اور اس سے کوئی

---

[1] آپ کا اسم گرامی سید علی حیدر ہے۔ اور نظم تخلص فرماتے ہیں قدیم وطن لکھنؤ ہے۔ اب عرصہ سے بسلسلۂ ملازمت حیدرآباد میں مقیم ہیں۔ کبھی کبھی زائرین کی طرح لکھنؤ آتے ہیں اور غریب الوطنوں کی طرح دس پندرہ روز قیام کر کے چلے جاتے ہیں۔ آپ زبردست نقاد اور علوم رسمیہ سے باخبر ہیں۔ آپ کی تصانیف میں سے قصیدہ شقشقیہ نہایت زبردست ہے غالب کے دیوان کے شارح ہیں۔ اور شرح لکھنے میں آپ نے پوری قوت صرف کرنے کے علاوہ اپنی معلومات کا زور غالب پر چند ایراد کرنے میں بھی صرف کیا ہے جو بتفصیل لکھے جائیں گے۔ آپ کی عمر اس وقت قریب قریب ستر برس کی ہے مگر مشاغل علمی میں وہی دلچسپی اور انہماک ہے۔

قرینہ ہستی کے حذف پر نہیں پیدا ہوا۔ آخر خود اُن کے منہ پر لوگوں نے کہدیا کہ شعر بے معنی ہے۔

(مؤلف) جب ایران کے شعرا کے کلام میں جابجا اس رسم کا ذکر پایا جاتا ہے تو مصنف کا یہ کہدینا غلط نہیں۔ قرینہ چاہتا ہے کہ ایران میں ایسا ہوتا رہا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ بہت سی رسمیں ایسی ہیں جنکا ذکر ہی رہ گیا ہے اور یہ کوئی بھی نہیں جانتا۔ کہ کب ایسا ہوتا تھا اور کون ایسا کرتا تھا۔ ممکن ہے کہ غالب نے یہ سب کچھ بربنائے قیاس ہی کہا ہو لہٰذا اس سے ان پر کوئی اعتراض نہیں پڑتا۔ بالغرض ایران میں یہ رسم نہو اور کہیں ہو۔ پھر بھی کوئی نقصان عاید نہیں ہوتا۔ اس رسم کا بہت سے شعروں میں تذکرہ ہے منجملہ اُن کے ایک دو یہ ہیں۔

خاقانی ؎   کاغذیں پیرہن از دست قدر باید بدر   تاکہ دست قدر از دست تو بر بود قلم

" ؎   کبود پوشم و قرطاس پیرہن سازم   گہے بماتم حسرت گہے بماتم داد

کمال اسمٰعیل ؎   کاغذیں جامہ بپوشید و بدرگاہ آمد   زادۂ خاطر من تا بدہی داد مرا

بابا فغانی ؎   زخوباں داد میخواہم فغانی مہربانی کو   کہ سازد کاغذی پیراہن انصاف افسونم

مولانا نے اپنے خیال کے مطابق اس شعر کے معنے بیان فرما کر اسیر المعنی فی بطن الشاعر کا الزام بھی لگایا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں اس لئے کہ اس کے معنے ہی یہ نہیں ہیں جو انھوں نے بیان کئے ہیں سیدھے قرین قیاس یہ معنے ہیں کہ کاغذ پر کھنچا ہوا نقش ایک فریادی معلوم ہوتا ہے اور فریادی ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ کاغذی جامہ پہنے ہوئے ہے۔

غالب ؎   کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیمکش کو   یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

اعتراض۔ جو کا واؤ وزن سے ساقط ہوگیا۔ اور یہ درست ہے۔ لیکن اس کے ساقط ہونے سے دو جیم جمع ہوگئے اور عیب تنافر پیدا ہوگیا۔ لیکن خوبی مضمون کے آگے ایسی باتوں کا کوئی خیال نہیں کرتا۔

غالب ؎   نہ دے نامہ کو اتنا طول غالب مختصر لکھدے   کہ حسرت سنج ہوں عرض ستمہائے جدائی کا

اعتراض۔ سنجیدن فارسی میں وزن کرنے اور موزوں کرنے کے معنی میں ہے۔ نوا سنج۔ نغمہ سنج۔ زمزمہ سنج۔ ترانہ سنج۔ نکتہ سنج سب مانوس ترکیبیں ہیں اور فصحا کی زبان پر ہیں۔ لیکن متاخرین اہل زبان اور اُن کے متبعین، آرزو سنج، حسرت سنج، شکوہ سنج بھی مثل بیدل وغیرہ کے نظم کرنے لگے ہیں اور تصنع سے خالی نہیں ہے۔

(مؤلف) اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ جب بیدل وغیرہ نظم کرنے لگے تو غالب کے لئے وہی سند ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر ان ترکیبوں میں تصنع ہے تو کیا وجہ ہے کہ مولانا کی بیان کردہ ترکیبوں میں تصنع نہ ہو۔ جواب یہ ہوگا کہ وہ مانوس ہوگئی ہیں۔ تو میں یہ عرض کروں گا کہ مانوس ہونا موقوف ہے کثرت استعمال پر لہٰذا آج اُن ترکیبوں کو بھی مانوس سمجھنا چاہیئے جو مانوس نہ تھیں۔

غالب ؎   یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز   چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

غالب ؎ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا دل جگر تشنۂ فریاد آیا

اعتراض (نمبر۱) بیش نہیں بیان حصر کے لئے ہے مگر اُردو نحو اس کی متحمل نہیں۔ (نمبر۲) دوسرے مصرع میں۔ آیا۔ ہوا کے معنی میں ہے جو فارسی کا محاورہ ہے اردو میں اس طرح نہیں بولتے۔

(مؤلف) دونوں اعتراض صحیح ہیں۔ اگر ڈھونڈھ کر اس کی کوئی مثال اُردو میں پیدا بھی کی جائے تو اس پر بھی وہی اعتراض وارد ہوگا۔ پہلے شعر میں بیش نہیں ایک حد تک صحیح ہے۔ مگر دوسرے شعر میں کوئی گنجایش نہیں۔

غالب ؎ فروغ عشق سے ہوتی ہے حل مشکل عاشق نہ نکلے شمع کے پاسے نکالے گر نہ خار آتش

اعتراض۔ حل کو بہ تانیث باندھا ہے شاید مشکل کے ہمسایہ میں ہونے سے دھوکا کھایا۔ محاورہ یہ ہے کہ میں نے اس کتاب کا حل لکھا۔

(مؤلف) حل یقیناً متفقہ طور پر لکھنؤ اور دلّی دونوں جگہ بتذکیر ہی لکھا جاتا ہے۔ مگر بقول معترض یا تو مشکل کی قربت نے مصنف کو دھوکا دیا۔ اور یا پھر کاتب نے اصلاح دیدی۔ مصرع اصل میں یوں ہوگا ؎

فروغ حسن سے ہوتا ہے حل مشکل عاشق - یا - فروغ عشق سے ہوتی ہے حل ہر مشکل عاشق۔ مگر میرے پاس غالب کے دیوان کا ایک بہت قدیم نسخہ ہے اوس میں بھی مصرع یوں ہی لکھا ہے جیسے مطبوعہ متداول دواوین میں ہے

غالب ؎ مجھکو ارزانی رہے تجھکو مبارک ہوجیو نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

اعتراض۔ ہوجیو بہت مکروہ لفظ ہے اور متروک۔

(مؤلف) مرزا غالب کے زمانے تک اس قسم کے الفاظ۔ کیجئو۔ کیئو۔ کھائیو۔ وغیرہ نہ متروک تھے اور نہ مکروہ۔ غالب نے اور بھی کئی جگہ اس قسم کے الفاظ استعمال کئے ہیں مثلاً :-

ہاں کھائیو مت فریب ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے شکیب و صبر اہل انجمن کی آزمایش ہے

دنیا کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ دنیا تمام حلقۂ دام خیال ہے

غالب ؎ نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا دی ہے جائے دہن اوسکو دم ایجاد نہیں

اعتراض۔ لفظ اثبات یہاں مصنف نے مونث باندھا حالانکہ افعال کے وزن پر جتنے افعال ہیں سب بتذکیر مستعمل ہیں۔ میر کہتے ہیں ؎ تابوت مرا دیر اٹھا اس کی گلی سے اثبات ہوا جرم محبت کا اسی سے

اور مصنف نے خود بہ تذکیر کہا ہے ۔ ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے ۔ یہاں تراوش کے قرب نے دھوکا دیا۔

غالب ۔ ان پریزادوں سے لینگے خلد میں ہم انتقام قدرت حق سے اگر حوریں بہی واں ہوگئیں

اعتراض ۔ اس شعر میں پریزادوں سے عورتیں مراد ہیں جیساکہ خواجہ حافظ فرماتے ہیں ۔

فغاں زیں لولیاں شوخ وشیریں کار دشہر آشوب چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوان یغمارا

حالانکہ فارسی واُردو میں غزل کے اصول جو قائم ہوئے ہیں بموجب اُن کے مرد ہی عاشق اور مرد ہی معشوق ہونا چاہئے اور معشوق کی نسبت مؤنث کے صیغوں کا استعمال کرنا بھی نہیں درست ۔ بلکہ وہ پری آیا ۔ اور وہ حور آیا بے تکلف سب نظم کرتے ہیں۔

(مؤلف) اس میں کلام نہیں کہ اردو کے شعرا ضمیر تذکیر ہی استعمال کرتے رہے ہیں ۔ مگر شعرائے ایران کے اتباع میں تھا ۔ ہزاروں شعر اُردو کے دواوین میں ایسے موجود ہیں ۔ جن میں انگیا چوٹی ۔ مسی کنگھی کا ذکر ہے ۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اون کا معشوق عورت ہے مگر پھر بھی لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ معشوق کا تعین نہیں ہوا کیا صرف ضمیر تانیث وتذکیر ہی سے تعین ہو سکتا ہے ۔ اورکسی صورت سے ممکن نہیں ہے ۔ بات یہ ہے کہ فارسی میں چونکہ مرد اور عورت کی ضمیریں علیحدہ علیحدہ نہیں ہیں اس وجہ سے یہ امر مبہم رہ گیا ۔ اور ہندوستانی شعرا کو دھوکہ ہوا کہ انھوں نے بھی معشوق کو مذکر یا مونث قرار نہیں دیا ۔ بھر بھی فطرت کے موافق ان کی شاعری سے مترشح ہے کہ وہ معشوق عورت ہی کو سمجھتے رہے ۔ ورنہ یہ سراپا اور یہ زیوروں اور زنانہ لباس کی تعریف اون کے یہاں نہ مل سکتی ۔

غالب نے اس شعر میں ضمیر تانیث ردیف سے مجبور ہو کر استعمال کی ہے ۔ ورنہ شاید وہ بھی استعمال نہ کرتے تاہم یہ کوئی عیب نہیں ہے ۔ اور اس کو محل اعتراض نہیں قرار دیا جا سکتا ۔

غالب ۔ دھوتا ہوں میں جو پینے کو اس سیمتن کے پانوٗ رکھتا ہی ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانوٗ

اعتراض ۔ اس مضمون کو مصنف نے عورتوں کے محاورے سے نکالا ہے وہ کہتی ہیں کہ خدا کرے تیرا شوہر تیرے پاؤں دھو دھو کر پئے ۔ یعنی بہت چاہے ۔ ورنہ پاؤں دھو دھو کر پینا حقیقت میں کوئی انداز محبت نہیں ہے ۔ اور اصل اس محاورے کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہندوؤں میں برہمن کے پاؤں پوجتے ہیں اور اعمال پرستش میں سے یہ بھی ہے کہ اس کے پاؤں دھو کر پیئیں ۔

(مؤلف) یہ ذرا مشکل سے معلوم ہوگا کہ محاورے کی اصل کیا ہے ۔ اور پاؤں دھو کر پینا کیوں رائج ہوا ۔ مگر مشہور ہے

کہ پاؤں کا دھوون یا اور کسی چیز کا دھوون پینا موجب ازدیاد محبت ہوتا ہے اس قسم کے سیکڑوں شعر اردو میں موجود ہیں مثلاً
آتش کہتے ہیں ؎

عمر خضر سے اسکی زیادہ ہو زندگی — دھوون پئے جو یار کی زلف دراز کا

بحر لکھنوی ؎ — یا شو یہ کیا مریض محبت کا چاہئے — دھوکر پلاؤ دلبر عیسےٰ دہن کے پاؤں

خورشید شاگرد رشک ؎ — ملتے ہیں اپنے چاہنے والے یہاں کماں — شیریں نے کیوں نہ دھو کے پیا کوہکن کے پاؤں

ذاکر لکھنوی ؎ — چہرہ پری کا ہے جسے پیلا ہو کھل بدن کے پاؤں — دھو دھو کے اس کے پیتا ہوں اس گلبدن کے پاؤں

مہر شاگرد نسیم دہلوی ؎ — شیریں کو یہ دلائی نہ غیرت کسی نے بھی — پی دھو کے جوئے شیر سے تو کوہکن کے پاؤں

غالب ؎ — واں پہونچکر جو غش آتا ہے پیہم ہمکو — صد رہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہمکو

اعتراض۔ لفظ پیہم باضافت و بلا اضافت دونوں طرح صحیح ہے لیکن اردو کا محاورہ یہی ہے کہ اس لفظ کو بے اضافت بولتے ہیں۔ فارسی عربی کے جتنے لفظ ذو وجہین ہیں ان میں محاورۂ اردو کا اتباع کرنا ضرور ہے۔ ورنہ مخل فصاحت ہوگا۔

(مؤلف) مولانا کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اردو میں پیہم بلا اضافت ہی مستعمل ہے۔ بلکہ دونوں طرح ہے سند کے لئے مومن کا یہ شعر کافی سمجھنا چاہئے۔

کیا دوا اسے ہو تری رنجش ہر دم کا علاج — چارہ گر کیوں مجھے رنج پیہم دیتے ہیں

ذو وجہین الفاظ کو یقیناً اردو کے محاورے کے مطابق لکھنا چاہئے۔ مگر کوئی شخص احیاناً اگر خلاف محاورۂ اردو صرف صحت لفظ کو مدنظر رکھ کر دوسرے طور پر لے تو اس کو مخل فصاحت کہنا زیادتی ہے

غالب ؎ — لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب — جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

اعتراض۔ تعجب یہ ہے کہ غالب سا شخص لکھنؤ سے شہر میں آئے اور کچھ اس کا ذکر کسی سے وہاں سننے میں نہ آئے کہ کب آئے۔ اور کہاں آئے، اور کیا ہوا۔

(مؤلف) معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو مرزا کے لکھنؤ آنے میں شک ہے۔ اور اس کو صرف تصنع شاعرانہ سمجھا ہے۔ مگر مرزا کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ بھی ٹھیرے تھے۔

غالب ؎ — ہمیں پھر ان سے امید اور انھیں ہماری قدر — ہماری بات ہی پوچھیں نہ وو تو کیونکر ہو

اعتراض - بندش میں تعقید ہے - اور وہ کی (ہ) کو قافیہ کے لئے واؤ بنالیا ہے اس لئے کہ یہ (ہ) تلفظ میں نہیں ہے بلکہ اظہار حرکت ماقبل کے لئے ہے

(مؤلف) میرے نزدیک یہ ایجاد کہ وہ کی (ہ) کو واؤ بنالیا ہے مرزا ہی پر ختم نہیں ہے بلکہ اس وقت یہ عام بات تھی - ظفر کا مطلع دیکھئے :-

ع　ایسا نہ ہو یارب کہ نہ یہ آئے نہ وہ آئے　یا آئے اجل یا صنم عربدہ جو آئے

غالب ع　اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے　کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے

غالب ع　کی ہمنفسوں نے اثر گریہ میں تقریر　اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھکو ڈبو آئے

اعتراض - محاورہ یہ ہے کہ ہم کو اس امر میں کلام ہے یعنی ہم اسے نہیں مانتے - مصنف نے یہ تصرف کیا کہ کلام کی جگہ تقریر کہا - اور محاورہ میں تصرف کرنے سے وہ معنی باقی نہیں رہتے -

(مؤلف) غالب کے لفظ تقریر کا مطلب یہ ہے کہ میرے دوستوں نے میرے نالے کی بابت اوس سے تقریریں کیں کہ وہ یوں آپ کی فرقت میں روتا ہے یوں تڑپتا ہے - مگر مجھکو ڈبو دیا یعنی وہ سمجھ گیا کہ اتنا رونے پر بھی کچھ نہ کر سکا معلوم ہوا کہ اس کے رونے میں کوئی اثر نہیں ہے - مگر مولانا نے جو اعتراض کیا ہے اُس کا کوئی مطلب سمجھ میں نہیں آیا - خدا معلوم یہاں تقریر کے معنی کلام کے کیونکر پیدا ہوتے ہیں -

---

غالب

پھر کھُلا ہے در عدالت ناز　گرم بازار فوجداری ہے

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر　زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال　ایک فریاد آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب　اشکباری کا حکم جاری ہے

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا

آج پھر اوس کی روبکاری ہے

اعتراض - اس قطعہ میں عدالت و فوجداری و سرشتہ داری اور سوال دینا اور مقدمہ اور روبکاری یہ سب اصطلاحیں ابھی تک فصحاء کی زبان پر مکروہ ہیں کراہت کی وجہ یہ ہے کہ اہل زبان کی بنائی ہوئی یہ اصطلاحیں یہ نہیں - گو بمجبوری یہ لفظ سبھی کو بولنا پڑتے ہیں - لیکن ابھی تک ان کا قوام نہیں درست ہوا - اور زبان اُردو نے انھیں قبول نہیں کیا - اور اگر زبان میں انھیں داخل بھی سمجھو تو ان معنی خاص پر یہ سب لفظ ہندی ہیں - ترکیب فارسی

میں ان کا لانا صحیح نہ ہوگا۔ مثلاً عدالت دار القضا کے معنی پر۔ اور فوجداری احتساب کے معنی پر۔ اگر ہیں تو ہندی لفظ ہیں پھر در عدالت تازہ اور بازار فوجداری کہنا بہ ترکیب فارسی کیونکر درست ہوگا۔ آتش کے اس شعر پر اعتراض چلا آتا ہے۔

ع کسی کی محرم آب رواں کی یاد آئی   حباب کے جو برابر کوئی حباب آیا

یعنی گو لفظ محرم ہندی نہیں ہے۔ لیکن انگیا کے معنی پر ہندی ہے۔ پھر اسے اضافت فارسی کیوں دی۔ حالانکہ محرم کے لئے فارسی و عربی میں کوئی لفظ نہیں ہے شاما کچھ۔ ومجول اور وضع کے لباس ہیں کہ اس کی وضع میں اور محرم میں فرق ضرور ہے۔ اور محرم فصحا کا بنایا ہوا لفظ ہے۔ برخلاف عدالت اور فوجداری کے کہ ان کے معنی کے لئے دار القضا و احتساب موجود ہے۔ اور فصحا کے بنائے ہوئے یہ الفاظ نہیں ہیں۔ بلکہ یہ الفاظ ایسے حرف لوگوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ جو کہ جائداد معروقہ۔ اسامی مفرور مثل مقدمہ۔ جائداد متدعویہ وغیرہ بے تکلف لکھتے پڑھتے ہیں۔ دوسرے شعر میں مصنف نے زلف کو سر اور رشتہ کی مناسبت سے سررشتہ داری دی ہے۔ لیکن عامیانہ لہجہ کی بہ موجب رشتہ کا (رے) حذف کر دیا ہے۔ جس طرح فردوسی نے سپید دیو میں سے دیو کی دال کو حذف کر کے سپید یو باندھا ہے۔ مگر اس سے حکم کلی کسی نے نہیں نکالا ہے۔ سوال نالش کے معنے میں اور مقدمہ خصومت کے معنی میں ہندی لفظ ہیں ان کو بھی ترکیب فارسی میں کوئی باندھے تو غلط ہوگا۔

(مولف) اصل یہ ہے کہ مصنف نے اس غزل میں عوام کے الفاظ یا ہندیوں کی بنائی ہوئی فارسی کو عامیانہ انداز میں ادا کیا ہے ورنہ حقیقتاً یہ سب ہندیوں کی بنائی ہوئی فارسی ہے۔ اور اہل زبان کے نزدیک مقبول نہیں یا غالب کے زمانہ میں ان کا استعمال جائز ہو یا نہ ہو۔ مگر اب لوگوں کی طبیعت اس طرف مائل ہے کہ اردو کے الفاظ ہند اور فارسی کے الفاظ میں اضافت و ترکیب جائز ہونا چاہیئے۔ رہا سررشتہ داری والا اعتراض۔ وہ غلط ہے۔ سررشتہ سررختہ سے بنا اور پھر (رے) کی تخفیف کے ساتھ رواج پا گیا۔ ایران میں سررشتہ دار سر دفتر عدالت کو کہتے ہیں۔ چنانچہ فرہنگ جہانگیری وغیرہ نے یہی لکھا ہے۔ دوسرے وہ قاعدہ جو مولانا نے بیٹے ہم میر، مرعی لکھا ہے کہ ذو وجہین الفاظ کو محاورے کے طور پر لانا چاہیئے یہاں کیوں نظر انداز فرما دیا۔ اگر یہم کو بلا اضافت اس وجہ سے کہنا چاہیئے کہ محاورہ یونہی ہے تو کیا وجہ ہے کہ سررشتہ دار کو سررشتہ دار حسب محاورہ نہ کہا جائے۔ جب شاعر تمام لوازم تکرار اعتماد کا ذکر کرنا چاہے تو اس کے لئے یقینی سررشتہ کو سررشتہ دار ہی کہنا چاہیئے۔ مرزا پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ وہ سررشتہ اور سررشتہ کے فرق کو نہیں جانتے۔ اس واسطے کہ جہاں سررشتہ کی ضرورت تھی وہاں انہوں نے سررختہ ہی کہا ہے۔ جیسا کہ اس شعر میں

تمھیں نہیں ہے سر رشتۂ وفا کا خیال   ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہئے

اور یا یہ کہ ذو وجہین الفاظ کو دونوں طرح استعمال کرنے کے قایل تھے۔

غالب ؎

عشرت صحبت خوباں ہی غنیمت سمجھو نہوئی غالب اگر عمر طبیعی نہ سہی

اعتراض ۔ طبیعی کو طبیعت سے اسم منسوب بنالیا ہے۔ لیکن قاعدہ یہ ہے کہ فعیلۃ کے وزن پر جو لفظ ہو اس کا اسم منسوب فعلی ہوتا ہے۔ جیسے حنفیہ سے حنفی اسی طرح طبیعت سے طبعی مگر فارسی گو تو ان حرکات کو ثقیل سمجھ کر (ب) کو ساکن کر دیتے ہیں۔ غرضکہ طبیعی کو بہ نقل شعرائے لکھنؤ صحیح نہیں سمجھتے اس وجہ سے کہ نہ تو یہ مضاعف ہے جیسے حقیقی نہ اجوف ہے جیسے طویلی۔ پھر کیوں (ے) کو نہ گرائیں۔

(مؤلف) یہ قاعدہ کہ فعیلۃ کے وزن پر جو لفظ ہو اس کا اسم منسوب فعلی ہوتا ہے۔ صحیح ہے مگر جامع و مانع نہیں ہے بلکہ اس میں شواذ موجود ہیں۔ جیسے لبیبیت کہ نہ مضاعف ہے نہ اجوف مگر اس کا اسم منسوب لبیبی آتا ہے لہذا اس پر کوئی کلیہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرے یہ کہ مرزا غالب کا مذہب بھی یہ تھا کہ الفاظ ذو وجہین کو وہ دونوں صورتوں میں استعمال کرتے تھے جیسا کہ اس سے پہلے دو جگہ آپ دیکھ چکے۔

تیسرے یہ کہ تمام عربی کی کتابوں میں طبیعی اسم منسوب آتا ہے۔ تمام کتب فنون و کتب طبیہ اس کی شاہد ہیں چوتھے یہ کہ مولانا نے فرمایا ہے کہ بہ نقل شعرائے لکھنؤ یہ غلط ہے۔ مرزا غالب اہل لکھنؤ کے متبع نہ تھے نہ اون کو اتباع کی ضرورت تھی۔ وہ خود موجد طرز، اور محقق زبان تھے۔ معترض کا یہ سمجھنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ اون کو لکھنؤ کا اتباع کرنا چاہیے تھا۔ ہاں اہل دہلی کے وہ ہم نوا تھے اور اہل دہلی کے کلام میں یہ لفظ اسی طرح ملتا ہے۔ چنانچہ حکیم آغا جان عیش کا مشہور شعر ہے ؎

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

خود مرزا نے دوسری جگہ فارسی میں کہا ہے ؎

ہر بوالہوس بادہ طبیعی است کہ غالب بپیمانہ جمشید رساند نسیم را

پانچویں یہ کہ اگر کہا جائے کہ طبعی منسوب ہے طبع کی طرف۔ اور طبیعی منسوب ہے طبیعت کی طرف تو تمام اعتراضات رفع ہو جاتے ہیں۔ طبع اور طبیعت میں بڑا فرق ہے چنانچہ طبع کے متعلق اہل لغت کا قول ہے۔ الطبع بالفتح هي الحالة التي عليها طبع الانسان وكذا الطباع بالكسر والطبائع الاربع هي الحرارة والبرودة والرطوبة واليبوسة ويطلق على الاركان والاخلاط۔

مطلب یہ ہے کہ طبع (بالفتح) اوس حالت کو کہتے ہیں جس پر انسان کی طبیعت ہے اور اسی طرح طباع

بالکسر۔ الخ اب طبیعت کی تعریف ملاحظہ ہو۔

الطبیعۃ قال بقراط ھی القوۃ المدبرۃ لبدن الانسان من غیر ارادۃ ولا شعور وھی مبدأ کل حرکۃ وسکون وقد یطلق اسم الطبیعۃ علی یبس البطن ولینہ۔ وقال افلاطون الطبیعۃ قوۃ الٰہیۃ موکلۃ بمصالح البدن۔ قال العلامۃ اسم الطبیعۃ یقال فی عرف الطب علی اربعۃ معانٍ۔ احدھا علی مزاج الخاص بالبدن۔ وثانیھا علی الھیئۃ الترکیبیۃ وثالثھا علی القوۃ المدبرۃ للبدن ورابعھا علی حرکۃ النفس۔ والاطباء ینسبون جمیع احوال البدن الی الطبیعۃ المدبرۃ للبدن والفلاسفۃ ینسبون ذالک الی النفس ویسمون ھذہ الطبیعۃ قوۃ جسمانیۃ (بحرالجواہر)

جب یہ بات صاف ہوگئی کہ طبع اور طبیعت کے معانی میں اختلاف ہے تو پھر طبعی اور طبیعی کے معنی میں کیوں نہ فرق کیا جائے۔

غالب ؎ نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

اعتراض۔ (میرا) اس شعر میں بے ضرورت اور بیکار ہے۔ اس لفظ کی جگہ (پہلے) کا لفظ ہوتا تو (اب) کے ساتھ مقابلہ کا حسن شعر میں زیادہ ہو جاتا۔ اور مصنف کو یہاں مقابلہ ہی مقصود ہے۔ یعنی پہلے وہ زور وشور تھا کہ نالہ عرش تک جاتا تھا اور اب یہ ضعف وناتوانی ہے کہ بہ مشکل لب تک آتا ہے۔

(مؤلف) یہ اعتراض بھی نہایت کمزور ہے۔ اس لئے کہ اگر (میرا) نہ کہا جاتا تو تعمیم ہو جاتی۔ اور لفظ (میرا) نے جو مصنف کی ذات کی تخصیص کی ہے وہ باقی نہ رہتی۔ اور اس سے شعر بیکار ہو جاتا۔ خدا معلوم کس کا نالہ تھا۔ اور اب کس کے لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے۔

غالب ؎ بیخودی بستر تمہید فراغت ہو جو پُر ہے سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھسے

اعتراض۔ (ہو جیو) خود ہی واہیات لفظ ہے مصنف مرحوم نے اوس پر اور طرّہ کیا کہ تخفیف کرکے (ہو جو) بنایا۔

(مؤلف) ایک جگہ مولانا ہو جیو کے لفظ کو پہلے بھی واہیات بتا چکے ہیں۔ معلوم نہیں کہ کس بنا پر اس کو واہیات بتایا گیا۔ رہا تخفیف کا مسئلہ گو اس کو میں مستحسن نہیں سمجھتا۔ مگر کیا کیا جائے۔ غالب کے زمانہ سے کر اس وقت تک اس قسم کے الفاظ بہ تخفیف (یا) مستعمل ہوتے ہیں تقریر میں تو خیر (ی) قدرتی طور پر اُڑ ہی جاتی ہے۔ لوگوں نے تحریر میں بھی اس (ی) کو حذف کیا ہے سب سے پہلے مونس کے اس بند کو دیکھئے۔ ؎

دیکھو نہ سرکشوں کو اماں اے دلاورو　　اعدا سے چھین لیجو نشاں اے دلاورو

جیتے نہ پھر لو صدقے ہو ماں اے دلاورو　　جانوں پہ کھیل جائیو ہاں اے دلاورو

میری تمھیں میں جان ہے گو بے حواس ہوں

تم ہو کے دیکھ لو کہ میں برچھے کے پاس ہوں

موجودہ دور کے مشہور شاعر دلگیر یار ہروی کا یہ شعر دیکھئے اس میں بھی تخفیف یا کے اسی قسم کا لفظ مستعمل ہوا ہے:

مجھ سے کہتے ہیں کہ تو حشر میں یہ کہیو　　میرا دعویٰ ہے کسی پر نہ کوئی قاتل ہے

اسی طرح قدما کے یہاں اگر ڈھونڈھنے کی زحمت کو برداشت کیا جائے تو میرے خیال میں ہزاروں جگہ اس قسم کے الفاظ ملیں گے۔ جو مولانا کے نزدیک متروک ہیں

غالب ؎　جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے　　جاں کالبدِ صورت دیوار میں آوے

اعتراض۔ گفتار میں آنا، بات چیت کرنے کے معنے پر اُردو کا محاورہ نہیں ہے ترجمہ ہے۔

(مؤلف) یہ اعتراض کوئی اہم اعتراض نہیں ہے۔ اُردو میں فارسی کے بے شمار الفاظ کا ترجمہ ہوا ہے اور پھر وہ الفاظ اسی طرح محاورہ ہو گئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ گفتار میں آنا محاورۂ اردو نہیں ہے۔ مگر شعرا کے یہاں مقبول ہے۔ چنانچہ مرزا غالب ہی اس محاورہ کو دوسری جگہ یوں استعمال کرتے ہیں ؎

اس چشم فسونگر کا اگر پائے اشارہ　　طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آئے

دوسرے یہ کہ اگر ایسی جگہ بجائے گفتار میں آنے کے بات چیت کرنا کہا جائے تو شعر کا وزن کم ہو جائے گا۔ اور مضمون بالکل سبک معلوم ہو گا

غالب ؎　جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہو گا　　کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

اعتراض۔ مولانا نظم نے دوسروں کی زبان سے یہ کہکر اعتراض کیا ہے کہ لوگ اس شعر کو سنکر یہ کہیں گے کہ۔ کیا مرغی ہے جو راکھ کرید رہی ہے؟

(مؤلف) اگر یہی سلیم المذاقی ہے تو سبحان اللہ، کہیں خاک اُڑانا دیکھیں گے تو کہیں گے کہ کیا کوئی بھیڑیا ہے جو خاک اُڑا رہا ہے گا۔ اور قشقہ کھینچنا دیکھیں گے تو کہیں گے کہ کیا کوئی برہمن ہے جو قشقہ کھینچے گا۔ میرے خیال میں تو شاید بہت کم ایسے مضامین شاعرانہ ہوں گے۔ جن پر کوئی اعتراض نہ پڑتا ہو لہٰذا یہ اعتراض فضول ہے۔

ظفر نے بھی اس لفظ کو ایک شعر میں استعمال کیا ہے۔ ؎

خاک میں میرے دبی ہے آتشِ عشق اے ظفر
گر نہ ہو باور تو کھد واس ستمگر سے کریٔد

غالب ؎ دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

اعتراض۔ مطلب یہ ہے کہ میری آنکھوں نے کیا کیا۔ میرے طائرِ دل کو پھنسایا ہے۔ شاید عشاق کی آنکھیں بھی تمہارے جال کے حلقے ہیں۔ یہ مطلب بہ مشکل ان الفاظ سے نکلتا ہے

(مؤلف) یہ اعتراض فضول ہے مطلب بالکل صاف ہے۔ ثبوت میں خود مولانا نظم ہی کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ کہ انھوں نے اس شعر کے معنی سمجھے اور بیان کئے۔

غالب ؎ نکتہ چیں ہے غمِ دل اوسکو سنائے نہ بنے کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

اعتراض۔ اس مطلع کے قافئے سنانا اور بنانا میں ایطا ہے۔ اس وجہ سے کہ دونوں لفظوں میں الف زاید ایک ہی طرح کا ہے۔ یعنی معنیٔ تعدیہ کے لئے۔ اور ساری غزل میں ستائے نہ بنے اور آئے نہ بنے اور بلائے نہ بنے کے سوائے سب قافئے شایگاں ہیں۔ یعنی سب میں الف تعدیہ ہے۔ حاصل یہ کہ ساری غزل بھر میں چار ہی قافئے ہیں جن میں ایک شائگاں ہے جو سات جگہ بندھا ہے۔

(مؤلف) جواب و فیصلہ سے پہلے مجھے یہ امر زیادہ مستحسن معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے وہ خیالات قلمبند کردوں جو وہ ایطا کے متعلق رکھتے ہیں۔ اور جو انھوں نے صاحب عالم مارہروی کو لکھے تھے۔

" قافیہ شائگاں جس کو عرب ایطا کہتا ہے وہ دو طرح پر ہے۔ خفی و جلی۔ اہل خرد نے خاک اڑائی ہے۔ اور بات بنائی ہے۔ خفی و جلی کی تعریف میں وہ کچھ لکھا ہے کہ صاحب طبع سلیم کبھی اُس کو نہ سمجھے چہ جائے آنکہ مانے۔ اصل یہ ہے ایطا، وہ قافیہ ہے کہ جو دو حرف ایک معنی کے ہوں جیسے الف فاعل گویا و بینا۔ و شنوا۔ شعر اسیر ؎

اے دانہ تسبیح خیالت دل دانا سر حلقۂ مستاں رخت دیدۂ بینا

اور دن دال مضارع کا جیسا اُڑنا دیکھنا اس مطلع میں ہے ؎

دل شیشہ نہ پنہاں تو ہر گوشہ بر نشش مستانہ مست مبادا کہ بنا گہ شکنندش

اور ایسا ہی الف نون جمع کا۔ مثلاً چراغاں۔ و جوانان۔ اور ایسا ہی الف نون حالیہ مانند گریاں و خنداں۔ پس۔ اگر یہ مطلع میں آپڑے تو ایطائے جلی ہے۔ اگر غزل یا قصیدہ میں بطریق تکرار قافیہ آپڑے تو ایطائے خفی ہے۔ آئمۂ فن نے وہ کچھ لکھا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر قائل تحقیق ہو تو میرے بیان پر غور کرو۔ اور جو عبدالواسع اور غیاث الدین

اور عبد الرزاق ان ناموں کی شوکت نظر میں ہے تو تم جانو۔
اس کے علاوہ ایک جگہ مرزا تفتہ کو بھی ایطا کے متعلق یہ لکھا ہے :۔

"حضرت اس غزل میں پروانہ۔ پیمانہ۔ بتخانہ۔ تین قافیے اصلی ہیں۔ دیوانہ چونکہ علم قرار پا کر ایک لغت جداگانہ مشخص ہو گیا ہے اس کو بھی اصلی سمجھ لیجئے۔ باقی غلامانہ و مستانہ و مردانہ۔ ترکانہ و دلیرانہ و شکرانہ سب ناجائز و نامستحسن ایطا۔ اور ایطا بھی قبیح۔ مجھے بہت تعجب ہے کہ انھیں قافیوں میں ایطا کا حال تم کو لکھ چکا ہوں۔ اور پھر تم نے غزل میں انھیں قوافی پر رکھی۔ کاشانہ و شانہ و افسانہ و جانانہ و فرزانہ یہ قافیے کیوں ترک کئے۔ یاد رہے ساری غزل میں مردانہ یا مستانہ یا اُن کے نظایر میں سے ایک جگہ آوے۔ دوسرے بیت میں زنہار نہ آوے۔ یہ غزل نظری ہو گئی اور غزل لکھ کر بھیجو تا اصلاح دی جائے۔" ان تحریروں کو دیکھتے ہوئے مرزا غالب کا یہ عقیدہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زوائد کے اُڑانے کے بعد قافیہ کو دیکھتے ہیں اور اس حالت میں اگر ہم قافیہ پاتے ہیں تو صحیح ورنہ غلط سمجھتے ہیں۔ اس صورت میں الف لفہ یہ کو اُڑانے کے بعد ماسوا ان قافیوں کے جنھیں نظم صاحب نے مستثنے کر دیا ہے سب میں ایطاء ہے۔ اگر چہ فی زمانا لوگ اس کو نہیں مانتے اور سوائے ایطا رجلی کے ایطائے خفی کو نہیں مانتے۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ رہا متعدی قوافی کا حال ان میں ایطا کی علت بہت ہی بری معلوم ہوتی ہے۔ اور میں خود بھی اس کا قائل نہیں۔

غالب ؎ ہم شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک آبگینہ کوہ پر عرض گرانجانی کرے

اعتراض۔ لفظ شکستن نے شعر کو کھٹکنا کر دیا۔ ترکیب اردو میں فارسی کے اور الفاظ لے لیتے ہیں۔ لیکن فارسی مصدر کا استعمال سب نے مکروہ سمجھا ہے۔ اور مصنف مرحوم کے سوا اور کسی کے کلام میں نظم ہو یا نثر ایسا نہیں دیکھا۔

(مؤلف) میرے خیال میں یہ اعتراض غلط ہے یہ میں نہیں کہتا کہ مصدر کا استعمال اس صورت سے مستحسن ہے مگر یہ مجھے معلوم ہے کہ غالب کے معاصر شعراء اور غالب سے پہلے لوگ اشعار میں مصدر کا استعمال اس طرح کرتے تھے کہ بجائے عیب کے وہ ایک ہنر معلوم ہوتا تھا۔ دو تین شعر مجھ بھی یاد ہیں سند اً پیش کرتا ہوں ؎

میر — دل کے طپیدن روز و شب نے اپنا کام تمام کیا

میر حسن ؎ — دل یہ کرتے لگا طپیدن تانہ — رنگ چہرے سے کر گیا پروانہ

حکیم مومن خاں مثنوی پنجم میں فرماتے ہیں ؎

لاگ لب کو وا شدن سے لگ گئی — چُپ ترے ترک سخن سے لگ گئی

خود مرزا غالب اگر چوک جاتے تو شاید دوسری جگہ نہ کہتے مگر اون کے یہاں مختلف جگہ مصدر کا استعمال آزادی
سے ہے۔ غالب ؎

ع۔ یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا
ع۔ تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

غالب ؎ بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

اعتراض۔ پہلے مصرع میں چار اضافتیں پے در پے اور دوسرے میں تین ہیں اردو میں اضافت خود ہی ثقل رکھتی ہے نہ کہ اتنی اضافتیں متوالی۔ تین اضافتوں سے زیادہ ہونا عیب ہے۔

(مؤلف) معترض کا اعتراض صحیح ہے۔ مگر یہ خیال رہنا چاہیئے کہ اضافتوں کا عیب ہونا یا نہ ہونا منحصر ہے سستی اور چستی بندش پر۔ اور مرزا کے یہاں بندش نہایت چست ہے اس لئے اضافتیں بجائے عیب ہونے کے حسن معلوم ہوتی ہیں۔ ہاں جہاں اضافتیں کانوں کو بری معلوم ہوں وہاں یقیناً توالیٔ اضافت عیب ہے۔ مگر غلط نہیں۔ اسکی مثالیں ہر جا مل سکتی ہیں۔

غالب ؎ کہا ہو کس نے کہ غالب برا نہیں لیکن سوائے اسکے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہئے

اعتراض۔ سوا عربی لفظ ہے۔ اور الف مقصورہ رکھتا ہے اسلئے اضافت کیلئے التیہ فارسی والے ہمیں (ے) بڑھاتے ہیں اور اردو میں لفظ سوا اور مع عامیانہ محاورے میں اکثر بہ اضافت بولتے ہیں۔ اور پھر مضاف الیہ میں (کے) بھی لگاتے ہیں۔ کہتے ہیں "سوائے خدا کے کون ہے" اور "مع عیال کے روانہ ہوا۔ مصنف مرحوم نے یہاں عام محاورے کے موافق لفظ سوا کو اضافت دی ہے اور پھر ہندی لفظ کی طرف اضافت دی ہے اور مضاف الیہ میں (کے) بھی لگایا ہے۔ اسی طرح ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتکڑیوں کے بھاگا اور اپنے نام کا خط مع ان اشعار کے یوسف علی کے حوالہ کیا"

(مؤلف) معترض کا اعتراض قاعدہ کی رُو سے صحیح ہے۔ مگر یہ صورت غلط العام کی ہو گئی ہے۔ آج ہندوستان میں قریب قریب سب اسی طرح بولتے ہیں جیسا کہ مرزا نے لکھا ہے۔

غالب ؎ طبع ہے مشتاقِ لذتہائے حسرت کیا کروں آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

اعتراض۔ اس شعر میں مطلب کی جگہ مطلوب چاہیئے۔ یہ دونوں لفظ اردو کے محاورے میں اس طرح بولتے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگار

رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ تک شائع ہوتا ہے
رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ قیمتاً روانہ ہوگا
سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سہ)
بیرون ہند سے آٹھ روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

شمارہ ۶	فہرست مضامین جون ۴۳ء	جلد ۲۳

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۳	جون ۱۹۳۳ء	شمار ۶

ملاحظات

ایک قوم کی تباہی کا راز اس کی قدامت پرستی ہے

"کسی زمانہ میں ایک بزرگ تھے جو دریا کی سطح پر مصلا بچھا لیتے تھے اور اس پر نماز پڑھتے ہوئے پانی کو عبور کر جاتے تھے"

"کوئی ولی اللہ کسی طرف سے گزر رہے تھے کہ ایک کنویں پر انھوں نے آدمیوں کا ہجوم دیکھا، دریافت سے معلوم ہوا کہ ایک بھینس اندر گر گئی ہے اور لوگ اس کے نکالنے کی فکر میں ہیں۔ انھوں نے کنویں میں ہاتھ لٹکا کر جو باہر نکالا تو لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ بھینس باہر کھڑی ہوئی ہے"

"کسی زمانہ میں ایک صاحب کرامت درویش کثرت ریاضت سے اسقدر "لطیف" ہو گئے تھے کہ تیکا اُن کے جسم کے آر پار ہو جاتا تھا اور ان کا بدن حائل نہ ہوتا تھا"

"تذکرۃ الاولیاء" قسم کی کتابیں اٹھا کر دیکھئے تو ہزاروں واقعات آپ کو اس سے زیادہ حیرت انگیز نظر آئیں گے۔ لیکن آپنے

اس پر بھی غور کیا ہے کیا واقعی کسی وقت ہمارے یہاں کے اکابر مذہب و تصوف سے اس قسم کی محیرالعقول باتیں ظاہر ہوتی تھیں اور اگر یہ صحیح ہے تو اس کا کیا سبب تھا اور کس فائدہ و نتیجہ کے لئے تھا اور اب اس "کشف و کرامات" کے لوگ کیوں نظر نہیں آتے؟

آپ کسی شخص سے جو ان باتوں کی صحت کا قائل ہے یہ سوال کریں گے تو وہ نہایت ہی غم آلود و حسرتناک چہرہ بنا کر کہے گا کہ "یہ اگلے لوگوں کی باتیں ہیں جو انھیں کے ساتھ گئیں، نہ اب وہ ریاضتیں ہیں نہ عبادتیں، نہ وہ روحانیت ہے نہ صداقت، نہ وہ ایمان ہے نہ وہ یقین" پھر آپ اس سے پوچھئے کہ اب ایسا کیوں نہیں ہے، کیا مسلمان دنیا میں نہیں رہے، کیا عبادت کا اصول بدل گیا، کیا اصول اخلاق و روحانیت میں کوئی تغیر پیدا ہو گیا، تو وہ اس کے جواب میں سوائے اس کے کہ اپنی کمبختی کا رونا رو دے، خدا کی مرضی پر محمول کرے یا کلجگ کی خرابی بتا کر خاموش ہو رہے اور کچھ نہ کہے گا ——— اکثر و بیشتر میرے پاس ایسے حضرات کرم فرماتے رہتے ہیں جو میرے کفر و الحاد میں میرے ساتھ ہمدردی رکھتے ہوئے مجھے راہ راست پر لانے کی سعی فرماتے ہیں چنانچہ چند دن ہوئے ایک صاحب میرے پاس تشریف لائے اور اس عزم کے ساتھ کہ وہ مجھ بیدین کو بغیر مسلمان بنائے ہوئے نہ اٹھیں گے، میں ان کی مقطع صورت ان کی شرعی وضع، اور ان کے ہنگامہ خیز "السلام علیکم" سے چونک کر پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ آج پھر کوئی "خداوند" اپنے "ناچیز بندہ" کو سعادت جلوہ بخشنے کے لئے آیا ہے، اس لئے تعظیماً و احتراماً اٹھ بیٹھا، صدر میں جگہ دی، اور مؤدب ہو کر خاموش بیٹھ گیا۔ پہلے تو وہ بڑی دیر تک نہایت غور سے میری صورت و وضع کو دیکھتے رہے اور پھر ایک نہ چھپ سکنے والی خشونت کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ "میں نے سنا ہے کہ تم معجزہ و کرامت کے قائل نہیں"، ——— میں نے عرض کیا کہ "یہ تو آپ نے غلط سنا ہے کیونکہ کل ہی میں کارنوال میں وان نارمن کا معجزہ دیکھ چکا ہوں جو ۱۰۰ فٹ کی بلندی سے ۲۰ فٹ کی جست لگاتا ہوا آگ کے شعلوں کے اندر غائب ہو جاتا ہے، علاوہ اس کے یہاں کے پروفیسر معشوق علی کی کرامتیں بارہا دیکھ چکا ہوں جو ایک رومال سے درجنوں رومال اور ایک روپیہ سے سیکڑوں روپے آن کی آن میں بنا دیتے ہیں"

یہ سنتے ہی اُن کا چہرہ سرخ ہو گیا اور برہم ہو کر بولے۔ "تو کیا رسولوں کے معجزے اور اولیاء کی کرامات بھی کوئی شعبدہ بازی تھی"

میں نے کہا "مجھے اس کا علم نہیں، لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ میرے لئے تو ان لوگوں کے یہ تماشے بھی معجزے ہی کا حکم رکھتے ہیں، کیونکہ میں ویسا کرنے سے عاجز ہوں" ——— فرمایا ——— "مشق سے ہر شخص ایسا کر سکتا ہے" ——— میں نے کہا کہ ——— "ایک منکر مذہب معجزوں کے متعلق بھی یہی کہہ سکتا ہے" ——— بولے ——— "مگر اس کا یہ کہنا تو غلط ہوگا کیونکہ وہاں مشق و اکتساب کا کوئی سوال نہ تھا۔ اور معجزہ اصطلاح میں کہتے ہی اس کو ہیں جو ایک نبی سے بغیر کسی مشق و اکتساب کے سرزد ہو" ——— میں نے کہا "بجا ارشاد ہوا، لیکن اگر آجکل کے شعبدے دکھانے والے بھی

یہی دعوے کر بیٹھیں کہ جو کچھ وہ دکھاتے ہیں اس کا تعلق مشق و اکتساب سے نہیں ہے تو آپ کیا فرمائیں گے" کہنے لگے ــــ "ہم اسے جھوٹا کہیں گے اور سیکڑوں مثالیں ایسی بتا دیں گے کہ مشق سے لوگ ویسا کرنے میں کامیاب ہو گئے" میں نے کہا ــــ "یہ درست ہے، لیکن نتیجہ کے لحاظ سے شعبدہ و معجزہ میں کوئی فرق مجھے نظر نہیں آتا، سوائے اس کے کہ ایک شخص کسی وہبی قوت کی وجہ سے اس کے ظہور کا مدعی ہے اور دوسرا مشق و اکتساب سے ــــ اس سے اخلاق انسانی کو کیا فائدہ پہونچتا ہے" ــــ بولے ــــ "معجزہ تو صرف اس لئے ہے کہ نبی کو نبی مانیں اور اس کے کہنے پر عمل کریں" ــــ میں نے کہا ــــ "تو خلاصہ یہ ہوا کہ نبی وہ ہے جس سے معجزہ سرزد ہو اور معجزہ وہ ہے جو نبی سے ظاہر ہو" ــــ کہنے لگے ــ "بیشک"

ظاہر ہے کہ جس جماعت کے رہنما و قاید اس عقیدۂ و خیال کے ہوں گے، وہ کیوں نہ اعجوبہ پرست ہوگی اور اس کا یہ عقیدہ کہ "اسلاف" کے سے صاحبان علم و عزیمت، حاملان فضل و کرامت اب نہیں پیدا ہو سکتے"، اس کو کس درجہ مایوس اور ناکارہ نہ بنا دے گا۔ اس میں شک نہیں کہ "عہد ماضی" میں انسان کے لئے بہت کچھ دلچسپیاں ہوا کرتی ہیں اور گزرے ہوئے واقعات بعض دماغوں کے لئے ایک "طلسم زار" کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں، لیکن اس کا تعلق صرف ہمارے جذبات محبت و عقیدت سے ہے۔ جو انسان کے عہد وحشت سے وراثتاً منتقل ہوتے چلے آئے ہیں اور اب ہم ان کو ایک "حقیقت و واقعہ" سمجھنے لگے ہیں

ادارۂ مذہب کے قیام کی تاریخ کا اگر آپ مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بنیاد ہمیشہ کسی ایک مخصوص ہستی کے ساتھ جذبۂ خوف و احترام یا محبت و عقیدت پر قائم ہوئی اور اس ہستی کے اٹھ جانے کے بعد انسان نے اپنی عقیدت و ارادت کو وسیع و مستحکم بنانے کے لئے بہت سی ایسی باتیں اپنی طرف سے اضافہ کر کے بیان کرنا شروع کیں جو لوگوں کو مرعوب یا راغب کرنے والی تھیں۔ چنانچہ انبیاء کے معجزے، اولیاء کے کرامات، درویشوں کے خوارق عادات سب اسی قبیل کی چیزیں ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ صرف ہمارے ہی ارادتمندانہ جذبات یا مصالح تبلیغ کی پیداوار ہیں۔ پھر جس طرح سو سال پیشتر کے کسی بزرگ کے حالات میں اس وقت ایک معتدبہ اضافہ اس کے کرامات کا نظر آتا ہے، اسی طرح آج کسی بزرگ کے متعلق بھی سو سال بعد ایسی ہی روایتیں منسوب کر دی جائیں گی، اور جس طرح چار قرن پہلے کی پختہ قبر آج کسی نہ کسی بزرگ کا مزار بن گئی ہے، اسی طرح نصف صدی بعد آج کی بنی ہوئی قبر پر بھی پھولوں کی چادر کا چڑھایا جانا مستبعد نہیں، اگر جہل و واہمہ پرستی کا یہی عالم رہا

ہمارے اسلاف نے اپنے عہد میں جو کچھ کیا وہ اس میں شک نہیں کہ لائق صد ہزار آفرین و ستائش ہے، لیکن یہ کہنا کہ جو کچھ وہ کر گئے ہیں، اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں اور جو کچھ وہ کہہ گئے ہیں۔ اس کو بلا چون و چرا آنکھ بند کر کے تسلیم کر لینا چاہیئے، حد درجہ مضر تعلیم ہے اور ایک قوم کی دماغی و ذہنی ترقی کو خاک میں ملا دینے والی ہے

آئیے اپنے بعض اسلاف کی علمی تحقیق اور ذہنی ترقی کا ایک لطیفہ سُن لیجئے:-

علامۂ قزوینی اور علامۂ دمیری سے غالباً ہر وہ شخص واقف ہو گا جس نے تاریخ کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے علامۂ قزوینی وہی ہیں جنھوں نے "تاریخ گزیدہ" مرتب کی، ظفر نامہ لکھا اور نزہۃ القلوب تصنیف فرمائی یہ حُر بن یزید کی اولاد میں سے تھے جنکو میدان کربلا میں سید الشہداء کے ہمرکاب جہاد کی سعادت حاصل ہوئی تھی اور مذہباً شیعہ تھے۔ علامۂ دمیری آٹھویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ، محدّث و مفسّر تھے، جامع ازہر قاہرہ میں فلسفہ و ادب کے لکچرار تھے، خاص سرزمین مکہ میں سلسلۂ درس و تدریس جاری رکھتے تھے، صاحب کرامات بھی مانے جاتے تھے اور منجملہ خطبات و دیگر کتب کے ایک مشہور کتاب حیات الحیوان کے بھی مصنف تھے الغرض یہ دونوں ایسے صاحب فضل و کمال تھے کہ آج کوئی مولوی و عالم ان کے مرتبہ تک پہونچنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ لیکن ان کی تحقیق انیق اور ان کی پختگی ذہن کا کیا عالم تھا۔ حیاۃ الحیوان لے کر اسکول کے کسی طالب العلم کو دیدیجئے اور فیصلہ اسی پر چھوڑ دیجئے —— مثالاً ان حضرات کی کاوش علمی کا ایک ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ عقاب کی تحقیق کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:-

"جب عقاب (چیل) سال خوردہ ہو جاتی ہے اور بینائی کھو بیٹھتی ہے تو وہ فضا میں بلند ہوتی ہے اور اس حد تک اوپر اُڑ کر چلی جاتی ہے کہ اس کے پر تمازت آفتاب سے جل جاتے ہیں، اس کے بعد وہ نیچے گرتی ہے اور ایک شور و تلخ پانی کے کنویں میں غوطہ لگا کر از سر نو جوان ہو جاتی ہے

(قزوینی)

جب چیل ضعیف و کمزور ہو کر اندھی ہو جاتی ہے تو اس کے بچے اس کو چاروں طرف لادے پھرتے ہیں، یہاں تک کہ ہندوستان کے ایک چشمہ تک پہونچتے ہیں اور اس میں غوطہ لگاتے ہیں۔ اس کے اثر سے چیل کی بینائی عود کر آتی ہے اور وہ از سر نو جوان ہو کر اپنی شکاری زندگی شروع کر دیتی ہے

کرگس، چیل کے انڈے سے پیدا ہوتا ہے اور چیل کرگس کے انڈے سے۔ تمام چیلیں مادہ ہیں اور دوسری چڑیوں سے جفتی کھاتی ہیں۔ یہ صرف تین انڈے دیتی ہیں۔ لیکن تیسرے انڈے کو پھینک دیتی ہیں اور صرف دو سیتی ہیں، تیسرے انڈے کو ایک اور طائر جس کا نام کاسر العظام (ہڈی توڑ) ہے اٹھا لاتا ہے اور اس سے بچہ نکالتا ہے

چیل، ہندوستان سے ایک پتھر لے آتی ہے اور گھونسلے میں رکھ دیتی ہے۔ تاکہ انڈا دینے میں آسانی ہو۔ یہ پتھر کھوکھلا ہوتا ہے جس کے اندر ایک اور پتھر ہوتا ہے یہ پتھر عورتوں کے وضع حمل میں بھی آسانی پیدا کر دیتا ہے

(دمیری)

غالباً یہ کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ عقاب کے متعلق جو کچھ ان محققین نے لکھا ہے وہ صرف نقل ہے قدیم یونانی روایات کی جو

عہد قدیم سے اُن کے یہاں رائج چلی آرہی تھیں۔ پھر جب آٹھویں صدی ہجری تک ہمارے یہاں کے مورخین ومصنفین کی تحقیق کا یہ عالم تھا کہ وہ روایات قدیمہ سے ایک انچ ہٹ کر خود اپنے ذہن وعقل سے کام لینا گناہ سمجھتے تھے تو ظاہر ہے کہ اس سے قبل اور کیا عالم رہا ہوگا اور ان کے علمی کارناموں کی زمانۂ موجودہ میں کیا وقعت ہوسکتی ہے یقیناً ان لوگوں پر کوئی الزام نہیں، کیونکہ جو کچھ انھوں نے کیا وہ ان کی بساط عقل کے لحاظ سے بالکل درست تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ تفتیش وتحقیق نے غیر معمولی وسعت اختیار کرلی ہے، کیوں کسی کو اس امر کے ماننے پر مجبور کیا جائے کہ اسلاف جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ بالکل ٹھیک ہے اور ہم انھیں کا اتباع کرکے ترقی حاصل کرسکتے ہیں

یہی وہ قدامت پرستی ہے جو اس سے قبل خدا جانے کتنی قوموں کو تباہ وبرباد کرچکی اور اب مسلمانوں کی جماعت اس کا شکار بنی ہوئی ہے —— اعجوبہ پرستی کا دور گزر گیا، یہ دور ہے صرف تجربہ ومشاہدہ کا، اس لئے اب نہ معجزہ وکرامات پر محض اس لئے یقین کیا جاسکتا ہے کہ قدیم کتابوں میں ایسا لکھا ہوا ہے اور نہ صرف خوارق عادات کی بنا پر کسی کی عظمت وبزرگی ثابت کی جاسکتی ہے، کیونکہ جب تک "طبیعیات" کی دنیا تک انسان کا دسترس نہ تھا کسی کا دس فٹ بلند جست کرلینا بھی معجزہ کہلایا جاسکتا تھا، لیکن اب کہ طیاروں اور ہوائیوں کے ذریعہ سے ہمدوش ثریا ہوجانا بھی مستبعد نہیں، اولیاء کرام کے خوارق عادات کو اُن کی بزرگی کے ثبوت میں پیش کرنا صرف یہی معنی رکھتا ہے کہ آج ہم یوروپ کے ایک ایک موجد ومخترع کو صاحب کرامات یقین کرنے پر مجبور ہیں

کسقدر افسوسناک امر ہے کہ اس وقت بھی جب تمام دنیا میں علم کا اجالا پھیل گیا ہے اور انسان حقیقی معنی "خلافت الٰہی" کے دور سے قریب تر ہوا جا رہا ہے، ہم بدستور اسی زمانہ میں ہیں جب بقول قزوینی ودمیری چیل کے گھونسلے میں پارس پتھر پایا جاتا تھا اور مستقبل کی امیدیں صرف نزول مسیح اور ظہور مہدی موعود سے وابستہ کئے ہوئے ہیں

کاش ہم سمجھ سکتے کہ اس وقت دنیا کو حاجت نہ مہدی کی ہے نہ مسیح کی بلکہ ضرورت ہے اڈیسن ومارکونی کی، رامان اور بوس کی کیونکہ انسان اب معجزہ وکرامات کی حد سے گزر کر عالم جدوجہد کی اس منزل تک پہونچ گیا ہے جہاں خود اس میں "جذبۂ الوہیت" پیدا ہوتا نظر آرہا ہے اور "انسانیت کبریٰ" کا مشاہدہ ایک ایسی حقیقت ذاتی کا احساس اس کے اندر پیدا کر رہا ہے جس کو اگر ہم چاہیں تو معرفت ربانی سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں اور قرب الٰہی سے بھی ——

اس لئے اگر تم قدامت پرستی کی لعنت سے آزاد ہونا چاہتے ہو تو اپنے آپ کو احمق وجاہل نہ سمجھو بلکہ

ہوش گوش والا انسان باور کرکے ہر بات کے سمجھنے کی کوشش کرو، اپنے ذہن و دماغ کو تواسیں قدرت کی گتھیاں سلجھانے کا اہل بناؤ اور پرستش اسلاف کو ترک کردو کہ اس سے زیادہ سنگ گراں ترقی کی راہ میں اور کوئی نہیں ہوسکتا اسی کے ساتھ اپنی اولاد کی تربیت و تعلیم میں بھی اس کا لحاظ رکھو کہ اُن کی عقلی آزادی نمو نہ ہونے پائے اور دوسروں کی روشنی میں مطالعۂ اشیاء کی عادت اُن کی "حریت فکر" کو تباہ نہ کردے۔ پھر اگر تمھاری ایک نسل بھی اسی اصول کے ماتحت تربیت پاگئی تو سمجھ لو کہ تمھاری تمام مصیبتیں دُور ہوگئیں۔ ورنہ کل جو تم کو اور تمھاری اولاد کو دیکھنا ہے اسے آج میری زبان سے سن لو اور یاد رکھو کہ جس طرح اور ہزاروں اندھی قومیں اب سے قبل تباہ ہوچکی ہیں، اسی طرح تم کو بھی تباہ و برباد ہوجانا ہے اور خدا اس سے بالکل بے نیاز ہے کہ مسلمان کا وجود دنیا میں باقی رہے یا نہ رہے

ایک مولوی کی عجیب و غریب حرکت

۲۲ مئی کے لیڈر میں ایک خبر شایع ہوئی ہے کہ سسرام ضلع آرہ کے ایک مولوی نے جن کا نام عبد العزیز ہے یہ عہد کیا ہے کہ وہ پیادہ سفر کرکے حج کریں گے اور دوران سفر میں ہر پانچ قدم کے بعد دو رکعت نماز نفل بھی پڑھیں گے چنانچہ ۹ مہینے ان کے سفر کو ہوگئے ہیں اور ابھی تک الہ آباد نہیں پہونچے۔ نامہ نگار کا بیان ہے کہ پندرہ دن کے بعد وہ الہ آباد پہونچیں گے اور ایک ہفتہ یہاں قیام کریں گے گویا سسرام سے الہ آباد تک کی مسافت ۱۵۶ میل کی دس مہینے میں طے ہوگی ——— اگر سسرام سے مکہ معظمہ تک خشکی کا راستہ کم از کم ۳۰۰۰ میل کا ہو اور مولوی صاحب موصوف اسی رفتار سے بغیر کسی اضمحلال و علالت کے اپنا سفر جاری رکھیں تو منزل مقصود تک پہونچنے کے لئے کم و بیش بیس سال درکار ہوں گے

یہ واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ممکن ہے مولوی ذہنیت کا شاہکار سمجھا جائے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ خدا کی یہ عجیب و غریب مخلوق اس سے زیادہ عجیب و غریب حرکتیں کرسکتی ہے اور دنیا کی بڑی سی بڑی مگراہی خیال بھی اُن واقعات کا مقابلہ نہیں کرسکتی جو اس جماعت کی طرف سے ظہور میں آسکتے ہیں

کیا سسرام میں کوئی ایسا شخص نہیں جو اس دیوانۂ مذہب کو اس حرکت سے باز رکھتا اور کیا ہندوستان میں بھی کوئی ایسا مسلمان نہیں جو اس غریب کو سمجھا سکے کہ مذہب اسلام ان لغویات سے بہت بلند واقع ہوا ہے اور یہ تقشف و جنون خدا و رسول کے نزدیک کسی طرح پسندیدہ نہیں ——— لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس "تن آزاری" کا مقصود کیا ہے۔ اور ہمارے سامنے بہت سے اُن سادھوؤں کی مثالیں موجود ہیں جو اپنے ہاتھ پاؤں تک خشک کر ڈالتے ہیں صرف اسلئے کہ جہلا کھنچ کھنچ کر اُن کے پاس آئیں اور خدا کو چھوڑ کر انکی پرستش کرنے لگیں

جنگ چین و جاپان سے ایک سبق

چین و جاپان کی جنگ اصولاً و عملاً دونوں طرح ختم ہو چکی، یعنی جاپان نے اپنی عسکری تنظیم، اپنی آراستگی علوم اور اپنے جوشِ وطنی سے باوجود ایک نہایت ہی محدود سلطنت ہونے کے دشمن کو شکست دیدی اور چین باوجود اتنی کثیر آبادی، اتنی وسیع سلطنت ہونے کے، اعترافِ شکست پر مجبور ہو گیا ــــ پھر اگر اس واقعہ میں ایک طرف ہمارے لئے یہ درسِ عبرت پنہاں ہے کہ "کم و کیف" کی جنگ میں ہمیشہ کامیابی "کیف" ہی کو ہوتی ہے، تو دوسری طرف جمعیۃ الاقوام کی بیچارگی بھی ایک دفترِ بصیرت ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جس نے ایک سال قبل یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ اس جنگ میں بجز شمشیر کوئی صلحنامہ نہیں ہو سکتا اور آج وہ جاپان کے اس زورِ شمشیر کو دیکھ رہی ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتی وہ لوگ جو قلم کی قوت کو تلوار کی قوت سے زیادہ کارگر یقین کرتے ہیں، آئیں اور جاپان کی اس فتحمندی کا مطالعہ کر کے عبرت حاصل کریں کہ آج مغرب کی بڑی بڑی قوتوں کی بزم آرائیاں، جاپان کی صرف ایک "داستانِ رزم" کی بھی حریف نہیں ہو سکتیں ــــ سچ کہا تھا۔ ڈی ولیرا نے کہ جمعیۃ الاقوام جس چیز کا نام ہے وہ صرف ایک ہو کے کی ٹٹی ہے جس کو ہر نیزہ باز اپنی ادنیٰ قوت سے کام لے کے پامال کرتا ہوا گزر جا سکتا ہے

مغربی زبانوں کے ادب لطیف پر تبصرہ

(مسلسل)

"اطالوی ادبیات"

از منۂ وسطیٰ سے نشاۃ الثانیہ تک

اطالوی زبان لاطینی زبان کی ارتقائی صورت ہے۔ اور اطالوی زبان کی امتیازی خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ہنوز اس لاطینی زبان کے عناصر پائے جاتے ہیں جو زوال سلطنت روما تک اس جزیرہ نما میں بولی جاتی تھی۔ لیکن اطالیہ کی ادبی زبان دراصل یہاں کی ایک مختص المقام زبان سے زیادہ متعلق ہے۔ جس کو تسکن (Tuscan) کہتے ہیں اور جو لاطینی کی ایک شاخ ہے

بارھویں صدی کی اطالوی شاعری کے نمونے اب تک محفوظ ہیں جو بھدے اور غیر شاعرانہ ہیں۔ اطالوی ادبیات کو جس چیز نے منضبط قومی ادبیات کی ہیئت دیدی وہ پراونس (Provence) کے رامشگر تھے جو آلپس (Alps) کے اس پار کے رہنے والے تھے اور وزن اور موسیقی کا صحیح مذاق رکھتے تھے۔ اسی زمانہ میں فرانسیسی شاعری اور نثر نے بھی اپنا اثر دکھایا۔ اطالیہ کا مشہور صوفی سینٹ فرانسس (St. Francis) اسی زمانہ میں گذرا ہے۔

شاعری کا اکھاڑہ اس زمانہ میں فریڈرک ثانی کا دربار تھا جو صقلیہ کا بادشاہ تھا اور جو پھر ۱۲۲۰ء میں اطالیہ کا شاہنشاہ بنا۔ اس عہد کے شعرا "مدرسۂ صقلیہ" (Sicilian School) کے شعراء کے لقب سے مشہور ہیں۔ انھوں نے شاعری میں کچھ اصول و ضوابط مرتب کئے اور سختی کے ساتھ ان پر کاربند رہے۔ انھوں نے اطالیہ میں سب سے پہلے غزلیات (Lyrics) کی بنیاد ڈالی۔ اور ایک مخصوص صنف ان کی شاعری کی جسے "سانٹ" (Sonnets) کہتے ہیں، اب تک پائی جاتی ہے

فریڈرک کے بعد "مدرسۂ صقلیہ" کا تسلط جنوب سے شمال کی طرف منتقل ہو گیا اور تسکنی (Tuscany) میں اس مدرسہ کا دوسرا دورہ شروع ہوا جس میں گوئٹون ڈارٹزو (Guittone d'Arezzo)

کو "آفاقِ سخن" کا مرتبہ حاصل ہے۔ یہ اسی کی تحریک کا نتیجہ تھا کہ شاعری نے شاہی دربار کے معاشقہ سے الگ ہو کر اخلاقیات اور سیاسیات کو اپنا موضوع بنایا۔ اسی نسل کا شاعر گوئڈو گوئنی کیلی ہے جس کو ڈانٹی (Dante) "طرزِ جدید" کا موجد قرار دیتا ہے۔ اس کی نظموں میں عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی دونوں ممزوج ہو گئے ہیں اور اس روحانیت کی جھلک یہیں سے نمایاں ہو چلی ہے جس نے آخر میں جا کر ڈانٹی کو شہرۂ آفاق کر دیا۔

فلارنس (Florence) کے مشہور مدبر اور ماہرِ سیاسیات برونیٹو لاطینی (Brunetto Latini) نے اسی زمانہ میں اپنی اخلاقی اور تمثیلی نظمیں پیش کیں۔ اور امبریا (Umbria) میں سینٹ فرانسس کے پیروؤں میں ایک مشہور مذہبی شاعر جیکوپونی ڈا لوڈی (Giacopone da-Lodi) بھی اسی عہد کے مشاہیر میں ہے۔ اس نے صوفیانہ نظم میں بڑا نام پیدا کیا۔

نثر کی رفتار بڑی سست تھی۔ اور اس کا مرکز دربارِ صقلیہ نہ تھا۔ بلکہ بلونا (Bologna) کی "درسگاہ" (University) تھی۔ تیرھویں صدی سے پہلے اطالیہ میں صرف و نحو اور مرصع نثر کے ماہر ضرور تھے جو لاطینی زبان میں لکھا کرتے تھے۔ ۱۲۵۰ء کے بعد سے لاطینی اور فرانسیسی زبان سے اطالوی زبان میں ترجمے شروع ہوئے جن میں اکثر اساطیر اور افسانے اب تک قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

اس دور کا وہ شاعر جو اب تک اکابرِ عالم میں شمار کیا جاتا ہے ڈانٹی ہے۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ کسی ملک اور کسی زمانہ میں اتنا بڑا قومی اور ادبی بطل پیدا نہیں ہوا۔ ابتدا میں ڈانٹی کی شہرت غزلیات (sonnets) سے ہوئی جن میں وہ اپنے پیشروؤں کی تقلید کرتا رہا۔ ان غزلیات کو بعد میں جمع کر کے اپنے ایک نثر کے کارنامے میں شامل کر دیا۔ اس میں اُسنے بیٹرس (Beatrice) کے ساتھ اپنے عشق کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ کل مجموعہ کا نام "حیاتِ جدید" (Vita Nuova) ہے۔ اس میں ابتدا سے انتہا تک تصوف کا رنگ غالب ہے۔ ڈانٹی نے اور بھی نثر میں تصنیفیں کی ہیں جو فلسفہ، کلام، سیاسیات اور ادب و شاعری پر مشتمل ہیں۔ اس زمانہ میں اس کے مذہبی اور روحانی عقائد میں جو تبدیلیاں نمایاں ہوئیں ان کا اظہار اُس نے اپنی شہرۂ آفاق نظم مسمیٰ بہ "ڈوائنا کمیڈیہ" (Divina Commedia) میں کیا ہے۔

"ڈوائنا کمیڈیہ" کی تاریخ تصنیف ٹھیک طور پر معلوم نہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کے دو حصّے "دوزخ" (Inferno) اور "برزخ" (Purgatorio) ۱۳۱۳ء میں لکھے گئے۔ لیکن قیاس کہتا ہے کہ اس کا آخری حصّہ "فردوس" (Paradiso)

ڈانٹی کی زندگی کے آخری سال ۱۳۲۱ء میں لکھا گیا۔ نظم ایک روحانی سفر یا سلوک کی صورت میں ہے۔ جس میں مرشد یا رہبر ورجل ہے۔ لیکن ورجل کی رسائی صرف " دوزخ " اور " برزخ " سے ہوتے ہوئے " فردوس اسفل " (Earthly paradise) تک ہے اس لئے کہ وہ حکمت و فلسفہ کا علم بردار ہے جس کی بنیاد عقل و استدلال پر ہے۔ یہاں سے ڈانٹی کی رہبری اس کی معشوقہ بیٹرس کرتی ہے اور فردوس کے نو طبقات کی سیر کراتی ہوئی " اعلےٰ علیین " میں ڈانٹی کو لے کر پہنچ جاتی ہے۔ بیٹرس کو ڈانٹی نے عرفانِ الٰہی کا سرچشمہ بنا کر پیش کیا ہے۔

ڈانٹی کے اسلوب کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ اہل نقد و بصر جانتے ہیں کہ اس کی یہ کتاب عہد عتیق اور ازمنۂ متوسطہ کی الہامی کتابوں کے مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس تصنیف کا اصل محرک بیٹرس کی محبت تھی اور اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ڈانٹی نے محبت کو ایک سرمدی سرور بنا کر پیش کیا ہے۔ لیکن ضمناً جو مباحث چھڑ گئے ہیں ان میں اس عہد تاریک کی عصبیت اور تنگ خیالی کافی نمایاں ہے۔ اس کے زمانہ تک جتنے غیر مسیحی اکابر عالم گذر چکے تھے مثلاً حضرت محمدؐ۔ حضرت علی۔ سقراط وغیرہ ان سب کو اس نے " دوزخ " میں دکھایا ہے۔ لیکن یہ ایک قدرتی بات تھی۔ یورپ نے اس وقت تک حروبِ صلیبیہ میں جو چرکے کھائے تھے۔ اس کا احساس ابھی تک تازہ تھا اور ہم اُن سے یہ ہرگز امید نہیں کر سکتے کہ وہ اپنے زخموں کو بھول کر " قاتل " کو " مرحبا " کہنے پر طیار ہو جائیں گے

ڈانٹی کو اگر ازمنۂ متوسطہ کا نبی کہا جائے تو فرانسسکو پٹرارک (Francesco Petrarch ۱۳۰۴ء تا ۱۳۷۴ء) کو اس کا جانشین سمجھنا چاہئے۔ اس میں جدتِ اسلوب کے ساتھ ساتھ قدامت کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ اس کو ۱۳۴۱ء میں ملک الشعراء کا خطاب ملا۔ اس کی غزلیں اور نظمیں اس کے جذبات کی پوری آئینہ داری کرتی ہیں۔ اطالوی اسلوبِ نظم کو اس نے درجۂ کمال تک پہونچا دیا۔ اور ایک نیا اسلوب بھی ایجاد کیا جو " پٹرارکن سانٹ " (Petrarchan Sonnet) کے نام سے مشہور ہے۔ اس کو لارا (Laura) کے ساتھ شدید محبت تھی۔ اُس نے ایک نظم لکھی جس کا موضوع ہی محبت ہے۔ نظم کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر عشقِ جسمانی اور عشقِ روحانی کی کشاکش میں مبتلا ہے لارا کو موت کے بعد پٹرارک نے بہشت میں جس طرح دکھایا ہے وہ اس کے خلوصِ محبت اور کمالِ تخیل کا ایک زبردست ثبوت ہے۔ گوشت و پوست کی دنیا میں اس نے اس حسن و جمال کا شائبہ بھی نہ پایا

جو اس کو بہشت میں پہونچنے کے بعد عطا ہوا - پٹرارک نے قومی اور سیاسی نظمیں بھی لکھیں - اُس کے دوست بوکیشیو (Boccacio) (۱۳۱۳ء تا ۱۳۷۵ء) نے اپنے قلم کی جولانی کے لئے میدان زیادہ وسیع رکھا لیکن جس چیز نے اس کو تمام دنیا میں مشہور کر دیا - وہ اس کے سو افسانوں کا مجموعہ ہے جس کا نام " ڈیکمران " (Decameron) ہے اور جس میں اس نے اپنے عہد کی متنوع معاشرت کو بڑے حسن و خوبی کے ساتھ پیش کر کے دکھایا ہے

چودھویں صدی کے اوائل میں مورخوں کا سلسلہ شروع ہوا - اس سلسلہ کی ابتدا ڈینو کو پینگنی (Dino Compagni) سے ہوتی ہے - اس کے بعد گیاونی ولانی (Giovanni Vollain) کا نمبر آتا ہے جو اپنی زبردست تاریخ کو نامکمل چھوڑ کر مر گیا - پھر بعد کو اس کے بھائی ماٹیو (Matteo) نے اس کو ختم کیا - یہ سب مورخ فلارنس (Flo- rence) کے رہنے والے تھے -

پاڈوا (Padua) کے مشہور وطن پرست شاعر نے لاطینی تاریخ لکھی جو شاہنشاہ ہنری (Henry.) کے عہد حکومت سے متعلق تھی اور ہنری کے بعد اطالیہ میں جو انقلابات رونما ہوئے ان کی مفصل داستان ہے - اس نے ایک سبق آموز المنامہ بھی لکھا جس کا سبق یہ ہے کہ آزادی و وطنیت حکومت کی روح رواں ہے اور ظلم حکومت کا دشمن ہے - اس صدی میں مذہبی اور راہبانہ ادب کی پیداوار کثرت سے ہوئی چنانچہ اس قسم کے مصنفوں میں سینا (Siena) کی سینٹ کیتھرائن (Saint Ca- therine) کے خطوط بڑے دلچسپ ہیں جن میں عورتوں اور مردوں کو محبت کے بڑے پاکیزہ سبق دئے گئے ہیں -

اسی صدی کے وسط کا ایک ممتاز شاعر یوبرٹی (Uberti) پیدا ہوا - اس کی غزلیات میں ایک خاص لذت ہے اور پٹرارک کے سوا وہ کسی سے کم رتبہ اس باب میں نہیں رکھتا - اس صف میں بنڈو ڈی کیونی (Bindo-di-Cione) کے منظومات بھی لائق ذکر ہیں -

اس وقت اطالوی شاعری میں ایک نئی تحریک شروع ہو گئی تھی - پچھلے دور کی خیال پرستی شاعروں سے چھوٹ چلی تھی اور اب اس میں عوام کی معاشرت کا نقشہ پیش کیا جا رہا تھا - اس تحریک کا خاص نمائندہ انٹانیو پچی (Antonio Pucci) تھا - اس کا دوست فرانکو ساکیٹی (Franco Sacchetti) تخیل اور معیار کے لحاظ سے پچی سے زیادہ بلند پرواز

ثابت ہوا۔

چودھویں صدی کو اطالیہ کا عہد زریں سمجھنا چاہئے۔ اس دَور میں شاعری کے بہترین کارنامے وجود میں آئے۔ شارلین (Charlemagne) اور سورماؤں کے قصے اور چند برطانوی اساطیر منظوم ہوکر اسی عہد میں بہت مقبول ہوئے۔ ان میں "گول میز کی تباہی (Destruction of the Round table) بہت مشہور ہے جو شاہ آرتھر سے متعلق ہے۔

نشأۃ الثانیہ وہ معاشرتی اور دماغی بیداری جو "نشأۃ الثانیہ" کے نام سے مشہور ہے۔ یوں تو بتدریج سارے یورپ میں پھیل گئی تھی لیکن اس کا گہوارہ اطالیہ تھا جہاں اس تحریک کے پیشرو بوکیشیو اور پٹرارک تھے۔ بوکیشیو کے زیر اہتمام ہومر کا ترجمہ ہوچکا تھا اور اگرچہ اس ترجمہ میں بہت کچھ خامیاں تھیں لیکن اس نے قوم کے جمود کو دور کرکے ایک اضطراب پیدا کردیا۔ پٹرارک بھی لوگوں کے اندر قدیم ادب و تمدن کو از سر نو زندہ کرنے کی تحریک پیدا کرگیا تھا۔ چودھویں صدی میں جو کام شروع ہوا تھا وہ پندرھویں صدی میں تکمیل کو پہونچا۔ قدیم لاطینی مصنفوں کے کارنامے ترجمہ ہوکر اطالوی زبان میں آگئے اور اسی کے ساتھ یونانی ادبیات کا بھی مطالعہ شروع ہوا۔ فتح قسطنطنیہ کے بعد اہل علم و ادب بہ ہجرت کرکے یونان سے اطالوی درسگاہوں میں پہونچے اور لوگوں کے جوش و خروش میں اضافہ کردیا۔ اسی زمانہ میں "حامیان انسانیت" (Humanist) کا زور ہوا۔ جنکا مرکز فلارنس تھا۔ ان حامیان انسانیت میں سے ایک شخص اینیا سلویو پکالومینی (Enea Silvio Piccolo mini) پائس ثانی (II Pius) کے نام سے پاپائے اعظم بھی بن گیا تھا۔ بڑے بڑے کتب خانے قائم کئے گئے۔ مطابع وجود میں آئے اور ترقی کے اور سامان مہیا ہوگئے۔

اس صدی کے اوائل میں ادبیات کی کمی نظر آتی ہے جسکی وجہ انتشار و بے نظمی ہے جو ایسی تحریکوں کی ابتدا میں لازمی ہے۔ لیکن انھیں ایام میں عامیانہ زبان کا ایک زبردست ادیب اپنا نام کرگیا اور وہ لیان بیٹسٹا البرٹی (Leon Battista Alberti) (۱۴۰۴ء تا ۱۴۷۲ء) ہے۔ اس کی تصنیفیں متنوع ہیں لیکن پھر اسی صدی کے آخر میں اطالوی زبان نے اپنا سکہ جمالیا۔ اور اس وقت اطالیہ میں تین ادبی مرکز ہوگئے۔ فلارنس (Florence) فرارا (Ferrara) اور نیپلز (Naples)

فلارنس نے حکمت الاشراق کو از سر نو پھیلایا اور اس نئے جوش میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت مارسیلیو فیکینو (Marsilio Ficino) کی ہے۔ جس نے افلاطون اور افلاطون ثانی

(فلاطینوس) کی تمام تصنیفوں کے ترجمے لاطینی زبان میں کر ڈالے اور اشراقیت کی مسیحیت کے ساتھ تطبیق کرنے کی بھی کوشش کی۔ نشاۃ الثانیہ کی سب سے بڑی خصوصیت تصوف اور وجدانیت ہے جو اس وقت کی دنیائے فکر کے ہر شعبہ میں پائی جاتی ہے۔ یہی تصوف یہاں سے انگریزی شاعری میں پہونچا اور سب سے پہلے اسپنسر (Spencer) اور آخر میں ورڈسورتھ اور شیلی کی شاعری کی روح رواں بن گیا۔

اشراقیت کے ساتھ ساتھ ٹسکن زبان کی شاعری کو بھی عروج ہوا اور اس کا سہرا لارنزو ڈی میڈیسی (Lorenzo-di-medici) اور اس کے ہم بزموں کے سر ہے۔ لارنزو کے دل و دماغ پر ادبیات قدیمہ کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ اس کا گھر ایک عجائب خانہ تھا جس میں پرانی نقاشی کے نمونے پرانے مجسمے اور پرانی کتابوں کی کثرت تھی۔ بہ حیثیت ایک انسان کے وہ دنیائے ماضی میں سانس لے رہا تھا لیکن اس کی شاعری اپنے دور سے بیگانہ نہ تھی۔ اس کی شاعری "تصوریت" یا "تخیل پرستی" (Idealism) اور "واقعیت" (Realism) کا بہترین امتزاج ہے

لارنزو کے بعد پولیزیانو (polizianno) کا درجہ آتا ہے۔ اس کی شاعری بھی قدیم و جدید کا ایک لطیف مرکب ہے۔ لیکن اس میں رنگینی، اسلوب کی دلکشی اور لچک زیادہ ہے۔ پندرھویں صدی کی ایک زبردست یادگار "رومانی شاعری" (Romantic poetry) ہے۔ اور اس صنف میں سب سے پہلے جس نے نام پیدا کیا وہ لوئیگی پلکی (Luigi pulci) ہے۔ اس کی شہرت کا سب سے بڑا سبب اس کی اولیت ہے۔ اس نے سنجیدگی اور ظرافت کو ملا کر خاصہ دلچسپ پیدا کر لیا تھا۔ لیکن اس سلسلہ کا سب سے بڑا شاعر جو تخیل اور ذوق سلیم کے لحاظ سے غیر معمولی شخص تھا۔ وہ فرانسسکو بیلا (Francesco Bella) تھا۔

پندرھویں صدی میں فن تمثیل نگاری کا معیار بہت بلند ہو گیا تھا۔ اور اس کا مرکز بھی فلارنس تھا۔ زیادہ تر مذہبی تیوہاروں کے موقع پر تماشا گاہوں میں تمثیلیں پیش کی جاتی تھیں اور ان کا تعلق بھی زیادہ تر مذہبیات سے ہوتا تھا۔ لیکن بعد میں بعض بڑے بڑے اہل قلم مثلاً لارنزو۔ پولیزیانو اور فیو بلکاری (Feo Belcari) نے اس فن میں بھی اجتہاد شروع کیا اور تمثیل کو مذہبی قیود سے آزاد کیا۔

اطالیہ میں ایک خاص قسم کی شاعری بھی پیدا ہوئی جس کو "راعیانہ" (pastoral) یا "دیہاتی" (Rural) شاعری کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں جتنے مناظر پیش کئے جاتے

ہیں۔ وہ دیہات کی زندگی اور بالخصوص گڈریوں کی معاشرت سے متعلق ہوتے ہیں۔ اس شاعری کی ابتدا یوں تو ورجل اور تھیوکریٹس (Theocritus) سے ہوتی ہے لیکن اطالوی زبان میں اس کی ابتدا پٹرارک سے ہوئی۔ اس صنف شاعری میں بھی لارنزو ممتاز رہا۔ "راعیانہ" شاعری عموماً مرثیوں کے لئے مخصوص ہے یعنے مرنے والے کو خواہ مخواہ مجازاً ایک گڈریہ مانا جاتا ہے۔ اور اس کی زندگی کو کھینچ تان کر گڈریہ کی معاشرت کے مطابق بنایا جاتا ہے۔ بعد کو اسی قسم کی شاعری مرثیہ کے لئے ہر ملک میں اختیار کی گئی۔ انگلستان کے متقدمین میں اسپنسر (Spenser) اور متوسطین میں ملٹن نے اس میں کافی شہرت حاصل کی۔ اس دور میں اطالیہ کی عشقیہ شاعری بہت بڑی حد تک بے کیف رہی۔

۱۴۹۴ء میں ادب و معاشرت میں ایک نئی تحریک کی بنیاد پڑی۔ اس کا بانی گرولامو سوانارولا (Girolamo Savonarola) تھا جو فلارنس کا رہنے والا تھا۔ اس نے قدامت پرستی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور لارنزو کا مد مقابل بنا۔ اس نے غیر مذہبی ادبیات کے پڑھنے سے لوگوں کو باز رکھنے کی پوری کوشش کی اور حکومت کی اصلاح بھی شروع کی۔ لیکن یہ اصلاح کسی سیاسی نیک نیتی پر مبنی نہ تھی بلکہ اس کی محرک در اصل وہ دشمنی تھی جو سوانارولا کو لارنزو کے ساتھ پیدا ہو گئی تھی۔ لارنزو اور اس کے دربار کی صورت میں وہ ایک استبداد محسوس کر رہا تھا۔ اور اس کو یقین تھا کہ جب تک لارنزو کا بول بالا رہے گا کیتھولک اعتقاد نہیں پنپ سکے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ میڈیسی خاندان کو کمزور کر کے فلارنس کی جمہوریت کو اپنے انصار کے ہاتھ میں دیدے اور اس طرح کیتھولک مذہب کو پھر سے زور پکڑنے کا پورا موقع ملے۔ بہر حال سوانارولا نے جس ترقی کی علم برداری کی در اصل ترقی معکوس تھی اور "نشاۃ الثانیہ" کی غرض و غایت اس سے مفقود ہو رہی تھی۔ سوانارولا کو بجا طور پر ایک "غالی" (Fanatic) سمجھا گیا ہے۔ اس کو بہ حیثیت اہل قلم کے کوئی خاص مرتبہ حاصل نہیں ہو سکا۔

پندرھویں صدی میں مورخوں کی کمی پائی جاتی ہے۔ تاریخ نگاری اور واقعہ نویسی میں جو ترقی ہوئی وہ عہد مابعد کی چیز ہے۔ جن مورخوں نے لاطینی زبان میں تاریخیں مدون کیں ان میں لیونارڈو برونی (Leonardo Bruni) کا نام قابل ذکر ہے۔ برنارڈینو کوریو (Bernardino Corio) نے میلان (Milan) کی تواریخ اطالوی زبان میں لکھی۔ کچھ عرصہ بعد سیاسیات اور تواریخ میں جو زبردست ترقیاں ہوئیں ان میں سب سے زیادہ حصہ میکیاویلی (Machiavelli) کا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ "شاہنشاہ" یا "شاہزادہ"

(The Prince) ہے۔ میکیاویلی عملی سیاسیات کا موجد ہے۔ اس نے واقعات پر غور کیا۔ تواریخ کا مطالعہ کیا اور اُن سے معقول اور کارآمد نتیجے نکالے۔ میکیاویلی نے جو تواریخ لکھی ہے ان پر بھی سیاسیات کا رنگ غالب ہے۔

میکیاویلی کے بعد فرانسسکو گوئیکیارڈینی (Francesco Guicciardini) کی باری آتی ہے جو بہ حیثیت مدبر اور مورخ میکیاویلی کا صحیح جانشین ٹھیرا۔ اس نے فطرت انسانی کا غائر مطالعہ کیا اور یورپ کی مختلف قوموں کی سیرت و خصلت کی سچی تصویر پیش کیں۔ ان کے علاوہ دوسرے درجہ کے اور بھی کئی مورخ گذرے ہیں۔

ایرلیسٹو (Ariosto) کی 'خیالی رزمیات' (Romantic Epics) اس دور کی خاص چیزیں ہیں۔ اس کے " آرلینڈو " (Orlando) کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا۔ کہ مصنف نے کسی خاص غرض و غایت کو پیش نظر رکھ کر اس کو نہیں لکھا بلکہ محض اپنے متخیلہ کی جولانی دکھائی ہے۔ سب سے زیادہ جس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے وہ طرز و اسلوب کی پختگی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ " تاریخی " یا " واقعی " (Historical) رزمیات میں گیان جارجیو ٹریسینو (Gian Giorgio Trissino) کا نام یادگار رہے گا اگرچہ اس کے تصنیفات میں کوئی خاص بات نہیں ہے تاہم ان کو پڑھ کر یہ علم کماحقہ ہو جاتا ہے کہ سولھویں صدی کی ذہنیت کیا تھی۔

" المیات " کی اس صدی میں کثرت ہے لیکن فن کے اعتبار سے وہ سب خام ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس دور میں اہل اطالیہ جذبات سے بیگانگی برت رہے تھے۔ سب سے پہلے جو المنامہ اس زمانہ میں اسٹیج پر آیا وہ ٹرسینو کا " سوفنسبہ " (Sofonisba) تھا لیکن اس میں بے کیفی اور بے رنگی قدم قدم پر نمایاں ہے۔ اسی طرح اور تمثیل نگاروں کے المنامے بھی بے کیف رہے۔ سب سے زیادہ مکمل اور بے عیب المنامہ ٹارکویٹو ٹیسو (Torquato Tasso) کا " ٹارسمانڈو " (Torrismondo) ہے۔

" ضحکیات " (Comedies) کی بھی اس عہد میں کمی نہ تھی۔ " ضحکیات " زیادہ تر لاطینی نمونوں کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے۔ اس قسم کے تمثیل نگاروں میں مکیاویلی ایریسٹو اور گیووَن میریا کچی (Giovan Maria Cecchi) کے اسمائے گرامی سر فہرست نظر آتے ہیں۔

ہجویات اور طنزیات میں بھی یہ صدی پیچھے نہیں رہی۔ انطانیو کامیلی (Antonio Commelli) اپنے تلخ طنز کے لئے مشہور ہے لیکن جس شخص نے اس قسم کے ادبیات کو درجہ کمال تک پہونچایا وہ فرانسسکو برنی (Francesco Berni) تھا۔

اخلاقی یا سبق آموز ادبیات میں چند معمولی اہل قلم کے علاوہ گیاوانی رکیلائی (Giovanni Rucellai) اور بلڈاسیر کیسٹگلیونی (Baldassare Castiglione) کے کارنامے بہت اہم ہیں۔ بالخصوص موخرالذکر نے اس عہد کے طبقۂ اعلیٰ کی معاشی اور اخلاقی حالت کے نمونے پیش کرکے عبرت وبصیرت کے لئے زبردست سامان مہیا کیا ہے۔

افسانہ نگاروں میں دو بہت ممتاز ہیں یعنے انطان فرانسسکو گرازینی (Francesco Grazzini) اور متیو باندیلو (Matteo Bandello) متقدم الذکر میں تمسخر اور لڑکپن ہے اور موخرالذکر میں سنجیدگی۔ اسی زمانہ میں یونانی اور لاطینی مصنفوں کے ترجموں کا سودا اور بڑھا اور اس جوش میں بڑے بڑے کارناموں کے ترجمے ہوگئے مثلاً ورجل کی "اینیڈ" (Aeniad) اور اووڈ (Ovid) کے "کونیات" (Metamorphoses) وغیرہ۔

مورخوں میں اس مسئلہ پر اتفاق نہیں ہے کہ آیا ٹیسو (Tasso) کو "نشاۃ الثانیہ" کا ادیب مانا جائے یا اس کو درمیانی دور کی ہستی سمجھا جائے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے عہد سے بڑی حد تک بیگانہ تھا۔ اس کے مذہبی عقائد۔ اس کی بڑھی ہوئی سنجیدگی، اس کا درد آشنا دل اس کا بلند اور ناقابل حصول معیار ہم کو مجبور کرتا ہے کہ اس کو میکیاویلی اور اریسٹو وغیرہ کی مجلس سے الگ سمجھیں۔ وہ فلسفی تھا۔ صناع تھا۔ محبت بھرا دل رکھتا تھا۔ رزم نگار تھا۔ غرضکہ ایک طرفہ معجون تھا۔ اس نے جو کچھ لکھا اس میں دل ودماغ کے ساتھ ساتھ قلم کا بھی کمال دکھایا۔ اس کے طرز میں جو کچھ خرابی ہے۔ وہ یہ ہے کہ دور از کار تشبیہات واستعارات اور دیگر صنائع وبدائع کا صرف اس کے یہاں کثرت سے ہے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ ٹیسو نے آنے والے دور کے لئے زمین تیار کی۔

درمیانی دور

سولھویں صدی کے اواخر سے جبکہ اطالیہ میں اسپینی تسلط وتشدد شروع ہوا ملک کے ادبیات میں انحطاط کے آثار نمایاں ہونا شروع ہوئے اور سترھویں صدی تک تو

یہ صاف طور پر محسوس ہونے لگا کہ قوم کی دماغی قوت، اور ادبی و تمدنی جوش میں گھن لگ گیا ہے۔ ملک غیروں کے ہاتھوں میں تھا اور عوام و خواص میں جذبۂ وطنیت کا فقدان تھا۔ حکومت کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے تھے اور اہل دربار آزاد خیالی اور آزاد بیانی کو جرم سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ بڑے بڑے اکابر علم و ادب کو اس زمانہ میں سخت سزائیں دی گئیں۔ کیمپنیلا (Campanella) کو ستایا گیا۔ برونو (Bruno) کو جلایا گیا اور نہ جانے کتنوں کے ساتھ اسی قسم کا سلوک کیا گیا۔

اس دَور کے اہل قلم میں وہ تمام معائب موجود ہیں جنکو زوال و انحطاط کی علامتیں کہہ سکتے ہیں۔ نہ ان میں کوئی خاص جذبہ ہے نہ وہ گرمجوشی جو خلوص کی دلیل ہوا کرتی ہے۔ ہے کیا؟ - مبالغہ۔ دوراز کار خیالات کی بھرمار۔ زبردستی کے تشبیہات و استعارات کی بوچھار۔ ان اہل قلم میں سب سے پہلے گیاوان بتستا میرینی (Giovan Battista Marini) کا نام آتا ہے جو نیپلز کا رہنے والا تھا۔ اس کی شہرت کا خاص سبب اس کی ایک نظم ہوئی جس کا عنوان "لاڈون" (L'Adone) ہے۔ لیکن اس نظم میں سوائے مبالغہ آمیز استعارات اور تضاد و تقابل کے کچھ ہے نہیں۔ اس کے پیرو اکیلینی (Achillini) کا بھی یہی رنگ ہے جو بولونا (Bologna) کا رہنے والا تھا۔ اور ہم مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس دَور کے بیشتر شعرا اور نثر نگاروں پر "میرینیت" چھائی ہوئی تھی۔ البتہ کیا بریرا (Chiabrera) اور اس کے شاگردوں میں کچھ تبدیلی کے آثار نظر آتے ہیں اور ان لوگوں میں تغزل اور جذبات نگاری کی ایک ہلکی سی جھلک محسوس ہو جاتی ہے۔ ان شعراء میں فلی کاجا (Filicaja) باشندۂ فلارنس خاص طور پر قابل ستایش ہے اس لئے کہ اس کے "نغمات" میں کافی تغزل ہے۔

کچھ عرصہ بعد یہ تحریک شروع ہوئی کہ اسالیب میں کچھ تبدیلیاں ہونا چاہئیں تاکہ ادبیات اپنے اصلی مرکز پر آجائیں۔ تصنع اور تکلف سے لوگ بہت جلد عاجز ہو گئے۔ اور نئی نسل کا میلان پھر سادگی اور بے تکلفی کیطرف ہوا۔ ۱۶۹۰ء میں "ندوۂ آرکیدیہ" (Academy of Arcadia) قائم ہوئی۔ اس کے بانی کرسکمبنی (Crescimbeni) اور گراوینا (Gravina) تھے۔ اس کو "آرکیدیہ" اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے ارکین نے اپنا نصب العین یہ بنا رکھا تھا کہ جہاں تک ہو سکے پرانی "راعیانہ" شاعری کا تتبع کریں۔ اور سادہ بیانی کو پیش نظر رکھیں۔ اس "ندوہ" کا سب سے ممتاز متغزل شاعر فیلکس زاپی (Felice Zappi) گذرا ہے۔

اگرچہ اس وقت اطالیہ کی معاشی اور سیاسی حالت بڑی پست تھی۔ عقلیت اور حریت کا جوش زائل

ہو چکا تھا۔ تاہم رد عمل کی علامتیں بھی بہت جلد رونما ہونے لگیں اور بعض آزاد خیال اہل دماغ مثلاً طلیسیو (Telesio) برونو اور کمپنیلا اپنی فلسفیانہ تحقیق و تدقیق سے باز نہیں آئے۔ اور جاں نثاری کے ساتھ حق کے راستہ میں ثابت قدم رہے۔ ان کے بعد ہی گلیلیو کے حکیمانہ کارنامے شروع ہوئے یہ صرف سائنس داں نہ تھا بلکہ ایک بے مثل نثار بھی تھا۔ اس کی نثر میں شاعری کا لطف ہے۔ اور وہ جو کچھ کہتا ہے اس میں سہولت، جامعیت اور ساتھ ہی ساتھ رنگینی بھی ہوتی ہے۔ علاوہ بریں اسی زمانہ کے بعض ہجو نگار مثلاً۔ روزا (Rosa) اور ٹاسونی (Tassoni) کی تیز و تلخ تصنیفوں سے بھی ظاہر ہے کہ لوگ مروجہ طرز معاشرت سے بیزار ہو رہے تھے۔ قوم کی آنکھوں سے پردہ ہٹ رہے تھے اور بیداری شروع ہو گئی تھی۔

اس بیداری کے آثار اٹھارھویں صدی میں محسوس طریقہ پر نمایاں ہو گئے۔ اسپین کی غلامی سے قوم آزاد ہو چکی تھی۔ اور ملک کی سیاسی و تمدنی حالت سدھر رہی تھی۔ اس دور اصلاح کے سربرآوردہ نمائندے جوزف ثانی (Joseph II) لیو پولڈ اول (Leopold I) اور چارلس اول (Charles I) تھے۔

گیم بتستا واکو (Gaim Battista Vico) نے اس وقت اطالیہ میں تاریخی اور قومی بیداری پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا۔ اس نے بڑے غور و مطالعہ کے بعد "حکمت جدید" (Scienza Nuova) لکھی جس میں اس نے ان انفسیاتی قوانین کی تحقیق کی ہے جن کے تحت قوموں کا عروج و زوال ہوا کرتا ہے۔ ان قوانین کا نام اس نے "قوانین تاریخ" رکھا۔

اسی تحریک کے سلسلہ میں اطالیہ کے تہذیب و تمدن کی تاریخی تحقیق ہونے لگی۔ لوڈووکیو انطانیو میراٹوری (Ludovico Antonio Muratori) نے بڑی کاوش اور تدقیق سے "تواریخ اطالیہ" مرتب کی۔

پہلو بہ پہلو اقتصادی اور تمدنی قوانین کا مطالعہ شروع ہوا۔ فرانسسکو گالیانی (Francesco Galiani) نے "کرنسی" (Currency) پر لکھا۔ گاٹانو فلانجیری (Gaitano Filangieri) "علم التشریع" (Scienza della Legislazione) کے نام سے ایک رسالہ تصنیف کیا۔ بیکاریہ (Beccaria) نے تعزیرات میں اصلاح کی اور تشدد کی بیخ کنی کی۔

اٹھارہویں صدی کی سب سے مقبول خاص و عام ہستی گیوسپی پارینی (Giuseppe

Parini) تھا۔ اس نے شاعری میں شارع عام سے انحراف کیا اور شاعری کو واقعات زندگی پر مبنی کیا۔ اس نے چند ہجویات بھی لکھے جن میں اس نے اپنے عہد کی رسمی پابندیوں اور اخلاقی کمزوریوں کو بے نقاب کیا ہے۔ اس نے غزلیات میں بھی جدتوں اور بدعتوں سے کام لیا۔ سچے جذبات و محسوسات جو ایک اوسط درجہ کے انسان میں پیدا ہو سکتے ہیں، پارینی کی رائے میں وہی غزلیات کے موضوع بن سکتے ہیں۔ اس لئے اس نے اپنی غزلوں کے لئے اپنی اردگرد کی واقعی زندگی سے مواد لیا۔ اجمالاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پارینی نے شاعری سے اخلاقیات کا کام لیا اور پھر شاعری کی شان کو بھی قائم رکھا۔

پارینی کے بعد ہجویات میں گازی (Gozzi) کا درجہ آتا ہے اگرچہ وہ صحیح طور پر پارینی کا مد مقابل نہیں ہے۔ تیسرا درجہ گیوسپی باریٹی (Giuseppe Barette) کا ہے جو ٹیورن (Turin) کا رہنے والا تھا۔

جہاں زندگی اور ادبیات کے ہر شعبہ میں اصلاح ہو رہی تھی وہاں تمثیل نگاری کی دنیا بھی بدل رہی تھی۔ اپاسٹولو زینو (Apostolo Zeno) اور میٹاسٹیزیو (Metastacio) نے "حسیت" (Sentimentalism) اور "عقلیت" (Rationalism) میں ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مؤخر الذکر اس باب میں خصوصیت کے ساتھ کامیاب رہے۔ اس نے سچے جذبات کی مصوری کی مکالمات میں واقعیت پیدا کی۔ پلاٹ میں کوئی غیر فطری عنصر نہیں رہنے دیا۔ لیکن اس میں چند ایسی خامیاں تھیں جس کی بنا پر اس کو تمثیل نگاری کا پہلا مصلح نہیں بنایا گیا۔ یہ شرف کارلو گولڈونی (Carlo Goldoni) کو ملا۔ اس نے کامیڈی میں تبدیلیاں پیدا کیں اور کردار نگاری (Character drawing) کو رواج دیا۔ گولڈونی کے افراد واقعی زندگی کے مطابق ہوتے ہیں اگرچہ ان میں گہرائی نہیں ہوتی۔ گولڈونی مشہور فرانسیسی تمثیل نگار مولئیر کا پیرو تھا۔

اٹھارہویں صدی کے اواخر میں فرانس میں تخیلی حریت۔ مساوات اور معقولیت کا جنون پیدا ہوا "جس نے آخر کار "انقلاب" کی صورت اختیار کی اس نے ادبیات اطالوی پر اپنا خاص اثر ڈالا قومیت اور وطن پرستی کا جذبہ ملک میں پھیل گیا۔ سیاسی اور مذہبی استبداد کی مخالفت شروع ہوئی اور قومیت و وطنیت ادبیات کا ایک جزو بن گئیں۔ لیکن ساتھ ہی ایک اور قوت اس وقت کام کر رہی تھی یعنی جن لوگوں کو سیاسی آزادی کا سودا تھا۔ ان کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ آزادی اسوقت تک ناممکن ہو

جب تک کہ ہم اپنے کو ادبیات قدیمہ سے کماحقہ' مانوس نہ بنائیں اس خیال سے ادبیات قدیمہ کا مطالعہ از سر نو
شروع ہوا اور یونانیات اور لاطینیات اطالوی زبان میں کثرت سے آنے لگے۔
اس نئے ادبی دَور کی ابتدا الفیئری (Alfieri) سے ہوتی ہے۔ وہ اہل یونان
اور اہل روم کا پجاری تھا اور ان کے حریت عامہ کے معیار کو الہامی معیار سمجھتا تھا۔ اس نے جتنے المنامے
لکھے وہ سب تاریخی واقعات سے متعلق تھے اور ان میں زیادہ تر یونان و روم کی تاریخ تھی۔ اس نے ادبیات
کے ذریعہ سے سیاسیات میں اصلاح کرنا چاہی۔ اسلوب میں تصنع اور تکلف سے اس کو دشمنی تھی۔
یوگو فاسکولو (Ugo Foscolo) ایک دوسرا قوم پرست گذرا ہے۔ اس نے
مکاتیب کی صورت میں ایک افسانہ لکھا ہے جس میں محبت کے پُرشور جذبات کے ساتھ وطن پرستی کا جذبہ
نمایاں ہے۔ اس نے گوئٹے (جرمنی شاعر) کے مشہور افسانہ "محبت" ورتر "(Werther)
کو بہ طور نمونہ پیش نظر رکھ کر ان مکاتیب کو لکھا ہے۔ اور اس میں معاہدۂ کیمپو فورمیو (Campo
Formio) کی نہایت سخت لہجہ میں مخالفت کی گئی ہے۔ اس میں محبت کی جو حکایت ہے۔ وہ
فاسکولو کی اپنی زندگی کا واقعہ ہے۔ فاسکولو ایک نہایت بے چین طبیعت کا آدمی تھا اور اس کے
جذبات ہنگامہ آفریں ہوتے تھے۔ جتنا جلد اس کے اندر جذبات کا خروش پیدا ہوتا تھا۔ اتنا ہی جلد
وہ فرو بھی ہو جاتا تھا۔
مانٹی (Monti) بھی اگرچہ وطن پرست تھا۔ لیکن بہ حیثیت صاحب فن
کے وہ زیادہ سرافراز ہے۔ اس نے اپنی تصنیفوں میں " انقلاب فرانس " کی مخالفت کی "پاپائی تسلط"
پر حملے کئے۔ حکومت آسٹریا کی بھٹی کی لیکن ان سب میں اُس نے اپنے فن کا زیادہ لحاظ
رکھا۔
مانٹی سے چار برس عمر میں چھوٹا ایک اور ممتاز شاعر تھا جس کا نام نکولینی (Niccolini
) تھا۔ ادبیات میں وہ بھی اپنے پیش رؤں کا مقلد تھا۔ اس نے جتنے المنامے لکھے انہیں
وہ انگریزوں اور جرمنوں کے قدم بقدم چلتا رہا۔ اور زیادہ تر سیاسیات کو اپنے قلم کا موضوع رکھا۔
اس کی تمثیلوں میں گھلاوٹ اور خستگی زیادہ ہے۔ جو دراصل غزلیات کے خصوصیات ہیں۔
اس وطنیت اور سلف پرستی کا ایک بُرا اثر یہ پڑا کہ تاریخ اور اس کے مطالعہ کا مذاق کسی قدر
گر گیا۔ پھر بھی تین مورخوں کا نام بغیر لئے نہیں رہا جا سکتا۔ کارلو بوٹا (Carlo Botta)
اطالیہ میں فرانسیسیوں کا تاخت و تاراج دیکھ چکا تھا۔ اور نپولین کا تسلط ابھی تک اس کی آنکھوں

کے سامنے تھا۔ اس نے اس کے بعد ملک کی ایک تاریخ مرتب کی جو جذبۂ وطنیت کے اعتبار سے قابل قدر چیز ہے۔ بوٹا کے بعد کالیٹا (Colletta) آیا۔ اس نے بھی عہد نپولین کی تاریخ لکھی تیسرا مؤرخ لازیرو پاپی (Lazzaro Papi) ہے جس نے "انقلاب فرانس" پر ایک مبسوط رسالہ تیار کیا۔

حیرت کی بات ہے کہ جس زمانہ میں ہر طرف سیاسی اور قومی جوش تھا اور ادبیات قدیمہ کی پرستش ہو رہی تھی عین اسی زمانہ میں زبان کی شستگی اور صفائی کا سوال بھی اٹھا دیا گیا۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں اطالوی زبان فرانسیسی اصطلاحوں اور محاوروں سے بھری پڑی تھی۔ نئی نسل نے قوم کی فلاح و بہبود کے لئے اس کو ضروری سمجھا کہ اپنی زبان سے غیر ملکی عناصر کو یک قلم خارج کر دیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو.... خالص اطالوی زبان کو قائم رکھا جائے۔ معیار کے طور پر ڈانٹی۔ پٹرارک اور بوکیشیو پیش نظر رکھے گئے۔ پرانے مصنفوں کے کارناموں کو از سر نو اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا۔ اس کام میں انٹانیو سیزر (Antonio Cesare) نے بڑا حصہ لیا۔

اس گروہ کا ایک زبردست شاگرد گیورڈانی (Giordani) تھا جس کی ساری زندگی جنگ حریت میں گذری۔ اس نے یونانی اور لاطینی مصنفوں کا وسیع اور غائر مطالعہ کیا تھا۔ نثر میں اس کی طرز نو اور روزگار میں شمار کی جاتی ہے۔ گیورڈانی کے ساتھ یہ دور بھی ختم ہو چکا ہے۔

انیسویں صدی اور مابعد

انیسویں صدی سے اطالوی ادبیات میں دور جدید کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس دور کی بنیاد اس طبقہ سے پڑی جس کو "رومانی طبقہ" (Romantic School) کہتے ہیں اور جس کا ایک نہایت موقر رکن مانزونی (Manzoni) ہے۔ مانزونی اور اس کے ہمچشموں میں جرمنی کی "تحریک رومانیت" کا اثر پھیل چکا تھا۔ اطالوی ادبیات میں مانزونی سے "واقعیت" (Realism) کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس نے والٹر اسکاٹ کے تتبع میں تاریخی ناول لکھے لیکن اس میں اپنی مخصوص شان قائم رکھی۔ لوگوں کی توجہ اب پلاٹ سے ہٹ کر کردار نگاری کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ اور مانزونی کو تفصیلی کردار نگاری میں ملکہ حاصل تھا۔ نفسیات انسانی کا اتنا صحیح مرقع وہ پیش کرتا ہے کہ جرمنی کے مشہور شاعر فلسفی گوئٹے کو اس کی قدرت کا قائل ہونا پڑا۔

اس دور کا سب سے بڑا شاعر لیوپارڈی (Leopardi) ہے جو ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اطالوی اور لاطینی ادبیات کے مقابلہ میں یونانی ادبیات کو اس کی طبیعت سے زیادہ مناسبت

تھی۔ چنانچہ اس نے یونانی مصنفوں کا زیادہ مطالعہ کیا۔ عزلت پسندی صحت کی خرابی اور خاندانی پریشانیوں نے اس کے اندر ایک "قنوطیت" (pessimism) پیدا کر دی تھی۔ اور وہ زندگی میں سوائے دُکھ اور تاریکی کے کچھ نہ دیکھتا تھا۔ اس کی شاعری میں ایک عجیب ہیبت و جلال ہے۔ اس کی نظمیں دُکھے ہوئے دل کی دل دکھا دینے والی آہیں ہیں جو اس تیور کے ساتھ سر کی گئی ہیں کہ ان کو پڑھ کر خود ہم میں ایک سنجیدگی اور بلندی پیدا ہو جاتی ہے۔

لیوپارڈی نثار بھی تھا۔ نثر میں اسکالپ و لہجہ اتنا ہی تلخ ہے۔ وہ انسان کے مقدر پر بڑے طنز کے ساتھ مسکراتا ہے اور اس کی یہ مسکراہٹ ہم کو بھی زندگی سے بیزار کر دیتی ہے۔ تغزل میں ڈانٹے کے بعد اسی کا درجہ ہے اور نثر میں اس کے برابر شاید ہی کسی اطالوی اہل قلم نے کمال حاصل کیا ہو۔

اطالوی ادبیات نے اس دَور میں سیاسیات کو بھی ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ اور شاعری نثر ہجویات میں سیاسی مباحث کو زبردست دخل ہے۔ لیکن سنہ ۱۸۵۰ء کے بعد اس صنف ادب کی اہمیت کم ہو گئی انیسویں صدی کے اواخر میں ادبیات اطالوی سے "رومانیت" مفقود ہونے لگی اور گیاونی پراٹی (Giovanni Prati) کے بعد رومانیت کا نام و نشان بھی نہیں رہا۔ اور میزینی جیسے مبلغ رومانیت میں بھی لوگوں کی دلچسپی کم ہو گئی۔

اس نئی نسل کے شعرا میں سب سے نمایاں ہستی گیوسو کارڈکی (Giosue Carducci) ہے جس نے قدیم عروض اور قدیم روح شاعری کو پھر سے زندہ کیا۔

کارڈکی صرف شاعر نہ تھا بلکہ ایک قابل قدر مؤرخ اور نقاد بھی تھا۔ کارڈکی کے علاوہ ڈامیلیکو گنولی (Domenico Gnoli) گیاونی مراڈی (Giovanni Marradi) رینالو فوکینی (Renato Fucini) اور اڈا نگری (Ada Negri) بھی مشہور شعرا میں سے ہیں۔

تمثیل نگاری میں دو شخص خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ المیات میں کاسٹا (Costa) اور ضحکیات میں مارٹنی (Martini)

افسانوں میں نفسیاتی ناول کے لئے بٹی (Butti) واقعاتی اور مختص المقام افسانوں کے لئے ویرگا (Verga) اور صوفیانہ افسانوں کے لئے فوگاٹزرو (Fogazzaro) مشہور ہے۔ عورتوں میں مٹلڈے سراؤ (Matilde Serao) اور گریزیا ڈیلیڈا (Grazia Deledda) نے خاصی مقبولیت حاصل کی۔

دورِ حاضر میں ڈانزیو (D'Annunzio) نے شاعری - افسانہ اور ڈرامہ میں بڑی طباعی سے کام لیا ہے - لطافت خیال اور نزاکت اسلوب دونوں اعتبار سے وہ آپ اپنی نظیر ہے -

اس کے بعد شاعری میں پاسکولی کا مرتبہ ہے - فطرت پرستی - وطنیت - جذبات وافکار کی گہرائی مناظر کی مصوری میں مشکل سے کوئی اس کا ہمسر نکلے گا -

فلسفہ میں دو نام ہمیشہ زندہ رہیں گے - بینی ڈیٹو کروچے (Benedetto Croce) جس کو "تصوریت" یا "معنویت" (Idealism) کا مبلغ مان لیا گیا ہے اور جو جمالیات (Aesthetics) کا بھی زبردست عالم ہے - لیکن جدید ترین نسل آجکل گیا ونی جنٹائل (Giovanni Gentile) کی گرویدہ ہو رہی ہے جس نے اطالوی فلسفہ کو منتہا تک پہونچا رکھا ہے -

مایا

رانی پور کے زمیندار بسنت کمار کے باپ سرگباش ہو چکے تھے۔ اور اب بوڑھی ماں رادھا اور نوجوان بیوی پاروتی کے سوا ان کا اس دنیا میں اپنا کوئی نہ تھا۔ وہ بی۔ اے پاس کر چکے تھے اور قانون کا امتحان دینے کی تیاری کر رہے تھے۔ ان کا زیادہ وقت پڑھنے لکھنے ہی میں گذرتا تھا۔ رادھا جو پرانے خیال کی ماں تھی اپنی بہو پاروتی کو بسنت سے ملنے کا بہت کم موقع دیتی تھی، جب کوئی پڑوس کی عورت رادھا سے اس کی وجہ پوچھتی تو وہ کہتی۔ "دونوں ابھی ناسمجھ اور ناتجربہ کار ہیں بیوی کے پھندے میں پھنس کر بسنت پڑھ لکھ نہیں سکتا ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے عیش و آرام کے لئے ساری زندگی پڑی ہے۔" چنانچہ اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ رادھا اپنی بہو کو بڑی کوشش سے خانہ داری کا کام سکھا رہی تھی۔ اور پاروتی کا سارا دن رسوئی، بھنڈار خانہ اور ٹھاکر جی ہی کے گھر میں گذرتا تھا رات کو بھی رادھا بہو کو اپنے پاس سلاتی تھی۔ جیسے کوئی لاپرواہ مان گنے کا رس خوب چوس چوس کر پیئے اور بچہ دور سے دیکھ کر للچائے وہی حال بسنت کا بھی تھا اس کی آنکھوں کے سامنے ہی نوجوان بیوی کا رس گرہستی کی چکی میں پس پس کر مٹی میں ملا جا رہا تھا لیکن وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ماں کے خلاف کوئی کام کرنے کی اس میں جرأت نہ تھی مگر ضبط کی بھی کوئی حد ہوتی ہے یہ سعادت مندی زیادہ دن تک نہ قائم رہ سکی آخر ایک دن وہ ماں سے باغی ہو گیا۔ پھاگن کا مہینہ اور دوپہر کا وقت تھا بسنت اپنی بیٹھک میں کچھ پڑھ رہا تھا یکبارگی اس کے کانوں میں آواز آئی :-

گیاں برجائے ایسی ہوری اُن بن دیہے جرت موری۔

گاؤں میں اس نے اکثر لوگوں کو پھگوا گاتے سنا تھا مگر اس وقت دیہاتی لڑکیوں کے گیت "گیاں برجائے ایسی ہوری" نے بسنت کے دل کو تڑپا دیا اُسے ایسا معلوم ہونے لگا گویا لڑکیاں گیت میں اس کا مذاق اُڑا رہی ہیں پھر دوسری 'ہولی' شروع ہوئی :-

ہوری آئی سجن ناہیں آئے دیکھو شیام ہمارے بدیسوا میں چھائے
رنگ کھیلیں سکھیاں اپنے پیا سنگ ہنس ہنس گر والگائے
نہ رہ آوے یاد بلم کی عبیر گلال نہ بھائے　　　ہوری آئی سجن.....

اب وہ اپنے دل کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ پیاسے کے سامنے پانی کا گلاس رکھا تھا لیکن اسے پینے کی اجازت

نہ تھی۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ وہ پھاگن کے مہینہ میں بھی اپنی بیوی سے بات چیت نہیں کر سکتا تھا۔ ماں تو پرانے خیال کی ہے لیکن وہ تو تعلیم یافتہ اور نئی روشنی کا تھا وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا اور پھر اپنے گھر میں داخل ہوا اس کی ماں سو رہی تھی کہ بسنت کی نگاہیں پاروتی کو تلاش کرنے لگیں وہ رسوئی گھر میں بیٹھی چاول چُن رہی تھی شوہر کو دیکھ کر اس نے گھونگھٹ کرنا چاہا لیکن بسنت نے اشارہ سے اس کو اپنی طرف بلایا۔ اس نے سوچا "پاروتی کتنی گنوار ہے شوہر سے پردہ کرتی ہے" مگر یہ کوئی نئی بات نہ تھی وہ ہمیشہ سے پردہ کرتی چلی آئی تھی لیکن آج سے پہلے بسنت نے اس کی طرف کوئی توجہ ہی نہ کی تھی۔ پاروتی نے گھبرا کر ساس کی طرف دیکھا وہ سو رہی تھی ـــ "آج ان کو کیا ہو گیا ہے . . . . . مجھے کیوں بلاتے ہیں . . ماں جی کا بھی کچھ خیال نہیں . . . . . . اگر میں ان کا حکم نہیں مانوں گی تو یہ ناراض ہو جائیں گے . . . . . اور اگر ان کے پاس جاؤں اور ماں جی جاگ اٹھیں تو . . . . . " پاروتی کو سوچتے دیکھ کر بسنت سے خاموش نہ رہا گیا اس نے کہا ـــ "اجی سنتی ہو یا نہیں میں کہتا ہوں ادھر آؤ . . . . . " یہ کہتا ہوا بسنت . . چھت پر چلا گیا۔

پاروتی سہمی ہوئی اٹھی اور ساس کی طرف خوف بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی دبے پاؤں بسنت کے پاس پہونچ گئی

"کھڑی کیوں ہو پلنگ پر بیٹھ جاؤ۔"

"جی ـــ"

"میں تو کہتا ہوں کہ پلنگ پر بیٹھ جاؤ اور تم "جی! جی!" کی رٹ لگا رہی ہو"

"اگر ماں جی جاگ اٹھیں اور انہوں نے مجکو یہاں دیکھ لیا تو بڑی بُری بات ہوگی"

"یعنی مجھ سے ملنا بُری بات ہے کیا خوب؟ کیسی بیوقوفی کی باتیں کرتی ہو۔ ہو نہ آخر دیہاتن؟"

"لیکن اب تک نہیں تلے یہ کس کی بیوقوفی تھی۔ میں تو دیہاتن ہوں لیکن آپ کو شہر میں رہ کر بھی آج سے پہلے کبھی اس کا خیال نہیں آیا"

بات معقول تھی لیکن بسنت اپنی ہار ماننے کیلئے تیار نہ تھے انھوں نے کہا۔ "خیر فضول بحث کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ سنو اور غور سے سنو میں نے اب تک بہت ضبط کیا لیکن اب مجھ سے ضبط نہیں ہوتا اب میں چاہتا ہوں اور دل سے چاہتا ہوں کہ تم میرے پاس بیٹھو مجھ سے باتیں کرو۔ اور میرا دل بہلاؤ۔" اتنا کہہ کر بسنت نے پاروتی کا ہاتھ تھام کر پلنگ پر بٹھا لیا۔

گون ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ دن کے وقت پاروتی اپنے شوہر کے پاس بیٹھی ہو شرم و لحاظ یا ساس کے ڈر سے وہ کانپنے لگی یہ حالت دیکھ کر بسنت نے پاروتی کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا . . . . ٹھیک اسی وقت

مادھا جو جاگ اٹھی تھی پاروتی کو تلاش کرتی ہوئی اوپر پہونچی۔ کمرہ کا ایک دروازہ کچھ کھلا ہوا تھا اس کے سامنے پہونچتے ہی رادھا اس طرح چونک اٹھی جیسے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا ہو ——— دوپہر کی روشنی میں یہ نظارہ دیکھ کر نئی روشنی سے متنفر قدیم خیالات پر جان دینے والی ماں سناٹے میں آگئی اور چپ چاپ اُلٹے پاؤں نیچے اتر گئی۔ وہ دل میں سوچ رہی تھی ——— "رام! رام! میری بھی ایک دن شادی ہوئی تھی مگر میں نے تو ایسی بے شرمی سے کبھی کام نہیں لیا۔ کلجگ کا زمانہ ہے جو کچھ نہ ہو جائے تھوڑا ہے"

(۲)

ہوا اور آگ کا میل ہو گیا۔ ادب و لحاظ سب کچھ محبت کی آگ میں جل کر خاک سیاہ ہو گئے۔ بیوی کی تربیت ہی بسنت کی زندگی کا اصلی مقصد ہو گیا۔ لوک لاج سے اس نے چشم پوشی اختیار کر لی اب پاروتی دن رات بسنت کے کمرہ میں رہنے لگی پاروتی یتیم تھی اس کے ماں باپ مر چکے تھے خیال تھا کہ سسرال میں اُسے آرام ملے گا مگر یہاں آتے ہی رادھا نے اسے گھرستی میں ایسا جکڑا کہ اُسے آرام ہی نہ ملا اس کا حُسن و شباب مٹی میں ملنے والا تھا مگر بسنت نے ٹھیک وقت پر سوکھے ہوئے کھیت کو حمیت کی آبیاری سے شاداب کر دیا اس کی ناز برداریوں سے پاروتی کے دل کا باغ لہلہانے لگا۔

پاروتی حُسن کی دیوی تھی مگر وہ تعلیم یافتہ نہ تھی بسنت نے اس کو پڑھانا شروع کر دیا۔ پہلے پہل تو دیہاتی لڑکی پڑھنے سے گھبرائی مگر پھر مجبوراً اس کو شوہر کا حکم ماننا پڑا۔ جب دیکھئے کمرہ میں بیٹھی ہوئی سر ہلا ہلا کر پڑھتی رہتی تھی اور ماسٹر صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے قانونی کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہتے تھے بیچ بیچ میں ترچھی نظروں سے شاگرد کی طرف بھی دیکھتے جاتے تھے کہ وہ جی لگا کر پڑھتی ہے یا نہیں۔ کبھی ایسا بھی ہو جاتا کہ بسنت اپنی کتاب بند کر کے یکبارگی پکار اٹھتے ——— "پاروتی!" پاروتی چونک اٹھتی اور گھبرا کر بسنت کی طرف دیکھنے لگتی۔ اس وقت اس کی ہرنی سی نشیلی آنکھیں ایسی پیاری معلوم ہوتیں کہ بسنت بیتاب ہو جاتا اور کہتا —— "اچھا اب اپنی کتاب میرے پاس... تو لاؤ دیکھوں تو سہی تم کیا پڑھتی ہو؟" پاروتی گھبرا جاتی کہ کہیں ماسٹر صاحب امتحان نہ لینے لگیں۔ کیونکہ امتحان میں پاس ہونے کی اسے بہت کم امید ہوا کرتی تھی بہت کوشش کرنے پر بھی اس کا جی پڑھنے میں نہ لگتا تھا وہ سبق پڑھ کر جتنا یاد کرنے کی کوشش کرتی اتنا ہی کالے کالے حروف چیونٹیوں کی قطار کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے سے نکلتے جاتے تھے۔

ماسٹر صاحب کے بلانے پر پاروتی ملزم کی طرح ڈرتے ڈرتے کتاب لے کر جاتی۔ بسنت اپنا ایک ہاتھ اس کی کمر میں اس طرح سے ڈال دیتا کہ وہ بھاگ نہ سکے اور دوسرے ہاتھ میں کتاب لے کر کہتا۔ ۔ ۔ ۔

. . . . اچھا

بتاؤ آج کتنا پڑھا ہے" پاروتی جتنی سطروں پر اس کی نظر پڑتی انگلی سے بتا دیتی۔ بسنت حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا۔ " اوہو! بہت پڑھ ڈالا مجھ کو دیکھو میں تو کچھ بھی نہیں پڑھ سکا"

بھولی بھالی پاروتی حیرت زدہ ہو کر کہتی۔ " تو اتنی دیر تک آپ کیا کرتے رہے؟"

بسنت اس کی ٹھوڑی پکڑ کر کہتا ـــ " میں ایک بیدرد۔ سنگدل دیوی کا درشن کر رہا تھا اور وہ میری طرف دیکھتی بھی نہ تھی ـــــــ"

پاروتی اس کا جواب دے سکتی تھی مگر لاج کے مارے اور پریم کے دباؤ سے وہ اپنی ہار مان لیتی تھی۔ کسی کسی دن بسنت کہیں باہر جاتا تو موقع پاکر پاروتی پڑھنے میں لگ جاتی اتنے میں بسنت نہ معلوم کہاں سے دبے پاؤں آکر پیچھے سے اس کی آنکھیں بند کر لیتا اور کہتا ـــــــ " اچھا بتاؤ! میں کون ہوں؟" اس پر پاروتی اپنی آنکھوں سے بسنت کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرتی ہوئی کہتی ـــ " واہ جی واہ! میں جان گئی بس اب آنکھیں کھول دو۔ آپ میرے ہردیشور ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نہ؟" اس پر بھی بسنت ہاتھ نہ ہٹاتا تو پاروتی اس کے ہاتھوں میں چٹکیاں لینے لگتی اور کوشش کر کے یکبارگی کھڑی ہو جاتی اس طرح سے اس کی آنکھیں تو کھل جاتیں لیکن اس کے دونوں ہاتھ بسنت تھام لیتا۔ اس "جنگ عظیم" میں پاروتی کے رخسار بیر بہوٹی کی طرح سرخ ہو جاتے کتاب دور گر جاتی اور ساڑی کا پلہ سر سے کھسک کر کندھے پر اور پھر وہاں سے سینہ پر سے گذر کر پاؤں پر گر پڑتا۔ اپنی اس بے بسی پر پاروتی کو غصہ آجاتا اور وہ رو پڑتی ـــ بس جنگ عظیم، فوراً ختم ہو کر صلح کی کارروائی شروع ہو جاتی۔

پاروتی کے پڑھنے کے وقت جب بسنت اس کو بہت پریشان کرتا تو وہ کتاب بند کر کے کہتی۔ " تو کیا آپ مجھے جاہل رکھنا چاہتے ہیں؟"

" تو تمھاری کرپا سے میں ہی کون پنڈت ہوا جاتا ہوں"

یہ سنکر پاروتی اٹھ کر چلنے کے لئے تیار ہو جاتی اور کہتی۔ " اچھا اب میں سمجھ گئی میری وجہ سے آپ کے پڑھنے میں حرج ہوتا ہے۔ اب میں یہاں نہ بیٹھوں گی لو جاتی ہوں ـــ"

بسنت اس کا ہاتھ تھام کر پھر بٹھا لیتا اور کہتا ـــ " اس کا حال تم کیا جانو مجکو چھیڑ کر تم بآسانی پڑھنے لگتی ہو مگر تم کو چھیڑ کر پڑھنا میرے لئے آسان نہیں ہے"

" اچھا جب آپ یہاں نہ رہا کریں گے تو میں پڑھا کروں گی"

" یہ تو میں ہرگز پسند نہ کروں گا"

" کیوں"

"اس لئے کہ تمھارا جی پڑھنے میں لگ جائے گا تو پھر تم مجھے بھول جایا کرو گی "

" واہ ! واہ ! کیا بات بنائی ہے "

اسی قسم کی نوک جھونک دونوں میں ہوتی رہتی تھی اس کے بعد کنوار کی ہلکی بارش کی طرح رونا دھونا شروع ہو جاتا جیسے دھوپ میں کبھی کبھی ترشح ہو کر یکایک بند ہو جاتا ہے اسی طرح پاروتی کا بھی حال تھا سوتی بھی تھی اور ہنستی بھی تھی۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہونا چاہئے وہی ہوا نہ تو بسنت ہی وکالت پاس کر سکا اور نہ پاروتی ہی اپنی پہلی کتاب ختم کر سکی۔

(۳)

پاروتی اور بسنت تو پریم لیلا میں پھنسے تھے اور رادھا گرہستی کے کاموں میں پسی جا رہی تھی اس کو کسی وقت آرام نہ ملتا تھا اگر پاروتی کوئی کام کرنے کے لئے تیار بھی ہوتی تو رادھا کہتی ——— " رہنے دو مہارانی ! تم کیوں تکلیف اٹھاتی ہو بسنت دیکھ لیگا تو خفا ہو گا جاؤ جاؤ آرام کرو پڑھ لکھ کر بندنا ئن بن جاؤ۔ مجھے تمھاری ضرورت نہیں بڑھی ہوں تو کیا میں اب بھی گرہستی کا کام تم ایسی نازک بدن لڑکیوں سے زیادہ اچھی طرح سے کر سکتی ہوں۔ جیتے جی بھگوان مجکو تمھارا محتاج نہ بنائے " یہ الفاظ پاروتی کے دل پر تیر کی طرح سے لگتے ان الفاظ میں کتنا زہر بھرا تھا یہ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی لیکن سمجھ کر بھی کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ رادھا کی خواہش تھی کہ ہمیشہ کی طرح پاروتی اس کے اشارہ پر چلے مگر اب یہ محال تھا پاروتی اپنے شوہر کو ناخوش نہیں کرنا چاہتی تھی اور اب جبکہ وہ بڑی آزادی سے اپنے شوہر کی محبت کا لطف اٹھا رہی تھی وہ ساس کی خوشامد کیوں کرتی۔ عرصہ تک اسی طرح کام چلتا رہا لیکن ہڈیوں کا ڈھانچہ کہاں تک کام دیتا بوڑھی اور کمزور رادھا محنت۔ رنج و غم اور جلن سے بیمار پڑ گئی شروع میں معمولی زکام ہوا اور پھر اسی نے رفتہ رفتہ مہلک بیماری کی صورت اختیار کر لی اور رادھا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر پرلوک سدھاری۔ پاروتی اور بسنت کو بہت صدمہ ہوا لیکن رفتہ رفتہ سب رنج و غم دور ہو گیا اور پھر دونوں محبت کے گہوارے میں جھولنے لگے۔ مگر اب یہ وقت پیش آئی کہ گرہستی کا کام کیسے چلے۔ پاروتی آرام طلب ہو چکی تھی جو کا برتن تو کہارن کر دیتی تھی لیکن پاروتی کو کھانا پکانا پڑتا تھا کچھ دن تک تو اس نے کسی نہ کسی طرح کام چلایا لیکن پھر بیمار پڑ گئی اب بسنت گھبرا گئے ان کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ کام کیسے چلے۔ پاروتی کے میکے " بسیڑھی " میں انکی ایک چچیری بال ودھوا بہن مایا جو اس سے دو چار سال بڑی تھی رہتی تھی۔ بسیڑھی ایک ویران مقام پر چھوٹا سا گاؤں تھا اسی گاؤں میں مایا ناامیدی کے تاریک سمندر میں غوطے کھاتی ہوئی باغ کی اس بیل کی طرح جس کی جڑ پہلے ہی سے کٹی ہوئی ہو اپنے باپ کے ساتھ دن کاٹ رہی تھی ماں لڑکپن ہی میں مر چکی تھی۔ ایک دن پاروتی نے مایا کو یاد کیا اور بسنت

سے کہا۔ "اگر کہو تو مایا کو میں یہاں بلالوں بڑی نیک لڑکی ہے اس سے مجکو بڑی مدد مل جائے گی۔"
بسنت۔ "بھلا تمھارے جیجا اس کو یہاں آنے کی کیوں اجازت دیں گے"
پاروتی۔ "میری بیماری کا حال سنکر وہ مایا کو ضرور بھیجدیں گے۔ مایا میری سہیلی ہے اس کے آنے سے میری طبیعت بھی بہل جائے گی"

بسنت نے دوسرے ہی دن مایا کو بلوا بھیجا اور وہ رانی پور آگئی۔ شام کا وقت تھا جب مایا بہلی سے اُتر کر پاروتی کے گھر میں داخل ہوئی اس وقت بسنت کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ پاروتی پلنگ پر پڑی تھی مایا کو دیکھتے ہی وہ خوش ہوکر اُٹھ بیٹھی — "آؤ جیجی! اچھی تو رہیں تم نے تو کبھی بھول کر بھی میری خبر نہ لی"

مایا۔ "بس رہنے دے باتیں نہ بنا یہ تو کہتی نہیں کہ سسرال میں آکر ہم غریبوں کو بھول گئی الٹا مجھے الزام دیتی ہے خیر یہ باتیں تو پھر ہوتی رہیں گی یہ تو بتا کہ تیرا یہ کیا حال ہوگیا۔ جیجا سے اچھی طرح بنتی تو ہے نہ؟"

پاروتی نے مسکرا کر کہا۔ "ہاں خوب۔ پرماتما کا ہزار ہزار شکر ہے" وہ "مجھ پر بہت مہربان ہیں مجھے یہاں کسی بات کی تکلیف نہیں۔ رہ گئی میری بیماری کو سچی بات یہ ہے کہ ساس جی ہی گھر کا سب کام کرتی تھیں۔ ان کے مرنے کے بعد سے گرہستی کا کام مجکو سنبھالنا پڑا کام کرنے کی عادت نہ تھی اس وجہ سے بیمار پڑگئی جیجی! میں نے اسی وجہ سے تم کو تکلیف دی ہے کہ تم میرا گھر سنبھال لو مجھ اکیلی جان سے گرہستی کا کام نہیں سنبھل سکتا اب تم کو یہاں سے کبھی نہ جانے دوں گی —— مگر جیجی! ایک بات کہتی ہوں دیکھو برا نہ ماننا تم میری بہن ہو اور میں نے تم کو اسی رشتہ سے بلایا ہے کہیں کچھ اور خیال نہ کرنا"

مایا نے منھ بنا کر کہا۔ — "واہ ری پگلی! بھلا اس میں کون برا ماننے کی بات ہے۔ کسی غیر کا تو کام ہے نہیں یہ تو اپنا کام ہے دونوں میں اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں کہ بسنت آگئے۔ مایا نے اس سے پہلے بسنت کو نہ دیکھا تھا وہ خاموش ہوگئی"

پاروتی نے بسنت سے کہا —" یہ لو میری مایا جیجی آگئیں۔ اب میری طبیعت اچھی ہو جائے گی"
بسنت نے مسکرا کر کہا — ضرور۔ کہو جیجی اچھی تو رہیں"
مایا نے کچھ شرما کر جواب دیا —" ہاں بھیا"

تعارف ہو جانے کے بعد سب نے کھانا کھایا۔ پاروتی اور بسنت تو اپنے کمرہ میں چلے گئے اور مایا کو ایک دوسرا کمرہ جو اُن کے کمرہ سے کچھ دور پر تھا رہنے کو مل گیا۔ دن بھر کی تھکی مایا بہت جلد نندیا دیوی کی گود میں سوگئی۔

(۴)

رات میں تو مایا کو گھر دیکھنے کا اچھی طرح سے موقع نہ ملا تھا صبح کو اس نے دیکھا کہ گھر بہت ردی حالت

میں ہے صحن میں کوڑا کرکٹ کا انبار لگا ہے رسوئی گھر میں کوئی چیز سلیقہ سے نہیں رکھی ہوئی ہے۔ مایا نے سب سے پہلے گھر کی صفائی کی بسنت کے کمرہ کو صاف کیا اور پھر کھانا پکایا۔ اس دن بسنت نے کھانا کھایا تو بہت تعریف کی پاروتی بھی بہن کی تعریف سنکر بہت خوش ہوئی۔ اب وہ پھر آزاد ہوگئی اسے کوئی کام نہ کرنا پڑتا تھا اس نے بھنڈار خانہ کی کنجی مایا کو دیتے ہوئے کہا۔ "بس جیجی اب میں بے فکر ہوگئی اب تم میرا گھر سنبھال لوگی۔"

مایا نے کنجی واپس کرنیکی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں پاروتی! اس کو تم اپنے پاس ہی رکھو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے"

پاروتی۔ "بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کنجی تم اپنے ہی پاس رکھو۔ کیا تم مجکو اپنی بہن نہیں سمجھتی ہو؟"

مجبوراً مایا نے کنجی لے لی۔ اب مایا ہی تمام گھر کا انتظام کرتی تھی اس نے تھوڑے ہی دنوں میں پاروتی کا گھر بنا دیا وہی گھر جو پہلے گندگی کا مخزن تھا اب رشک چمن بن گیا۔ پاروتی اور بسنت سوتے ہی رہتے لیکن مایا علی الصبح اٹھ کر ان کے کمرہ کو صاف کر آتی بسنت کی کتابیں جو ادھر ادھر بے ترتیبی سے پڑی رہتیں ان کو ٹھکانے سے رکھ آتی۔ مایا کی سلیقہ مندی نے آہستہ آہستہ بسنت کے دل میں جگہ پیدا کرلی تھوڑے دن تک مایا بسنت سے بے تکلف نہ ہوئی ایکدن پاروتی نے مایا سے کہا "جیجی! تم "ان" سے شرماتی کیوں ہو انسے خوب بے تکلف کر باتیں کیا کرو۔"

مایا اس کے جواب میں مسکرا کر چپ ہوگئی اتفاق سے بسنت بھی اس موقع پر آگئے اور انھوں نے بھی شکوہ کیا کہ مایا ان سے کیوں بات نہیں کرتی۔ اس دن سے مایا بسنت سے کچھ کچھ باتیں کرنے لگی اور رفتہ رفتہ وہ بالکل بے تکلف ہوگئی۔ پہلے وہ اس جگہ سے ہٹ جاتی تھی جہاں مایا اور بسنت ہنستے بولتے تھے روکنے سے بھی نہ ٹھیرتی تھی مگر اب وہ ان کی ہنسی مذاق میں بھی حصہ لینے لگی۔ جب پاروتی کبھی بسنت کا مذاق اڑاتی تو مایا بھی پاروتی کا ساتھ دیتی۔ میل جول اور بات چیت ہی سے کسی کی خوبی یا برائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بسنت کی نگاہوں میں مایا کی قدر و وقعت بڑھنے لگی اب اُسے مایا کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی خوبی نظر آنے لگی۔

مایا نے بائیسویں سال میں قدم رکھا تھا اس لحاظ سے وہ ایک شگفتہ پھول تھی لیکن ایسا پھول جو عموماً دوپہر کے وقت کملاتا ہے اور دھوپ سے مرجھانے لگتا ہے۔ مایا کے خوشنما چہرہ پر ایک خاص قسم کی رونق ضرور تھی لیکن ایسی رونق جو عموماً دوپہر کے وقت پھولوں پر ہوتی ہے جن پر صبح کی شبنم سے بنائے ہوئے پھولوں کی صباحت اور نسیم سحری کے پنکھا جھلے ہوئے تازگی کے آثار کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ مایا کی آنکھوں میں نشۂ شباب سے سرخ ڈورے دوڑ رہے تھے۔ مگر ماتھے پر سیندور کا ٹیکہ اور مانگ میں سہاگ کی لکیر نہ تھی کیونکہ وہ بیوہ تھی اور ایسی بدنصیب بیوہ جس کا سہاگ لڑکپن ہی میں اُجڑ گیا تھا۔ اور اب وہ بیوگی کی آگ میں جل رہی تھی۔ اس کے حسن و شباب پر خزاں نے اپنا قبضہ جما رکھا تھا۔

عرصہ تک پانی نہ ملنے سے جس طرح پودا مرجھانے لگتا ہے لیکن پانی پاتے ہی وہ لہلہا اٹھتا ہے۔ وہی حال مایا کا بھی ہوا جب اس پر پاروتی کی محبت اور بسنت کی عنایت کی بارش ہوئی تو اس کا غنچۂ دل کھل اٹھا اس کے چہرہ پر شگفتگی آگئی۔ گلاب کے پھول پر گرد جم گئی تھی ہوا کے ایک خوشگوار جھونکے نے وہ گرد اڑا دی اور پھول نکھر کر نہایت خوبصورت معلوم ہونے لگا۔

برکھا رت کی اندھیری رات تھی زمینداری کے کام سے بسنت کسی دوسرے گاؤں میں گیا ہوا تھا واپس ہونے میں اسے بہت دیر ہو گئی۔ مایا کھانا پکا کر پاروتی کے کمرہ میں بیٹھی ہوئی ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھی پاروتی نے کہا ــ "رات زیادہ ہو گئی ہے آسمان گھرا ہے پانی برسنے والا ہے مگر وہ، اب تک واپس نہیں آئے"

مایا۔ "آتے ہی ہوں گے"

پاروتی۔ "میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے میں تو اب سوتی ہوں وہ آئیں تو بھوجن پروس دینا۔ تکلیف تو ہوگی"

"نہیں نہیں تکلیف کس بات کی اچھا تم آرام کرو" یہ کہکر مایا رسوئی گھر میں چلی گئی اور آرام طلب مایا تھوڑی دیر میں خراٹے لینے لگی بجلی کی چمک اور بادل کی گرج میں بسنت گھر میں داخل ہوا اب پانی بھی برسنے لگا تھا مایا نے رسوئی گھر سے نکل کر کہا۔ "بارو (پاروتی) کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ وہ آپ کا انتظار کر کے سو گئی کہئے بھوجن پروس دوں"

"اوہو تو کیا تم اب تک میرے ہی انتظار میں بیٹھی ہو"

مایا کے رنگیلے رسیلے ہونٹ اس کا جواب دینے کے لئے پھڑک اٹھے لیکن وہ صرف "جی ہاں" کہہ سکی۔ اس وقت بجلی پھر چمکی سفید دھوتی میں مایا کا چہرہ جگمگا اٹھا بسنت کی آنکھیں چوندھیا گئیں بسنت نے سنبھل کر کہا۔ "اچھا میں رسوئی گھر ہی میں آتا ہوں وہیں بھوجن کروں گا کمرہ میں کھانا لانے کی ضرورت نہیں"

بسنت کپڑے بدلنے کے لئے اپنے کمرہ میں چلا گیا اس عرصہ میں مایا نے جلدی جلدی آگ جلا کر گرم گرم پوریاں تل ڈالیں۔ بسنت آیا تو اس نے آسن بچھا کر بھوجن پروسا اور بسنت کے سامنے رکھدیا۔ آج خلاف معمول بسنت کو ہمیشہ سے زیادہ کھانے میں مزہ ملا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ "مایا! اُف مایا! کتنی ہنرمند۔ سلیقہ شعار اور دلکش لڑکی ہے۔ اس کی آنکھوں میں تو جادو بھرا ہے" بسنت نے نظر اٹھا کر مایا کی طرف دیکھا وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی تھی بسنت کی زبان سے بے خودی میں نکل گیا ــ "مایا!" مایا نے سر اٹھایا بسنت اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا دونوں کی نظریں لڑ گئیں مایا کانپ اٹھی بسنت کا دل مچل اٹھا۔ اس کی زبان سے نکل گیا۔ "آہ تم کتنا اچھا کھانا پکاتی ہو اور کھانے ہی کا کیا ذکر تمھاری تو ہر بات بہت اچھی معلوم ہوتی ہے

اور کیوں نہ ہو جب تم خود اچھی ہو ——" مایا نے شرما کر سر جھکا لیا وہ پھر بسنت سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ کر سکی " اور کیوں نہ ہو جب تم خود اچھی ہو ——" یہ صدا اس کے کانوں میں بار بار گونجنے لگی۔ آج تک کسی مرد نے اس سے ایسی باتیں نہ کی تھیں۔ ایسی باتیں اس کے لئے معیوب تھیں —— مگر اس وقت مایا کا جی چاہتا تھا کہ بسنت برابر ایسی ہی باتیں کرتا رہے۔

کھانا کھانے کے بعد جب بسنت منھ ہاتھ دھو چکا تو مایا نے پان دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ بسنت نے اس کی انگلی کو دبا دیا مایا کو ایسا معلوم ہوا گویا بچھو نے ڈنک مار دیا اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور رسوئی گھر سے نکل کر اپنے کمرہ کی طرف بھاگی تمام صحن میں پانی بھرا تھا اس کا پاؤں پھسلا اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑی بسنت نے جلدی سے دوڑ کر اسے اٹھا لیا۔ مایا کی ناگن کی طرح لہراتی ہوئی لٹیں بسنت کے رخساروں کا بوسہ لینے لگیں اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مایا تڑپ کر بسنت کی آغوش سے جدا ہو گئی۔ شرم و غیرت سے وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

بسنت نے کہا —— " کہیں چوٹ تو نہیں لگی "

" نہیں " کہتی ہوئی مایا دوڑ کر اپنے کمرہ میں گھس گئی اور اندر سے زنجیر لگا دی۔ وہ تمام رات روتی رہی غیرت شرم و لحاظ۔ ڈر رسوائی یا اپنی بیکسی پر، یہ معلوم نہیں۔ ادھر بسنت کی بھی ساری رات بڑی بے چینی سے گذری۔ " کیا میں نے کوئی پاپ کیا ہے ؟ —— وہ گر پڑی تھی اس کو اٹھانا کیا میرا فرض نہیں تھا۔ مگر —— کیا میں بار دوست کو دھوکا نہیں دے رہا ہوں —— کہیں مایا میری شکایت بار دوست سے نہ کر دے —— اُف پھر تو میں منھ دکھانے کے لایق نہ رہ جاؤں گا۔ مگر او نھ! شکایت بھی کر دے گی تو میرا کیا ہوگا —— "

بسنت کی ساری رات اسی ادھیڑ بُن میں گذری۔

(۵)

اس کے بعد کئی دن تک پھر بسنت کو مایا سے ملنے کا موقع نہ ملا یا خود مایا ہی تنہائی میں بسنت کے پاس نہ گئی۔ بسنت کو جب یہ اطمینان ہو گیا کہ مایا نے بار دوست سے اس کی شکایت نہیں کی تو وہ دل میں بہت خوش ہوا۔ اور اب اس کی ہمت بڑھ گئی لیکن جتنا وہ مایا کے قریب پہونچنے کی کوشش کرتا مایا اتنا ہی اس سے دور بھاگتی مگر یہ حالت بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ برسات میں ندی جب جوش پر آتی ہے تو اس کی تھاہ نہیں ملتی پھر بھی ملاح تھاہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح مایا بھی بسنت کے دل کی تھاہ لے رہی تھی وہ عورت تھی اور ایسی عورت جس کا سہاگ اجڑ چکا تھا جو سماج کی ستائی ہوئی تھی جس نے محبت کا کبھی مزہ ہی نہ چکھا تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کے دل میں محبت کے جذبات نہ تھے یا اس کا دل محبت سے خالی تھا وہ

پریم کی پیاسی تھی اس کی دلی خواہش تھی کہ کوئی اس سے محبت کرے اور وہ بھی اس کے بدلے میں اپنی محبت پیش کرے لیکن سماج کے ڈر سے اُسے اس کا موقع ہی نہ ملتا تھا وہ اپنی خواہش کو دبائے ہوئے تھی مگر جب سماج ہی نے اس کا موقع دیا تو اس کے دل سے محبت کا دریا پھوٹ نکلا۔ اتفاق سے وہ ایسے گھر میں پہونچی۔ جہاں اس کو سماج کے ایک خوش مزاج مرد نے شراب محبت کا پیالہ پیش کیا وہ انکار نہ کرسکی۔ جس طرح راکھ میں دبی ہوئی چنگاری ذرا سا کریدنے سے چمک اٹھتی ہے اسی طرح مایا کی محبت کی آگ بھی بھڑک اٹھی جس نے شرم و لحاظ اور خوف رسوائی کو جلا کر خاک کر دیا۔

بسنت کا عجیب حال تھا اب اس کو مایا کا لب ولہجہ اتنا دلکش اور سرور انگیز معلوم ہوتا کہ اس پر ایک بیخودی سی طاری ہو جاتی مایا کے ایک ایک لفظ میں بسنت نے وہ اثر محسوس کیا کہ بھولی بھالی پاروتی کی پریم رس میں بھری باتیں اسے پھیکی معلوم ہونے لگیں سچے موتی کی آب وتاب کو جھوٹے موتی کی عارضی چمک نے ماند کر دیا۔ شرابی نشہ کے بعد درمیان ہی میں خمار آنے پر پھر شراب پینے کی خواہش کرتا ہے تاکہ رنگ جما رہے مگر یہ نشہ پاروتی کہاں سے لائے وہ مایا کے جال سے بے خبر تھی بسنت کی طرف سے اس کو اطمینان تھا اپنی بہن پر پورا بھروسہ تھا عین اس خمار کی حالت میں جب مایا نے پرانی شراب نئے رنگین پیالہ میں بھر کر ایک عجیب ادا سے بسنت کو پیش کی تو وہ مدہوش ہو گیا اس کا سر ساقی کے قدموں پر جھک گیا مگر بسنت کی مدہوشی نے مایا کے قدموں کو بھی ڈگمگا دیا بہت کوشش کرنے پر بھی وہ سنبھل نہ سکی اور خود بھی نشہ میں چور ہو گئی

سردرُت تھی صاف شفاف دن تھا آسمان نیلگوں تھا دو پہر کے سناٹے میں پاروتی سو رہی تھی۔ مگر جوانی سے دیوانی مایا اپنی آرام گاہ میں فرشی تکیہ کے سہارے لیٹی ہوئی اپنے مستقبل کے متعلق کچھ سوچ رہی تھی اس وقت اسے یہ بھی خیال نہ تھا کہ اس کے سر پر کوئی کپڑا بھی ہے یا نہیں۔ وہ ایک نیمہ آستین اور سفید دھوتی پہنے ہوئے تھی وہ دھوتی سر سے سرک کر کمر کے گرد لپٹ گئی تھی اور نیمہ آستین بھی اپنا فرض اچھی طرح سے نہیں ادا کر رہی تھی۔ اتفاق سے بسنت کسی کام سے مایا کے کمرہ کی طرف نکل گیا سوانتی کو دیکھ کر متوالا پپیہا آپے میں رہے یہ محال ہے مایا کے پلنگ سے دو قدم کے فاصلہ پر پہونچ کر بسنت ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ سب بناؤ اسی کو تڑپانے کے لئے کئے گئے ہیں اس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ "اُف مایا! اس وقت تم کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی ہو" یہ کہتے ہی اس کے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھ گئے۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ مایا کو گلے لگانا چاہتا ہے۔ مایا گھبرا کر اٹھی اور بسنت سے دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ خوف اور شرم سے اس کے چہرہ کا رنگ غروب ہونے والے آفتاب کی طرح سُرخ ہو گیا اس نے کمرہ سے باہر نکل جانے کے لئے قدم بڑھایا مگر بسنت نے روکتے ہوئے کہا۔ "مایا! ہاتھ جوڑتا ہوں ٹھہر جاؤ۔ صرف تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جاؤ۔" مایا کے قدم

میں جیسے کسی نے زنجیر ڈال دی بسنت کی محبت آمیز آواز سنکر پاؤں ہی نہیں بلکہ سارے جسم نے ایک مٹی کے بنے ہوئے بت کی سی شکل اختیار کرلی۔ بسنت نے جرأت کرکے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور مایا کے کندھوں پر کانپتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ بسنت کے چھونے سے مایا کے دونوں گال سُرخ اور پیشانی پسینہ سے تر ہوگئی اس کی تمام شوخی اور تیزی نہ جانے کہاں چلی گئی اور وہ منتر کے بس میں آئی ہوئی ناگن کی طرح سر جھکائے خاموش کھڑی رہ گئی۔ بسنت نے مایا کے گلابی گالوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا —— "کیا مجھ سے خفا ہو ؟"

"نہیں ——"

"تو پھر مجھے کیوں دور بھاگتی ہو۔ مجھ سے ہنس کر باتیں کیوں نہیں کرتی ہو۔"

"مجھ سے باتیں کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔ مجکو میرے حال پر پڑا رہنے دیجئے۔ اگر آپ کی یہ منشا ہے کہ میں اس گھر کو چھوڑ دوں تو اچھی بات ہے میں کل بیسٹرس چلی جاؤں گی۔ اچھا بس اب آپ یہاں سے چلے جائیے۔"

"میں کیا کروں اپنے دل کے ہاتھوں سے مجبور ہوں مایا !"

"ایسے دل کو نکال کر پھینک دیجئے جو پاپ ساگر کی طرف لئے جارہا ہو" یہ کہکر مایا نے بسنت کے دونوں ہاتھوں کو ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے کندھوں سے ہٹادیا اور کسی قدر ہٹ کر بولی۔ "آپ کا کیا بگڑے گا آپ مرد ہیں مگر میں دکھیا تو کہیں کی نہ رہوں گی، سماج میں کہیں مجھے جگہ نہ ملے گی"

"اونھ ! سماج کا کیا ذکر۔ سماج کو میں ٹھیک کرلوں گا اس کو ہمارے تعلقات کا پتہ ہی نہ چلنے پائے گا"

"جی ہاں پتہ نہ چلنے پائے گا۔ یہ خوب کہی ! آپ کو باتیں بنانی خوب آتی ہیں مگر میرے حال پر کرپا کیجئے اور فوراً یہاں سے چلے جائیے کہیں پاروتی آگئی تو میں منہ دکھانے کے لائق نہ رہ جاؤں گی"

بسنت نے گویا کچھ سنا ہی نہیں اس نے مایا کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "تو اچھا صرف دو منٹ جی بھر کر اس چاند سے مکھڑے کو تو دیکھ لینے دو"

زور سے جھٹکا دے کر مایا نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور پاروتی کے کمرہ میں چلی گئی۔

(۶)

اب پاروتی کو بسنت گویا بھول گیا تھا وہی پاروتی جسکو وہ کسی وقت اپنی آنکھوں کے سامنے سے اوجھل نہ ہونے دیتا تھا وہی پاروتی جس کے لئے اس نے اپنی ماں کی بھی کچھ پرواہ نہ کی تھی اب دن رات اپنے کمرہ میں پڑی رہتی تھی۔ بسنت کے دل کا حال اس سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ بسنت اب پاروتی سے بہت کم بولتا تھا کچھ عرصہ تک تو اس نے پاروتی کا لحاظ کیا لیکن پھر اس نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی اب اس کا زیادہ وقت مایا سے ہنسی مذاق میں گذرتا تھا۔ ہر وقت اس کی زبان پر مایا ہی کی تعریف رہتی تھی۔ وہی پاروتی جو کبھی مایا کی تعریف سنکر

خوش ہوا کرتی تھی، وہی اب مایا کی تعریف سنکر جلنے لگی۔ اب تو اُسے مایا کی صورت سے بھی نفرت ہوگئی۔ مرد کے دل کو کس طرح سے اپنے قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ مرد کس بات سے خوش ہوتا ہے یہ اس کو معلوم نہ تھا بسنت اس کو بغیر کسی کوشش اور محنت کے بڑی آسانی سے مل گیا تھا اب اس کو مایا کے جال میں پھنسا دیکھ کر پاروتی تلملا اٹھی لیکن پھر بھی اس نے وہ طریقہ اختیار نہ کیا جس سے مایا کا جال ٹوٹ جاتا بلکہ اس کی ناتجربہ کاری نے اسے غلط راستہ پر ڈال دیا بسنت کو سنبھالنے کے بجائے وہ مایا سے لڑنے کو تیار ہوگئی اب وہ اُٹھتے بیٹھتے مایا کو طعنے دینے لگی لیکن مایا نے برا نہ مانا اس نے پاروتی کے طعنوں کو بڑی خندہ پیشانی سے سنا اور خاموش رہی۔ پاروتی کی یہ حرکت بسنت کو بہت بُری معلوم ہوئی اور اُس نے پاروتی کو بہت لعنت ملامت کی اور ضد میں آکر پاروتی سے ملنا جلنا بالکل بند کر دیا اب وہ ہر کام مایا ہی کے اشارہ پر کرتا مایا ہی کی خاطر داری اور ناز برداری اس کی زندگی کا خاص مقصد ہوگیا اب مایا ہی گھر کی ملکہ تھی لیکن مایا ہمیشہ پاروتی کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی مگر اس کا نتیجہ اُلٹا ہی ہوتا تھا ایک دن پاروتی نے مایا کو خوب گالیاں سنائیں مایا جو اب تک خود کو سنبھالے ہوئے تھی گالیاں سنکر اپنے غصہ کو نہ ضبط کر سکی اس نے کہا " زبان سنبھال کر بات کر"

" مجھے تم سے ایسی اُمید نہ تھی " پاروتی نے منھ بنا کر کہا۔

" کیسی ؟ "

" خود اپنے دل سے پوچھ لو "

" میں کچھ نہیں سمجھی "

" سمجھ کر بھی نہ سمجھو تو بھلا کوئی کیسے سمجھا سکتا ہے "

" تو صاف صاف کیوں نہیں کہتی ہو دل میں رکھنے سے کیا فائدہ ۔ میں تو تمھاری خدمت کرنے یہاں آئی تھی اگر اب تم کو میری خدمت کی ضرورت نہیں ہے تو مجھے بسیرا ھی بھیجدو۔ یہ روز روز کے طعنے شکوے مجھ سے اب نہیں سنے جاتے "

" میں نہ کہوں مگر دنیا کی کون زبان بند کر سکتا ہے۔ مجھے یہ کیا معلوم تھا کہ خدمت کے صلہ میں تم میرے پتی کو مجھ سے چھین لوگی اگر مجھے یہ پہلے معلوم ہوتا تو میں تم کو ہرگز نہ بلاتی "

مایا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا ــــ " پاروتی تمھارا خیال غلط ہے۔ پرماتما جانتا ہے کہ میرا دل اب تک پاک ہے۔ تمھارا سوامی تم کو مبارک رہے "

" جیجی! باتیں نہ بناؤ۔ میں تمھاری چال کو خوب سمجھتی ہوں پہلے تو مایا کے جال میں پھنسا دیا اور اب کہتی ہو کہ تمھارا سوامی تم کو مبارک رہے "

مایا کی بھنویں تن گئیں اس نے تڑپ کر کہا۔ "پارو! سچ کہتی ہو عورتوں کی ذات ہی مایاوی ہوتی ہے۔ مجھ میں کیا مایا تھی یہ تو میں نہ جان سکی مگر تم نے جان لیا۔ اسی طرح تم میں کیا مایا ہے تم نہیں جان سکتیں مگر میں واقف ہوگئی۔ مجھ میں مایا ضرور تھی ورنہ ایسی نوبت کبھی نہ آتی میں نے کچھ جان کر اور کچھ نہ جان کر پھندا ڈالا ہے مگر اس میں میری کوئی خطا نہیں تم نے ہی مجھے اس کا موقع دیا ہماری جاتی کا دھرم ہی ایسا ہے۔ میں نے قسم بھی کھائی لیکن تم نے یقین نہ کیا اچھی بات ہے اب ہوشیار ہو جاؤ میں اب بتا دوں گی کہ مجھ میں کیا مایا ہے۔۔۔"

اتنا کہکر غرور۔ غصہ اور نفرت کی شکست سے مایا رو پڑی وہ پاروتی سے اور کچھ نہ کہہ سکی جلدی سے اٹھی اور اپنے کمرہ میں جاکر لیٹ رہی۔ شہد کی مکھی جب ضد پر آتی ہے تو جو بھی اس کے سامنے آئے اُسے کاٹ کھاتی ہے اسی طرح غصہ سے بھری ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی مایا بھی پاروتی کے گھر میں آگ لگانے کے لئے تیار ہوگئی اگر اُسے سکھ نہیں ملا تو وہ بھی اس کو جو اس کی راہ میں کانٹا ثابت ہوگا جلاکر خاک سیاہ کردے گی۔

(۷)

اُس دن مایا دن بھر اپنے کمرہ سے باہر نہ نکلی۔ شام کے وقت بسنت نے جب مایا کو نہ دیکھا تو اس نے گھر کی کہارن سے دریافت کیا اس نے پہلے تو چھپانا چاہا لیکن جب بسنت نے بہت مجبور کیا تو کہا۔ "وہ اپنی کوٹھری میں ہیں ملکن سے کچھ بات ہوگئی ہے مگر کون بات ہوئی ہے یہ مجکو نہیں معلوم، رام جانیں"

بسنت کے تن بدن میں آگ لگ گئی اس نے پاروتی سے جاکر غصہ میں پوچھا۔ "مایا کہاں ہے؟"

"واہ ری مایا! مایا ہی سب کچھ ہے میں کچھ نہیں بہت دنوں کے بعد بات بھی کی تو وہی مایا کا ذکر! سچ ہے مرد کی ذات بڑی بے وفا ہوتی ہے۔۔" یہ سوچ کر پاروتی کے دل پر چوٹ لگی اور اس نے تڑپ کر جواب دیا۔

"میں کیا مایا کے پیچھے پھرا کرتی ہوں۔ تمھارے دل میں تو ہر وقت مایا بسی رہتی ہے اُسی دل سے پوچھ لو کہ مایا کہاں ہے؟"

غصہ کے مارے بسنت کا بُرا حال ہوگیا۔ سچی باتیں ہمیشہ کڑوی معلوم ہوتی ہیں مرد ہوکر وہ اپنی عورت سے شکست ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اُس نے بھی جل کر کہا۔ "مایا میرے دل میں ہے یا نہیں یہ تو پرماتما جانے لیکن اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ تم مایا کے جلن میں جلی جارہی ہو اس کی خوبیاں تمھاری آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہی ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ تم مایا کا کسی بات میں مقابلہ نہیں کرسکتی ہو۔ اب اس ضد میں تو میں تم کو اور جلاؤں گا دیکھوں تم میرا کیا بگاڑ سکتی ہو۔۔۔ راتی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی اس کے سوا اور کیا ہوگا؟ تم بے فائدہ مایا سے لڑا کرتی ہو اور آج بھی لڑی ہو یہ مجھے معلوم ہوگیا یاد رکھنا اس کا نتیجہ تمھارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔۔" اتنا کہکر بسنت مایا کے کمرہ میں پہونچا۔ پاروتی کی آنکھیں کھل گئیں نتیجہ کا خیال کرکے وہ کانپ اٹھی۔

بات اتنی بڑھ جائے گی یہ اس نے نہ سوچا تھا اس وقت بسنت کی دھمکی سن کر وہ پریشان ہو گئی اس کی آنکھوں میں سارا جہان تاریک معلوم ہونے لگا اس نے اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالا اور کچھ سوچ کر مایا کے کمرہ کی طرف چلی سر فتح ہو گی یا شکست۔ یہ سوچنے کا موقع نہ تھا مگر مایا کی یہ بات کہ "ہم عورتوں کی ذات ہی مایاوی ہوتی ہے" اُسے یاد آ گئی۔ پاروتی بھی عورت تھی اس میں بھی کوئی نہ کوئی مایا ہو گی پاروتی بھی اپنی مایا کا امتحان دینے کے لئے تیار ہو گئی۔ مایا کے کمرہ کا دروازہ کھلا تھا اور وہ پلنگ پر منھ لپیٹے پڑی تھی۔ پاروتی دروازہ ہی پر چھپ کے کھڑی ہو گئی کہ بسنت اُسے نہ دیکھ سکے۔ مایا نے کروٹ لی بسنت نے کہا —" مایا!"

محبت بھری آواز سنکر پیار کا دریا لہریں مارنے لگا وہ لہریں لطیف تھیں ان سے رگوں میں محبت کا رس دوڑ گیا

مایا نے سر اٹھا کر بسنت کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور پھر منھ چھپا لیا

بسنت نے عاجزانہ لہجہ میں کہا —" مایا! سچ بتاؤ آخر کیا بات ہے۔ کیا تم کو پاروتی نے کچھ کہا ہے"

مایا نے کچھ جواب نہ دیا مگر وہ رو پڑی۔ بسنت نے بیتاب ہو کر کہا۔" مایا! مایا! مت روؤ۔ ہاتھ جوڑتا ہوں مت روؤ۔ میں تمہاری یہ حالت نہیں دیکھ سکتا میری ہی وجہ سے تم کو بے فائدہ باتیں سننی پڑتی ہیں لیکن اب آیندہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا پاروتی بیوقوف ہے۔ نالائق ہے۔ میں اب اسکو ایسا سبق دوں گا کہ وہ بھی عمر بھر یاد رکھے گی۔ تم کو رنج کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اوبس اب اٹھو میں پاروتی کو اسی وقت گھر سے......" اس سے زیادہ بسنت کو کہنے کا موقع نہ ملا پاروتی یکایک کمرہ میں داخل ہوئی اور مایا کے قدموں پر گر کر رونے لگی وہ بڑی مشکل سے اتنا رک رک کہہ سکی —" جیجی! مجھے معاف کر دو اب میں تمہارے دل کو کبھی نہ دکھاؤں گی... مجھ سے غلطی ہوئی..... تم میری بڑی بہن ہو میری گستاخی کو"

مایا گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ پتی ورتا پاروتی کے چہرہ پر دکھ کی جلتی ہوئی آگ دیکھ کر مایا کے دل میں ایک جھجک پیدا ہوئی۔ رنج و غم کے تپے ہوئے پانی میں نہائی ہوئی بھولی بھالی پاروتی نے پراچین زمانہ کی دیویوں کی طرح اپنے من کو اور دیا اب وہ معمولی عورت نہیں تھی بلکہ کسی سادھوی عورتوں کی طرح ہو گئی تھی —— وہ ہار کر جیت گئی اور مایا جیت کر بھی ہار گئی۔ جب آگ بہت تیز ہوتی ہے تو پانی کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ پاروتی بچوں کی طرح سے بلک بلک کر رو رہی تھی مایا نے اُسے زور سے اپنے کلیجہ سے لگا لیا۔ مایا کا جال آناً فاناً ٹوٹ گیا۔ یہ موثر سین دیکھ کر پھر بسنت سے کمرہ میں نہ ٹھیرا گیا وہ دبے پاؤں باہر نکل گیا۔

(۸)

بھادوں کی اندھیری رات تھی گھر کے سب لوگ سو رہے تھے مایا چپکے سے اٹھی اور دبے پاؤں پاروتی کے کمرہ میں پہونچی وہاں پہونچکر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے بڑی مشکل سے اس نے اپنے دل کو سنبھالا اور بھنڈار خانہ کی کنجی پاروتی کے آنچل میں باندھ دی ایک مرتبہ حسرت بھری نظروں سے بسنت کی طرف دیکھا اور پھر وہاں سے نکل کر

دروازہ کھولا اور گھر سے باہر ہو گئی۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ غیر مانوس جگہ کی تاریکی میں صرف سیاہ رنگ کا پردہ ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ عجیب و غریب اسرار سے بھی بھرا ہوتا ہے اسکے اندر جتنی چمک نظر آتی ہے وہ ایک اجنبی اور غیر مفہوم زبان میں ہمکلام ہوتی ہے جسے نہ کوئی بولتا ہے نہ جانتا ہے۔ باغ کی گھنی پتیوں سے لدے ہوئے درختوں کی خاموشی اور چٹیل میدان کی ٹیڑھی ترچھی لکیروں نے بھادوں کی اندھیری رات میں دھندلی سی شکلیں اختیار کر کے مایا کو چاروں طرف سے گھیر لیا —— وہ بسنت کے یہاں بڑے آرام میں تھی اچھے سے اچھا کھانا اور عمدہ کپڑے پہننے کو ملتے تھے۔ وہ بے فکر تھی آزاد تھی لیکن اس کی قسمت میں عیش نہ لکھا تھا۔ پرائے مال پر اس کا کیا اختیار۔ مالک کے سوا کسی غیر کو باغ میں پھول توڑنے کی اجازت نہیں ہوتی جو غیروں کے باغ میں گھس کر رنگ برنگ کے خوشنما پھول کھلے دیکھ کر للچا اٹھتے ہیں یہ انکی غلطی ہے۔ اسی قسم کی غلطی یا بھول مایا سے بھی ہوئی وہ بھی بسنت کے گھر کو اپنا گھر سمجھ بیٹھی اُسے گھر کی اصلی ملکہ کا خیال ہی نہ رہا۔ لیکن جب وہ اس بھید کو سمجھ گئی تو پھر اس کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بسنت کے گھر کو چھوڑ دے چنانچہ یہی سب کچھ سوچ کر وہ اس تاریک رات میں بسنت کے گھر سے نکل پڑی لیکن اب جائے کہاں ؟ یہ اس کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا۔ زمانے کی ستائی اور سماج کی ٹھکرائی عورت کو کون پناہ دے سکتا ہے اس وقت اس کو اپنے وطن کا ٹوٹا پھوٹا گھاس پھوس کا جھونپڑا یاد آیا —— گھر کے سامنے کا پرانا تالاب جس میں بکثرت کائی جمی ہوئی تھی —— وہ نیم کا پیڑ جس میں وہ جھولا جھولا کرتی تھی —— بوڑھے باپ کی شکل —— بچپن کی سہیلیاں —— سب یاد آگئیں۔ اپنی شادی کا سماں آنکھوں کے سامنے پھر گیا —— سہاگ اجڑنے کی منحوس ساعت یاد آگئی —— وہ ایک بیخودی کے عالم میں کسی نامعلوم مقام کی جانب قدم بڑھائے چلی جا رہی تھی کہ یکبارگی بادل گرجا۔ بجلی چمکی اس کا سر چکرایا کسی چیز کی ٹھوکر لگی —— وہ بیہوش ہو کر زمین پر گری قلب کی حرکت بند ہو گئی اور وہ ہمیشہ کے لئے قید ہستی سے آزاد ہو گئی۔

تمام رات پانی برستا رہا۔ رات کی تاریکی ماں کی آنچل کی طرح مایا کے جسم کو ڈھانپے رہی۔ صبح کو جب مایا کی لاش جنگل میں ملی تو تمام گاؤں میں کہرام مچگیا۔ وہی بسنت جو کبھی مایا کے لئے اپنی جان تک قربان کرنے کے لئے تیار رہتا تھا اب اس کو مایا کی کریا کرم کرنے میں بھی غیرت معلوم ہوئی مگر اندر سے اس کا دل اس کو ملامت کر رہا تھا —— سماج نے بھی مایا ہی کو قصوروار سمجھا کسی نے اصلیت معلوم کرنے کی کوشش نہ کی —— سماج کی نظروں میں ایک بیکس بیوہ عورت کی ہستی و قعت ہی کیا رکھتی ہے وہ تو ایک بیکار شے سمجھی جاتی ہے پھر کسی کو کیا ضرورت تھی کہ بیکس بیوہ کی موت پر دو آنسو بہائے یا ہمدردی کا اظہار کرے۔ بیوہ کا فنا ہو جانا ہی سماج کے ٹھیکیداروں کے لئے خوشی کا باعث ہوتا ہے۔

اعظم کریلوی

جوش کی شاعرانہ لغزشیں

(مسلسل)

گزشتہ اشاعت میں جوش کی ایک نظم " ناخدا کہاں ہے " پیش کر کے بتایا جا چکا ہے کہ وہ کس حد تک بنگال کے مشہور شاعر قاضی نذر الاسلام کی نظم سے ماخوذ ہے اور اس میں کیا کیا فنی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح کی ایک نظم اور جناب جوش کی روزنامۂ ہند میں شائع ہوئی تھی جسکا عنوان " آوازِ شباب " تھا۔ اور جو قاضی نذر الاسلام کی دوسری نظم " باغی " سے ماخوذ تھی۔ قاضی صاحب کی نظم کا ترجمہ ۲۶ر اگست ۴۲ء کے ہند میں شائع ہوا تھا اور جوش صاحب کی نظم اس کے چودہ دن بعد ۸ر ستمبر کی اشاعت میں نکلی ـــــ مقصود و مدعا دونوں کا ایک ہے لیکن فرق یہ ہے کہ قاضی صاحب کی نظم میں ایک سرفروشانہ اقدام، ایک مجاہدانہ ولولہ پایا جاتا ہے اور جوش کی نظم اس صداقت سے معرا ہے۔ نذر الاسلام کھلا ہوا درسِ بغاوت و عدمیت کا دیتا ہے اور اپنا سینہ کھول کر حکومت کے تیغ و سناں کے سامنے بلا پس و پیش آ جاتا ہے، لیکن جوش اس پہلو کو بچا کر " کفر و ایمان " کا ذکر کرتے ہوئے صرف اتحادِ مسلم و غیر مسلم پر اپنے بیان کو ختم کر دیتے ہیں، الغرض ان دونوں میں بلحاظ اثر وہی فرق ہے جو صداقت و تصنع یا خلوص و تکلف کے درمیان پایا جاتا ہے۔

جوش نے اپنی نظم کا عنوان بھی نذر الاسلام کے ان الفاظ سے استنباط کیا ہے :-

" میں وہ نوجوان ہوں جس کی رگوں میں تازہ خون دوڑتا ہے "

" کہدے، اے جوانمرد کہدے کہ میرا سر ہمیشہ بلند رہے گا "

بہرحال جوش نے اپنی نظم کو کسی واقعی ولولہ سے مجبور ہو کر لکھا یا نہیں یہ امر زیادہ بحث طلب نہیں کیونکہ " قومیات " میں بلحاظ معنی کے ان کے کلام کی بے اثری تو خود ان کی زندگی سے واضح ہے، لیکن بہ لحاظ فنِ شعر کے (جس پر ان کو ناز ہے) اس نظم کا مطالعہ ہمارے دائرۂ بحث کے اندر ہے اس لئے اسی پر گفتگو مناسب ہے۔

اس نظم میں پیری سے مخاطبہ کیا گیا ہے یعنی ان لوگوں سے جو قدامت پرست ہیں۔ اور ان کے طریقِ کار کو غلط بتا کر شباب یا " نئی تہذیب " کے کارفرما ہونے کا اعلان کیا گیا ہے ـــــ اس نظم کا پہلا شعر ہے :-

ہوشیار اپنی متاعِ رہبری سے ہوشیار
اے غلش ناآشنا پیری و شیبِ ہرزہ کار

بہ لحاظ بندش و ترکیب اس شعر میں کوئی عیب نہیں لیکن بہ اعتبار معنی و بلاغت نقص موجود ہے اور وہ یہ کہ پہلے مصرعہ میں "پیری و شیب ہرزہ کار" کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ اپنی متاع رہبری کی طرف سے ہوشیار رہے۔ اور اسی طرح گویا فی المعنی شاعر نے "متاع رہبری" کو واقعی "متاع رہبری" تسلیم کرلیا ہے، درانحالیکہ مقصود شاعر کا بالکل اس کے خلاف ثابت کرتا ہے۔ یا تو اس کو بجائے "متاع رہبری" کے "متاع گمرہی" کہنا چاہئے تھا یا پھر پورا مصرعہ ایسے انداز میں لکھنا چاہئے تھا جس سے مخاطب پر اس کی "متاع رہبری" کی حقیقت کھل جاتی —— چوتھے شعر میں یوں مخاطب کیا گیا ہے کہ

اے قدامت، یہ کھلی ہے سامنے راہ فرار
بھاگ اب میں ہوں نئی تہذیب کا پروردگار

دوسرے مصرعہ میں لفظ میں کا زور بالکل بیکار ہے۔ مقصود صرف یہ کہنا ہے کہ "اے قدامت بھاگ جا کیونکہ اب نئی تہذیب کا دور دورہ ہے" - اگر شاعر کا مقصود یہ کہنا ہے کہ چونکہ اب میں نئی تہذیب کا پروردگار بنا ہوں اس لئے تجھے بھاگ جانا چاہئے تو اس "میں" کی خصوصیت آیندہ اشعار سے ثابت نہیں ہوتی جن میں "میں" سے مراد صرف "شباب" لیا گیا ہے —— دوسرا شعر ملاحظہ ہو :-

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

پہلے مصرعہ میں تغیر غلط استعمال کیا گیا ہے۔ تغیر کے معنے بدل جانے کے ہیں اور یہاں بدل دینے کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے جس کے لئے صحیح لفظ "تغییر" ہے نہ کہ "تغیر"۔

دوسرے بند کے پہلے دو شعر ملاحظہ ہوں :-

ہاں تو ہی ہو وہ، جنوں نے جس کے ٹکڑے کردیا سبحہ و زنار کی الجھن میں رشتہ قوم کا
ہو جو غیرت ڈوب مر، یہ عمر، یہ درس جنوں دشمنوں کی خواہش تقسیم کی صید زبوں

اس میں بھی اسی "پیری و قدامت پرستی" سے خطاب کیا گیا ہے۔ پہلے شعر کے مصرعہ اوّل میں اس کے جنون کو ایک حقیقت ثابتہ ظاہر کیا گیا ہے اور دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں "یہ عمر، یہ درس جنوں" کہکر اظہار حیرت کیا گیا ہے کہ اس عمر میں یہ جنوں، کیونکر پیدا ہوگیا، درانحالیکہ عمر کی زیادتی یا کمی سے جنون کی شدت یا خفت متعلق نہیں ہو سکتی، بلکہ واقعتاً اس قسم کا "جنون" تو انحطاط قوا ہی کے زمانہ میں ہونا بھی چاہئے

اسی بند کا ایک اور شعر ہے :

دیکھتی ہے صرف اپنے ہی کو اے دھندلی نگاہ
سر بھی تک اٹھا ہے لیکن دل ابھی تک ہے سیاہ

یہاں پہلے مصرعہ میں مخاطبت "دھندلی نگاہ" سے ہے گویا کہ وہ کوئی علیحدہ چیز ہے۔ یہ مصرعہ مخاطبت اولی کے سلسلہ کو قائم رکھ کر یوں کہنا چاہیے تھا کہ

دیکھتی ہے صرف اپنے کو تری دُھندلی نگاہ

دوسرے مصرعہ میں "سر بھڑک اٹھنا" معلوم نہیں کس مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ غالباً بال سفید ہونے کے معنے میں لکھا ہے کیونکہ "دل ابھی تک ہے سیاہ" کے مقابلہ میں یہی مفہوم اسی کا ہونا چاہیے لیکن یہ محاورہ اس معنی میں میری نظر سے کہیں نہیں گزرا

تیسرے بند کا پہلا شعر ہے :-

پوپلے منہ، ختم کر یہ عاقبت بینی کا شور
دیکھ اب بُزدل مری ناعاقبت بینی کا زور

اس شعر میں پوپلے منہ - عاقبت بینی - اور بزدل تینوں بے ربط استعمال کئے گئے ہیں اور باہمدگر ان میں کوئی تعلق نہیں پایا جاتا -

دوسرا شعر ہے :-

چہرۂ امروز ہے میرے لئے ماہ تمام
خوفِ فردا ہے مری رنگیں شریعت میں حرام

اس شعر میں بھی "ماہ تمام" کا استعمال کسی شاعرانہ ادعا کا مثبت نہیں ہے۔ اور دوسرے مصرعہ میں لفظ "رنگین" بھی بیکار لایا گیا ہے۔ اگر دوسرے مصرعہ میں "خوف فردا" کے بجائے "خوف تاریکی فردا" کہا جاتا یا اسی کے ہم معنی کوئی اور فقرہ استعمال کر کے لفظ رنگین اڑا دیا جاتا تو یہ عیب باقی نہ رہتا۔ مثلاً اس کی اصلاح یوں ہو سکتی تھی :-

میرے مسلک میں ہے خوفِ ظلمتِ فردا حرام

آخری بند کا آٹھواں شعر ہے :-

اس نئے مذہب پہ سارے تفرقہ وارونگا میں
تجھ پہ پھر گردن ہلا کر قہقہے ماروں گا میں

"کسی پر قہقہے مارنا" محاورہ کے خلاف ہے۔ پر کے ساتھ قہقہے لگانا کہنا چاہیئے
اس کے بعد کا شعر ہے:-

پھر اٹھوں گا ابر کے مانند اٹھلاتا ہوا
گھومتا، گھرتا، گرجتا، گونجتا، گاتا ہوا

پہلی چار صفتیں تو ابر کے لئے ٹھیک ہیں لیکن گونجنا اور گانا اس سے تعلق نہیں ہو سکتا۔ مکان گونجتا ہے، وادی گونجتی ہے لیکن ابر نہیں گونج سکتا۔ اسی طرح ابر کو جب گرجتا ہوا کہدیا تو پھر اس کا گانا کیا معنی؟
آخری شعر ملاحظہ ہو:-

کوہ ہل جائیں گے میرے کارواں کے سامنے
گردنیں جھک جائینگی ہندوستاں کے سامنے

محض کارواں کا کسی جگہ پایا جانا "کوہ ہل جانے" کو مستلزم نہیں، جب تک اس کے مقابلہ میں کسی "آواز" کا وجود نہ ظاہر کیا جائے۔ بجائے کارواں کے اگر "درائے کارواں" ہوتا تو بیشک کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا تھا۔

(باقی)

مکتوبات نیاز

یکم جولائی ۱۹۲۱ء

غلامی مبارک ــــ کچھ زمانہ ہوا یہ حماقت مجھ سے بھی سرزد ہوئی تھی۔ لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ دنیا میں کوئی کسی کا رہبر نہیں۔ مجبوراً یہ تعلق ترک کیا اور خود اپنی ہی ذات کی طرف توجہ کی ــــ نیتجہ کیا ہوا؟ ــــ اگر یہ کہوں کہ تمام حجابات دفعتہً اٹھکر "سوا و ماسوا" سب آیندہ کے لئے روشن ہوگیا تو تم مانوگے نہیں، کیونکہ بدقسمتی سے وہ صورت و وضع نہیں رکھتا جو تم ایسے احمقوں کو فریب میں مبتلا کرسکے ــــ اگر یہ کہوں کہ میں مرتبہ ابدال کی خدمت میرے سپرد کی گئی اور میں نے انکار کردیا تو اس کا یقین اور بھی تمھیں نہ آئیگا کہ کہاں یہ گناہگار اور کہاں یہ سعادت ــــ اس لئے تمھیں حقیقت کا یقین کیونکر دلاؤں کہ رفع حجاب اور ابدالیت کا تو ذکر ہی کیا، منزل "قطبیت" سے بھی گزر کر ایک خاص درجہ پر فائز ہوں اور بغیر کسی واسطہ کے براہ راست انوار ربانی سے معاملہ رکھتا ہوں ادھر آؤ ــــ اگر یقین نداری بہ امتحاں برخیز ــــ اور بیعت کرکے دیکھو کہ تمھارے پیر ٹھکانے کی باتیں کہتے ہیں یا یہ "دلِ خانہ خراب" ! ــــ مگر مجھے معلوم ہے اور از روئے "کشف" معلوم ہے کہ تم مانوگے نہیں اور ہمیشہ یونہی مسجدوں اور خانقاہوں میں بھٹکتے رہوگے

سرِ روحانیاں داری ولے خود را ندیدستی
بہ خوابِ خود درا تا قبلۂ روحانیاں بینی

نیاز

۱۰ر جولائی ۱۹۲۱ء

صدیقی ــــ قربانی کے باب میں میرا بھی وہی مسلک ہے جو آپ کا، کیونکہ آج تک میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ ــــ وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا ــــ لیکن میں ۱۰ر ذی الحجہ کو ایک جان ضرور لیتا ہوں، اس کو "قربانی" اس لئے نہیں کہتا کہ نماز سے پہلے ہی ذبح کرلیتا ہوں اور جس وقت لوگ عیدگاہ سے واپس آتے ہوں یہاں ہضم رابع بھی ختم ہوچکا ہوتا ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں تو کہدیتا

ہوں کہ قیامت میں مجھے تماشہ بننا منظور نہیں کہ پل صراط سے بکرے کی پیٹھ پر سوار گزر رہا ہوں اور لڑکے پیچھے تالیاں پیٹ رہے ہیں ـــــ لیکن چونکہ نشاط قومی قائم رکھنے کے لئے ایسے تہواروں کا قائل ہوں جن میں روزانہ کی بے آب ورنگ زندگی سے ہٹ کر چند ساعتیں ہیل بیل میں گزر جائیں اسی لئے یہ گناہ کر لیتا ہوں ہولی اپنے یہاں نہیں تو کیا خون کی چند چھینٹوں سے بھی اپنے آپ کو محروم رکھوں ـــــ مگر آپ کا فلسفہ تو شاید یہ ہوگا کہ دوپہر کو بھنی ہوئی کلیجی اور شام کو بریانی کا درد سر کون مول لے ـــ نقصان مایہ اور دعوتِ ہمسایہ !

نیاز

۲۰، ۲۱ جولائی سنہ ۶

عزیز عبید آپ کا خط لے کر آئے۔ آپ کا خط نہ ہوتا تو بھی کیا صرف " انسانیت " کا تعلق میری ہمدردی حاصل کرنے کے لئے کم تھا ـــــ آپ مطمئن رہیئے وہ میرے ہی پاس ہیں اور میں نے ان کے تمام اوقات کا لحاظ رکھ کر پوری راحت و آسائش کا انتظام کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ پلنگ کے پاس ایک چوکی اور چوکی پر ایک نرم جانماز بچھوا دی ہے تاکہ وہ نہایت سکون کے ساتھ اوراد و وظائف پڑھ پڑھ کر اپنے اوپر دم کرتے رہیں۔

آپ کو یہاں کی حالت معلوم ہو یا نہ ہو، لیکن کم از کم میری نااہلی و بیچارگی سے تو آپ ناآشنا نہیں ـــ وہ شخص جو ایک ایک مہینہ گھر سے باہر قدم نہ نکالے، وہ جو کسی کے سامنے کوئی غرض لے کر جانا " شرک فی التوحید " سمجھے اس سے آپ کیا توقع کر سکتے ہیں ـــــ لیکن اسے بھی جانے دیجئے میں رات دن ان کے لئے سرگرداں رہنے کے لیے آمادہ ہوں، اور ایک ایک کے سامنے دستِ سوال پھیلانے کے لئے بھی طیار۔ لیکن جانتا ہوں کہ صاف انکار کی کسی میں ہمت نہیں۔ اور ایفاء عہد کی توفیق نہیں۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ وہ کب تک اپنا وقت ضائع کریں گے۔ اول تو نوکری ملنا آسان نہیں اور اگر ہزاروں احسان رکھنے کے بعد کسی نے دفتر میں کوئی جگہ دی بھی تو بیس پچیس حد ہے ـــــ خدا کے لئے اُن سے کہئے یا آپ اجازت دیں تو میں کہدوں کہ میاں داڑھی بڑھالو اور تہمد باندھ کر کسی مسجد میں خدا رسول کے متعلق جتنی سمجھ میں نہ آنے والی باتیں ہوسکتی ہیں لوگوں سے بیان کرنا شروع کر دو۔ پھر دیکھو چند دن میں فتوحات کا کیا عالم ہوتا ہے ـــــ

آپ مطمئن رہیے سعی میں کمی نہ ہوگی، لیکن سچ کہتا ہوں مجھے کامیابی کی کوئی اُمید نہیں ـــ اگر تجارت کا شوق ہو تو بیشک میں بمبئی اپنے ایک کرمفرما کے پاس بھیج سکتا ہوں، جو دولت دول دونوں حیثیت سے بہت بڑے شخص ہیں ـــ ان کے پاس چند دن کام سیکھیں اور انھیں کے منشاء کے مطابق اپنا کام شروع کر دیں ـــــ کہئے منظور ہے یا نہیں ؟

نیاز

۲۴ر جولائی ۱۹۳۱ء

محبی ــــــ معاف فرمائیے، جواب تعویق سے جا رہا ہے۔ چند دن کے لئے اجین چلا گیا تھا۔ وہاں سے واپس آیا تو ایک اور دوسرا مرض مول لے لیا جس سے ابھی تک نجات نہیں ملی، لیکن آخر کب تک آپ کو منتظر رکھتا، مجبوراً لکھ رہا ہوں، گو جی نہیں چاہتا۔

سنئیے، آپ نے جس کتاب کا ذکر کیا ہے اس کا ایک قدیم نسخہ میرے پاس ضرور موجود ہے اور مجھے عاریتاً کیا ارزاناً پیش کر دینے میں بھی کوئی عذر نہیں ہو سکتا، لیکن باور کیجئے مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ وہ ہے کہاں ؟ یعنی یہاں یا فتحپور میں ـــــ بہرحال آپ مطمئن رہئے۔ وہ آپ تک ضرور پہونچ جائے گا، لیکن آج یا دو سال کے بعد اس کے متعلق کچھ عرض نہیں کر سکتا ـــــ یہ تو جواب ہو گیا آپ کے خط کے اس حصّہ کا جو بقول آپ کے واقعی میرے لئے "غیر دلچسپ" تھا ـــــ رہ گیا دوسرا حصّہ جس میں آپ نے مجھے میری آئندہ زندگی کے متعلق چند محبت آمیز مشورے دیئے ہیں، سو اس کے جواب میں بجز اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ

نظارۂ خوبان و مے و نغمہ حرام ست
دیدیم و شنیدیم و سمعنا و اطعنا

اگر ناگوار ہو تو شعر کے "طنز یاتی" پہلو کو اڑا دیجئے۔ اور خوش ہو جائیے کہ میں نے "اعتراف گناہ" بھی کر لیا اور توبہ بھی ـــــ آہ، کاش کہ آپ اس فلسفہ کی صداقت پر بھی ایمان لے آتے کہ

دل از غمگیں شود بے ذوق زنہار
گہے طفلے شو و مستانہ می رقص

نیاز

۲۰ر اگست ۱۹۳۱ء

اے حضرت ! یہ کہاں کا انصاف ہے کہ خود تو آپ وہی گناہ سو بار کرنے پر بھی بس نہ کریں۔ اور میرے لئے ایک بار کی جسارت بھی حرام ہو ـــــ پہلے آپ بتائیے کہ آپ نے میری پچیس تحریروں کا جواب کیوں نہیں دیا، پھر میں بھی بتاؤں گا کہ آپ کی ایک تحریر کے جواب میں مجھ سے کیوں تاخیر ہوئی ـــــ معقول ! میں سوچتا ہوں کہ آپ عدالت گاہ میں کیا خاک انصاف کرتے ہوں گے، غریبوں کا خون ہی ہوتا ہو گا ـــــ

سنئیے، نامۂ گرامی پہلی کو مجھے ملا اور دوسری کو مجھے ایک عزیز کی ناگہانی موت کی وجہ سے بھوپال چھوڑنا پڑا، ایک ہفتہ کے بعد واپس آیا تو تپ میں مبتلا ہو گیا ـــــ ایک سو چار ڈگری اور کچھ پوائنٹ ! بھلا سمجھے

آپ ـــــ پرسوں اس قابل ہوا ہوں کہ سہارے سے بیٹھ سکوں ـــــ مجھے معلوم ہے کہ یہ سنکر آپ رسمی ہمدردی کے چند الفاظ لکھ دیں گے اور خود اپنی فراموشکاری کا وہی فرسودہ عذر پیش کر دیں گے کہ "خط ملے ہی نہیں" بہتر ہے آیندہ میں بھی ہر لفافہ ایک آنہ کا وی۔پی کرکے بھیجا کروں گا تا آنکہ آپ چیخ اٹھیں

نیاز

۱۵ر ستمبر ۲۱ء

کیا پوچھتے ہو کس عالم میں ہوں

سیماب پشت گرمیِ آئینہ دے ہے، ہم
حیراں کئے ہوئے ہیں دل بیقرار کے

اگر کوئی ذریعہ سکون کا ہے تو صرف یہ خیال کہ جب زندگی کو بقا نہیں تو دل کے "اضطراب بے مدعا" پر کیوں سر دُھنا جائے ـــــ

پرسوں مرزاجی کے خط کے ساتھ ایک تحریر اور کسی کی بھی ملی، اس نے اور قیامت ڈھادی، ارشاد ہوتا ہے:ـــ

آجاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

اب فرمائیے آپ کیا مشورہ دیتے ہیں؟ ـــ سر پھوڑنا تو خیر میری اختیاری بات ہے، اس کے علاوہ جو صورت جواب کی ہو اُسے سوچئے ـــ "انستی چشم وگوشس" اگر کوئی گناہ ہے تو خدا بھی زیادہ سے زیادہ یہی سزا اس کی دے سکتا تھا۔

میں نے تو فی الحال کلیجہ پر پتھر رکھ کر یہی جواب دیدیا ہے کہ

" فی الحال اس مژدۂ نوید سے تو جانبر ہو لینے دیجئے، ممکن ہے یونہی کام تمام ہو جائے "

نیاز

۲۰ر اکتوبر ۲۱ء

مکرمی میاں صاحب ـــــ میں آپ سے جدا ہو کر یہاں آنے کو تو آگیا، لیکن خدا شاہد ہے۔ کہ دل و دماغ دونوں وہیں چھوڑ آیا ہوں ـــ ایک چیز آپ کے پاس اور دوسری اُن کے ـــــ اب تقاضہ کروں بھی تو کس سے ـــ آپ سے؟ کہ دماغ کا ہر ہر نقش آپ ہی کا مرہون کرم ہے ـــ اُن سے؟

کہ دل پھیر بھی دیں تو پھر بصد لجاجت انھیں کو سونپ دینا پڑے۔
میری بندگی ان تک پہونچا دیجئے اور کہہ دیجئے کہ میری زندگی بے مزہ کرکے انھیں کیا ملا ؟
نیاز

---

۲۷ ر اکتوبر ۱۹۶۱ء

ظالم ، خدا بچھے (تم سے تو نہیں مگر) اُس سے جس نے تمھیں یہ سمجھا دیا کہ محبت کی آزمائش سُن کر بھی ہوا کرتی ہے ــــ میں پوچھتا ہوں کہ میں نے کیا قصور کیا تھا جو آپ مجھ سے روٹھ گئے ــــ قسم لیلو جو میں نے آپ کی غیبت میں کوئی ایک لفظ بھی آپ کے متعلق اُن سے کہا ہو ــــ یہ آخر آپ نے انھیں اس قدر معصوم اور اپنے آپ کو اس درجہ "مستحقِ کرامت" کیوں سمجھ لیا ــ کیا آپ سے زیادہ گناہگار کوئی اور انھیں دنیا میں مل ہی نہیں سکتا ؟

میاں ، ہوش میں آؤ ، کیسی محبت ، کہاں کی الفت ، جوانی میں یہ بڑھاپے کے سے گلے شکوے کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے ــــ وہ ایک دفعہ بھلا دینے کی دھمکی دیں تم سو دفعہ منہ موڑ کر چلے آؤ ــــ یہ بھی کوئی بڑی بات ہے۔ تمھاری عمر میں ، تو یہاں دل کے اندر تیر پر تیر پیوست ہوتے تھے۔ اور پھانس کی طرح نکال کر پھینک دئے جاتے تھے۔

نیاز

---

۱۰ ر نومبر ۱۹۶۲ء

صدیقی العزیز ــــ آپ کو معلوم ہے کہ یہ تحریر کس کے ذریعہ سے بھیج رہا ہوں ــــ پہلے اٹھکر سروقد تعظیم دیجئے ، پھر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائیے اور دست بوسی کرکے صدر میں بٹھائیے ــــ اسکے بعد بتاؤں گا کہ یہ کون ہیں ؟

سنئے ان کے جد بزرگوار تو خیر صرف ہمارے فتحپور ہی کے صاحب خدمت تھے لیکن ان کے والد محترم کے سپرد تو پوری کمشنری الہ آباد کا نظم و نسق تھا ــــ یہ خود کیا ہیں مجھے تو ان کے بیان سے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ یوروپ کے جس قطب نے جنگ عظیم کرادی تھی اس کو شکست دیکر انھوں ہی نے آپس میں صلح کرائی ہے۔ یہ اتنا بڑا مرتبہ ہے کہ آپ ہی اس کی حقیقت کو سمجھ سکیں تو سمجھ سکیں ــ میرے بس کی بات تو ہے نہیں۔ یہ فی الحال اپنے گاؤں میں ایک مسجد بنوا رہے ہیں اور امداد کے طالب ہیں ــــ میں نے پوچھا کہ کیا آپ

کے گاؤں میں کوئی اور مسجد نہیں تو فرمایا کہ "مسجدیں تو کئی ہیں لیکن بے مینار کی مسجد کوئی نہیں ہے" میں ڈر کے مارے یہ نہیں کہہ سکا کہ "کیوں نہ آپ موجودہ مسجدوں کے مینار تڑوا دیں۔ اس میں زیادہ آسانی ہے"۔۔۔ شاید آپ انھیں سمجھا سکیں بہر حال آدمی بہت دلچسپ ہیں اور ہمدردی کے قابل"

نیاز

باب الاستفسار

عقل و مذہب کی جنگ اور خدا سے انکار

(جناب عبد الحفیظ صاحب مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول خیر نگر میرٹھ)

اگرچہ آپ مجکو نہیں جانتے لیکن مجکو جناب کے رسالہ کے ذریعہ سے غائبانہ نیاز حاصل ہے۔ حال میں جنوری ۱۹۳۲ء کے رسالہ "لٹریری گائڈ" میں پروفیسر ٹی۔ اے۔ بینڈرٹ صاحب کا ایک مضمون بعنوان (Substitute for Religion) میری نظر سے گذرا جسکو پڑھکر خیالات میں عجیب تلاطم پیدا ہوا۔ چونکہ آپ کے رسالہ میں اس قسم کے اکثر استفسار معہ تسلی بخش جوابات کے شایع ہوتے رہتے ہیں اس لئے مجکو بھی اس بات کی ہمت ہوئی کہ آپ سے رجوع کروں۔ لہذا پروفیسر صاحب مذکور کے مضمون کا اردو ترجمہ آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں کہ آپ اس کو رسالہ نگار کی کسی قریبی اشاعت میں جگہ دیکر اس پر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں

"علمبرداران مذاہب کی طرف سے عقلیت پسند جماعت پر جو عام الزام لگایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ تم (خدا سے انکار کرا کے) کمزوروں غریبوں سے، مصیبت زدہ مظلومین سے اس اُمید و اعتقاد کو چھین لینا چاہتے ہو کہ ایک ایسا قادر مطلق خدا موجود ہے جو اُن کی نگرانی کرتا ہے اُن کی دعاؤں کو سنتا اور قبول کرتا ہے اور جو اُن کی تکلیفوں کا بدلہ لینے اور ناانصافی کو انصاف سے بدلنے کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ تم یتیموں اور بیواؤں کو اُن کی اس زندہ امید سے محروم کرنے پر تیار رہو کہ ایک ایسی طاقتور ہستی موجود ہے جو ایک کا باپ اور دوسرے کا محافظ بننے کے واسطے آمادہ ہے۔ تم باپ اور ماؤں کی، بھائیوں اور بہنوں کی اس اُمید کو خاک میں ملا دینا چاہتے ہو کہ وہ اپنے اُن عزیزوں سے پھر ملیں گے جن کو موت نے اُن سے جدا کر دیا ہے۔ تم تمام بنی نوع انسان کی اس امید پر پانی پھیر دینا چاہتے ہو کہ وہ مر کر دوبارہ زندہ ہوں گے

اور پھر ہمیشہ زندہ رہیں گے کیا تمھارے پاس ان مذہبی عقائد کا جو انسانوں کو مصائب زندگی برداشت کرنے کی طاقت بخشتے ہیں کوئی نعم البدل موجود ہے ؟ عقلیت پسند کے پاس اس الزام کا کیا جواب ہو سکتا ہے - آئیے اس پر غور کریں-

(۱)

منکر خدا واقعی کسی ایسی ہستی کا قائل نہیں ہے جو قادر مطلق ہو یا رحم و محبت کا مجسمہ ہو - وہ اس خیال کو اپنے دماغ میں جگہ نہیں دے سکتا کہ ایسی کائنات کا جیسی کہ ہمارے سامنے ہے کوئی خالق ہو سکتا ہے کیونکہ ایک کامل خالق کی پیدا کی ہوئی کائنات بھی کامل ہونی چاہیئے تھی اور تمام مخلوق کو مکمل اور عیوب و نقائص سے مبرّا ہونا چاہیئے - درانحالیکہ جدید طبیعی تحقیقات ہم کو یقین دلاتی ہے کہ یہ کائنات یعنی نظام ثوابت معہ کرۂ زمین کے قطعی مکمل نہیں اور مکمل ہونا کیسا جبکہ ابھی تک ان کا دور تعمیر ہی ختم نہیں ہوا اور روز کے طبعی مشاہدات اس کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں زلزلوں کا آنا ، آتش فشاں پہاڑوں کا پھوٹ نکلنا ، سواحل سمندر کا ابھر ابھر کر ڈوبنا ، آہستہ آہستہ پہاڑوں کا سمندروں میں پہونچ جانا ، پہاڑوں کی جگہ وادیاں اور وادیوں کی جگہ پہاڑ بن جانا ، جو بے شمار قرنوں سے جاری ہے اور آئندہ بے شمار قرنوں تک جاری رہیگا - کیا اس عدم تکمیل کا کافی ثبوت نہیں - اور آگے چلئے - کرۂ ارض میں قطبین مقناطیسی کا انتقال مقامی ، نیز اس کے قطبین ہندسی کا تغیر ، زمین کے محور کا اپنے دائرۃ البروج کے مقابل مائل ہو کر کرۂ باد میں تبدیلیاں پیدا کرتے رہنا اور نسل انسانی کے واسطے بے شمار مصائب و آلام کا باعث ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ کرۂ ارض کی تخلیق ہنوز کس درجہ نامکمل و ناقص ہے - پھر یوں دیکھئے کہ دنیا میں ہر مخلوق اعلیٰ سے ادنےٰ تک زندہ رہنے کے لئے اس بات پر مجبور ہے کہ دوسری مخلوق کو تباہ کرے او رکھا جائے - اور اس طرح دنیا میں ایک بیرحمانہ قتل ایک بے پناہ خونریزی اور ایک وحشیانہ سعیِ فتحمندی جاری ہے - اور ہر چیز محض زندہ رہنے کے لئے اس جد و جہد میں مصروف ہے کہ اپنی ہستی قائم رکھنے کے حق کو دوسروں سے بہ جبر تسلیم کرائے - پھر ظاہر ہے کہ ان حالات کے ماتحت کسی ایسے خدا کا تصور جو یکسر محبت و رافت بتایا جاتا ہے کیونکر ممکن ہے - عقلیت پسند ، خدا پر اعتقاد رکھنے والے کو یقین دلاتا ہے کہ ایسے خدا کی کوئی ہستی موجود نہیں ہے جو مکمل دانائی انصاف اور محبت کی صفات سے متصف ہو اور نہ کوئی ایسی شخصیت موجود ہے جو اس ذرہ بے مقدار انسان کی کوششوں کے نتائج اور انجام پر حکمراں ہو - ان باتوں کو سُنکر معتقد کانپ اٹھتا ہے - اور خوف و ہراس کی حالت میں آسمان کی طرف ، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے کیونکہ اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا تمام نظام اجتماعی کی بنیادیں منہدم ہو گئی ہیں - لیکن عقلیت پسند اپنا نہایت مدلل اور ہمت افزا جواب پیش کرتا ہے کہ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں بلکہ برخلاف اس کے نسل انسانی کی نجات اسی خیال میں مضمر ہے کیونکہ وہ کامل دانائی جس کے متعلق فریب خوردہ انسان کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ عرش معلےٰ سے حکومت کر رہی ہے خود اسی کے اندر موجود ہے

وہ کامل انصاف جس کے واسطے آپ فلک الافلاک کی طرف نگاہیں اٹھا رہے ہیں حقیقتاً خود آپ ہی کے اندر موجود ہے اور وہ کامل محبت جس کے متعلق آپ کا یہ خیال ہے کہ اس کائنات پر حکمران ہے، خود آپ ہی کے دل میں پوشیدہ ہے۔ جو کچھ انسان نے ہزار ہا سال کے افکار کے بعد کیا وہ صرف یہ ہے کہ اس نے اُس چیز کو جو خود اسی کے پہلو میں پائی جاتی ہے خلاف عقل طریقوں سے استدلال کر کے عالم موجودات سے باہر لامکان میں پہونچا دیا، وہ ہزارہا سال تک ایک فحش غلطی میں مبتلا رہا لیکن آج جبکہ وہ اپنی اُس غلطی کو دُور کرنا چاہتا ہے، اس کو بجز اس کے اور کچھ نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ اس نوع انسانی کو پستی سے اٹھا کر بلند ترین سطح پر پہونچا دے یعنی اب اس کا کام یہ ہے کہ اس اپنی اور آئندہ آنیوالی نسل کے قوائے دماغی کو معقول تعلیم کے ذریعہ سے کامل بنائے۔ اور انصاف کی شمع مردہ کو اور راستی کے چراغ سحری کو آفتاب کی طرح روشن اور پُر نور کر دے، ناانصافی اور ناراستی کی تاریکی کو محو کر دے یہاں تک کہ تمام نسلی امتیازات، تمام اقتصادی ناہمواریاں ایک ہموار سطح پر آجائیں، اور تمام تعصبات صفحہ ہستی سے مٹ کر ایک انصاف کامل کی حکومت کا آغاز ہو جائے

(۲)

عقلیت پسند گروہ بقائے روح اور حیات بعد الموت کے خیال کو اپنے دماغ سے نکال دیتا ہے کیونکہ اس اعتقاد کی تائید میں ضعیف ترین شہادت بھی میسر نہیں آتی برعکس اس کے حیات عضوی (Organic life). اس امر کی تائید کرتی ہے کہ موت خواہ طبیعی ہو خواہ غیر طبیعی زندگی کے خاتمہ کا نام ہے جس میں انسانی زندگی بھی شامل ہے عقلیت پسند جانتا ہے کہ عہد قدیم میں انسان نے خود کو باقی موجودات سے اسقدر افضل خیال کیا کہ اُس نے یہ سمجھ لیا کہ صرف اسی کو روح سے سرفراز کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے بعد جب انسان نے حیات حیوانی پر زیادہ توجہ کی اور افعال حیوانی کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا تو اس کو اس بات کا اقرار کرنا پڑا کہ حیوان مطلق کو بھی روح عطا ہوئی ہے بلکہ بعض تو یہاں تک اقرار کرتے ہیں کہ درختوں میں بھی روح یا روح کے مشابہ کوئی چیز پائی جاتی ہے۔

اسی کے ساتھ ایک ماہر علم الاعصاب میدان میں آتا ہے۔ اور مذہب پرست کو یقین دلاتا ہے کہ یہ نام نہاد روح سوائے نظام عصبی کے اور کچھ نہیں ہے اور یہ کہ جس حد تک کسی حیات عضوی میں نظام عصبی موجود ہے اسی حد تک اس میں روح بھی موجود ہے اور اس لئے وہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ جب نظام عصبی فنا ہو جاتا ہے تو اس کے ساتھ روح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ اس نام نہاد روح کی کیا اصلیت ہے یہ ایسا سوال ہے جس پر متفکرین کے دماغ اسی روز سے غور کر رہے ہیں جس روز سے انسان نے زندگی کے آغاز و انجام پر غور کرنا شروع کیا اور جس کے متعلق عجیب و غریب قیاسی توہمات قائم کئے، مگر عقلیت پرست اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ روح کا آغاز عین اسی وقت شروع ہوتا ہے جب کہ نظام عصبی کا آغاز ہوتا ہے اور نظام عصبی کا آغاز عین اسی وقت یا اس کے کچھ بعد

ہوتاہے جبکہ نسل جنسی کے ذریعہ سے عمل قائم ہوتاہے۔ الغرض عقلیت پرست اپنی رائے کو قدیم روحانیات کی تعلیم کے موافق نہیں بناسکتا اور اسی بناپر وہ ہمیں اس بات کایقین دلاتاہے کہ متقدمین کی تمام روحانیات کی کتابیں از سر نو تحریر کی جانی چاہئیں تاکہ وہ طبیعیات اور علم الاعصاب کی موجودہ تحقیقات کے نتائج کے ساتھ موافقت پیدا کرسکیں

مگراب سوال یہ ہے کہ عقلیت پرست اس مقلد کی تسکین کے واسطے کیا چیز پیش کرتاہے اس بیچاری ماں اور مغموم باپ کی تسلی کے لئے کیاچیز پیش کرسکتاہے جوآنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کھلی ہوئی قبر کی طرف دیکھ رہے ہیں جوان سے اس چیز کو ہمیشہ کے واسطے چھین لینے کے لئے تیارہے جوان کی زندگی کاسہارا محبت کاواسطہ اور خوشی کاذریعہ ہے۔ کیا اس کے پاس کوئی تسلی بخش الفاظ سُنانے کے واسطے اور کوئی ہمت افزا باتیں پیش کرنے کے واسطے نہیں ہیں جنکے ذریعہ سے اُن کے آنسو بند ہوجائیں۔

اس کاصرف ایک جواب ہے جس کی پوری اہمیت سمجھنے کے لئے ہمیں موت کاوہ رسمی موروثی نظریہ قطعی طور پر بدلدینا پڑے گا جونسل انسانی میں اس وقت پایاجارہاہے اور اس کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ اعلیٰ درجہ کے روشن خیال اپنی متفقہ کوششوں کے ذریعہ سے عوام الناس کے داغوں میں اور خاصکر آنے والی نسلوں کے ذہن میں یہ خیال پختگی کے ساتھ جادیں کہ جہاں تک ضعیف العمری کی موت کاتعلق ہے وہ فطری چیز ہے اور فطری زندگی کافطری نتیجہ موت ہے۔ جہاں تک بیماری کے ذریعہ سے موت کاتعلق ہے وہ دانشمند انہ حفظ ما تقدم کے ذریعہ سے روکی جاسکتی ہے اور علاج کے ذریعہ سے اُس کاکامیابی کے ساتھ مقابلہ بھی کیاجاسکتاہے اور جواموات بطور حادثہ واقع ہوتی ہیں وہ بھی سخت ترین قوانین تحفظ کے ماتحت بند کی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح موجودہ اور آنے والی انسانی نسلوں میں یہ خیال ذہن نشین ہوجائے گا کہ ملکی جنگوں کے باعث جو موتیں واقع ہوتی ہیں ان کو بین الاقوامی مجلس صُلح کے ذریعہ سے قطعی ناممکن الوقوع بنایاجاسکتاہے۔

اس نقطہ پر پہونچکر نظریۂ ارتقا ہمارے پیش نظر ہوتاہے نہ بطور لعنت کے جیساکہ مقلدین کاعقیدہ ہے بلکہ بطور برکت کے جو بغیر متعصب لوگوں پر یہ واضح کرتاہے کہ تمام فاسد نفسانی خواہشات میں ایک خواہش بھی ایسی نہیں ہے جو کسی شیطانی ہستی نے اُس کے اندر پیداکردی ہوں اور جو اُس کے اختیار سے باہر ہوں بلکہ یہ تمام آثار ہیں اس بات کے کہ انسان نے ان ادنیٰ درجہ کی خواہشوں کو جانوروں سے وراثتاً حاصل کیاتھا۔

پھر ممکن ہے کہ خود ہمارے اندر اسقدر ہمت پیدا نہ ہوسکے کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں اس پر عمل کرکے دکھلادیں لیکن ہماری اولادیں اور ہماری اولادوں کی اولادیں متحدہ عمل اور مشق کے ذریعہ سے اسقدر کافی ہمت پیدا کرلیں گی کہ موت، تابوت اور قبر کا بخندہ پیشانی خیر مقدم کریں اور بغیر کسی یاس وحُزن کے موت کامقابلہ کریں

بلکہ یہاں تک کہ موت کی عظمت سے اُن کے چہرے جگمگا اُٹھیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک عقلیت پرست، آسمانی قوانین کے مقابلہ میں کیا چیز پیش کرسکتا ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ مقلد کو یقین دلاتا ہے کہ اول تو دنیا میں کبھی کوئی ایسی چیز آئی نہیں جسکا نام آسمانی قوانین ہو بلکہ برعکس اس کے جو قوانین آسمانی قوانین کے نام سے لوگوں کے سامنے پیش کئے گئے وہ حقیقت میں مذہبی لوگوں ہی کا اختراع تھے جنھوں نے ان کو موثر اور مدلل بنانے کے لئے لوگوں پر یہ ظاہر کیا کہ یہ خدا نے ان کو الہام، وحی کے ذریعہ سے بتلائے ہیں اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک ایسا جہنم بھی ایجاد کیا جسمیں آگ روشن ہے اور جس میں قدیم یونانیوں کے خیال کے مطابق استمراری عذاب موجود ہے۔ لیکن جوں جوں تہذیب ترقی کرتی گئی، انسانی قوانین رفتہ رفتہ نام نہاد آسمانی قوانین کی جگہ لینے لگے اور بالآخر خود اُن کی جگہ قائم ہوگئے اس لئے اب انسانی فرض یہ ہے کہ جب اور جہاں خدائی قوانین انسانی آزادی اور انسانی حقوق کے متعارض واقع ہوں، ان پر نظر ثانی کرے ترمیم و تنسیخ کرے یا نئے حالات کے ساتھ موافقت پیدا کرنے کے لئے اُن کو قطعی مسترد کردے۔

بقائے روح کے متعلق جو جواب ابھی دیا گیا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے عقلیت پرست اس بات کو بھی محسوس کرتا ہے کہ اُس کا یہ نظریہ کہ ماورائے لحد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے اس موجودہ زندگی کو اسقدر بیش بہا بنا دیتا ہے کہ ہم اس کے ایک ایک لمحہ کو مستحق حیات بنانا اپنا اولین فرض سمجھتے ہیں اس لئے ہمارے واسطے یہ لازم ہے کہ ہم اس زندگی کو خواہ وہ کتنی ہی مختصر کیوں نہو شرافت اور رحمدلی سے اُس حد تک مالا مال رکھنے کی کوشش کریں جس حد تک کہ ہم میں اس کی صلاحیت موجود ہے۔ ہماری اولادوں کو یہ بات سکھائی جائے گی کہ کوئی سخت کلمہ یا ناروا سلوک نہ کبھی واپس لیا جاسکتا ہے نہ اس کا کبھی تدارک کیا جاسکتا ہے اور نہ کوئی قربانی اسکا کفارہ ہوسکتی ہے اس لئے اُس سے ہمیشہ احتراز کرنا چاہئے۔

اس طرح عقلیت پرست یقین رکھتا ہے کہ اس کے پاس فی الحقیقت ایک ایسا نعم البدل پیش کرنے کے واسطے موجود ہے جو اُس مذہبی عقیدہ کی جگہ لے سکتا ہے جس کو مذاہب عالم نے نشو و نما دیا ہے۔

(نگار) آپ، بلینڈرٹ کے اس مقالہ پر مجھ سے اظہار خیال چاہتے ہیں، درانحالیکہ انداز بیان اور انتخاب الفاظ کے ادنیٰ تغیر کے ساتھ یہی سب کچھ میں بھی لکھ چکا ہوں اور ایک مغربی ملحد کو میرے مقابلہ میں اگر کوئی امتیاز حاصل ہے تو صرف یہ کہ وہ سرے سے خدا کے وجود یا خدا کے مفہوم ہی کو قابل تسلیم نہیں سمجھتا اور میں ایک ایسی قوت کا قائل ہوں جو حقیقی معنی میں " فعال لما یرید " ہے ـــ وہ مصائب عالم اور حوادث

طبیعی کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ کائنات ہنوز نامکمل ہے اور ایک مکمل خالق سے نامکمل مخلوق کا ظہور میں آنا قابل یقین نہیں، میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی قوت اعلیٰ، عالم خلق و کون میں تدریج کے ساتھ عمل تکمیل کو جاری رکھنا چاہتی ہے تو اس میں کونسا استحالہ عقلی ہے، اور کیا "فعّالٌ لما یرید" کے مفہوم میں وہ قوت واقتدار داخل نہیں ہے جو "مسئولیت" و "پرسش" سے بہت بلند ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ میں یہ باور کرنے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہو سکتا کہ وہ قوت انفرادی کی سطح حیثیت سے عالم کی ایک ایک چیز اور اس کے ایک ایک ذرّہ کی ہر وقت نگرانی کرتی ہے اور اسی لئے میں دعا و استجابت دعا کو بالکل فعل عبث قرار دیتا ہوں۔

مقدرات الٰہیہ سے حقیقتاً وہ نوامیس فطرت مراد ہیں جو ایک خاص اندازہ سے تمام عالم طبیعیات میں اپنا اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور مادی اسباب کے تغیر و انقلاب یا کمی و بیشی سے کبھی کبھی اُن نتائج میں بھی تبدیلی پیدا کر دیتے ہیں جو عادتاً ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ پھر میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس کو عدم تکمیل یا عدم یکسانیت قرار دے کر کیوں کسی "مکمل خدا" کے وجود سے انکار کیا جائے جبکہ اسی کیفیت کو خدا کے "ارادہ آزاد" سے متعلق کر کے بہ آسانی اس گتھی کو سلجھایا جا سکتا ہے ——— بہر حال کسی ایسی قوت کے وجود سے جو عالم تکوین میں کار فرما ہے۔ سخت سے سخت ملحد بھی انکار نہیں کر سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس کا نام خدا نہ رکھے اور اسے "علت اولین" یا "علت العلل" وغیرہ کے نام سے موسوم کرے۔

ایک مذہبی انسان اور غیر مذہبی انسان کے اس اعتقاد میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ وہ عوام کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر (یا حقیقتاً خود اپنی ذہنیت کے لحاظ سے جو ممکن ہے ترقی یافتہ نہ ہو لیکن اصلاح پسند ضرور ہے۔) ایک ایسا خیال خدا کے متعلق پیش کرتا ہے جو فلسفہ کی گتھی میں الجھائے بغیر نوع انسانی کی اصلاح چاہتا ہے اور یہ خود اپنی تسکین قلب کے سامنے اُن مصالح کی پرواہ نہیں کرتا جو عوام سے متعلق ہے ——— البتہ اگر وہ زمانہ کبھی آیا (اور یقیناً آئے گا) کہ تمام افراد انسانی ایسے ہی ترقی یافتہ ہو جائیں، جیسے کہ مسٹر بینڈ رٹ ہیں اور تکمیل اخلاق کا وجوب ایک کھلی ہوئی روشن حقیقت کی صورت اختیار کر لے تو یقیناً انسان مذہب سے بے نیاز ہو جائے گا۔ اور ہو جانا چاہئے کیونکہ ایک مذہب کا انتہائی ارتقا صرف یہی ہے۔ اور اس کی تکمیل کے بعد اس کو از خود تحلیل ہو جانا چاہئے۔

الہامی کتابوں کے متعلق جو خیالات فاضل مقالہ نگار نے ظاہر کئے ہیں، اُن سے مجھے اس حد تک تو ضرور اتفاق ہے کہ ان کو خدا کا کلام کہنا حقیقتاً کوئی وزن نہیں رکھتا اور اس کو اب کوئی صاحب عقل انسان صحیح باور نہیں کر سکتا، لیکن میں یہ کبھی نہ مانوں گا کہ انبیاء و رسل نے مقصداً لوگوں کو دھوکا دیکر ایسا باور کرایا، کیونکہ اُن کی سیرت کا مطالعہ ہم کو بتاتا ہے کہ وہ لوگ جھوٹے یا مکار نہیں تھے اور نہ وہ اپنے مقصد میں

کامیاب ہو سکتے تھے اگر ان کی کارگاہِ عمل صرف مکر و فریب پر قائم ہوتی ـــــ اس لئے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کہ الہامی کتب خدا کا کلام بھی نہیں ہیں اور انبیا نے بھی غلط بیانی سے کام نہیں لیا ہے تو پھر تیسری صورت کیا ہو سکتی ہے ؟

میں اس سے قبل کئی بار " وحی والہام " کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کر چکا ہوں جنکا ماحصل یہ ہے کہ انبیار کی زبان سے ایک خاص تاثر کے ماتحت بے اختیارانہ طور پر کلمات رشد و ہدایت کا نکل جانا اصل وحی ہے اور چونکہ اس حال میں انسان پر ایک قسم کی " مقناطیسیت ذاتی " (Self Magnetism) طاری ہو جاتی ہے۔ اور یہ کیفیت رفتہ رفتہ " اشارۂ ذاتی " (Auto Suggestion) میں تبدیل ہو جاتی ہے جسے " لطیفۂ غیبی یا روح القدس " بھی کہہ سکتے ہیں، اس لئے وہ باور کرنے لگتا ہے کہ جو کچھ اس کے منہ سے نکل رہا ہے وہ خود اس کی ذاتی فکر و کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ کوئی قوت برتر و اعلی اس کے دماغ سے بول رہی ہے اور اسی بات کا یقین وہ دوسروں کو دلانا چاہتا ہے۔ خود کلام مجید کے طرز عبارت کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جابجا اس میں خود رسول اللہ سے بھی خطاب کیا گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی اور کا کلام سول سنا رہے ہیں۔ لیکن آپ سمجھے کہ یہ کیا بات ہے ۔

یہ " مقناطیسیت ذاتی " کی وہ انتہائی کیفیت ہے۔ جب انسان اپنے پیکر مادی سے علیحدہ ایک اور لطیف ہستی " (Spiritual Being) کے وجود کو اپنے اندر محسوس کر کے اس کے " داعیات " کو علیحدہ ایک مستقل صورت میں دیکھنے لگتا ہے اور اس حال کے ماتحت جو کچھ اس کے منہ سے نکلتا ہے وہ واقعی انسانی دماغ کی پیداوار سے بلند تر مرتبہ کی چیز ہوتا ہے۔ پھر جس طرح یہ صحیح ہے کہ ہم اس کو (لغوی معنی کے اعتبار سے) کلام خداوندی یا " منطوقات الٰہی " نہیں کہہ سکتے ، اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ انبیار و رسل کا اپنی شدید کیفیاتِ نبوت کے لحاظ سے اس کو " ماورار عالم مادہ " کی چیز کہکر پیش کرنا غلط بیانی یا مکر و فریب نہیں کہلا یا جا سکتا

حیات بعد الموت یا معاد کے متعلق جو خیالات فاضل مقالہ نگار نے ظاہر کئے ہیں۔ ان سے مجھے بالکل اتفاق ہے اور اس میں کلام نہیں کہ انبیار کا " دوزخ و جنت " کے خیال کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا بالکل تمثیلی و تشبیہی چیز ہے ، لیکن اس کو " حقیقت " کے رنگ میں اس لئے پیش کیا کہ عوام کے متاثر کرنے کا بہترین ذریعہ یہی تھا

جن حضرات نے شروع سے نگار کا مطالعہ کیا ہے وہ واقف ہوں گے کہ مسئلہ معاد میں میرے خیالات میں تدریجی طور پر برابر انقلاب پیدا ہوتا رہا ہے۔ خیر، اس کا قائل تو میں کبھی نہیں ہوا کہ قیامت کے دن مردے

قبروں سے اٹھیں گے، جوق درجوق محشر میں جمع ہوں گے اور باقاعدہ حساب کتاب ہوکر دوزخ وجنت کی سزا وجزا انھیں ملے گی، لیکن یہ ضرور یقین کرتا تھا کہ مرنے کے بعد رُوح قایم وباقی رہتی ہے اور روحانی مسرت و اذیت کا دوسرا نام فردوس وجہنم رکھا گیا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ خیال بھی محو ہوتا گیا یہاں تک کہ آج میں روح کی بقا کا بھی قائل نہیں اور پورے اعتقاد و یقین کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ زندگی نام ہے امتزاج عناصر کے اعتدال کا اور جب یہ اعتدال باقی نہیں رہ جاتا تو انسان پر موت طاری ہوجاتی ہے۔ اور موت نام ہے بالکل "نسیاً منسیا" ہوجانے کا۔

اس میں شک نہیں کہ مذہب کی بنیاد تمامتر منحصر ہے اعتقاد معاد پر اور کوئی شخص اس کو تسلیم نہ کرے تو پھر مذہب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ جس طرح ایک مذہب کو مابعد الطبیعیات سے متعلق کرکے غیر ترقی یافتہ عقول انسانی کے لئے مفید و کارگر بنایا جاسکتا ہے، اسی طرح اس کو اسی دنیا سے متعلق کرکے موجودہ ترقی علوم وفنون کے دور میں قابل عمل نہیں ٹھیرایا جاسکتا ——— میرا خیال یہی ہے کہ اس خدمت کو صرف مذہب اسلام ہی انجام دے سکتا ہے اور یہی میرا موجودہ مشن ہے جسکی تبلیغ میں ایک زمانہ سے کر رہا ہوں۔

اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ نوع انسانی کی فلاح کا تعلق صرف دو چیزوں سے ہے، ایک سعی وعمل اور دوسرے اتحاد ومساوات۔ اور عملی طور پر ان دونوں چیزوں کو جس طرح اسلام نے پیش کیا ہے۔ وہ کسی سے مخفی نہیں۔ جا بجا "تفکر و تدبر" کی ہدایت کرنا، صرف جد وجہد ہی کو ذریعۂ فلاح و نجات قرار دینا اور تمام نوع انسانی کو ایک رشتہ سے وابستہ سمجھنا، یہ ہے قرآن مجید کی تمام تعلیم کا خلاصہ لیکن ایک قدیم خیال کے مذہبی انسان میں اور مجھ میں اتنا فرق ہے کہ وہ ان سب کے نتائج عالم مابعد الموت سے متعلق کرتا ہے۔ اور میں اسی دنیا سے وابستہ سمجھتا ہوں۔ پھر کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ زمانہ کا ساتھ دینے کے لئے اس سے زیادہ لچک کسی اور مذہب میں پائی جاسکتی ہے اور کیا اسلام کو فطری وآخری مذہب کہنا اس کا مقتضی نہیں کہ وہ ترقی کے ہر دور میں یکساں طور پر مفید یقین اور رہبر و رہنما ثابت ہو۔

یہاں پر ایک اعتراض ضرور پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر قدیم خیال کے لوگ بقاء روح اور عقیدۂ معاد کو بھی تسلیم کراتے ہیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے اور اس کی مخالفت کیوں کی جائے جبکہ وہ دنیاوی ترقی کے مانع نہیں ——— لیکن یہ اعتراض موجودہ عقلی دور میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ اس وقت انسان کا مطالبہ ایسی تعلیم کا ہے جو ذہنی وعقلی آزادی کو برقرار رکھنے والی ہو اور بغیر سمجھے ہوئے محض روایات اعتقادی کی بناء پر کسی امر کا باور کرلینا یا دوسرے کو باور کرانا عقلی آزادی کو تباہ کرنے والا ہے جس پر اب کوئی راضی نہیں

ہو سکتا ـــــــ محض اس لئے کسی بات کو یقین کر لینا کہ اس کے یقین کر لینے میں کوئی حرج نہیں، نہایت غلط منطق ہے اور اب اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا۔ جب تک ایک انسان بالکل بچہ ہے، ہم اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر اس کو ڈرا سکتے ہیں کہ "اس کو نہ لو یہ کاٹ لیتا ہے" لیکن سن شعور تک پہونچنے کے بعد تو ہم اس سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ "تم تو یہی یقین کئے جاؤ کیونکہ ایسا یقین کرنے میں کوئی حرج نہیں"۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ دلیل سنکر سوائے ہنس دینے کے اور کیا کر سکتا ہے۔

بہر حال اس میں کلام نہیں کہ یہ زمانہ مذاہب عالم کے لئے نہایت ہی خطرناک زمانہ ہے۔ اور اس وقت صرف وہی مذہب و مسلک زندہ رہ سکتا ہے جو ذہنی ترقیوں کا ساتھ دینے والا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ ایسا مذہب صرف اسلام ہے بشرط آنکہ اس کی صحیح روح سمجھ کر لوگوں کو اس کی حقیقت سے آگاہ کیا جائے، ورنہ مولویوں کا بتایا ہوا مذہب تو اب چلنے کا نہیں

این خستہ اگر دیر زید شام بمیرد

باب المراسلة والمناظرۃ

(جناب شوق قندھاری)

مدت سے آرزو تھی کہ جناب سے طرح گفتگو ڈالوں لیکن موقعہ و محل کے خیال نے اب تک ایک مناسب عنوان کا منتظر رکھا اور اب جبکہ ملاقات کے لئے ایک موزوں تقریب ہاتھ آگئی ہے میں اپنی اسی دیرینہ خواہش کو پوری کر رہا ہوں یہ تقریب کیا ہے؟ اس کو اسی وقت بیان کر دینے سے پہلے میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ نگار سے اپنی شناسائی اور بتوسط نگار آپ سے بھی ــــ اپنی غائبانہ واقفیت کی داستان مختصر الفاظ میں بیان کر دوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ آپ کی کوششیں کیسی نہ کسی عنوان اور کسی نہ کسی طریقہ سے کامیاب اور بار آور ہو رہی ہیں اور ہوتی جائیں گی۔

آج سے آٹھ نو سال پیشتر میں نے پہلے پہل آپ کا نام سنا اور وہ بھی معاند اسلام اور دشمن مذہب کی حیثیت سے۔ اور سچ پوچھئے تو اس وقت نہ مجھ کو اتنی فرصت تھی کہ نگار کا بالاستیعاب مطالعہ کرتا اور نہ اتنی اہلیت کہ مطالعہ کے بعد تنقید کرتا آپ کے خیالات پر اور اپنی کوئی ذاتی رائے قائم کرتا اس لئے خاموش رہا۔ اور منتظر رہا وقت و موقعہ کا۔ اس طرح چار پانچ سال گذر گئے۔ اور اس عرصہ کے بعد میں نے اپنے میں اتنی اہلیت محسوس کی کہ اب میں نگار کا بامعان نظر مطالعہ کر کے بطور خود کوئی شخصی رائے قائم کر سکتا ہوں چنانچہ اتفاق وقت سے اتنی مہلت بھی زمانہ نے دی کہ ایک گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر ایک مدت کی تمنا کو پوری کر سکوں۔

اب فرصت کے زمانہ میں جتنے بھی پرچے مجھے دستیاب ہو سکے میں نے پڑھ ڈالے اس میں شک نہیں کہ شروع شروع میں اپنے عقاید و ایمانیات کے بارے میں ایسی تلخ بلکہ مخالفانہ آرا کا مطالعہ کرتے مجھے نہایت تکلیف ہوئی اور اس احساس تکلیف کا ذمہ دار وہ تعصب مذہبی اور وہ اسلوب تربیت تھا جو کسی تنقید و تبصرہ کو مطلق برداشت اور گوارا نہیں کر سکتا۔ اس احساس تکلیف کے دوران میں کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ میں نے پرچے پڑھتے پڑھتے پھینک دئے۔ لیکن وہی جستجوئے حقیقت جس نے مجھے شروع میں نگار کے مطالعہ پر آمادہ کیا تھا پھر مجھے اکسانی اور میں پڑھنا شروع کر دیتا

تھوڑے دنوں کے مطالعہ کے بعد میں نے خود غور کرنا شروع کیا کہ نگار کا مشن کیا ہے اور وہ کہاں تک حامل حقیقت ہے۔ چنانچہ میرے تعمق و وجدان نے مجھ پر یہ امر واضح کیا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ حق و صداقت کے اعتبار سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ چنانچہ اس وقت سے میں نگار کا مستقل خریدار ہوں اور ہر ماہنامے کو مطالعہ کو —— اور خصوصاً شعبہ مذہب کے مطالعہ کو اپنے اوپر فرض سمجھتا ہوں۔

نگار کی اس خاموش تبلیغ نے مذہب کے متعلق اور سنجیدہ و عمیق مطالعہ کا شوق مجھ میں بیدار کر دیا میں چاہتا تھا کہ اس بارہ میں غائر تصانیف کا مطالعہ کروں تاکہ تسکین ہو اس سلسلہ میں میں نے علاوہ دیگر بے شمار کتب کے مقبول احمد صاحب کی کتاب فلسفۂ مذہب کو —— جو بالالتزام نگار میں شائع ہوا کی —— بھی لگے ہاتھوں پڑھ ڈالا لیکن معاف فرمائیے کہ اسے بالکل سطحی تصنیف پایا بعد ازاں میں نے فلسفہ کی باقاعدہ اور منضبط تحصیل شروع کی۔ اور مسلسل دو تین سال کے درس فلسفہ نے مجھے تشکیک کے دامن میں پناہ دی اور میں نے جان لیا کہ علم کی رسائی نارسائی سے آگے نہیں یعنی

معلومم شد کہ ہیچ معلومم نیست

ہماری ساری علمی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

اب میں تشکیک و ارتیابیت کا قائل ہوں اور مذہب اور مذہب کی پیدا وار کے متعلق میرے خیالات وہی ہیں جو ایک متشکک کے ہوتے ہیں۔ اور آپ ہی فرمائیے۔ کہ اگر آپ کسی چیز کا انکار نہیں کر سکتے تو کیا اس کا اثبات کر سکتے ہیں ؟

خدائے تعالیٰ کو آپ بدیہی الوجود کہتے ہیں —— اور اس کے شاہد نگار کے ملاحظات ہیں —— لیکن آپ ہی فرمائیے کہ کیا آپ اسکا اثبات کر سکتے ہیں۔ اگر مصنوع کو دیکھ کر صانع کا خیال پیدا ہونا ناگزیر امر ہے تو یہی فرمائیے کہ کیا آپ کا صانع اسی نوع کا ہے جس نوع کے صناع انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر ایک اور چیز اس کی شریک ازلیت ہو جاتی ہے جسے مادہ کہتے ہیں اور شاید اس ثنویت کو آپ جائز نہ رکھیں اور اگر آپ کا "صانع حقیقی" صناعان مجازی کے مانند نہیں تو کیا وہ خود ہی صانع اور خود ہی مصنوع ہے۔

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ ؟

اور کیا اس میں اسی قسم کا استحالۂ عقلی نہیں جس قسم کا کہ مصنوع کو خود بخود بن جانے کے اعتقاد میں ہے ؟

اگر آپ اثبات کی جرأت کریں تو شاید آپ برکلے کے ہمنوا ہو کر آخری دلیل جو پیش کریں گے وہ یہی ہوگی کہ مادہ کو عامل و فاعل ماننے سے تنفر لازم آتا ہے۔ اور خدائے تعالیٰ کے بارے میں ایسا کوئی تنفر لازم نہیں آتا لیکن

میرا سوال اس وقت یہی ہوگا کہ اس تغیر کا ذمہ دار کون ہے سوا آپ کے متعصب اسلوب تربیت کے ؟ اور یہ بھی کہ خدائے قدوس کے بارے میں ایسا کوئی تغیر کیوں لازم نہیں آتا ؟

اس پر سے مجھے آپ کہیں مادیت کا وکیل نہ سمجھئے میرا مسلک تو "لاعلمی" ہے اور بس اور اس سے اتنا تو ثابت ہے کہ ہمارے علم میں وثوق و اذعان کوئی چیز نہیں اور یہ بھی کہ اگر ہم کسی چیز کا انکار ایقان و وثوق کے ساتھ نہیں کر سکتے تو اس کے اثبات میں بھی وہ ادعائے شان باقی نہیں رہتی۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا ـــــ جو کائنات مذہب کی سب سے زیادہ جلیل القدر ہستی ہے ـــــ ذہن انسانی کی سب سے زبردست تصنیف ہے ـــ اور تعجب ہے کہ ہمیں کو اپنے ذاتی خیالات سے ـــــ جن کا استداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ترقی پذیر ہونا یقینی ہے ـــــ اب انحراف در و گردانی ناممکن سی ہوگئی ہے !!

اس طرح ارتیابیت نے مجھے وہ سکون و اطمینان بخشا جس کا میں جویا تھا اور اس کے لئے میں نگار کا کسقدر ممنون ہوں ظاہر ہے۔

اب آپ نے اچھی طرح پتہ چلا لیا ہوگا کہ مذہب کے متعلق میرا زاویہ نگاہ کیا ہے مذہب کی فی الوقت دنیا کو ضرورت ہے یا نہیں اس کے متعلق میں یکطرفہ رائے نہ دوں گا البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ صاحبان علم و عقل کے لئے کسی مذہب کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے اور نہ ہے ان کا اپنا ضمیر ان کا بہترین رہنما ہے۔ ہاں اس طبقہ کو چھوڑ کر بقیہ افراد بنی نوع انسان کے لئے مذہب کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر نہ وہ معاشرۂ انسانی کے لئے کارآمد ہو سکتے ہیں اور نہ وہ خود کوئی پسندیدہ زندگی کر سکتے ہیں۔

یہاں پر میں اپنے معتقدات سے الگ ہو کر آپ سے چند استفسارات کرنا چاہتا ہوں ـــــ اور دراصل یہی تقریب ملاقات ہے ـــــ یہ کہ عبادات کا مفہوم و منشا جو آپ نے سمجھا ہے اور سمجھانا چاہا ہے وہ تو ہر لحاظ سے بالکل درست و احسن ہے اور واقعہ بھی یہی ہے ـــــ یہ میں بحیثیت ایک ارتیابی کے نہیں بلکہ بحیثیت ایک ایسے مسلم کے جو نیاز کی تبلیغ پر ایمان لایا ہے کہہ رہا ہوں ـــــ کہ اوامر اس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے کہ انسان کو معاشرہ کے لئے اور زیادہ کارآمد بنائیں مدنیت و معاشرت میں ممد و معاون ہوں اور خیالات کی درستی، اخلاق کا تصفیہ اور نفس کا تزکیہ کریں بنابریں آپ کا یہی کہنا بالکل درست ہے کہ "محض نماز پڑھ لینا یا ایک ماہ کے روزے رکھ لینا اصل ایمان نہیں" لیکن یہ تو بتلائیے کہ جب عبادات کا مقصد اتنا ارفع و اعلےٰ ہے تو پنجوقتہ یا سہ وقتہ اور ایک ماہ یا بلا قید مدت کی پابندی اور اس پر اصرار کیوں اور پھر مناقشہ و رد و قدح کیا معنی ؟ اگر کوئی شخص تمام رات نماز پڑھنے کے بعد اپنے میں وہ بات پیدا کرلے جو مقصود ہے تو اس کو کیوں مطعون کریں آپ ؟ اور اگر کوئی شخص بغیر رکوع و سجود کے

وہ اپنے پر کیف طاری ہوتا پائے جو اصل نماز ہے تو وہ کیوں جہنمی ہو؟ جیسا کہ مولوی کہتے ہیں!

دوسرا استفسار میرا الہامی کتب سے متعلق ہے آپ نے اپریل کے نگار میں الہام کی حیثیت اور الہامی کتب کی حقیقت سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اس کی افادیت سے مجھے انکار نہیں آپ کا یہ فرمانا کہ "یہ وہ الفاظ و خیالات ہیں جو انتہائی تاثر کے عالم میں اصلاح ملک و قوم کے لئے بے اختیارانہ انبیاء کے منہ سے نکل گئے" دعویٰ مستغنی عن الدلیل لیکن آپ نے اس امر کی نسبت بھی غور کیا ہے کہ الہامی کتب کا پیرایہ بیان کیا ہے دور کیوں جائیے قرآن ہی کو لیجئے اس میں کہیں تو رسول اللہ کو مخاطب کیا گیا ہے اور کہیں مسلمانوں کی جماعت کو اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خود خدا خطاب کر رہا ہے اگر آپ کا کہنا مان لیا جائے تو یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ انبیاء نے یہ دیکھ کر کہ ان کے اپنے مخاطبہ کا جماعت پر کوئی اثر نہ ہوگا یہ جھوٹ تراشا کہ خدا کی زبان میں بولنے لگے۔ مولانا ماجد اور ان کی قوم کے دیگر انبیاء بنی اسرائیل کے ان ہفوات کو تو میں درخور اعتنا نہیں سمجھتا کہ یہ خود خدا کا کلام ہے جو بہ اہتمام خاص "لوح محفوظ" سے ذریعہ "جبریل امین" نازل ہوا اس پر جتنے اور جس قسم کے اعتراضات ہو سکتے اور ہوتے ہیں ان کے نہ اعادہ کی ضرورت ہے اور نہ مجھے خط کی طوالت اس کی اجازت دیتی ہے۔ مذکورہ اعتراض اسلام کی اس صنف پر کیا گیا ہے جو کہ سر عقلی ہے۔ نقل کا تو ذکر ہی کیا

کیا ان امور کی نسبت قریبی اشاعت میں آپ کچھ روشنی ڈالنی پسند کریں گے اور ایسی امید اگر میں کوئی باندھوں تو وہ ناسزا تو نہیں؟ فقط

۶ر مئی ۱۹۳۳ء

مخلص
شوق قندھاری

(نگار) گرامی نامہ پڑھنے کے بعد میرا ارادہ یہ ہوا کہ آپ سے نج کے طور پر سلسلۂ مراسلت قائم کروں لیکن افسوس ہے کہ نہ آپ نے اپنا پورا نام اور پتہ تحریر فرمایا اور نہ ڈاکخانہ کی مہر سے کچھ سراغ چل سکا کہ خط کہاں پوسٹ کیا گیا ہے۔ ہرچند لفافہ کی پشت پر ایک چھوڑ اُر دو کی دو دو مہریں "عمری" اور "حد گاؤں" نظر آتی ہیں، اور اس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ ریاست نظام میں کسی جگہ آپ کا قیام ہے لیکن مراسلت کے لئے اس کو ناکافی سمجھ کر مجبوراً نگار ہی کے ذریعہ سے رسید پیش کرتا ہوں۔

مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ آپ نے نگار کے متعلق جو فیصلہ کیا ہے وہ کامل غور و مطالعہ کے بعد کیا ہے اور قدامت پرستی کی زنجیروں سے علیحدہ ہو کر ——— ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء — نگار کی زندگی

کے تقریباً بارہ سال گزر چکے ہیں اور اس دوران میں ایک عشر لمحہ بھی مجھ پر ایسا نہیں گزرا کہ میں نے اپنے مشن کی صداقت کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا ہو ـــــ پھر یہ تو ہوا کہ کسی مسئلہ پر میری رائے میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں، لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ اس تغیر کو ظاہر کرنے میں میں نے پس و پیش سے کام لیا ہو۔ یہاں تک کہ آج نصف قرن کی تحقیق و مطالعہ اور غور و تفکر کے بعد میں اپنے آپ کو اس منزل میں پاتا ہوں جسے صحیح معنے میں "ایقان و عرفان" کی منزل کہنا چاہیئے ـــــ نہ اب مجھ پر کوئی کیفیت "ارتیاب و شک" کی کبھی طاری ہوتی ہے، نہ "اضمحلال و تزلزل" کی اور میں نہیں کہہ سکتا کہ ایک زمانہ کے اضطراب روحانی اور تذبذب ذہنی کے بعد جو یہ سکون ضمیر نصیب ہوا ہے تو کتنی راحت و لذت اپنے اندر محسوس کرتا ہوں ـــــ جب تک میں مذہب کو اپنے آبا و اجداد کی نگاہ سے دیکھتا رہا، درس نظامی کی کتابوں کے اوراق میں ڈھونڈھتا رہا، مولویوں کے مواعظ اور صوفیوں کے اقوال میں تلاش کرتا رہا، ایک لمحہ کے لئے بھی قلب کو اطمینان نصیب نہ ہوا، لیکن جب ان تمام واسطوں سے علیحدہ ہو کر، ان تمام علائق کو توڑ کر، ان جملہ ذرائع سے بے نیاز ہو کر، خود اپنی آزاد آنکھوں، اپنی آزاد عقل، اور اپنے آزاد ضمیر کو رہبر بنایا تو حجابات اٹھنے لگے، تاریکیاں مٹنے لگیں اور آخر کار شاہد مقصود کو بے نقاب دیکھ کر جس کیفیت سے لطف اٹھا رہا ہوں اس کا حال نہ پوچھئے

هم کعبه و هم بتکده سنگ ره ما بود
رفتیم و صنم بر سر محراب شکستیم

میری پیدائش، میری تربیت ایسے شدید مذہبی ماحول میں ہوئی تھی کہ اگر فطرت خود میری رہنمائی نہ کرتی تو میری ہلاکت میں کوئی شک و شبہ نہ تھا، لیکن یاد رکھیئے کہ ابتدا ہی سے میں مولویوں کے بتائے ہوئے مذہب کو اپنے لئے غیر تشفی بخش پاتا تھا اور ایسا محسوس کرتا تھا کہ میری روح کی شیرینی میں کوئی تلخ شے ملائی جا رہی ہے پھر جب بعد کو مجھے آزادی نصیب ہوئی اور میں اس غلامی سے نکل کر خود تحقیق کی لذت سے آشنا ہوا تو مختلف ادوار سے مجھے گزرنا پڑا اور سب سے آخری دور جس کے بعد شمع یقین کا روشن ہونا مقدم ہو چکا تھا، وہی ارتیاب و تشکیل کا دور تھا جس سے آپ اس وقت گزر رہے ہیں،

گر غبار آلودهٔ گشتی باک نیست
اے ہزاراں دیده در راه تو خاک

انتظار کی گھڑیاں ختم ہو رہی ہیں، جلوہ حقیقی کی ساعت قریب تر آتی جا رہی ہے اور وہ لمحۂ درخشاں آنے ہی والا ہے جب خدا، "انسانیت کبریٰ" کے صورت میں آپ کے سامنے جلوہ گر ہوگا اور آپ بھی بے اختیار کہہ اٹھیں گے کہ

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتو آں ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

جس وقت تک میں نے نگار جاری نہ کیا تھا، یہ سمجھتا تھا کہ جو حالت "تذبذب" و "عدم یقین" کی مجھ پر طاری ہے۔ وہ شاید ہی کسی اور جگہ نظر آئے، لیکن جب نگار کے ذریعہ سے میں نے اپنے "اضطراب روحانی" کو ظاہر کیا اور اپنے شکوک واوہام لوگوں کے سامنے پیش کئے تو مجھے یہ معلوم کرکے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی کہ ایک میں ہی نہیں بلکہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کا بڑا حصہ یہ خلش اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور ایک عام بے اطمینانی لوگوں کے دلوں میں پائی جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد میری آواز کا حلقہ جتنا وسیع ہوتا گیا، اتنے ہی زیادہ ہم خیال نظر آنے لگے، یہاں تک کہ اس وقت نگار ہزاروں آدمیوں کے "تذبذب و اضطراب" کو دور کر چکا ہے اور آج ہندوستان کا شاید ہی کوئی مقام ایسا ہو جہاں نگار کی تبلیغ پر ایمان لانے والے چار موجود نہ ہوں۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ جتنی کامیابی ہونی چاہئے تھی نہیں ہوئی، اور جس وسعت کے ساتھ اس خیال کو پھیلنا چاہئے تھا نہیں پھیلا، لیکن اس کا سبب اصل تحریک کا نقص نہیں بلکہ اس کا سبب فقدان علم ہے جو علم و تحقیق کے اس دور میں بھی ہندوستان کی خصوصیت خاصہ بنا ہوا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ نگار کا مخاطبہ صرف اہل علم ہی سے ہے اور انھیں کے ذہن ودماغ میں تبدیلی پیدا کرنا نگار کا مقصد ہے۔

آپ نے دو باتیں بھی مجھ سے دریافت کی ہیں۔ ایک عبادات کے مفہوم کے متعلق ہے اور دوسری وحی و الہام کے متعلق ——— میں ان دونوں مسئلوں پر کئی بار صراحت کے ساتھ نگار کے صفحات میں گفتگو کر چکا ہوں لیکن غالباً نگار کے وہ پرچے جناب کی نگاہ سے نہیں گزرے ——— میں نے کبھی روزہ و نماز کی مخالفت نہیں کی بلکہ ہمیشہ صاف صاف الفاظ میں یہی ظاہر کیا ہے کہ اگر کوئی ان ذرائع سے مقصد حقیقی کو حاصل کر سکتا ہے تو یقیناً ان کی پابندی واجب ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ ضرور کہا ہے کہ ان کو اصل چیز نہ قرار دو بلکہ صرف ذریعہ سمجھو تزکیۂ اخلاق کا اور اس لئے اُس شخص کو بھی جہنمی نہ کہو جو بغیر اس ذریعہ کے کسی اور وساطت سے اصل مقصد تک پہونچنا چاہتا ہے ———

جنوری ۱۹۳۱ء کے نگار کا غالب حصہ اسی بحث کے لئے وقف تھا۔ اگر آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا تو اب دیکھئے ۔ اسی کے ساتھ مئی ۱۹۲۹ء، جولائی ۱۹۲۹ء، اگست ۱۹۲۹ء اور اگست ۱۹۳۰ء کے پرچے بھی ملاحظہ فرمائیے کہ صحیح فیصلہ آپ ان کے مطالعہ کے بعد ہی کر سکتے ہیں۔

وحی والہام کے متعلق آپ نے اپریل ۱۹۳۳ء کے نگار کا حوالہ دیکر استفسار کیا ہے، حالانکہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صرف ضمنی وسرسری طور پر ہے، اس مسئلہ پر بسیط گفتگو میں نے اپریل ۱۹۳۰ء کے پرچہ میں کی ہے

اس کو ملاحظہ فرمائیے اور اس ماہ کی اشاعت میں بھی باب الاستفسار پڑھنے کی تکلیف گوارا کیجئے۔ اگر اس کے بعد بھی کوئی کیفیت منتظرہ باقی رہے تو مطلع فرمائیے تاکہ اس کے دور کرنے کی کوشش کروں

اخیر میں ایک بار مجھے اور اجازت دیجئے کہ "حریت فکر" کے حصول پر آپ کو مبارکباد دوں اور اس تحریک کو اس استدعا پر ختم کروں کہ :-

بیا کہ روے بہ محراب گاہِ نور نہیم ٭ بنائے کعبۂ دیگر ز سنگِ طور نہیم
حطیم کعبہ شکست و اساس قبلہ بریخت ٭ بتازہ طرح یکے قصرِ بے قصور نہیم

گدا

توُنے پھیلایا ہے میرے سامنے دستِ سوال
چھیڑ دی یا اے گدائے بینوا، نبضِ خیال

یہ تری سہمی ہوئی نظریں سراپا التماس
اسقدر افسردہ حالی، خال و خد اتنے اُداس!

سر سے پا تک بید کے مانند تھرّاتا ہے تو
ہر قدم پر ناتوانی سے گرا جاتا ہے تو

چبھ رہی ہے روح میں صبر آزما افسردگی
تلخ ہے کس درجہ آنکھوں کی بھیانک روشنی!

زندگی کو ناز ہے جس پر وہ حُسنِ مستعار
آج تک تیری نگاہوں پر نہیں ہے آشکار

کس قدر دُھندلا ہے اس پیکر میں نورِ جانِ پاک
کوچۂ بیچارگی ہے اور تیری مشتِ خاک

توہے ای ناشاد! پامالِ جفائے روزگار
ٹھوکریں کھاتا ہے تو یا آدمیت کا وقار

عظمتِ نوعِ بشر ہے دَورِ گردوں کا فراخ
ہوش میں آ۔ اے رہینِ نخوت با درنگ و تاخ

ہے یہی ہمدردیٔ پست و بلندِ کائنات
سر جھکا اے دعوئ یک رنگیٔ بزمِ حیات

ذرہیں آزادی اسی کا نام ہے کیا ای خدا!
شرم کر اے دانشِ تہذیب و زعمِ ارتقا

جس نے پایا ہے کمالِ آدمیت کا سُراغ
اب کہاں ہے، سامنے آئے وہ عقلِ بددماغ

ہے اسی پستی پہ یہ آوازہ طبعِ غیور
بول اے انسانِ فانی کے فلک پیما غرور

ہے یہی تنظیم اجزائے معارف کا مآل کچھ بتا اے محوِ بالِ افشانیٔ نبضِ جمال
چاہئے لبریز تجھ کو عشرتِ فانی کا جام اے پرستارِ خودی، اے مال و دولت کے غلام
ان سے تیری غفلتیں کیا داخلِ عصیاں نہیں
ہیں جو کہنے کے لئے انساں، مگر انساں نہیں

جنکی روحیں مرچکی ہیں بھیک ہے جنکا شعار بیچتے پھرتے ہیں جو بے دام انسانی وقار
جنکے سینوں میں نہیں سعی و عمل کی دار و گیر جنکے دل خوابیدہ ہیں خاموش ہیں، جنکے ضمیر
جنکی ہر جنبش ہے استعمارِ ذلت کے لئے جو بنے ہیں، ظلم و تحقیر و اہانت کے لئے
جادۂ منزل سے واقف ہیں نہ گرمِ جستجو سُست جنکی نبضِ دل ہے، سرد ہے جنکا لہو
جھلملا کر بجھ چکا ہے جن کی روحوں کا کنول زندگی میں چھا رہا ہے جن پر اک خوابِ اجل

ان کو تیرے سامنے لایا ہے فطرت کا عتاب یہ ترے باطن کی تصویریں ہیں کچھ بیرنگ و آب
تاکہ تو آنکھوں سے دیکھے اپنی بربادی کا حال رقص کرتے ہیں ان آئینوں میں تیرے خد و خال
ان کے نالے ہیں زمانے کو جگانے کے لئے قوم کی غفلت کا افسانہ سنانے کے لئے
لیکن اس ہنگامۂ ادبار میں غیرت کہاں
قوم جب مجروحِ پستی ہو تو پھر غفلت کہاں

علی اختر (حیدرآباد دکن)

احساس آتشیں

گاہے گاہے کس لئے مغموم ہو جاتا ہے تو ! اے مرے غمخوار شاید میرا غم کھاتا ہے تو
چھوڑ دے، یہ روز کی دلدوز باتیں چھوڑ دے رنج پہونچاتی ہیں یہ جانسوز باتیں چھوڑ دے
میری ہستی خود مرے آزار کی بنیاد ہے میرے ہر ذرے میں سوزِ جاوداں آباد ہے
جاگتا رہتا ہوں میں راتوں کو جلنے کے لئے شمع کی مانند جل جل کر پگھلنے کے لئے
ختم ہو سکتا نہیں شاعر کا روحانی عذاب پھونک دے گا مجھ کو اک دن غم کا طولانی عذاب
دوسروں کی آگ میں جلنا مری تقدیر ہے میرے پیارے شاعری اک دردِ عالمگیر ہے

دے کے قدرت نے مجھے اک دور رس، گہری نظر غیر مرئی حادثوں کو دیکھنے والی نظر
کر دیا ہے اک عذابِ دائمی کا اہتمام ہو گئی ہیں زندگی کی راحتیں مجھ پر حرام
کاش تو میری نظر سے دیکھ سکتا، ایکبار سینۂ گیتی کے لا محدود داغوں کی بہار
کیا کہوں اس غمکدے میں کیسا نازک دور ہے اور ہی کچھ ہم نشیں! قدرت کے زیرِ غور ہے
وقت آتا ہے کہ بے چون و چرا اُڑ جائیں گے
اِک دھماکا ہوگا اور ارض و سما اُڑ جائیں گے

عدم

نمودِ شبنم

جلوہ آرا تھی عروسِ شب عجب انداز سے
ٹہنیوں پر غنچہ و گل جھولتے تھے ناز سے

کیف آگیں تھیں چمن میں حسنِ گل کی گرمیاں
ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی میں تھیں ہوا کی نرمیاں

حسن کی انگڑائیاں تھیں عشق کی آغوش میں
اک جہانِ آرزو تھا محشرِ خاموش میں

عشرتوں کی مستیوں میں، شب بسر ہوتی رہی
چھاؤں میں تاروں کی، دنیا بے خبر سوتی رہی

یک بیک شب کی فضاؤں میں تغیر ہو گیا
لشکرِ انجم فلک سے کوچ کرنے کو ہوا

اب عروسِ شب سحر سے منہ چھپانے کے لئے
یا طلسمِ رنگ و بو کو آزمانے کے لئے

تیز رفتاریوں شرما کے دکھلانے لگی
سوئے مغرب ناز سے اڑتی ہوئی جانے لگی

اُف دمِ رخصت عروسِ شب کی وہ جلوہ گری
پیر میں پازیب اور سر پر ردائے عنبری

یاد ہے وہ شب کا جانا منہ گلوں کا چوم کر
شاخِ گل کا پھر قدمبوسی کو بڑھنا جھوم کر

کانٹوں سے پازیب کا پیہم الجھنا۔ چھوٹنا
پھر روپہلے موتیوں کا وہ جھما جھم لوٹنا

غنچہ و گل اس ادا پر بے تحاشا ہنس دیئے
ہنس کے اپنے جیب و دامن موتیوں سے بھر لیے

فطرت واسطی

داعیات

آہ نارسا اپنی، نالہ ناتواں اپنا
اشک داستان دل کی، خامشی بیاں اپنا

کیا کہیں، محبت میں دل پہ کیا گزرتی ہو
حسن بے نیاز اُن کا، عشق بدگماں اپنا

آپ اور دلداری! خواب ہو کہ بیداری
ہو ہنوز کچھ باقی شاید امتحاں اپنا

لطفِ زندگی کیسا سیر گلستاں کس کی
ہے وہ اب قفس اپنا تھا جو آشیاں اپنا

آنہ جائے حرف اک دن اُنکی بے نیازی پر
تا کجا محبت میں آپ امتحاں اپنا

تا کجا رہیں گھُٹ کر دل کی حسرتیں دل میں
لوٹ لے کوئی رہزن کاش کارواں اپنا

فکر کی لطافت میں ذکر کی حلاوت میں
کون ہے شریک اپنا کون ہم زباں اپنا

دوست کے سوا کس سے حالِ دل کہوں کوکب
اور ہی دو عالم میں کون نازداں اپنا

کوکب (مغابھانپوری)

افسردگی!

روئے گیتی سے نمایاں ہو رہا ہے اضطرار!
چھا رہی ہے بے دلی ہر شے ہے گویا سوگوار!

خشک ہو کر رہ گئی ہے ہر رگِ ابرِ بہار!
تیز رو سیل ہوا میں کانپتے ہیں برگ و بار!

بند تھا غنچے کے سینے میں کبھی طوفانِ رنگ!
یا یہ عالم ہے کہ اس کی دید بھی ہے ناگوار!

اب وہ اگلی سی نہیں رخسارِ گل کی آب و تاب
اب وہ پہلی سی نہیں کیفیتِ موجِ بہار!

چہرۂ گیتی نظر آتا ہے اک تصویرِ غم!
دہر کی ہر چیز سے افسردگی ہے آشکار!

آج ہر اک شے مری نظروں میں ہے تصویرِ یاس!
دل ہی افسردہ ہو جب تو کیوں نہ ہو دنیا اداس!

راز بنگش سرحدی

غزل —— فرخ بناری

غم نہیں گر غمِ ہستی کو فراوانی دے — ہاں مگر دل کو مرے ذوقِ پریشانی دے
شوقِ دیدار کی منزل ابھی طے کرنا ہو — اور جلووں کو ذرا رخصتِ عریانی دے
کون ہوتا ہو حریفِ مئے حسن و نغمہ — دل دیا ہو تو اسے قوتِ سوہانی دے
جذبِ آنکھوں سے کروں دل میں جنوں کی دنیا — اور تھوڑی سی جو گنجائشِ ویرانی دے
مکتبِ عشق میں لیتا ہو مجھے درسِ تپش — چشمِ سفاک کو تادیبِ ستم رانی دے
ہوں وہ بلبل کہ قفس لیکے اڑوں سوئے چمن — مجکو صیاد اگر اذنِ پرافشانی دے
جادۂ شوق میں گم ہو کے تجھے پا جاؤں — عقل کو راہ بتاتی ہوئی نادانی دے
یوں تو ہی عام نگاہ غلط انداز کا فیض — اے خوشا دل جسے وہ مژدۂ حیرانی دے
شاد و فانی سے زمانہ ہوا خالی فرخ — کون ہو اب جو مجھے دادِ سخندانی دے

غزل —— اختر انصاری

مری جبیں سے، یہ سچ ہے، سکوں ٹپکتا تھا — مگر نظر میں تو کربِ نہاں جھلکتا تھا
نظر تو پھر بھی نظر ہے، غمِ محبت میں — ہنسا میں جب تو ہنسی سے لہو ٹپکتا تھا
چھپا ہے حسنِ بہاراں خزاں کی زردی میں — رُخِ بہار میں رنگِ خزاں جھلکتا تھا
ربابِ زیست سے پیدا تھی جب نوائے شباب — شمیمِ حسن سے باغِ جہاں مہکتا تھا
وہ وقت، آہ! افق سے نکل رہا تھا جو — کلیجہ، تاروں بھری رات کا دھڑکتا تھا
مرے شباب کی قسمت بری سہی، لیکن — جوان ہونے سے پہلے میں مر تو سکتا تھا

مری نگاہ بھی کس درجہ مست تھی اختر!
جب اُسمیں عکسِ خراباتِ دل جھلکتا تھا

مطبوعات موصولہ

ترجمان القرآن ماہوار رسالہ ہے جو ۶ ماہ قبل مولوی ابو محمد صاحب مصلح کی ادارت میں حیدرآباد سے جاری ہوا تھا اور اب مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی اڈیٹری میں شایع ہونا شروع ہوا ہے۔

اس رسالہ کا مقصود اس کے نام سے ظاہر ہے، یعنی مطالب قرآنی اور تعلیمات فرقانی کو ان کی صحیح و حقیقی روشنی میں لوگوں کے سامنے پیش کرنا۔ یقیناً اس مقصود کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن جیسا کہ خود فاضل اڈیٹر نے ظاہر کیا ہے۔ عہد حاضر میں اس مدعا کی تکمیل آسان نہیں ـــ عہد ماضی میں جب مذہب نام صرف اسلاف پرستی و قدامت پرستی کا تھا کسی شخص کا مبلغ یا مصلح بن جانا دشوار نہ تھا، لیکن اب جبکہ علوم جدیدہ اور اکتشافات حاضرہ نے "عمل و خیال" کی بالکل نئی طرح ڈال کر "حریت فکر و ضمیر" کی دولت سے دماغوں کو مالا مال کر دیا ہے۔ کوئی مذہب صرف اس دلیل کی بنیاد پر زندہ نہیں رہ سکتا کہ اس کے اسلاف کا بھی طرز عمل یہی تھا اور وہ بھی وہی سوچتے سمجھتے تھے جو اب بتایا جاتا ہے۔

پہلے اگر خدا کی وحدانیت سے بحث کی جاتی تھی تو اب سرے سے خدا کا وجود ہی محل نظر بتایا جاتا ہے۔ اگر پہلے ایک رسول کی ہدایت اس کے معجزوں سے ثابت کی جا سکتی تھی تو اب "علوم مقناطیسیہ" انھیں معجزوں کی دلیل پر ہزاروں رسول و نبی پیدا کرنے کے لئے آمادہ ہیں ـــــ پہلے ایک واعظ آسمان کی طرف دیکھ کر "عرش و کرسی" والے خدا کو پکار سکتا تھا لیکن آج جبکہ آسماں ہی کوئی چیز نہیں رہا، اس کا ایسا کرنا کسی طرح مفید یقین نہیں ہو سکتا۔ الغرض اب زمانہ "یومنون بالغیب" کا نہیں رہا بلکہ "یومنون بالحریۃ والشہود" کا ہے اور اسلئے ایسے نازک وقت میں کسی شخص کا مذہب کی حمایت کے لئے کھڑا ہو جانا آسان کام نہیں، جبکہ خود نفس "مذہبیت" کا خیال بھی اپنی جگہ چنداں قابل قبول نہیں

اس وقت تک جتنے مذہبی رسائل مسلمانوں کے نکلے ہیں ان سب کی شان یہی رہی ہے کہ مخاطب کو مسلمان سمجھکر خطاب کیا گیا ہے اور میرے نزدیک یہ پہلی کمزوری ہے جو کسی مذہب والے کی طرف سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ ضرورت ایسے رسائل کی ہے جن میں مسلم و غیر مسلم دونوں سے خطاب کیا جائے۔ اور جتنے خدشات و شبہات ایک شخص کے دل میں پیدا ہو سکتے ہیں ان کو سامنے رکھ کر دلائل کو استوار بنایا جائے ـــــ محض یہ کہدینا کہ قرآن کی تعلیم یہ ہے، یا احادیث

میں یوں بتایا گیا ہے، یا ہما ـ ے فقہا وعلما یہ کہہ گئے ہیں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس سے زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ آپ ایک مسلمان کی زبان بند کرکے طوعاً یا کرہاً اس کا سر انقیاد جھکا دے سکتے ہیں، لیکن جس چیز کو شمع یقین کہتے ہیں وہ خود ایک مذبذب ایمان والے مسلمان کے دل میں بھی روشن نہیں ہو سکتی، چہ جائیکہ ایک غیر مسلم یا کافر و ملحد جو آپ کی کسی کتاب سے مرعوب ہونے کے لئے طیار نہیں

اس لئے اگر یہ رسالہ بھی صرف مسلمانوں کے لئے جاری کیا گیا ہے اور غیر مسلم اس سے نور ہدایت حاصل نہیں کر سکتا تو بیکار ہے، لیکن اگر ایسا نہیں ہے جیسا کہ خود اڈیٹر کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے تو پھر ان کے لئے مناظرہ کا باب کھولنا ضروری ہوگا - (درانحالیکہ وہ اپنے اشتہار میں اس سے علٰحدہ رہنے کا اظہار کر رہے ہیں) ـــــ

چاہئے تو یہ تھا کہ مولوی ابوالاعلیٰ صاحب ذاتی و انفرادی احساس و یقین کی بنا پر خواہ کچھ ہوتے، لیکن رسالہ نکالتے ایک غیر مسلم کی حیثیت سے اور پھر اسی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر وہ اسلام کی صداقت کو ثابت کرتے، لیکن وہ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو کم از کم اس کی ترتیب ہی میں وہ کچھ ایسی بات پیدا کر دیں۔ جو ایک غیر مسلم کو اس کے مطالعہ کی طرف مائل کر سکے ـــــ میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ خواہ مخواہ کلام مجید کی آیتیں یا دوسری عربی کتابوں کی عبارتیں نقل کرکے پہلے ہی سے ایک غیر مسلم کے دل میں وحشت پیدا کر دی جائے اور وہ نگاہ ڈالتے ہی رسالہ کو بند کرکے رکھدے۔ اس لئے میں مشورہ [illegible] ...ری حیثیت اور انشا و تحریر کے لحاظ سے بھی اس کو "اغیار" کے مطالعہ کے قابل بنایا جائے۔ اگر واقعی اسلام کی صحیح خدمت انجام دینا ہے

قرآن پاک اپنے معنی کے لحاظ سے تین حصوں پر منقسم ہے ایک وہ جس میں اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ دوسرا وہ جس میں اعتقادات پیش کئے گئے ہیں۔ اور تیسرا وہ جو قصص و تمثیلات پر مشتمل ہے۔ حصۂ اول کے متعلق نہ زیادہ سمجھنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی دلیل و برہان کے لانے کی، کیونکہ تعلیم اخلاق تمام مذاہب کی تقریباً یکساں ہے اور ہر شخص یہ ماننے پر مجبور ہے کہ مذہب اسلام کی تعلیم دوسرے مذاہب کی تعلیم سے مختلف یا فروتر نہیں، البتہ حصۂ دوم اور حصۂ سوم پر زیادہ توجہ کرنا چاہئے، کیونکہ علوم جدیدہ اور انکشافات حالیہ نے انھیں دو حصوں کی طرف سے ریب و تذبذب کی کیفیت لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان شبہات کے دور کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ اس صدی کا مجدد کہلائے جانے کا مستحق ہوگا

اس لئے میں مشورہ دوں گا کہ ایک مستقل باب اس موضوع پر قائم کرکے تمام اُن آیات قرآنی کا استقصا کرنا چاہئے جو عقاید و قصص سے متعلق ہیں اور ان کا صحیح مفہوم و مدعا متعین کرکے اُن اعتراضات کو رفع کرنا چاہئے جو اس وقت اہل علم و تحقیق کی طرف سے وارد کئے جاتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا نہ کیا گیا بلکہ صرف پند و موعظت کو شعار بنا لیا تو پھر یہ رسالہ صرف بچوں، عورتوں اور جاہلوں ہی کے پڑھنے کی چیز رہ جائے گا۔ اور علمی و تحقیقی دنیا میں اسے کوئی

نہ پہنچے گا

مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کو اس وقت سے جانتا ہوں جب ان کا جاننے والا صرف میں ہی تھا۔ اور اس لئے میں اچھی طرح واقف ہوں کہ باوجود قدامت پسند ہونے کے وہ بہت سلجھی ہوئی طبیعت رکھتے ہیں، خدا نے "فکر سلیم" کی توفیق بھی انھیں دی ہے، اور اگر ضرورت و ماحول کے اقتضا نے انھیں مجبور نہ کر دیا تو ہمیں امید رکھنا چاہیے کہ وہ ترجمان القرآن کو صرف پرانے خیالات کے مولویوں کا پرچہ نہ ہونے دیں گے۔ بلکہ جدید روشن خیال والوں کے لئے بھی اسے مفید بنانے کی کوشش کریں گے ——— محرم کا جو رسالہ ہمیں موصول ہوا ہے اس کو دیکھ کر آیندہ کے متعلق ہم کوئی رائے قائم کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ کیونکہ یہ نئے اڈیٹر کی پہلی فکر کا نتیجہ ہے۔ آیندہ کے لئے میں ان کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ سب سے پہلے وحی و الہام کی حقیقت پر گفتگو کریں کہ اسی کے سمجھنے پر کلام اللہ کی حقیقت کا سمجھنا منحصر ہے اور پھر مسئلہ معاد کو لیں کہ اسی کے حل ہونے پر انحصار مذہبیت و لامذہبیت کا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کلام الٰہی اور معاد کا کیا مفہوم متعین کرتے ہیں، اس کے بعد میں اپنے شبہات و اعتراضات پیش کروں گا۔ اور اگر ان کی کوشش سے وہ دور ہو گئے تو مجھے بڑی مسرت ہوگی کیونکہ "ناچار مسلماں شو" کی جس لعنت میں بہت سے لوگ گرفتار ہیں، اس کا ایک بڑا سبب "عقیدۂ معاد" بھی ہے۔

خمستان ایک ماہوار ادبی رسالہ ہے جو کم و بیش ایک سال ہوئے سرزمین راولپنڈی سے نکلا۔ اور اب تک جاری ہے ـــ اس رسالہ کی نظم و ترتیب وہاں کی ایک ادبی انجمن کے ہاتھوں میں ہے جس کے روح رواں ہمارے عزیز دوست حضرت عدمؔ ہیں۔ جناب عدمؔ کی ادبیت کا اثبات ضروری نہیں کیونکہ ناظرین نگار اچھی طرح واقف ہیں، کیونکہ ان کی نظمیں اکثر نگار میں شائع ہوتی رہتی ہیں اور بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں

امید ہے کہ یہ رسالہ جناب عدمؔ کی کوشش سے "معیاری" اصول کو نہ چھوڑے گا۔ اور زبان کی مفید خدمت انجام دینے والا ثابت ہوگا

محشرستان مجموعہ ہے جناب محشر عابدی بی۔اے کے چند مختصر افسانوں کا جسے مطبع عہد آفریں حیدر آباد نے پاکیزہ طباعت و کتابت کے ساتھ شایع کیا ہے۔ جناب محشر کے جو افسانے اس مجموعہ میں شامل ہیں وہ ہندوستان کے مختلف رسائل میں اس سے قبل شایع ہو کر پسند کئے جا چکے ہیں، اس لئے ضرورت تھی کہ ان کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شایع کیا جاتا

جناب محشر کے افسانے عموماً جذبات محبت سے لبریز ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے کافی تاثر کے ساتھ انھیں لکھا ہے۔ زبان و طرز ادا بھی کافی دلکش ہے اور پلاٹ بھی اکثر افسانوں کے فن کے لحاظ سے

اچھے ہیں۔

یہ مجموعہ چھوٹی تقطیع کے ۲۳۶ صفحات پر محیط ہے اور مجلد ۱۲؎ میں ، غیر مجلد ۸؎ میں دفتر نگار سے بھی مل سکتا ہے

نوجوان ورتھر کی داستان غم | ترجمہ ہے جرمنی کے مشہور فیلسوف شاعر گوئٹے کے ایک رومانِ محبت کا، جناب ریاض الحسن صاحب ایم - اے کے قلم سے۔

گوئٹے کو دنیائے ادب میں جو مرتبہ حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں اور جو بین الاقوامی شہرت اسکو حاصل ہوئی وہ مشکل ہی سے کسی اور کو نصیب ہوئی ہوگی۔ گوئٹے دنیا کے اُن چند مخصوص لوگوں میں سے تھا جن کے دماغ کو قدرت نے ادب و فلسفہ کے لئے نہایت ہی معتدل امتزاج کا حامل بنایا اور عمر بھر اُن سے وہی خدمت لی جس کے لئے وہ وضع کئے گئے تھے

گوئٹے نے اس داستان محبت کو صرف ہیرو (ورتھر) کے خطوں سے مرتب کیا اور جذبات کی ایک دنیا اُن میں منتقل کردی - افسانہ صرف اتنا ہے کہ ورتھر ایک لڑکی سے محبت کرنے لگا اور وہ اس سے۔ لیکن اس کی شادی کسی اور شخص سے ہوگئی، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ورتھر نے ہجر و فرقت کی کڑیاں جھیلتے جھیلتے آخرکار ایک دن خودکشی کرلی۔

ورتھر کا وہ خط جو اس نے خودکشی سے پہلے اپنی محبوبہ کو لکھا ہے۔ ایک ایسا شاہکار ادب ہے جس کی مثالیں بہت کم کسی زبان کے لٹریچر میں ملتی ہیں

فاضل مترجم کا ملک کو ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس کتاب کا ترجمہ کرکے زبان کی گرانقدر خدمت انجام دی۔ ترجمہ بڑی حد تک صاف و سلیس ہے، گو ترقی کی گنجائش اس میں ابھی بہت کچھ پائی جاتی ہے۔

فاضل مترجم نے مقدمہ میں گوئٹے کے مفصل سیرت بھی قلم بند کردی ہے اور اس کی تصانیف پر بھی دلچسپ تبصرہ کردیا ہے جسکی سخت ضرورت تھی۔ یہ کتاب ۱۲؎ میں لٹریری سنڈیکیٹ نمبر۱- بیلی روڈ الہ آباد سے مل سکتی ہے

تجدید عمل | لاہور میں ایک مذہب شکن انجمن قائم ہوئی ہے اور یہ رسالہ اس انجمن کی پہلی تبلیغی کوشش ہے یہ رسالہ لکھنؤ کے مرزا عسکری علی خاں مجازی نے لکھا ہے اور صحیح آئینہ ہے ان خیالات کا جو آجکل ہر سوچنے والے دماغ میں پیدا ہو رہے ہیں اور آہستہ آہستہ مذہب کی عمارت کو متزلزل کرتے چلے جاتے ہیں

اس رسالہ میں مختلف ابواب کے ماتحت مختلف عنوانات سے بحث کرکے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مذہب کا وجود عہد تاریک کی یادگار رہے اور اب زمانۂ حال میں مذہبیت کو قائم رکھنا ذہنی ارتقاء کی راہ میں ایک سنگ گراں حائل کرنا ہے جسے انسانیت کبھی گوارا نہیں کرسکتی ـــــ رسالہ فی الجملہ دلچسپ اور مطالعہ کے لائق ہے معلوم نہیں ہمارے علماء کرام کی نگاہ سے یہ رسالہ گزرا ہے یا نہیں، اور عبدالماجد صاحب دریابادی

"قبلۂ دیں مددے، کعبۂ ایماں مددے" نے بھی کوئی کارروائی اس انجمن اور اس رسالہ کے مصنف کے خلاف مقدمہ چلانے کی کی ہے یا نہیں اور اپنے مذہب کی حمایت کے لئے حکومت برطانیہ کے سامنے دستِ سوال پھیلایا یا نہیں۔ اگر اُن کے علم میں یہ بات اب تک نہیں آئی تو اب میں ان کو آگاہ کرتا ہوں اور اُن کے جوشِ ایمانی کے مظاہرہ کا منتظر ہوں لیکن اگر یہ جاننے کے بعد بھی وہ خاموش رہیں تو سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ

سودا قمارِ عشق میں خسرو سے کوہکن ۔۔۔ بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز ۔۔۔ اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

یہ رسالہ ۸ر میں اُردو بک اسٹال بیرون لوہاری دروازہ لاہور سے مل سکتا ہے

اِس کا تجربہ نہ کیجئے



اگر آپ کو پندرہ کتابیں مختلف سائز کی ایک الماری میں رکھی ہوئی دیدی جائیں اور کہا جائے کہ ان کو الٹ پلٹ کر جتنی صورتیں ممکن ہو سکتی ہیں الماری میں ترتیب دیجئے تو بظاہر آپکو یہ کام بہت آسان نظر آئیگا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک کتاب کے نکالنے اور رکھنے میں صرف ایک منٹ صرف ہو تو بھی آپکو ۲۴۸۰۹۹۶ سال کا زمانہ درکار ہوگا

معلومات

فن خطابت کے دس اہم اصول

فرانس کے مشہور ماہر خطابیات نے ذیل کے دس اصول فن خطابت کے بتائے ہیں :-

۱ ـــ ہمیشہ نرم و آہستہ آواز سے بولنا شروع کرو اور رفتہ رفتہ آواز کو بلند کرو
۲ ـــ ہر لفظ کو زبان اور لب کی پوری حرکت سے صاف صاف ادا کرو
۳ ـــ ہر لفظ دوسرے سے علیحدہ ادا کرو، تاکہ باہم گڈمڈ نہ جائیں
۴ ـــ ٹھیر ٹھیر کر، گہری سانس لیکر تقریر کرو اور ایسا کبھی نہ ہو کہ تم کچھ بول رہے ہو اور تمہارے دانت بند ہوں
۵ ـــ اپنے سامنے سامعین کی طرف دیکھتے رہو اور اگر کوئی تحریر پڑھ رہے ہو تو کوشش کرو کہ آواز کی موجوں کا رُخ سامعین کی طرف سے نہ ہٹے
۶ ـــ جب خطبہ دو تو پوری طرح تنکر کھڑے ہونے کی کوشش کرو
۷ ـــ تقریر کے وقت کبھی تنگ و چست کپڑے استعمال نہ کرو
۸ ـــ کھانا کھانے کے بعد تقریر کرنے سے احتراز کرو
۹ ـــ میٹھی چیزیں زیادہ استعمال کرو
۱۰ ـــ اور اگر ان تمام احتیاطوں کے باوجود تمہاری آواز کام نہیں دیتی تو کسی طبیب سے رجوع کرو

موت کے بعد تاجپوشی

پرتگال کا ایک بادشاہ تھا جس کے بیٹے اور ولی عہد کا نام بدرو تھا۔ بدرو کی شادی ایک عورت انیز سے ہو چکی تھی، لیکن چونکہ یہ شادی شاہ پرتگال کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی اور وہ اپنے بیٹے کی شادی کسی اور جگہ کرنا چاہتا تھا، اس لئے اس نے اپنی بہو کو قتل کرا دیا

اس کے تین سال بعد جب وہ مرا اور بدرو تخت نشین ہوا تو اس نے اپنی مقتول بیوی کی لاش کو نکلوایا اور لباس فاخرہ لپیٹ کر اس کو تخت پر بٹھایا اور سر پر تاج رکھا جس وقت یہ رسم ادا ہو رہی تھی بدرو اپنی مقتول ملکہ کے سامنے کھڑا ہوا رو رہا تھا اور تمام امرا سر جھکائے ہوئے رسم احترام کو ادا کر رہے تھے

ایک عظیم الشان درخت

کلیفورنیا کے جنگلوں میں جو جماعتیں مفتشین کی پھرتی رہتی ہیں ان کو وہاں ایک عجیب و غریب درخت نظر آیا ہے جس کی عظمت کا مقابلہ دنیا کا کوئی درخت نہیں کر سکتا یہ درخت ۴۰۰ گز لمبا ہے اور بیس گز اس کا دور ہے۔ ہرچند اس کی لمبائی زیادہ حیرت انگیز نہیں کیونکہ اس لمبائی کے

درخت وہاں اور بھی پائے جاتے ہیں لیکن اس کی موٹائی البتہ حیرتناک ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس درخت کی لکڑی سے پورے بیس گھر طیار ہو سکتے ہیں

کلیفورنیا میں لکڑی کے مکانات کثرت سے طیار ہوتے ہیں، چنانچہ وہاں ایک کلیسہ ایسا ہے جو صرف ایک ہی درخت کی لکڑی سے طیار ہوا ہے، لیکن اس درخت سے تو درجنوں کلیسا طیار ہو سکتے ہیں

حُسن کا مقابلہ چار ہزار سال قبل اس وقت یوروپ میں ہر جگہ مقابلۂ حُسن کا سودا سمایا ہوا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ غالباً یہ کوئی نئی چیز ہے، درانحالیکہ اب سے چار ہزار سال قبل بابل و آشوریہ میں بھی یہی رواج پایا جاتا تھا اور وہاں کے بادشاہ بھی بالکل اسی طرح اس کا انتظام کرتے تھے جیسا آجکل یوروپ و امریکہ میں نظر آتا ہے

فیصلہ کرنے والوں کی ایک جماعت بٹھا دی جاتی تھی اور مقابلۂ جمال میں شریک ہونے والی لڑکیاں انکے سامنے سے گذرتی تھیں یہ ایک ایک کو دیکھ کر باتفاق رائے اس کی حُسن کی قیمت کا اندازہ کرتی تھیں اور جو شخص اُن سے نکاح کرنا چاہتا تھا، اس کو مقررہ قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس طرح جو روپیہ جمع ہوتا تھا وہ انھیں لڑکیوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا تاکہ ان کے مصارف نکاح اور جہیز کے کام آئے

نہ جلنے والا کاغذ جرمنی کے کسی شخص باول براؤن نے ایک کاغذ ایجاد کیا ہے جس پر آگ کا اثر نہیں ہوتا اور سخت سے سخت آگ اس کو جلانے سے عاجز ہے، درانحالیکہ بظاہر دیکھنے میں وہ بالکل معمولی کاغذ معلوم ہوتا ہے

یہ کاغذ نوٹ، دستاویز وغیرہ کے لئے بہت موزوں ہے اور اب جرمنی میں غالباً اسی کاغذ کے "اوراق مالی" طیار کئے جائیں گے۔ یہ شخص اس سے قبل پچاس ایجادیں کر چکا ہے جو سب کی سب جرمنی میں رجسٹرڈ ہو چکی ہیں

ڈاک ہوائی کے ذریعہ سے جرمنی، فرانس، امریکہ میں تجربے کئے جا رہے ہیں کہ ڈاک ہوائیوں کے ذریعہ سے پہونچائی جائے۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ ایک بڑی نلکی لی جائے گی جس کے نصف حصہ میں ڈاک ہوگی اور بالائی نصف حصہ ہوائی ہوگا۔ اس ہوائی میں اتنی طاقت ہوگی جو ایک متعین مقام تک پہونچ سکے۔ اس مقام تک پہونچنے کے بعد وہ پھٹے گی اور ڈاک کے تھیلے چھتریوں کے ذریعہ سے آہستہ آہستہ زمین پر اتر آئیں گے

اگر اس میں کامیابی ہوگئی تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ گویا ڈاک تار کے ذریعہ سے بھیجی جاسکتی ہے۔ اور اس کے بعد دوسرا قدم غالباً یہ ہوگا کہ بجائے ڈاک کے تھیلوں کے انسانوں کو ہوائی میں بٹھا کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہونچایا جائے ـــ جرمنی میں اس کے تجربے ہو رہے ہیں اور پوری کامیابی کے ساتھ

امریکہ میں اشتہار کا بالکل نیا طریقہ

امریکہ کی ایک کتب فروش کمپنی نے ایک عجیب و غریب طریقہ کتابیں فروخت کرنے کا اختیار کیا ہے۔ اس نے دس ہزار اشتہار معہ ایک لفافہ کے ملک میں تقسیم کئے ہیں اور اشتہار میں صرف یہ لکھا ہے کہ لفافہ چاک کرکے مطالعہ کیجئے۔ لفافہ کے اندر ایک ٹکڑا ڈورے کا ملتا ہے اور ایک گوند لگا ہوا فیتہ جس پر کارخانہ کا پتہ چھپا ہوا ہے، اسی کے ساتھ ایک تحریر ملتی ہے جس میں درج ہے کہ آپ ہماری دوکان سے ہر نئی شائع شدہ کتاب مفت لے کر پڑھ سکتے ہیں اگر پسند ہو تو قیمت بھیجدیجئے ورنہ یہ ڈورا لپیٹ کر اور فیتہ چپکا کر ڈاک خانہ میں دیدیجئے، کتاب ہم کو واپس مل جائے گی

غار کے اندر رہنے والی قوم

چین کے صوبہ شانسی میں تمام لوگ ان غاروں کے اندر زندگی بسر کرتے ہیں جو کسی وقت اُن کے آباؤ اجداد نے پہاڑوں میں کھودتے تھے۔ یہ لوگ مغل نسل کے ہیں اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے کافی ترقی یافتہ ہیں کیونکہ یہ لوگ کاشتکاری، پارچہ بافی، اور سنگتراشی وغیرہ سے بخوبی واقف ہیں

حال ہی میں جرمنی کے ایک سیاح نے ان کا حال لکھا ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ اس سیاح کو حیرت ہو گئی جب اس نے دیکھا کہ ان کے مکانات جو غاروں کے اندر پتھر کاٹ کر بنائے گئے ہیں نہایت پاکیزہ ساخت کے ہیں اور فن تعمیر و سنگتراشی کا بہترین نمونہ کہلائے جا سکتے ہیں۔ یہ لوگ نہایت نفیس کپڑے طیار کرتے ہیں، عمدہ چٹائیاں بنتے ہیں اور گھروں کی آرائش و زیبائش کے لئے بھی مختلف قسم کی چیزیں بناتے ہیں ان کی صحت بہت اچھی ہے اور باوجودیکہ غاروں میں رہنے سے سورج کی روشنی ان تک بہت کم پہونچتی ہے ان کی تندرستی قابل رشک ہے۔ ان کے یہاں جب کوئی مرجاتا ہے تو اس کے دفن کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے اور قبر کی طیاری میں حد درجہ فنی نزاکت صرف کی جاتی ہے

ہیں کہ (کو) کے ساتھ مطلوب کہتے ہیں۔ اور (کا) کے ساتھ مطلب۔ مثلاً اوس کو یہ مطلوب ہے اور اس کا یہ مطلب ہے۔ اور اس شعر میں (مجھے) کا لفظ (مجھکو) کے معنی پر ہے یعنی مجھکو شکست آرزو مطلوب ہے اور مصنف نے مطلوب کی جگہ پر مطلب باندھا ہے غرضکہ ردیف ربط نہیں کھاتی یوں ہونا چاہئے ؎

آرزو سے ہے شکست آرزو مطلب مرا

آتش نے بھی ایسا ہی کہا ہے ؎

وہاں نہ زخم کشتگاں سے ہے — میرے قاتل کو مرحبا مطلب

(مؤلف) اعتراض آجکل کے محاورے کے مطابق درست ہے۔ مگر ممکن ہے کہ غالب کے زمانے میں دونوں صورتیں رائج ہوں جیسا کہ آتش کے شعر سے بھی ظاہر ہے۔ اور مطلوب کی جگہ مطلب۔ مطلب کی جگہ مطلوب کہا جاتا ہو جیسا کہ اس شعر میں ؎

اک شہر دلمیں ہے اوسے کوئی گھبرائے گا کیا — آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

غالب ؎ دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے — عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

اعتراض۔ یہاں مصنف نے صاحب کو مطلب کا قافیہ عام محاورے کی بنا پر کیا ہے۔ کہ محاورے میں (ح) کو مفتوح بول جاتے ہیں

(مؤلف) جواب اس کا یہ دیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب نے دوسرے مصرع میں کسی دوسرے قائل کا قول بجنسہ نقل کر دیا ہے اور یہ جائز ہے چنانچہ ایک لطیفہ مشہور ہے کہ فردوسی کے اس مصرع پر کہ ؎ فلک گفت احسن ملک گفت زہ اعتراض کیا گیا۔ کہ احسن۔ فلک۔ ملک۔ سب عربی کے لفظ ہیں۔ حالانکہ فردوسی کا دعوے یہ ہے کہ فارسی کے سوا عربی کے لفظ شاہنامے میں نہیں آئیں گے۔ اور اگر آئیں گے تو بہت ہی کم۔ چنانچہ فردوسی نے فوراً اس کا جواب دیا کہ آں فلک گفت و آں ملک گفت من چہ گفتم۔ بہرصورت صاحب میں (ح) بالکسر ہے۔ اور اگر تادیلات کو نظر انداز کر دیا جائے تو قافیہ میں عیب پیدا ہوتا ہے۔

غالب ؎ قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب — وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھسے

اعتراض۔ اس شعر میں جس مقام پر مصنف نے (نہ) کہا ہے یہاں نہیں کہنا چاہئے تھا۔ یا (ہے) کو ترک کیا ہوتا۔ اس سبب سے کہ (نہ) کے ساتھ فعل منفی میں (ہے) بولنا خلاف محاورہ ہے۔ اور قدیم اردو میں بھی دیکھنے میں نہیں آیا مثلاً مجھ سے مارے ضعف کے نہ بولا جاتا ہے۔ غلط ہے۔ اور نہیں بولا جاتا ہے صحیح ہے۔ ہاں جہاں (نہ) عطف کے لئے ہو وہاں (ہے) کے ساتھ جمع کرنا درست ہے۔ جیسے نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھسے۔ یا جیسے نہ بھاگا جائے ہے مجھسے

وہ ٹھہرا جاتا ہے مجھ سے۔ اور عطف کے مقام پر نہیں کہنا خلاف محاورہ ہے۔ مثلاً نہیں بھاگا جاتا ہے مجھ سے نہیں ٹھہرا جاتا ہے مجھ سے۔ غلط ہے۔ اور نہ کے ساتھ ہے کا جمع کرنا اس سبب سے غلط ہے کہ ایسے مقام پر نہیں محاورہ میں ہے۔ اور نہیں۔ نہ۔ اور (ہے) فعل ناقص سے مرکب ہے۔ اور نہیں کے ساتھ جب (ہے) بولتے ہیں تو وہ فعل تام ہوتا ہے

(مولف) اعتراض صحیح ہے۔ تاویل کی گنجائش یہی ہے کہ دو چار مثالیں اس قسم کی پیش کی جائیں۔ مگر چونکہ یہ اعتراض قاعدہ کے ماتحت ہے مذاوہ مثالیں غلط ہوں گی

غالب ؎ جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

اعتراض۔ منظور عربی لفظ ہے لیکن جس معنی پر مصنف مرحوم نے باندھا ہے۔ عربی میں اس کا استعمال نہیں ہے ایک شعر نون کی ردیف میں گزر چکا ہے ؎

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

یہاں بھی (منظور) مبصر و مرئی کے معنے پر لیا ہے مگر محاورہ اس کے مساعد نہیں۔

(مولف) میرے نزدیک مصنف نے دونوں شعروں میں پزیرا۔ اور مقبول کے معنے لئے ہیں۔ لہذا اعتراض صحیح نہیں ہے پہلے شعر کے معنے یہ ہیں۔ میں صورت عالم میں صرف نام عالم کو تو مان سکتا ہوں باقی اس کی کوئی ہستی میرے نزدیک نہیں ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں یہ معنی ہیں کہ لوگ جو عالم کو شاہد ہستی مطلق کی کمر بتاتے ہیں ان کا یہ دعوے ہم کو منظور نہیں۔ مرئی کے معنے دونوں شعروں میں نہیں ہیں۔

غالب ؎ سوزش باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں دل محیط گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

اعتراض۔ محیط کو فارسی والے دریا کے معنی پر باندھا کرتے ہیں۔ اصلی معنی اس لفظ کے گھیرنے والے کے ہیں۔ اور سمندر کو بحر محیط اس وجہ سے کہتے ہیں۔ کہ بحر اعظم کو گھیرے ہوئے ہے۔ مگر تمام فارسی والوں نے دھوکا کھایا وہ یہ سمجھے کہ محیط نام ہے۔ یعنے جیسے بحر قلزم نام ہے اور اضافت بیانیہ ہے اسی طرح وہ سمجھے کہ بحر محیط میں بھی اضافت عام کی خاص کیطرف محض بیان کے لئے ہے اور یہ خیال غلط ہے۔ بلکہ یہاں اضافت توصیفی ہے جو کہ قید واقع ہوئی ہے۔ بحر کی۔ یہاں لفظ بحر کو ترک کرکے فقط محیط پر اکتفا کر لینا درست نہ تھا۔ مگر اس میں مصنف کی تخصیص نہیں ہے جو فارسی والے حقیقت الفاظ عربی سے ناآشنا ہیں وہ بے تکلف محیط کو دریائے شور کے معنی میں باندھتے ہیں۔ اور ان کا باندھنا مصنف کے لئے سند ہے۔

(مولف) میرے خیال میں معترض کا یہ لکھنا کہ تمام فارسی والوں نے دھوکا کھایا غلط ہے۔ محیط کو دریا کے معنی میں ان لوگوں

نے بھی استعمال کیا ہے جو عربی کے زبردست عالم تھے۔ اور اس میں نہ دریائے شور کی قید لگائی ہے۔ نہ کالے پانی کی مطلق دریا کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ چنانچہ علامہ فیضی کا یہ مصرعہ   والاگہر محیط افلاک ۔   اس کی شہادت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ مگر مرزا نے محیط کا لفظ اپنے یہاں اس طریقہ سے استعمال کیا ہے کہ اگر کوئی چاہے تو یہ معنی بیان کرکے تاویل کرسکتا ہے۔ کہ میرا دل گریہ کا احاطہ کئے ہوئے ہے اس پر بھی میرا لب خندہ آشنا ہے

غالب ؎   باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے   سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

اعتراض۔ جو لوگ صاحب تجربہ ہیں وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ نظیری کے شعر سے اس تشبیہ کی طرف مصنف کا ذہن منتقل ہوا ہے ؎   بزیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را   نواگران نخوردہ گزند راچہ خبر

غالب ؎   جوہر تیغ بہ سرچشمۂ دیگر معلوم   ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اگاتا ہے مجھے

اعتراض۔ ایران میں زہراب اہل زبان پیشاب کو بھی کہتے ہیں۔ اس لفظ سے بچنا چاہئے تھا۔

(مؤلف) کوئی شک نہیں کہ کنایتاً زہراب پیشاب کو بھی کہتے ہیں۔ مگر اردو میں کسی نے اس لفظ کو پیشاب کے معنے میں نہیں لکھا۔ اور جہاں تک میرا خیال ہے بہت سے لوگ ان معنوں سے واقف بھی نہیں ہیں۔ غالب نے محض اسی خیال سے لکھا۔ ورنہ یہ کون سمجھ سکتا ہے کہ وہ نہ جانتے ہوں گے کہ زہراب پیشاب کو بھی کہتے ہیں۔ اور علی الخصوص اس صورت میں جب وہ زہراب کو سبزہ کے اگانے کا سبب قرار دے رہے ہیں۔ جہاں معنی ثانی کے سمجھ لینے کا قرینہ بہت زیادہ ہے۔ مگر چونکہ وہ سمجھ چکے تھے کہ اردو زہراب کے معنے پیشاب کے نہیں آتے اس واسطے انھوں نے کوئی خیال نہیں کیا۔

غالب ؎   آمد سیلاب طوفان صدائے آب ہے   نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

اعتراض۔ اس شعر میں قافیہ کے اعتبار سے یہ بحث ہے۔ یعنی اس مصرع میں ؎

نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

ضرور ہے کہ جادہ کو جادے کہیں۔ اس لئے کہ سے۔ میں۔ پر۔ تک۔ کو۔ نے۔ کا۔ یہ سات حروف معنویہ زبان اردو میں ایسے ہیں کہ جس لفظ میں ہائے مختفی ہو اس کو زیر دیتے ہیں۔ غرض کہ اس مصرع میں تو جادہ کی دال کو زیر ہے اور اس کے بعد کا جو شعر ہے اوس میں کہتے ہیں ؎   شیشہ میں نبض پری پنہاں ہے موج بادہ سے

یہاں بادہ اضافت فارسی کی ترکیب میں واقع ہوا ہے۔ اور موج کا مضاف الیہ ہے۔ اب اس پر ترکیب اردو کا اعراب یعنی (سے) کے سبب سے زیر نہیں آسکتا اس لئے کہ اگر موج بادہ سے اُسے پڑھیں تو یہ قیامت ہوگی کہ

لفظ بادہ میں ہندی تصرف کرکے اور اُسے ہندی لفظ بناکر ترکیب اضافت فارسی میں داخل کیا بعینہ جیسے کوئی کہے کہ (عشق بتوں میں یہ حال ہوا۔) اور یہ کہنا صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ لفظ بُت میں ہندی تصرف کیا ہے اور ہندی جمع کی علامت اس میں بڑھائی گئی ہے۔ اب وہ ہندی لفظ ہوگیا۔ پھر ہندی لفظ کی طرف عشق کی اضافت کیونکر درست ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ (سے) کا اگر محل ہے تو لفظ موج بہ ہے۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ موج سے بادہ کی۔ پھر سے کے سبب سے بادہ کی دال کو زیر کیوں ہونے لگا عرضکہ جادہ کی دال کو زیر ہے۔ اور بادہ دال کو زبر ہے۔ قافیے تہ و بالا ہیں اگر یوں کہو کہ ہم بادہ اور جادہ کی ہ کو حرف روی لیتے ہیں تو اختلاف توجیہ کے علاوہ ایک عیب یہ پیدا ہوگا کہ شعر بے قافیہ کے رہ جائے گا۔ اس واسطے کہ (ہ) وزن سے گر گئی ہے۔ جیسے حکیم مومن خاں جب ایک مثنوی میں باہم گردونوں کے عاشق ہونے کا بیان لکھتے ہیں تو کہتے ہیں ؎

اس کا ہوش اپنے رنگ کا پیرو ۔۔۔ اپنا صبر اسکے رنگ کا پیرو

اس شعر میں اس کے اور اپنے کو قافیہ کیا ہے۔ اور صرف روی یعنی (ی) وزن میں نہیں سماتی۔ اب اسکے اور اپن قافیہ کی جگہ رہ گیا۔ میر حسن نے بھی یہ دھوکا کھایا ہے ؎

گر اس طرف سے قدم بڑھ وہ ۔۔۔ تو کہنے لگی مُسکرا اس کو وہ

(مؤلف) چونکہ دوسرے شعر میں (بادہ) ترکیب کے ساتھ ہے لہٰذا اس شعر میں حرکت قافیہ میں بصورت امالہ اختلاف ہوگیا ہے متقدمین کے یہاں اس کو کوئی عیب نہیں مانا گیا تھا۔ مگر آخر آخر میں لوگوں نے اس سے احتراز شروع کیا۔ اور آج عیب ہے۔ بصورت قدیم منشی کا یہ شعر غالب کے شعر کی تائید کرتا ہے ؎

شکستہ کئے یکسر آتش کدہ ۔۔۔ کیا ژند و اُستا کو آتش زدہ

غالبؔ و آرگس

غالب ؎ عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا ۔۔۔ درد کی دوا پائی درد لادوا پایا

آرگس ظہوری اس خیال کو اس طرح ادا کرچکا تھا ؎

شد طبیب ما محبت منتش برجان ما ۔۔۔ محنت ما راحت ما درد ما درمان ما

لہ آرگس ایک مضمون نگار کی مفروضہ ہستی ہے۔ جسکا ذکر غالباً ہوچکا ہے۔ انھیں مضمون نگار نے مرزا غالب کے بعض اشعار کے متعلق نگار ماہ فروری ۱۹۲۸ء میں ایک مقالہ سپرد قلم کیا تھا۔ جسمیں ثابت یہ تھا کہ بعض لوگوں کا یہ خیال کہ غالب کا کوئی شعر ایسا نہیں جسکا مضمون کسی شاعر سے لڑ جانے غلط ہے۔ غالب کے اکثر مضامین ایسے ہیں جنھیں دوسروں کے کلام سے لیا گیا ہے۔ استاذہ فارس کے کلام سے لیکر اردو میں انکا ترجمہ کردیا گیا ہے ان مضمون

اس مضمون کو مولانائے روم نے یوں ادا کیا ہے۔

مرحبا اے عشق خوش سودائے ما　　اے طبیب جملہ علتہائے ما

جواب بیخود۔ انداز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہوری نے ملائے روم سے اور غالب نے ظہوری سے سرقہ کیا میرا خیال یہ ہے کہ مولانائے روم نے عشق کا خیر مقدم کیا اور اُسے تمام بیماریوں کا معالج قرار دیا ہے۔ لفظاً مرحبا (خوش آمدید) سے ایک آنے والے کی چلتی پھرتی تصویر دکھا کر بیان واقعہ کو واقعہ کر دکھایا ہے۔ مگر شعر حکیمانہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لئے کہ جملہ علتہا کا مفہوم اوصاف ذمیمہ بشری تک پہونچ کر رہ جاتا ہے۔ یعنی اے عشق تو انسان کو تمام اخلاق ردیہ سے پاک کر دیتا ہے اور بس۔ اب ظہوری کے شعر پر نظر ڈالئے۔ محبت مجھ بیمار کے علاج کی طرف مائل ہوئی۔ میں دل وجان سے اس کا منت گزار ہوں۔ محبت میری تکلیف۔ میری راحت۔ میرا درد۔ میرا درمان ہے۔ ظہوری نے اس مفہوم کو اتنے ٹکڑوں کے اضافے کے ساتھ بیان کیا۔ منتش برجان ما۔ محنت ما۔ راحت ما۔ درد ما۔ درمان ما۔ ظہوری نے محبت کی کرشمہ سازیاں اور اُن سے اپنے متکیف ہونے کی حالت بیان کی اور اسطرح کہ مرتبۂ کرامت کو پہونچگئی۔ اب رہا غالب کا شعر وہ ظہوری کے شعر سے کہیں بالاتر ہے۔ مرزا نے یہ بتایا کہ جب تک عشق نہ ہو زندگی بے کیف ہے۔ دوسرے مصرع میں اور ترقی کی یعنی ابھی تک زندگی کو صرف بے مزا کہا تھا۔ اب کہتا ہے کہ زندگی بے کیف ہی نہ تھی ——— اور درد بھی ایسا جس کی دوا عشق کے سوا کچھ اور تھی ہی نہیں مگر یہ دوا ہے کیسی خود ایک درد لادوا۔ ظاہر ہے کہ عشق مجازی ہو یا حقیقی بہرحال لذت زندگانی کا کفیل ہے۔ اور اہل تحقیق جانتے ہیں کہ محبت کا جذبہ فنا ہو جائے تو انسان کہنے کو زندہ حقیقت میں مردہ ہے غالب کے شعر میں دو باتیں ظہوری کے شعر سے زیادہ ہیں۔ خود زندگی کو درد قرار دینا۔ جہاں محبت درمان درد زیست ہے وہیں درد لادوا بھی ہے۔ اب خیال عشق کے غیر فانی ہونے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جناب آرگس اور جناب سُہا کو عشق کے ارتقائی مدارج دکھانا تھے۔ جناب آرگس تو اسے سرقہ کہکر چلتے بنے۔ جناب سُہا نے ملائے روم اور ظہوری کے اشعار کو یقیناً کی تاکید کیساتھ ہم مضمون کہا اور خیال کو پامال اور مبتذل بتایا۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ اگر غالب کے شعر میں فلسفیت اور شعریت نظر آتی ہے تو ملائے روم کے شعر میں حکمت۔ اور ظہوری کے شعر میں حکمت و شعریت جلوہ دکھاتی ہے۔ جب اتنی ترقیاں موجود ہیں تو شعر کو چربہ کہنا غلطی ہے۔

(مؤلف) آرگس نے کسی جگہ نہ سرقہ بتایا۔ نہ شعر کو چربہ کہا۔ اس لئے اسقدر مضمون آرائی کی ضرورت نہ تھی۔ آرگس کا خیال یہ ہے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۱۲) کے دو جواب نکلے۔ ایک جناب سُہا کا اور دوسرا حضرت بیخود موہانی کا۔ یہاں آرگس کے اعتراضات اور ان کے جوابات کا اقتباس قلمبند کیا جاتا ہے

کہ تینوں مضمون یکساں ہیں۔ مرزا غالب بھی عشق کو درد کی دوا۔ اور درد لا دوا بتاتے ہیں۔ اور ظہوری بھی عشق و محبت کو، علاج درد۔ اور درد بتاتے ہیں۔ پھر جب حقیقت یہ ہے تو آرگس کے دعوے کو غلط کیونکر کہا جاتا ہے کیونکہ اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ یہ مضمون پہلے سے موجود تھا، غالب کی ابداع واختراع نہیں ہے

غالب ؎ بقدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

آرگس ۔ علی سہرندی اس مضمون کو یوں ادا کر چکا ہے :۔

تو چوں ساقی شوی درد تنگ ظرفی نمی ماند بقدر بحر باشد وسعت آغوش ساحل ہا

جواب سُہا ۔ غالب وسعت شوق بیان کرتا ہے ۔ اور علی سہرندی تنگ ظرفی ۔

جواب بیخود موہانی ۔ علی سہرندی کہتا ہے کہ جب تو شراب پلانے لگے تو جتنی بھی پلادے میکش کا ظرف تنگی نہ کرے گا۔ یہ تیری ساقی گری کا اعجاز ہے ۔ دوسرے مصرع میں تمثیل سے کام لیتا ہے ۔ کہ دیکھے جتنا دریا کا پاٹ بڑھتا جاتا ہے اتنی ہی ساحل کی آغوش کی وسعت بڑھتی جاتی ہے ۔

غالب کا انداز بتاتا ہے کہ میکش کے اصرار پر اُس سے کہا گیا ۔ یا وہ خود ساقی کو شراب دینے میں تامل کرتے ہوئے دیکھ کر یہ سمجھا ہے کہ ساقی مجھے تنگ ظرف سمجھتا ہے ۔ اس کا جواب دیتا ہے اور مدلل کر اے ساقی میں اپنی تشنہ کامی کے اندازہ کے لئے تجھے ایک پیمانہ بتائے دیتا ہوں ۔ وہ یہ کہ جسقدر تجھے ذوق مے ہے اسی قدر خمار تشنہ کامی بھی ہے ۔ یہاں تک تو عاشق نے پردہ پردہ میں گفتگو کی اور معلوم ہوتا تھا ۔ کہ شراب کا تقاضہ کر رہا ہے ۔ مگر دوسرے مصرع میں کچھ اور ہی عالم نظر آنے لگا ۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ تیرے یہاں شراب کا دریا بھرا ہوا ہے ۔ بلکہ یہ کہتا ہے اگر تو دریائے مے ہے تو میں خمیازۂ ساحل ہوں یعنی مجھے تیری تمام اداؤں کا تحمل ہے اور میری انتہائی خواہش پر میرے شوق کی انتہا شاہد ہے ۔ یعنی تو ناز آفرینی کرتے ہوئے کیوں رُکتا ہے میں ہرگز یہ نہ کہوں گا ؎

کمتر شراب جلوہ کہ پرشد ایاغ ما روغن چناں مریز کہ میرد چراغ ما

(مؤلف) جناب سُہا کا جواب تو کوئی جواب ہی نہیں ۔ بیخود صاحب نے البتہ کچھ تاویلات کی ہیں سو وہ بھی بیکار ہیں کیونکہ ان دونوں مضمونوں کے یکساں ہونے کو خود انھوں نے بھی مان لیا ہے اور یہی مقصود آرگس کا تھا

غالب ؎ محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

آرگس ۔ یہ غالب کا نہایت مشہور شعر ہے ۔ مگر عرفی اس سے قبل دو شعر اسی مفہوم کے لکھ گیا ہے اور غالباً غالب نے انھیں سے اپنا شعر اخذ کیا ہے ۔

ہرکس نہ شناسندۂ رازست وگرنہ   اینہا ہمہ رازست کہ معلوم عوام است
گوکہ نغمہ سرایان عشق خاموش اند   کہ نغمہ نازک و اصحاب پنبہ در گوشند

(مولف) جناب بیخود اور سہا نے بھی اس جواب میں صرف ان اشعار کے مطالب بیان کرکے باہمی فرق دکھایا ہے۔ لیکن آرگس کے اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیا گیا کہ غالب نے یہ خیال عرفی سے لیا۔

غالب ؎   کی مرے قتل کے بعد اسنے جفا سے توبہ   ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

آرگس - حافظ لکھتا ہے :-

آفریں بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب   کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

خیال دونوں کا یکساں ہے۔ غالب کے یہاں زود پشیماں ہے اور حافظ کے یہاں دل نرم۔ غالب کے یہاں جفا سے توبہ ہے اور حافظ کے یہاں "بہر ثواب بنماز آمدۂ"

(مولف) سہا نے معترض کے خیال کو صحیح باور کرکے اور بیخود نے غیر صحیح لکھکر صرف یہی تاویلیں پیش کی ہیں کہ دونوں کے مفہوم میں فرق ہے۔ درانحالیکہ معترض کا اعتراض تو صرف یہ ہے کہ غالب نے اس شعر سے استفادہ کیا جو کسی طرح رد نہیں ہو سکتا۔

غالب ؎   دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا   زخم کے بھرتے تلک ناخن نہ بڑھ جائینگے کیا

آرگس - ناطق گرانی اسی مفہوم کو یوں ادا کر چکا ہے :-

لذت زخم بسکہ دل زار من گرفت   ناخن زدم بہ سینہ اگر بستن گرفت

(مولف) بیخود صاحب نے حسب عادت تشریح کرکے دونوں شعروں میں صرف یہ فرق نکالا ہے کہ غالب کا شعر مجنونانہ ادا کا آئینہ دار ہے۔ اور ناطق، لذت زخم عشق کو بیان کرتا ہے۔ لیکن اس سے آرگس کا اعتراض نہیں اٹھتا

غالب ؎   آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں   عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا

آرگس - عرفی اس سے پہلے یوں کہہ چکا ہے :-

منم آں سیر زجاں گشتہ کہ با تیغ و کفن   تا در خانۂ جلاد غزلخواں رفتم

(مولف) سہا اور بیخود دونوں صرف اتنا فرق دونوں شعروں میں بیان کرتے ہیں کہ عرفی جان سے بیزار ہے، اور غالب معشوق کے ہاتھ سے قتل ہوکر اسی کو زندگی سمجھتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ غالب جو تیغ و کفن باندھکر قتل ہونے کے لئے جاتا ہے کیا وہ جان سے بیزار نہیں ہے اگر ایسا نہو تو اس اہتمام سے جائے کیوں۔ اور عرفی جو جان سے بیزار ہے وہ بھی اگر بقول

(بیخود) صاحب موت کو زندگی نہیں سمجھتا تو سیر کیوں ہے۔ میرے نزدیک زندگی سے تو اور زیادہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ فنا
کو بقا جانتا ہے۔ چہ جائیکہ غالب کے شعر سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا۔ کہ وہ کیوں مرتا ہے بجز اس کے کہ وہ زندگی سے سیر ہے۔
(بیخود) معشوق کے ہاتھ سے قتل ہونے کی خوشی اوس کا، اوّل تو غالب کے ہاں پتہ ہی نہیں اور اگر ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ عرفی کے
(غزل خوں رفتم) والے ٹکڑے سے بھی خوشی کا اظہار نہ سمجھا جائے۔ غرض یہ کہ دونوں شعر کسی طرح جدا نہیں ہو سکتے۔

غالب ؎ ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

آرگس۔ میلی ہروی کا شعر اسی مضمون کا یہ ہے:-

بیم از وفا مدار بہ وعدہ کہ من از ذوقِ وعدۂ تو بفردا نمی رسم

سُہا۔ نیشاپوری (میلی) وعدے کے ذوق میں مرجانے کا یقین دلا کر محبوب سے پیمان لینا چاہتا ہے۔ غالب صدق وکذب وعدہ کا ایک اچھوتا معیار پیش کرتا ہے۔ اختلاف مضمون مستزاد برآں۔ غالب کا حسن بیان شعر کو نیشاپوری کے شعر سے بلند ترکئے ہوئے ہے۔

بیخود۔ میری رائے میں حضرت آرگس کا خیال صحیح ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ دونوں خیال یکساں ہی نہیں بالکل ایک ہیں۔ حضرت سُہا جس کو اچھوتا معیار قرار دیتے ہیں وہ بالکل اسی طرح بلکہ اُس سے کہیں بہتر صورت میں میلی کے یہاں پایا جاتا ہے۔ مگر یہ مضمون عام ہے۔ اس لئے کہ انتہائی خوشی میں مرجانا مشہورات میں سے ہے۔ جس پر شادی مرگ کی شہرت شاہد عادل ہے۔ پھر وعدۂ وصل یار کی خوشی میں مرجانا کون سی بڑی بات ہے اس لئے اسے نہ ترجمہ کہئے نہ سرقہ یہ توارد کہا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک میلی کا شعر نزاکت و بلندئ خیال کے اعتبار سے مرزا غالب کے شعر سے کہیں بالاتر ہے۔ اس لئے کہ کہاں وعدہ یار کی خوشی میں مر نہ جانے کی معذرت کرنے کے لئے زندہ رہنا اور کہاں قبل وعدہ وعدۂ وصل کی خوشی میں مرجانے کا یقین ہونا۔

(مؤلف) حضرت بیخود نے یہاں آرگس کے خیال سے اتفاق کیا اور جناب سہا کی ناحق کوشی کا جواب بھی دیا۔ رہا یہ فرمانا کہ یہ مضمون عام ہے اس لئے توارد ہوا۔ یہ بھی آرگس کے اصول کی تصدیق ہے کیونکہ آرگس ہی کا یہ مقولہ ہے کہ توارد ہمیشہ عام اور سطحی مضامین میں ہوا کرتا ہے۔

غالب ؎ ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

آرگس۔ کسی کا شعر ہے ؎

غرقہ بحریم ما را در دیار ما مپرس لقمۂ کام نہنگم از مزار ما مپرس

غالب کے شعر میں جانِ خیال یہی بات ہے کہ دریا میں ڈوب جاتے تو نہ مزار بنتا۔ نہ جنازہ اٹھتا دوسرے شعر میں بھی یہی ہے۔ مگر غالب کے یہاں حسرت غرق ہے اور فارسی شعر میں اخبار ا ۔ الغرق

(مؤلف) حضرت بیخود نے اپنے جواب میں صرف شعر کے معنی بیان کر دئے ہیں۔ مگر آرگس کے اس فقرہ کو نہ دیکھا کہ غالب کے یہاں حسرت غرق ہے۔ اور فارسی شعر میں اِخبار بعد الغرق۔ غالب حسرت کرتا ہے کہ ۔ ہوئے کیوں نہ غرق دریا۔ فارسی شاعر کہتا ہے کہ ۔ غرقۂ بحر یم ماراده دیار ما مپرسش ۔ غالب کہتا ہے۔ نہ کہیں مزار ہوتا۔ فارسی شاعر کہتا ہے ۔ از مزار ما مپرسش ۔

فارسی کے شاعر کا مقصد یہ ہے کہ ہم دریا میں ڈوب مرے۔ اب تو کیا ہمارے مزار کا پتہ پوچھنا ہے۔ ہم سے یہ رسوائی کہ برداشت ہوئی کہ ہم زندہ رہتے اور اپنی موت سے مرتے۔ اور ہمارا مزار بنتا۔ اور ایک مستقل ملامت کی بنا پڑتی لوگ مزار کو دیکھتے اور بقول حضرت بیخود یہ کہتے کہ یہ وہی کم حوصلہ ہے جس سے عشق کی کڑیاں جھیلی نہ گئیں۔ جو مر کے اپنے آپ کو اپنے معشوق کو عزت عشق کو بدنام کر گیا ـــــ غالب ان سب باتوں کی حسرت کرتا ہے ۔ کہ دریا میں کیوں نہ ڈوبے کہ یہ سب رسوائیاں ہوئیں۔

غالب ؎ دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

آرگس۔ ملا غنیمت لکھتا ہے :۔

زمہرش سینہ ہا جولانگہ برق دل ہر ذرہ در جوشِ انا الشرق

ذرہ اور قطرہ، انا البحر اور انا الشرق میں کوئی فرق ظاہر نہیں ہوتا ۔

سُہا۔ دونوں شعر متصوفانہ یا وحدت الوجود کے رنگ کے ہیں۔ اس لئے نہ مُلا غنیمت کا شعر مُرجح ہو سکتا ہے نہ غالب کا ۔ تاہم یہ فرق بھی موجود ہے کہ ملا صاحب انوار و تجلیات کی عمومیت بیان کرتے ہیں ۔ اور غالب اپنی گرانقدر حقیقت کی طرف ایک توحیدی تمثیل سے اشارہ کرتا ہے ۔

(مؤلف) اس اعتراض کو سہا نے تسلیم کیا ہے۔ بیخود صاحب نے حسب عادت بے معنی تاویلیں کی ہیں ۔

غالب ؎ بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

آرگس ۔ عرفی اس مضمون کو یوں بیان کر چکا ہے :۔

وقتِ عرفی خوش کہ نکشودند چوں در برخش بر درِ نکشودہ ساکن شد در دیگر نزد

غالب کہتے ہیں کہ بندگی اور ذوق طاعت گزاری میں بھی ہم آزاد ہیں اگر کعبہ کا دروازہ بھی نہ کھلا تو واپس آگئے۔ عرفی کا خیال ہے کہ در دوست نہ کھلا تو اُسی بند دروازے کے پاس ٹھہر گئے۔ مگر دوسرے دروازے پر نہیں گئے۔ تقریباً ایک

خیال دوسرے خیال کی ضد ہے۔

سُہا۔ اگر وفا اور خود داری آپس میں ضد اور مقابل ہیں تو یقیناً ایک خیال دوسرے کی ضد ہے۔ مگر عرفی اپنے شعر میں ایک شان وفا اور غالب آن خود داری کا مضمون ادا کر رہا ہے۔

(مؤلف) ایک شخص دروازے پر ٹھہر گیا۔ ایک واپس آگیا۔ ایک بات ہے۔ کیونکہ بہرحال یہ مسلم ہے کہ کسی دوسرے دروازے پر دونوں میں سے کوئی نہیں گیا۔ نہ عرفی نہ غالب۔ درِ خانۂ معشوقِ عرفی کے لئے بھی نہیں کھولا گیا۔ اور در کعبہ غالب کے لئے وا نہیں ہوا۔ غالباً ان دونوں ٹکڑوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور اسی بنا پر آرگس نے ایک شعر کو دوسرے کے مقابلہ میں پیش کیا ہے

غالب ؎ نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی ہوا داغِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

آرگس۔ بیدل لکھتا ہے:۔

منزلِ عیش تو وحشت کدۂ امکاں نیست چمن از سایۂ گل پشت پلنگ است اینجا
در وحشت ایں بزم بعشرت نتواں زیست ہر چند چراغانش کفِ پشت پلنگ است

غالب کہتے ہیں کہ عیش و جاہ سے وحشت کا سدِ باب نہ ہو سکا۔ زمرد کا داغ بھی میرے لئے داغ پلنگ یعنی سرمایۂ وحشت بن گیا۔ بیدل کہتا ہے کہ وحشت کدۂ عالم میں یہ صلاحیت نہیں کہ منزلِ عیش بن سکے۔ چمن سایۂ گل سے پشت پلنگ بن گیا۔

سہا۔ غالب نفسِ عیش و جاہ کو، بیدل دونوں شعروں میں اس دنیا کو سرمایۂ وحشت قرار دیتے ہیں۔ غالب کا موضوع زیادہ نازک ہے۔ مضامین اور مشبہ میں فرق ہے۔ اگرچہ مشبہ بہ مشترک ہے۔

بیخود۔ بیدل دنیا کو وحشت کدہ قرار دیتا ہے اور ایسا وحشت کدہ کہ سامان آرایش سے اور زیادہ وحشت ناک ہو جاتا ہے۔

غالب کہتے ہیں کہ سامانِ عیش و جاہ علاجِ وحشت نہیں ہو سکتا۔ رفتہ رفتہ جام زمرد (سامانِ عیش و جاہ) بھی میرے لئے پشت پلنگ بن گیا۔ بیدل نے اپنے اشعار میں دنیا کو چراغاں اور چمن کو سایہ گل سے پشت پلنگ بنایا۔ مرزا نے جام زمرد کو داغ پلنگ بتایا۔ ہر ایک نے جُدا تشبیہ نکالی۔

(مؤلف) آرگس کے اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ کہ غالب نے اس مضمون میں بیدل سے استفادہ کیا ہے۔

غالب ؎ نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے لگا دے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

آزگس۔ حزیں کا شعر ہے :۔

کتانِ طاقتم را پردہ داری میکند حسنش　　رُخش در شام خط ابسحاب آلودہ را ماند

غالب کا خیال ہے کہ آئینہ کے جس جوہر کو اس کے سبزۂ خط سے طراوت پہونچتی ہے وگرنہ میرے معشوق کا چہرہ خانۂ آئینہ میں آگ لگادے۔ شیخ علی حزیں کا خیال تھا کہ میرے کتانِ صبر کی پردہ داری اس کا حسن کرتا ہے۔ خط جو اسکے رخسار کو ڈھانک رہا ہے وہ ایک سحاب ہے جس کیوجہ سے میرے کتانِ صبر پر اس چاند کا پورا اثر نہیں پڑسکتا ایسا نہو تو کتانِ صبر پارہ پارہ ہوجائے۔ اس شعر میں پروازِ خیال یکساں ہے۔ مضمون میں کچھ نہ کچھ فرق ہے

سُہا۔ حزیں کے شعر کی بندش کسقدر سُست اور غیر مربوط ہے۔ دوسرے یہ کہ جب حسن بھی پردہ دارِ طاقت ہے تو طاقت کو پارہ کرنیوالی کون سی چیز باقی رہ جاتی ہے۔

بیخود۔ جناب آزگس کا خیال صحیح ہے۔ دونوں شعروں میں پروازِ خیال کا ایک رنگ ہے انداز بیان بھی ایک ہی ہے۔ مگر دونوں کا خیال الگ ہے۔ مضمون میں بہت بڑا فرق ہے۔

(مؤلف) حضرت سہا نے زبردستی علی حزیں پر اعتراض کیا۔ بیخود صاحب نے اقرار کرلیا کہ جناب آزگس کا خیال صحیح ہے۔ فرق اتنا رہا کہ آزگس نے کہا تھا مضمون میں کچھ نہ کچھ فرق ہے۔ بیخود صاحب نے یہ فرمایا کہ بہت بڑا فرق ہے۔ لہٰذا کچھ لکھنا بیکار ہے۔ اگر فرق کی کمی و بیشی کی بحث چھوڑدی جائے تو یقینی آزگس کا خیال صحیح ٹھہریگا۔

غالب ؎　پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم　　ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

آزگس۔ علی حزیں کا شعر ہے :۔

گرانجاں تر ز شبنم نیست جسمِ ناتوانِ من　　اگر سے بود بامن روئے گرمی آفتابش را

اسی طرح صائبؔ نے لکھا ہے :۔

بہ اندک روئے گرمی پشت بر گل میکند شبنم　　چہ دارد آشنائی اینقدر کس بیوفا باشد

شیخ کا خیال ہے کہ میرا جسم ناتواں شبنم سے زیادہ تو گرانبار نہیں ہے کہ وہ مجھپر نظرِ عنایت کرے اور فنا نہ ہوجائے۔ صائبؔ کہتا ہے کہ آفتاب کی تھوڑی سی توجہ سے شبنم پھول کی طرف سے منہ پھیر لیتی ہے۔

سُہا۔ شبنم کی بے ثباتی کی تخئیل عام طور پر زبان پر رائج ہے۔ لیکن مسلمہ تشبیہات و تمثیلات کے متنوع استعمال سے اشعار ہم مضمون نہیں ہوجایا کرتے۔

بیخود۔ میرے نزدیک ان اشعار میں تخئیل اور خیال دونوں ایک ہیں۔ مگر حزیں کے شعر میں بہ تقاضائے بشریت کچھ فروگزاشتیں ہوگئی تھیں مرزا نے ان کو نکال دیا۔

(مؤلف) اس شعر میں جناب سہا نے۔ شبنم کی تخیل کی آڑ سے کر ہم مضمون ہونے کا اقرار کیا تھا۔ مگر بیخود صاحب نے صاف صاف اقرار کر لیا کہ دونوں خیال ایک ہیں۔

غالب ؎ کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

آر گس۔ خسرو کا شعر ہے:۔

زہے عمر دراز عاشقاں گر شب ہجر ادحساب عمر گیرند

دونوں شعر ایک ہی مضمون کے ہیں۔ البتہ مندرجہ ذیل خیال کچھ علیحدہ ہے۔

سپہری ؎ زخضر عمر فزونست عشقبازاں را
اگر ز عمر شمانند شام ہجراں را

غالب ؎ اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

آر گس۔ خاقانی کا شعر ہے:۔

من وبلائے تو نطع ادیم و تاب سہیل من وجفائے تو شاگرد سیلی اُستاد

اسی طرح ظہیر کا شعر ہے:۔

صد جہانے عشق ماکے بوالہوس را در قبول کے شناسد طفل قدر سیلی اُستاد را

غالب کے یہاں بصورت عمومیت، خاقانی کے یہاں بصورت خصوصیت، اور ظہیر کے یہاں بصورت نفی ایک ہی مضمون کو باندھا گیا ہے۔ بنائے اشتراک خیال سیلیٔ استاد کے سوا کچھ نہیں۔

(مؤلف) اصل اعتراض کا جواب بیخود و سہا نے کوئی نہیں دیا——

غالب ؎ میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا بلبلیں سنکر مرے نالے غزلخواں ہوگئیں

آر گس۔ عالی کا شعر ہے:۔

آب و رنگ گلستاں عشق اکنوں از من است عندلیباں ہرچہ میگویند مضموں از من است

دونوں مضمون تقریباً یکساں ہیں۔ عالی کے یہاں دبستاں نہیں ہے مگر اُس کے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔

(مؤلف) بیخود صاحب نے اعتراض کو تسلیم کر لیا ہے۔

غالب ؎ وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

آرگس - عرفی اس مضمون کو یوں لکھ چکا ہے :-

بہ کیشِ برہماں آنکس از شہید انست کہ در عبادتِ بُت روئے بر زمیں میرد

دونوں کی بنائے اشتراکِ خیال وفاداری پر مبنی ہے - مضمون قریب قریب ایک ہے -

---

غالب ؎ بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

آرگس - یہ شعر فیضی کے اس شعر سے ماخوذ ہے :-

دریاب کہ ماندہ است زدل قطرۂ خونے واں قطرہ ہم از دستِ تو لبریزِ چکیدن

بیخود - میرے خیال میں دونوں شعروں میں بہت زیادہ فرق ہے - غالب کہتا ہے کہ میں ہمہ تن عجز و مجبوری ہوں - میرے پاس لے دے کے ایک دل تھا - جو خون کا ایک قطرہ تھا - اب اس کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ ٹپکنے کے انداز سے سرنگوں ہو رہا ہے - یعنی یہ حالت ہو گئی ہے کہ یہ قطرہ بھی ٹپکا ہی چاہتا ہے -

فیضی معشوق سے کہتا ہے کہ دل میں اب ایک قطرۂ خوں کے سوا کچھ رہا نہیں (یعنی پہلے بہت کچھ تھا) وہ قطرہ بھی تیرے ہاتھوں سے لبریزِ چکیدن ہے - یعنی فنا ہوا چاہتا ہے - اگر تجھے خبر لینا ہے تو دیر نہ کر - فیضی کا مطلب یہ ہے کہ تو نے جلا جلا کر یہ حال کر دیا ہے - مگر ابھی رحم کی گنجائش باقی ہے - غالب انسان کی مجبوری و بے دست و پائی کی داستان سناتا ہے - فیضی اپنی حالتِ زار دکھا کر معشوق کو مہربان کرنا چاہتا ہے - رہا دل کا قطرۂ خون کہنا مشہد بات ہے اور اغراض و مسلمات کے حکم میں ہے - اسے بنائے اشتراکِ خیال کہنا شرمناک غلطی ہے -

(مولف) بیخود صاحب نے جتنا دلیل بار دی ہے اس سے اس کے سوا اور کچھ ثابت نہیں کر سکے کہ فیضی معشوق سے التجائے رحم کرتا ہے - سو معترض اس پر یہ کہہ سکتا ہے کہ غالب کے شعر میں یہ مضمون رہ گیا اور وہ شعر کو فیضی کے درجہ پر نہیں پہونچا سکے - غالب کے یہاں لفظ (تھا) کے معنی (باقی تھا) اور فیضی کے یہاں (ماندہ است) دونوں ایک سے ٹکڑے ہیں - بیانِ واقعہ یعنی دل ایک قطرۂ خون رہ گیا ہے - اور وہ بھی آمادۂ چکیدن ہے دونوں میں ہے - پھر آخر اور اتحادِ خیال کیا کسی چیز کا نام ہے یا بیخود صاحب کا یہ مقصد ہے کہ لفظ بہ لفظ مل جائے تب خیال متحد ہے -

---

غالب ؎ مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان ناف زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

آرگس - خاقانی کے اشعار ملاحظہ ہوں :-

نافِ زمین کعبہ گر نافِ مشک شد کاندر سموم کرد اثر مشک زد فرش

نافۂ آہو شدہ است نافت زمین از ہوا　　عقدۂ دوپیکر است پیکر باغ از ہوا

بیخود۔ میں اسے توارد سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ خیال پیش پا افتادہ ہے۔ اور غالب کے شعر سے اشعار خاقانی بہتر ہیں۔

(مؤلف) یہاں بھی بیخود آرگس کے اعتراض کو ماننے پر مجبور ہو گئے۔

غالب ؎ مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو　　اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

آرگس۔ یہ خیال خیام کی اس رباعی سے لیا گیا ہے:۔

مے خوردن من نہ از برائے طرب است　　نے بہر فساد و ترک دین و ادب است

خواہم کہ بہ بیخودی بر آرم نفسے　　مے خوردن و مست بودنم زیں سبب است

غالب ؎ ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق　　وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

آرگس۔ فسونی تبریزی کا شعر ہے:۔

بہ روبجو میرسم آسودہ میشوم از دور　　ندیدہ حال مرا وقت بیقراری حیف

غالب کے یہاں یہ خیال نہایت عمدگی سے ادا ہوا ہے۔ مگر خیال ایک ہے فسونی کہتا ہے کہ میں جب اس کو دیکھتا ہوں آسودہ ہو جاتا ہوں وہ مجھے اچھا اور تندرست جانتا ہے غالب کے یہاں برعکس ہے

غالب ؎ تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے　　اگر پہلو تہی کیجئے تو جا میری بھی خالی ہے

آرگس۔ بیدل کا شعر ملاحظہ ہو:۔

ز جیب ہر مژہ آغوش می چکد ایں جا　　کہ جائے تو ہمہ در چشم دوستاں خالی است

غالب ؎ نہ ہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب　　بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہئے

آرگس۔ میلی کا شعر یہ ہے:۔

دارد خموشی تا من حسرت کشیدہ را　　گوید شنیدہ ام سخن نا شنیدہ را

غالب ؎ زبسکہ مشق تماشا جنوں علامت ہے　　کشاد و بست مژہ سیلی ندامت ہے

آزگس - بیدل لکھتا ہے:-

دیدہ راکہ بنظارۂ دل محرم نیست مژہ برہم زدن از دست ملامت کم نیست

غالب ؎ باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

آزگس - ذوق نے اس مفہوم کو یوں لکھا ہے:-

سایۂ سرو چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے اژدہا بن بن کے شب ہر رشک گلشن آپ میں

فیضی[1] و عرفی

فیضی نے جب اکبر کے حکم سے مثنوی نلدمن لکھی - اور انتہائی تازہ و افتخار کے ساتھ اوس کو دربار اکبری میں پیش کیا تو اتفاق سے عرفی بھی موجود تھا - اگرچہ پہلے عرفی مدتوں تک فیضی کے خوان کرم کا ریزہ چیں رہ چکا تھا، مگر کچھ اسباب ایسے پیش آئے جن کی وجہ سے معاصرانہ چشمک معاندانہ حد تک پہونچ گئی اور عرفی فیضی سے الگ ہوکر حکیم ابوالفتح اور خانخاناں وغیرہ کے جود وسخا پر اپنا گزارا کرنے لگا۔

چنانچہ فیضی نے جب مثنوی کو اول سے پڑھنا شروع کیا - اور پہلا مصرعہ پڑھا کہ

اے در تگ و پوئے تو ز آغاز

تو عرفی اچھل پڑا - اور بآواز بلند کہا کہ سبحان اللہ - فیضی خوش گفتی - دلبسیار خوش گفتی - درستی - بخواں بخواں - فیضی نے پھر پڑھا ؎

اے در تگ و پوئے تو ز آغاز طاؤس نظر بلند پرواز

عرفی نے دوسرا مصرعہ سنتے ہی اعتراض کیا کہ " فیضی طاؤس را چہ پرواز - ازیں بام تا آں بام - بلکہ بگو - عنقائے نظر بلند پرواز " یہ معلوم نہیں کہ فیضی نے اس اصلاح کو مانا یا نہیں مانا - مگر آج نلدمن کے جتنے نسخے پائے جاتے ہیں اون سب میں بجائے طاؤس کے عنقا ہی پایا جاتا ہے۔

(مؤلف) فیضی پر جو اعتراض کیا گیا وہ صرف اس بات پر مبنی تھا کہ طاؤس بلند پرواز نہیں ہوتا - مگر نظر کی عنقا سے تشبیہ دی گئی ہے - جو خود ایک معدوم چیز ہے - اور یہی کسے معلوم ہے کہ عنقا بلند پرواز ہے یا مور کے برابر بھی اوس کی پرواز

---

[1] سنہ ۹۵۴ھ میں چارباغ نامی ایک بستی میں جو آگرے کے قریب دریائے جمنا کے کنارے واقع ہے پیدا ہوئے - اور سنہ ۱۰۰۴ھ میں ضیق النفس اور استسقا وغیرہ کے مرض اور مہلک عارضوں میں مبتلا ہوکر راہیٔ عدم ہوئے۔

نہیں ہے۔ اس واسطے کہ اوسے کسی نے نہیں دیکھا۔ فیضی نے نظر کی تشبیہ اس لئے طاؤس سے دی تھی کہ نظر جب رنگ ایک طرف میں رہتی ہے تو اس میں طاؤس کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور طرح طرح کے رنگ اوس کے سامنے آتے ہیں۔ اگر طاؤس میں بلند پروازی نہیں ہے تو نہ ہو تشبیہ بلا وجہ طایست جائز ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس میں یہ عیب ہے کہ تشبیہ تام نہیں ہے مگر عرفی کی اصلاح اچھی نہیں۔

فیضی ؎ ناخن چہ زنی رگِ جنوں را آگاہ نہ تپ در دل را

عرفی - فیضی از ناخن چہ کار آید۔ بگو کہ نشتر چہ زنی رگِ جنوں را

(مؤلف) اس وقت کے تمام نسخوں میں نشتر ہی پایا جاتا ہے۔ مگر ایک بہت قدیم نسخے میں میں نے ناخن بھی دیکھا ہے۔ یہ شعر اس جگہ کا ہے جہاں طبیب راجہ نل کو دیکھنے گیا ہے۔ اور غالباً ناخن زدن رگ سے مراد، نبض دیکھنا ہے۔ کیونکہ اُس جگہ جراح کا ذکر نہیں ہے بلکہ طبیب کا ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ اس سے پہلے شعروں میں کا ایک یہ شعر ہے۔

قارورہ شناس را طلب کرد گریاں شد و پرسش سبب کرد

اس لحاظ سے ناخن زدن مناسب تھا۔ مگر عرفی نے بوجہ رگ جنوں کے یہ اصلاح دی۔

میر وزیر علی صبا[1] و مولوی عصمت اللہ شاگرد ناسخ

صبا ؎ یہ ہم جلیس یہ ہمدم ہیں بزم ہستی تک لحد میں کوئی کسی کا شریکِ حال نہیں

اعتراض - ہم جلیس غلط ہے

جواب - یہ غلط العام ہے اس کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں

(مؤلف) جب مجیب خود اس ترکیب کو غلط العام کہتا ہے تو جواب دینا مدعی سست و گواہ چست کے مطابق ہوگا۔ مگر یہ کہنا کہ غلط العام کے استعمال میں کوئی ہرج نہیں ہے ایک حد تک صحیح ہے۔ اور ایک حد تک غلط۔ صحیح اس لئے کہ غلط العام کا بیشک یہی حکم ہے اور غلط اس واسطے کہ غلط العام کی حد میں لفظ ہم جلیس نہیں ہے۔ جلیس کے ساتھ ہم کی ضرورت نہیں

---

[1] صبا مرحوم کا نام میر وزیر علی تھا۔ آتش مرحوم کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ کے مشہور شاعر تھے۔ سنہ ۱۲۷۱ھ میں گھوڑے پر سے گر پڑے اور انتقال کیا۔ ایک دیوان ان سے یادگار ہے

مولوی عصمت اللہ کا تذکرہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ انھوں نے لکھنؤ کے مشہور شعرا پر اعتراض کئے تھے اور ایک رسالہ ترتیب دیا تھا جن میں میر وزیر علی صبا بھی تھے۔ اسی کا جواب مولوی محمد آغا علی صاحب مدرس مدرسہ ریاست ... نے لکھا تھا

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

- گرہستی کا لال
- شوکت کی کہانیاں حصہ اول و دوم
- شوکت کی کہانیاں حصہ سوم
- سیدہ کے خطوط
- پیاری بیسیل
- نئی نظمیں پیاری بیسیل
- عورتوں کی [illegible]
- دستار نسواں
- سیرۃ الکبریٰ
- طرز زندگی
- مخدرات تیموریہ
- ازواج النبی
- ازواج الانبیا
- سیرۃ عائشہ صدیقہ
- عفت المسلمات
- سبیل الجنان
- بچوں کی پرورش
- حفظ طفلاں
- تہذیب نسواں
- بیوی کی تعلیم
- بیوی کی تربیت
- تربیت الاطفال
- فرائض مادری
- انسانہ جہاں
- اقبال دلہن
- حسن معاشرت
- ایامیٰ
- سولہ کہانیاں
- سترہ کہانیاں
- سولہ قصے
- مراۃ العروس
- بنات النعش
- ترجمہ نصوح
- کنیز فاطمہ
- گھر داری
- نصیحت کا کرن پھول
- برکات سلطانی
- ابن الوقت
- چند پند
- منتخب الحکایات
- تندرستی
- حفظ صحت
- طبیب نسواں
- رہبر صحت

ناول، ڈرامے اور افسانے

- قطرات اشک
- جنت در ماتم
- بیس کا دکھ
- فسانۂ سعید
- [illegible]
- سیلاب اشک [illegible]
- بے زبان صورت
- جام الم [illegible]
- تفسیر عصمت
- جوہر قدامت
- تائید غیبی
- پر اسرار قتل
- اعلان آزادی
- سرگذشت ہاجرہ
- قصہ زندگی
- قلب حزیں
- عروس کربلا
- شہید مغرب
- ماہ عجم
- تیغ [illegible]
- سراب مغرب
- [illegible]
- موتی
- دروغ ظفر
- یاسمین شام
- طوفان اشک
- شاہین و دراج
- درس عشق
- گرد ریتی بھادر
- تین بندوق باز
- کرشمۂ رقابت
- انقلاب قسطنطنیہ
- شاہد رعنا
- ڈیڈیا کی سرگذشت
- شگوفۂ محبت
- نسوانی زندگی
- ولایتی [illegible]
- شمع خاموش
- حب زندگی کامل
- مودودہ
- چندر کلا
- گلستان خاتون
- صبح زندگی
- شام زندگی

تاریخ و سوانح عمریاں

- تاریخ مغرب
- مختصر تاریخ اسلام
- ایضاً حصہ ۲
- ایضاً حصہ ۳
- ایضاً حصہ ۴
- الصالحات
- امت کی مائیں
- الزہرا
- اسوۂ حسنہ
- ہند الشعرا
- شہنشاہ [illegible]
- سوانح اکبر الہ آبادی
- سفرنامہ عراق
- تاریخ افاغنہ
- اسلام اور غیر مسلم
- سیر المصنفین حصہ ۱
- ایضاً حصہ ۲
- تاریخ [illegible] جلد
- اخبار الاندلس [illegible] جلد
- خلافت موحدین
- خلافت [illegible]
- عرب اور اس کا مستقبل

لغات و ادب

- بازاری زبان
- لغات سعیدی
- لغات کشوری
- گنجینۂ تحقیق جلد
- غیاث اللغات فارسی
- محاورات نسواں
- جوہر اللغات
- گوہر اللغات
- چراغ سخن
- دکھنی لغت
- جواہرات کلیات نظیر
- عزیز اللغات
- تذکرۂ ریختی
- تاریخ ادب [illegible]
- دکن میں اردو
- منتخب کلام ہندی
- رباعیات عمر خیام
- منتخب کلام ہندی
- اردو کے اسالیب بیان
- تصریح الاغلاط
- فیض اردو
- نور اللغات [illegible] جلد

دواوین فارسی

- دیوان شمس تبریز
- کلیات عراقی
- دیوان حافظ
- دیوان بیدل
- دیوان عرفی
- کلیات جامی
- کلیات غالب
- کلیات صائب
- دیوان ناصر علی
- کلیات سعدی
- کلیات حزیں
- دیوان عنصری
- دیوان [illegible]
- دیوان ہلالی
- [illegible]
- [illegible]
- پیام مشرق
- قصائد [illegible] جلد

دواوین اردو

- کلیات ظفر
- کلیات مومن
- دیوان ناسخ
- کلیات میر
- کلیات سودا
- کلیات [illegible]
- کلیات نظیر اکبر آبادی
- گلزار داغ
- دیوان رند
- دیوان ذوق
- [illegible]
- مراۃ الغیب
- صنمخانۂ عشق
- فریاد داغ
- عالم خیال باتصویر
- دیوان [illegible]
- کلیات اکبر الہ آبادی
- [illegible]